

درسِ بخاری

شیخ الحدیث والتفسیر مولانا عبدالحق صاحب دہلی

ضبط و ترمیم

مولانا عبدالحق صدیقی فتحپوری

تعدیل و تصحیح و ترمیم

محمد جلیل صاحب مولانا حبیب الرحمن لاہوری

ایچ ایم سعید مکتبہ
امپریل پبلشرز پاکستان

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

فہرست مضامین

صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین
۱۴	حضرت مولانا عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کا قول فیصل	۱	کلمات تشکر - از مولانا سید احمد صاحب بزرگ
۱۴	صحیحین کی حدیثیں سفید قلعہ میں یا نہیں	۲	پیش لفظ - از مولانا محمد منظور صاحب نعمانی
۱۸	امام بخاریؒ کے مرنے پر منہ سے کیوں شروع کیا	۲	تعارف و تقدیر - از مولانا عبدالوہید صاحب فتوری
۲۰	دنیا کا محقر ترین مکتوب	۲	مذکرہ مولانا عثمانی - از مفتی یحییٰ الرحمن صاحب عثمانی
۲۰	حافظا و حجۃ، حاکم - صحیح کی اصطلاحات	۲	محقر سوانح امام بخاریؒ
۲۱	سند کی اہمیت اور اس کے مختلف الفاظ	۲	کتاب فضائل الصحابہ والتابعین کی تصنیف
۲۱	ہمارا سلسلہ اسناد	۲	امام بخاریؒ کے اساتذہ کی تعداد
	کتاب الوجی	۲	چھ لاکھ احادیث سے کتاب بخاری منتخب کی
۲۲	باب کیف کان بدر الوجی	۲	موقوف - مقطوع - منقطع - کی تقریبات
۲۲	امام بخاریؒ کے تراجم اور ان کی اہمیت	۳	امام بخاریؒ کے حفظ کا امتحان بغداد میں
۲۲	شروع بخاری میں فتح الباری مرتبہ	۴	اہل بیہودہ کو احادیث کا اطار
۲۲	تراجم بخاری اور حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ	۴	امام بخاریؒ کے دروغ و لغوی
۲۳	تراجم بخاری اور حضرت شیخ المسند رحمۃ اللہ علیہ	۵	ابو احوال اور ابن احوال کا فرق
۲۳	پدرالوجی کو کیوں مقدم کیا	۵	کفاۃ المجلس کی حدیث کو معلول کہنے پر امام مسلم کا ناپ جانا
۲۴	حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کا حل	۵	امام ذہبی کا امام بخاریؒ سے اختلاف
۲۴	حضرت شیخ المسند رحمۃ اللہ علیہ کا حل	۶	امام بخاریؒ کی وفات
۲۵	نبوت موحیت ہے کسی نہیں	۶	امام کے تمامہ کی تعداد
۲۶	کیف سے سوال بھی تعظیم کے لئے ہوتا ہے	۶	ایک محدث کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو امام بخاریؒ کے متعارف کھڑا دیکھنا
۲۶	وحی کے معنی	۸	امام بخاریؒ کی قبر سے مشک کی خوشبو آنا
۲۸	مشیر شاہ سوری کا ایک واقعہ	۸	ابتداءً تدوین حدیث سے بخاری تک
۲۹	جوہر الاسلام امام غزالیؒ کے فرماتے ہیں کہ امام بھی ایک قسم کی	۹	تدوین حدیث کے تین دور (پہلا دور)
	وحی ہے	۱۰	مراہیل مقبول ہیں یا نہیں
۲۹	عمران ابن حصینؒ صحابی کو ملک (خرنقہ) سلام کرتے تھے	۱۰	دوسرا دور
۲۹	ولی فرستے کو دیکھ نہیں سکتا	۱۰	تیسرا دور امام بخاریؒ کے کا دور
۲۹	فتح اکبریٰ تشریح وحی نبوت اور وحی ولایت کے بارے میں	۱۰	بخاریؒ و مسلم کا فرق
۳۰	وحی کی تقسیم قرآن کی آیت ما کان بشران یکلمہ اللہ سے	۱۱	ابن ماجہ کی کیفیت
۳۰	بخاریؒ کا بہترین انتخاب آیت انا ما عیضنا الا	۱۱	کتب حدیث کی انواع
۳۱	اس تفسیر کا جواب کہ نوح علیہ السلام سے کیوں شروع کیا آدم علیہ السلام سے کیوں نہیں کیا۔	۱۲	بخاریؒ میں مکدمات
	وحی نبویؐ وحی نوحیؑ سے اسخبر ہے	۱۳	فقر البخاریؒ فی تراجم کا مطلب
۳۱	موسیٰ علیہ السلام سے کلام کی خصوصیت	۱۳	قبول حدیث کی شرطیں اور ان میں اختلاف
۳۲	وحی کی اہمیت کہ مستند ترین کلام اگر اس کے لئے تو وحی ہی ہے	۱۳	حدیث معنی کی حقیقت
		۱۳	بحث ارسال و تدلیس

صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین
۵۰	باب در الخلق میں ہے یا تثنیٰ الملک	۳۲	انبیاء علیہم السلام میں ایک دوسرے کے مصدق ہوتے ہیں
۵۱	وحی الہامی میں ولی کو امر و نہی نہیں ہوتا	۳۳	مترجم برادہ مقصورہ ترجمہ کافرق (شیخ الحداد)
۵۱	شیخ اکبر نے کہا ہے کہ جو دعویٰ کرے وہ کذاب ہے یا مجنون	۳۴	سنہ حدیث اور امام حمیدی استاذ امام بکریؒ
۵۱	قادیانی نے دعویٰ کیا ہے کہ میری وحی میں امر و نہی ہے	۳۴	حدیث "انما الاعمال بالنیات"
۵۱	"کامن لبشر" میں تین صورتیں بیان کی ہیں	۳۵	حدیث کی ترجمہ الباب سے مناسبت اور اسکی وضاحت اور تفسیر
۵۱	(۱) وحی	۳۶	منصب نبوت
۵۱	(۲) من و دار حجاب	۳۶	نبی کا معصوم ہونا ضروری ہے
۵۱	(۳) فرشتہ منجید ہو کر سامنے آتے	۳۷	انما الاعمال بالنیات سے کیا مراد ہے۔
۵۲	عر فاروقؓ کی روایت میں دوی النحل آیا ہے	۳۷	احناف کے نزدیک وضو میں نیت شرط نہیں
۵۲	حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے دلوں کو ایک کہتے ہیں	۳۷	نیت کے مطابق ثمرات کی ایک مثال حدیث سے
۵۲	وحی الہامی کی شکل میں بھی ہوتی ہے۔ اسکا ذکر کیوں نہیں	۳۷	مسجد ضرار کا قصہ
۵۲	سخت حوالے کے زمانہ میں پسینہ کیوں ٹپکتا تھا	۳۸	دوسری نظیر حاطب رضی اللہ عنہ کا واقعہ
۵۳	شیخ اکبر کا ارشاد	۴۰	ضابطہ انما الاعمال بالنیات آیات قرآنی سے
۵۳	شاہ ولی اللہؒ کا ارشاد	۴۲	علامہ شاطبی کی تحقیق
۵۳	وحی آتے وقت نبی علیہ السلام کی کیفیت	۴۲	تواتر لفظی اور تواتر معنوی
۵۳	حضرت زبیر بن ثابتؓ کا فرمان	۴۳	نیت کے معنی میں اختلاف
۵۳	اس حدیث سے مقصد کفار کی عظمت وحی کا بتلانا ہے	۴۳	عبادت اور عادت میں فرق
۵۳	قرآن کا نزول بکثرت پہلی صورت میں ہوتا تھا	۴۴	فقہاء کا اختلاف نیت کے کسی معنی پر مبنی ہے
۵۳	جبریل امینؑ اصلی شکل میں دوبار آتے	۴۵	فن کانت ہجرت الی اللہ کی وضاحت
۵۳	دوسرا قول	۴۵	مسئلہ مختلف فیہ کی شرح اور حقیقہ کا مسلک
۵۴	حضرت جبریلؑ کی پہلی شکل میں فرشتہ کا آنا	۴۵	قول لامرئی ماقوی
۵۴	کہیں وقد دعیت اور کہیں ناعی کیوں نہرایا	۴۵	قول فن کانت ہجرت الی دینہ الخ
۵۵	اول ما بدر دیا صاحبہ	۴۵	امام بخاریؒ نے ایک جملہ حذف کر دیا
۵۵	فلق الصبح کیسا ہے	۴۵	حذف کی وجہ
۵۵	ثم حثب الیہ العذر	۴۶	شیخ الاسلام ذکر بانفساری کا قول
۵۵	غبار حسراء	۴۶	حدیث میں غور کے ذکر کی فاسد وجہ
۵۵	آپ کے دادا عبد اللہؓ اس فاد میں کسی بھی اعکان کرتے تھے	۴۶	اجماع سلف اس پر کہ ابتداء نیت ابھی بھی بعد میں کچھ
۵۶	تمحش کیا ہے	۴۷	موافق پیدا ہو گئے تو.....
۵۶	بعضوں نے اسے یتخف بڑھا ہے	۴۸	ام المؤمنین کا لفظ قرآن سے تقبیس ہے
۵۶	غازی میں نبیؐ کی شہادت سلم کا طریق عبادت کیا تھا	۴۸	حارث بن ہشام رضی اللہ عنہ کا سوال
۵۶	ویرزود غار حرا میں قیام کی مدت کتنی تھی	۴۹	احسان یا تثنیٰ مثل صلیبہ الجسد
۵۶	فقلت ما انا بقاری	۴۹	یہ آواز کسی کی ہوتی تھی کیا جبریل ملائکہ کی یا صوت حق
۵۶	جبریل علیہ السلام کے دبانے کی کیفیت اور اس کے اثرات		ہوتی تھی۔
۵۷	دبانے کا ایک واقعہ	۴۹	کبھی شہر محمود ہوتا ہے مگر شہر مجبور نہیں ہوتا
۵۸	ما انا بقاری کا صحیح ترجمہ	۴۹	حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ کی تفسیر کا واقعہ
۵۸	اقر باہم ربک میں لفظ رب کا ذکر کیوں	۴۹	حدیث ان الایمان لیا رز الی اللہینہ
۵۹	الذی خلق فرمایا خالق کیوں نہ فرمایا	۴۹	تشبیہ محض المصلح کے لئے
۵۹	تو خلق الانسان من علق	۵۰	حضرت حسان رضی اللہ عنہ کی ایک تشبیہ
۵۹	تو اقر ربک الاکرم الخ قلم کا ذکر کیوں	۵۰	فرمان نبویؐ حبسہا بالیس الفصل

صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین
۸۱	اسرار اور معراج کا فلسفہ	۶۰	جدید سائنس سے اس کی تفسیر
۸۲	محققین کا قول بحجرت و فضیلت فی نفسہ نامہ کا میں بھی ہے	۶۰	قول علم الانسان امام یسلم
۸۲	شیخ الاسلام ابن قیم کی بحث نہاد و مکان کی فضیلت کے بارے میں	۶۱	قول رجعت نوادہ
۸۵	حضرت ابو الیمان ابو بادشاہوں کو دین کی دعوت	۶۱	سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ جبکہ حضرت اسیان جنس کی تہمت تھی
۸۶	والی حبشہ کا قبول اسلام	۶۱	لفظ رب اور لفظ روع آئے۔ یہ روع کسی شے کی بنا پر
۸۶	کسری کا حشر	۶۲	نہیں بلکہ طبعی اثر تھا
۸۶	قیصر کا قتل نامہ مبارک کیساتھ حضرت دیکھی نے پیش کیا تھا	۶۲	اب ای نبوت میں مروجہ تھی حید کا بعض نے سمجھا ہے
۸۶	فتح روم کی پیشین گوئی اور اس کا ملور	۶۲	قولہ ذلقت خشیۃ اس کی شرح میں حافظ نے بارہ قول نقل کیے ہیں
۸۶	حضرت ابوسفیان کی گفتگو ہر قتل قیصر روم سے	۶۲	علامہ ابوالحسن سندی نے اسے حاشیہ بخاری میں وضاحت سے
۸۶	مشترکین اپنے مہموردوں کو وجہ مستقل ادمن وجہ غیر مستقل	۶۲	بیان کیا ہے۔ نووی نے بھی اشارہ کیا ہے
۹۱	مانتے تھے	۶۲	زبان قدرت کی اثر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اور
۹۱	مدنی میں حاتم کا سوال اھم حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب	۶۳	جبریل ابن علیہ السلام کا تسلیم دینا
۹۲	غیر انٹر کوسوہ کرنا فکاہ شریعت میں	۶۳	حضرت صدوق صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب اور آپ کے اوصاف کا بیان
۹۲	نجدی علماء کا نظریہ	۶۴	دورین و فتن سے ملاتوں اور گفتگو
۹۲	نجدی علماء سے حضرت العلماء کا مکالمہ	۶۵	دور نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا نام لیا
۹۲	حجۃ اللہ الباقین شاہ صاحب کی نفیس تحقیق	۶۵	ناموس اور جاسوس کا فلسفہ
۹۳	شاہ ابن سودا اعتراضات	۶۵	توریت اور انجیل کا فرق
۹۴	ہرقل کا تبصرہ	۶۶	اول مومن کون ہے کیا دور قد مومن تھے
۹۴	انبیاء علیہم السلام ہمیشہ عالی نسب ہوتے تھے	۶۶	ایمان معرفت علم یا نصیب سے ایمان معتبر نہیں ہوتا
۹۴	متبعین انبیاء زار و منفار ہی ہوتے ہیں	۶۶	ابو طالب کا قصہ اور ان کی خدمت
۹۵	قال انوار یون حق النصار ان اللہ	۶۸	شیخ اکبر فرماتے ہیں کہ نبوت اور رسالت میں فرق ہے
۹۶	ہرقل نے نامہ مبارک پر حصا	۶۹	ارشاد نبوی، اور مخبرجی حکم
۹۶	کسی کا فسکہ اکرام کس حد تک جائز ہے	۶۹	اور مخبرجی حکم کا قصہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو بھی پیش آیا
۹۸	اسلم تسلیم کا مطلب	۷۰	ابن شہباز کی دوسری روایت
۹۸	اجرم تین کا مطلب	۷۰	نزول با اہل المدرثم، مع تفسیر
۹۹	یا اہل کتاب تعالوا الی کلمۃ الخ	۷۱	زہرہ کے چار تلمیذ
۹۹	دوسری آیات سے استشہاد	۷۲	حدیث فتح الباری کے کتبے پہلے نزول فاتحہ کا ہوا
۱۰۰	یادری فتور کا قول کہ عقل کی رسائی سے باہر ہے	۷۳	کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یخرج لسانہ و شفیتہ
۱۰۰	منشا ہست سے ہونے کا جواب	۷۴	قولہ لا تحکم بلسانک، نفیس کلام
۱۰۱	یہود اپنے کسب سے بڑا موحد کہتے ہیں	۷۵	رابط آیات سورہ قیامہ
۱۰۱	اب سیدنا خزیرہ علیہ السلام کو ابن اللہ کہنے والا کوئی نہیں	۷۶	قرآن کے بار میں روا فیض کے تین گروہ
۱۰۲	شرک کے انواع	۷۷	فقال مدنی کا قول یا تیرے لطیف آیات
۱۰۲	توراة میں انبیاء اسلام کا درجہ	۷۷	کتاب بول کر بھی قرآن نامہ اعمال مراد لیتا ہے
۱۰۲	ہندوؤں کا دھرم	۷۸	شاہ سیحہ اور حضرت ابن علیہ وسلم کی تقریر
۱۰۲	کیا ہر دین برحق اسلام ہے	۷۹	رابط آیات کی ایک افواہی تحقیق
۱۰۳	حافظ ابن حجر نے فرمایا کہ اسلام اس امت کا لقب ہے	۷۹	منزل کے لئے تین چیزیں ضروری ہیں
۱۰۴	حضرت العلماء کی تحقیق انہیں	۸۰	رابط آیات پر غور کرنے کا اصول
۱۰۵	قیصر کے دربار سے ابوسفیان صلی اللہ علیہ وسلم کا متاثر ہونا	۸۰	آیت سبحوت عنہا پر غور
۱۰۶	ابن الناطور نے اسلام قبول کر لیا تھا۔	۸۰	استبعاد جمع کا ایک نمونہ

صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین
۱۳۲	صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کا انقیاد	۱۰۷	عمل نے اسلام قبول نہیں کیا
۱۳۲	الترام کا نام ایمان ہے	۱۰۸	انہیں اختلاف ہو گیا خلافت عمر بن خطاب سے مسلمانوں کے مقابلہ میں
۱۳۳	قولہ والزمین اشد ارادہ ہم ہوتی		وہی یہ قول تھا دوسرا
۱۳۳	علیہ السلام عشرہ کی تقریر نفیس	۱۱۰	کتاب الایمان
۱۳۵	قولہ انکم زادتمہ ایمانا	۱۱۰	ایمان کے تقویٰ معنی
۱۳۵	قولہ فاشترکم فزادتمہ ایمانا کا شان نزول	۱۱۰	ایمان بھی متعدی بنفسہ ہوتا ہے اور کبھی متعدی بحرف
۱۳۶	واقعہ حراء الاسد	۱۱۰	ایمان کی نقد تصدیق سے
۱۳۷	قولہ الحب فی الشد	۱۱۱	ایمان کے شرعی معنی
۱۳۷	ابن مبارک کی نظر میں امر معاویہ رضی اللہ عنہ کا وجہ	۱۱۱	علم، معرفت، یقین کا نام ایمان نہیں
۱۳۸	عمر بن عبد العزیز کا خط بنام عدی بن عدی اور اس میں	۱۱۲	سید جبرانی کا قول
	شرائع ایمان کا بیان	۱۱۳	ابوطالب کے دو شعر
۱۳۹	قولہ ولاکن لیطعن قلبی	۱۱۴	امام ابو صفیہ رحمۃ اللہ کا قول
۱۴۰	قولہ الیقین الایمان کلمہ سے بخاری کا استدلال	۱۱۴	الایمان موتہ و اقرب بالضروریۃ کے معنی
۱۴۰	قولہ الصبر نصف الایمان	۱۱۵	ایمان میں اتار دینی شرط - اس میں تین قول ہیں
۱۴۰	قولہ لا یبلغ العبد حقیقتہ العتقونی شرعاً اور منہج کی تفسیر	۱۱۵	اہل حق کے نزدیک اس میں تفصیل ہے
۱۴۲	نبی الاسلام علی محمد میں بارخ میں انحصار کیوں	۱۱۵	انہام کا قول
۱۴۲	ذکر صف لا الذل الا اللہ سے کلمہ شہادت نہیں	۱۱۵	اعمال جزو ایمان ہیں یا نہیں - اس میں چار مذہب ہو رہے ہیں
۱۴۲	صوم رمضان میں اربع سے توڑنے اور مسلم میں مقدم	۱۱۵	مقررہ جزیرہ - جمہور محدثین - امام اعظم اور جمہور متکلمین
۱۴۳	ازکان اربعہ کی حقیقت	۱۱۶	کیا ایمان میں زیادتی کی جاتی ہے
۱۴۴	مکین زکوۃ پر حساد	۱۱۷	ایمان کو مرکب کہنے والے تین اجزاء بتاتے ہیں - اعتقاد، قول، عمل
۱۴۵	شیخ اکبر اور مولانا محمد قاسم نانوتوی کی تحقیق کہ صوم حج ساقی ہو	۱۱۷	کلام میں ایک حقیقت ایمان میں عمل داخل ہے یا نہیں -
۱۴۵	کی شان محبوبیت کے منظر ہیں	۱۱۸	اسلام و ایمان میں ایسا ہی تعلق ہے جیسے روح و جسم میں
۱۴۶	اور صلوٰۃ و زکوٰۃ شان حکومت کے منظر ہیں	۱۱۹	عمل کے جزو ایمان ہونے پر اشکال
۱۴۸	باب امور الایمان	۱۲۰	اہم رازی کا قول
۱۴۸	ترتیب بخاری بہترین ترتیب	۱۲۰	امام ابن تیمیہ کا قول
۱۴۹	آیت لیس البر کی تفسیر	۱۲۰	امام ابو صفیہ کا قول کہ ایمان وہی ہے جو حدیث جبریل میں ہے
۱۴۹	بحث تحویل قبلہ	۱۲۱	اہل حق میں اختلاف انفس کا ہے
۱۵۰	ایک صورت ہے کہ ایک حقیقت ہے -	۱۲۱	حضرت شیخ احمد رضا کا محاکمہ
۱۵۱	حدیث سے بخاری کا استدلال اور ہمارا خواب	۱۲۲	امام اعظم کا قول لا ینزید ولا ینقص - بحث نفیس
۱۵۱	حدیث ابن عبد اللہ بن محمد جعفری	۱۲۴	امام اعظم کے مسلک کے آیات قرآنی کی تطبیق
۱۵۱	ایمان کے شعبے ستون اور ستون کی بحث	۱۲۵	ایمان منجی کی حقیقت شیخ اکبر کے نزدیک
۱۵۲	حضرت علامہ کی تطبیق	۱۲۶	کفر کی چار حدیں ہیں
۱۵۳	قولہ انکما شعبۃ من الایمان	۱۲۶	حدیث شاہ محمد اور صاحب کے نزدیک قاتل کی چار قسمیں ہیں
۱۵۳	جہاد کی قسمیں	۱۲۸	حضرت علامہ (مولانا عثمان) اور قاتل
۱۵۵	جہاد اور سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ	۱۲۹	قولہ نبی الاسلام علی محمد
۱۵۵	باب المسلم من سلم المسلمون	۱۳۰	علامہ مخنزی ہوں میں معتزلی اور فروع میں ضعیفی تھے
۱۵۵	مسلم سے کیا مراد ہے	۱۳۰	شاہ عبدالقادر نے فرمایا - ایمان کے بہت سے شعبے ہیں
۱۵۶	کافر سے کس قسم کا سلوک ہو	۱۳۱	واقعہ مدینہ
۱۵۷	قولہ والہما جرم منہما	۱۳۲	احرام کوئے زنیہم المؤمنین اہم سلمہ رضی اللہ عنہما کا مشورہ

صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین
۱۵۷	باب ۱۱ الاسلام الفضل	۱۵۷	قادیانی کا جواب
۱۵۸	اسلام کے مراتب متفاوت ہیں	۱۵۸	ایک لمحہ اعتراض حضرت قادیانی کا جواب
۱۵۹	باب ۱۲ اطعام الطعام من الاسلام	۱۵۹	باب ۱۱ من الدین الفرائض
۱۵۹	ایک ہی طرح کے سوال کے مختلف جوابات کی تحقیق	۱۶۰	حدیث کا
۱۶۰	جان و مال سے بڑھ کر مذہبی کی محبت	۱۶۰	الفرائض من الفتن کو کتاب الایمان میں کیوں لائے
۱۶۰	مومن کی محبت اور کافر کی محبت میں فرق	۱۶۱	رہسپاہیت کی تعلیم نہیں ہے
۱۶۲	مشک ماں باپ کے ساتھ مومن اور کافر کا سلوک	۱۶۱	باب ۱۲ قول ابنی سلی الشعلیہ وسلم نا علمک ما ناس
۱۶۲	اوپر کی دونوں حدیثوں کے متعلق علامہ عثمانی کا ارشاد	۱۶۱	ترجمے کے دو جزو ہیں
۱۶۳	باب ۱۳ من الایمان ان یحب لدینہ ما یحب لنفسه	۱۶۲	اس میں مرجع اور کراہیدہ کا رد ہے
۱۶۳	لا یومن احدکم کا مطلب	۱۶۲	مفسر زید ابن الکمال تابعی کا قول
۱۶۴	یحب لدینہ کے دو مطلب	۱۶۳	حدثنا محمد بن سلام
۱۶۵	جی سنی الشعلیہ وسلم کی تربیت کا ایک عمدہ نمونہ	۱۶۳	صحابہ اسوہ بننے والے تھے اسلئے انھیں کسی بھی تعلیم دی
۱۶۵	باب ۱۴ حب الرسول صلی اللہ علیہ وسلم من الایمان	۱۶۳	تین صحابہ نے صدیق رضی اللہ عنہما سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی
۱۶۵	محبت کے اقسام یہاں کوئی محبت مراد ہے	۱۶۳	عبارت دہاقت کی اس کی تفصیل
۱۶۶	عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ کی محبت	۱۶۴	ابن ابی علیہ السلام مزاج شناس ہوتے ہیں
۱۶۶	ایک انصاری صحابہ رضی اللہ عنہما کا واقعہ	۱۶۵	یہ معرفت مخصوص بالانبیاء ہے
۱۶۶	عبداللہ بن حذافہ سمی رضی اللہ عنہما کا واقعہ	۱۶۵	آپ جو مکہ سید الانبیاء ہیں اسلئے اعرف بھی ہوئے
۱۶۸	حدیثوں میں دہر تہر مراد نہیں جو علامہ بیضاوی نے بیان کیا ہے	۱۶۵	معرفت ایمان کا اعلیٰ مرتبہ ہے
۱۶۸	سیدنا رضی اللہ عنہما کا واقعہ (محبت کے بار میں)	۱۶۵	باب ۱۵ من کر ان یعرف فی الغفران
۱۶۹	حدیث پاک آیت قرآنی سے مقبول ہے	۱۶۶	قسطانی نے کہا دین کی مدد محبت کی نشانی ہے
۱۶۹	باب ۱۵ حلاۃ الایمان	۱۶۶	باب ۱۶ تفاضل اہل الایمان من الاعمال
۱۷۰	حلاوت کی نشانی یہاں کوئی قسم مراد ہے	۱۶۷	اہل ایمان عصا مومنین کی شفاعت کریں گے
۱۷۰	ابن ابی جرہ کا قول	۱۶۷	حدیث شفاعت نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام
۱۷۰	باب ۱۶ علامۃ الایمان حب الانفسار	۱۶۸	ترجمہ الباب میں اور حدیث میں مطابقت نہیں
۱۷۱	ہمارے کو توجہ دلانا مقصود ہے کہ انصار کا پورا خیال رکھنا	۱۶۸	ایک دوسرا اشکال پہلے سے اہم
۱۷۱	انصار کے اشارہ کا ذکر کرنا پناہ میں	۱۶۸	ایک روایت میں من ایمان دوسری میں من غیر
۱۷۲	باب ۱۷ عبادہ بن صامتؓ کا واقعہ یہاں سے تھے، پوری تھے	۱۶۹	مسئلہ کا حل
۱۷۲	قول بابونی، اس نے فرمایا	۱۶۹	ابو سعید خدریؓ کی روایت میں تین قسم کے لوگ
۱۷۲	حدیث پاک کی تشریح	۱۶۹	حدیث شفاعت نبویؐ کی تشریح
۱۷۳	غنی نزد غلم اور غنی نزد غلم کی مصلحت	۱۶۹	مکمل حدیث شفاعت از حسن بصری رحمہ اللہ
۱۷۳	بخاری بھی انفسد ترجمہ ترک کر دیتے ہیں	۱۷۰	رجوع الی حدیث بخاری
۱۷۳	اس موقع پر شاید بخاری مقتدر اور خواجہ کا ذکر ہونے میں	۱۷۰	نفس تصدیق من تفاوت ہواللہ الایمان غنی میں غفلت نہیں
۱۷۳	حدود زوار ہیں یا سوار	۱۷۰	حدثنا محمد بن عیسیٰ
۱۷۳	احناف کا مسلک - خوارج کا مسلک	۱۷۱	صدیق اکبرؓ اور عمر فاروقؓ کے درجہ کا فرق
۱۷۳	ایک اشکال اور اس کا جواب	۱۷۱	صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عمر فاروقؓ کو
۱۷۳	لفظ عقب سے حدیث میں کیا مراد ہے	۱۷۱	راہبہ بنی ہجاب صدیق اکبرؓ نے بھی دیا
۱۷۳	نفیس بحث بابت وضع حدود	۱۷۱	اصل نقشہ فتوحات کا صدیق اکبرؓ کا بنایا ہوا تھا
۱۷۳	حدیث دو چیزیں ہیں اور دونوں قابل لحاظ ہیں	۱۷۱	باب ۱۷ انیسار من الایمان
۱۷۳	سرتر میں قطع یرک مصلحت	۱۷۱	خام کہ ہے صحت اور عنایت سے

صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین
۲۱۶	شیخ کا استحسان اور صحیح جواب	۱۹۸	عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت جہا کے بار میں
۲۱۶	باب کفران البیشر و کفر دون لغیر	۱۹۹	راغب نے حیاء تعریف کی
۲۱۶	حدیث ۷۸۔ ام بخاری ترجمے میں دو لفظ لاتے	۲۰۰	باب فان تابوا و اقاموا الصلوٰۃ
۲۱۷	من لم یحکم ما نزل اللہ فانکستم الکافرون کا مطلب	۲۰۰	حدیث باب آیت قرآنی کے مطابق ہے
۲۱۸	باب المعاصی من امر ابیہا لیت۔ ائمہ ربیعہ کا موقف	۲۰۱	حدیث پر اشکال اور اس کا جواب
۲۱۹	واقعہ ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ	۲۰۱	تارک صلوٰۃ کا حکم
۲۱۹	شرک اور کفر میں لزوم ہے	۲۰۱	حدیث سے استدلال علی ائمتہ کی حیثیت
۲۱۹	یہود کا کفر و شرک	۲۰۳	شیخ الاسلام ابن قیم کی تحقیق
۲۱۹	یعقوب علیہ السلام کی کشتی اللہ تعالیٰ سے	۲۰۳	قتل مراد نہ ہونے کا قرینہ
۲۲۰	نصاری نے آدمی کو کھانا بنا کر دیا تو وہ نے خدا کو آدمی بنا دیا	۲۰۳	اجماع تارک نماز کے قتل نہ کرنے پر
۲۲۰	آریہ اور سناٹن جہم کا فرق	۲۰۳	امام نووی کے قول قتل تارک نماز کو رد کیا گیا ہے
۲۲۰	گردناک یا افریج کچھ شکر کے دربار میں	۲۰۴	نووی کا مقصد عین مطابق حدیث
۲۲۰	قول المعاصی من امر ابیہا لیت	۲۰۵	حقیقہ پر ایک اشکال اور اس کا جواب
۲۲۰	شیخ ابن قیم کا جواب جو عمدہ جواب ہے	۲۰۶	امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہما اللہ کا ایک منظر
۲۲۱	قولہ وان طاعتنا من المومنین اقبلوا	۲۰۶	باب من قال ان الایمان جو اعلیٰ
۲۲۱	حدیث ۲۹۔ اصحف بن قیس کا قول	۲۰۶	ایمان عمل سے کیا مراد ہے
۲۲۲	حدیث کا مطلب	۲۰۶	نفس معرفت ایمان نہیں
۲۲۲	واقعہ خلافت ہارون علیہ السلام	۲۰۶	ام بخاری نے عن مراد لی ہے
۲۲۳	مشاہیر صحابہ کو شجرہ مولیٰ ذراؤں کی طرح سمجھو	۲۰۷	حقیقہ عمل سے عمل قلب مراد لیتے ہیں
۲۲۴	واقعہ صل اور اہل حق کا مسلک	۲۰۸	قولہ مثل ذہا فلیعلیٰ العالون
۲۲۵	حدیث ۳۰۔ قولہ عن المودود	۲۰۸	حدیث ای اعلیٰ انفصل
۲۲۶	ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کا اپنے غلام کے ساتھ معاملہ	۲۰۹	راج مقبول کی علامات
۲۲۷	غلام کو اسلام نے کس بلند مرتبہ پر پہنچا دیا	۲۰۹	باب اذا لم یکن الاسلام علی تحقیقہ
۲۲۷	باب غلام دون مسلم	۲۰۹	ایمان اور اسلام میں فرق
۲۲۸	حدیث ۳۱۔ دو صحابہ کی یہ اصطلاح ہے کہ صرف عبداللہ	۲۱۰	ایمان کی طرح اسلام کے بھی مراتب ہیں
۲۲۸	پولیس کو عبداللہ بن مسعود مراد ہوں	۲۱۰	حدیث رہط بن سے دس ہنگ کی جماعت
۲۲۸	آیت کریمہ استوا ولم یبوس ایسا نعم نظم	۲۱۱	سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ رشتے میں نبی صلی اللہ علیہ
۲۲۹	آیت کریمہ کی شرح از حضرت علامہ	۲۱۱	و سلم کے ماموں تھے
۲۲۹	مقررہ کا قول اور اس کا جواب	۲۱۲	حضرت سعد کی درخواست پر آپ کا جواب
۲۳۱	باب علامۃ المنافق	۲۱۲	کسی کے باطن پر قطعی حکم لگانے کا حق نہیں
۲۳۲	حدیث ۳۲۔ غرض امام بخاری علامۃ نفاق تین ہیں	۲۱۲	نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب کو دیتے ہیں صلوات سے دیتے ہیں
۲۳۳	حدیث ۳۳۔ حدیث تفسیرہ الخ	۲۱۳	لا یج دیکر ایمان کی طرف نہ بلانا چاہیے
۲۳۳	ان ملائمتوں کے کیا نامے تھے کیا وہ اسلام سے خارج ہو چکے	۲۱۳	فتہار کا قول کہ اب مؤلفۃ القلوب کی کوئی مد نہیں
۲۳۳	حدیث کی تحقیق و تشریح	۲۱۳	باب انتشار الاسلام من الاسلام
۲۳۴	وعدہ اور معاہدہ میں فرق	۲۱۴	حدیث ۲۴۔ حدیث تفسیرہ الخ
۲۳۵	باب قیام لیلۃ القدر من الایمان	۲۱۴	قولہ ان النفاق من الاقتار۔ وقال عمار رضی اللہ عنہ
۲۳۵	حدیث ۳۴۔ حدیث البواہیمان	۲۱۵	پچھلی صدی کے ایک بزرگ عبدالعزیز دہراغ
۲۳۵	کفار کے اعمال بیکار ہیں۔ قرآن کی دو سیس	۲۱۵	آیت حدیث میں فرق کا عجیب طریقہ
۲۳۶	ایمان کی شرط کیسا تھ احتساب کی شرط	۲۱۵	حضور اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی چال کی نقل و کھانی تو لوگ تاب نہ لاسکے

صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین
۲۵۷	کافر مسلمان پر حملے کو زیادہ کفر کے حسرات شمار ہوں گے	۲۳۷	باب ۱۰۔ الجہاد من الایمان
۲۵۹	حدیث اخذ بادل و آخرہ کا مطلب	۲۳۷	حدیث ۳۵۔ حدیث حرمی بن حفص
۲۶۰	حدیث ۴۱۔ حدیث محمد بن المنہال - شرح حدیث	۲۳۸	روح جہاد ایمان یا شہادہ و تصدیق بالرسول ہے
۲۶۰	قرآن علیکم بما تعقیقون	۲۳۸	قولہ لودت ان اتل فی سبیل اللہ
۱۹۱	باب ۱۱۔ زیادۃ الایمان و نقصانہ	۲۳۹	باب ۱۱۔ تطوع قیام رمضان
۲۶۳	امام بخاری رحمہ اللہ ناقص بولتے ہیں مگر غیر کامل کتابوں	۲۳۹	حدیث ۳۶۔ قولہ من قام الخ
۲۶۱	شرح حدیث ۴۲۔ حدیث اسلم بن ابراہیم	۲۳۹	قیام میل میں تراویح بھی شامل ہے
۲۶۲	حدیث ۴۳۔ حدیث الحسن العسکری - شرح حدیث	۲۴۰	باب ۱۲۔ صوم رمضان حسبما بان الایمان
۲۶۲	باب ۱۲۔ الزکوۃ من الاسلام	۲۴۰	حدیث ۳۷۔ حدیث ابن سلم
۲۶۲	حدیث ۴۴۔ حدیث اسمعیل	۲۴۰	قولہ یا باغی الخیر اقبل الخ
۲۶۵	شرح حدیث۔ قولہ لا ان تطوع	۲۴۱	قولہ رقم الف رجل و قل علیہ رمضان الخ
۲۶۵	امام شافعی رحمہ اللہ کتاب الامم میں کچھ فقرات من الصلوۃ خمس واسوا	۲۴۱	جبریل علیہ السلام کی مدعا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آیت
۲۶۵	تطوع۔ حقیقہ کا جواب	۲۴۱	باب ۱۳۔ الدین یسر
۲۶۶	امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا کمال تفقہ۔ ایک مکالمہ	۲۴۲	حدیث۔ احب الدین الی اللہ
۲۶۷	باب ۱۳۔ حدیث ۴۵۔ حدیث احمد بن عبد اللہ	۲۴۲	ابراہیم علیہ السلام کو حقیقت کہا
۲۶۷	حلف غیر الشری کی ممانعت کیوں (ذرقانی)	۲۴۳	آگ میں ڈالنے کا واقعہ
۲۶۲	باب ۱۴۔ خوف المؤمن۔ حدیث ۴۶۔ شرح حدیث	۲۴۳	فرمان الدین عطار کی کتاب منطلق الطیر کے چند اشعار
۲۶۵	سینک محفل علی ہیں یا نہیں	۲۴۳	قرآن میں سرفراہی علیہ السلام کو حقیقت کہا گیا
۲۶۵	امام بخاری رحمہ اللہ کی تردید کہ ہے ہیں	۲۴۴	حدیث ۳۸۔ حدیث عبد السلام بن مطہر
۲۶۷	اختلاف امام کا حلیہ حدیث میں عمدہ نمونہ	۲۴۵	قولہ لن یشاء الدین احمد علیہ
۲۶۷	ایمانی کامیابان جبریل کی بحث	۲۴۵	شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کا قول مجتہد اللہ ابا لعلہ میں
۲۶۷	حدیث محمد بن عمر	۲۴۵	تقلیل عبادت کا حکم بحکم عبادت کیلئے ہے
۲۶۷	انا مؤمن انشاء اللہ کہے یا نہیں	۲۴۶	امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ باقی میں ان کی عبادت
۲۶۷	صحابہ کرام رحمہ اللہ غفاتی سے بچد ڈرتے تھے	۲۴۶	قولہ واستعینوا بالغدۃ والروحۃ
۲۶۷	امت کے گمراہ فرستے	۲۴۶	باب ۱۴۔ الصلوۃ من الایمان
۲۶۷	حدیث ۴۷۔ حدیث قتیبہ بن سعید	۲۴۷	حدیث ۳۹۔ حدیث محمد بن خالد۔ قولہ قبل کس نماز میں ہوئی
۲۶۷	غیبتہ الطالبین کے بارے میں ذہبی کی تصریح	۲۴۷	حدیث کی شدت
۲۶۷	شرح حدیث	۲۵۰	قولہ انکان اللہ یضیع ایسا حکم
۲۶۸	باب ۱۵۔ سوال جبریل النبی صلی اللہ علیہ وسلم حافظان	۲۵۱	برابرین مع درستی یا غلطی کی حیثیت کہ کچھ کہیں اور کفر کا
۲۶۹	نصراحت کی پیکرہ آخر کا واقعہ ہے	۲۵۲	صحابہ کے حالات میں تین کتابیں - حکم نماز کے بعد صحت کی
۲۸۰	حاضرین میں سے کسی نے جبریل علیہ السلام کو نہیں پہچانا	۲۵۲	تینوں سے پہلے اپنے طور سے کوئی کی طرف منہ کرتے تھے
۲۸۰	حدیث ۴۸۔ حدیث اسلمد - شرح حدیث	۲۵۵	باب ۱۵۔ حسن اسلام المرء
۲۸۱	اسلام۔ ایمان۔ احسان۔ کاسر تسبہ	۲۵۵	قال ہاک الخیر بن زید بن اظم - شرح حدیث
۲۸۲	حدیث میں کل دن کا خلاصہ بیان فرمادیا	۲۵۶	حدیث پاک میں بہت بڑی بشارت ہے
۲۸۰	جملہ سورہ فاتحہ اللہ کا کلام علیہ علیہ حدیث ام السنہ ہے	۲۵۷	حدیث ۴۰۔ حدیث ابن جابر بن منصور
۲۸۵	ایمان مثل روح کے اندر اسلام مثل بدن کے ہے	۲۵۷	کافر کے عذاب میں تخفیف کی بحث
۲۸۶	حافظ بن ربیع صلی لے کا ادا اجتماعاً تفرقاً و ادا تفرقاً	۲۵۷	امام بخاری رحمہ اللہ نے حدیث میں یہ جملہ چھوڑ دیا ہے
۲۸۷	امام ذہبی کی تفسیر راجح ہے	۲۵۷	دار طینی یہ روایت کو نظر سے لائے ہیں اور سب میں
۲۸۸	دریاد میں کس کے دیکھنے کو دخل ہے۔	۲۵۷	یہ اضافہ نقل کیا ہے۔

صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین
۳۱۱	کتاب العلم	۲۸۸	متی السائدہ کا سوال نظر غیر موطوع معلوم ہوتا ہے
۳۱۱	باب فی فضل العلم	۲۸۸	حضرت مولانا ابونوری رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب کے دوسرے میں
۳۱۱	امام بخاری نے دو کتابوں سے فضل علم بیان کیا	۲۸۹	محدثین کی پیشین گوئی کا اتم تمام دنیا کا مذہب اسلام ہو گا
۳۱۳	باب فی من نزل علما و دہش عقل فی حدیثہ	۲۹۰	قول اذا ولدت الامم رتہا
۳۱۳	حدیث ۵۰۔ حدیثنا محمد بن سنان - شرح حدیث	۲۹۰	مکسبرہ نعمان بن المنذر کی لڑائی کے دو شعر
۳۱۴	باب فی من رفع صوتہ بالعلم	۲۹۰	قول اذا لکادل رعاة الابل ابہم
۳۱۶	روافضی بیرونی پر مسیح کے قاتل ہیں	۲۹۱	مسند علی غیب کی حقیقت
۳۱۶	باب فی قول المحدث حدیثنا ابو	۲۹۳	کشف میں کلفی کا احتمال میں ہے
۳۱۶	امام بخاری نے امام مسلمین لفظ حدیثنا بخیر کے اعتبار کر نہیں لیا	۲۹۴	باب ۶۔ حدیث ۹۹۔ حدیثنا ابو نعیم بن حمزہ
۳۱۶	حافظ بن حجر کا فیصلہ نہایت مناسب ہے	۲۹۴	حدیث کی شرح
۳۱۸	توران من الشجرة شجرة لا یسقط ورتہا قال عبداللہ	۲۹۴	باب فی فضل من استبرأ الذینہ
۳۱۸	قول فی نفسی انما الخلفہ فاستحییت	۲۹۵	حدیث ۵۰۔ حدیثنا ابو نعیم ابو۔ قول احوام میں ابو
۳۱۹	وجہ مشابہت مسلم	۲۹۵	کلام علامہ شبر کے مصداق کے بارے میں
۳۱۹	باب فی طرح الامام المسئلہ	۲۹۶	کبھی تحقیق مناسط میں اختلاف ہو جاتا ہے
۳۱۹	حدیث ۶۰۔ حدیثنا خالد بن محمد	۲۹۶	ابن المنیر کے شیخ کا قول - شرح حدیث
۳۲۱	باب فی القراءۃ والعرض علی المحدث	۲۹۸	نفس و دروس کے متعلق علامہ ابن قیم کی ایک مفید بحث
۳۲۱	امام مالک نے امام محمد کو بائع سوا حادیث سنائی	۲۹۸	حکمانے دلع کے سسے کئے
۳۲۱	قول اکثرہم ان فی فضل المسلمۃ	۲۹۹	امام شافعی نے فرمایا قلب محل عقل ہے
۳۲۱	قول بالسنک	۳۰۰	شاہ صاحب فرماتے ہیں اصل منبع قلب ہے
۳۲۲	حدیث ۹۱۔ حدیثنا محمد بن سلام	۳۰۰	باب فی ادارۃ النفس من الایمان
۳۲۲	قول و یقر علی المقبری	۳۰۰	حدیث ۵۱۔ حدیث علی بن ابی جعد
۳۲۲	حدیث ۹۲۔ حدیثنا عبداللہ بن یوسف	۳۰۰	شرح حدیث۔ و ذہب عبدالقیس
۳۲۲	قول فاما فی المسجد	۳۰۱	ربیع۔ مہر۔ الامار۔ بار۔ چار بھائی تھے
۳۲۵	قول ثم قال عنام بن قلیب	۳۰۲	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مہر کی اولاد میں تھے
۳۲۵	قول فلا تجعل علی فی نفسک	۳۰۳	قول وان تقطامن الفم فی النفس
۳۲۷	حدیث ۹۳۔ حدیثنا موسیٰ بن سلیمان	۳۰۴	قول و نہایت عن ادب
۳۲۷	قول اخو بنی سعد	۳۰۵	حدیث ۵۲۔ حدیثنا عبداللہ بن مسلمہ
۳۲۷	قول زینبنا۔ سیبویہ بہت مجرم کو نکال کر تمام مقام کیا ہے	۳۰۵	باب فی اجار ان الاعمال بالینۃ و المحبۃ
۳۲۸	باب فی ما یکرہ فی المنازلۃ	۳۰۶	حدیث ۵۳۔ حدیثنا حماد بن منہال - شرح حدیث
۳۲۸	قول نسخ عثمان المصاحف	۳۰۶	قول فی لحد قس
۳۲۸	قول لا میر السریۃ	۳۰۶	حدیث ۵۴۔ حدیثنا حکم بن نافع
۳۲۹	حدیث ۹۴۔ حدیثنا اسمعیل بن عبداللہ	۳۰۷	الاشباہ والنظائر میں موطوع کی اپر کو کہاں نیت ضروری ہے
۳۲۹	حدیث ۹۵۔ حدیثنا محمد بن مقفل	۳۰۷	حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو تسلی کہ ابھی تم نہیں مرو گے
۳۲۹	قول فذہب علیہم	۳۰۷	باب فی قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم الدین النصیحة
۳۳۰	باب فی من قعد حدیث یتقی بالمجلس	۳۰۷	حدیث ۵۵۔ حدیثنا سعد۔ شرح حدیث۔ نصیحت کے مراتب
۳۳۲	حدیث ۹۶۔ حدیثنا اسمعیل۔ قول الامام	۳۰۸	قول ولا تمسکوا بالمسلمین
۳۳۲	باب فی قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم رب کل اوطی من سائت	۳۰۹	حدیث ۵۶۔ حدیثنا ابو نعیم۔ شرح حدیث
۳۳۲	حدیث ۹۷۔ حدیثنا سعد	۳۰۹	مقبول شہر فی الشریعہ پر لے کر صحابی ہیں
۳۳۳	قول بنظر ام المومنین	۳۰۹	جبر بن عبداللہ کا لقب یوسف ابہ الامتہ ہے

صفحہ نمبر	مضامین	صفحہ نمبر	مضامین
۳۵۲	حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے روایت	۳۳۳	باب ۱۰ العلم قبل القول والعمل - شرح حدیث
۳۵۳	باب ۱۱ قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم ائکم علی کتاب	۳۳۴	علماء امتی کا کیا رہنما بنی اسرائیل ثابت نہیں
۳۵۳	حدیث ۷۵ - حدیث ابو معمر الو - شرح حدیث	۳۳۵	قول من سلک طریقاً یطلب بہ علی
۳۵۳	فقتضانی کہ امامدار ابن عباس پر	۳۳۶	شہداء کا قانون اور کتابت کی سیاہی یکساں نہیں
۳۵۳	باب ۱۲ مثنی - یصح سماع الصغیر	۳۳۶	ابن عبد البر نے ابن دیر کے چند شعر نقل کئے ہیں
۳۵۳	حدیث ۷۶ - حدیث اسمعیل	۳۳۷	قول یفقد فی الرحمن
۳۵۲	قول قدنا ہرت	۳۳۷	سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ کو ایک
۳۵۵	نماز میں سترہ ضروری ہے یا نہیں	۳۳۸	خاص مسئلے میں فتویٰ دینے سے روکا تھا۔
۳۵۵	حدیث ۷۷ - حدیث محمد بن یوسف	۳۳۸	قول کوثر ابانین - حکمت ایک نور نصیرت ہے
۳۵۵	قول وانا ابن خمس سنین	۳۴۰	باب ۱۳ ما کان البیضی اللہ علیہ وسلم کان یقولم بالموعظۃ
۳۵۵	کس کے کچھ یاد رکھ سکتا ہے اور اس کا کچھ معیار ہے یا نہیں	۳۴۰	حدیث ۷۸ - حدیث محمد بن یوسف
۳۵۶	حدیث ۷۸ - حدیث ابو القاسم	۳۴۰	شرح حدیث اور ترجمہ سے ربط
۳۵۶	فی التجر کی قید حدیث میں کیوں لگائی	۳۴۰	حدیث ۷۹ - حدیث محمد بن بشار - شرح حدیث
۳۵۶	حجرت جابر رضی اللہ عنہ کا حدیث سننے کیلئے سڑوں سفر	۳۴۱	حضرت گنگو بی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ
۳۵۸	میر سید شریف جرمائی کا سفر	۳۴۱	نوحہ کے باریس ام عطیہ کی سرگزشت
۳۵۹	میر سید شریف اور علامہ تقی زانی کا مناظرہ	۳۴۲	باب ۱۴ من جعل لابی العلم
۳۵۹	باب ۱۵ فضل من علم وعلم	۳۴۲	حدیث ۸۰ - حدیث عثمان بن ابی شیبہ
۳۵۹	حدیث ۷۹ - حدیث محمد بن العلاء	۳۴۳	دعوت کی حقیقت
۳۶۰	ترجمہ و حدیث کا ربط	۳۴۳	طلب العلم و فیض علی علیہ السلام کی شرح
۳۶۰	زین کی تین قسمیں	۳۴۴	باب ۱۵ من یراد فی خیر یفقد فی الرحمن
۳۶۰	مشید اور مشبہ میں انطباق	۳۴۴	حدیث ۸۱ - حدیث اسمعیل بن عقیل
۳۶۱	باب ۱۶ ریع العلم وظہود الجمل	۳۴۴	قول انا انما فاسم وانش یعط
۳۶۱	رفع علم علامت قیامت ہے	۳۴۵	مطلب قول من ترال ہذا الامۃ قائمۃ علی امر اللہ الخ
۳۶۲	قول ریعۃ الراۃ	۳۴۵	کون سا گروہ مراد ہے
۳۶۲	حدیث ۸۰ - حدیث عمران بن ہبیر	۳۴۵	باب ۱۶ العلم فی العلم
۳۶۳	حدیث ۸۱ - حدیث مسدد - شرح حدیث	۳۴۵	حدیث ۸۲ - حدیث علی بن عبد اللہ
۳۶۲	قول النعم	۳۴۶	بڑوں کا ادب
۳۶۳	باب ۱۷ فضل العلم	۳۴۶	باب ۱۷ الاغتباط فی العلم
۳۶۴	بظاہر بخرا معلوم ہوتا ہے کہ بخاری کی نظر بہت دقیق ہے	۳۴۶	حدیث ۸۳ - حدیث اسمعیل بن عقیل - شرح حدیث
۳۶۴	حدیث ۸۲ - حدیث اسمعیل بن عقیل - شرح حدیث	۳۴۶	عجلہ کی حیثیت شرع کی نگاہ میں
۳۶۵	قول ثم اعطیت فضل	۳۴۶	قول تعقوا قبل ان ینسودوا
۳۶۵	سیدنا عمر رضی اللہ عنہ محدث ہیں - محدث کی تعریف	۳۴۸	قول علی بن ابی طالب
۳۶۵	باب ۱۸ الفقیہاء ہووا آقف علی الدرایۃ	۳۴۸	قول لاصد الہ فی الاثنین
۳۶۵	حدیث ۸۳ - حدیث اسمعیل بن عقیل	۳۴۸	باب ۱۹ ما ذکر فی دہاب موسیٰ علیہ السلام
۳۶۶	طالب علمی کا ایک واقعہ	۳۴۸	حدیث ۸۴ - حدیث محمد بن عمر بن الو
۳۶۶	شرح حدیث		ترجمہ میں کیا بیان ہے
۳۶۶	باب ۱۹ من اجل الفقیہاء بشاۃ البید	۳۴۹	قول قتادہ بن یحییٰ و ابو ارحم بن قیس
۳۶۶	حدیث ۸۴ - حدیث موسیٰ بن اسمعیل		بحث یہ کہ موسیٰ علیہ السلام جسکے پاس وہ حضرت یحییٰ کوئی اور
۳۶۸	حدیث ۸۵ - حدیث اسمعیل	۳۵۰	موسیٰ علیہ السلام کا سفر حضرت کے ساتھ

صفحہ نمبر	مضامین	صفحہ نمبر	مضامین
۳۸۵	باب ۱۱ تعلیم الرجال امیر دہلی	۳۶۸	حدیث ۸۶ - حدیث موسیٰ بن سلیمان
۳۸۵	حدیث ۹۶ - حدیث محمد بن ابی سلمہ	۳۶۹	قولہ ایت عاتشہ رضی اللہ عنہا
۳۸۶	قولہ تفسیرہ لم اجسران -	۳۶۹	قولہ السب علی راسی
۳۸۶	قولہ اعطینا کما	۳۶۹	جنت و ذر جہاں میں کا جواب
۳۸۶	تلاوتہ لم اجران پر اشکال و جواب	۳۷۰	قولہ ہذا رجل - قولہ ثم صلیت
۳۸۶	فتح الباری میں بیس نظائر	۳۷۰	کافری بھی سوال ہوگا
۳۸۶	اہل کتاب سے کون مراد ہیں	۳۷۱	باب ۱۲ توفیق النبی صلی اللہ علیہ وسلم و دفعہ القیس
۳۸۸	جواب میں پہلے حافظ کا کلام سنو	۳۷۱	حدیث ۸۷ - حدیث محمد بن بشار - شرح حدیث
۳۸۸	بیضیہ باتیں (۱) انبیاء علیہم السلام باسنتہا بعض باتیں تو مکمل	۳۷۲	قولہ کنت یحییٰ عن النبی
۳۸۹	مبعوث ہوتے (۲) جس قوم میں جو نبی آیا اس قوم میں نبی پر ایمان لانا لازم ہے	۳۷۳	باب ۱۳ الرجل فی المسد النازلہ
۳۸۹	تعلی الدین نے لکھا کہ توحید کا دعوت عام ہے - یعنی طرفہ بی مبعوث	۳۷۳	حدیث ۸۸ - حدیث محمد بن مقاتل
"	نہیں ہوئے ان کو دعوت پہنچے تو توحید کا قبول کرنا لازم ہے	۳۷۳	قولہ عقبین ہمارا - شرح حدیث
۳۹۰	اہل تصدیق یا علیہ السلام کہے جو سیدنا یوسف علیہ السلام کی اولاد میں ہیں	۳۷۴	تہامہ رضی اللہ عنہ شہادت میں اللہ کا اختلاف
	و فارا تو فانی لکھا ہے کہ مدثر نورہ میں ایک چتر پایا گیا جس میں لکھا تھا	۳۷۵	تصاویر و ریات کے مراتب
	انار رسول رسول اللہ صلی	۳۷۵	منصب نصار اور منصب افترا کا فرق
	ان تقریروں سے تشفی نہیں ہوئی	۳۷۶	باب ۱۴ التناوب فی العلم
۳۹۱	تشفی بخش تقریر - مقدمہ	۳۷۶	حدیث ۸۹ - حدیث ابو الیمان
۳۹۲	حدیث میں تین چیزیں بتائی گئیں	۳۷۶	تناوب کا مطلب - شرح حدیث
۳۹۲	قولہ کاراک بدتہ	۳۷۶	قولہ بزمیہ بن زہد - یہ واقعہ ایسا کہ ہے
۳۹۳	ایمان بانی الہی پر دوا رہیں	۳۷۷	قولہ اہل القسانی
۳۹۴	فتح الکر کا محقق دار شاد قال لا جہ ہے	۳۷۷	حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اپنی بیٹی سے خطاب
۳۹۶	باب ۱۵ غفۃ النساء و تعلیمہن	۳۷۸	باب ۱۵ الغضب فی الوعظۃ
۳۹۶	حدیث ۹۰ - حدیث سلیمان بن حرب - شرح حدیث	۳۷۸	حدیث ۹۰ - حدیث محمد بن کثیر - شرح حدیث
۳۹۶	باب ۱۶ الحصر علی الحدیث	۳۷۸	غصہ حفظ نفس سے نہیں بچتا
۳۹۷	حدیث ۹۱ - حدیث عبد العزیز - شرح حدیث	۳۷۹	قولہ الخفق
۳۹۸	قولہ من قال لا الہ الا اللہ	۳۸۰	حدیث ۹۱ - حدیث عبد الرحمن بن محمد - شرح حدیث
۳۹۸	شفاعت کی نہیں	۳۸۰	قولہ سالہ رجل اللقطہ
۳۹۸	باب ۱۷ کیف یقیم العلم	۳۸۰	قولہ فضالہ الابل - قولہ فضالہ الغنم
۳۹۸	علم کے اٹھانے جانے کی صورتیں	۳۸۱	حدیث ۹۲ - حدیث محمد بن العسار
۳۹۹	قولہ فانی حضرت دروس العلم	۳۸۱	قولہ سن عن اشیار
۳۹۹	حدیث ۹۹ - حدیث العلاء بن عبد الجبار	۳۸۲	قولہ سلونی عما شتمتم
۳۹۹	حدیث ۱۰۰ - حدیث اسمعیل بن اویس	۳۸۲	باب ۱۸ من یرک علی رکبتہ
۳۹۹	عمر بن عبد العزیز اور عبد الملک - تالی الفربری	۳۸۲	حدیث ۹۳ - حدیث ابو الیمان
۴۰۰	باب ۱۸ یصل للنساء یوما	۳۸۳	قولہ رضینا بالشر ربنا الخ
۴۰۰	حدیث ۱۰۱ - حدیث آدم - قولہ و عشرین	۳۸۳	باب ۱۹ من اعاد الحدیث ثلاث لیفہم
۴۰۱	حدیث ۱۰۲ - حدیث محمد بن بشار - شرح حدیث	۳۸۴	حدیث ۹۴ - حدیث اعمدة - شرح حدیث
۴۰۲	باب ۱۹ من سمع شیئا فلم یفہمہ	۳۸۴	حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تین سلام کا مطلب
۴۰۲	حدیث ۱۰۳ - حدیث سعید بن ابی مریم	۳۸۴	حدیث ۹۵ - حدیث مسدود
۴۰۳	قولہ من جو سب فقد عذب	۳۸۵	حدیث کی تکرار کیوں

صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین
۴۱۲	ابن تیمیہ کا قول اس میں معتبر نہیں	۴۰۳	باب ۱۰۱۲ یسلف العلم الشاہ العالی
۴۱۲	علامہ آئینی نے روح المعانی میں لکھا ہے کہ رویت	۴۰۳	حدیث ۱۰۲۲ - حدیث عبداللہ بن یوسف
۴۱۳	یقظہ میں بھی ہو سکتی ہے	۴۰۴	حضرت نسیم اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما کا
۴۱۳	باب ۱۰۱۳ کتابتہ علیہ	۴۰۴	یزید کی بیعت سے انکار
۴۱۳	سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے -	۴۰۵	حدیث ۱۰۱۵ - حدیث عبداللہ بن عبد الوہاب
۴۱۳	نوشتہ کی حقیقت	۴۰۵	قولہ لا یصلحہ عاصبت
۴۱۳	حدیث ۱۱۱ - حدیث محمد بن سلام	۴۰۶	باب ۱۰۱۴ - ائمہ من کرب علی العنصری صلی اللہ علیہ وسلم
۴۱۳	شرح حدیث	۴۰۶	قولہ من کرب علی یسلف النار
۴۱۳	قولہ لا یقتل مسلم بکافر	۴۰۶	امام ابوحنیفہ کے قول اور ابن عمر کے قول کا فرق دیا
۴۱۳	ائمہ اربعہ کا مسلک	۴۰۶	جھوٹے کہا کہ ان سے ہو گا مگر اسد کبیرہ کا
۴۱۳	حدیث ۱۱۲ - حدیث ابو نعیم	۴۰۶	مکتب ہے
۴۱۳	صلح حدیبیہ میں قیدیہ خزانہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم	۴۰۶	موقوفہ ہے بہت تساہل سے کام لیا
۴۱۳	کا حلیف تھا	۴۰۶	حدیث ۱۰۱۶ - حدیث علی بن ابی جعد
۴۱۳	بخزانہ کی آمد کی اطلاع آپ نے دی آنے	۴۰۶	حدیث کی شرح
۴۱۳	سے پہلے	۴۰۶	حدیث ۱۰۱۷ - حدیث ابو الولید
۴۱۳	قولہ لا یصلحہ شیء	۴۰۶	مستخرج حدیث
۴۱۳	قولہ لا تنقطع ساقطہ الامتداد	۴۰۶	حدیث ۱۰۱۸ - حدیث ابو معمر
۴۱۳	قولہ لا یکتولانی فلال	۴۰۶	قال انس رضی اللہ عنہ
۴۱۳	کتابت کا مسئلہ معلوم ہو گیا اور یہی ترجمہ تھا	۴۰۶	حدیث ۱۰۱۹ - حدیث المنی
۴۱۳	حدیث ۱۱۳ - حدیث علی بن عبد اللہ	۴۰۶	حدیث ۱۱۰ - حدیث موسیٰ بن
۴۱۳	قولہ تابعہ معمر	۴۰۶	قولہ لا یکنون بکینتی
۴۱۳	حدیث ۱۱۴ - حدیث یحییٰ بن سلیمان	۴۰۶	قولہ من رأی فی المم فقد رأی
۴۱۳	قولہ اتونی بکتاب	۴۰۶	اختلاف علماء اس مسئلے میں
۴۱۳	شرح حدیث	۴۰۶	من رأی فقد رأی الحق کی تشریح
۴۱۳	ردائے فی کتب وچند	۴۱۰	ایک اہم سوال
۴۱۳	واقعہ کی حقیقت	۴۱۰	کس صورت میں رحمت معتبر ہو گا
۴۱۳	مسلم شریف میں حدیث ہے کہ آپ نے صدیق عالت	۴۱۰	قاضی عیاض، شاہ عبد العزیز - شاہ رفیع الدین
۴۱۳	سے فرمایا تھا مجھے کے لئے	۴۱۰	ماری مالکی شاعر مسلم کے اقوال
۴۱۳	باب ۱۰۱۵ العلم والعلمۃ باللیل	۴۱۰	مولانا عبد العلی صاحب کا خواب اور مولانا
۴۱۳	حدیث ۱۱۵ - حدیث صدقہ	۴۱۰	گوگنوی کی تعبیر
۴۱۳	قولہ ما ازل اللیلۃ	۴۱۰	حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے خواب میں مناجات نہیں
۴۱۳	قولہ ما افرح من الخوان	۴۱۱	فتح المغیث میں سخاوت کی تعبیر بہت عمدہ ہے
۴۱۳	قولہ فزت کاسیۃ الخ	۴۱۱	امام المعبرین محمد بن سیرین کا قول
۴۱۳	باب ۱۰۱۶ اسیر علیہ	۴۱۱	امام غزالی اور علامہ سیوطی کی رائے
۴۱۳	حدیث ۱۱۶ - حدیث سعید بن غفیر	۴۱۱	مولانا فضل حق خیر آبادی کا خواب اور شاہ
۴۱۳	شرح حدیث	۴۱۱	ولی اللہ رحمہ اللہ کی تعبیر
۴۱۳	خضر خضر زندہ ہیں یا نہیں	۴۱۱	ہدیت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم بلی ہو تو کوئی حکمت
۴۲۰	حدیث ۱۱۷ - حدیث آدم	۴۱۲	ہوتی ہے -
۴۲۰	شرح حدیث	۴۱۲	ابن ابی حرقہ فرماتے ہیں یقظہ میں بھی گریختہ ہو سکتی ہے کہ دیکھے گا

صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین
۲۱۹	حدیث ۱۲۵۔ حدیث ابو نعیم	۲۱۹	قول فصلی الرابع
۲۲۰	باب قول اللہ و ما اوتیتہم من العلم الا تنسیلا	۲۲۰	قول فقدت من اہل ساعۃ ثم ہام
۲۲۰	حدیث ۱۲۶۔ حدیث قلیس بن حصص	۲۲۰	اس سے ترجمہ نکل آیا
۲۲۱	قول تل الدوح من امر ربی	۲۲۱	باب حفظ العلم
۲۲۱	حدیث ۱۲۷۔ حدیث عبد اللہ بن مسعود	۲۲۱	حدیث ۱۱۸۔ حدیث عبد العزیز بن عبد اللہ
۲۲۱	باب ترک بعض الاختیار	۲۲۱	قول ان الناس یقولون
۲۲۲	باب کا تعلق کتاب العلم سے	۲۲۲	حدیث ۱۱۹۔ حدیث ابو مصعب
۲۲۲	نقطہ ابن الزبیر	۲۲۲	حدیث ۱۲۰۔ حدیث ابراہیم بن المسدد
۲۲۳	باب من خص بالعلم قرآ	۲۲۳	حدیث ۱۲۱۔ حدیث اسفیل
۲۲۳	حدیث ۱۲۸۔ حدیث اسحق بن ابراہیم	۲۲۳	قول تحفظت و عاتین
۲۲۳	قول ان تجوز ان یکذب	۲۲۳	قول قطع فی العلوم
۲۲۳	امام مالک کی روایت روایت حدیث کے بارے میں	۲۲۳	باب انصاف للعار
۲۲۳	حدیث ۱۲۹۔ حدیث مسدد	۲۲۳	حدیث ۱۲۲۔ حدیث عجاج
۲۲۳	شرح حدیث	۲۲۳	قول لا تزجوا بعدی لغار
۲۲۳	قول اذا تکلموا	۲۲۳	شرح حدیث
۲۲۳	قول من قال لا الہ الا اللہ الخ	۲۲۳	باب ما یستحب للعالِم
۲۲۳	قول من ادعی غیرہ الخ	۲۲۳	حدیث ۱۲۳۔ حدیث عبد اللہ بن محمد
۲۲۳	باب اجماع فی العلم	۲۲۳	قول المسندی
۲۲۳	حدیث ۱۳۰۔ حدیث مسدد	۲۲۳	قول نوفا البکالی
۲۲۳	شرح حدیث	۲۲۳	قول کذب عدو اللہ
۲۲۳	حدیث ۱۳۱۔ حدیث اسفیل	۲۲۳	قول یحییٰ بن محمد بن شاہ اور صاحب رد المحتار کا قول
۲۲۳	قول مستحکم الخ	۲۲۳	قول ہوا علم منک
۲۲۳	باب من سئحی فامر غیرہ بالسؤال	۲۲۳	قول وکان المسندی رقاہ عجبا
۲۲۳	حدیث ۱۳۲۔ حدیث مسدد	۲۲۳	قول انک لن تستطیع معی صبرا
۲۲۳	باب ذکر العلم والفتیاء الخ	۲۲۳	شرح حدیث
۲۲۳	حدیث ۱۳۳۔ حدیث قتیبہ بن سعید	۲۲۳	قول استطعا الیہما۔ اہل سے مراد
۲۲۳	باب من اجاب السائل باکثر مما سأل	۲۲۳	قول رحم اللہ موسیٰ لودونا الخ
۲۲۳	حدیث ۱۳۴۔ حدیث آدم الخ	۲۲۳	باب من سئل و ہوا من عالم جالساً
۲۲۳	قول ما یلبس المحرم	۲۲۳	حدیث ۱۲۴۔ حدیث عثمان
۲۲۳	قول کعبین الخ	۲۲۳	باب السؤال والفتیاء عندی الجہار

تم کتاب العلم بحمد اللہ و بہ تم المجلد الاول من درس البخاری

وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ محمد و علی آلہ و اصحابہ اجمعین برحمتہ

یا ارحم الراحمین

درسِ بخاری

شیخ الحدیث والتفسیر اُسَیْنَا الْعُلَمَاءِ عَلَیْہِ السَّلَامُ شَیْخُ اَحْمَد عُمَا رِیْہِ

ضبط و تحریر

مولانا عبد الوحید صدیقی فتحپوری

تعدیل و تصحیح و تہذیب

محمد جلیل حقیر مولانا حبیب الرحمن الاعظمی مدظلہ

ناشر

مکتبہ عارفین

ناشران تاجران کتب، رقیہ بلڈنگ، پاکستان، چوک کراچی

مطبوعہ

ایجوکیشنل پریس
پاکستان چوک، کراچی

————— ❦ —————

تاریخ طبع

جنوری ۱۹۸۳ء

مطابق

ربیع الثانی ۱۴۰۳ھ

————— ❦ —————

قیمت

قیمت ایک سو پچیس روپے

————— ❦ —————

AF.1317

کلمات تشکر و امتنان

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھل سملک۔ گجرات (جنوبی ہند) کی وہ قدیم اور مشہور دینی درس گاہ ہے جسے بجا طور پر یہ فخر ہے کہ یہاں ان نادور روزگار کی دو غنی شخصیتوں نے منہ تدریس و منصبِ شرفِ حدیث کو رونق بخشی ہے جنکی نظیر ملنے متقدمین میں بھی خال خال ہی نظر آتی ہے۔ اس جامعہ کی بنیاد ۱۳۲۶ھ میں سملک کی سیدیں کتب کی شکل میں رکھی گئی تھی۔ کچھ دنوں تک مکتبی بیانیہ یہاں دین کی خدمت انجام دیتی رہی پھر اسی مکتبے مدرسہ کی شکل اختیار کی اور جسے منتقل ہو کر اپنی مستقل حالت میں آگیا اور سطحات تک کی تعلیم کا یہاں نظم کیا گیا۔ لیکن حالات زمانہ اور ماحول کی وجہ سے مدرسہ کی ترقی کی رفتار بہت سست تھی۔ نہ طلبہ کی کثرت تھی نہ عمارت کا یہ سلسلہ نہ کوئی قابل ذکر کتب خانہ، نہ استقامت و انصرام کا کوئی معقول نظم۔ تاکہ اس ہمدی کے نصف اول میں اللہ نے اپنا فضل فرمایا اور علماء اور شائع دارالعلوم کی جماعت کا ایک عظیم قائد باکس غیبی طریقہ پر ڈابھل کی اس دور دراز بستی میں اپنے فیض و برکات کیساتھ پہنچا۔ آئیہاں میں المہم العصر مولانا علامہ حضرت سید انور شاہ کشمیری اور حضرت العلماء مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی (نور اللہ مرقدہا) جیسی نامور علماء اور عبقری شخصیتیں بھی تھیں ان اساطین علم و فضل کی آمد نے اس چھوٹے مدرسہ کو ایک عظیم دینی جامعہ کی شکل میں کر دیا اور یہاں کے طلبہ میں حضرت مولانا سید یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا سید حمید الدین صاحب سابق شیخ الحدیث مدرسہ عالیہ کلکو، جیسے لوگ نظر آنے لگے۔ اور اس کی شہرت کا آوازہ ہند سے تاشقند و بخارا اور کاشغر چین تک گونجا۔ اور گجرات کی نفا پھر ابجبار قال اللہ و قال الرسول کے فوجیاں آفروز سے گونجنے لگی۔

اور یہی دور جامعہ اسلامیہ کی تاریخ کا سب سے خوشہ اور تابناک دور ہے۔ حضرت علامہ کشمیری نے اس جامعہ میں پانچ سال تک بخاری کا درس دیا۔ اوپر سے انکے شاگرد رشید اور ہمارے استاذ حضرت مولانا بدر عالم صاحب مدظلہ رحمۃ اللہ علیہ نے انکے امالی درس بخاری کو فیض الباری کی صورت میں ترتیب کیا جو چار جلدوں میں چھپ چکی ہے۔ حضرت شاہ صاحب کے بعد حضرت علامہ عثمانی مدظلہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس منصب کو زینت بخشی اور ایک لمبی مدت تک جامعہ میں بخاری کا درس دیا اور علم و تحقیق کے موتی نثاے۔ حضرت علامہ عثمانی سے جو واقف ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ اللہ نے انکے اندر کی مجاہدیت کی شان کھنی تھی اور علوم دینیہ میں انکا مقام معاصر علماء میں کتنا بلند تھا۔ تفسیر وحدیث میں انکی مذاقت فن اور بلاغت شان پر شاہد ان کا حاشیہ قرآن اور جامع مسلم کی شرح میں انکی شاہکار تصنیف فتح الملمم ہے۔ حضرت علامہ محدث کی خواہش تھی کہ وہ فتح الملمم ہی کی طرح پر ہمار کی شرح بھی اردو میں لکھیں اور جہاں تک مجھے معلوم ہے کہ علامہ نے اسکے بار میں سخیگی سے سوجنا بھی شروع کر دیا تھا لیکن شاید یہ بات مقدر نہ تھی اور ان کے قلم سے یہ کام نہ ہو سکا۔

البتہ ان کے درس بخاری کے امالی کو ان کے بعض شاگردوں نے دورانِ درس میں منظر کیا تھا۔ اور انھیں میں سے ہمارے محب کرم جناب مولانا عبدالوحید صاحب مدظلہ بھی ہیں جن کو حضرت علامہ سے خصوصی ملکہ کا شرف حاصل ہوا اور وہ اسی جامعہ کے فارغ ہیں۔ جن حضرات کو علامہ کے درس بخاری میں بیٹھنے کا شرف حاصل ہوا ہے (اور انھیں میں یہ بندہ ناچیز بھی ہے) انھیں اندازہ ہے کہ علامہ کا یہ درس کس شان کا

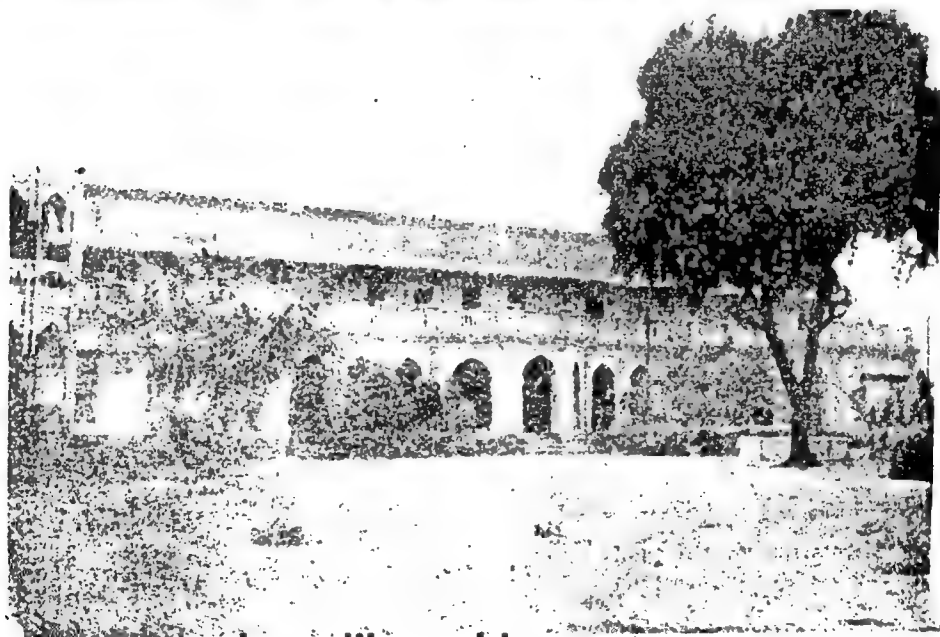
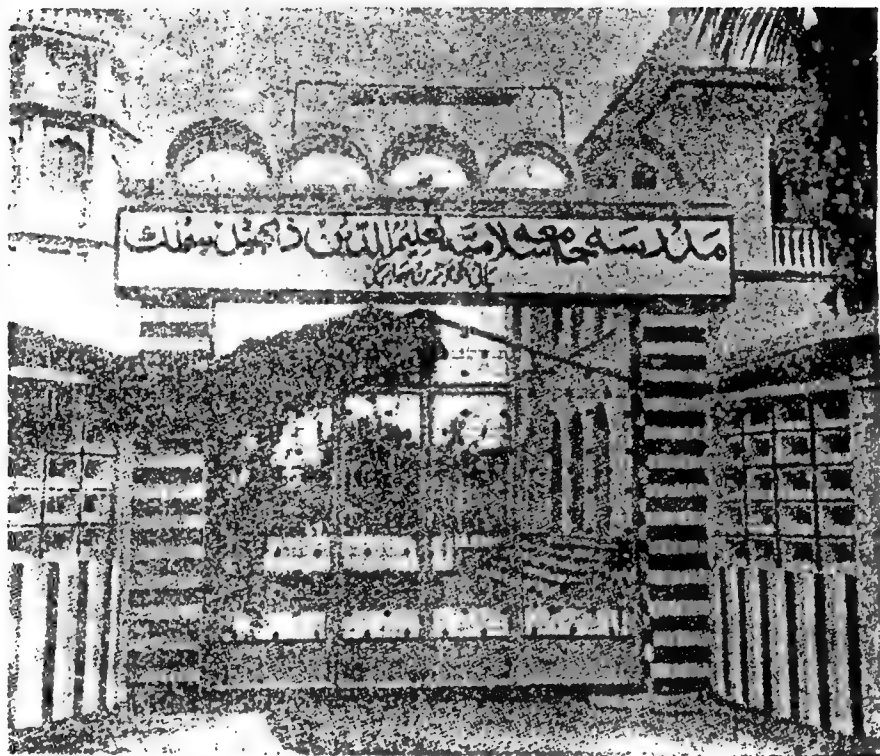
ہوتا تھا۔ حدیث اور متعلقات حدیث پر کسی جامع، مفصل اور محقق آپ کی گفتگو ہوتی تھی۔ معلوم ایسا ہوتا تھا علم و تحقیق کا دریائے ساکن بہت چلا جا رہا ہے اور ایک محدث وقت اپنی پوری شان حدیث کے ساتھ مسند حدیث پر بیٹھا اس منصب کا پورا حق ادا کر رہا ہے۔ بنظر استحضار کے ساتھ ساتھ متقدمین و متاخرین کے علوم پر علامہ کی گہری نظر تھی۔ پھر اٹھنے کو تیار رہا وہ عطا فرماتی تھی کہ ہر بات طلبہ کے دل میں اترتی جلی جاتی تھی۔ حضرت علامہ کے یہ مالی دس جس کے ضبط کرنے کا مولانا عبدالوہید صاحب نے خصوصی اہتمام کیا تھا۔ ان کے پاس محفوظ تھے جس کی اطلاع مجھے مولانا منظور صاحب نعمانی خط لکھنے دی۔ اور مناسب معلوم ہوا کہ تحقیقات کو نادر کے اس علی خزانہ کو محفوظ کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اسے شائع کروایا جائے۔ چنانچہ جامعہ کی طرف سے اسکی طباعت کی بابت سوچا جانے لگا۔

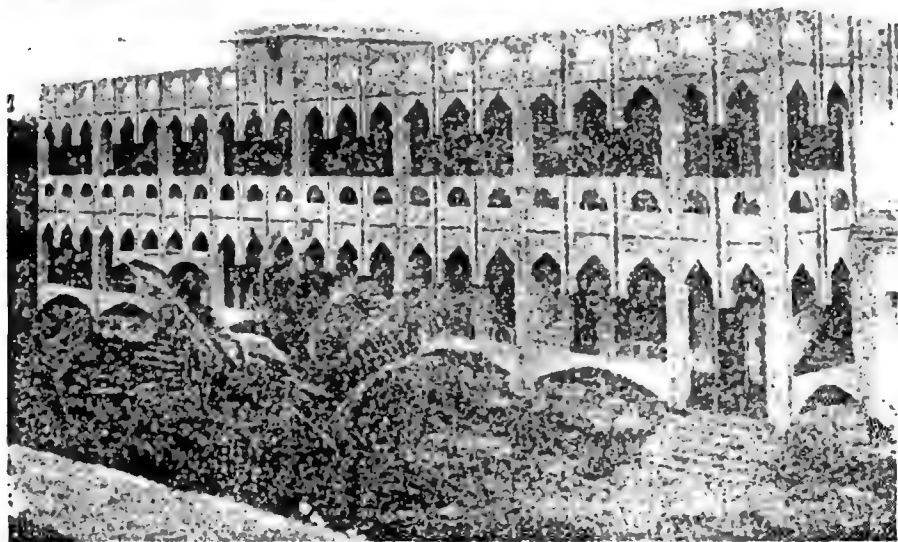
لیکن چونکہ اس تحریر کی حیثیت درس تقریر کی تھی اور دوران دس میں اس کا اہتمام بہت مشکل ہے کہ کہنے والے کی ہر بات بلا کم و کاست جوں کی توں ضبط کی جاسکے۔ اس لئے ضرورت تھی کہ یہ تحریر کسی صاحب نظر اور محقق عالم کی نظر سے گزر جائے چنانچہ اس کے لئے ہم سب کی نگاہ محدث وقت حضرت علامہ حبیب الرحمن صاحب اعظمی مدظلہ پر پڑی جن کو حضرت علامہ نعمانیؒ سے شرف تلمذ بھی حاصل ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ جاننے والے جانتے ہیں کہ موصوف اس وقت حدیث و رجال کی معرفت میں دنیا سے اسلام کی منفرد شخصیت ہیں۔ ہم نے مولانا سے اس بات کیلئے درخواست کی اور موصوف نے باوجود اپنی شدید مصروفیتوں اور پیرائے سالی کے ہماری درخواست کو شرف قبول بخشا اور کتاب کی پہلی جلد پر نظر ثانی فرما کر اس لائق کردہ کا ادب ہم اسے ایمان و اعتماد کے ساتھ پریس کے حوالہ کر سکیں۔ جس کے لئے ہم مولانا کے ممنون و شکر گزار ہیں اور ہمیں امید ہے کہ کتاب کی دوسری جلد بھی جلد ہی حضرت مولانا کی نظر ثانی کے بعد ہدیہ ناظرین ہوگی۔

اس موقع پر ہم ان بھی معاونین کے شکر گزار ہیں جنہوں نے علم و تحقیق کے اس عظیم ذخیرہ کو منصہ شہود پر لانے میں اپنے مالی و اخلاقی تعاون سے ہماری بہت افزائی فرمائی۔ اور ہمیں اس لائق بنایا کہ ہم اس کتاب کو ناظرین کی خدمت میں پیش کر سکیں۔ میں ان سب کا نام لے کر اپنے اس دلی شکر کو رسمی و اسی نہیں بنانا چاہتا۔ دعا ہے کہ اللہ ان سب کو اسکا بہتر بدلہ دے اور اپنی توفیق خاصہ انکی ساتھ کرے انجمن میں میں عزیز گرامی مولانا رشید احمد صاحب مفتاحی الاعظمی صاحبزادہ حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب الاعظمی مدظلہ بطور خاص شکر گزار ہوں جن کی مساعادت سے تعدیل و تصحیح کا کام انجام پایا اور انکی توجہ اور دلچسپی سے کتاب کا مسودہ کتابت اور طباعت کے مراحل سے گزر کر منصہ شہود پر آسکا۔ والسلام

خادم محمد سعید بزرگ -
ہتم جامعہ اسلامیہ ڈابھیل سملک

۶ ذیقعدہ ۱۳۹۹ھ





پیش لفظ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَتَحْرِیْ جَہَنَّمِ مَوْلَانَا مُحَمَّدٌ مِّنْظُورٌ حَسْبُنَا لِنَعْمَانِ مَدَظْلَةُ الْعَالَمِ

حَامِدًا وَمُصَلِّيًا وَمُحَمَّدًا

اب سے ۶۰ سال پہلے کا واقعہ ہے کہ یہ عاجز ”رابطہ عالم اسلامی“ کے اجلاس میں شرکت کے لئے مکہ منظر گیا ہوا تھا۔ اجلاس سے فارغ ہو کر حسب معمول مدینہ طیبہ بھی حاضری ہوئی۔ اس سفر میں پاکستان کے ایک عالم دین جناب مولانا قاضی عبدالرحمن صاحب (کراچی) سے ملاقات ہوئی، موصوف نے بتلایا کہ حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے اردو زبان میں بخاری شریف کی شرح لکھی تھی لیکن وہ مولانا کی حیات میں چھپ نہیں سکی تھی اس کا مسودہ اُنکے وارثوں کے پاس محفوظ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر یہ انعام فرمایا کہ اُن کو لوگوں کو اُن کی مرضی کے مطابق معاوضہ ادا کر کے میں اس کے حاصل کر لیتا میں کامیاب ہو گیا۔ اور اب میں آفٹ سے چھپوانے کے لئے اُس کی جلد اول کی کتابت کر رہا ہوں، اس کے کچھ اجزاء یہاں بھی میرے پاس ہیں، وہ میں آپ کو بھی دکھلا چاہتا ہوں۔ میں نے عرض کیا کہ میں ضرور دیکھوں گا، لیکن مجھے اس میں شبہ ہے کہ حضرت مولانا عثمانی رحم نے بخاری شریف کی کوئی شرح لکھی تھی۔ میں نے قاضی صاحب سے دریافت کیا کہ کیا آپ بتا سکیں گے کہ حضرت نے یہ شرح کس زمانہ میں لکھی تھی، آیا ہندوستان کے قیام کے زمانے میں یا پاکستان کے قیام کے دوران میں؟ انہوں نے بتلایا کہ حضرت مولانا نے یہ اُس زمانے میں لکھی تھی جب حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری رح کی وفات کے بعد ”جامعہ اسلامیہ ڈابھیل“ میں وہ بخاری شریف کا درس دیتے تھے۔ میں نے عرض کیا کہ پھر تو میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس معاملہ میں کوئی غلط فہمی ہو رہی ہے۔ میں نے مزید کہا کہ میرے یقین کی بنیاد یہ ہے کہ ”جامعہ اسلامیہ ڈابھیل“ میں حضرت مولانا کے قیام اور وہاں بخاری شریف پڑھانے کے کم از کم سبب ۱۹۳۵ء (بعد ۱۳۵۴ھ) کی ایک ملاقات میں حضرت مولانا نے اس عاجز سے براہ راست ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا تھا کہ میرا ارادہ اردو زبان میں بخاری شریف کی ایک مختصر شرح لکھنے کا ہے۔ میں نے دریافت کیا کہ کیا حضرت یہ کام شروع فرما چکے ہیں؟ فرمایا ابھی شروع کیا تو نہیں ہے لیکن جلد ہی ہی شروع کر دینے کا ارادہ ہے اور امید ہے کہ انشاء اللہ اس میں زیادہ مدت نہیں لگے گی (یہ گفتگو دیوبند میں حضرت کے دولت کدہ پر ۱۹۵۰ء کی ایک ملاقات میں ہوئی تھی) اسکے بعد چند ہی دنوں کے

بعد حضرت مولانا نے ”جمعیۃ علماء اسلام“ کی صدارت قبول فرمائی اور مسلم لیگ کی تحریک پاکستان کی حمایت میں سرگرم ہو گئے اور پھر قیام پاکستان اور وہاں منتقل ہو جانے کے بعد بھی سیاسی مصروفیات نے اُن کو بالکل اس کی مہلت نہیں دی کہ وہ کوئی علمی اور تصنیفی کام کر سکتے۔ اسلئے میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ حضرت مولانا نے بخاری شریف کی اردو شرح لکھنے کا ارادہ تو کیا تھا لیکن آخری عمر کی سیاسی مصروفیات کی وجہ سے یہ ارادہ عمل میں نہیں آ سکا۔

مولانا قاضی عبدالرحمن صاحب نے فرمایا کہ میں نے صحیح بخاری کی شرح کا جو مسودہ حضرت مولانا عثمانی کے وارثوں سے حاصل کیا ہے اس کا کچھ حصہ میرے پاس یہاں بھی موجود ہے، آپ اس کو دیکھ سکتے ہیں۔ میں نے کہا میں اُس کو ضرور دیکھنا چاہتا ہوں شاید اُس سے کچھ پتہ چلے اور یہ معمل ہو سکے۔ قاضی صاحب نے دوسرے وقت اُس مسودہ کے کچھ اوراق دکھائے اور اس ساتھ ہی شرح کے کچھ کتابت شدہ صفحات بھی دکھائے۔

مسودہ کے اوراق دیکھ کر پتہ چل گیا کہ یہ دراصل حضرت مولانا عثمانی رحمہ کے درس بخاری کی تقریر ہے جو اُن کے کسی لائق اور ذی استعداد شاگرد نے (دارالعلوم دیوبند وغیرہ بڑے مدارس کے رواج کے مطابق) درس کے ساتھ قلبند کی ہو اور بعد میں حضرت مولانا رحمہ نے اُسے ملاحظہ بھی فرمایا ہے اور کہیں کہیں اپنے قلم سے کسی غلطی کی (اصلاح یا کوئی ترمیم بھی فرمائی ہے اور کسی کسی جگہ حاشیہ پر کسی حوالہ کی عبارت اصل کتاب سے نقل فرمائی ہے یا مضمون میں کوئی اضافہ اپنے قلم سے فرمایا ہے۔

میں چونکہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا خط پہچانتا تھا اسلئے معاملہ کو صحیح طور پر سمجھ لینا میرے لئے آسان ہوا۔ علاوہ ازیں مسودہ میں ہر سبق کی تاریخ بھی درج ہے جس سے میرے اس خیال کی پوری توثیق ہو گئی کہ یہ حضرت کی تصنیف نہیں ہے بلکہ کسی شاگرد کی لکھی ہوئی درسی تقریر ہے جو ۱۳۵۲ھ کے درس بخاری میں قلبند کی گئی ہے۔ ان حقائق کے سامنے آجانے کے بعد قاضی صاحب نے بھی تسلیم کر لیا کہ واقعہ یہی معلوم ہوتا ہے۔ قاضی صاحب نے یہ بھی بتایا کہ ہم اس مسودہ کو کبھی طبع نہیں کر رہے ہیں بلکہ اس میں بہت کچھ اضافہ کر کے عصر حاضر کی ضرورت کے مطابق صحیح بخاری کی ایک مکمل شرح کی شکل میں اس کو شائع کر رہے ہیں، اس کا نام ”فضل الباری“ تجویز ہوا ہے۔ اسکے جو کتابت شدہ صفحات قاضی صاحب کے ساتھ تھے میں نے ان کو بھی دیکھا اندازہ ہوا کہ اچھی صلاحیت اور بڑی محنت سے کام کیا گیا ہے اور اردو میں بخاری شریف کی ایک بہت اچھی شرح تیار کی جا رہی ہے، کتابت بھی بہت اعلیٰ معیار کی تھی اس سے بھی متاثر ہوئی۔

مولانا قاضی عبدالرحمن صاحب کی اس ملاقات کے ٹھیک ایک سال کے بعد رابطہ عالم اسلامی کے اجلاس ہی کی شرکت کے لئے یہ عاجز مکہ مکرمہ حاضر ہوا تو اتفاق سے اُس وقت بھی قاضی صاحب وہاں تشریف لائے ہوئے تھے اور ان کی تیار کردہ شرح بخاری ”فضل الباری“ کی پہلی جلد شائع ہو چکی تھی۔ قاضی صاحب نے وہیں اس کا ایک نسخہ بھی عطا فرمایا۔ محمد شہر بڑی دیدہ زیب اور بڑی حسین و جمیل شکل میں شائع ہوئی ہے۔ جس مدت تک مطالعہ کیا جاسکا اس سے اندازہ

ہوا کہ عصر حاضر کی ضرورت کے مطابق خاص کر اردو داں طبقہ کے لئے اور اہل علم کے لئے بھی بخاری شریف کی بہت اچھی اور مکمل شرح ہے اللہ تعالیٰ قبول فرمائے اور ناظرین کے لئے نافع بنائے۔ لیکن اس میں حضرت علامہ عثمانی رحمہ کی تقریر پر بہت اضافہ کیا گیا ہے جو غالباً اصل تقریر سے کئی گنا زیادہ ہوگا، پھر ایسا بھی نہیں ہے کہ کوئی مطالعہ کرنے والا کسی علامت سے یہ سمجھ سکے کہ اس میں کتنا مضمون حضرت علامہ عثمانی کا ہے اور کتنا اور کون مضمون دوسرے حضرات کا اضافہ کیا ہوا ہے۔ ایسی صورت میں اس پوری کتاب کی نسبت حضرت علامہ رحمہ کی طرف اس عاجز کے نزدیک عمل نظر اور خاص کر فن حدیث کے اصول و روایات کے خلاف ہے۔ مترجم قاضی صاحب اور ان کے رفقاء کو اس پر غور فرمانا چاہیے۔

حرمین شریفین کے اس سفر سے میری واپسی کے چند روز بعد اتفاق سے ہماری جماعت اور ہمارے اس دور کے مشہور صاحبِ طلب و صاحبِ علم و قلم جناب مولانا نسیم احمد صاحب فریدی امر دہی پور شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا دامت برکاتہم کے غلفہ میں سے ہیں، لکھنؤ تشریف لائے۔ میں نے حرمین پاک کے اس سفر کے واقعات مولانا سے بیان کرتے ہوئے مولانا قاضی عبدالرحمن صاحب کی ملاقات کا اور بخاری شریف کی شرح کے مذکورہ بالا معاملہ کا بھی تذکرہ کیا۔ مولانا موصوف نے فرمایا کہ مجھے حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ کی بخاری شریف کی ”اس درسی تقریر“ کی پوری تاریخ معلوم ہے۔ انھوں نے بتلایا کہ میں جس زمانہ میں دارالعلوم دیوبند میں پڑھتا تھا وہ دور وہ تھا جب حضرت مولانا عثمانی رحمہ دارالعلوم دیوبند کے صدر مہتمم تھے۔ مولانا نے اپنے درس بخاری کی ایک قلمی مکتوب تقریر کی چند ایسے طلبہ سے نقل کرائی تھی جنکا خط صاف تھا ان کو اس کی معقول اجرت بھی مرحمت فرمائی تھی۔ نقل کرنے والے ان طلبہ میں ایک میں بھی تھا، یہ تقریر جس کی نقل ہم لوگوں نے کی تھی، مولانا عبدالوحید صاحب پنجپوری کی لکھی ہوئی تھی۔ انھوں نے جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں حضرت مولانا عثمانی سے بخاری شریف پڑھی تھی اور پھر اہتمام اور بڑی لیاقت سے مولانا کی درسی تقریر قلمبند کی تھی حضرت مولانا رحمہ نے اُسے دیکھ کر کہیں کہیں اصلاح و ترمیم بھی فرمائی تھی اور اپنے لئے اُس پوری تقریر کی ایک نقل تیار کرائی تھی۔ وہی نقل حضرت مولانا عثمانی رحمہ علیہ کے وارثوں کے پاس رہی ہوگی۔

حسن اتفاق کہ مولانا فریدی کی اس ملاقات کے چند ہی روز بعد ایک دن مولانا عبدالوحید صاحب لکھنؤ تشریف لائے۔ میں نے ان سے مولانا فریدی کی گفتگو کے حوالہ سے ”تقریر“ کے بارے میں دریافت کیا۔ انھوں نے دورہ حدیث پڑھنے کے لئے شوال ۱۴۲۰ھ میں اپنے ”جامعہ اسلامیہ ڈابھیل“ جانے اور وہاں حضرت مولانا عثمانی رحمہ سے بخاری شریف پڑھنے اور خاص اہتمام سے درسی تقریر قلمبند کرنے کا واقعہ تفصیل سے بیان کیا اور بتلایا کہ حضرت مولانا نے میری لکھی ہوئی تقریر کو بہت پسند فرمایا تھا اور وہ عاریتہ مجھ سے لے لی تھی، اُس کے بعد کئی سال تک وہ حضرت مولانا ہی کے پاس رہی اور حضرت نے کہیں کہیں اصلاح و ترمیم بھی فرمائی۔ اس کے بعد وہ میرے پاس واپس آئی۔ میں نے مولانا عبدالوحید صاحب سے اس کے دیکھنے کی خواہش

ظاہر کی تو انھوں نے وہ تقریر میرے پاس بھیج دی۔ میں نے اس کو دیکھا تو محسوس کیا کہ یہ مکتوب تقریر حضرت علامہ عثمانی رحمہ اللہ کے درس بخاری شریف کی بہت مستند اور نافع تقریر ہے اور ان کی خاص علمی تحقیقات اور مخصوص خط و اداسلوب خطاب و بیان اس میں قریب قریب جوں کے توں محفوظ ہیں۔

اس کے بعد جب مولانا عبدالوہید صاحب سے ملاقات ہوئی تو میں نے اپنا یہ احساس و تاثر بیان کیا اور کہا کہ اس کا تو یہ حق تھا کہ اس کو بالکل اسی طرح چھپوایا جاتا، انھوں نے کہا کہ اس کی آرزو اور خواہش تو یہی لیکن اپنے میں استطاعت نہ تھی اور کسی دوسرے سے کہنا اچھا نہ معلوم ہوا۔ میں نے کہا کہ اگر آپ خود اس کو چھپوا نہیں سکتے تو پھر اس کی اشاعت کا انتظام جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کی طرف سے ہونا چاہیے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ایسا ہی کر دیا اب یہ ”جامعہ اسلامیہ ڈابھیل“ ہی کی طرف سے شائع ہو رہی ہے۔ ازراہ احتیاط یہ بھی ضروری سمجھا گیا کہ فن حدیث کے کوئی ماہر اور صحیح بخاری شریف کے کوئی بالکل استاذ اس کو ملاحظہ فرمائیں تاکہ اگر کہیں کوئی سہو قلم محسوس ہو یا کوئی بات وضاحت طلب ہو تو اس کی اصلاح یا توضیح کریں یا اس کے لئے محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی مظلہ العالی سے عرض کر لیا گیا اور حضرت مدوح نے قبول فرمایا۔ اب یہ حضرت مدوح مظلہ العالی کی نظر سے گزرنے کے بعد شائع کی جا رہی ہے۔

راقم سطور کا خیال ہے کہ جن اہل علم اور طالبان حدیث نے حضرت مولانا کو نہیں پایا وہ اس کے ذریعہ گویا حضرت کا درس بخاری سن سکتے ہیں۔ اور ان کے خاص علوم و تحقیقات سے مستفیض ہو سکتے ہیں۔

درس مخفی منم چوں ہوئے گل در برگ گل ہر کہ ذوق دید دارد در سخن بیند مرا
اللہ تعالیٰ حدیث نبوی اور اصح الکتاب بعد کتاب اللہ صحیح بخاری شریف کی اس خدمت کو قبول فرمائے اور نافع بنائے اور صاحب تقریر حضرت علامہ عثمانی رحمہ اللہ کے قلمبند کرنے والے مولانا عبدالوہید صاحب نقجوری اور اس کی اشاعت کا اہتمام کرنے والے جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کے مہتمم مولانا محمد سعید صاحب بزرگ اور اس پر نظر ثانی فرمانے والے مجددی حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی مظلہ العالی کے لئے اور سب اصحاب خیر کے لئے جنھوں نے اس کی اشاعت میں جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کی مدد کی وسیلہ سعادت و ذخیرہ آخرت بنائے۔ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ۔

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

لکھنؤ

۲۳ رمضان المبارک ۱۴۱۶ھ ۸ ستمبر ۱۹۹۶ء یوم غیب شبہ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ٥

الحمد لله الذي بعث فينا رسله وآله وأصحابه وسلم على سيدنا محمد وآله وأصحابه وسلم

راقم الحروف محمد عبد الوحيد صدیقی ابن محمد عبد العزیز صدیقی محرم ۱۳۶۶ھ (مطابق فروری ۱۹۰۸ء)

بہارِ حق پتھر - یوپی - پیدا ہوا - والد صاحب مرحوم و مغفور نے پیدائش ہی کے دن اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حافظ و عالم ہونے کی درخواست پیش کی - اور بالکل ابتدائی زندگی سے دینی تربیت فرمائی، سات سال کی عمر میں حفظ شروع کرایا اور پورے اہتمام سے نگرانی سرنامی دس سال پانچ ماہ کی عمر میں احمدیہ حفظ پورا ہو گیا تو خود اسکے دو کلام اپنے ذمہ لیا اور ایسا انہماک ہوا کہ پندرہ پندرہ پارے یوہیسن سکر رمضان المبارک سے پہلے پہلے خوب پختہ کر دیا - حضرت مولانا سید محمد ظہور الاسلام صاحب رحمۃ اللہ علیہ بانی مدرسہ اسلامیہ فتحپور و خلیفہ حضرت مولانا شاہ فضل الرحمن رحمۃ اللہ علیہ نے تراویح میں پورا کلام پاک سنا اور خوش ہو کر عالم ہونے کی دعا دی - والد مرحوم اور سب حاضرین نے آمین کہی - پھر خود ہی فارسی شروع کرانی - کچھ دن پڑھانے کے بعد فرمایا: اب تم عربی شروع کرو تمہے کہہ اور کلام لینا ہے، اور خود ہی عربی شروع کرانی اور پابندی کیساتھ اسباق پڑھاتے رہے اور انتہائی شفقت سے پڑھاتے رہے - فروری ۱۹۱۸ء میں بیمار ہوئے مگر میرا سبق برابر ہوتا رہا، حتیٰ کہ بیماری بڑھی اور ۲ مارچ ۱۹۱۸ء تک سبق ہوا سنا کہ مرض بہت بڑھ گیا اور ۳ مارچ کو اپنے ماموں زاد بھائی مولوی ملک سید عبد الحمید صاحب ڈلموی سے فرمایا کہ آج اس کا سبق تم پڑھا دو ناغہ نہ ہو - قبیل حکم میں انھوں نے اس دن پڑھا دیا، ۴ مارچ ۱۹۱۸ء یوم جمعہ کی صبح کو انھوں نے داعی اجل کو لبیک کہا، رحمہ اللہ تعالیٰ رحمة واسعة اور میرا سبق بند ہو گیا - پھر چند دنوں بعد مدرسہ اسلامیہ فتحپور میں داخل ہو گیا - قدوری تک تعلیم پہنچی تھی کہ والد صاحب مرحوم نے استاذ و محترم ماسٹر حاجی ریاض الدین صاحب کے ذریعہ سے جو اس وقت گورنمنٹ ہائی اسکول علیگڑھ میں ملازم تھے مجھے مدرسہ عربیہ خانقاہیہ سیدیہ ریاست دادون ضلع علیگڑھ میں داخل کر دیا - یہ مدرسہ ضلع علیگڑھ کی ایک ریاست دادون کے رئیس نواب محمد ابو بکر خان صاحب مرحوم نے صرف اپنی ذاتی آمدنی سے قائم کیا تھا اور اس کے مصارف کے لئے اپنی جائداد کا ایک حصہ وقف کر دیا تھا، وہاں میری خوش قسمتی سے ایک بہت ہی شفیق استاذ و مربی حضرت مولانا مولوی حافظ و مجاہدین احمد خان صاحب مدظلہ، بعدہ صدر مدرس فائز تھے (بعد میں وہ مدرسہ عالیہ رام پور کے پرنسپل ہو گئے اور اب وہاں سے پنشن پا کر اپنا دینی مدرسہ رام پور ہی میں چلا رہے ہیں، اللہ تعالیٰ اس سایہ کو دائم و قائم

رکھے (آمین) انھوں نے میرے ساتھ خاص عنایت و سرپرستی کا معاملہ فرمایا۔ مولانا مدد رح مدرسہ عالیہ رام پور کے ممتاز فاضل اور حدیث میں حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری و حضرت علامہ مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہما کے شاگرد رشید تھے۔ انھوں نے مجھے انتہائی شفقت سے پڑھایا اور صحیح معنی میں میری علمی تربیت فرمائی۔ مطالعہ کرنے کا ذوق پیدا فرمایا اور مطالعہ کرنے کے آداب تلقین فرمائے جس سے ساری عمر مجھے فائدہ پہونچتا رہا اور اب تک پہونچ رہا ہے، ۱۹۳۸ء تک میں اس مدرسہ میں رہا اور جلالین، ہدایہ مدارک، میرزا ہد رسالہ، حدائق وغیرہ تک کتابیں پڑھیں ۱۹۳۹ء میں وہاں سے رام پور ریاست میں آکر مدرسہ عالیہ میں داخلہ لیا۔ درجہ سوم میں داخلہ ہوا، جس میں ہدایہ ثالث، حدائق، شرح ہدایہ الحکمۃ وغیرہ کتب تھیں۔ سالانہ امتحان میں اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ کی طرح درجہ میں اول کامیاب کیا جسکی بنا پر انعامی وظیفہ کا مستحق ہوا۔ اگلے سال درجہ دوم میں بیضاوی شریف - ہدایہ رابع - قاضی مبارک - صدرا وغیرہ پڑھیں۔ اس سال بھی اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے امتحان سالانہ میں اول کامیاب ہوا اور انعامی وظیفہ حاصل کیا۔ اس کے بعد درجہ اول میں (جو یہاں کا آخری اور انتہائی درجہ تھا) شمس باغ - میرزا ہد امور عامہ - مقامات بدیع - طحاوی شریف وغیرہ پڑھیں۔ یہ درجہ امام الحکمۃ حضرت مولانا فضل حق صاحب رامپوری رحمۃ اللہ علیہ کے پاس تھا جو اس وقت مدرسہ عالیہ رامپور کے پرنسپل (صدر المدرسین) تھے اور مولانا عبد الحق صاحب خیر آبادی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے اور فن حکمت کے امام تھے میرزا ہد امور عامہ پر انکا ایک علمی حاشیہ ہے جو طبع ہو چکا ہے۔ یہ سال چونکہ سنہ فراغ ملنے کا تھا اس لئے پچھلے سالوں سے بھی زیادہ محنت کی اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے مدرسہ عالیہ رامپور کی تاریخ میں پہلی بار یو۔ پی کے ایک طالب علم کو اول ڈویژن اور اول نمبر کی کامیابی حاصل ہوئی فالحمدا للہ علی ذلک۔

دورانِ سال ہی میں اپنے استاذ شیخ اکابر کے توسط اور سفارش کے ساتھ حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری شیخ الجامعہ اسلامیہ ڈابھیل ضلع سورت رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں درخواست ارسال کی کہ اگلے سال جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں حدیث پاک پڑھنے کے لئے داخلہ منظور فرمایا جائے۔ حضرت شاہ صاحب اور حضرت علامہ مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہما سے حدیث شریف پڑھنے کی ترغیب بھی استاذ محترم حضرت مولانا حافظ وجہ الدین احمد خان صاحب رامپور مدظلہ العالی نے دی تھی اس غریب طالب علم پر حضرت مولانا کا یہ خاص انخاص احسان تھا کہ حدیث پاک کی تعلیم کے لئے ان بزرگوں کے پاس حاضری کی ترغیب ہی نہیں بلکہ حکم دیا کہ وہ رام پور کی مکتبہ فکر کا عام ذہن یہ تھا کہ ازل تو سب فقہ میں آجاتے ہیں حدیث تو بس تبرک کے طور پر پڑھنی چاہیے یہی نہ تھے بھی گہا گیا مگر اللہ تعالیٰ دارین میں جزائے خیر عطا فرمائے حضرت مولانا وجہ الدین صاحب کو جنہوں نے ان بزرگوں کے قزوں تک پہونچا دیا۔ درخواست کی منظوری ابھی نہیں آئی تھی کہ ایک شب میں خواب میں حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھا اس سے پہلے کبھی حضرت کی زیارت نہیں کی تھی۔ خواب ہی میں عرض کیا کہ میں ڈابھیل آکر حدیث پاک پڑھنا چاہتا ہوں آپ اجازت دے دیں ہنس کر فرمایا اجازت ہے آہا و انشاء اللہ ضرور پڑھاؤنگا۔ صبح کو مدرسہ پہونچا اپنے بعض ساتھیوں سے خواب بیان کیا تو ایک ساتھی مولوی عزیز الرحمن صاحب پٹواری نے کہا علیہ بتاؤ کیا تھا، میں نے بتایا تو دراز۔ ڈاڑھی بھری ہوئی بدن

سڈول - سفید عمامہ باندھے ہوئے - نگاہیں جھکی ہوئی - کہنے لگے میں نے حضرت مولانا کو دیکھا ہے بالکل یہی جلیبہ ہے، تم نے صبح دیکھا، جاؤ مبارک ہو میں بہت خوش ہوا اور اسے فال نیک سمجھا چند دنوں بعد منظور بھی آگئی۔ بعد رمضان میں نے شمال ۱۳۵ھ کے ابتدائی عشرہ میں اپنے ایک آٹھ سالہ رفیق درس مولوی سید مسعود علی صاحب علیگڑھی کے ساتھ ڈاھیل پہنچ گیا۔ اس وقت اساتذہ میں سے حضرت مولانا بدر عالم صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور مفتی عتیق الرحمن صاحب مدظلہ العالی پہنچ چکے تھے۔ جلد ہی داخلہ کے امتحان کا اعلان ہوا اور دورہ کے طلبہ کا امتحان حضرت مولانا بدر عالم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سپرد ہوا۔ میں نے تازہ پڑھی ہوئی درسی کتب، قاضی مبارک - صدر - حاشہ اور طحاوی شریف میں امتحان دیا اور رابطہ کے مطابق داخلہ کے امتحان کے بعد محمد شہر دورہ حدیث میں داخلہ منظور ہو گیا۔ اسباق کی تقسیم کا اعلان اس طرح کیا گیا کہ بخاری شریف حضرت علامہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے پاس اور ترمذی شریف حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کے پاس اور ابوداؤد شریف اور مسلم شریف حضرت مولانا سراج احمد صاحب رشیدی کے پاس۔ پہلے حضرت مولانا سراج احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس اسباق شروع ہوئے۔ پہلے ہی دن فرمایا جبکہ ابوداؤد شریف شروع کرائی کہ کتاب مجھ سے حل کرو۔ اور تقریر حضرت شاہ صاحب اور مولوی شبیر احمد صاحب کی سننا۔ حقیقت یہ ہے کہ کتاب کا حق ادا فرماتے اور اس خوبی سے مسلک حنفی کے ساتھ احادیث کی تطبیق فرماتے کہ ذرا بھی اشکال باقی نہ رہتا تقریر طویل نہ ہوتی مگر مسئلہ پوری طرح منقح ہو جاتا۔ چند ہی دن گزرے تھے کہ حضرت مولانا شبیر احمد صاحب دیوبند سے تشریف لے آئے اور ساتھ ہی یہ خبر لائے کہ حضرت شاہ صاحب کی طبیعت نا ساز ہے ابھی نہ آسکیں گے۔ آنے کے بعد ہی ترمذی شریف کا سبق شروع ہوا۔ پہلے ہی دن کے سبق کا قلب پر یہ اثر پڑا کہ اللہ تعالیٰ نے بڑی ہی فضل فرمایا کہ اس مبارک درس کی تک اور ان بلند پایہ اساتذہ تک پہنچا دیا۔ اس پر جہتد بھی اس کا شکر ادا کیا جائے کہ ہے۔ اس وقت میرا ملاحظہ تھا اچھا تھا پوری تقریر محفوظ ہوگئی لیکن مایہ خیال آیا کہ اس حافظ کا اعتبار نہیں کچھ دنوں بعد یہ تقریریں اور یہ خاص علمی مباحثہ دین میں نہ رہیں گے اور پھر ان سے استفادہ ممکن نہ رہے گا اسلئے یہ تقریریں اسی تفصیل کے ساتھ لکھ لینا چاہئے اسی دن سے درس گاہ میں درس کے ساتھ ہی لکھنا شروع کر دیا۔ اور اللہ ہی کا فضل شامل حال رہا کہ اس نے لکھنا آسان کر دیا۔ کوشش یہی کہ تقریر حتی الوسع حضرت ہی کے الفاظ میں ضبط کی جائے حضرت اپنے وقت کے سلم صاحب سان صاحب بیان تھے۔ تقریر کا طرز بہت ہی پر وقار اور دلنشین تھا مشکل حقائق و مضامین کو سہل الفہم کر کے بیان کر دینا آپ کا خاص کمال تھا۔ رک رک کر تقریر فرماتے مگر روانی میں فرق نہ آتا۔ لکھنے والا اگر متوسط درجہ سے لکھتا رہے تو پوری تقریر لکھ سکتا تھا میں نے یہی کوشش کی اور محمد شہر اسی کے کرم سے پوری تقریر لکھی جاتی رہی۔ ادھر ہی اسباق - ترمذی شریف - ابوداؤد شریف - مسلم شریف جاری تھے ادھر تمام طلبہ کو شاہ صاحب کا بے چینی سے انتظار تھا لیکن اطلاعات مایوس کن آئے لگیں تو دل ٹوٹنے لگے دورہ حدیث کی اس جماعت میں متعدد طلبہ وہ تھے جو بعض مدارس کے اچھے اساتذہ تھے اور صرف شاہ صاحب سے استفادہ کی خاطر آئے تھے مگر العبدید برو اللہ بقدر

ناہ صفر میں ان کے وصال کی اطلاع نے سب کو غزوہ - افسردہ و دہشزدہ کر دیا اور اس فیض و ثروت سے ہم سب محروم ہو گئے۔ مدرسہ میں ایساں ثواب کے لئے قرآن خوانی ہوئی اور جلسہ تعزیت ہوا۔ اس میں حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی نے فرمایا تم کو تو انوسوس ہونا ہی چاہیئے کہ تم شاہ صاحب کے فیوض کی تنہا میں طویل سفر کر کے یہاں آئے تھے لیکن تمہاری تسلی کا سامان تو پھر بھی فراہم ہو ہی جائے گا روتے ہیں کہ ہمارے سروں پر ان کا سایہ نہ رہا۔ مشکل سے مشکل سے مقام جو ہفتوں کی کتب بینی اور تلاش سے مل نہ ہو سکتا تھا شاہ صاحب کے پاس پہنچتے ہی منٹوں میں ایسا مل ہو جاتا تھا کہ گویا کچھ محتاجی نہیں پھر شاہ صاحب کے دستِ علی اور قوتِ حافظہ کے متعدد واقعات بیان فرماتے۔ ان میں سے ایک ناظرین کرام بھی ملاحظہ فرمائیں۔ فرمایا پارہ ۲۳ سورہ "ص" میں سیدنا داؤد علیہ السلام کے ایک امتحان کا ذکر ہے کہ اچانک بھت سے کو در دو آدمی ان کی خلوت گاہ میں جہاں وہ مہرنت عبادت تھے پہنچے اور کہا کہ ہم دو فریق میں جھگڑا ہے آپ اسے طے کریں اور ابھی طے کریں حضرت داؤد علیہ السلام ان کے اس طرح خلل انداز ہونے سے مکدر اور پریشان ہوئے اور ان کی خلوت مع اللہ اور عبادت میں خلل پڑ گیا۔ اور فیصلہ کرنے لگے یہ جمل واقعہ ہے۔ اسرائیلیات میں بہت بھونڈے طور پر حضرت داؤد علیہ السلام پر کریک اخلاقی الزامات لگائے گئے ہیں۔ اہل حقنا مفسرین نے متفقہ طور پر حضرت داؤد علیہ السلام کی برائت کا اعلان کیا ہے اور صاف صاف کہا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نبی تھے اور انبیاء علیہم السلام معصوم ہوتے ہیں ان سے صغیرہ کا صدور بھی نہیں ہوتا نہ کہ کبیرہ کا اس لئے یہ اہل کتاب کا ہیبتناں ہے۔ یہ تو اہل حق کی شفق علیہ بات تھی جس سے ایک معصوم نبی کی فحش سے برائت ہو گئی۔ مگر یہ بات باقی رہ جاتی ہے کہ فی الحقیقت وہ واقعہ کیا تھا جس کو قرآن نے "قَتْلًا" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔

حضرت علامہ عثمانی نے فرمایا کہ میں نے فوائد القرآن لکھنے کے سلسلے میں اس واقعہ کی تحقیق میں تمام کتب متبادلہ چھان ڈالیں جہاں جہاں اس کی تفصیل ملنے کا امکان تھا سب کچھ دیکھ لیا مگر مشکل حل نہ ہوئی ہفتہ بھر کی چھان بین کے بعد مجبوراً شاہ صاحب کے پاس اس وقت حاضر ہوا جبکہ وہ قیلو فرمانے کو لیٹ گئے تھے دیکھتے ہی اٹھ بیٹھے اور فرمایا اس وقت کیسے تکلیف کی۔ میں نے سارا برا کہا سنایا اور یہی بھی کہہ دیا کہ تمام متداول کتابیں چھان چکا ہوں کہیں کوئی تشفی بخش بات نہیں ملی۔ آپ کے ذہن میں کوئی چیز ہو تو بیان فرمائیں۔ فرمانے لگے ایک چیز ذہن میں ہے آپ کو دکھاتا ہوں شاید آپ کا دل مکمل کے یہ فرما کر اٹھے اور الماری سے مستدرک حاکم نکال لائے اور بالکل غیر متعلق جگہ سے ایک روایت سامنے کر دی کہ اسے پڑھئے۔ بس اسے پڑھنا تھا کہ سب گرہیں مکمل گئیں اور پورا مسئلہ حل ہو گیا۔ شاہ صاحب کی اس وسعتِ علی اور قوتِ حافظہ پر ششدر رہ گیا جو مسئلہ ہفتوں کی چھان بین سے حل نہ ہو سکا تھا شاہ صاحب نے منٹوں میں اس طرح حل کر دیا گویا کہ وہ اسکے لئے ابھی تیاری کر کے بیٹھے تھے۔ پھر فرمایا یہ تھے شاہ صاحب۔ اللہ تعالیٰ کی ہزار ہا ہزار رحمتیں شاہ صاحب پر جو ہم کو تیم کر کے اللہ کے قرب میں پہنچ گئے۔

(نوٹ) واقعہ طویل ہے یہاں بیان کرنے کی گنجائش نہیں حضرت الاستاذ علامہ عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے فوائد القرآن سورہ ”ص“ آپ پڑھ لیں اس سانچہ کے بعد بخاری شریف کا سبق حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے سپرد ہوا اور ترمذی شریف جو اس وقت تک باب مَا جَاءَ فِي التَّرْجِيعِ فِي الْاِذَاانِ کے ختم تک ہو چکی تھی حضرت مولانا بدر عالم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آگئی جس کا پہلا سبق ۱۳ صفر ۵۲ھ یوم چہار شنبہ کے باب فی افراد الافات مآۃ سے شروع ہوا حضرت علامہ عثمانی کے ہاں ۱۳ صفر ۵۲ھ یوم چہار شنبہ بوقت ساڑھے آٹھ بجے صبح بخاری شریف کا سبق شروع ہوا۔ میں چونکہ ترمذی شریف کے درس میں حضرت الاستاذ علامہ عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی وسعت علم و نظر سے بہت زیادہ متاثر اور طرز تقریر سے مانوس ہو چکا تھا اسلئے اہتمام کے ساتھ بخاری شریف کی تقریر بھی لکھنی شروع کر دی کچھ دنوں بعد ایک شب جب میں حضرت کی خدمت میں کچھ پوچھنے کے لئے بعد نماز عشاء حاضر ہوا تو دریافت فرمایا تم جو درس میں لکھتے ہو یہ صرف نوٹ ہوتے ہیں یا پوری تقریر بخاری کی لکھ رہے ہو میں نے عرض کیا حضرت کی پوری تقریر لکھتا ہوں فرمایا جو کچھ اب تک لکھ چکے ہو ٹھیکو دکھانا اگلے دن میں نے لکھے ہوئے اجزاء حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب صدیقی خادم خاص حضرت مولانا کے ذریعہ حضرت تک پہنچا دیئے۔ چند دنوں بعد وہ اجزاء واپس فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ میں نے میں نے یہ کل اجزاء دیکھ لئے ہیں تم ڈھنگ سے لکھ رہے ہو اسی طرح لکھتے رہو اور جہاں کچھ رہ جائے یا کوئی بات سمجھ میں نہ آئے تو یہاں آکر پوچھ لیا کرنا۔ موقعہ پا کر میں نے اپنا وہ خواب بیان کر دیا جو رام پور میں پچھلے سال دیکھا تھا تو بڑی مسرت کا اظہار فرمایا اور فرمایا کہ تعبیر تو سامنے آگئی کہ تم نے خواب میں دیکھا تھا کہ میں نے وعدہ کیا ہے اب اللہ نے تمہارا خواب سچا کر دکھایا اور میرا خواب کا وعدہ پورا کر رہا ہے پھر جب کوئی بات قابل دریافت ہو تو میں بعد نماز عشاء حاضر ہو جاتا اور پیر و بانے لگتا پھر اپنی بات عرض کرتا حضرت پورے اجناسط کے ساتھ مسئلہ کی تقریر فرماتے کبھی کبھی جاڑے کی راتوں کے گیارہ بج جاتے مگر تقریر یہی فرمادیتے۔ اس طرح حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے برابر فیض حاصل ہوتا رہا میری بڑی خوش قسمتی تھی کہ اس تعلیمی سلسلے میں مجھے حضرت کی خاص نظر عنایت و شفقت نصیب رہی کبھی ایسا نہیں ہوا کہ حضرت مولانا کسی سوال پر مکدر ہوئے ہوں۔ ہمیشہ مسرت و بشارت کا اظہار فرماتے اور پوری شفقت کے ساتھ جواب عنایت فرماتے جس سے پورا انشراح و الطینان حاصل ہو جاتا۔

چونکہ بخاری شریف تاخیر سے شروع ہوئی تھی اسلئے اس سال حضرت نے بڑی محنت فرمائی حتیٰ کہ وہ فضلدار استاد جو حضرت شاہ صاحب ہی سے استفادہ کی غرض سے آئے ہوئے تھے اور برہمن پڑھا کر آئے تھے وہ بھی بہت ہی خوش اور مطمئن رہے۔ کچھ ہی دنوں بعد عصر کے بعد بھی سبق ہونے لگا۔ اس محنت شاقہ کا اچھا نتیجہ یہ ہوا کہ ۳۳ رجب ۱۳۸۵ھ کو بخاری شریف ختم ہوگئی۔ پورے سال اللہ تعالیٰ کا معاملہ میرے ساتھ بڑے ہی لطف و کرم کا رہا بعد اللہ ایک سبق بھی ناظر نہیں ہوا

میں نے اپنی اس لکھی ہوئی تقریر میں اس کا التزام اول دن ہی سے رکھا کہ تاریخ درس مسلسل لکھتا رہا۔ جہاں سے سبق شروع ہوتا حاشیہ پر تاریخ لکھ دیتا۔

امتحان سالانہ میں بھی اللہ تعالیٰ انتہائی کرم فرمایا اور جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کی تاریخ میں پہلی بار دورہ حدیث میں یو۔ پی کا طالب علم (حکموہاں ہندوستانی کہا جاتا تھا) اول نمبر پر کامیاب ہوا یہ محض اللہ کا فضل و کرم تھا ورنہ اس سال دورہ حدیث میں وہاں بڑے ذہین دذی استعداد طلبہ اور بعض وہ حضرات بھی شریک تھے جو برسوں پڑھا چکے تھے۔

بعد امتحان جلسہ دستار بندی ہوا۔ جس میں حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب۔ حضرت مولانا احمد سعید صاحب رحمۃ اللہ علیہما تشریف لائے تھے۔ بہت کامیاب جلسہ ہوا۔ تقریروں کے بعد تسلیم سنا اور دستار بندی کی گئی۔ مدرسہ میں تعطیل کا اعلان ہوا اور طلبہ اپنے اپنے وطن جانے کے لئے رخت سفر باندھنے لگے۔ میں نے بھی تیاری کی اس اتذہ سے ملنے کے بعد آخر میں حضرت مولانا بدر عالم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بہت خوش ہوئے۔ اول پاس ہونے پر مسرت کا اظہار کیا اور فرمایا تمہاری منطق تمہارے کام آگئی اور تم کو اول نمبر کی کامیابی حاصل ہوئی۔ معاف کے ساتھ رخصت فرمایا اور حکم دیا کہ حضرت مولانا شبیر احمد صاحب سے تعلق قائم رکھنا۔ وہاں حضرت مولانا عثمانیؒ کی خدمت میں آخری سلام کیلئے حاضر ہوا تو حضرت نے کامیابی پر مبارکباد دی اور بہت سی دعائیں دیں اور فرمایا کہ اپنی لکھی ہوئی تقریر مجھے دے دو۔ میں دیکھ کر واپس کر دوں گا۔ مجھے اس سے بڑی مسرت ہوئی کہ حضرت خود ملاحظہ فرمائیں گے تو انشا اللہ جو غلطیاں اس میں ہوئی ہوں گی ان کی اصلاح ہو جائے گی اور تقریر مستند ہو جائے گی۔ میں نے پوری تقریر جو خاصی ضخیم تھی پیش کر دی۔ حضرت نے مولانا محمد یحییٰ صاحب کو حوالہ کرتے ہوئے فرمایا اسے احتیاط سے بکس میں رکھ دینا میں حضرت سے رخصت ہو کر وطن چلا آیا۔ اول فرزند شہبازؒ ہی میں گھر سے حضرت والا کے پاس دیوبند عریضہ ارسال کیا اور اس میں درخواست کی کہ مدرسہ کی سند تو مل گئی مگر تمنا ہے کہ حضرت والا اپنے قلم سے چند الفاظ تحریر فرمادیں۔ تو وہ میرے لئے اصل سند و باعث صداقت قرار ہوں گے۔ حضرت والا نے جواب میں جو کچھ تحریر فرمایا وہ حضرت ہی کے الفاظ ہیں۔ پڑھ لیں۔

از بندہ مشیر احمد عثمانی عفا اللہ عنہ بمطالعہ برادر عزیز سید اللہ تعالیٰ۔ بعد سلام سنون آنکہ خط پہنچا الحمد للہ بندہ خیریت سے ہے۔ نزلہ وغیرہ میں کمی ہے۔ البتہ عزیزم مولوی محمد یحییٰ سید بیس ابیس روز سے چوتھیا بنجار میں مبتلا ہیں۔ مسہل بھی ہوئے لیکن بنجا وہیں رکا۔ دعا کرتے رہیں۔ اپنے والد ماجد کی خدمت میں میرا سلام عرض کر دیں۔ انشاء اللہ چند روز میں کوئی تحریر بطور سند لکھ کر تمہارے پاس روانہ کر دوں گا۔ دس پانچ روز میں مجھے ذرا یاد دلادینا۔ بندہ تم کو اون طلبہ میں سمجھتا ہے جن پر مدرسہ فخر کر سکتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے فضل و رحمت سے امیدوار ہے کہ آئندہ تم کو بہت کچھ ترقی نصیب کرے گا۔ والسلام

از دیوبند ۴ رمضان المبارک ۱۳۵۲ھ

بہت دن اسکے بعد گزر گئے۔ پھر حضرت والانے ۸ رتوال ۱۳۵۵ھ کو ایک والانامہ تحریر فرمایا جو اجازت پر مشتمل تھا اور تصدق والا کے دست اقدس سے سند حدیث اور اس کے درس کی اجازت تھی۔ حضرت ہی کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الحمد لله رب العالمين والعاقبة للمتقين والصلاة والسلام على سيدنا محمد وآله اصحابه جمعين

بعد حمد و مملوۃ گزارش آنکہ برادر عزیز مولوی حافظ عبدالوہید صدیق فچوری ریاست رام پور وغیرہ میں فنون کی تحصیل کے بعد جامعہ اسلامیہ ڈابھیل ضلع سورت میں بغرض تحصیل علم حدیث ۱۳۵۲ھ میں داخل ہوئے اسی سال حضرت علامہ سید انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی (جو اپنے زمانہ میں باعتبار علم و فضل و جامعیت کلمات نظیر نہیں رکھتے تھے) وفات ہوئی تھی لہذا برادر مذکور مع اپنے رفقاء کے اس عاجز و بچکان کے پاس تحصیل بعض کتب حدیث میں مشغول ہو گئے (صحیح بخاری ابتدا سے انتہا تک اور جامع ترمذی کا ایک حصہ اور دوسری کتب حدیث جامعہ اسلامیہ کے دوسرا سا تذکرہ کے ہاں ختم کیں، عزیز مذکور کی نجابت و سادہ۔ خوش اخلاقی۔ تہذیب و ششاسی اور تحصیل علم میں انتہائی کاوش کو دیکھتے ہوئے سب اساتذہ اور متعلمین جامعہ ان سے خوش رہے۔ اور میں بلا مبالغہ کہہ سکتا ہوں کہ میری عمر میں بہت تھوڑے طالب علم ایسے آئے ہیں جنہیں باوجود نوجوان ہونے کے صلاح و رشد۔ ذکاوت و فطانت۔ علمی استعداد اور ذوق صحیح اس طرح جمع ہوئے ہوں۔ مجھے اللہ کے فضل سے ان کی نسبت بہت اچھی توقعات ہیں اسلئے ان کو اجازت دیتا ہوں کہ کتب حدیث کے درس میں بشرطہ و طہ المقبوضہ مشغول رہیں اور علم دین کی خدمات ممکنہ انجام دیتے رہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمارا سبک خاتمہ اپنی خوشنودی میں فرمائے و ھو الھادی الی سواء السبیل شبیر احمد عثمانی دیوبندی عفا اللہ عنہ ۸ رتوال ۱۳۵۵ھ

(نوٹ) بوقت تحریر بالا حضرت دارالعلوم دیوبند کے صدر مہتمم تھے۔

میری لکھی ہوئی تقریر حضرت ہی کے پاس تھی کہ حضرت نے اگلے سال ۹ صفر ۱۳۵۳ھ میں والانامہ تحریر فرمایا، ازبندہ شبیر احمد عثمانی عفا اللہ عنہ بطلانہ برادر عزیز سلمہ اللہ تعالیٰ۔ بعد سلام سنون آنکہ تمہارے کئی خط پہنچے۔ میں پہلے تو مشغول رہا پھر تکلیف دانتوں میں ہو گئی اونکے نکلوانے میں کئی روز سے مبتلا ہوں۔ اب نیچے کے سب نکل گئے اوپر کے پانچ باقی ہیں وہ بھی ہفتہ عشرہ میں نکل جائیں گے اوکے تین مہینہ بعد مصنوعی دانت لگوانے کا خیال ہے۔ کھانے پینے کی بہت دقت ہے اور بولنے میں بھی قدرے تکلف ہوتا ہے۔ کئی روز سے سبق بھی نہیں پڑھایا۔ آپ کسی طرح کی ناراضی نہیں بلکہ تمہاری محبت اپنے دل میں محسوس کرتا ہوں۔ اور برابر خیال ہے کہ کسی مناسب موقع پر تمہیں کام میں لگادیا جائے۔ اپنے پاس یا کسی اور جگہ تم کچھ فکر مت کرو انشاء اللہ کوئی مناسب صورت نکل آئے گی۔ رجب الاول کے آخر میں قصد حیدر آباد جانے کا ہے وہاں کوئی موقع ہو تو خیال رکھا جائے گا بہر حال میں تمہاری غیر خواہی سے غافل نہیں۔ تمہاری لکھی ہوئی تقریر سے مجھے اس سال

بہت سہولت ہوگئی۔ لیکن اس کو ذرا تربیت و مہذب کرنے کا خیال ہے۔ اپنی خیریت سے مطلع کرتے رہا کرو۔ اپنے والد صاحب اور جملہ اعزہ و اقارب سے بندہ کا سلام کہیں اور میری صحت کے لئے دعا کرتے رہیں۔ از ڈا ہیمل ۶ مئی ۱۳۵۳ء

چونکہ اس خط کی روشنائی بہت ہلکی ہوگئی ہے اس لئے عکس صاف نہیں میں نے اسی غرض سے اپنے قلم سے اس تحریر کا نقل کر دیا ہے کہ اب تحریر کا پڑھنا انشاء اللہ آسان ہو جائے گا۔

مجھ کو اس جملہ سے کہ ”تمہاری لکھی ہوئی تقریر سے مجھے امسال بہت سہولت ہوگئی“ جو قدر خوشی ہوئی اس کا اندازہ بھی ہر ایک کو نہیں ہو سکتا۔ پھر اس کا انہار کہ اس کو مرتب و مہذب کرنے کا خیال ہے کیسے خوش کن اور حوصلہ افزا ہے۔ ایک بعد یہ تقریر برسوں حضرت ہی کے پاس رہی۔ حضرت والا نے حرف حرف اسے پڑھا کہیں کہیں اس پر حاشیے بھی تحریر فرمائے۔ جا بجا تصحیح بھی فرمائی۔ کہیں کتب کا حوالہ بھی دیا کہ وہاں دیکھو۔ غرض پوری تقریر من اولہ الی آخرہ حضرت غلام کی نگاہ سے گزر گئی۔ مہر صفر ۱۳۵۴ء کے ایک دارالافتاء میں کچھ اجزاء واپس فرماتے ہوئے تحریر فرمایا از بندہ شبیر احمد عثمانی عفا اللہ عنہ بطلالہ برادر عزیز سلسلہ اللہ تعالیٰ۔ بعد سلام مسنونہ آنکہ۔ عید الفرج سے بہت ہوں اس لئے جواب خطوط میں تاخیر ہو جاتی ہے۔ کچھ اور خیال نہ کریں۔ وہ تو میں سمجھتا ہوں کہ تم یہاں آنے سے معذور رہے۔ عذر واضح ہے مجھے اس پر ملال کیوں ہوتا۔ آپ مطمئن رہیں۔ الخبیر فیما دقع۔ بقیہ اجزاء تقریر کے عنقریب روانہ کر دیئے جائیں گے۔ اپنے والد۔ چچا۔ ماموں صاحبان کو اور سب گھر والوں کو سلام مسنونہ کہہ دیجئے۔ عزیزم مولوی محمد علی سلمہ کی طرف سے سلام مسنونہ۔

از ڈا ہیمل ضلع سورت ۶ مئی ۱۳۵۴ء

یہ سنہ ستاون یعنی پانچ سال بعد کا دارالافتاء ہے واقعہ یہ تھا کہ حضرت والا میری لکھی تقریر کی نقل کرا رہے تھے۔ جتنی نقل ہو جاتی واپس فرمادیتے اور صفر ۱۳۵۴ء تک جو اجزاء باقی رہ گئے تھے وہ وہی تھے جنکی نقل نہ ہو سکی تھی۔ اسکے بعد یہ اجزاء بھی نقل ہونے کے بعد حضرت والا نے واپس فرمادئے۔ الحمد للہ وہ پوری تقریر کتابی شکل میں میرے پاس محفوظ ہے۔ میں قریب قریب ہر سال رمضان المبارک میں حضرت کی خدمت میں حاضری دیتا رہتا۔ اس درمیان میں حضرت نے متعدد بار فرمایا اور تحریر بھی فرمایا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ تم میرے پاس رہو مگر میں اپنی والدہ مرحومہ کی پیرائے سالی کی وجہ سے نہ جاسکا۔ جامعہ اسلامیہ ڈا ہیمل کی صدارت تدریس کے زمانہ میں حضرت نے دوبارہ جامعہ میں تدریس کی خدمت کے لئے طلب فرمایا۔ پھر دارالعلوم دیوبند کی صدارت اہتمام کے دور میں دارالعلوم کے تکمیل معقولات کے درجہ کے لئے انتخاب فرمایا اور طلب فرمایا مگر یہ ناچیز اپنے بیجوریوں کی وجہ سے تعمیل کی سعادت حاصل نہ کر سکا۔ یا یوں سمجھ لیا جائے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ”مدرسہ اسلامیہ فتحپور“ ہی کی خدمت مقدس ہو چکی تھی اسلئے قدم کہیں نہ بچل سکے۔ حتیٰ کہ قریب تر جگہ لکھنؤ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے لئے محدودی حضرت مولانا محمد منظور نعمانی اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہما العالی نے متعدد بار طلب فرمایا مگر وہاں بھی حاضری نہ ہو سکی۔ تب میں سمجھا کہ بانی مدرسہ اسلامیہ فتحپور حضرت مولانا شاہ سید

محمد ظہور الاسلام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مجھے عربی شروع کرتے وقت جو جملہ فرمایا تھا کہ تم عربی شروع کرو تم سے کچھ اور کام لینا ہے دراصل یہی مدرسہ اسلامیہ کا کام لینا تھا۔ چونکہ وہ ایک خدا رسیدہ بزرگ تھے اگر انھیں یہ کشف ہوا تو تعجب نہیں۔ بفعل مایشاء و بحکم مایرید۔

فراغت کے بعد جب سے فقیر میں قیام ہوا تھا اسی وقت سے حضرت مولانا عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے بار بار امر فرمایا کہ محلہ کی مسجد میں درس قرآن شروع کرو۔ اس سے تم کو بھی فائدہ ہوگا اور سامعین کو بھی معرغالوا بوجہ اللہ اور احسانا کرنا معاوضہ کا خیال بھی نہ کرنا۔ ساتھ ہی مدینہ پر بس بجنور کا شائع کردہ اپنے ”فوائد القرآن“ والا قرآن پاک بہیہ رحمت فرمایا پھر والا نامہ آیا تو تاکید فرمائی اور جب میں نے تعمیل ارشاد میں درس قرآن شروع کر کے اطلاع دی تو بہت خوش ہوئے اور چند تفسیروں کے نام تحریر فرمائے کہ ان کو خاص طور سے مطالعہ میں رکھو۔ اللہ کا احسان ہے کہ اس سلسلے سے مجھ کو خود فائدہ پہونچا۔ اور قرآن پاک سے خصوصی لگاؤ پیدا ہو گیا۔ الحمد للہ والشکر والتمت کہ آج تک یہ سلسلہ جاری ہے اللہ تعالیٰ مقبول فرمائے اور میرے لئے وسیلہ نجات بنائے۔ اور رہبری فرمانے والے حضرت الاستاذ محمد اللہ تعالیٰ کے مراتب قرب میں ترقی و ازادیا نصیب فرمائے۔ آمین

میری دلی آرزو تھی کہ الاستاذ علامہ حضرت مولانا عثمانی کی صحیح بخاری شریف کی یہ دسی تقریر (جس پر حضرت کی اصلاحی نظر بھی پڑ چکی تھی اور جس پر حضرت نے حواشی کی شکل میں اضافے بھی فرمائے تھے) کسی طرح چھپ جاتی مگر خود اپنے میں اس کی استطاعت نہ تھی اور کسی سے کہنے سے جی مانع رہی تقریباً نصف صدی کی مدت اس طرح گزر گئی اور کوئی سبیل نہ رہی کہ اللہ تعالیٰ کی شان ہوالذی ينزل النبی من بعد ما قضاوا وینش رحمۃ کا نظور ہوا اس طرح کہ محمدی و محمدی حضرت مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہ العالی کو مولانا نسیم احمد صاحب فریدی (امروہی) کے ذریعہ اس کا علم ہوا۔ اور حضرت مولانا کو یہ بھی انھیں مولانا نسیم احمد صاحب سے معلوم ہوا کہ حضرت علامہ مولانا عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کو اس تقریر سے خاص دلچسپی تھی اور حضرت مدوح نے اپنے لئے اسکی ایک نقل دارالعلوم دیوبند کے چند خاص طلبہ سے اجرت دیکر کرائی تھی جن میں ایک خود مولانا فریدی بھی تھے۔ ایک دفعہ اتفاق سے میرا جانا لکھنؤ ہوا تو حضرت مولانا نعمانی نے تقریر کے بارے میں دریافت فرمایا۔ میں نے پورا واقعہ عرض کر دیا۔ حضرت مولانا نے تقریر طلب فرمائی میں نے بھیج دی۔ مولانا نے اسے دیکھ کر فرمایا کہ یہ حضرت مولانا عثمانی کی خاص یادگار اور ان کی علمی خصوصیات کی حامل ہے اسکو اسی طرح اور اسی حال میں چھپ جانا چاہیئے۔ یہ بھی فرمایا کہ اس کو آپ خود چھپوائیے یا پھر ”جامعہ اسلامیہ ڈابھیل“ کا حق ہے کہ وہ اس کو چھپوائے۔ چنانچہ جامعہ کے موجودہ مہتمم حضرت مولانا محمد سعید احمد بزرگ دامت فیوضہم سے اس سلسلہ میں خط و کتابت کی گئی اور بالآخر یہی طے ہو گیا کہ ”جامعہ اسلامیہ“ کی طرف سے اس کو چھپوایا جائے۔ مزید احتیاط و اطمینان کے لئے یہ بھی مناسب سمجھا گیا کہ اس پر ایک اصلاحی نظر حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی مدظلہ العالی کی پڑ جائے، تاکہ اگر کہیں مجھ سے بھول چوک ہوئی ہو یا عام ناظرین کو غلط فہمی سے بچانے کے لئے کسی مقام پر

و غایت کی ضرورت محسوس ہو تو اصلاح یا توفیق کر دیا جائے۔ اسکے لئے حضرت ممدوح مدظلہ العالی سے درخواست کی گئی اور میری اور کتاب کی انتہائی خوش قسمتی کہ حضرت ممدوح نے شدید ضعف کے باوجود حضرت علامہ عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ خصوصی تلمذ کے تعلق کی بنا پر اسکو منظور فرمایا اور تقریر کا مسودہ باعنان نظر ملاحظہ فرمایا اور فروری اصطلاحات و توضیحات فرمائیں اللہ تعالیٰ حضرت مولانا کو اس کا بہتر سے بہتر صلہ عطا فرمائے آمین،

پھر حضرت مولانا ہی سے اس پر مقدمہ لکھنے کی بھی درخواست کی گئی، حضرت ممدوح نے اس کو بھی بطیب خاطر منظور فرمایا، فالحمد للہ علی احسانہ، ناظرین کرام میری ان گذارشات کے بعد حضرت ممدوح کا مقدمہ بھی ملاحظہ فرمائیے۔ سب سے آخر میں کتابت اور طباعت کا مرحلہ تھا، اس ہفت خواں کو طے کرنے کی تعب میں بالکل صلاحیت نہ تھی، نہ میں اس کا کوئی انتظام ہی کر سکتا تھا، حضرت مولانا نعمانی نے حضرت مولانا اعظمی مدظلہ العالی کے فرزند اکبر مولانا رشید احمد اعظمی کو کسی نہ کسی طرح آمادہ کر لیا کہ وہ اس کی ذمہ داری قبول کر لیں، الحمد للہ کہ وہ آمادہ ہو گئے اور توفیقہ تعالیٰ ان کی توجہ اور محنت سے اتنا کام ہو گیا کہ کتاب کی پہلی جلد جو کتاب الایمان اور کتاب العلم پر مشتمل ہے، اور جو کتاب کا سب سے اہم حصہ ہے شائع ہو رہی ہے۔

”یہ جلد اول“ اس طرح شائع کی جا رہی ہے کہ اوپر صفحہ کی پیشانی پر بخاری شریف کا اصل متن ہے پھر اس کے ترجمہ دیا گیا ہے جو حضرت مولانا، وحید الزماں صاحب کا قدیم مستند ترجمہ ہے (اور حضرت الاستاذ علامہ رحمۃ اللہ علیہ بحیثیت ترجمہ اسکی تعریف و تحسین فرماتے تھے) اس ترجمہ کے بعد حضرت الاستاذ علامہ کی تشریحی تقریر ہے، اندازہ ہے کہ اس جلد کے بعد دو تین جلدیں اور ہوں گی اور تین یا چار جلدوں میں کتاب مکمل ہو جائے گی، اللہ تعالیٰ ان کی بھی اشاعت کا اسی طرح انتظام فرمادے، آمین،

میں صمیم قلب سے حضرت محدث جلیل مولانا الاعظمی مدظلہ العالی، حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانی مدظلہ العالی حضرت مولانا محمد سعید احمد بزرگ (مہتمم جامعہ اسلامیہ ڈابھیل) اور مولانا رشید احمد صاحب مفتاحی الاعظمی سب کا شکر گزار ہوں، اللہ تعالیٰ ان سب حضرات کو دنیا و آخرت میں اپنے فضل و کرم سے نوازے، اس کتاب کو اللہ تعالیٰ قبول فرمائے، حدیث نبوی کے اس تذہ اور طلبہ کے لئے نافع بنائے، آمین!

کاش عالم برزخ کے ارواح میں صاحب تقریر حضرت الاستاذ علامہ عثمانی رحمۃ اللہ کی روح کو اس کا علم ہو جائے اور خوشی ہو، وَمَا ذَلِكْ عَلَى اللَّهِ بِعَزِيزٍ، وَآخِرُ عَوَاظِنَ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ

عَاجِزٌ وَخَاطِئٌ
مُحَمَّدُ عَبْدُ الْوَحِيدِ فَتْحُ پُورِ

رمضان المبارک ۱۴۱۹ھ مطابق ستمبر ۱۹۹۷ء

مختصر تذکرہ

حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ

[اس تذکرہ کے مندرجات زیادہ تر مولانا مفتی قیق الرحمن عثمانی صاحب کے ایک مقالے سے ماخوذ ہیں]

ولادت مولانا کی ولادت ۲۷ محرم ۱۳۰۶ھ (مطابق ۱۸۸۷ء) کو ہوئی۔ ان دنوں ان کے والد ماجد مولانا فضل الرحمن

”فضل اللہ“ رکھا، لیکن دوسرا نام (غالباً عشرہ محرم میں پیدائش کی مناسبت سے) شبیر احمد رکھا گیا اور اسی سے مشہور ہوئے

ابتدائی تعلیم ۱۳۱۲ھ میں دارالعلوم دیوبند کے درجہ قرآن کے استاذ حافظ عبدغنی صاحب کے سامنے ”بسم اللہ“ کی تقریب ہوئی۔ اور قرآن مجید ہی کے ساتھ اردو کی کچھ کتابیں بھی پڑھیں۔ ۱۳۱۴ھ میں دارالعلوم

ہی میں حساب کے مشہور استاد منشی منظور احمد صاحب سے حساب اور فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ اور فارسی کی ادھر کی کتبائیں استاد اکل مولانا محمد حسین صاحب (والد ماجد مولانا مفتی محمد شفیع صاحب) سے پڑھیں۔

عربی تعلیم اور فراغت ۱۳۱۹ھ میں دارالعلوم میں عربی کی تعلیم شروع کی اور ۱۳۲۵ھ (مطابق ۱۹۰۷ء) میں دورہ حدیث سے فارغ ہوئے اور امتحان میں سب سے اعلیٰ نمبر کا امتیاز حاصل کیا۔

تدریس فراغت کے بعد چند مہینے دارالعلوم میں درس دیا۔ پھر مدرسہ عالیہ پنجپوری دہلی میں صدر مدرس ہو کر تشریف لے گئے۔ قریباً دو ہی سال بعد ربیع الثانی ۱۳۳۰ھ (اپریل ۱۹۱۱ء) میں دارالعلوم کا دہرائی جیلے

دستار بندی ہوا جس سے دارالعلوم کی زندگی کا نیا دور شروع ہوا، اس جلسہ میں مولانا نے وہ پہلی تقریر فرمائی جس سے ان کے جوہر نمایاں ہوئے، اسی سال شوال میں مولانا کا استاذ کی حیثیت سے دارالعلوم میں باضابطہ تقرر ہوا بشرط میں مختلف علوم و فنون کے اونچے درجے کے اسباق متعلق رہے۔ ۱۳۳۵ھ (مطابق ۱۹۱۵ء) میں جب حضرت شیخ المنہ نے اپنے مجاہدانہ منصوبہ کے مطابق حجاز مقدس کا سفر فرمایا تو اسکے بعد سے خصوصیت سے مسلم شریف مولانا کے زیرِ درس رہی۔ مطالعہ بھی وسیع تھا غیر معمولی ذہانت کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے حسن بیان اور خطابت کا کمال بھی عطا فرمایا تھا اس نے مولانا کا صحیح مسلم کا درس اپنی خصوصیات کے لحاظ سے بے مثال ہوتا تھا۔ ان کے درس صحیح مسلم کی نوعیت کا کچھ اندازہ ان کی کبھی ہوئی صحیح مسلم کی شرح ”فتح الملعونہ“ سے کیا جاسکتا ہے، جسکی تالیف کا کام اسی زمانے میں شروع ہوا تھا۔ دارالعلوم میں

مولانا کا صحیح مسلم کا یہ درس تسلسل کے ساتھ ۱۳۴۲ھ تک جاری رہا۔

۱۳۴۲ھ کی مکہ مکرمہ کی (۱۳۴۲ھ کے حج کے موقع پر دہائی نجد و تہذیب سلطان عبدالعزیز بن سعود نے) جن کا حجاز مقدس موقر عالم اسلامی میں شرکت پر قریباً ایک ہی سال پہلے تسلط و اقتدار قائم ہوا تھا) مکہ معظمہ میں عالم اسلامی کی ایک اہم و موقر بلاتی جس میں ہندوستان سے جمعیۃ علماء ہند کو بھی اپنا نمائندہ وفد بھیجنے کی دعوت دی گئی تھی۔ مولانا اس دور میں جمعیۃ کے ممتاز ترین ارکان میں سے تھے۔ جمعیۃ کی طرف سے جو فنداس موقر میں شرکت کے لئے گیا، اس میں آپ بھی تھے۔ اگرچہ عربی میں تقریر و خطابت کی مولانا کو عادت نہ تھی لیکن اس موقر میں انھوں نے جو فاضلانہ تقریریں کیں اور جس طرح اپنا نقطہ نظر پیش کیا اس کی وجہ سے جمعیۃ کے وفد کو اس موقر میں خاص امتیاز حاصل رہا۔ یہ سفر ۱۳۴۲ھ کے اواخر میں ہوا تھا۔ واپسی پر کچھ عرصہ تک صحت خراب رہی اور غالباً اسی سال آنکھ کا آپریشن بھی ہوا۔

ان حالات کی وجہ سے اُس تعلیمی سال (۱۳۴۲-۴۳ھ) میں صحیح مسلم کا درس مولانا نہیں دے سکے۔ جبکہ دارالعلوم کے اس سال کے دورۂ حدیث کے طلبہ نے اپنا پڑا خرابہ محسوس کیا۔

دیوبند سے ڈابھیل اور اسکے اگلے سال اللہ تعالیٰ کی تکتوینی مشیت اور تضرار و قدر کے فیصلوں کے نتیجہ میں دارالعلوم میں وہ وہاں تدریس۔ حالات پیدا ہو گئے جن کی وجہ سے مولانا ممدوح اور اس وقت کے صدر المدین حضرت مولانا محمد نور علیؒ اور ان کے ساتھ متعدد دوسرے اساتذہ نے دارالعلوم سے قطع تعلیق کا فیصلہ کر لیا۔ اور پھر ڈابھیل (گجرات) کے ”جامعہ اسلامیہ“ کو یہ شرف و امتیاز حاصل ہو گیا۔

غنی روز سیاہ پر کنکشاں راتما شاکن کہ نور دیدہ اشش روشن کند چشم زلیخارا
ڈابھیل کے جامعہ اسلامیہ میں مولانا نے چند سال تک ترمذی شریف کا درس دیا پھر ۱۳۵۲ھ میں حضرت مولانا محمد نور شاہ صاحبؒ کی وفات کے بعد بنجاری شریف کا درس آپ ہی نے دیا۔ اسی سال (۱۳۵۲ھ میں) جامعہ اسلامیہ کی دورۂ حدیث کی جماعت میں مولانا محمد عبدالوحید صاحب فقہوری بھی شریک تھے۔ انھوں نے مولانا کی درس بنجاری کی تقریر قلمبند کرنے کا خاص اہتمام کیا تھا وہی تقریر اس کتاب کی شکل میں آپ کے سامنے ہے۔

حسن بیان اور خطابت
اللہ تعالیٰ نے مولانا کو حسن بیان اور دلکش و دلنشین خطابت کے کمال سے بھرپور نوازا تھا۔ جنھوں نے مولانا کی تقریر نہیں سنی ان کو اب کسی طرح اس کا اندازہ نہیں کرا جاتا۔
کاش اُس زمانہ میں ریکارڈنگ کا وہ انتظام ہوتا جو آج میسر ہے۔

تصنیف و تالیف
درس و خطابت کے علاوہ مولانا نے قلم کے ذریعہ بھی دین اور علم دین کی وہ خدمات انجام دیں جن سے امت اور خاص کر اسکے اہل علم انشا اللہ صدیوں تک استفادہ کریں گے۔ ”الاسلام“، ”العقل و النقل“، ”الدار الاحدہ“

اعجاز القرآن، ”الشہاب“، ”تحقیق خطیہ جمعہ“، ”سجود اشمس“، ”حجاب شرعی“، ”خوارقِ عادات“، ”الروح فی القرآن“ مولانا کے یہ وہ رسائل اور مقالات ہیں جن میں سے ہر ایک ان کی غیر معمولی ذہانت، وقت نظر، جدید ذہن سے واقفیت اور مشکل مسائل کی تفہیم پر غیر معمولی قدرت کا آئینہ دار ہے۔

تفسیری فوائد قرآن مولانا کا سب سے عظیم تصنیفی کارنامہ حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمہ قرآن پر بطور حاشیہ لکھے ہوئے تفسیری فوائد ہیں جو فی الحقیقت قرآن حکیم کی مکمل تفسیر ہیں۔ جو صاحبِ علم قدیم تفسیر کا ذخیرہ سامنے رکھ کر ان کا مطالعہ کرے گا اس کو محسوس ہوگا کہ کتب تفسیر کا عطر کھینچ کر ششہ اردو میں قلبندہ کر دیا گیا ہے۔ مختصر عبارتوں اور تہلیلوں میں اہل زین و ضلال کی تادیبوں اور تحریفوں کی اطمینان بخش تردید بھی کر دی گئی ہے۔۔۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے مرض وفات میں مولانا جب عیادت اور زیارت کے لئے ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضرت نے فرمایا: ”میں نے اپنا تمام تہجد وقت کر دیا ہے صرف دو چیزیں جو مجھے زیادہ محبوب ہیں اپنے پاس رکھ لی ہیں ایک آپ کے حاشی والی قرآن مجید اور دوسری کتاب ”جمع الفوائد۔“

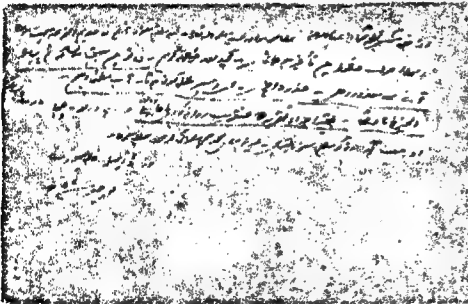
فتح الملہم جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے جس زمانہ میں مولانا دارالعلوم دیوبند میں مسلم شریعت کا درس دیتے تھے اسی زمانہ میں اس کی یہ شرح لکھنی شروع کی تھی۔ بعض موانع کی وجہ سے یہ کام تسلسل کے ساتھ جاری نہیں رہ سکا۔ طباعت کا مرحلہ بھی مشکل اور وسائل طلب تھا پھر اللہ تعالیٰ نے اُس وقت کی ریاست حیدرآباد کو اس کا وسیلہ بنا دیا۔ یہ شرح صرف کتاب النکاح تک لکھی جاسکی ہے جو تین ضخیم جلدوں میں شائع ہو چکی ہے۔ اس کی زبان عربی ہے یہ کتاب مولانا کے علمی امتیاز و کمال اور خاص کرفن حدیث اور فہم فی الدین میں ان کے بلند مقام کا پورا آئینہ ہے۔ کاش یہ پوری ہو جاتی۔

سیاسی بصیرت و ملی خدمات سیاسی بصیرت کے لحاظ سے بھی اپنے طبقہ میں مولانا کا خاص مقام تھا۔ پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴ تا ۱۹۱۸ء) کے بعد تحریک خلافت کے آغاز میں جب حضرت شیخ الہندؒ اسارتِ مالٹا سے رہا ہو کر تشریف لائے تو ان کے آخری لمحو حیات تک مولانا عثمانی ہی ان کی زبان اور ان کا قلم رہے ”جامعۃ اسلامیہ“ کے نائیبی اجلاس علیگڑھ اور جمعیتہ علماء ہند کے اجلاسِ دہلی وغیرہ میں حضرت شیخ الہندؒ کے جو خطبے اور پیغامات پڑھے گئے (حضرت شیخ الہندؒ کی شدید علالت اور غیر معمولی ضعف و نقاہت کی وجہ سے اُن کے حکم سے) وہ مولانا ہی کے قلم سے لکھے ہوئے ہوتے تھے۔ اور مولانا ہی ان کے پڑھنے والے ہوتے تھے۔ اسکے بعد سے برابر جمعیتہ علماء ہند کے صنفِ اول کے ارکان بلکہ رہنماؤں میں رہے۔ واقعہ یہ ہے کہ زمانہ دراز تک جمعیتہ کا پلیٹ فارم ان کی تقریروں سے گرم اور پُر رونق رہا۔ لیکن ملک کی تقسیم سے چند سال قبل جمعیتہ کے طریق کار سے ان کو اختلاف پیدا ہو گیا تھا ان کی شدت اور مضبوطی کے ساتھ یہ رائے ہو گئی تھی کہ اب جبکہ ملک کی آزادی سامنے ہے ہمیں کانگریس کے واسطے سے اس ملک کی اکثریت سے باضابطہ معاہدہ کرنا چاہیے۔ اس سے پہلے اس مرحلہ پر کانگریس

کی غیر مشروط حمایت کی پالیسی سے ان کو اختلاف تھا۔ اس موضوع پر تبادلہ خیالات اور مکالمات بھی ہوئے لیکن افسوس ہے کہ خیالات میں اختلاف و بعد رفتہ رفتہ بڑھتا ہی گیا اور ایک قابل فخر ہستی کو جمعیت علماء ہند کے اُس کے نظام سے بے تعلق ہونا پڑا اور اس کا آخری انجام یہ ہوا کہ انھوں نے مسلم لیگ کے مطابق پاکستان کی حمایت کا فیصلہ کر لیا۔ پھر ملک تقسیم ہوا اور مولانا نے پاکستان کو شرعی نصب العین کے مطابق ”اسلامی مملکت“ بنوانے کے لئے وہیں جانے کا فیصلہ کر لیا اور ہم اس خزانہ علم و دانش سے محروم ہو گئے۔

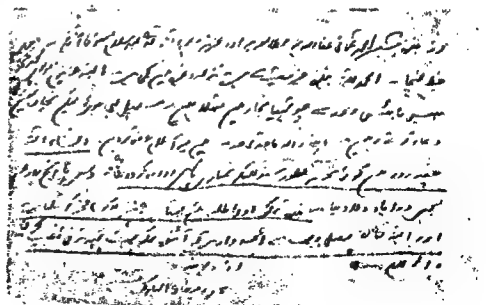
وفات

۸ دسمبر ۱۹۴۹ء کو بھادوپور کے وزیر اعظم کی درخواست پر ”جامعہ اسلامیہ“ کے افتتاح کے لئے تشریف لے گئے ۱۲ دسمبر کی شب میں بخار ہوا، صبح طبیعت بہتر ہو گئی، ۹ بجے پھر سینہ میں تکلیف محسوس ہوئی سانس میں رکاوٹ ہونے لگی۔ ۱۳ دسمبر ۱۹۴۹ء مطابق ۲۱ صفر ۱۳۶۹ء شنبہ کے روز ۱۱ بجکر ۴۰ منٹ پر یہ آفتاب علم و فضل غروب ہو گیا۔ بوقت وفات ۶۴ سال ایک ماہ ۱۲ یوم کی عمر تھی رحمہ اللہ تعالیٰ رحمت و واسعت۔



عکس تحریر

حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی مدظلہ العالی



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

مختصر سوانح امام بخاری

[بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَآلِہٖ وَسَلَّمَ اَجْمَعِیْنَ]

اما بعد:- چونکہ اساتذہ کی عادت ہے کہ پہلے مصنف کا کچھ ذکر کرتے ہیں، اس لئے تینا کچھ ان کا (امام بخاری) کا ذکر کیا جاتا ہے۔

ان کا نام محمد ہے، نسب یہ ہے محمد بن اسمٰعیل بن ابراہیم بن مغیرہ بن بردزبہ۔
سوانح امام بخاری
 بردزبہ کے متعلق یہ تصریح ہے کہ مسلمان نہیں ہوئے یہ جو سی تھے، امام بخاری کے ابداد میں سب سے پہلے مغیرہ نے اسلام قبول کیا، جو بیٹے ہیں بردزبہ کے، وہ بیان جعفی کے ہاتھ پر جو والی بن راتھا مسلمان ہوئے، اسی سے جعفی کہلاتے ہیں، نسب کے اعتبار سے نہیں ولا کے اعتبار سے، مغیرہ کے بیٹے ابراہیم کا ذکر کتابوں میں نہیں ملتا،

اسمٰعیل کا ذکر ابن جان نے (کتاب الثقات میں) کیا ہے، اچھے علماء میں سے تھے، ذہبی کی تاریخ الاسلام [بلکہ خود تاریخ بخاری] میں ہے کہ ان کو ابن مبارک کی صحبت رہی ہے، حماد بن زید وغیرہ سے روایت کرتے ہیں، انقیار میں سے تھے، جب ان کا انتقال ہونے لگا تو بعض محدثین موجود تھے، ان کے سامنے فرمایا کہ اس مال میں جو میں نے چھوڑا ہے ایک درہم بھی ایسا نہیں ہے جس میں حرام کا شبہ بھی ہو، کہنے کو یہ معمولی بات ہے مگر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت بڑی چیز ہے کہ کوئی درہم شبہ بھی نہ ہو حرام تو درکنار، اس مال سے پرورش ہوئی تھی امام بخاری کی، والدین کی نیت تقویٰ و اخلاص کا اثر ضرور اولاد پر ہوتا ہے۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت ۱۹۷ھ میں ہوئی اور ۲۵۶ھ میں انتقال فرمایا، رحمہ اللہ رحمۃ واسعة صغیر سن (بچپن) میں ینائی جاتی رہی تھی، والدہ محترمہ بہت دور دروگر ان کے لئے دعا میں کرتی تھیں، خواب میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو دیکھا کہ فرماتے ہیں ”اللہ تعالیٰ نے تیری کثرت دعا کی وجہ سے تیرے بچے کی آنکھیں واپس فرما دی ہیں“

(۱) دو مرتبہ خطوط کے درمیان جو عبارت جہاں بھی ہے، مرتب تقریر کی طرف سے اضافہ ہے ۱۷ مرتب

صبح کو دیکھا تو آنکھیں درست تھیں، بینائی واپس آگئی تھی، یہاں تک مومنین کا بیان تھا، آگے خدا ان کا بیان سنئے :-

ابو جعفر وراق نے امام بخاری سے سوال کیا کیف کان بدعا مولا، جواب میں فرمایا کہ جب میں مکتب جاتا تھا اسی وقت مجھے حفظ حدیث کا الہام کیا گیا اس وقت میری عمر دس سال یا کچھ کم تھی، مکتب سے نکلنے کے بعد میں داخل وغیرہ کے پاس جایا کرتا تھا، ایک بار انھوں نے فرمایا [سفیان] عن ابی الزبیر عن ابراہیم، میں ٹوٹا کہ ابوالزبیر ابراہیم سے روایت نہیں کرتے فانتھری تو انھوں نے مجھے جھڑک دیا، میں نے پھر عرض کیا کہ آپ اپنی یادداشت دیکھ لیں پھر فرمائیں، تو اٹھ کر گھر تشریف لے گئے، یادداشت دیکھی۔ واپس تشریف لائے تو فرمایا کیف ہو یا غلام! میں نے عرض کیا ہو الزبیر (بن عدی) [عن ابراہیم] یعنی ابوالزبیر کے بھائے زبیر بن عدی صحیح ہے یہ سن کر اساتذہ نے میرا ہی قلم لے کر اسے درست فرمایا، اس وقت میری عمر گیارہ سال کی تھی۔

سولہ سال کی عمر میں ابن مبارک، دکیع اور اصحاب الہائے کی کتابیں یاد کر لیں، اٹھارہ سال کی عمر میں کتاب قضایا الصحابة والتابعین لکھی، تاریخ کبیر بھی اسی عمر میں لکھی ہے، اس تاریخ کبیر کے بارے میں محدثین فرماتے ہیں کہ اگر ہزاروں کتابیں دیکھ لے تب بھی تاریخ کبیر سے استغناء نہیں ہو سکتا، ایک ہزار اشیا اساتذہ سے علم حاصل کیا ہے، انہیں کوئی ایسا نہیں ہے جو محدث نہ ہو، آگے خود کھولتے ہیں کہ جس کا یہ مذہب نہ ہو کہ الایمان قول و عمل یزید و ینقص، جن حضرات کا یہ مسلک نہیں میں نے ان سے علم نہیں لیا، چھ لاکھ احادیث و آثار محفوظ تھے، جن سے یہ جامع (بخاری) تیار کی ہے، چھ لاکھ کی تنقید کرتے کرتے مرفوعات ۹۰۸۳ باقی رہیں، مع مکرات (قطلانی) موقوفات و مکرات اس کے علاوہ ہیں، موقوف قول صحابی کو کہتے ہیں، اور مقطوع قول تابعی کو، منقطع وہ ہے جس میں واسطہ چھوٹ جائے، مکرر و معلق سب ملا کر ۹۰۸۳ ہیں، پھر یہی نہیں کہ صرف یاد ہوں، بلکہ تفقہ و معرفت رجال اور تنقید [متون کا] ملکہ بھی حاصل تھا، امتیاز بین السقم و الصحة ان کی خاص چیز ہے، حافظہ کا یہ حال تھا کہ خود کہتے ہیں کہ رفتار دوم جماعت دیکھتے کہ میں کچھ لکھتا نہیں، ایک مدت کے بعد ایک ساتھی نے کہا تم کچھ نہیں ہو یا دیکھے رکھو گے، میں نے کہا تمہارے پاس کتنی حدیثیں ہیں، یادداشتیں لے کر بیٹھ جاؤ، وہ بیٹھ گئے میں نے سب حدیثیں بالترتیب سنا دیں، تب وہ سمجھ کہ اللہ نے حفظ کا یہ کمال نصیب فرمایا ہے کہ ترتیب تک نہ بدلی اور سب کی سب سنا دیں، ہمارے اس دور میں رحمہ اللہ کا نمونہ حضرت النور کشمیری رحمہ اللہ رہتے۔

امام بخاری کے قوی احفاظہ ہونے کی خبر بہت عام ہو چکی تھی، جب وہ بغداد پہنچے تو وہاں کے محدثین نے ان کا امتحان کرنا چاہا۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری کے مقدمہ میں اس واقعہ کو اس طرح تحریر فرمایا ہے کہ یثین

نے سو حدیثیں چھانٹیں اور انھیں الٹ پلٹ کر اس طرح کر دیا کہ ایک حدیث کا متن لیا اور دوسری حدیث کی سند اس کے ساتھ جوڑ دی، دوسری حدیث کی سند لی تیسری حدیث کے متن سے اسے جوڑ دیا، اس طرح ان سو حدیثوں میں رد و بدل کر دیا کہ جب امام بخاری تشریف لائیں گے تو ان سے پوچھیں گے، انھوں نے دس آدمیوں کا انتخاب کیا اور ہر ایک کو دس دس حدیثیں دیں اور یہ سمجھا دیا کہ اسی رد و بدل کے ساتھ امام بخاری کو ایک ایک کر کے سنانا اور ان سے جواب لینا وہ تیار ہو گئے اور اب امام سے مجلس [منقہ کرنے] کی درخواست کی گئی، امام نے اس کو قبول فرمایا، جب مجلس منعقد ہوئی تو عوام و خواص کا بڑا مجمع ہو گیا ان میں بہت سے اہل خراسان، اور بہت سے اہل بغداد و علماء و محدثین وغیرہ سب ہی تھے، جب مجلس جم گئی تو کبھی بدی بات کے مطابق ان دس میں سے ایک کھڑا ہوا اور ایک حدیث بدلی ہوئی حدیثوں میں سے پڑھی پڑھ کر جواب کا انتظار کیا، امام نے سن کر فرمایا لا اعرف، میں اسے نہیں جانتا، اس نے فوراً دوسری پڑھی، امام نے اسکو سن کر بھی لا اعرف، فرمایا، اس نے تیسری، چوتھی، دسویں تک ایک ایک حدیث پیش کر دی، امام نے ہر ایک کے جواب میں صرف لا اعرف، فرمایا، اور [اس سے زیادہ] کچھ نہ کہا، پھر دوسرے صاحب کھڑے ہوئے انھوں نے بھی ایک ایک کر کے دسوں حدیثیں سنا ڈالیں، امام نے بھی ہر ہر حدیث پر وہی جملہ لا اعرف، دہرایا، اور دہراتے رہے، پھر تیسرے، چوتھے سے دسویں صاحب تک اسی طرح دس دس حدیثیں پیش کرتے رہے اور ان سب کے جواب میں امام بخاری وہی جملہ دہراتے رہے، اہل علم تو شروع ہی میں سمجھ گئے کہ یہ شخص واقعی اپنے درجہ کا ہے، کسی کے دھوکے میں نہ آنے کا، مگر عوام سمجھے کہ یوں ہی شہرت تھی، ایک دھونگ تھا، حقیقت کچھ نہ تھی، جب وہ سب اپنے ترکش خالی کر چکے اور ان کی بنائی ہوئی ساری حدیثیں ختم ہو گئیں، تب امام نے سب پہلے شخص کو مخاطب کر کے فرمایا، تم نے پہلی حدیث یوں پڑھی، اور اُسی طرح پڑھ کر سنایا جس طرح اُس نے پڑھی تھی، پھر فرمایا یہ حدیث اس طرح نہیں بلکہ اس طرح ہے، یہ کہہ کر اسے صحیح طرح پڑھ کر درست فرما دیا، اور جو سند جس متن کے ساتھ تھی اس کو اسی کے ساتھ ذکر کیا، اسی طرح اس کی دسوں حدیثیں اسی ترتیب کے ساتھ جس ترتیب سے اس نے سنائی تھی ایک ایک کر کے سناتے اور اس کی غلطی ہر ہر حدیث میں بتاتا کہ ساری حدیثیں صحیح سند اور صحیح متن کے ساتھ جوڑ کر سنا دیں، پھر دوسرے شخص کی طرف متوجہ ہوئے اس کی بھی دس حدیثیں تھیں، امام نے اسی ترتیب کے ساتھ اس کی حدیثیں سنائیں اور ہر ایک کی غلطی بتاتے ہوئے سب کی صحیح سندیں صحیح متون سے جوڑ کر سنا دیں، پھر تیسرے پھر چوتھے یہاں تک کہ دسویں صاحب تک سب کے ساتھ یہی کیا کہ پہلے اسی کی ترتیب سے سنائی ہوئی حدیث اسی شان سے پڑھتے جس شان سے اس نے پڑھی تھی، پھر اس کی غلطی بتاتے پھر اس کی تصحیح منسرد کر کے بتاتے کہ یہ سند اس متن حدیث کی ہے اور یہ متن حدیث اس سند کا ہے، سب علماء و محدثین اور مشائخ و بزرگ رہ گئے

اور سب امام کا فضل ماننے پر مجبور ہو گئے۔

حافظ نے یہ واقعہ نقل کر کے فرمایا کہ امام کا بڑا کارنامہ یہاں صرف یہی نہیں ہے کہ انھوں نے بدلی ہوئی صحیح کر دیں، وہ حافظ حدیث تھے کر سکتے تھے، ان کا یہاں بڑا کارنامہ یہ ہے کہ صرف ایک بار سن کر ان کی بدلی ہوئی سندوں کو اسی ترتیب سے یاد رکھا جس ترتیب سے ان ولس آدمیوں نے سو حدیثیں بدل بدل کر سنائی تھیں، یہ امام کا کمال تھا کہ سو حدیثیں ایک ہی مجلس میں صرف ایک بار سن کر ایسی محفوظ کر لیں کہ نہ سندوں اور متنوں میں فرق آیا، نہ ترتیب میں، ذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔

اور یہ امام کی وہ عمر تھی جب آپ کی داڑھی کا ایک بال بھی سفید نہ تھا، مگر بڑے بڑے پایہ کے لوگ زانوئے ادب تکررتے تھے، جب امام بصرہ پہنچے تو اعلان عام ہو گیا کہ حدیث کا املا ہو گا جس کا جی چاہے سنے، بڑا مجمع ہو گیا، جب ممبر بیٹھ تو فرمایا اَنَا رَجُلٌ شَابٌ (میں ایک جوان آدمی ہوں) اور آپ لوگ بزرگ ہیں آپ کے سامنے کیا کہوں، مگر آپ کا اصرار ہے تو میں صرف وہ احادیث سناؤں گا جو میں تو بصرہ ہی کی، مگر آپ کے پاس نہیں ہیں، پھر ایک حدیث سنائی اور فرمایا یہ حدیث تمہارے پاس اس سند سے ہے، اور وہ سند سنائی اور پھر فرمایا مجھے اس سند سے پہنچی ہے۔ پوری مجلس میں ساری حدیثیں اسی قسم کی سنائیں، لوگ حیران تھے کہ اللہ نے کیا نعمت عطا فرمائی ہے، یہ تو حافظ اور علم کا حال تھا، اسی کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے تقویٰ اور فصیح کے اپنے درجہ سے بھی نوازا تھا، ان کے ورع کا ایک واقعہ سنو، امام کا حال یہ تھا کہ کچھ اپنے پاس رکھتے نہ تھے، جو کچھ آتا اسے فوراً علحدہ کر دیتے، اور وہ رقم کسی اچھے مصرف میں صرف فرما دیتے، تا جراتک میں رہتے کہ کچھ امام کے پاس پہنچے تو جلد پہنچ کر کم سے کم پر معاملہ کر لیں پھر نفع کمائیں، اتفاق سے ایک مرتبہ کہیں سے کچھ قیمتی سامان آیا، تا جردن کو بھنک مل گئی، ایک تاجر بسمت کر کے پہنچ گیا اور امام سے عرض کیا کہ یہ مال اس قیمت کا ہے، میں اس پر پانچ ہزار درم نفع ایک دوں گا، مجھے دیدیتے، جواب میں فرمایا، کل پھر آتا تب آخری بات ہوگی، اس کے جانے کے بعد دوسرا تاجر پہنچے، اور عرض کیا کہ میں ولس ہزار نفع دوں گا مجھے دیدیتے، امام نے فرمایا کہ پہلے صاحب نے جب بات کی تھی اور پانچ ہزار کی پیشکش کی تو میں نے زبان سے تو کہہ دیا تھا کہ کل آتا تب آخری بات ہوگی، مگر میں نے دل میں نیت کر لی تھی کہ انھیں کو یہ مال دیدوں گا اب میں مزید نفع کی خاطر اپنی نیت نہ بدلوں گا، اور مال پہلے تاجر ہی کو دوں گا، غور کر دشرعاً وہ اس کے پابن نہ تھے، مگر میں نے جو کہا کہ اللہ نے ان کو ورع و تقویٰ سے نوازا تھا، تو یہ دقاتق تقویٰ میں سے ہے کہ صرف نیت کی تھی تو اسے بھی نہیں بدلا، اور کم پر قناعت فرمائی، پھر عمل کا حال یہ تھا کہ رمضان مبارک میں دن کو روزانہ ایک ختم پڑھتے اور سحر کے وقت دس بارہ پارے پڑھتے تھے، اس طرح ہر تیسری رات کو ایک ختم کرتے تھے، اور تراویح کی ہر رکعت میں بیس آیتیں پڑھتے تھے، اپنی اس کتاب کے لکھنے میں ان کا یہ معمول تھا کہ ہر باب پر دو رکعت نماز پڑھتے تھے پھر لکھتے تھے، حقیقت

یہ ہے کہ ائمہ نے جس مقام پر امام کو کھڑا کرنا چاہا تھا، اس کے اسباب بھی پیدا فرمادیئے تھے اور امام کو ان پر عمل کرنا آسان بنا دیا تھا، بخاری ہی میں کسی کا مقولہ ہے کہ ”تقویٰ اسہل شی (بڑی آسان چیز ہے) کیونکہ دعایہ میں ایک الی مالایہ میں ایک الی ہی جملہ تو ہے، تو ان پر کیا مشکل ہے، امام بخاری کے لئے ائمہ نے واقعی اسے اسہل شی بنا دیا تھا، ابو داؤد (محدث مشہور) کے بارے میں آیا ہے۔

لان الحدیث وعلمہ بکمالہ لامام اہلیہ الخ داؤد
مثل الذی لان الحدید وسکیہ لنبی اہل زمانہ داؤد

[یعنی اسحاق صنعانی اور ابراہیم حربی کا قول ہے۔ جس کو کسی نے منظوم کر دیا ہے۔ مرتب]

یہ ابو داؤد کے بارے میں ہے، تو بخاری کا درجہ تو ابو داؤد سے بہت ارفع ہے، [اور ان دونوں میں] ایسا ہی فرق ہے جیسا کہ مونیہ کے ہاں ابو احمال اور ابن احمال کا فرق ہے، ابو احمال وہ ہے جس پر حال کا غلبہ نہ ہو بلکہ حال مغلوب ہو اور یہ اس پر غالب ہو، اور ابن احمال وہ ہے کہ جس پر حال غالب ہو اور یہ اس سے مغلوب ہو۔ فن کے اعتبار سے معلوم ہوتا ہے کہ امام بخاری ابو الفتن ہیں، اور ابو داؤد بلکہ مسلم بھی ابن الفتن ہیں، ابو الفتن ہونے کی ایک مثال سنو، امام بخاری جو فن کے امام ہیں علل کے بھی امام ہیں، ایک مرتبہ امام مسلم نے ان کی پیشانی کا بوسہ دیکر اجازت چاہی کہ اے استاذ الاساتذہ، اے سید المحدثین، اے طیب الحدیث فی عللہ، مجھے اجازت دیجئے کہ آپ کے دونوں پیروں کو بوسہ دوں پھر حدیث کفائہ مجلس سنائی، ابن جریر حدیثی موسیٰ بن عقبہ عز سہیل عن ابیہ عن ابی ہریرہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: کفایتہ المجلس ان یقول اذا قام من مجلسہ: سبحانک اللہ ربنا و بحمدک اور اسے سن کر ایک روایت کے مطابق پوچھا کہ اس سند کے ساتھ دنیا میں اور کوئی حدیث بھی ہے؟ تو امام بخاری نے امام مسلم کی اس طرح تصویب فرمائی کہ ہذا حدیث ملیم ولا اعلم بہذا الاسناد فی الدنیا حدیثا غیر ہذا الا انہ معلول، امام مسلم یسئل کہ یہ حدیث معلول ہے کانپ گئے اور لا الہ الا اللہ کہا، کیونکہ اپنی سمجھ سے ایک نادر چیز پیش کی تھی اور وہ امام کے ہاں معلول قرار پائی تو امام حیران رہ گئے۔ اور عرض کیا کہ آپ وہ ملت بیان فرمائیں، جواب میں فرمایا اس پر پردہ ہی پڑا رہے دو، یہ حدیث بڑی حلیل القدر ہے۔ اے بہت سے لوگوں نے حجاج بن محمد بن عہد عن ابن جریر کے واسطے سے بیان کیا ہے، مگر امام مسلم نہ مانے پیچھے لگ گئے۔ امام کے سر کا بوسہ دیا، اور قریب رونے کے ہو گئے تب امام نے فرمایا، اچھا بھی تو لکھو اگر ضروری سمجھتے ہو۔ لکھو حدیثنا موسیٰ بن اسمعیل حدیثنا وحبیب حدیثنا موسیٰ بن عقبہ عن عہد بن عبد اللہ قولہ اور فرمایا کہ موسیٰ بن عقبہ کا سہیل سے کسی سند کا روایت کرنا مذکور نہیں ہے لہ

امام مسلم بولے بس آپ تو صرف حاسدی بغض رکھے گا یہ واقعہ اس لئے سنایا کہ تمہیں معلوم ہو جائے کہ بخاری ابوالفضل ہیں، اور مسلم جیسا اونچے درجہ کا محدث ابن الفضل، اور سنو، جب امام نیشاپور کی طرف چلے اور امام کے استاذ محمد بن یحییٰ ذہلی کو اس کا علم ہوا، تو آپ نے اعلان کر دیا کہ بخاری آرہے ہیں ان کے استقبال کو چلو، [میں بھی ان کا استقبال کر دنگا]، چنانچہ انھوں نے اور اکثر علمائے نیشاپور نے دو یا تین منزل آگے بڑھ کر ان کا استقبال کیا، لکھا ہے کہ نہ صرف مرد بلکہ عورتیں اور بچے بھی نکل پڑے، جب شیخ ذہلی نے یہ شان دیکھی تو فرمایا لوگو! ان سے استفادہ کرو مگر کلامی مسئلہ نہ پھینا، (اشارہ تھا خلق قرآن کی طرف، جس کا ان دنوں بہت چرچا تھا) ورنہ ممکن ہے آپس میں ناچاقی ہو جائے، مشہور مقولہ ہے الانسان خریص علی مامنع روئے کا اثر یہ ہوا کہ لوگوں نے نواخواہ سوال کر ہی دیا کہ ما قولک فی اللفظ بالقرآن، امام نے تین بار اعراض کیا، جب لوگ نہ مانے تو چوتھی بار یہ جملہ فرمایا [القرآن کلام اللہ غیر مخلوق] وانما العباد مخلوقۃ [والامتحان بدعت] قرآن اللہ کا کلام غیر مخلوق ہے اور امتیاء بندوں کے افعال مخلوق ہیں، [اور امتحان بدعت ہے] معترض نے یہ سن کر شور و شغب برپا کر دیا کہ بخاری نے لفظی بالقرآن مخلوق کہا ہے، حالانکہ بخاری نے صراحتاً اس کی تردید کی، اسناد صحیح کے ساتھ بخاری سے منقول ہے کہ جھوٹا ہے وہ شخص جو یہ کہتا ہے کہ میں نے لفظی بالقرآن مخلوق کہا ہے جب استاذ بخاری شیخ ذہلی کو یہ بات پہنچی کہ بخاری نے یہ جملہ کہا ہے تو انھوں نے اعلان کر دیا کہ بخاری کے پاس کوئی استفادہ کیلئے نہ ملے یہ اعلان سن کر سب لوگوں نے امام بخاری کے پاس جانا بند کر دیا، صرف امام مسلم اور احمد بن حنبلہ نے امام کے پاس جانا نہیں چھوڑا (چھرا امام ذہلی نے یہ اعلان کیا کہ جو شخص مسئلہ لفظ کا قائل ہو اس کے لئے ہماری مجلسیں حاضر ہونا حلال نہیں ہے۔ یہ سن کر امام مسلم ذہلی کی مجلس سے بر ملا اٹھ کھڑے ہوئے اور ذہلی سے جتنی حدیثیں سنیں ان کو ایک حمال کی پشت پر رکھ کر ذہلی کے پاس بھیج دیا اور اپنی مشہور کتاب صحیح مسلم میں ان سے ایک روایت بھی نہیں لی، یہ تھا مسلم کا رویہ امام بخاری کے ساتھ، امام بخاری نے شیخ ذہلی کی حدیثیں لی ہیں، لیکن کہیں حدیث شامحمد اور کہیں حدیث بن خالد کہا ہے، صراحت نہیں کی کچھ ابہام رکھا ہے، اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ ذہلی امام بخاری پر جارح ہیں واضح طور پر ان کا نام لیکر روایت کرنے سے ان کی تعدیل ہوگی، اور بادی النظر میں اس تعدیل سے اس جرح کی جو انھوں نے بخاری پر کی ہے توثیق ہوگی اس لئے انھوں نے ان کی حدیث تو لی مگر صاف نام نہیں لیا۔ یہ امام بخاری کا کمالِ فطانت ہے۔

یہ میں نے بہت مختصر سوانح حیات امام بخاری کے بتائے، تفصیلاً تم بعد میں معلوم کرنا، اب مختصر اہی تم ان کی وفات کا حال بھی سن لو۔ امام نے آخر عمر میں وطن میں رہتے کا فیصلہ فرمایا تھا، جب اہل وطن کو علم ہوا کہ امام آرہے ہیں تو کئی فرسخ آگے سے لوگوں نے ان کے استقبال کا انتظام کیا، بخارا سے تین میل آگے قبے (خیمے) نصب کئے اور سامنا شہر استقبال کو نکل کھڑا ہوا۔

جب امام تشریف لائے تو لوگوں نے ان پر اشرافیاں بچھا دیں۔

پھر امام نے وطن پہنچ کر درس دینا شروع کیا، نوے ہزار ان کے تلامذہ کی تعداد پہنچ گئی، قدرت کا عجب نغمہ ہے کوئی سمجھ نہیں پاتا، امام کو ایک ابتلا پیش آیا، وہ ثابت قدم رہے، مگر وطن چھوڑنا پڑا، ہوا یہ کہ سلطنت عباسیہ کی طرف سے وہاں کا والی خالد بن احمد بڑی تھا، اس نے امام سے درخواست کی کہ میرے بچوں کو قصر سلطانی میں آکر اپنی تاریخ اور جامع پڑھا دیا جائے، امام نے اس کو منظور نہیں کیا اور فرمایا کہ میں کسی جماعت کے ساتھ سماعت کو مخصوص نہیں کر سکتا، دوسری روایت میں بچوں کے بدلے خود امیر کا ذکر ہے اور جواب میں یہ بھی ہے کہ امیر کو ضرورت ہو تو میری مسجد میں یا میرے گھر آجائیں اور اگر یہ پسند نہ ہو تو آپ حاکم ہیں، مجھ کو مجلس سے روک دیں تاکہ خدا کے پاس میرا عذر قائم ہو جائے اور یہ کہ میں نے خود کتمان علم نہیں کیا، یہ بات حاکم کو ناگوار ہوئی اور باہم منافرت و دشت پیدا ہو گئی، حاکم نے حرث بن ابی الوراق وغیرہ سے مدد لی، ان لوگوں نے امام کے مذہب کے بارے میں کلام کیا اور حاکم نے امام کو شہر چھوڑنے کا حکم دے دیا، امام بخاری نے حاکم و حرث وغیرہ کے حق میں بڑی عاکی، نتیجہ یہ ہوا کہ امام کے ترک وطن پر ایک ماہ بھی نہ گزرا تھا کہ حکومت کا عتاب والی پر ہوا، اور حکم ہوا کہ خالد کو گدے پر سوار کر کے تشہیر کی جائے، اور شہر چھوڑ دیا جائے، یوں اللہ نے اس کو فوری سزا دے دی، اور دوسروں کو بھی وہ برے دن دیکھنے پڑے کہ اللہ کی پناہ !

(من عادی لی ویلیا فقد آذنتہ بالمحوب کا نمونہ سامنے آگیا) امام بخاری سے روانہ ہو کر خرتنگ پہنچے وہاں ان کے کچھ عزیز واقربا رہتے اس لئے وہیں رک گئے۔

اور دعا کی، اے اللہ! زمین باوجود کشادگی کے مجھ پر تنگ ہو گئی ہے اب مجھے اٹھالے، اس کے بعد مرتد سے ایک قاصد آیا کہ وہاں کے لوگ آپ کی تشریف آوری کے خواہشمند ہیں، آپ تیار ہو گئے، کپڑے پہنے، عامہ باندھا اور چل دئے، چند قدم چلے گئے کہ فرمایا مجھ پر صفت طاری ہے مجھے چھوڑ دو، یہ کہہ کر لیٹ گئے تو پسینہ آنا شروع ہوا اور بکثرت آیا، مورخین نے لکھا ہے کہ بے انتہا پسینہ آیا اور اسی میں عالم جاودانی کی طرف رحلت فرمائی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون، ابن کثیر نے تفسیر موت پر بحث کی ہے، فلینظر ہناک،

ایک محدث نے خواب میں دیکھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مع صحابہ کرام کے کھڑے ہیں انھوں نے سلام کیا، آپ نے سلام کا جواب دیا انھوں نے عرض کیا حضرت! یہاں کیوں کھڑے ہیں، فرمایا محمد بن اسماعیل کا انتظار کر رہا ہوں۔ پھر چند دنوں کے بعد ان کو خبر ملی کہ امام بخاری کا انتقال ہو گیا اور انتقال کا جو وقت بتایا گیا تھا غور کیا تو وہی وقت تھا جس وقت انھوں نے خواب دیکھا تھا (مقدمہ)

لکھا ہے کہ قبر سے کئی دنوں تک مشک کی خوشبو آتی رہی، اور کیوں نہ ہو وہ اس ذات قدسی صفات کی عایشوں کے

یہ امام کا مختصر تذکرہ ہوا جو تینٹا کر دیا گیا، اب کتاب کے متعلق بھی کچھ عرض کر دوں۔

ابتداء تدریس حدیث سے صحیح بخاری کی تصنیف تک

تدریس حدیث سلسلہ ۹۹ میں شروع ہوئی تاکہ علم سنیہ
چلا آ رہا تھا، سب سے پہلی کتاب جو امت کو ملی وہ ابن ہشام

زہری کی تھی، مگر یہ مطلق ابتداء کتاب حدیث کا ذکر نہیں ہے کیونکہ داغ بیل کتاب حدیث کی توحید نبوی ہی میں پڑ چکی تھی، ہذا اولا
میں ابو شامہ کے لئے [حدیث] لکھ کر دینے کا ذکر [تو بخاری ہی میں] موجود ہے، فرمایا تھا اکتبوا [ابی نحسہ بخاری] ترمذی میں
ہے کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مجھ سے زیادہ کسی کے پاس حدیثیں نہیں ہیں سوائے [عبد اللہ بن] عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ خباب بن الارت
لکھتے تھے، اور میں لکھتا تھا، اس کا واقعہ طبقات ابن سعد میں یوں لکھا ہے کہ [عبد اللہ بن] عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ خباب بن الارت
صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میں چاہتا ہوں کہ جو اقوال آپ سے سنوں انھیں لکھتا جاؤں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دیدی
اور انھوں نے لکھنا شروع کر دیا، مگر بعض لوگوں نے ان سے کہا کہ حضور جو کچھ فرماتا ہے اسے لکھ لیا کرو اور جو غصہ کی حالت
میں فرماتا ہے اسے مت لکھا کرو، یہ بات جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی گئی تو اپنے لبوں کی طرف اشارہ فرما کر فرمایا کہ ان سے حق
کے خلاف کوئی بات [کسی حال میں] نہیں نکلتی، چنانچہ وہ ہر بات جو حضور سے سنئے تھے لکھ لیا کرتے تھے، اس طرح انھوں نے [تثابرتاً]
ذیہ ورج کر لیا کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ مجھ سے زیادہ حدیثیں [عبد اللہ بن] عمرو بن العاص کے سوا کسی اور کے پاس نہیں ہیں،
اور اس کی وجہ بھی خود ہی بتاتے ہیں [وفانہ کان یکتب دلائل الکتب] وہ لکھتے جاتے تھے اور میں لکھتا تھا، اندازہ کر لیا جاسے
کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے پانچ ہزار سے زیادہ احادیث مروی ہیں [تو حسب بیان ابو ہریرہ] [عبد اللہ بن] عمرو بن العاص رضی اللہ
عنہ کی احادیث پانچ ہزار سے بھی زیادہ ہوں گی، انھوں نے اس مجموعہ کا صداقت نام بھی رکھا تھا، گویا ایک نقل کتاب تھی جس کا
نام بھی تجویز ہوا تھا، حافظ ابن حجر (اس کتاب کی) وجہ تسمیہ یہ بیان کرتے ہیں کہ ان کے پاس ایک صحیفہ اور بھی تھا جس کا نام یرموک
تھا جسے انھوں نے غزوہ یرموک میں از قبیل اسرائیلیات جمع کیا تھا، اس میں چونکہ ہر قسم کی سچی جھوٹی روایات تھیں، اور اس میں
اقوال رسول میرا سلام تھے اس لئے اس کا نام صداقت رکھا۔

(اقول) اس کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ بلاشفا فرماتا تھا اس میں کسی قسم کے کذب کا
احتمال مطلقاً نہ تھا، اس لئے صداقت نام رکھا گیا، عز عمر و بن شعیب عن ابیہ عن جابر کے سلسلہ سے جو حدیثیں کتابوں
میں مروی ہیں وہ درحقیقت اسی صحیفہ کی ہوتی ہیں، اس سلسلہ انادیں بعض محدثین کو چونکہ انقطاع معلوم ہوتا ہے اس لئے اس پر

لے صحیح یہ کہ اہل کتاب کے لکھے ہوئے معاف ان کو اس جنگ میں دستیاب ہوئے تھے، اور وہ دو گئے تھے جن کو مدین کہتے تھے (مرتب)

کلام کرتے ہیں، اور کل روایات کے قبول میں انھیں تردد ہوتا ہے۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے بھی کچھ روایات لکھ کر محفوظ کی تھیں، غرض ابتدا تو پہلے ہر چکی تھی مگر اس وقت تک باقاعدہ تدوین و تبویب نہیں ہوئی تھی، اس کی طرف سب سے پہلے سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے توجہ فرمائی، انھوں نے ۹۹ھ میں، اکناف و اطراف میں احکام بھیجے کہ جس کے پاس جو ذخیرہ حدیث کا موجود محفوظ ہوا اسے کتاب کی صورت میں جمع کر لے اس حکم کی تعمیل شروع ہو گئی، اور لوگوں نے تدوین کتب شروع کر دی، سب سے پہلے قوم کے ہاتھ میں جو کتاب پہنچی وہ ابن شہاب زہری کی تھی، اس کے بعد امام مالکؒ نے موطا لکھی، لیکن اس میں انھوں نے آثار صحابہ و اقوال تابعین بھی لے لئے، نیز مراسیل اور منقلا بھی اس میں آگئیں اس لئے لوگوں نے مانید لکھنا شروع کیا جن میں صرف احادیث نبویہ کو جو مسند ہوں بیان کرنے کی کوشش کی گئی، سب سے بڑا مسند [جو عام طور پر دستیاب ہوتا ہے] امام احمد بن حنبل کا ہے، جس کے متعلق خود امام احمد کا قول ہے کہ جو حدیث مسند میں نہیں وہ حجت ہی نہیں، گو علماء نے یہ دعویٰ تسلیم نہیں کیا تاہم ذخیرہ احادیث کے وفور میں شک نہیں کیا جاسکتا [اس طرح بقدر امکان استیعاب کے ساتھ خالص مرفوع احادیث کی تدوین جس کی ضرورت موطا کے بعد بھی محسوس کی جا رہی تھی پوری ہو گئی، مگر ایک ضروری کام اب بھی باقی تھا وہ یہ کہ ہر صنف کی حدیثوں کو مختلف کتب اور ابواب کے تحت سندوں کے ساتھ اکٹھا استیعاب کے ساتھ کیا جائے۔ اس ضرورت کا احساس امام احمد ہی کے عہد میں امام عبدالرزاق اور امام ابن ابی شیبہ نے کیا اور دونوں نے مصنف کے نام سے ایک ایک کتاب لکھی۔ اور اسی عہد میں سعید بن منصور نے سنن لکھی، لیکن ان حضرات نے بھی مرفوع و مسند حدیثوں پر اکتفا نہیں بلکہ آثار صحابہ و تابعین بھی ذکر کر دیئے اور ہل کی راہ اختیار کر کے ضعیف حدیثوں کو بھی اپنی کتابوں میں جگہ دے دی [ایسے وقت میں ضرورت تھی کہ کوئی خدا کا بندہ اٹھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح اور کھری احادیث کو مصنفات و سنن کے بیچ پر جمع کرے، اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے امام ہمدانی کو منتخب کر رکھا تھا، چنانچہ وہ اٹھے اور بخاری شریف لکھی، اور ایسی لکھی کہ کتاب اللہ کے بعد صحت و استناد میں اسی کا مرتبہ علماء قول نے تسلیم کیا، و نہائے اسلام کو بجا طور پر فخر ہے کہ اپنے نبی کی تعلیمات اور ان کے اخلاق و کردار کو اس درجہ احتیاط اور التزام صحت کے ساتھ محفوظ رکھنے کی خدمت میں مسلمانوں نے انجام دی دیسی دوسری کسی قوم نے انجام نہیں دی۔

تدوین حدیث کی تکمیل تک تین دور گزرے ہیں، دور اول بالکل ابتدائی تھا، اس دور میں متعدد حضرات نے اپنے اپنے طور پر حدیثیں لکھیں، جنھیں فنی حیثیت حاصل نہ تھی اس قسم کی کتابت حدیث ۹۹ھ سے شروع ہوئی جس میں باقاعدہ کتابیں لکھی گئیں، مگر ان میں سے کسی

لے ان کا نام و نسب یوں ہے، محمد بن مسلم بن عبید اللہ بن عبد اللہ بن شہاب الزہری المدنی، (مقدمہ فتح الملہم ص ۹۲)

آثار صحابہ و اقوال تابعین سب ہی ان میں شامل تھے، جیسے مولانا امام مالک و جامع سفیان ثوری، اس ضمن میں یہ بحث بھی سامنے آئی کہ مراسیل مقبول ہیں یا نہیں، ابن جریر وغیرہ نے مرسل کے قبول کرنے پر سلف کا اجماع نقل کیا ہے، مگر حافظ نے دعویٰ اجماع پر کلام کیا ہے اور ایک دو نام ایسے لوگوں کے پیش کئے ہیں جو کہتے تھے کہ مرسل حجت نہیں۔ بہر حال اجماع انہیں تو قریب باجماع ضرور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امام ابو حنیفہ و مالک وغیرہما جو مقدم ہیں مرسل کو قبول کرتے ہیں، اور امام شافعی نے اس میں بہت کلام کیا ہے۔

دوسرا دوسرا وقت شروع ہوا، جب سانیہ لکھی گئیں، ان میں آثار صحابہ و اقوال تابعین نہیں صرف احادیث نبوی ہیں، ان میں انہیں صحت کا التزام نہیں کیا گیا، اس وقت ہمارے ہاتھ میں سب سے بڑا مسند امام احمد بن حنبل کا ہے، لیکن انہوں نے بھی صحیح و سقیم سب ہی لے لئے ہیں، صرف صحاح کو چھ کرنے کا ارادہ نہیں کیا۔

امت میں تشکیکی باقی رہی تو تیسرا دور آیا، دوسری صدی ہجری ختم ہو رہی تھی، اور یہ وقت وہ تھا جس کا تقاضا تھا کہ کھری اور پکی حدیثوں کے مجموعے سامنے آئیں، جن کی اسانید و متون بیدار ہوں، کوئی کتاب اس وقت تک اس شان کی موجود نہ تھی، اسلئے پوری امت کو انتظار تھا، اس وقت اللہ تعالیٰ نے امام بخاری کو کھڑا کر دیا، اور انہوں نے ایسی کتاب لکھی کہ وہی اس شان کی اول اور وہی آخر کتاب ثابت ہوئی، اس میں اقوال صحابہ جہاں آئے ہیں وہ ترجمہ میں ہیں، البواب کے تحت آثار نہیں ہیں، اس کتاب کو ایسا اونچا مرتبہ ملا کہ امت نے تلقی بالقبول کر لیا، یہ دور تکمیل کا دور تھا، پہلی صدی کے آخر سے یہ کام شروع ہوا اور دوسری صدی کے ختم ہوتے ہوتے مکمل ہو گیا، بعد میں آنے والے انہیں کی اتباع کرتے رہے، مگر یہ درجہ کسی کو نہ مل سکا، امام سلم نے امام کا اتباع کیا ہے اور جن وضع و ایراد احادیث بیشک امام سلم کا امام بخاری سے بڑھا ہوا ہے، لیکن صحت میں درجہ بخاری کا اونچا ہے، حافظ عبد الرحمن یمنی شافعی کے سامنے یہ مسئلہ رکھا گیا کہ جمہور کی رائے ہے کہ بخاری کا درجہ سلم سے اعلیٰ و افضل ہے، اور وہ اصح الکتاب بعد کتاب اللہ کا درجہ رکھتی ہے، مگر منارہ اور ابوطی نیشاپوری کی رائے میں سلم کا درجہ بلند ہے تو انہوں نے ایک حکم کیا، اور وہ یہ ہے کہتے ہیں

تَنَازَعُ قَوْمٌ فِي الْبُخَارِيِّ وَمُسْلِمٍ لَدَيْ فُقَهَاءِ الْأَيِّ دِينَ يَقْدُمُ

فَقُلْتُ لَقَدْ فَاتَ الْبُخَارِيُّ صَحَّةً كَمَا فَاتَ فِي حَسَنِ الصَّنَاعَةِ مُسْلِمٌ

حقیقت یہ ہے کہ امام سلم نے ہر باب کی تمام احادیث کو اس خوش اسلوبی سے بیجاہج کر دیا ہے کہ بیک نظر اس کے متعلیٰ تمام احادیث پر اطلاع ہو جاتی ہے، بخاری ہاں ایسا نہیں ہے، بلکہ بسا اوقات ایک دو حدیث کے لئے تمام کتاب چھاننی پڑتی جو اس کی وجہ یہی ہے کہ انہوں نے یہ التزام نہیں کیا ہے کہ ایک باب میں اس باب کی تمام احادیث بیان کر دیں، اس نے حفاظ عبد الرحمن کا یہ فیصلہ بالکل صحیح اور درست ہے۔

مناسب کہ تمہیں باقی صحاح کا حال بھی مختصراً بتا دیا جائے، سنو، صحیحین کے بعد اکثر علماء کے نزدیک ابوداؤد کا مرتبہ ہے،

مگر بہتر یہ ہے کہ ناسی کو ابو داؤد پر مقدم رکھا جائے، کیونکہ تقدیر جالی میں بعضوں کے نزدیک ناسی کا مرتبہ مسلم سے بھی بڑھ کر ہے، جی کہ بعضوں نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ جو روایات ناسی میں ہیں ان کی تنقید کی ضرورت نہیں، خود ناسی کا قول ہے، کہ میں نے اجماعی (ناسی شریف کا نام) میں صحیح احادیث ہی لکھی ہیں، برخلاف اس کے ابو داؤد وہن کر جاتے ہیں [استماع سے کام لیتے ہیں] اور ضعیف بھی قبول کر لیتے ہیں، خود ان کا بیان ہے کہ وہن شدید کو میں ظاہر کر دوں گا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہن خفیف کو بیان نہیں کریں گے، نیز وہ کہتے ہیں جہاں میں سکوت کر دوں گا وہ صالح ہوگی، اب نہیں معلوم کہ صالح کا کیا مطلب ہے، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ صالح لہذا احتیاج ہوگی، یہ بھی ممکن ہے کہ صالح للعمل یا صالح للامتنع ماد ہوگی، اگر صالح للعمل یا لاستنہاد ہوگی تو اس کا صحیح ہونا ضروری نہیں، کیونکہ غلغ استہاد کے لئے ضعیف بھی کافی ہو جاتا یا کرتی ہے، اور اگر احتجاج مراد ہو تو اس کے لئے کم از کم حسن ہونا چاہیئے، حالانکہ سکوت حسن پر نہیں ہوتا، بلکہ اس پر ہوتا ہے جو مستحکم فیہ ہو، بہر حال ابو داؤد، ناسی کے مقابلہ میں مرجوح ہے، تو چوتھا درجہ ابو داؤد کا رہے گا، پانچواں درجہ ترمذی کا ہے، مگر ایک دوسری حیثیت سے ترمذی کا مرتبہ مقدم ہے اور وہ افضل ہے، وہ یہ کہ ترمذی اول تو ہر حدیث پر حکم لگاتے ہیں کہ یہ حسن ہے، یہ صحیح ہے، دوسرے بیان مذاہب فقہاء کا التزام کرتے ہیں تیسرے راوی کے عادل یا مجروح ہونے پر بھی تنبیہ کرتے ہیں، یہی وجہ ایسے ہیں جن کی وجہ سے یہ کتاب مقبول عام ہو گئی، نیز درس میں اسکی طرف خاص توجہ بھی اسی وجہ سے ہے، رہا ابن ماجہ، سو متقدمین نے تو اس کو صحاح میں داخل ہی نہیں کیا بلکہ انھیں پانچوں کو اصول خمسہ کہتے تھے، سب سے پہلے ابوطاہر مقدسی نے اسے صحاح میں داخل کر کے صحاح ستہ نام رکھا، مگر حقیقت یہ ہے کہ اسے صحاح میں داخل نہ کرنا چاہیئے، ابن کثیر نے بھی اسے صحاح میں داخل نہیں کیا، بلکہ موطا امام مالک کو اس کے قائم مقام رکھ لے، وجہ اس کی یہ ہے کہ بعض ناقدین نے ابن ماجہ کی بائیس احادیث پر وضع کا حکم لگایا ہے حافظ ابو الجاہلی کہتے ہیں جس روایت میں ابن ماجہ منفرد ہے وہ صحیح نہیں ہے، حافظ ابن حجر نے گو اس کا یہ کہ تسلیم نہیں کیا مگر اس سے اتنا ضرور معلوم ہو گیا کہ اس میں بہت سی احادیث غیر صحیح ہیں، حضرت شاہ ولی اللہ فرماتے تھے کہ ابن ماجہ کے بجائے صحاح میں موطا امام مالک یا سنن دارمی ہونا چاہیئے، کیونکہ موطا کے متعلق امام شافعی کا قول ہے کہ وہ اصح الکتاب بعد کتاب اللہ ہے (لیکن امام شافعی کا یہ فرمانا بخاری کی تصنیف سے پہلے ہے) بہر حال ابن ماجہ صحاح میں داخل کرنے کے قابل نہیں ہے، اور نہ اسے صحاح میں شمار کرنا چاہیئے۔

(تنبیہ) کتب حدیث متعدد انواع کی ہیں، جوامع، مسانید، سنن، اجزاء، افراد، غرائب

وغیرہ، جامع وہ ہے جس میں یہ آٹھ چیزیں موجود ہیں۔

سیارکادب و تفسیر و عفت اند فتن، احکام و اشراط و مناقب

مسند وہ ہے کہ جس میں (ایک ایک صحابی کی حدیثیں صحابہ کے مراتب کا لحاظ کرتے ہوئے یکجا کی گئی ہوں، مثلاً پہلے

ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی، پھر عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی، دیکھئے ۱۔ [مگر مسند کے لئے یہ لازمی شرط نہیں ہے]

مسند وہ ہیں جن میں فقہی ابواب کی ترتیب پر احادیث احکام کو جمع کیا گیا ہو، اگر اکثر سنن میں دوسری انواع کی حدیثیں بھی ذکر کر دی جاتی ہیں، جیسے تفسیر، فتن اور ابواب القیامہ وغیرہ کی حدیثیں]

اجزاء وہ ہیں جن میں کسی خاص مسئلہ کی احادیث ہوں، جیسے جزء الفراءۃ للبخاری۔

افراد وہ ہیں جن کو روایت کرنے میں کوئی ایک شخص یا صرف کسی ایک شہر کے لوگ متفرد ہوں ۲۔
غرائب، جن میں اپنے شیخ کے متفردات منقول ہوں، کوئی دوسرا اس کا راوی نہ ہو۔

معجم، کسی محدث نے اپنے تمام شیوخ کی ایک ایک دو حدیثیں ان کے ناموں کی ترتیب پر جمع کی ہوں — بخاری مسلم صحیحین ہیں، باقی سنن، نیز بخاری و ترمذی جامع بھی ہیں، مگر ترمذی کو تنقیحاً سنن میں شمار کرتے ہیں، مسلم کے جامع ہونے میں بعض لوگوں نے کلام کیا ہے، کیونکہ اس میں تفسیر کم ہے، مگر یہ فیصلہ درست نہیں اس لئے کہ تفسیر اس میں موجود تو ہے کم سہی، پھر کیوں اسے جامع نہ کہا جائے۔ اب رہا تفسیر کا کم ہونا، سو اس کی وجہ یہ ہے کہ ادلاً تو مسلم نے یہ التزام کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسند و مرفوع حدیثیں بیان کریں گے، آثار صحابہ و اقوال تابعین سے احتراز کریں گے، دوسرے یہ کہ مکررات سے بچیں گے، یہی وجہ ہے کہ مسلم میں مکررات صرف دو ہی چار پائے جاتے ہیں، اور تفسیر میں احادیث مرفوعہ مسندہ کم ملتی ہیں، اور جو ملتی بھی ہیں ان کو مسلم دوسرے ابواب میں پھیلانے لگے ہیں، اور عدم تخیار کا التزام ہے، پھر بخاری نے زیادہ کہاں سے لاتے، بخاری نے ان دونوں باتوں کا التزام نہیں کیا، وہ آثار صحابہ و اقوال تابعین اور ائمہ لغت کی تصریحات بھی نقل کر دیتے ہیں، اور ایک ایک حدیث کو کئی کئی باب میں بھی لے آتے ہیں، اسی لئے ان کی کتاب التفسیر بہت طویل ہے، اور مسلم کے سخت شرائط کی وجہ سے ان کی کتاب التفسیر بہت مختصر رہی، مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ جامع نہ رہی اس کی تائیدیوں بھی ہوتی ہے کہ عبدالبر بن فیروز آبادی نے (جولفت میں حافظ ابن حجر کے استاد تھے) جب مسلم ختم کی تو کہا ہے

ختمت بحمد اللہ جامع مسلم

اس سے بھی معلوم ہوا کہ مسلم جامع ہے، اور اُسے جامع سے خارج کرنا درست نہیں، تو اب صحاح ستہ میں تین جامع رہیں، اور تین سنن، البتہ ترمذی کو تنقیحاً سنن بھی کہہ دیتے ہیں۔

بخاری میں مکررات :- اس میں کلام ہوا ہے کہ بخاری میں مکررات ہیں یا نہیں، بعض نے اثبات کیا ہے، بعض نے انکار، جو مکررات مانتے ہیں، ان کی بات تو غاہر کے مطابق معلوم ہوتی ہے، مگر جو مکررات کے منکر ہیں وہ توجہ کرتے ہیں، جیسا کہ ماخذ ابن جریر نے باب المغرور (العقیدہ) میں لکھا ہے، کہ عدم تکرار کے معنی یہ ہیں کہ ایک لفظ ایک سند ایک سیاق کے ساتھ

نہ لائیں گے۔ بلکہ یا تو سندیں متعدد ہوں گی، یا اگر سندیں متعدد نہ ہوں گی، تو متن میں اختصار کر دیں گے یا سندیں قلیب کر دیں گے [او غیر ذلک] خلاصہ یہ ہے کہ دوبارہ لائی ہوئی حدیث ہر لحاظ سے پہلی جیسی ہوگی، یہی وجہ ہے کہ طالب حدیث کو بخاری میں کسی حدیث کا تلاش کرنا بہت دشوار ہوتا ہے۔ اور سلم میں اس قسم کی دشواری نہیں ہوتی، اس لئے وہ سہل و آسان ہے۔

مشہور ہے فقہ البخاری فی ترجمہ یعنی اپنا مذہب فقہی ترجمہ میں ظاہر کرتے ہیں، مگر لطیف معنی یہ ہیں کہ ان کی شانِ فقہ ترجمہ سے ظاہر ہوتی ہے، اسی کو دیکھ کر بعضوں نے جہاں تک کہہ دیا کہ بخاری احمد بن حنبل سے افتحہ ہیں واللہ اعلم۔

استاذ رحمہ اللہ (حضرت شیخ الہند) فرماتے تھے کہ امام بخاری کبھی ترجمہ میں کوئی قید لگا دیتے ہیں، مگر اصل میں وہ جملہ (قید) نہیں ہوتا تو دراصل بخاری دم لیتے تھے، اور کسی پر کچھ غلطی ہوتی ہے تو ترجمہ میں اسے ظاہر کر دیتے ہیں، حدیث میں کچھ سامان نہیں ہوتا تو تراجم میں جو کہنا ہوتا ہے وہ سب کہہ لیتے ہیں، اسی لئے کہا گیا ہے فقہ البخاری فی الترجمة۔ خود بخاری نے کہا ہے کہ میرے پاس کوئی قول صحابہ یا تابعین کا ایسا نہیں ہے جسکی اصل قرآن یا سنت سے نہ ہو، پس اپنے اس علم کا اظہار وہ ترجمہ میں کرتے ہیں۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں دو تین اصول بیان کر دئے جائیں، تاکہ طالب کو بصیرت حاصل ہو، ان کا بیان کو دنیا اس لئے بھی مناسب بلکہ ضروری ہے کہ علماء نے جو تحقیق فرمائی ہے اس سے کچھ شفا نہیں ہوئی، پہلی بات معنعن کے بارے میں کہنی ہے، اور دوسری بات جہور و بعض اصولیین کے اس اختلاف کے متعلق کہنی ہے کہ بخاری و مسلم کی روایات مفید یقین ہیں

یا نہیں۔
معنعن کے اتصال کی شرط یہ تو معلوم ہی ہے کہ تمام ائمہ کی کچھ نہ کچھ شروط ہیں قبول حدیث میں، حازمی نے ایک رسالہ ائمہ شیعہ کی شروط میں لکھا ہے، بخاری و مسلم اتنی بات میں متفق ہیں کہ رواۃ ثقات ہوں، عادل و ضابط و متقن ہوں، متن، شذوذ و علت سے پاک ہو۔ مگر اس میں اختلاف ہے کہ بخاری ایسے اشخاص کی روایت لیتے ہیں جو کثیر المذائمہ ہوں، مسلم کے ہاں یہ شرط نہیں، وہ محض عدل و ضبط وغیرہ کا لحاظ کرتے ہیں، بشرطیکہ کوئی جرح موثر نہ ہوئی ہو، اس میں اختلاف ہے کہ اگر عنفہ ہے تو کن حالات میں مقبول ہے، یہ تو مسلم ہے کہ مدرس کا عنفہ غیر مقبول ہے، لیکن غیر مدرس کا عنفہ بخاری کے نزدیک اس وقت مقبول ہوگا جب تمام عمر میں کم از کم ایک مرتبہ لقار ثابت ہو، اگر ایک بار بھی راوی و مروی عنہ کی باہم ملاقات ثابت نہ ہو تو راوی کا عنفہ عند البخاری صحیح نہیں، (یعنی اتصال پر محمول نہ ہوگا)

مسلم کہتے ہیں کہ اگر معاشرت ثابت ہے اور امکان لقار موجود ہے، تو غیر مدرس کے عنفہ کی صحت کیلئے اتنا ہی کافی

ہے، حسن ظن کی بنا پر اسے متصل ہی کہیں گے، کیونکہ جب امکان افتاد موجود ہے تو بلا وجہ انقطاع پر کیوں حمل کریں، محال یہ کہ صرت معاشرت عند البخاری کافی نہیں ہے، اور سلم کے نزدیک کافی ہے، مسلم نے مقدمہ میں شد و مد سے پہلے مسلک کا رد کیا ہے اور تھدی کے ساتھ لکھا ہے کہ کسی اہل علم کا سلف میں سے یہ قول نہیں ہے جو بخاری کا ہے، نام بخاری کا نہیں لیا ہے، بلکہ بعض منتحلی الحدیث کا عنوان اختیار کیا ہے، مگر بغاہ بخاری ہی مراد ہیں، کیونکہ قائلین میں صرت و مخصوص کے نام لئے جاتے ہیں، ایک بخاری کا، دوسرے علی بن المدینی کا، مسلم کا کہنا ہے کہ قبول غنہ کے لئے یہ شرط لگانا محدث و مخترع و بدعت ہے، اجماع سلف اس کے خلاف ہے اس قول کے ساتھ ہونے کی ایک دلیل تو اجماع کی ہوئی، دوسری دلیل انھوں نے یہ دی کہ اگر بخاری کے قول کو تسلیم کر لیا جائے، اور صحت کے لئے یہ شرط تسلیم کر لی جائے تو ایک بڑا ذخیرہ صحیح روایتوں کا معطل و بیکار ہو جائے گا، کیوں کہ بخاری کہتے ہیں کہ اگر القار کا ثبوت نہیں ہے، تو ممکن ہے کہ معاصر معاصر سے بطریق ارسال روایت کرتا ہو، اور ارسال سے وہن و ضعف پیدا ہو جائے گا [اور وہ ان لوگوں کے نزدیک قابل قبول نہ ہوگی جو سلم کو قبول نہیں کرتے] مسلم جواب میں کہتے ہیں کہ اگر ایک بار سماع ثابت بھی ہو گیا تو یہ کیا ضرور ہے کہ سب روایات سنی ہوئی ہوں، لہذا باقی روایات میں پورا احتمال ارسال موجود ہو جائے تو یہ کہ ہر حدیث صحیح یا احتمال مند نہ ہوگا اور شبہ ارسال کل وجہ وہن و ضعف پایا جائے گا، مثلاً امام مالک کوئی روایت زہری سے عن سے کریں، تو باوجود القار کے اس خاص حدیث میں صراحت سماع ہوئی چاہیئے، ورنہ احتمال ارسال ہوگا، تو اس شرط کی بنا پر بہت بڑا ذخیرہ حدیث کا صحیح قرار نہ پائے گا، کیونکہ ہر حدیث میں امکان ارسال ہے جب تک تحدیث کی صراحت نہ ہو، امام مسلم نے اسی دلیل پر بہت زور دیا ہے، تیسرا اعتراض یہ کیا ہے کہ بہت سی حدیثیں معنعن ہیں اور راوی کا مروی حدیث سے ان خاص اسناد میں سماع ثابت نہیں، حالانکہ بخاری بھی ان کو صحیح مانتے ہیں اور بخاری میں درج بھی ہیں، یہ الزامی جواب ہے کہ خود بخاری نے اپنی اس شرط کے خلاف کیا ہے تو پھر کس طرح دوسرے کو پابند بنانا چاہتے ہیں، شارحین سلم اور شارحین بخاری نے بھی بخاری ہی کی بات کو صحیح کہا ہے اور سلم کی بات کو اگر ایسا ہے کوئی مسلم کے قول کو ترجیح نہیں دیتا لیکن ان شرار نے کوئی ایسی بات نہیں کہی جو کوئی خاص وزن پیدا کرے،

سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ تمام احادیث کا ذخیرہ ہاتھ سے جاتا رہے گا، اس کا جواب یہ دیا ہے کہ ثبوت القار کے بعد غنہ میں انقطاع کا شبہ جس احتمال کی بنا پر کیا جائے گا وہ تیس کا احتمال ہوگا نہ کہ ارسال کا، اور کلام مدرس کے بارے میں نہیں ہے تو جس کا سماع و القار ثابت [اور وہ عن سے روایت کرے] اس کو متصل ماننا چاہیئے تیس کا احتمال پیدا کر کے اس کو منقطع نہیں کہہ سکتے، اس لئے کہ راوی مدرس نہیں ہے، ابن جریر، نووی وغیرہ سب نے یہی لکھا ہے، مدون غور کیا کہ کوئی قول بخاری کے خلاف ہے، مگر نہیں ملا، اپنی سمجھ میں جو آیا وہ بیان کرتا ہوں، مگر پہلے ارسال اور تیس کا فرق سمجھ لو، نیز یہ سمجھ لو کہ ارسال ایک جلی ہے، ایک خفی، یہ تین چیزیں ہوتیں، پون سمجھو کہ راوی اور مروی حدیث کے درمیان تین صورتیں ہیں، ایک یہ کہ ان میں معاشرت نہیں ہے اس صورت میں اگر راوی عینہ وہ لہذا سماع سے روایت کرے تو یہ ارسال

جی ہے اجماعاً، اگر صراحت سماع کرتا ہے اور فی الواقع سماع نہیں ہے تو کذب صریح ہے، اور وہ کذا اب تک، صیغہ موبہ ہونا چاہیے تاکہ ارسال کہا جاسکے اور کذب صریح نہ کہا جائے، دوسری صورت یہ ہے کہ دونوں میں معاصرت بھی ہے اور سماع و لقار بھی ثابت ہے اس کے بعد راوی ایک روایت لکھتا ہے اور یہ خاص حدیث سنی ہوتی نہیں ہے، اور صیغہ موبہ ہی جیسے عن وغیرہ، تو یہ بالاتفاق تدریس ہے اسے تدریس اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں تدریس ہے اور تدریس مذموم ہے اور ارسال عیب نہیں، گو واسطہ دونوں جگہ حذف ہوتا ہے مگر دونوں میں فرق ہے، اور وہ یہ کہ جس نے زمانہ نہیں پایا، مثلاً میں کہوں کہ غلامی فرماتے تھے تو کسی کو دہم بھی نہیں ہو سکتا کہ میں نے خود سنا ہو گا شخص جاتا ہے کہ ملاقات ممکن نہیں ہے، تو چونکہ ارسال میں لقار ممکن نہیں اور محدثین کو معلوم ہے کہ اسے لقار نہیں تو محدثین کو دھوکا نہیں لگتا گو صیغہ موبہ ہی کیوں نہ ہو، اور مدرس کے قول سے دھوکا ہوتا ہے، مثلاً ہم اپنے استاذ سے روایت کریں اور ایک ایسی چیز نقل کر جائیں جو سنی نہیں ہے اور بصیغہ موبہ بیان کریں، تو اب دہم ہو گا، گویا عدم سماع پر مدرس پردہ ڈال رہا ہے، اس لئے یہ چیز مذموم ہے اور اس میں ثابہ کذب پایا جاتا ہے، تیسری صورت اور ہے جس میں اختلاف بین المحدثین ہوا ہے، وہ یہ کہ معاصرت تو ثابت ہو لیکن لقار و سماع ثابت نہ ہو، اگر ایسا راوی ایسے مروی عنہ سے بصیغہ موبہ روایت کرے، تو آیا یہ تدریس ہے یا ارسال؟ ایک حیثیت سے تو یہ صورت تدریس کہلانے کی مستحق ہے، کیونکہ معاصرت پائی باقی ہے، اور دوسری حیثیت سے ارسال کہلانے کی مستحق ہے کیونکہ سماع ثابت نہیں، مگر ارسال جلی نہیں، کیونکہ معاصرت ثابت ہے اور تدریس بھی نہیں کیونکہ سماع و لقار ثابت نہیں، بھری کو بعض نے تدریس کہا اور بعض نے ارسال، حافظ ابن حجر نے اس کا نام ارسال نفی رکھا ہے، مگر میں کہتا ہوں کہ کچھ تھوڑا سا تدریس میں داخل کرو، اور تھوڑا سا ارسال میں، اگر صرف معاصرت ہے سماع و لقار ثابت نہ ہو۔ بلکہ عدم کا ثبوت ہو جائے تو اب یہ مرسل ہے کیونکہ دھوکا نہیں، اور اگر معاصرت ثابت ہو اور سماع ثابت نہ ہو اور سماع کی نفی بھی ثابت نہ ہو تو معاملہ بالکل مبہم ہے اس کو تدریس کی قسم میں داخل ہونا چاہیے، کیونکہ اب دھوکا لگتا ہے، اور یہی فرق ہے، تدریس و ارسال میں، صورت معاصرت میں دو صورتیں نکل آئیں، ایک عدم ثبوت سماع، جس میں امکان سماع ہے، دوسری ثبوت عدم سماع، جس میں سماع کا امکان نہیں تو ابہام تک تدریس ہے اور بعد رخ ابہام ارسال (کنافی الکفایۃ فی اصول الحدیث، للخطیب البغدادی) ستاد نے اسکو فتح المغیث میں نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ اصلی فرق یہی کہ جہاں ابہام ہو تو تدریس اور جہاں ابہام نہ ہو تو ارسال ہے، (ثبوت عدم اور عدم ثبوت دو چیزیں الگ الگ ہیں، مادل میں عدم کے ثبوت کا دعویٰ ہے اور دوسرے میں امکان ہے ثبوت کا جو ثبوت ہوا نہ ہو) مثلاً میں کہوں کہ لندن کا فلاں آدمی یوں کہتا ہے اور معلوم ہے کہ نہیں وہاں گیا نہ وہ یہاں آیا تو چونکہ اس صورت میں ابہام نہیں، لہذا یہ صورت ارسال کی ہے،

جب یہ ثابت ہو گیا تو اب میں کہتا ہوں کہ مسلم کا اعتراض درست ہے کیونکہ بخاری کہتے ہیں کہ بلا سماع و لقار احوال ارسال

فتح المغیث طبع ہند ص ۷۷ کی طرف رجوع کیا جائے ۱۷ مرتب

ہے اور مسئلہ کہہا کہ ایک بار لقاہ و سماع کے بعد بھی یہی احتمال ہے، اور اس کا جواب کہ اب جو احتمال ہے تیس کا ہے نہ اس سال کا، ایسا ہے کہ بعینہ یہی جواب مسلم دے سکتے ہیں، کہ ثبوت معاصرت کے بعد عدم ثبوت لقاہ کی صورت میں عن کہنے سے جس بابت کا احتمال پیدا ہوتا ہے وہ بھی تیس ہی کا ہے نہ کہ ارسال کا اس لئے کہ یہ بھی ابہام ہی کی صورت میں غنہ ہے، خواہ تم اس کا نام ارسال بھی رکھو یا اور کچھ، کیوں کہ ارسال میں ابہام بالکل نہیں تاہذا بخاری کا دعویٰ کہ اس صورت میں احتمال ارسال کا ہوگا صحیح نہیں، بلکہ اس صورت میں بھی احتمال تیس ہی کا ہوگا، والمسائل متفرقة ختہ فی غیر الدیس لہذا اب ایک بار لقاہ اور امکان لقاہ دونوں مساوی ہیں، اور جب دونوں مساوی ہیں تو جس طرح ایک بار لقاہ کے بعد کی صورت محمول علی الاتصال ہے اسی طرح امکان لقاہ کی صورت بھی خارج از بحث ہونی چاہیے، بلکہ ابن عبد البر نے کہا کہ یہ صورت اشخ ہے، کیونکہ احتمال لقاہ و سماع دونوں کا ہے۔ اس لئے ابہام زائد ہوگا، اور لقاہ کے بعد ابہام صرف سماع میں ہے لہذا یہاں ابہام کم ہوگا۔

اب رہا دعویٰ اجماع کا تو اس کے توڑنے کے مخالفین نے دوسرے اجماع کا دعویٰ کر دیا اور کہہ دیا کہ بخاری کے قول پر اجماع ہے، مگر مسلم کے قول کے مقابل میں متاخرین کا قول کون سن سکتا ہے، ہاں اگر مسلم سے قبل کا اجماع یا خلاف نقل کیا جاوے تو بیشک قابل توجہ ہو سکتا ہے، مگر اس کا وجود نہیں، اگر کوئی اس کا مدعی ہو تو اسے پیش کرنا چاہیے، رہیں روایات مخفیہ کی، کہ وہ بالاتفاق مرسل ہیں، گما قالہ الحافظ، حالانکہ قاصد سے مدرس کہنا چاہیے کیونکہ یہاں معاصرت ثابت ہے اور لقاہ ممکن ہے اور جب امکان لقاہ ہے تو ابہام موجود ہے مگر کوئی ان کو مدرس نہیں کہتا تو اس کا جواب ملا علی قاری نے شرح منجہ کی شرح میں یہ دیا ہے کہ تمہارے نزدیک مخفم وہ ہے کہ زمانہ پایا ہو اور معاصرت ثابت ہونے کے ساتھ عدم لقاہ متحقق و متیقن ہو لہذا متحقق عدم لقاہ کی وجہ سے ان کو بالاتفاق مرسل ہی کہا جائے گا۔ پس حافظ کا اعتراض صحیح نہیں، استاذ رحمہ اللہ کا خیال تھا کہ یہ شرط بخاری کے نزدیک بھی نفس صحبت حدیث کے لئے نہیں تھی، بلکہ صحیح بخاری کے لئے بشرط لگائی ہے، یعنی انہوں نے اپنی صحیح میں التزام کیا ہے کہ انہیں ایوں کا غنہ قبول کریں گے، جن کا سماع مروی عتہ سے کم از کم ایک بار ثابت ہو، اس کی نظیر مسلم میں بھی موجود ہے، کہ جب شگرد نے کہا کہ زیادہ سیماں تہی فاذا قرأوا فاضتوا کیسی ہے؟ تو کہا اتريد احفظ من سليمان، وہ سوال کرتا ہے کہ ابو ہریرہ کی روایت (جو ابو داؤد میں ہے) کیسی ہے؟ تو کہا صحیح ہے، سوال کیا لکن تفضہ ہاھنا، جواب دیا انما وضعت ہاھنا ما اجمعوا علیہ، اجماع سے مراد ان چار اشخاص کا اجماع ہے جو شیوخ مسلم میں ہیں، یعنی یحییٰ بن معین، امام احمد بن حنبل، ابو زرہ رازی اور ابو حاتم رازی۔

لہ فتح المغیث ۴۲، ۵۵، یکھو ۵۲ فتح الملہم ۳۳ ۳۴ جامع تقریر نے اخیر کے دو ناموں کے بجائے عثمان بن ابی شیبہ اور سعید بن منصور کا نام لکھا ہے۔

مگر یہ سہو ہے، فتح الملہم میں استاذ الاستاذ مرحوم نے وہی نام لکھے ہیں جو ہم نے دہے گئے ہیں ۱۲ رشید احمد اعظمی

اس سے معلوم ہوا کہ صحیح مسلم میں ہر مرتبہ صحیح کا اندراج ضروری نہیں، نہ انھوں نے اس کا التزام کیا ہے۔ کیونکہ کتاب کیلئے کچھ مخصوص شرائط ہیں تو اگر بخاری نے بھی اپنی کتاب کے لئے یہ شرط لگائی ہو تو کوئی مانع نہیں، اور جہور کے خلاف بھی نہیں استناد نے اس بات کو درس ترمذی میں کہا تھا لیکن اس کی نقل کہیں نہیں ملی تھی، اب تدریب الراوی للسیوطی میں دیکھی، قیل کر کے نقل کیا ہے، مقدمہ مسلم میں میں نے مبسوط بحث کی ہے۔ فانظر هناك۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ آیا صحیحین کی حدیثیں مفید قطع ہیں یا نہیں، یہ مرکزہ الآثار مسئلہ ہے، مہجور جن کے علم ہر دار، عزالدین بن عبدالسلام و امام نووی ہیں، فرماتے ہیں کہ مفید قطع نہیں بلکہ مفید ظن ہیں الا یہ کہ متواتر ہوں، نووی نے اسی کو محققین کا قول بتایا ہے۔ اور ابن الصلاح بھی پہلے اسی کے قائل تھے وہ فرماتے ہیں کہ میں پہلے اسی طرف مائل تھا اور اسی کو تو یہ سمجھتا تھا پھر مجھ پر ظاہر ہوا کہ صحیح یہ ہے کہ یہ اخبار مفید قطع ہیں^۱ حافظ ابن حجر نے فرمایا کہ نووی نے اکثر علماء کی طرف اس قول کی جو نسبت کی ہے وہ تو مسلم ہے۔ لیکن یہ کہنا کہ محققین صرف اسی کے قائل ہیں، یہ مسلم نہیں ہے۔ بلکہ دوسرے قول یعنی مفید قطع ہونے کے قائل اور ابن الصلاح کے مویہ بھی محققین ہیں۔

تدریب الراوی میں ابن الصلاح کے مویہ محققین کے جوامع دیئے ہیں ان میں شمس الامیر شمسی کا احاطہ میں اور ان میں ابویلی و ابن الزاغوانی و ابوالخطائے نام خانبہ میں، اور قاضی عبدالوہاب کا مالکیہ میں، اور شروائع میں بہت سے محققین کے نام مذکور ہیں، ان کا کہنا ہے کہ ان دونوں کتابوں کی امت نے تلقی بالقبول کر لی ہے، اور اہل علم و ائمہ کا اجماع ہو گیا ہے کہ کتب حدیثیہ میں، یہ سب صحیح ہیں، تو جب یہ اجماع ہو گیا اور امت محمدیہ نے ان کی تلقی بالقبول کر لی، تو اب وہ یقیناً غنیت سے نکل کر قطعیت تک پہنچ گئیں، خبر واحد جب موقوف بالقرائن ہو تو وہ قطعی ہو جاتی ہے، مثلاً کوئی کہے کہ فلاں کا انتقال ہو گیا تو وہ کو خبر واحد ہے مگر جب اس کی صحت کے قرائن موجود ہوں تو یہ قطعی ہو جاتی ہے اور ظنیت سے خارج ہو جاتی ہے، (امول فقہ و حدیث میں یوں ہی لکھتے ہیں) نظیر اس کی حدیث تھیں تبدیلہ ہے کہ صرف ایک شخص کی خبر پر تھیں قبلہ کر لی گئی، حالانکہ بیت المقدس کا قبلہ ہونا یقینی [اور قطعی تھا]، اور [توہل کی] خبر واحد تھی، مگر چونکہ [موقوف بالقرائن] تھی اسلئے اس پر یقین ہو گیا [اور وہ مفید قطع ہو گئی] [حافظ ابن حجر نے فریقین میں] مصالحت کی کوشش کی ہے چنانچہ منتخب میں بھی ہے اور سخاوی نے بھی فتح النیث میں حافظ کے قول کو نقل کیا ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ جو مفید قطع کہتا ہے وہ علم کو نظری کے ساتھ متفکر کہتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ اخبار جس علم قطعی کو مفید ہیں وہ استدلال و نظر سے حاصل ہوتا ہے، اور جو مفید ظن کہتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ اس قطعیت کی مفید نہیں ہیں جو بدایت سے حاصل ہوتی ہے، مثلاً بندہ ادا کے وجود کا علم قطعی جیسا ہے، لیکن اسام حادث (عالم حادث ہے) کا علم کو قطعی ہے، مگر نظری اور استدلال سے حاصل ہے، پس جو شخص صحیحین کے مراتب کو جانتا ہو بشرطیکہ وہ مذاق میں سے ہے اور اجماع کا بھی اسے علم ہے، اور اس کو معلوم ہے کہ امت نے تلقی بالقبول کر لی ہے،

تو ان نظریات سے وہ یقین کر لے گا کہ یہ قطعی ہے، مگر یہ علم نظری ہوگا، جیسے العالم حادث کا، مگر ایسا قطع و یقین نہیں ہوگا جیسا متواتر کا قطع ہوتا ہے، میں نے مقدمہ مسلم میں لکھا کہ ان اخبار کو مفید یقین کہنا ایک دقیق خطا ہے۔ اور دلائل کا سبک جواب دینا ہے مثلاً اصحیت پر اجماع کی بنا پر مفید یقین کہا گیا ہے تو، میں کہتا ہوں کہ مطلق خبر واحد مع قطع النظر عن الصمیمین، جن میں شروط صحیح جمع ہوں، وہ اتفاق و اجماع مقبول ہے، تو کیا یہ بھی قطعی ہو جائے گی اگر ایسا اجماع مفید یقین ہے تو ہر صحیح خبر واحد مفید یقین ہوگی، لیکن جب اجماع مطلق خبر واحد پر دلیل قطع نہیں تو پھر معین اخبار پر اجماع کیونکر مفید قطع ہو جائے گا، ہر خبر واحد پر بعینہ ہی اجماع ہے، فرق اتنا ہے کہ وہ مطلق پر اجماع ہے اور یہ مفید پر اجماع ہے، دوسرے یہ کہ اجماع اصح ہونے پر جو ہے وہ جملہ کا جملہ سے اصح ہونے پر ہے، یعنی مجموعی حیثیت سے بخاری اصح و افضل ہے، اس کی بحث وہاں ہے جہاں بخاری کے مقابلہ میں مسلم کو مرجع کہا گیا ہے، وہاں یہ تصریح موجود ہے، اور شیخ بدر الدین زکریا نے تصریح کی ہے کہ ہر حدیث بخاری کی ہر حدیث مسلم سے اصح نہیں ہے، بلکہ مجموعی حیثیت سے بخاری اصح ہے مسلم سے، اور یہی مراد ہے وہاں بھی کہا گیا ہے کہ صحیحین اصح ہیں بقیہ کتب سے کسی خاص حدیث کو لے کر اجماع کا دعویٰ صحیح نہیں ہے، ہر حدیث میں یہ احتمال ہے کہ اس جملہ میں سے یہ نہ ہو تو پھر تمام احادیث صحیحین کی مفید قطع کس طرح ہو جائیں گی، فلیتدبر!

یہ دونوں بحثیں طالب حدیث کے لئے بڑی اہم تھیں، اس لئے اصل کتاب کو شروع کرنے سے پہلے ان کا ذکر کیا گیا،

ابتداء میں صرف بسمہ پر اکتفا کرنے کی توجیہ

امام بخاری نے بعد بسمہ کتاب شروع کر دی، حجلہ نہیں لکھی، ایسا ہی ترمذی نے کیا ہے، اس کی کیا وجہ ہے؟ جواب یہ ہے کہ حدیث میں آیا ہے کل امروء یبالی لم یبدأ فیہ بسم اللہ فہوا ابتداء، نیز قرآن میں ہے اقرا باسم ربک ان دونوں جملوں سے معلوم ہوا کہ ابتداء بسم اللہ سے ہونی چاہیے، اب رہا حمد لہ کا ذکر نہ کرنا، تو اس کے مختلف جوابات دئے گئے ہیں، حافظ ابن حجر نے تو سکے سے حدیث ہی کو ضعیف قرار دے دیا، اور جب ضعیف ہے تو پھر اگر عمل نہ کیا گیا تو کیا مضائقہ؟ اس حدیث کے متعلق تاج الدین سبکی نے طبقات شافعیہ میں مبسوط بحث کی ہے، اور آخر میں فیصلہ کیا ہے کہ یہ حدیث مرتبہ حسن میں ہے، ومن شاء فلیجمع الیہا مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ جواب کچھ بھینٹا نہیں، کیونکہ بخاری جیسا کتاب کی قبولیت کا متمنی حدیث برکت پر عمل نہ کرے، بعد از قیاس ہے، اس کی تو حالت یہ تھی کہ بخاری لکھنے کی مدت مدید میں ہر حدیث پر غسل و وضو کرتا اور برابر روزہ رکھتا تھا اور یہ امور تو کسی ضعیف کیا کسی موضوع حدیث سے بھی ثابت نہیں

مگر صرف اس بنا پر یہ سب کرتے تھے کہ ممکن ہے اسی سے درجہ قبولیت حاصل ہو جائے ابتداء پر اباحمد کی حدیث ضعیف بھی یہی بہر حال حدیث تو ہے اور فضائل اعمال میں ضعیف معتبر بھی ہوتی ہے پھر بخاری نے اس کو کیونکر ترک کر دیا، بہر حال بخاری کے حملہ چھوڑنے کی یہ توجیہ رکیک اور بیکار ہے، ہاں دوسرا جواب ابن حجر کا بیشک قابل قبول ہے اور وہ یہ ہے کہ حملہ کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ اس کو لکھا ہی جائے، ممکن ہے ابتداء کتاب کے وقت دل میں پڑھ لی گئی ہو، اور محدثین کا یہی معمول رہا ہو، اس کی تائید یوں ہوتی ہے کہ امام احمد بن حنبل نقل حدیث کے وقت صلی اللہ علیہ وسلم زبان سے کہتے تھے تھے لکھتے نہ تھے، کیونکہ اسرار مقصود ہوتا تھا یہ تو حافظ ابن حجر کا جواب تھا،

امام نووی کہتے ہیں کہ بسم اللہ سے مراد مطلق ذکر ہے مسند احمد کی روایت (بذکر اللہ) اس کی منوید ہے، جب ذکر مطلق مراد ہے تو پھر بسم اللہ واحمد اللہ دونوں اس کے فرد ہونے ایک کے کہنے سے حدیث پر عمل ہو گیا، اگر ان دونوں کے علاوہ کوئی تیسرا لفظ جو شعر ذکر رب ہو کہہ دیا جاوے تو بھی عمل باحدیث ہو جائے گا، مگر یہ سمجھیں نہیں آتا کہ جب مطلق ذکر مراد ہے تو پھر ہمیشہ ابتداء پر بسم اللہ کیوں ہوتی ہے کہیں تو پہلے حمد ہوتا اور صرف حمد پر اکتفا کیا گیا ہوتا، مگر واقعہ اس کے خلاف ہے، لہذا یہ جوابات دل کو لگتے نہیں نہ چسپاں ہوتے ہیں، ہاں ایک جواب علامہ زرقانی نے شرح موطا میں ذکر کیا ہے، وہ دل کو لگتا ہے، وہ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دو چیزیں منقول ہیں (یعنی عادت مستمرہ آپ کی بطور استقرار یوں رہتی کہ) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک تو خطبہ دتے ہیں، وہ منقول ہیں، دوسرے حضور نے خطوط لکھوائے ہیں وہ بھی منقول ہیں، ان دونوں میں ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز عمل دیکھنا چاہیے، جو طرز عمل آپ کا ثابت ہو وہی سنت ہوگا، جب ہم اس طرح مسئلہ پر غور کرتے ہیں، تو معلوم ہوتا ہے کہ حضور نے ہمیشہ کتب (خطوط) میں بسم اللہ پر اکتفا فرمائی ہے، یہی آپ کی عادت مستمرہ ملتی ہے، مثلاً بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ مِنْ مُحَمَّدٍ رَّسُولِ اللّٰهِ (صلی اللہ علیہ وسلم) الی ہر قول الخ، اور مثلاً بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ہذا اما قاضی علیہ، محمد رسول اللہ، وغیرہا، اور جب خطبہ فرمایا تو وہاں عادت مستمرہ یہ رہی کہ حمد پر اکتفا فرمایا، مثلاً الحمد للہ محمد کا الخ وغیرہ، ان دونوں طریقوں سے معلوم ہوا کہ کتب میں بسم اللہ، اور خطب میں الحمد للہ ہونا چاہیے، اسی سنت نبوی پ نظر رکھتے ہوئے محدثین نے کتب میں بسم اللہ پر اکتفا فرمائی اور حمد نہیں لکھی، اب رہا امام مسلم کا حملہ کہ ذکر کرنا، سو اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے پہلے مقدمہ لکھا ہے اور یہ بمنزلہ خطبہ کے ہے اس لئے حمد لکھی، اور یہی مناسب بھی تھا، اور اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ دستور نبوی بسم اللہ کا مخصوص بالکتب ہونا قریع سے چلا آتا ہے، کوئی نئی بات نہیں ہے، مثلاً خود قرآن میں ہے کہ جب بلقیس ملکہ سبا کو حضرت سلیمان علیہ السلام نے خط لکھا تو یوں لکھا (اِنَّكَ مِنْ سُلَيْمَانَ وَ اِنَّكَ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ اَلَا تَتَكَلَّمُوْا عَلٰی دَاوُوْدَیْنِ مُسْلِمٰیْنِ) اس سے تائید ہوتی ہے محدثین اور مفتیین بالہر سلسلہ کی، الحمد للہ، اس طرح یہ مسئلہ صاف

ہو گیا۔ اور کوئی کھٹک باقی نہیں رہی، نہ اس کی ضرورت باقی رہی کہ اس مقام پر ابتداً تحقیقی و اضافی کا جھگڑا چھیڑا جائے، کیونکہ ابتداً تحقیقی ایک آئی چیز ہے جس میں امتداد نہیں اور یہاں بسم اللہ میں بہر حال امتداد ہے، اور جب امتداد ہے تو یہ بسم اللہ وہی ہوگی جسے عرفی ابتداً کہا جاتا ہے اس نے حدیث میں اس کی تحقیق بیگار ہے۔

(فائدہ ۱) دنیا میں ایسا مختصر اور پر معنی مکتوب کسی کو نہیں لکھا گیا جیسا کہ سلیمان علیہ السلام کا یہ خط جو قرآن میں مذکور ہے، نہایت ہی مختصر اور نہایت ہی لمبے اور پر معنی ہے، ہاں ایک اور خط امت محمدیہ کے ایک فرد و خلیفہ ہارون رشید کا ضرور مکتوب ہے جو اسی طرح مختصر اور جامع ہے، واقعہ یہ پیش آیا کہ روم کے ایک حصہ پر ایک عورت کھان تھی اور وہ سالانہ جزیہ مسکلت اسلامی کو ادا کیا کرتی تھی۔ کیونکہ حکومت اسلامی کے زیر نگین تھی، جب اس کا انتقال ہوا تو اس کا بیٹا اس کے قائم مقام ہوا جب یہ تخت پر بیٹھا تو اس کو جزیہ دینا ناگوار ہوا اس نے بند کر دیا اور خلیفہ کو خط لکھا کہ میری ماں ایک عورت تھی وہ جزیہ دیا کرتی تھی اب میں تخت نشین ہوں اور مرد ہوں میں ہرگز جزیہ نہ دوں گا، بلکہ جو رقوم ادا کی گئی ہیں وہ واپس لوں گا، جب یہ خط ہارون رشید کو ملا تو اس کے بدن میں آگ لگ گئی اور فوراً جواب لکھ کر روانہ کر دیا اور ساتھ ہی شکر روانہ کر دیا، لشکر نے اسے شکست دی اور اس نے خراج دینا منظور کر کے صلح کر لی، اس وقت تاریخ بیان کرنی مقصود نہیں صرف اس خط کا ذکر کرنا تھا، واقعہ منشا آگیا، خلیفہ کا خط یہ ہے۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ من ہادون امیر المؤمنین الی نقفور کلب الروم قد قرأت کتابک یا امین الکافرة والجواب ما تراء لا ماتمہ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ کس قدر مختصر اور پر معنی خط لکھا گیا ہے اور مطالب کو کس وضاحت کے ساتھ اس مختصر خط میں بھر دیا گیا ہے، بس اس کے علاوہ اور کوئی تیسرا خط ہمارے علم میں روئے زمین پر آیا نہیں دیکھا گیا جو انتہائی اختصار کے باوجود ایسا جامع اور پراز معانی و مطالب ہو۔

فائدہ ۲۔ حافظ حدیث اس کو کہتے ہیں جو تحقیق و تدقیق میں اپنے شیوخ اور شیوخ الشیوخ سے بڑھ جائے اور اس کے فنی معلومات اس کے جہولات سے زیادہ ہوں، ملاحظہ فرمائیے کہ ایک لاکھ حدیث مع الاسناد کی تعداد نقل کی ہے اور اگر تین لاکھ احادیث مع الاسناد محفوظ ہوں تو ایسے کو جو کہیں گے، اور اگر تمام احادیث تہامہا و کماہا مع الاسناد و مع مالاہل محفوظ ہوں تو ایسے کو ماک کہیں گے، جو شخص مشول فی الحدیث روایت و درایت ہو اسے محدث کہتے ہیں، محدث کا مرتبہ حافظ سے کم ہے، ابن ہمام محدث ہیں، حافظ نہیں، شیخ بدر الدین مینی کو بشکل حافظ کہا گیا ہے۔

فائدہ ۳۔ جب کوئی خبر کسی کو دیکھائے اور اس کا تعلق کسی تیسرے سے ہو تو ضروری ہوگا کہ جن واسطوں سے

وہ خبر پہنچی ہے ان کو ذکر کیا جائے، وہاں تک جہاں سے خبر چلی ہے، لہذا جب ہم یہ کہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان عالی ہے تو ہم پر یہ بھی ضروری ہو کہ ہم بتلائیں کہ یہ فرمان نبوی ہم تک کیونکر پہنچا، کیونکہ ہم نے بالمشافہہ تو سنا نہیں دوسرے اشخاص کے ذریعہ سے سنا ہے لہذا ہمیں ان وسائل کا ذکر کرنا حضور تک ضروری ہے، اسی کا نام سند یا اسناد ہے، گواہ تدوین کتب کے بعد اس درجہ میں اس کی ضرورت نہ ہو، تاہم یہ اسلام کا ایک خاص امتیاز ہے جس سے دنیا کے تمام مذاہب محروم ہیں اس لئے اس کا باقی رکھنا بہت ضروری ہے، اسی لئے تبرکاً اس کا ذکر ضروری ہے، جب اسناد کا ضروری ہونا معلوم ہو گیا تو یہ بتانا ضروری ہو گیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک ہمارا یہ سلسلہ سند کس طرح پہنچا ہے، یوں تو سلسلہ ایک ہی ہے مگر سمجھانے کے لئے اسے تین حصوں میں تقسیم کر کے بیان کیا جاتا ہے، ایک حصہ ہم سے حضرت شاہ ولی اللہ تک، دوسرا شاہ ولی اللہ سے صاحب کتاب تک تیسرا صاحب کتاب سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک۔ بطور مقدمہ یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ قبل حدیث کے چند طریقے ہوتے ہیں، اور ان کو ظاہر کرنے کے لئے مخصوص الفاظ ہیں، اگر ہم نے پڑھا، اور شیخ نے سنا، تو اسے قراءۃ علی الشیخ کہیں گے، اور عرض علی الحدیث بھی، اور اگر شیخ نے پڑھا اور ہم نے سنا تو اسے سماع عن الشیخ، اگر نہ ہم نے پڑھا نہ شیخ نے، بلکہ ہمارے ساتھیوں میں سے کسی نے شیخ کے سامنے پڑھا اور ہم نے سنا، تو قری علی الشیخ وانا اسمع کہیں گے، اب سنو کہ ہم نے تینوں طریقوں سے شیخ الہند سے حدیثیں حاصل کی ہیں، اور انھوں نے ہم کو اجازت دی ہے، اور انھوں نے مولانا محمد قاسم نانوتوی سے پڑھا اور اجازت لی، انھوں نے شاہ عبدالغنی مجددی دہلوی ثم مدنی کے پاس پڑھا اور اجازت لی، شاہ عبدالغنی کو شاہ محمد اسحق دہلوی سے اجازت تھی اور ان کو شاہ عبدالعزیز دہلوی سے اور ان کو اپنے پدر بزرگوار حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی سے اجازت حاصل تھی۔ دوسرا محدث شاہ ولی اللہ صاحب سے صاحب کتاب تک اسکو صحاح ستہ کے ادائل یا یا مقدمات میں بحثوں نے لکھ دیے ہیں، اور صاحب کتاب نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک ہر ہر حدیث کا سلسلہ لکھ دیا ہے، اس طرح اکھوند ہجری سنائی جوئی ہر ہر حدیث کا سلسلہ سند کے ساتھ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا ہے، اور ہمیں اجازت ہے تمہیں اجازت دینے کی، اس لئے ہم بھی تم کو اجازت دیتے ہیں،

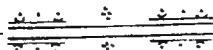


بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

کتاب الوحي

بَابُ كَيْفَ كَانَ بَدْءُ الْوَحْيِ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
سرور کائنات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نزول وحی کی ابتداء کیوں کر ہوئی۔

بَابُ الْبَلْتُونِ بھی ہے اُیْ هَذَا ابَابٌ، اور بالاضافہ بھی، یہ شبہ ہوا ہے کہ اضافت جملہ کی طرف صحیح نہیں
بجز آٹھ الفاظ کے، اور یہ ان میں سے نہیں، جواب یہ ہے کہ اگر لفظ مراد ہوں تو جائز ہے در نہ نہیں اور تقدیر یہ ہے جَاب
جواب کیف کان الخ یعنی اگر کوئی سوال کرے کیف کان الخ تو ہم یہ جواب دیں گے تو مراد اس جملہ سے لفظ میں نہ معنی، اور الفاظ
میں جائز ہے، اور معنی میں ناجائز، اس کے بعد سنو کہ باب کے بعد حد ثنا سے پہلے جو عبارت ہے اسے ترجمہ الباب
کہتے ہیں، بخاری کے تراجم ایک مستقل فن کی حیثیت رکھتے ہیں، اور بخاری کے تفقہ کا کمال ان کے تراجم سے ظاہر ہوتا ہے، بخاری
بہت بڑے فقیہ اور مستقل مجتہد میں کسی کے مقلد نہیں، وہ بجائے اس کے کہ کوئی کتاب فقہ میں لکھتے انھوں نے تراجم میں اپنی فقہ
بیان کر دی ہے، جہاں انشراح نہیں ہوتا وہاں ایسے لفظ لائے ہیں جن سے رجحان کا پتہ نہیں چلتا، مثلاً استغفار وغیرہ کا عنوان
اختیار کرتے ہیں، خلاصہ یہ کہ تراجم بخاری کے بہت اہم ہیں، استاذ فرماتے تھے اور بہت تواضع سے فرماتے تھے کہ میں ڈرتے
ڈرتے کہتا ہوں کہ ابن خلدون (یہ تخیف اللام، اور ابن خلدون بتشدید اللام وکسر اللام) نے اپنے مقدمہ میں جہاں بخاری کا
ذکر کیا ہے، لکھا ہے کہ بخاری کی بہت سی شرحیں لکھی گئیں ہیں، لیکن ابھی تک امت پر اس کا دین باقی ہے حق ادا نہیں ہوا،
شمس الدین سخاوی نے جو حافظ ابن حجر عسقلانی کے خاص تلامذہ میں سے ہیں، اور فانی الشیخ کا مرتبہ رکھتے ہیں، کتاب الغنۃ للام
فی اعیان القرآن التاسع لکھی ہے، اس میں لکھا ہے کہ ابن خلدون نے ایسا لکھا ہے مگر میرے استاذ نے یہ دین اتار دیا، انھوں
فتح الباری لکھ امت کی طرف سے بخاری کا حق ادا کر دیا،



وَقَوْلُ اللَّهِ تَعَالَى اِنَّا اَوْحَيْنَا إِلَيْكَ كَمَا اَوْحَيْنَا إِلَى نُوحٍ وَالنَّبِيِّينَ مِنْ بَعْدِهِ

سخاوی نے ٹھیک ہی کہا، کیونکہ اب تک یہ کوئی ایسی شرح لکھی گئی نہ آتہ کوئی توقع ہے، عینی نے گو مبسوط شرح لکھی مگر انصاف یہ ہے کہ کوئی شرح خواہ کسی کی ہوتی الباری کے مقابلہ کی نہیں [حتی کہ بعض زاویوں سے وہ عینی کی شرح سے بھی فائق ہے اور اسکو تقدم کا شرف بھی حاصل ہے] جہاں تک شرح کا تعلق ہے، سخاوی ٹھیک کہتے ہیں، مگر تھوڑا دین اب بھی ذمہ میں ہے، یعنی حدیث کا دین تو اُنزگیا، لیکن تراجم کا دین ابھی باقی ہے، یہ دین کسی سے نہیں اترتا، حضرت شاہ ولی اللہ نے تراجم بخاری پر ایک رسالہ لکھا ہے (جود ائزۃ المعادۃ حیدر آباد میں چھپ بھی گیا ہے) شاہ صاحب اپنے زمانہ کے امام مسلم ہیں، لیکن استاذ فرماتے تھے کہ دین اب بھی باقی ہے۔ مالٹے کے زمانہ قیام میں استاذ [شیخ الہند] نے ایک خدمت ترجمہ قرآن کی کی، دوسری خدمت شرح تراجم بخاری کی تھی جس کو شروع کیا، مگر تمام نہ کر سکے۔ (حضرت استاذ نے پتیس بار بخاری پڑھائی تھی) یہ اس لئے ذکر کر دیا کہ تراجم میں کج رنگ کلام کرنا پڑے گا۔

محدثین نے اصول قائم کئے ہیں کہ بخاری نے کن کن چیزوں کا التزام کیا ہے، اس ترجمہ پر بحث سے قبل یہ سمجھ کر عادت حدیث کی یہ رہی ہے کہ کوئی کتاب الایمان سے شروع کرنا ہے اور کوئی کتاب الطہارۃ سے اور کوئی اعتقام البتہ سے، مگر بخاری نے جو صورت اختیار کی ہے وہ سب سے علمدہ ہے، اصل تو ایمان ہے اور اس کی اصل توحید ہے، ان سب کو چھوڑ کر بدرالوحی کو مقدم رکھا، اس میں کیا حکمت اور کیا غرض ہے؟ استاذ فرماتے تھے، کہ یہی ایک چیز ہے اگر بخاری کی یہ غرض معلوم ہو جائے تو بہت سی مشکلات سہل ہو جائیں،

یہاں بدرالوحی کو مقدم کرنے کی غرض یہ ہے کہ جو چیز بھی منقولہ خواہ صلۃ کی ہے یا نکاح و طلاق کی، یا ایمان و توحید کی وہ اس وقت تک معتبر و مستند نہیں جب تک منسوب الی الوحی نہ ہو اور وحی الہی سے ثابت نہ ہو، رائے، قیاس، اجتہاد، کشف وغیرہ جس کا استناد وحی کی طرف نہ ہو، ہرگز مستند نہیں، اگر مستند ہے تو صرف وحی الہی ہے اور کوئی چیز مستند نہیں، جب سب کا مدار وحی پر ہو تو پہلے وحی کی عظمت اور اس کی عصمت اور صداقت و بزرگی کو تسلیم کرنا ہے، جب اس کو تسلیم کر لیں گے تو پھر وہ سب چیزیں جو وحی کی طرف منسوب ہوں گی ان سب کو ماننا پڑے گا، گویا یہ ساری کتاب کا مقدمہ، تو اصل کتاب تو کتاب الایمان سے ہے، مگر بطور مقدمہ اسے پہلے بیان کر دیا، کہ میری کتاب مستند الی الوحی ہے خواہ متلو ہو یا غیر متلو، پھر وحی کے احوال و مبادی بیان کئے کہ احوال و مبادی کے بیان سے وحی کی عظمت و عصمت کا سکہ بیٹھ جائے گا تو ساری کتاب قابل تسلیم ہوگی،

ترجمۃ الباب کا مفہوم اور اس کا مقصد، پھر جو آیت ترجمہ میں لائے ہیں اس کو انتخاب کرنے اور اس کو لانے کی غرض اور تھہ حدیثیں جو باب کے تحت مذکور ہیں ترجمۃ الباب سے ان کی مناسبت یہ سب سخت مشکل مباحث ہیں ان پر غور کرنا ضروری ہے، بخاری کی غرض معلوم ہونے کے بعد انشاء اللہ سب آسان ہو جائیں گے، بظاہر چند احادیث کی مناسبت باب سے یہیں معلوم ہوتی مگر تشریح کے بعد انشاء اللہ سب کی مناسبت معلوم ہو جائے گی،

اشکال یہ ہے کہ ترجمہ کا ظاہر تو یہ ہے کہ بدر الوہی کی کیفیت بیان کریں گے، کہ ابتدا وحی کی کس طرح سے ہوئی، لیکن احادیث ایسی ہیں کہ بعض میں تو وحی کا ذکر بھی نہیں، اور بعض میں ذکر ہے تو ابتدا کی کیفیت نہیں، ایک آدھ حدیث مثلاً حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا اول ما بدیٰ لہ وہ تو بدایت کو بتلاتی ہے، بقیہ میں خاص ابتدا کا قصہ ہی نہیں معلوم ہوتا اور پہلی حدیث اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ ہے اس میں وحی کا ذکر ہی نہیں، دوسری میں وحی کا ذکر ہے تو ابتدا کا ذکر نہیں، حالانکہ حدیث کو باب کے مناسب ہونا چاہیے، یہ ہوا اشکال۔

جواب سننے سے پہلے چند اصطلاحیں سمجھ لو، ایک اصطلاح تو یہ ہے کہ لفظ باب کے بعد اور حدیث سے پہلے تک ترجمۃ الباب کہا جاتا ہے، اور اسی کو مترجم بہ بھی کہتے ہیں، اور حدیث کے بعد جو چیز ہے اس کو مترجم لہ کہتے ہیں، تو دو لفظ ہوتے ایک مترجم بہ دوسرے مترجم لہ، یعنی جس بات کے لئے ترجمہ رکھا گیا، لہذا دونوں میں مناسبت ہونی چاہیے، اور یہاں مناسبت نہیں، اور یہ اشکال بخاری کے اکثر ابواب میں پیش آئے گا، ہر قتل والی حدیث میں بھی بدر الوہی کا ذکر نہیں، بلکہ آپ کے اخلاق و اوصاف بیان کئے گئے ہیں، یہی چیز قابل تو مہ ہے، شراح نے جوابات بہت سے دیے ہیں، مگر اکثر غیر شافی ہیں، اس لئے ان کے نقل کی ضرورت نہیں، استاذ رحمہ اللہ نے بڑی عمدہ تقریر کی ہے، مگر شاہ ولی اللہ صاحب نے جو ارشاد فرمایا ہے پہلے اسے بیان کرنا ہوں، شاہ صاحب کہتے ہیں کہ یہاں وحی سے عام مراد ہے متلو ہو یا غیر متلو، خاص قرآن مراد نہیں گو متبادر قرآن کی وحی ہے لیکن مراد عموم ہے اور وجہ عموم یہ ہے کہ مقصد بخاری اس باب سے یہ ہے کہ جو کچھ میں درج کروں گا وہ مشکوٰۃ نبوت سے ماخوذ ہے۔ لہذا ان پر عمل اور ان سے تمسک کرنا وغیرہ وغیرہ سب اس پر موقوف ہیں کہ وہ وحی ہو، چونکہ اصل تمام تعلیمات کی وحی ہے، اس لئے جو چیز اس کی طرف مستند نہ ہو وہ حجت نہیں، حتیٰ کہ نبی کی ذاتی رائے کا یہی حکم ہے جب تک وحی سے اس کی تقریر نہ ہو، چنانچہ تاہر بنخل کی حدیث اس کی شاہ عدل ہے، آئیں اپنے فرمایا کہ میں بشر ہوں جو وحی سے کہوں وہ لے لو اور جو اپنی رائے سے کہوں فانتم اعلم بماورد دنیا کھ معلوم ہوا کہ سند و حجت صرف وحی سے دوسری کوئی چیز حجت نہیں، مثلاً طب کے متعلق جو اقوال وارد ہوئے ہیں انکے باریں

علمائے لکھا ہے کہ وہ تجربات کی بنا پر فرماتے گئے ہیں، وہ حجت شرعیہ نہیں، تو بخاری نے بتلایا کہ کوئی خلق، کوئی عمل، اور کوئی چیز مستند نہیں جب تک اس کا انتساب نہ ہو وحی الہی کی طرف، جب یہ مقصود ہے تو پھر وحی کو خاص کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ وہ عام ہے خواہ متلو ہو خواہ غیر متلو، اور جب وحی ہونا ثابت ہو گیا تو وہ صدق وحی ہے اس میں شائبہ کذب نہیں اسلئے وہ اب حجت شرعیہ ہے خواہ متلو ہو یا غیر متلو، یہ حاصل ہے شاہ ولی اللہ کے کلام کا، اور بالکل درست ہے بلکہ کچھ عجیب نہیں کہ زائد تر مقصود بخاری کا وحی غیر متلو ہو، کیونکہ توثیق یہاں احادیث نبویہ کی مقصود ہے، تفسیر تو نہیں کر رہے، حضرت استاذ [شیخ الہندیا] فرماتے ہیں کہ مثل لفظ وحی کے لفظ بدر بھی عام ہے، بدر کی طرح کا ہے، کبھی بدر زمانی پر اطلاق ہوتا ہے مثلاً کوئی یوں کہے کہ فلاں چیز کی ابتداء کب ہوئی، تو جواب دیا جائے گا کہ فلاں سال یا مہینہ میں یا اتنے زمانہ پہلے، اور کبھی مبداء مکان کے اعتبار سے کبھی اسباب کے اعتبار سے کبھی احوال کے اعتبار سے بیان کیا جاتا ہے، بدر کے معنی شروع ہونے کے ہیں، تو کبھی زمانہ کے اعتبار سے، مثلاً کوئی کہے کہ وحی کی ابتداء چالیس سال کی عمر میں ہوئی، اور اگر یہ کہے کہ فارحما سے شروع ہوئی، تو یہ مکان کے اعتبار سے ہوگی، اور اگر یہ کہے کہ ابتداء خدیجہ والوبکر سے ہوئی، (رضی اللہ عنہا) اس وقت کوئی دوسرا ماننے والا نہ تھا تو یہ بھی ابتداءے وحی ہے مگر باعتبار قبول کے، اور اگر میں کہوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پہلے غار میں جا کر عبادت کرتے تھے، اور آپ میں ایسے اخلاق، ایسی عادتیں، ایسی بے رعبی دنیا سے، اور ایسا زہد تھا، اس وقت وحی آئی تو یہ بھی ابتداء ہی ہے، لیکن احوال بتا کر کہ ترتیب وحی ابتداء ان چیزوں پر ہوا، اور لغت میں بھی اس کا اطلاق یوں ہی ہوتا ہے، چنانچہ کہتے ہیں کہ خشب مبداء ہے سریر کا، یہاں متکون ہونے کی وجہ سے مبداء کہتے ہیں یہاں مادہ کو مبداء کہہ دیا، تخم کو مبداء شجر کہتے ہیں، حالانکہ یہ نہ زمانہ ہے نہ مکان، نہ صفت ہے نہ حال، بلکہ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وجود شجرہ کا اس سے ہوا، تو بیج مثلاً وجود ہوا، پس زمان، مکان، سبب، علت و معدات سبب مبداء کہلاتی ہیں، امام بخاری کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ وحی کے مبادی خواہ وہ کسی اعتبار سے ہوں اس کو بیان کرنا چاہتے ہیں مبداء زمانا ہو یا مکانا اور غیر ہما، اب بہت وسعت ہو گئی، اصل مقصود صرف زمانہ یا مکان بیان کرنا نہیں بلکہ مقصود اصلی ان حالات و اسباب کا بیان کرنا ہے جس کا تعلق ابتداءے وحی سے ہے، غور کرو کہ وحی کے چند اطراف ہیں، ایک موحی - ایک موحی الیہ - ایک واسطہ ایحاء - وحی لانے والے کو بھی موحی کہتے ہیں، اور وحی بھیجنے والے کو بھی موحی کہتے ہیں، موحی کا بتلانا اور اس کا ذکر بھی بدر سے متعلق ہے، کیوں کہ سرچشمہ بیان ہے، لانے والے کا ذکر بھی بدر الوحی کا ذکر ہے، اور اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کس قسم کے احوال طاری ہوتے تھے ان کا بیان بھی بدر الوحی ہے، موحی الیہ کے عادات و اخلاق و اسباب وغیرہ کا بیان بھی بدر الوحی ہے، یہ سب مبادی وحی ہی تو ہیں؟

اس تقریر سے ممکن ہے کہ کوئی نبوت کو کسی سمجھنے لگے، جیسا کہ معتزلہ کو یہ دعو کا لگ چکا ہے، معتزلہ کہتے ہیں کہ جس طرح ولایت کسی ہے، ایسے ہی نبوت کسی ہے، مگر صحیح یہ ہے کہ نبوت موهبت ہے، کسی چیز نہیں ہے خواہ عبادت کتنی ہی کی جائے، سمجھانے کے لئے میں اس کی تعبیر یوں کرتا ہوں کہ نبوت و رسالت ڈگری نہیں ہے بلکہ عہدہ ہے امتحان کے پاس کرنے پر ڈگری تو مل جاتی ہے مگر کوئی امتحان کے بعد کلکٹر نہیں بن جاتا، بلکہ جب یہ عہدہ ملتا ہے تب کلکٹر بنتا ہے۔ ولایت حقیقۃً ڈگری ہے اور نبوت عہدہ، اور یہ کام یعنی اعطاء نبوت اور عہدہ دنیا یہ اللہ تعالیٰ کا کام ہے، مبادی وحی میں اخلاق حسنہ و عادات کریمہ کا ہونا بیشک ضروری ہے، مگر نبوت ملتی ہے اللہ کی طرف سے، البتہ اس کے ظہور کیلئے چند اشیاء کی ضرورت ہے جس سے معلوم ہو جائے کہ یہ اس لائق ہیں کہ یہ جلیل الشان عہدہ انھیں سپرد کر دیا جائے، تو ان کے اندر کمالات ہونے چاہئیں، یہاں دو چیزیں ہیں دونوں کو خوب سمجھ لو، ایک یہ کہ نبوت موهوب ہے اسکی دلیل اللہ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُ یعنی اللہ جانتا ہے کہ کسے اپنا رسول بنائے، انتخاب اللہ فرمائے گا، کوئی شخص چاہے کہ عبادات سے نبوت حاصل کر لے تو حاصل نہیں کر سکتا، دوسرے مقام پر فرمایا اللہ يُصْطَفِيْ مِنْ الْمَلَائِكَةِ رُسُلًا وَمِنْ النَّاسِ یعنی اللہ تعالیٰ ان لوں اور ملائکہ سے اصطفا (انتخاب) فرماتا ہے، نیز فرمایا اِنَّا اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ كَمَا اَوْحَيْنَا اِلَى نُوْحٍ وَالْبَنِيْنَ مِنْ بَعْدِهِ [الہی قولہ تعالیٰ] لٰكِنَّ اللّٰهَ يَشْهَدُ بِمَا اَنْزَلْنَا اِلَيْكَ اَنْزَلْنَاهُ بِعِلْمِهِ (سورہ نساء ۱۶۶) بعلمہ کی تفسیر بعض نے یہ کی کہ جو چیز نازل کی گئی وہ اللہ کے علم پر مشتمل ہے، یعنی اللہ نے ایک مخصوص علم اس میں رکھا ہے، بعض نے کہا اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے علم سے اور جان کر اتارا ہے، وہ جانتا ہے کہ کس میں استعداد ہے اس کے اٹھانے کی اور کس میں نہیں، تو یہ دوسری تفسیر اللہ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُ کے موافق ہوئی۔

دوسری چیز یہ ہے کہ موهوب ہونے باوجود کچھ اسباب ظہور کے لئے ہوتے ہیں، اس کے لئے آیت وَلَمَّا بَلَغَ اُسْمٰدُكَ وَاَسْمٰوٰی اَتَيْنٰهُ حُكْمًا وَعِلْمًا وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ (۱) پر غور کر دے آیت الگ الگ [تھوڑے سے فرق سے] موسیٰ علیہ السلام اور یوسف علیہ السلام دونوں کے لئے آئی ہے حُكْمًا وَعِلْمًا سے نبوت مراد ہے، اُسٹوئی سے معلوم ہوا کہ پہلے ہوا کر کیا جاتا ہے، آگے فرمایا وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ، یعنی ہم اسی طرح بدلہ دیتے ہیں محسنین کو، معلوم ہوا کہ عطا رب بھی انھیں کو ہوتا ہے جو اس کے اہل ہوتے ہیں، اشارہ فرمایا کہ ملتی ہے نبوت ہمارے دینے سے، مگر ترتیب ان اوصاف و

استعدادات پر ہوتا ہے جو ان میں ہوتے ہیں، دونوں چیزیں ثابت ہو گئیں اول وہب، دوم مبادی [یعنی صلاحیت و استعداد] کا ہونا، بخاری بیان کرنا چاہتے ہیں کہ وہ مبادی کیلئے جن پر ترتیب و جوہیت نبوت کا ہوا، بس ان اسباب کا بیان کرنا مقصود اب موجی اور موجی الیک کا ذکر بھی بدر میں داخل ہے، مقصود اصلی بخاری کا وحی کی عظمت و عصمت کا سکہ بٹھالنے اور یہی نسبت ہے، نبض نسوں میں بدو (بالواد) لکھا ہے، حافظ نے کہا کہ ہمارے نوحوں میں بدر (بالہمزہ) ہے، اس کی تائید یعنی بالہمزہ کی تائید اس نسو سے ہوتی ہے جہیں لفظ ابتداء ہے۔

قولہ کیف، کیف سے جو سوال ہوتا ہے اس سے کبھی مقصود اس کی تاریخ کا معلوم کرنا ہوتا ہے اور کبھی اسکی تعظیم مقصود ہوتی ہے، جیسے :- الم تریک فعل (ریک) باصحاب الفیل، اور حق تعالیٰ کا قول ونبین لکم کیف فعلنا دہم کہ یہاں ان آیات میں سوال مقصود نہیں، بلکہ مقصود تعظیم و تعظیم ہے، کوئی شاہ صاحب کی نسبت سوال کرے کہ ان کی استوائی حالت کیا تھی؟ اور یہ سوال ایک مورخ کا ہو تو ایک صورت سوال کی یہ ہے اور ایک صورت یہ ہے کہ کہا جائے، کہ سمجھتے ہو ان کی حالت کیسی تھی، تو اب اس وقت تاریخ مقصود نہیں بلکہ تعظیم مقصود ہے، بالکل اسی طرح یہاں بھی ہے کہ تعظیم و تعظیم کا بیان مقصود ہے اور احوال و صورت کو ذکر کرنے کا ارادہ ہے، اور موجی کا تذکرہ اور اس کی عظمت کو بتلانا ہے، مولانا فرماتے ہیں کہ ایک مترجم یہ کہ مدلول مطابق ہوتا ہے اور ایک التزامی، تو اب اوقات بخاری ایک عبارت کہتے ہیں مگر غرض مدلول مطابق نہیں ہوتا بلکہ التزامی مدلول مراد ہوتا ہے، جیسے یہاں مدلول التزامی یہ ہے کہ اس کی عظمت و عصمت کا بتلانا مقصود ہے، تو یہاں مدلول مطابق سے مناسبت مت دیکھو بلکہ مقصود اصلی کے اعتبار سے مناسبت دیکھو، یہاں مقصود مدلول التزامی ہے نہ کہ مدلول مطابق، اور غرض بیان تعظیم ہے جو مدلول التزامی ہے، اب تمام مراحل صاف ہوئے، یہ خاص مولانا کی بات ہے اور کہیں نہیں ملے گی۔

اس کے بعد وحی کے معنی سمجھو، وحی کے معنی لغت میں اعلام فی خفی یا اعلام فی خفیۃ ہیں۔ عام لغویین یہی معنی لکھتے ہیں، راغب مفردات میں لکھتے ہیں وحی کے معنی الامتداد السریۃ فی خفیۃ، بجائے اعلام کے انھوں نے یہ الفاظ استعمال کئے ہیں، یعنی جھپک کے ساتھ اشارہ کا نام وحی ہے، اس تعبیر نے لغت کو ایک فلسفہ بنا دیا کیونکہ اس سے معلوم ہوا کہ وحی میں لفظ تین باتیں ہونی چاہئے، ایک اشارہ یعنی ایک لمبی چیز کو غصہ طور پر ادا کر دینا، گویا راغب کہتے ہیں کہ جیسے رموز

۱۰ مفردات راغب میں فی خفیۃ نہیں ہے ۱۱ مرتب

ہوتے ہیں مثلاً ھب پہتی فی شعب الایمان کے لئے، یا عب مصنف عبدالرزاق کے لئے، اور رزمیں لمبی عبارت کو مختصر عبارت میں بیان کرتے ہیں [اسی طرح وحی میں ہوتا ہے] پھر اشارہ کبھی زبان سے ہوتا ہے، مثلاً کسی کی امداد کرنی ہے تو امیر یوں نہیں کہے گا کہ اے دے دو، بلکہ صرف ”ہونہ“ کہہ دیتا ہے، مزاج شناس صرف اسی سے سمجھ لیتا ہے، کبھی صرف انگلی کا اشارہ کافی ہوتا ہے، میں حیدر آباد میں تقریر کر رہا تھا، نظام بھی تھے، مغرب کا وقت قریب تھا انھوں نے اشارہ کیا انگلی سے، میں سمجھا کہ مجھے روکنا چاہتے ہیں، مگر مجھے فوراً معلوم ہو گیا کہ اشارہ یتیموں کے جلانے کا تھا، جسے مزاج شناس نے فوراً سمجھ لیا، یہ اشارہ ہوا، تو کبھی صوت اور کبھی کوئی حرکت اور کبھی ہمزے اشارہ ہوتا ہے، گویا وحی اشارہ کو کہتے ہیں، اور گودہ مختصر ہوتی ہے لیکن اس میں بے حد بہت ہوتا ہے، اور پیغمبروں کے دماغ اس قدر اعلیٰ ہوتے ہیں کہ فوراً اس کی گہرائی تک پہنچ جاتے ہیں، ایک واقعہ ہے کہ شیر شاہ سوری نے یک بیک ایک مجلس میں بیٹھے ہوئے زمین پر ایک لکیر کھینچ دی، اس وقت سفر بھی موجود تھے، بظاہر یہ ایک ہل اشارہ تھا، سفر ابھی سمجھے کہ یہ کیا بچوں کی سسی حرکت کرتا ہے، مگر مزاج شناس وزیر نے فوراً کہہ کر کہاں پناہ ایسا ہی ہوگا، تب سفر نے سمجھا ہل بات نہیں تھی، پھر یہ بڑی سڑک بنوادی، یہ تھا اشارہ جسے وزیر نے سمجھ لیا۔ اسی طرح اللہ کے مقررین اشارات کو سمجھ لیتے ہیں، راغب کی تعریف کا یہ پہلا جزو تھا،

دوسرا جزو ہے السریعة، یعنی بہت جلدی سے اس کا نزول ہونا چاہیے، اور یہ جھپک سب مضامین پر پرنش ہوتی ہے، بلکہ شیخ اکبر نے لکھا ہے کہ جس وقت وحی آتی ہے اسی وقت سمجھ بھی لیتے ہیں، افہام و تفہیم تمام مضامین کا بیک وقت ہوتا ہے اس سے لغت عرب کی دست کا اندازہ ہوگا، کسی زبان میں وحی کے مرادف لفظ مل نہیں سکتا، تیسری چیز ہے فی خفیة، یعنی اشارہ بالکل مخفی ہو، کسی کو بھی خبر نہ ہو، یہ تینوں چیزیں لفظ وحی میں موجود ہیں، اسے

معلوم ہوتا ہے کہ دائمی دنیا میں صرف ایک ہی زبان اس قابل تھی قرآن اس میں نازل ہو، مگر یہ کام راغب ہی کا ہے کہ وہ ترک پہنچ کر موتی نکال لاتا ہے، تھوڑے سے صرف سے کیا کیا مضامین اس کے اندر پیدا ہو گئے، یہ تحقیق لغوی تھی لفظ وحی کی۔ شیخ اکبر کہتے ہیں کہ نبوت وہ مقام ہے کہ بڑے سے بڑا ولی بھی اسے نہیں سمجھ سکتا، یہ وہی سمجھ سکتا ہے جس پر گذرتی ہے، ہماری بات انہیں کہ کچھ بیان کریں، مگر شیخ اکبر کے کچھ اقوال جو قرآن و سنت کے موافق ہیں، بیان کرتے ہیں، کیونکہ

عہ بکل کی چمک سے زیادہ سرعت ہوتی ہے نزول وحی میں،

ہمارے لئے یہی اقوال قابل استناد ہیں اور جو ہمارے خیال میں قرآن و سنت کے خلاف معلوم ہوتے ہیں، ان کا بیان ہمیں زیب نہیں دیتا، اس لئے ہم وہ بیان نہیں کریں گے۔

امام حجتہ الاسلام غزالی نے المضمون بہ علی اھلہ یا علی غیر اھلہ وغیرہ میں فرمایا ہے کہ الہام بھی ایک قسم کی وحی ہے، وہ بھی ایک اشارہ مخفیہ ہوتا ہے، یہ وحی اولیاء ہے، اور جہاں وحی نبوت و ولایت کا فرق بیان کیا ہے، وہاں لکھا ہے کہ نبی کی وحی میں واسطہ ملک ہوتا ہے اور ولی کی وحی میں واسطہ نہیں ہوتا، مگر شیخ اکبر نے فتوحات میں رو کیا ہے، اور کہلے کہ غزالی کے تصور نظر پر یہ کلام دال ہے، وہ یہاں تک نہیں پہنچے اور ہم اس کا مزہ چکھ چکے ہیں اور ہمیں معلوم ہے کہ مُلہم کو بھی واسطہ ملک الہام ہوتا ہے، ہاں تجربہ سے معلوم ہوا کہ جب ملک الہام کے ساتھ آتا ہے تو وہ نظر نہیں آتا، ولی سمجھتا ہے کہ فرشتہ دل میں ڈال رہا ہے، مگر رویت نہیں ہوتی، ویسے دوسرے اوقات میں ملک کو دیکھ سکتا ہے، جیسے عمران بن حصین رضی اللہ عنہ صحابی رسول کو ملک سلام کرتے تھے، مگر ولی بوقت الہام ملک کو نہیں دیکھتا، بوقت القار شہود رویت ولی کے لئے ناممکن ہے، یہ صرف نبی کا خاصہ ہے، مثلاً کسی کی آواز سے کوئی واقف ہو تو وہ سمجھ لیتا ہے، کہ یہ فلاں کی آواز ہے، مگر سامنے آکر اگر کوئی بولے تو اس میں زیادہ یقین ہوتا ہے اور پس پردہ کی آواز میں التباس ممکن ہے، یہ مشاہدہ ہے کہ آدمی جانور کی آواز نکالتا ہے اور وہ بالکل غیر ممتاز ہوتی ہے، میں نے خود سنا ہے ایک شخص بکری کی آواز سے بولتا تھا اور بالکل امتیاز نہ ہوتا تھا کہ انسان بول رہا ہے یا جانور، تو جب جانوروں کی صوتیں اور آدمیوں کی صوت میں انسان امتیاز نہیں کر سکتا تو ملک کی صوت اور انسان کی صوت میں کیونکر امتیاز ہوگا، تو شیخ اکبر کا قول (اگر ان پر گذری ہے جیسا کہ انھوں نے فرمایا ہے) فارق ہو گیا نبی اور ولی کی وحی میں، نبی کی وحی میں کسی قسم کا التباس نہیں ہوتا بخلاف وحی ولی کے کہ وہاں التباس باقی رہتا ہے، (اسی لئے نبی کی وحی حجت ہے تمام امت پر اور ولی کی وحی کسی پر حجت نہیں، سہ) تو شیخ اکبر نے کہا کہ غزالی اپنے مرتبہ کے اعتبار سے کہہ رہے ہیں، ورنہ تحقیق وہی ہے جو ہم نے بیان کی، اور یہ ہمارا اور تمام اولیاء کا بالاتفاق تجربہ ہے، دوسری چیز یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام سب مصطفیٰ اور مقبول ہیں، مگر بظاہر شیخ اکبر کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ کبھی کبھی نبی کو بلا واسطہ بھی القار ہوتا اور ہو سکتا ہے، اور کبھی کبھی اللہ کا کلام بلا واسطہ ملک جابجے سننے ہیں، جیسے موسیٰ علیہ السلام نے من ودعاء جاب کلام سنا، کلام مع رویت الہی نبی کے لئے بھی نہیں فرداً فرداً

علہ اگر ولی کو ملک نظر آئے تو یہ ولایت نہیں بلکہ نبوت ہے (منہ) یعنی ملک اسی ولی کو نظر آوے گا جو نبی ہی ہے (جامع)

دو دنوں (یعنی کلام بھی اور رویت الہی) جائز ہیں، یہ حج کلام و رویت آخرت میں ہو گا اس دنیا میں نہیں، وحی کی تقسیم قرآن کی اس آیت میں ہے، مَا كَانَ لِشَيْءٍ أَنْ يُلْحَمَهُ اللَّهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا فَيُوحِيَ بِإِذْنِهِ مَا يَشَاءُ، اِنَّهُ عَلِيُّ حَكِيمٌ، یعنی کسی بشر میں یہ قابلیت نہیں کہ وہ اپنے قوی معجزاتی رہ کر اللہ سے کلام کرے الا وحیاً وہی اشارہ، اومن وراء حجاب جیسے موسیٰ علیہ السلام کو طور پر، یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو لیلۃ المعراج میں، اویسیل الخ یعنی اللہ قاصد بھیجتا ہے اور وہ اللہ کے اذن سے وہ چیز پہنچاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کا کلام تین طریقوں سے ہوتا ہے، تکلم حق انھیں تین میں منحصر ہے، اندہ علی حکیم، علی ہونے کی وجہ سے کوئی بشر طاقت نہیں رکھتا کہ غایت علو کی وجہ سے اس سے کلام کر سکے، اور چونکہ حکیم ہے اس لئے یہ تین صورتیں مقرر کر دیں اب اَنَا وَحْيًا آتا ہے، بخاری کہیں لقول اللہ کہتے ہیں، اور کبھی وقولہ تعالیٰ عطف کے ساتھ کہتے ہیں لقول اللہ صریح دلیل ہوتی ہے اور یہاں استفہام تھا، اور استفہام کے لئے دلیل نہیں ہوتی تو لقول اللہ نہیں کہہ سکتے تھے، اس لئے وقول اللہ کہا یعنی بدء الوحی، اور قول اللہ، اَنَا وَحْيًا کے متعلق بیان کریں گے، بخاری نے تمام قرآن میں سے صرف ایک آیت چھانی اور نہایت بہترین انتخاب کیا، یہ ان کے کمال علم و ذکاوت پر دلالت ہے، اساذ فرماتے تھے کہ اتنا مبسوط اور مشرح بیان قرآن کی کسی آیت میں نہیں، پورا رکوع بلکہ پہلا رکوع بھی انبیاء علیہم السلام کے ذکر میں ہے اور درحقیقت اہل کتاب کے سوال کا جواب ہے، پہلے رکوع میں سوال تھا اور دوسرے میں جواب دیا، یَسْأَلُكَ اَهْلُ الْكِتَابِ سَے بتلادیا کہ ان کی حالت ایسی ہے، پھر توفیق فرمائی، پھر جواب دیا، اَنَا وَحْيًا الخ یعنی یہ ہماری ایک سنت ہے اور وہ وحی تشریفی آج سے نہیں نوح (علیہ السلام) کے وقت سے ہوتی چلی آرہی ہے، اور پھر ہم نے وحی کیجی ہے، اب کسی کا حق نہیں کہ کہے ایک بار کتاب کیوں نہ اتار دی یہ نہ سمجھا کہ صرف ایک جملہ سے استشہاد کر رہے ہیں، بلکہ پورے رکوع سے استشہاد کر رہے ہیں، بعلمہ کی تفسیر کوئی سی بھی لے لو، ہر تفسیر بذالوحی کے مناسب ہے، چونکہ اتنا مبسوط و مشرح بیان تھا اس لئے اتنی وضاحت کرنا پڑی، اتنا اور اضافہ کر لو کہ یہاں وحی کا ذکر ہے۔ اور بدر کا حال بیان کر رہے ہیں تو اس کی اصلی ابتداء بتلاتے ہیں کہ یہ سلسلہ ماضی سے چلا آ رہا ہے، کوئی نئی بات نہیں ہے، اس آیت نے بتلادیا کہ اس ابتداء سے پہلے وحی کی ابتداء کیونکر ہوئی، بدر کے بھی مناسب آیت ہے اس لئے اس کو انتخاب کیا، اور اس لئے بھی کہ ایسا بیان قرآن میں اور کہیں نہیں ہے، آخری آیت بھی مؤید ہے،

لَهُ اَنَا وَحْيًا کے بعد چوتھی آیت میں ہے لکن اللہ یشہد بما انزل الیہ انزلہ بعلمہ (نہد)

یہاں یہ شبہ کیا جاسکتا ہے کہ نوح علیہ السلام سے کیوں شروع کیا، ان کی تخصیص کیوں کی، آدم، شیث، ادریس علیہم السلام کے پاس بھی تو وحی آئی تھی، تو آدم علیہ السلام کا نام کیوں نہیں لیا، مفسرین و محدثین نے اس کے جوابات دیئے ہیں مگر پہلے رسول و نبی کا فرق معلوم کرنے کی ضرورت ہے، پھر یہ کہ نوح علیہ السلام اور ان سے پہلے اور بعد کے انبیاء علیہم السلام کی وحی میں کچھ فرق تھا یا یکسانیت تھی؟ اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی وحی اشبہ لوحی النوح تھی یا نہیں؟ اصل یہ ہے کہ دنیا کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی مدرسہ بنائے تو پہلا کام معمولی طور پر ہوتا ہے، کھانے پینے کا بھی انتظام معمولی طور پر ہوتا ہے، کچھ تھوڑا تھوڑا تعلیم کا سلسلہ بھی ہوتا ہے، جوں جوں ترقی ہوتی جاتی ہے اسی قدر سارے انتظامات ہوتے جلتے ہیں اور انتظام تعلیم بھی عمدہ ہوتا جاتا ہے، یا مثلاً بچہ کو ماں باپ تعلیم دیتے ہیں، لباس و غسل کا طریقہ بتلاتے ہیں، مگر یہ تعلیم باپ کی تربیت کا جزو ہے، اسے کوئی نہیں بتاتا کہ تعلیم شروع ہوگئی، عرفاً تعلیم شروع اس وقت ہوتی ہے جب بچہ مدرسہ جا کر استاد کے سامنے کتاب رکھ دے، اسی طرح جب آدم علیہ السلام تشریف لائے اور اولاد ہوئی تو تھوڑے سے آدمی تھے، ابھی کھانے پینے کا پورا انتظام بھی نہ ہوا تھا، جنت میں بے فکر تھے، سرکاری مکان، سرکاری راشن، سرکاری لباس، سب کچھ وہیں سے تھا، خود کچھ کرنا نہیں تھا، اس لئے کسی قسم کی فکر نہ تھی، اب یہاں سب کچھ خود کرنا تھا، اس لئے معاشرت کی تعلیم دی، اکثر حصہ اسی کا تھا، لباس، غذا کے متعلق تعلیم دی، زندگی گزارنے کے پسندیدہ طریقے بتائے، ساتھ ہی ساتھ کچھ چیزیں جن کی اہمیت اور ضرورت تھی، روحانیت کی بھی تعلیم دی گئیں، جیسے بچہ کو اسی طرح معاشرتی و دینی تربیت دی جاتی ہے بس آدم علیہ السلام سے نوح علیہ السلام تک کا زمانہ غذا و تحقیق عالم کی طفولیت کا زمانہ تھا، جو وحی آنے کے پاس آئی چھ زیادہ تر ان کے بود و باش اور طرز معاشرت کے متعلق تھی، ساتھ ہی کچھ روحانیت کی بنیادی باتیں بھی تھیں، نوح علیہ السلام سے اب باقاعدہ انتظام شروع ہوا، نوح علیہ السلام کے زمانہ میں سزا کا نفاذ ہوا، انھیں کے زمانہ میں احکام کا نزول ہوا، نیز تزکیہ نفس کی تعلیم دی گئی، اب دیکھو کہ وحی نبوی وحی آدم سے اشبہ ہے یا وحی نوح سے؟ تو معلوم ہوگا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی نوح علیہ السلام کی وحی سے اشبہ ہے، تو نوح علیہ السلام کے دور سے مدرسہ چلا اور بتدریج ترقی ہوتی رہی، مدرسہ سے کالج، کالج سے یونیورسٹی بن گیا، حتیٰ کہ تکمیل جناب خاتم النبیین کے دور میں ہوئی (اليوم اکملت لکم دینکم) حاصل یہ ہوا کہ آپ کی طرف جو وحی آئی وہ اس نوعیت کی تھی، جو نوح علیہ السلام کے پاس آئی تھی، ابن تیمیہ کہتے ہیں کہ نوح علیہ السلام پہلے رسول ہیں

عمہ یعنی لوگ یہ سمجھتے تھے کہ ابتدا غار سے ہوئی، اللہ تعالیٰ اشارہ فرماتا ہے کہ اس ابتدا کی بھی اور ایک اور ابتداء ہے جیسا کہ فرمایا، قل صاکنت جبل عا من المرسل، تو ابتدا یہاں بلاشبہ غار سے ہوئی لیکن یہ ابتداء شخصی تھی، ابتداء نوعی نوح علیہ السلام سے ہوئی۔

کا اختلاف تو ہم اس میں کسی حکم کو غلط نہیں کہتے، بلکہ ہم اسے اس وقت کے لئے بالکل صحیح و درست کہتے ہیں، جب وہ نازل ہوئے تھے ہیں اس کا یقین ہے کہ اس وقت وہی صحیح تھے، اگر کوئی یوں کہے معاذ اللہ کہ موسیٰ علیہ السلام جو احکام لائے تھے۔ وہ یا ان میں سے کچھ غلط تھے، تو ہم اسے کا فرکتے ہیں، تو دنیا کی کسی بات میں بھی اتفاق نہیں ہو سکتا، اگر اتفاق ہو سکتا ہے تو صرف وحی الہی میں، اب سنو کہ ہماری نے ایک حجت قائم کی آیت پیش کر کے، کہ ایک نبی نے جو کہا وہی دوسرے نے کہا، وہ ہمیشہ ایک دوسرے کی تصدیق کرتے آئے کبھی کسی نے کسی کی تغلیط نہیں کی تو بس یہی (وحی) قابل قبول چیز ہوئی، (قرآن کی ایک سے زیادہ آیات اس کی تائید کرتی ہیں، مثلاً تیسرے پارے کا آخری رکوع پڑھئے، واذ اخذ اللہ ميثاق النبين لَمَا آتَيْنَاكُمْ مِنْ كِتَابٍ وَحُكْمَةٍ ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مُصَدِّقٌ لِمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهِ وَلَتَنْصُرُنَّهُ اَلَمْ تَعْلَمُوْا -

[ہمارے اس بیان سے عجیب یہ ثابت ہو گیا کہ مقصود صرف عظمت و عظی کا بیان کرنا ہے تو اب اتنا اور سمجھ لو کہ ہماری ایک اور ترجمہ لائیں گے اس کے الفاظ یہ ہیں باب کیف فنزل الوحي واول ما نزل، یہ دونوں ترجمے الفاظ کے اعتبار سے متقارب ہیں، وہاں بھی ادیت ہے نزول کا ذکر بھی ہے وحی کا ذکر بھی، اور یہاں بھی، فرق یہ ہے کہ یہاں بدر کا لفظ ہے اور وہاں بجائے بدر کے اول ما نزل ہے، ان دونوں میں فرق پتہ ہے، کیونکہ میں کہہ چکا ہوں کہ ایک مترجم یہ ہے کہ اور ایک مقصود بالترجمہ، یہاں مقصود تعظیم و تظیم ہے، اور آگے فضائل القرآن میں صرف قرآن کے فضائل بیان کرنا مقصود ہے، وہاں (فضائل قرآن میں) وحی عام نہیں ہے اور یہاں عام ہے بلکہ دائم تر مقصود وحی غیر متلو ہے، یہاں موسیٰ الیہ کے احوال کا بیان کرنا بھی مقصود ہے وہاں نہیں، اسی لئے وہاں الی رسول اللہ نہیں ہے، کیونکہ وہاں یہ مقصود نہیں، بلکہ وہاں تاریخ نزول و کیفیات و ادیت زمانہ مراد ہے اور یہاں غوم ہے، احوال و اسباب و مبادی وغیرہ سب کو شامل ہے، ابن حجر وغیرہ کا ذہن بھی اس نکتہ کی طرف نہیں گیا، اور بہت کم شارح نے دونوں ترجموں میں فرق بیان کیلئے، بعض احادیث مشترک ہیں تو اس میں وجہ یہ ہے کہ من وجہ اس کا تعلق یہاں سے بھی ہے اور من وجہ وہاں سے بھی، مگر پھر بھی دونوں میں فرق ہے کہ وہاں موسیٰ الیہ سے تعریض نہیں اور یہاں تعریض کیا ہے، وہاں خاص قرآن مراد ہے اور یہاں عام، بس یہ یاد رکھو، شیخ الہند کا جملہ کہ ایک مقصود بالترجمہ ہے، ایک مترجم بہ، اور یہ دونوں ایک نہیں ہیں،

۱۔ حَدَّثَنَا الْحُمَيْدِيُّ قَالَ حَدَّثَنَا سُفْيَانُ قَالَ حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ سَعِيدٍ الْأَنْصَارِيُّ قَالَ أَخْبَرَنِي مُحَمَّدُ بْنُ
ہم سے بیان کیا حمیدی نے کہا ہم سے بیان کیا سفیان کہا ہم سے بیان کیا یحییٰ بن سعید انصاری نے، کہا مجھ کو خبر دی محمد بن
إِبْرَاهِيمَ النَّخَعِيُّ أَنَّهُ سَمِعَ عَلْقَمَةَ بْنَ وَقَّاصٍ اللَّيْثِيَّ يَقُولُ سَمِعْتُ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ عَلَى الْمَنْبَرِ
ابراہیم نخعی نے، انھوں نے سنا علقمہ بن وقاص لیثی سے، وہ کہتے تھے میں نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے ممبر پر سنا،

قوله الحميدى، ایک حمیدی متاخر ہیں جنھوں نے کتاب "الجمع بين الصحيحين" لکھی ہے [ان کا نام محمد بن ابی نصر بن عبد اللہ
بن حمید ہے وہ ابن جزم اور خطیب بغدادی وغیرہ کے شاگرد ہیں ان کی وفات ۲۸۸ھ میں ہوئی ہے] وہ یہاں مراد نہیں، اور یہ حمیدی
[جو بخاری کے شیخ ہیں مقدم ہیں ان کا نام عبداللہ بن الزبیر الاسدی الکی ہے بن کی مسند الحمیدی ہے یہ سفیان کے پاس] امام شافعی
[کے گویا ہم سبق] اور طلب علم [و تحصیل سماع] میں ان کے رفیق تھے۔

سفیان [سے] ابن عیینہ مراد ہیں نہ ثوری، کیونکہ یحییٰ، ابن عیینہ کے اساتذ ہیں، نہ ثوری کے، بعض نے اس حدیث کے
تواتر کا دعویٰ کیا ہے، مگر یہ صحیح نہیں، اس میں چار طبقوں میں تفرد ہے پھر تواتر کیسے ہو سکتا ہے، علقمہ مفرد ہیں عمر بن الخطاب سے،
محمد بن ابراہیم مفرد ہیں علقمہ سے، یحییٰ بن سعید مفرد ہیں محمد بن ابراہیم سے، نیز عمر بن الخطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو روایت
کرنے میں مفرد ہیں کیونکہ اس مضمون کی کوئی حدیث اس سیاق کے ساتھ بسند صحیح کسی دوسرے صحابی سے مروی نہیں ہے، ہاں یحییٰ
سے متواتر ہے، یحییٰ سے روایت کرنے والے بکثرت ہیں، حتیٰ کہ بعضوں نے دوسوا اور بعضوں نے سات سو تک گنا ہے، ابن حجر
لکھتے ہیں کہ طالب علمی سے اب تک میں برابر جستجو رہا مگر مجھے تو راوی نہ مل سکے، بہر حال یحییٰ سے راوی ہیں بہت، مگر عجیب بات ہے
کہ عمر رضی اللہ عنہ نے یہ حدیث ممبر پر بیان کی تو وہاں [اسامعین] کم از کم سیکڑوں کی تعداد میں ہوں گے، لیکن باسناد صحیح علقمہ کے سوا
کوئی دوسرا روایت کرنے والا نظر نہیں آتا، بہر حال چونکہ یہ روایت صحیحین میں ہے اس لئے اس کی صحت میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا،
بخاری میں یہ حدیث تقریباً سات جگہ باختلاف سیرائی ہے، آخری دفعہ اس کو ترک خیل میں لانے ہیں وہاں الفاظ یہ ہیں، فرمایا
يا ايها الناس انما الاحتمال الخ یہ خطاب مشعر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی خطبہ میں یہ فرمایا تھا کیونکہ یہ انداز خطاب عموماً خطبہ
ہی میں ہوتا تھا، اس کو تصریح تو نہیں کہہ سکتے بلکہ اشارہ ضرور ہے، ایسا ہے تو مخاطب بھی بکثرت ہوں گے، مگر تعجب ہے کہ حضرت
عمر کی روایت کے سوا کوئی دوسری روایت کسی اور صحابی سے نہیں ملتی، اصولیین (اصول نقد) کے نزدیک اسے مشہور کہیں گے۔

کیونکہ اگر طبقہ اہل میں راوی ایک ہو، اور بعد کے طبقات میں کثرت ہو جائے خواہ تابعین کے طبقہ میں یا تبع تابعین کے، تو اصول
نقد والے اسے مشہور کہتے ہیں، اصول حدیث کے اعتبار سے مشہور بھی، نہ، کیونکہ ان کے ہاں ہر طبقہ میں کم از کم دو راوی ہونچائیں

يَقُولُ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّةِ. وَإِنَّمَا لِامْرِئٍ
وہ کہتے تھے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا فرماتے تھے جتنے (ثواب کے) کام ہیں وہ ۔ سے ٹھیک ہوتے ہیں اور ہر آدمی کو

یہ تو اتنا و عدم توازن کے متعلق بات تھی، نفس حدیث کے بارے میں غور کرو کہ یہاں تین جملے فرمائے، (۱) انما الاعمال بالنية،
(۲) انما لامرئ الخ (۳) فمن كانت هجرته الخ مراد حدیث بیان کرنے سے پہلے یہ بتانا ضروری ہے کہ اس حدیث کو
ترجمہ الباب سے کیا مناسبت ہے، بعضوں نے لکھا ہے کہ اس کو ترجمہ الباب سے کوئی مناسبت نہیں ہے، امام بخاری اس حدیث
کو ابتداء کتاب میں تصحیح نیت کے لئے لائے ہیں، تاکہ لکھنے والا اور پڑھنے والا اپنی نیت صحیح و درست کر لے، کہ سوا ابتداء وجہ اللہ
کے اور کوئی نیت نہ ہو، مگر اس پر شبہ یہ ہے کہ اگر غرض یہ ہوتی تو باب سے قبل لائے تاکہ ساری کتاب سے پہلے نیت درست کرنے
کا ذریعہ قرار پاتی جیسا کہ مشکوٰۃ میں کیا گیا ہے، اس کا یہ جواب دیا جاسکتا ہے کہ ترجمہ خود ان کی اپنی عبارت ہے اور عبادت آگے
حدیث کے ذکر سے شروع ہوتی ہے لہذا اب بھی حدیث سے قبل رہی، بعض نے کہا کہ امام بخاری نے کیفیت کان بدء الوسی
میں اس آیت کا ذکر کر کے گویا ابتداء نوعی بیان کر دی، پھر اس کے مناسب یہ حدیث لائے کہ سارے انبیاء کے پاس یہ وحی
آئی ہے اور سب کو نیت سکھائی گئی ہے۔ کما قال اللہ تعالیٰ وَصَّا امْرُؤًا اَلَّا يَعْْبُدَ وَ اللّٰهُ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ، تو چونکہ
یہ چیز تمام کو دی گئی ہے، اور سب کو اخلاص نیت کا حکم دیا گیا ہے، لہذا اس مناسبت سے بیان کر دیا گیا، مگر اس کی حاجت نہیں،
استاذ فرماتے ہیں کہ حدیث اس لئے لائے ہیں کہ نبی میں جہاں اور اخلاق فاضلہ اور عادات صالحہ ہونی چاہئیں وہاں پہلی چیز یہ ہے
کہ صدق و عزیمت و اخلاص نیت ہو، پہلے یہ دیکھا جاتا ہے کہ کس وجہ پر اس کا اخلاص اور کس مرتبہ پر اس کی نیت ہے، اللہ
جانتا ہے کہ اس کی نیت کیسی ہے اور وہ کس طور پر ہمارے احکام لوگوں کو پہنچائے گا، گویا بخاری نے متنبہ کیا کہ سب سے پہلے موصی الیہ
کی نیت دیکھی جاتی ہے، نیت کا حال اس کے احوال سے معلوم ہوتا ہے، ہم نے دیکھ لیا کہ تم تک بالتوحید کرنے والا دنیا میں کوئی نہیں
تھا، شرک و بت پرستی رائج تھی، جہل و ظلم عام تھا، ایک بندہ اللہ کا اٹھتا ہے اور کفر و شرک، نیز جہل و ظلم کی فوج کو تہ و بالا کو دیتا
تو کیا یہ اس کی نیت کا غمیرہ نہیں، لڑکے کی عمدہ تربیت کو والدین کے حسن نیت پر محمول کرتے ہیں، حضور کا تعلیم کے ذریعہ دنیا کی
کایا پلٹ دینا عزم و نیت سے ہو سکتا تھا، خود بیان فرمادیا، جیسی نیت ہوگی ویسے ہی ثمرات ملیں گے، تو نیت کا اخلاص سب سے
بڑا مبدع ہے، قرآن میں ہے کَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لِّيَقُولُوْا اِهٰؤُلَاءِ مِمَّنْ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ عَلٰی سَیِّئٰتِهِمْ
بعض کو بعض کے ذریعہ آزمائش میں ڈالا تو کہتے ہیں کیا یہی ہیں جن پر اللہ نے احسان کیا ہمارے درمیان میں) اللہ تعالیٰ ان کا یہ
اعتراض نقل کرنے کے بعد جواب دیتا ہے، ایس اللہ با علم بالشافکون، اعتراض تھا اللہ نے انھیں کیوں مخصوص فرمایا

مَا نَوَىٰ، فَمَنْ كَانَتْ هَجْرَتُهُ إِلَىٰ دُنْيَا يُصِيبُهَا أَوْ إِلَىٰ امْرَأَةٍ يَنْكِحُهَا فَهَجْرَتُهُ إِلَىٰ مَا هَا جَدَّ إِلَيْهِ
وہی ملے گا جو نیت کرے، پھر جس نے دنیا لکائی یا کوئی عورت بیاہنے کے لئے ہجرت کی (دیں چھوڑا) اس کی ہجرت اس کام کیلئے ہوگی

جواب دیا، الیس اللہ الخ، یعنی کیا اللہ سب سے زیادہ جانتے والا ہیں ہے شکر گزاروں کو، یعنی یہ دولت اسی کو ملتی ہے جس کے متعلق معلوم ہوتا ہے کہ یہ شکر کرے گا، اور ہر طرح ہمارا مطیع رہے گا، یہ مضمون اور اللہ اعلم حیث یجعل دسائلہ اور لکن اللہ یشہد بما انزل الیک انزلہ بعلمہ، اور موسیٰ ویوسف علیہما السلام کے لئے وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ سبک ایک ہی مضمون ہے، اور احسان انتہائی اخلاص کا نام ہے کہ گویا بندہ خدا کو دیکھ رہا ہے تو معلوم ہوا کہ یہ نعت مخلص کامل کو ملتی ہے، تو مبادی دہی میں سب سے بڑی چیز یہی ہے [اسی کو بیان کرنے کے لئے یہ حدیث لائے] ہاں ممکن ہے ثانوی مقصد بھی ہو کہ پڑھنے والوں کو متنبہ کریں کہ نیت درست کر لو۔ اور اپنی نسبت بھی اشارہ کر جائیں کہ اس کام کو شروع کرتے وقت یہ حدیث ہمارے پیش نظر ہے، مگر مقصود اول وہی ہے، اور کلام میں گو مقصود ایک ہی ہوتا ہے مگر اشارہ دوسری طرف بھی ہو سکتا ہے، اور ہوتا ہے، لہذا الحمد للہ اب کچھ فرخستہ نہیں رہا، ————— اب کچھ منصب نبوت کے بارے میں بھی سن لو:-

منصب نبوت | بلاشبہ فرض کر دو، اگر حکومت کسی کو وائسرائے بلکہ ادنیٰ درجہ کا ملازم بھی مقرر کرے، تو اس میں دو باتیں دیکھی گی، ایک وفاداری، دوم لیاقت، پہلے یہ اندازہ کرے گی کہ کس قسم کا خاندان ہے، کس قسم کے جذبات ہیں، کتنا وفادار ہے، دوم لیاقت، یعنی علم و فہم، سیاست و تدبیر وغیرہ میں کیسا ہے، مگر مقدم وفاداری ہے، دنیا کی کوئی حکومت کسی باغی کو وائسرائے بنائے گی؟ ہرگز نہیں، یہی دو چیزیں منصب نبوت عطا کئے جانے میں بھی دیکھی جاتی ہے، پہلی چیز زیادہ مطلوب ہے کہ جسکو نبی بنانا ہے وہ مرضیات الہی میں فنا ہو، کیونکہ مقصود یہ ہے کہ بندوں سے اللہ کی پرستش کرائیں، نہ یہ کہ وہ جا کر اپنی بندگی کرانے لگیں، اسی کو فرمایا ہے مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يَقُولَ اِنَّهُ تَمَتَّقُ لِلنَّاسِ كَتَمَتَّقُ لِلّٰهِ وَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَلِيمِ، یہ ناممکن ہے کہ اللہ کی جانب سے کسی باغی کو بھیجا جائے، یہی وجہ ہے کہ ہر نبی اپنے زمانے کا سب سے بڑا وفادار اللہ کا ہوتا ہے، مگر فرق یہ ہے کہ دنیاوی حکومت کو ماکان ماکان کما کیون کا قطعی علم نہیں ہوتا۔ اس لئے امکان رہتا ہے کہ منتخب شخص باغی بن جائے، لیکن انبیاء علیہم السلام کے باب میں یہ صورت ناممکن ہے، کیونکہ اللہ کا علم ماکان ماکان کما کیون کو محیط ہوتا ہے، وہ جانتا ہے کہ یہ خلاف حکم کر ہی نہیں سکتے، اور اللہ کا علم غلط نہیں ہو سکتا، لہذا نبی معصوم ہی ہوگا، وہ دعا بازی سے، دھوکہ دہی سے، اور عصیان سے، معصوم ہوگا، زلت اور چرینے سے، وہ عصمت کے خلاف نہیں، اس لئے کہ نفرت جس سے سرزد ہوتی ہے وہ یہ سمجھ کر کرتا ہے کہ یہ بات مرضی الہی کے خلاف نہیں، رب کی نافرمانی

سمجھتے ہوئے ہرگز نہیں کر سکتا،

دوسری چیز فہم و لیاقت ہے کہ اس کے ملکات علیہ ارفع و اعلیٰ ہوں، اخلاق بہترین ہوں، کردار بہت بلند ہو، یہ دو باتیں نبی میں نمایاں ہوتی ہیں، اور پہلے ان دونوں باتوں کے شواہد کا ظہور ہوتا ہے، تاکہ پیغام الہی کی پوری وقوت دلوں میں اتر جائے اور نبی کی عظمت و عصمت کا یقین ہو جائے، تو قبول کرنا آسان ہوگا،

امام بخاری نے بہترین صورت اختیار کی اور بتلایا کہ نبی کے سب سے بڑی چیز اخلاص ہے، اور نیت کا صحیح ہونا اور اس کا حسن ہونا ضروری ہے، رہا اس اخلاص اور نیت کا ظہور، وہ احوال سے ہوتا ہے، نبی کے کارنامے اور بلند اخلاق بتلاتے ہیں کہ نیت میں بھرپور اخلاص کا فرما ہے، نفع الباری میں ہے کہ آپ ابتدا ہی سے اوثان کو مبغوض رکھتے تھے، اور ارادہ رکھتے تھے کہ ان کا استعمال کیا جائے، متفرق طور پر شرح نے بھی ان باتوں کو بیان کیا ہے، مگر یہ استاد کی جامع تقریر ہے جو بہت کا منصب واضح کر دیتی ہے،

انشاء الاحمال میں بہت کلام کیا گیا ہے، اور تعین مراد میں بہت گفتگو کی گئی ہے، اور اس خلاف یہ بھی بیان کئے گئے ہیں، عینی نے سورہ صفحہ لکھے ہیں، کسی نے کہا کہ صحتہ مقدر ہے، کسی نے کہا کہ ثواب، کسی نے کہا کہ مقدر مانا، کسی نے اعتبار وغیرہ مگر ہر ایک نے اپنے مقصود کو پیش نظر رکھا، کیونکہ ہر ایک کو اپنے اپنے اصول کا لحاظ ہوتا ہے، اسی کے موافق توجیہ کرتے ہیں، اخاف و ضو میں نیت کو شرط نہیں کہتے، اور شوائع شرط مانتے ہیں، دلیل میں اس حدیث کو پیش کرتے ہیں اور صحتہ کو مقدر مانتے ہیں، اور اعمال کو عام قرار دیتے ہیں، خواہ مقاصد ہوں یا دسائل، اس کے برخلاف حنفیہ کمال کو مقدر مانتے ہیں، مگر مذہب کی رعایت سے قطع نظر کرتے ہوئے، انصاف کی بات یہ ہے کہ قائل کی غرض اور ماسبق لہ الکلام کو دیکھا جاتا اور اسی کے مناسب محذوف کی تقدیر بانی جائے، سلطان العلماء شیخ عبدالدین بن عبدالسلام اور حافظ عماد الدین ابن کثیر کی تحقیق میں کلام کی تقدیر یہ ہے، انشاء الاحمال معتبر بالنیات، یعنی اعمال نیت سے متبر ہوتے ہیں، جیسی نیت ہوگی ویسا ثمر ہوگا، میرے نزدیک انشاء اللہ ہی حق اور اقرب الی مراد النبی صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔

عمل کا محمود و مذموم ہونا یا شرمز بکارت ہونا یا محبط سیئات ہونا نیت کے اعتبار سے ہے، نیت اچھی ہے تو عمل محمود ہے، نیت خراب ہے تو اللہ کے نزدیک مذموم ہے، گو اعمال بظاہر کیسے ہی اچھے کیوں نہ ہوں، ان دونوں کی مثال حدیث ہی سے پیش کرتا ہوں، قرآن و حدیث میں مسجد ضرار کا ذکر ہے، اور مسجد بنانے کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:-
مَنْ بَنَى لِلَّهِ مَسْجِدًا اَوْ بَنَى لِلْجَنَّةِ، اس حدیث کی رو سے مسجد کا بنانا بڑا اچھا کام تھا، مگر مسجد ضرار بنانے کی

نیت وغرض کی تھی اسے قرآن نے بیان فرمایا، واللّٰذین اتخذوا مسجداً اخراداً وکفراً وتفریقاً بین المؤمنین واصحابہ
 لمن حادّب اللہ ذرّ سؤلہ، الاّیّۃ، یعنی مقصود ضرر پہونچانا اور تفرقہ بین المؤمنین اور اصحاب یعنی جو محارب تھا اسکو گھات
 میں بٹھانا تھا،

واقعہ یہ ہے کہ ابو عامر فاسق کی پہلے مدینہ میں بڑی عزت تھی اور اسب کہلاتا تھا، جب سرکار مدینہ تشریف لائے
 تو اس کو اپنا وقار گرتا نظر آیا، اس نے اس نے پہلے تو انصار مدینہ کو مسلمان ہونے سے روکنا چاہا مگر وہ ایسے عاشق ہو چکے تھے
 کہ اس کی کچھ نہ چلی تو یہ دشمن ہو گیا اور جب مدینہ میں دال نہ لگی تو شام چلا گیا، اور روم وغیرہ کے عیسائیوں کو مسلمانوں کے خلاف
 ابھارتا رہا، منافقین مدینہ کو اس کے پیغامات پہونچتے رہتے تھے، جب وہ واپس آیا تو منافقین نے یہ مسجد اس لئے بنائی کہ
 یہاں بیٹھ کر شورے کریں گے، گویا ایک بڑا اڈہ بنایا گیا۔ مدینہ سے ہٹ کر قبائیں تاکہ فاصلہ ہونے کی وجہ سے اچانک چھاپہ باری
 سے محفوظ رہیں، یہاں نماز کا اور اصل مقصد تفریق بین المسلمین، یہ کہ کچھ لوگ یہاں بھی اگر نماز پڑھیں گے تو ہم انھیں توڑیں
 تو یہ ظاہر میں تو بڑی اچھی بات تھی مگر اللہ نے قرآن میں اعلان فرمایا واللّٰہ یشہد انھم لکذّبون، انھوں نے قسم
 کھا کر اپنا مدعا ظاہر کیا، ویحلفن ان اردوذا الا الحسنی اللہ نے اس کی تردید واللّٰہ یشہد فرما کر کی، پھر حکم ہوا
 لا تقف فیہ ابداً جس کام کے کرنے پر جنت میں مکان بتا تھا نیت کی خرابی کی وجہ سے ساتویں آسمان کے اوپر سے حکم آتا ہے لا تقف فیہ ابداً،
 کیونکہ انکی حالت اور انکی نیت درست نہیں تھی۔ اسکے مقابلہ میں مسجد قبا کا ذکر کیا مسجد اسس علی التقوی من اول یوم...
 المہدیین، یعنی انکی نیت بہتر تھی۔ تو وہ باعث رفع مراتب بن گئی، اور ان کی خرابی نیت ان کے لئے ذہاب بن گئی۔ جیسے
 کہ فرمایا رسول علیہ السلام نے والقرآن حجة لک وعلیک، یعنی جیسی نیت ہوگی ویسی ہی اثر ہوگا۔

دوسری تلخیص وہ واقعہ ہے جس میں بظاہر عمل خراب ہے لیکن حق نیت کی وجہ سے ایک درجہ میں رسول اللہ صلی
 علیہ وسلم نے اس کا لحاظ فرمایا ہے، یہ واقعہ حاطب بن ابی بلتعنہ رضی اللہ عنہ بدری صحابی کا تھا، جہاں عمل بہت خراب تھا
 مگر ان کی نیت کے حسن نے انھیں عتاب سے بچالیا، حضرت حاطب رضی اللہ عنہ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ آ گئے تھے، جب
 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ فتح کرنے کا ارادہ فرمایا تو تیاری کا حکم دے دیا، لیکن انتہائی راز میں لکھا تاکہ خونریزی
 نہ ہو اور مکہ فتح ہو جائے، حضرت حاطب نے ایک عورت کو ایک پرچہ لکھ کر دے دیا جو سردار قریش کے نام سے تھا
 جس میں لکھا تھا کہ اللہ کے نبی علیہ السلام جہاد کی تیاری فرما رہے ہیں، میرا گمان ہے کہ مکہ کا رخ ہوگا، تم اپنے بچاؤ کی

فکر کرو، عورت خط لیکر روانہ ہو گئی، وحی نے حضور علیہ السلام کو واقعہ بتا دیا، آپ نے دو آدمی جن میں سے ایک حضرت علی رضی اللہ عنہ، یہ کہہ کر بھیج دیا کہ فلاں مقام پر اس طرح کی ایک عورت ملے گی، اس کے پاس ایک خط ہے لے آؤ، یہ حضرت روانہ ہوئے اور ٹھیک اسی مقام پر جہاں کی نشان دہی بنی علیہ السلام نے فرمائی تھی، اس عورت کو پایا، اور اس سے خط مانگا اس نے انکار کیا، تو اس کے سامان کی تلاشی لی، مگر نہ ملا، سیدنا علی مرتضیٰ نے تلوار سونت کر کہا کہ خط دے ورنہ تلوار سے گردن اڑا دوں گا، ان کو یقین تھا کہ خط اس نے کہیں چھپا دیا ہے، اللہ کے نبی کی بات غلط نہیں ہو سکتی، جب جان کا خطرہ دیکھا تو عورت نے سر کے چوڑے سے چھپا ہوا خط نکال کر دے دیا، وہ خط لے کر دربار میں پہنچے تو معلوم ہوا کہ یہ خط عاطب کا ہے، معاملہ نہایت سنگین تھا، اور خط لکھنے والا سخت سزا کا مستحق تھا، صحابہ میں عام بے چینی پھیل گئی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا، حضور اس منافق کی گردن مار دی جائے مگر حضور نے جلدی نہیں کی، بلکہ پہلے انھیں بلا کر ان سے دریافت فرمایا، انھوں نے جواب میں عرض کیا یا رسول اللہ جو مہاجرین یہاں ہیں ان کے مکہ میں کئے قبیلے کے لوگ ہیں جو ان کی حمایت و حفاظت کریں گے، انھیں اہل مکہ سے کوئی خطرہ نہیں ہے، لیکن میرا کوئی قبیلہ نہیں جو میرا حامی ہو، میں کہیں اجنبی ہوں میرے پس ماندگان کے لئے پورا خطرہ ہے اس لئے کسی سے حمایت کی توقع نہیں، اسی خیال سے میں نے تصور اساتعلق ان سردارانِ مکہ سے پیدا کرنا چاہا تاکہ میرے اہل و عیال کو نہ ستائیں، اور خدا کی قسم نہ میں اسلام سے پھر اوردہ کفر کو دوست رکھا اور مجھے یقین تھا کہ آپ کی فتح ہو کر ریگی چاہے میں کچھ کروں، میں نے اپنی بات عرض کر دی اب آپ میرے بارے میں جو چاہیں حکم دیں، حضرت عمر کو پھر غصہ آیا مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم (فداہ ابی دہامی) نے فرمایا لا تقولوا الا خیراً، کیونکہ اللہ نے اہل بدر کے بارے میں فرمادیا ہے اعملوا ما شئتم فقد غفرت لکم، پھر آپ نے انھیں کوئی سزا نہیں دی، اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ نیت کا بھی ایک درجہ میں اعتبار ہے، کتنا سخت واقعہ تھا، قرآن میں آیا ہے یا ایہا الذین آمنوا لاتغضوا واعدای وعدوا وکموا لیاء قلیقون الیہم بالمودۃ الآیہ پورے رکوع میں تنبیہ فرمائی گئی مگر ان کی نیت کا اعتبار کرتے ہوئے انھیں معاف کر دیا گیا، معاملہ چونکہ سنگین تھا اس لئے تنبیہ کی گئی اور پوری تنبیہ کی گئی مگر نیت کی اچھائی کا یہ فائدہ بھی ضرور ہوا کہ سزا سے بچ گئے، ان دونوں مثالوں سے معلوم ہو گیا کہ روح عمل نیت ہے، نیت صحیح ہے تو عمل محمود ہے، اور نیت فاسد ہے تو عمل مذموم، ہاں بعض عمل جو خراب ہیں انھیں خراب ہی کہیں گے، ہاں نیت سے فی الجملہ اس کا ضرر باقی نہیں رہتا بلکہ کچھ جن آج تھے،

اب میں چند آیات قرآنی پیش کرنا چاہتا ہوں جن سے واضح ہوگا کہ یہ ضابطہ انما الاعمال بالنیات کا قرآنی آیت سے بنا ہے۔

قرآن میں تیسرے پارے سورۃ البقرہ کے رکوع ۳۶ میں فرمایا گیا ہے کَلَّذِي يَنْفِقْ مَالَهُ رِئَاءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ، فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَأَصَابَهُ وَابِلٌ فَتَمَرَكُ بِهِ فَسُكَّانٌ، لَا يَقْدِرُونَ عَلَى شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوا، یعنی جو ریاوار اور دکھاوے کے لئے مال خرچ کرتے ہیں اس کی مثال ایسی سمجھو کہ چکنے پتھر پڑی ہو گئی ہو، جو نہی ایک تیز بانی کا پھینکا پڑا وہ مٹی صاف ہو گئی، اور پتھر ہی رہ گیا، اسی طرح ریاکار کا خرچ کرنا بیکار جاتا ہے کچھ فائدہ نہیں پہنچاتا، آگے فرمایا، وَمَثَلُ الَّذِينَ يَنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ وَتَثْبِيتًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ لَمَّا كَسَبُوا جَنَّةَ بَرٍّ جَوْهَرٍ أَصْبَحَا وَابِلٌ فَانْتَبَهَتْ جَنَّتُهُمْ، فان لم يصعبوا وابل فطل، یعنی جو دل میں جہاد سے اللہ کی مرضیات کے لئے خرچ کرتا ہے تو اس کی حالت ایسی ہے جیسے ایک باغ ہو ربوہ میں (ربوہ ایسی زمین جہاں خوبہت جلدی ہوتا ہے) کہ اگر بارش ہوئی تو خوب پھل دونا چوگن آیا، اور اگر زیادہ بارش نہ ہوئی تو ٹھوڑی سی (پھل کے سنی ٹھوڑی بارش، جسے پھوار کہا جاتا ہے) وہ بھی کافی ہو جاتی ہے یعنی نیت کا پھل ہے کہ ٹھوڑی سی چیز بڑی سی ہو جاتی ہے،

دوسری آیت میں فرمایا گیا، اَفَمَنِ اسَّسَ بِنِیَآئِهِ عَلٰی تَقْوٰی مِّنْ اللّٰهِ وَرِضْوَانٍ خَیْرًا مِّنْ اَسَّسَ بِنِیَآئِهِ عَلٰی شَفَاجِرٍ هٰدٍ فَاَنْهَارٍ دِهٍ فِی نَارٍ جَهَنَّمَ، یعنی جس نے اللہ کی رضا اور خوشنودی کے لئے کیا وہ بہتر ہے، یادہ جس نے بنیاد ڈالی، کھائی کے کنارے پر جو قائم نہیں رہ سکتی، فانہادہ یعنی ایک دھکے میں جہنم میں جا رہی، یعنی نیت کی خرابی نے جہنم میں پہنچا دیا،

۶۵ تیسری آیت مسجد مزار کی ہے، چوتھی آیت اہل تباہی مسجد کے بارے میں ہے لَمَسْجِدِ اسَّسَ عَلٰی التَّقْوٰی پانچویں آیت ومن ینخرج من بیتہ مہاجرًا الی اللہ ورسولہ ثم یدرکہ الموت فقد وقع اجرہ علی اللہ، ابھی نکلا نہیں شہر سے، رہے شہر ہی میں، مگر نیت اس کی اچھی تھی اس لئے موت سے اس کا اجر ثابت ہو گیا، چھٹی آیت من کان یرید الحیوۃ الدنیا و زینتھا فوف الیہما عمل اللہ فیہا و ہم فیہا لا ینقصون جو دنیا کی زندگی کا اور اسی کی زینت کا ارادہ کرتا ہے ہم اس کو اسی دنیا میں پوری پوری جزا دیں گے اور ہمیں بھگتان کر دیں گے، اور اس میں کچھ کمی نہ کیا جائے گی، مگر آخرت میں کیا ہے، فرمایا وَلِلّٰهِ الدِّیْنُ لَیْسَ لَہُمْ فِی الْآخِرَۃِ اِلَّا النَّارُ وَحَبَطَ مَا صَنَعُوا فِیہَا

دَبَّاهِل مَكَانٍ لَا يَعْمَلُونَ (یہ ایسے لوگ ہیں کہ ان کے لئے آخرت میں صرف آگ ہے اور ان کے سارے کارنامے برباد، اور ان کے سارے اعمال باطل ہو جائیں گے) یعنی وہاں کچھ نہ ملے گا، جیسی نیت ویسا ہی ثمرہ،

سَاتَوِیْ اَیَّتْ، مَنْ كَانَ بِمِیْدِ الْعَجَلَةِ، عَجَلًا لِّهِ فِیْهَا مَا نَشَاءُ لِمَنْ نُرِیدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهُ جَهَنَّمَ یَصْلُهُ اَمَّا مَنْ مَوَّاهِدٌ حَوْراً، جَوَّادِی عَاجِلٌ (دنیا) کا طالب ہوگا، تو ہم جتنا چاہیں گے اور جسکو چاہیں گے جلدی اسی دنیا میں دے دیں گے، مگر آخرت میں انتہائی ذلت کے ساتھ وہ جہنم میں جھونک دئے جائیں گے، یعنی طالب دنیا کے لئے یہ ضروری نہیں کہ اس کو بالکل اسی کے مرضی کے مطابق مل ہی جائے، اور جسکو ملے بھی، تو جتنی وہ چاہے اتنی ہی مل جائے، بلکہ ان طالبین دنیا سے دنیا میں بھی جسکو ہم چاہیں گے، دیں گے، اور جسکو نہ چاہیں گے نہ دیں گے، کسی کا زور نہیں ہے کہ زبردستی لے ہی لے، پھر جسکو دیں گے بھی تو جتنا ہم چاہیں گے اتنا ہی ملے گا، کسی کا دم نہیں کہ وہ ہماری چاہت سے زیادہ لے لے، یہ تو ہم معاملہ دنیا کا، اب رہی آخرت، تو وہاں کچھ نہ ملے گا، بس وہاں تو صرف جہنم ہی ہے جس میں وہ ذلت و خواری کے ساتھ ڈھکیل دیاجائے گا، پھر دنیا کا مال و متاع وہاں کچھ کام نہ آئے گا، اس کے بالمقابل آخرت کی نیت رکھنے والوں کا آگے ذکر فرمایا، وَمَنْ اٰدَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰی لَهَا سَعِیْہَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ، فَاُولٰٓئِکَ کَانَ سَعِیْہُمْ مُشْکُوْرًا، یعنی جس کے دل میں ایمان و یقین موجود ہو اور وہ نیک نیتی سے خدا کی خوشنودی اور ثواب اخروی کی خاطر پیغمبر علیہ السلام کے بتلائے ہوئے راستہ پر عملی دؤر و صوب کرے، تو اس کی کوشش ہرگز ضائع ہونے والی نہیں، یقیناً بارگاہِ احادیث میں حسن قبول و سرفراز ہوگی، آگے فرمایا، کَلَّا نَمِدُّ هٗٔوْلًا وَّهٗٔوْلًا مِّنْ عَطَاٰءِ رَبِّکَ، وَمَا کَانَ عَطَاٰءُ رَبِّکَ مَحْظُوْرًا، یعنی حق تعالیٰ اپنی حکمت و مصلحت کے موافق بعض طالبین دنیا کو تمام طالبین آخرت کو آخرت عطا فرماتا ہے، اس کی عطاریں کوئی مانع اور مزاحم نہیں ہو سکتا، معلوم ہوا کہ دار و مدار نیت دارادہ پر ہے (سورۃ بنی اسرائیل رکوع ۲۷)

اَتُحْیٰی اَیَّتْ مَنْ كَانَ بِمِیْدِ حَوْثِ الْاٰخِرَةِ نَزْدِلْہٗ فِیْ حَوْثِہٖ، وَمَنْ کَانَ بِمِیْدِ حَوْثِ الدُّنْیَا فَوْتِہٖ مَتْمٰہَا وَمَالِہٖ فِی الْاٰخِرَةِ مِّنْ نَّصِیْبٍ، جو کوئی چاہتا ہو آخرت کی کھیتی زیادہ کریں ہم اس کے لئے اس کی کھیتی، یعنی ایک لگاؤں گنا سات سو گنا اور اس سے زیادہ، اور دنیا میں ایمان و عمل صالح کی برکت سے جو فراخی و برکت ہوتی ہے وہ الگ رہی، اور جو کوئی چاہتا ہو دنیا کی کھیتی اس کو دیں ہم کچھ اس میں سے، یعنی جو دنیا کے لئے محنت کرے موافق قسمت کے ملے، مگر آخرت میں اس کی محنت کا کچھ فائدہ نہیں، (سورۃ شوریٰ رکوع ۳) معلوم ہوا کہ مدار نیت پر ہے،

نویں آیت میں فرمایا، حتی اذا فشتم وتنازعتم فی الامر وعصیتم من بعد ما اداکم ما تحبون منکم من یرید الدنیا ومنکم من یرید الآخرة، یہاں تک کہ جب تم خود ہی رائے میں کمزور پڑ گئے (اس طرح کہ جو تجویز رسول اللہ صلی اللہ علیہ نے فرمائی تھی کہ مورچہ پر ایک افسر اور پچاس آدمی برابر بیٹھے رہیں، بعضوں نے غلط فہمی سے یہ رائے دی کہ اب ہم کو بھی کفار کا تعاقب کرنا چاہیے اور تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کہنے پر نہ چلے بعد اس کے کہ تم کو تمہاری دلخواہ بات آنکھوں سے دکھلا دی تھی، یعنی مسلمانوں کا غلبہ دکھلا دیا تھا اور تمہاری اس وقت یہ حالت تھی کہ تم میں سے بعض تو وہ شخص تھے جو دنیا لینا چاہتے تھے، یعنی کفار کا تعاقب کر کے مال غنیمت جمع کرنا چاہتے تھے، اور بعض تم میں وہ تھے، جو صرف آخرت کے طلب گار تھے، دونوں جماعتیں الگ الگ نیت رکھتی تھیں، تو نیتوں کے فرق سے نتیجہ میں فرق ہو گیا، (سورۃ آل عمران رکوع ۱۶)

دسویں آیت، ان یریدوا اصلاحا یوفی اللہ بیدعہما، یعنی اگر نیت اصلاح ہے تو اللہ تعالیٰ توفیق فرمادے گا (سورۃ نساء آیت ۲۵)

گیارہویں آیت، تلك الدار الآخرة نجعلها للذين لا یریدون علوا فی الادب ولا فسادا (سورۃ قصص رکوع ۹) یعنی یہ عالم آخرت تو ہم انھیں لوگوں کے لئے خاص کر دیتے ہیں جو زمین میں نہ بڑا بننے کا ارادہ و نیت رکھتے ہیں نہ فساد کرنے کی، معلوم ہوا جو بڑا بننے اور فساد کی نیت رکھتے ہیں ان کے لئے دار آخرت میں کچھ نہیں، ہاں جن کی نیت اچھی ہے اور وہ تنکیر اور فساد کی نیت نہیں رکھتے، دار آخرت انھیں کے لئے ہے، بارہویں آیت، والذین صبروا ابتغاء وجه ربهم الخ (سورۃ مدثر رکوع ۲) یعنی نیت مرضی الہی اور اللہ کی خوشنودی کی ہے،

تیرہویں آیت، وما امروا الا لیعبدا للہ غلصین له الدین، (سورۃ لم یکن رکوع) یعنی انھیں صرف یہ حکم دیا گیا تھا، کہ غلو ص نیت کے ساتھ اللہ کی بندگی کریں،

چودھویں آیت، وما لاحد عنده من نعمۃ تجزئ، الا ابتغاء وجهہ الاعلا ولسوف یرضی (سورۃ الدلیل رکوع ۱۴) یہ آیت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے بارے میں ہے کہ ان پر کسی کا احسان نہیں کہ اس کا بدلہ دیں لیکن صرف اللہ کی رضا جوئی کی نیت سے وہ مال صرف کرتے ہیں، اس پر تفریع کی ولسوف یرضی اور عنقریب وہ

راضی ہو جائے گا، یعنی اللہ کی طرف سے اس نیک نیتی پر اسے راضی کیا جائے گا، ان آیات معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم سے اخذ فرمایا اور ہر اعتقیدہ بھی یہی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جو فرلتے ہیں اس کا ماخذ قرآن ہے، ہاں الفاظ کا اتحاد ضروری نہیں، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے یہی دعویٰ کیا ہے کہ حضور جو فراتے ہیں اس کا ماخذ قرآن ہے، گو ہم نہ سمجھ پائیں امام شافعی نے موافقات میں کہا ہے کہ عموم کبھی صیغہ سے ثابت ہوتا ہے اور کبھی جزئیات ہوتی ہیں ان کو دیکھ کر ایک عام ضابطہ نکل آتا ہے، ان جزئیات میں ایک قدر مشترک ہوتی ہے اس سے ضابطہ بن جاتا ہے، اللہ رحم فرمائے شافعی پر کہ انھوں نے بہت بڑی چیز کی طرف متنبہ فرمایا، ان تمام آیات سے معلوم ہوا کہ نیت پر معاملہ ہوتا ہے اور انھیں نصوص سے ایک صنف اہل اہل حکی تعمیر انما الاعمال بالنیات سے فرائی گئی اسکی مثال یوں سمجھو کہ ایک تواتر معنوی ہے ایک لفظی (اسی طرح سمجھو کہ ایک عموم لفظی ہوتا ہے ایک معنوی) [معنوی کا مطلب یہ ہے کہ لفظ کوئی ایسا نہیں جس سے ضابطہ بن سکے، مگر جزئیات کثیرہ سے ایک قدر مشترک نکل آئے جس سے ضابطہ بن جائے، اسی طرح حاتم کی سخاوت متواتر ہے مگر اس کے جوہر سخا کا کوئی خاص واقعہ متواتر نہیں ہے مگر جب کسی کا حال یہ ہو کہ جب اس کے پاس کوئی پہونچے تو اس کو کچھ دے دے، پھر دوسرا پہونچے تو اسکو بھی دے، پھر جو پہونچے کچھ ضرور دے، اور ان میں سے ہر ایک یوں نقل کرے کہ اس نے ہمیں یہ دیا، دوسرا کہے کہ میں یہ دیا اور سب یوں ہی کہیں تو ان سب کا قدر مشترک متواتر ہوا اور وہ اس کی سخاوت ہے بہر حال یہ ایک قدر مشترک کی بنا پر کہنا ہوگا، اسے تواتر معنوی کہیں گے، تو ضابطہ کے لئے عام لفظ کی ضرورت نہیں بلکہ بہت سی جزئیات کو دیکھ کر ضابطہ بن جاتا ہے بس یہاں انما الاعمال بالنیات کا ضابطہ ان جزئیات (آیات) کی بنا پر بن گیا، جن کا ذکر اوپر کیا گیا،

نیت کے معنی میں سخت احتلا ہو گیا ہے، لغت عرب میں لفظ نیت بمعنی قصد آتا ہے، مگر تصدیق صرف ارادہ ہوتا ہے اور نیت میں ارادہ کسی غایت پر پہونچنے کا ہوتا ہے، نیر نیت میں تمیز مقصود ہوتی ہے، مگر کہیں تمیز ایک عمل کی دوسرے عمل سے ہوتی ہے، مثلاً کہیں کدھر کی نیت کرو، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ عصر کی نہیں، نفل کی نہیں، تو یہ عمل کی تمیز ہوتی دوسرے عمل سے، کبھی تمیز عبادت کی عادت سے ہوتی ہے، مثلاً روزہ رکھا مگر نیت نہیں کی تو عبادت نہیں ہوتی، یا ہفتہ میں ایک دن نہ کھانے کی عادت کرنی، اور نہ کھایا تو یہ عبادت نہ ہوتی، ہاں نیت کرنی روزہ کی، یعنی نیت کی کہ اللہ کے حکم سے ایسا کرتا ہوں، تو اب یہی نہ کھانا عبادت بن گیا، تو نیت سے عبادت اور عادت میں تمیز ہو جاتی ہے، تو اب ایک عبادت کو دوسری عبادت سے اور عبادت کو عادت سے تمیز دینے کا نام نیت ہوگا، اور فقہاء میں اسی معنی کے

اعتبار سے اختلاف ہے

کبھی دوسرے معنی بھی نیت کے آتے ہیں، وہاں معمول کہ کی دوسرے معمول لہ سے تمیز مقصود ہوتی ہے اور مبدوء کی مبدوء سے تمیز مقصود ہوتی ہے، یعنی جس کے لئے عمل کیا گیا ہے، وہ اس سے ممتاز ہو جائے جس کے لئے عمل نہیں کیا گیا، مثال کے لئے مسجد ضرار کا واقعہ لے لو، یہ مسجد اللہ کی عبادت کی نیت سے نہیں بنائی گئی تھی، تو اس کا حکم مسجد کا نہ رہ گیا اگر کہا جائے نیت ٹھیک کرو، یعنی یہ کہ اللہ کے لئے کرتے ہو یا کسی اور کے لئے، تو یہاں معمول لہ کو غیر معمول لہ سے تمیز مقصود ہوگی، اس کی نظیر مشکوٰۃ کی وہ حدیث ہے جہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ کوئی مال وجاہ کے لئے کوئی ریا اور دکھاوے کے لئے کوئی حایت کے لئے لڑتا ہے تو ان میں سے مجاہد کون ہے، فرمایا مجاہد صرف وہ ہے جو صرف اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لئے لڑے، من قاتل لئنکون کلمۃ اللہ ہی العلیا، تو یہاں معمول لہ کا اعتبار ہے کہ عمل کس کے لئے ہو رہا ہے، قرآن کریم کی تمام آیات میں یہی ثانی معنی مراد ہیں، اور یہی معنی حدیث کے بھی ہیں، یعنی جس چیز کے لئے نیت ہوگی وہی ملے گی، چنانچہ ضمن کانت ہجرتہ الی اللہ الخ سے تفصیل فرمادی، فاء تقریبیہ قرینہ ہے کہ حدیث کے معنی ثانی معتبر ہیں نہ اول، کیونکہ بتلادیا کہ اگر اللہ کے لئے کام ہے تو اس کا ثمر مرتب ہوگا اور وہ عمل مقبول عند اللہ ہو جائے گا، لیکن اگر معمول لہ کوئی دوسرا ہے تو اس کا ثمر دوسرا مرتب ہوگا، اللہ کے یہاں اس کو درجہ قبول نہ ملے گا، پس حدیث میں یہی معنی معتبر ہوں گے کہ جس کے لئے کام کر دگے وہی ملے گا، وہی حاصل ہوگا، اور یہ معنی متفق علیہ ہیں، اختلاف معنی اول میں ہے تو اب حدیث سے اس مسئلہ مختلف فیہا کا کوئی تعلق نہیں رہا، بلکہ وہ الگ چیز ہے، اور اگر اسی سے بحث ہے تو میں کہتا ہوں کہ مقصود بالذات امور میں نیت بالاتفاق ضروری ہے،

وسائل میں اختلاف ہے، چنانچہ ہمارے ہاں وضو میں شرط نہیں، مگر باس معنی کہ مفتاح صلوٰۃ ہو، اگر اسے عبادت بنانا ہے تو بلاشبہ بغیر نیت کے عبادت نہیں بنے گا، اس کے بارے میں میں کہتا ہوں کہ اگر عمل کی صحت کیلئے نیت ضروری قرار دیجائیگی تو یہ کلیہ صحیح نہیں ہوگا، کیونکہ تب تطہیر بطن و ثیاب میں بھی نیت کو شرط ماننا پڑے گا، حالانکہ ہم بھی اس کے قائل نہیں، لیکن عموم مانتے ہو تو یہاں بھی ماننا پڑے گا، اور اگر فارق نکالو گے تو ہم بھی کوئی فارق نکالیں گے، کپڑے میں ازالہ نجاست کا ہے اور یہاں ازالہ حدث کا ہے، پانی بالطبع مطہر ہے اس لئے بلانیت طہارت ہو جائے گی۔ ازالہ نجاست و ازالہ حدث میں کوئی فرق نہیں ہے، ہاں تیمم میں نیت ضروری ہوگی، کیونکہ زمین بالطبع مطہر نہیں، اور

اسی وجہ سے جہاں ظہوریت ناقصہ ہے وہاں بھی نیت ضروری ہے جیسے وضو بالنیذ یا مار مشکوک، اور پانی چونکہ بالبطح مطہر ہے جیسا کہ قرآن میں ہے: .. وانزلنا من السماء ماءً طہوداً، اور فرمایا وینزل علیکم من السماء ماءً لیطہرکم به، اس نے نیت شرط نہیں، تو جب نیت کرتے ہو تو ہم بھی اگر تخصیص کریں تو کیا حرج ہے؟

قولہ (احمری) مانوی، اس میں اور پہلے جملہ میں بظاہر فرق نہیں معلوم ہوتا، مگر دونوں میں فرق ہے اور وہ یہ کہ ایک تو عمل کا محمود مذموم ہوتا، اس کے لئے پہلا جملہ ہے، اور ایک عاملین کے لئے ثمرہ کا حصول ہے، اسے بتلایا جملہ ثانیہ سے، یعنی ایک تو فی نفسہ عمل کا جن دنج ہونا ہے وہ بھی نیت سے ہے، اور ایک عامل کو ثمرہ کا ملنا ہے، یہ بھی نیت ہی سے ہے اس میں آخرت کی تخصیص نہیں، دنیا میں بھی اس کا ثمرہ ملتا ہے، اسے ملے یا اس کی اہلاد کو، فرمایا، من کان یرید حوث الدنیا فو قہ منها وصالہ فی الآخرۃ من نصیب، جو دنیا کی نیت کرتا ہے اس کو بھی دیتے ہیں، تو کفار کی نیت بھی ضائع نہیں جاتی، رہے ایمان والے سوان کو ثمرہ ملتا ہی ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی ملے گا، تو ان دونوں جملوں کا الگ الگ فائدہ ہے۔

قولہ فمن کانت ہجرۃ الی دنیا یصیبھا والی امرأة ینکحھا الخ

یہاں یہ سوال ہوتا ہے کہ یہ حدیث یہاں پوری مذکور نہیں ہے، پوری حدیث یوں ہے، فمن کانت ہجرۃ الی اللہ ورسولہ فھجرۃ الی اللہ ورسولہ ومن کانت ہجرۃ الی دنیا الخ پہلا فقرہ بخاری نے حذف کر دیا، حالانکہ اس کا تعلق نیت حسنہ کے ساتھ ہے، اس سوال کا یہ جواب کہ بخاری کو یوں ہی پہنچنی ہوگی صحیح نہیں ہے، کیونکہ دیگر مواقع میں بخاری ہی میں وہ فقرہ بھی موجود ہے، بعضوں نے اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ حمید کی روایت میں یہ جملہ نہ ہوگا، مگر یہ وجہ صحیح نہیں، اس لئے کہ حمید نے اپنی مسند میں پوری حدیث درج کی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عداً اختصار کیا گیا ہے، کیونکہ حذف و اختصار کے بعد بھی غرض پوری ہو جاتی ہے، تقابلاً و مفہوم مخالف خود بخود سمجھ میں آگیا، اس لئے ضرورت نہیں سمجھی، مگر یہ ریکٹ توجیہ ہے کیونکہ پھر دیگر مواقع پر کیوں لائے، اور پھر دوسری احادیث میں بھی یہی کرتے، حالانکہ ایسا نہیں کیا، آخر میں شرح نے لکھا ہے کہ بخاری نے تواضعاً ایسا کیا، یعنی اگر یہ جملہ ذکر کرتے تو اس میں اشعار ہوتا کہ ہم نے صحیح نیت اور محض ابتغاء وجہ اللہ کے لئے یہ کام کیا ہے اور اس میں ایک قسم کا دعویٰ اور شیخی پائی جاتی، اس لئے اس جملہ ہی کو حذف کر دیا، اور تواضعاً صرف دوسرا فقرہ

ذکر کر کے اشارہ کر دیا کہ ہم حسن نیت و اخلاص کا دعویٰ کیا کر سکتے ہیں، مگر اس سے بھی تشفی نہ ہوئی کیونکہ بخاری تو حدیث نقل کر رہے ہیں اس میں تزکیہ کیا تھا، بہر حال کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی، ہاں ایک یہ خیال ہوتا ہے کہ حذف سے ممکن ہے یہ غرض ہو کہ جس قدر ضرورت نیت کے صالح بنانے کی ہے، اس سے زائد ضرورت نیت فاسدہ سے بچنے کی ہے، بعض اعمال ایسے ہوتے ہیں کہ جو بری نیت سے نہیں کئے جاتے اور نہ اس میں ابتداء وجہ اللہ ہوتا ہے مگر ان سے بھی قربت حاصل ہوتی ہے لیکن جس عمل میں بد نیتی ہو وہ مطلقاً مفید نہیں بلکہ مضر ہیں تو یہ شرط ہر عمل میں ضروری ہے کہ بد نیتی نہ ہو، مثلاً تلاوت قرآن پاک میں ریا ہے تو وہ مفید نہیں، اور اگر نیت کچھ بھی نہیں تو بھی ثواب حاصل ہوگا، پس نیت فاسدہ سے بچنے کی ہر وقت ضرورت ہے تو ممکن ہے کہ حذف سے اس کی طرف متوجہ کرنا مقصود ہو کہ حصول نفع کیلئے نیت حسن کا اشتراط تو کبھی ساقط بھی ہو جاتا مگر نیت فاسدہ سے اجتناب احتراز ہر حال میں اور ہر وقت ضروری ہے، اجتناب کی اس شرط کا سقوط کبھی نہیں ہوتا، چنانچہ عمومی نے شیخ الاسلام زکریا القادری سے نقل کیا ہے کہ یہاں تین چیزیں ہیں۔ ایک طاعات، ایک قربات، ایک عبادات طاعات میں نہ معرفت مطاع کی شرط ہے نہ نیت مشروط، جیسے کوئی دلائل میں غور و فکر کرے تاکہ موصل الی الایمان ہو، یہ ایک نفل ہے جس میں نہ نیت شرط ہے، کیونکہ کافر کی نیت غیر معتبر ہے اور نہ معرفت شرط ہے، کیونکہ اسی کی معرفت کے لئے تو نظر کر رہا ہے، تو طاعات میں نہ معرفت شرط ہے نہ نیت مشروط۔

دوسرے قربات ہیں، اس میں معرفت مطاع شرط ہے، گو نیت غیر مشروط ہو، جیسے تلاوت قرآن، کہ یہ معرفت معبود سے ہے لہذا ثواب ملے گا، علق، ذکر، مراقبہ، صدقات، سب قربات ہیں۔

تیسرے عبادات ہیں، یہاں معرفت معبود بھی مشروط ہے، اور نیت عبادت بھی ضروری ہے، حدیث کا پڑھنا قربات میں آ سکتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ نیت فاسد نہ ہو، ہم کو یہ تو جیہ بہتر معلوم ہوتی ہے، گویا بخاری نے پہلے فقہ کو حذف کر کے بتلادیا کہ اس وقت ہمارے پیش نظر زیادہ تر وہی فقرہ ہے جس کو ہم ذکر کر رہے ہیں، جس میں بری نیت کا مذموم و مضر ہونا مذکور ہے اور جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ایسی نیت سے اجتناب لازم ہے، ہمارے نزدیک یہ جواب اور جوابوں سے بہتر ہے۔ واللہ اعلم۔

قوله (والی امرأة الخ)

یہاں اس حدیث میں عورت کا ذکر تمیم کے بعد کسی چیز کا بالتخصیص ذکر خاص طور پر اس لئے کیا گیا کہ انتہا ن عورت

کے ساتھ زیادہ ہے، جس طرح اہتمام شان کے لئے ذکر دیا کرتے ہیں، بعض نے اس حدیث کے متعلق یہ لکھا ہے کہ یہ واقعات قیس کے بارے میں وارد ہوئی ہے اس لئے کہ اس نے نکاح کے لئے ہجرت کی شرط کی تھی، چنانچہ اس شخص کا نام ہی مہاجرام قیس پڑ گیا، اس مرد کا نام کسی کو معلوم نہیں، ہاں یہ معلوم ہے کہ عورت کا نام قبیلہ تھا، گو اس کی صحت کا ثبوت نہیں، مگر نفس واقعہ کا ثبوت ضرور ہے، لیکن اس واقعہ ہی میں اس حدیث کے وارد ہونے کا ثبوت نہیں بہر حال تخصیص بالذکر سے یہ ضرور معلوم ہوا کہ افتنان عورت سے زیادہ ہے، یہی وجہ تخصیص تھی، ورنہ دنیا کے ذکر میں اس کا بھی ذکر آچکا تھا،

کما قال اللہ تعالیٰ :- ذین للناس حب الشهوات من النساء والبنین الخ
ایک صورت یہ بھی ہے کہ نیت کچھ دنیا کی ہو، اور کچھ آخرت کی، ایسے وقت میں حجۃ الاسلام امام غزالیؒ کہتے ہیں، جدھر غلبہ ہوگا، اسی کا اقتدار ہوگا۔

عمل کے متعلق ایک بات یہ بھی عرض کر دوں کہ ابن جریر طبری نے اجماع سلف نقل کیا ہے کہ اگر کسی کی نیت ابتداءً اچھی ہو، بعد میں کچھ عوارض اس نیت کے خلاف طاری ہو جائیں تو وہ مفسر نہیں، اور ثواب اسے ملے گا، لیکن اگر آخر تک نیت اچھی رہے تو اور زیادہ افضل ہے اور ثواب بھی زائد ملے گا۔

۲۔ حَدَّثَنَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ يُوسُفَ قَالَ: أَخْبَرَنَا مَالِكٌ عَنْ هِشَامِ بْنِ عُرْوَةَ عَنْ أَبِيهِ

عبد اللہ بن یوسف نے ہم سے بیان کیا کہ امام مالک نے ہشام بن عروہ سے یہ روایت بیان کی انھوں نے عروہ سے

عَنْ عَائِشَةَ أُمِّ الْمُؤْمِنِينَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا أَنَّ الْحَارِثَ بْنَ هِشَامٍ سَأَلَ رَسُولَ اللَّهِ

بطریق ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا یہ بیان کیا کہ حارث بن ہشام نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا

صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَا رَسُولَ اللَّهِ! كَيْفَ يَأْتِيكَ الْوَحْيُ؟ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ

صلى اللہ علیہ وسلم فرمایا رسول اللہ آپ کے پاس وحی کس طرح آتی ہے.....؟ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: أَحْيَانًا يَأْتِينِي مِثْلَ صَلَٰصَلَةِ الْجَرَسِ وَهُوَ أَشَدُّهُ عَلَيَّ

نے فرمایا کبھی تو میرے پاس گھنٹی کی آواز کی طرح آتی ہے، اور یہ انداز وحی میرے اوپر سب سے زیادہ مشاق

(حدیث) ام المؤمنین کا لفظ قرآن سے مقتبس ہے، فرمایا واذ واجه امہاتھم، نبی علیہ السلام کی بیویاں امت

کی مائیں ہیں، احترام و توقیر اور عدم جواز نکاح میں، نہ کہ تمام احکام میں، اس لئے کوئی یہ نہ کہے کہ پردہ بھی نہ کرنا چاہیے۔

حارث بن ہشام رضی اللہ عنہ ابو جہل کے بھائی ہیں، فضلاء صحابہ میں ہیں۔

انھوں نے اتیان وحی کی کیفیت پوچھی، اس سے معلوم ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جو بات مخصوص ہے

اس کی نسبت بھی سوال جائز ہے، غرض رسول یہ ہے کہ وحی ایک امر عجیب ہے، اس کا تجربہ سوائے نبی کے اور کسی کو

نہیں، اُنہی نے کمال اشتیاق سے سوال کیا، جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کمال اشتیاق میں رَبِّ ادِّبْنِي

كَيْفَ يَخْرُجُ الْمَوْكُوتُ کہا تھا، اسی طرح کمال اشتیاق میں یہ سوال بھی تھا، اس کا آپ نے جواب دیا، جس کا ماحل یہ ہے کہ

ایتیان وحی کی دو صورتیں ہیں، (اس حدیث میں دوہی بیان کی گئی ہیں) اول مثل صَلَٰصَلَةِ الْجَرَسِ، یعنی

ٹالی کی سی آواز، یا گھنٹی کی سی آواز، جو گاڑی وغیرہ میں لگادیتے ہیں۔ صلصلہ اس آواز کو کہتے ہیں جو متصل

ہو اور متدارک، جیسا کہ ٹالی کی گنگناہٹ ہوتی ہے، چونکہ اور کوئی چیز مشابہ نہ تھی، جس سے سمجھایا جاسکے، اس لئے

سمجھانے کے لئے یہ فرمایا، پھر اس میں کلام ہے کہ یہ صوت وحی کی تھی، یا اجنہ ملائک کی آواز تھی، علما کے دونوں

قول میں ہمارے نزدیک ظاہر یہ ہے واللہ اعلم کہ غالباً یہ صوت وحی کی ہوتی تھی، اور یہ بیان مشابہ ہے اس کے جو دوسری

حدیث میں آیا ہے، کہ جب اللہ کوئی حکم بھیجتے ہیں تو ملک ایک ایسی آواز سنستے ہیں جو صامت پتھر پر کوئی زنجیر

کھینچنے سے پیدا ہوتی ہے، فرشتے یہ آواز سن کر سجدہ میں گر جاتے ہیں، اور اپنے بازو مارنے لگتے ہیں، اور رب

چھا جاتا ہے، بعد افاقۃ نیچے والے فرشتے اوپر والے فرشتوں سے پوچھتے ہیں ماذا قال ربکم؟ جواب ملتا ہے الحق، قرآن میں ہے حتی اذا فرغ عن قلوبہم قالوا ماذا قال ربکم، قالوا الحق وهو العلی الکبیر، یعنی جب گھبراہٹ دور کر دی جاتی ہے تو یہ سوال وجواب ہوتے ہیں وہ علی وکبیر ہے اس کے علاوہ کمال عظمت سے مرعوب ہو جاتے ہیں، تو یہاں صلیۃ الجوس اور وہاں کسلۃ علی صفوان ہے اور یہ دونوں متقارب ہیں، اور میرے خیال میں یہ اشارہ بساطۃ کی طرف ہے، تشبیہ ایسی دی کہ فی الجملہ اس میں بساطت ہو اور ترکیب نہ ہو، سلسلۃ علی صفوان بھی گو محدث ہے مگر من وجہ وہ ترکیب سے بید ہے، اگر تار وغیرہ اس زمانہ میں ہوتے تو ممکن تھا حضور اسی سے تشبیہ دیتے، کیونکہ یہاں ایک آواز منقل متدارک ہوتی ہے جہاں تار لگا ہوتا ہے وہاں گھنٹی بھی ہوتی ہے جس سے وہ مطلع ہوتا ہے، بہر حال تشبیہ کا مقصود انشاء اللہ اشارہ بساطۃ کی طرف ہے مگر حال کیا ہوتا ہے فرماتے ہیں کہ وہ آتی ہے پھر منقطع ہو جاتی ہے۔ مگر میں وہ سب کچھ محفوظ کر لیتا ہوں جو ملک لانا ہے اور آواز ختم ہوتی اور صبیحہ میں محفوظ ہو گیا، القار، تفہیم، حقا، سب مٹا ہے اتنا اور سمجھ لو کبھی ایسا ہوتا ہے کہ مشبہ محمود ہوتا ہے، اور اور مشبہ محمود نہیں ہوتا، بلکہ مذموم ہوتا ہے، صلیۃ الجوس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے اور فرمایا ہے کہ جس قافلہ میں برس ہوگا اس قافلہ میں فرشتے رحمت کے نہیں ہوتے، تو یہ چیز مذموم تھی مگر تشبیہ دے دی وہی کو اس سے جو محمود ہے مگر جو کہ غرض واضح ہے [اور مقصد تشبیہ کا صرف ایضاح ہے] اس نے کچھ حرج نہیں، اگر کوئی کہے کہ فلاں شیر کی طرح ہے تو کیا تمام باتوں میں تشبیہ ہے؟ نہیں بلکہ تشبیہ ایک خاص وصف میں ہے، یعنی شجاعت میں، ایسے ہی پہلا وجہ شبہ کا اعتبار ہے تشبیہ سے مقصود مشبہ کو واضح کرنا ہوتا ہے، اس لئے اسے اختیار کیا جاتا ہے، اور یہ نبی ہی کی شان ہے کہ ایسی بلند تشبیہ دی کہ اس سے بہتر تشبیہ نہیں مل سکتی، براہین قاطعہ مولانا غلیل محمد رحمۃ اللہ علیہ ہے کہ مرد و مجلس میلاد ایسی ہے جیسے کنہیا کا جنم، اس کی مولانا کی تکفیر کر دی گئی، کیونکہ مجلس میلاد کو ایسی چیز سے تشبیہ دے دیا جو ازل سے اور مذموم، اور کہا گیا کہ اس سے تو بہتر گئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی، حالانکہ تو بہن کا نہ کوئی شائبہ ہے، اور نہ مقصود تنقیص نبی ہے، بلکہ مقصود یہ ہے کہ جو جہالات جاری کر رکھی ہیں وہ بالکل اس کے مشابہ ہیں، اگر تشبیہ جو حدیث میں ہے کوئی دیوبندی دیتا تو تحفہ کر دی جاتی، مگر چونکہ اگلی حدیث میں تو اب کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا، صحیح مسلم میں ہے ان الایمان لیأذنی المدینۃ کما تاذن الحیۃ الیٰ حمراھا یعنی اسلام لوٹے گا مدینہ کی طرف جیسا کہ سانپ اپنی بی کی طرف لوٹتا ہے، اگر کوئی دیوبندی

ایسی تشبیہ دیتا تو کافر کہا جاتا کہ ایمان میں مبارک شئی کو سانپ سے جس کا حرم میں بھی مار ڈالنا جائز ہے، تشبیہ دے دی، مگر غرض واضح ہے کیونکہ سانپ کہیں پھرتا پھرے مگر لوٹ کر اپنی ہی طرف آتا ہے، اسی طرح اسلام وقت فتنہ و فساد میں اپنے منتقر (مدینہ) میں پناہ لے گا، بخاری میں آگے آئے گا کہ حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ جب کفار کی جو کرتے تھے تو حضور علیہ السلام نے ان سے فرمایا کہ اے حسان جتنی شاخیں قریش کی ہیں سب میں میرا نسب ملا ہوا ہے ایسا نہ ہو کہ ایسی جو کرو جو مجھ تک پہنچ جاتے، لہذا ابو بکر سے نسب کی تحقیق کر لیا کرنا، جواب میں حضرت حسان عرض کرتے ہیں کہ یا رسول اللہ میں آپ کو ایسا نکال لوں گا، کما تامل الشعرة من العجين (بخاری ص ۵۵) تو کس کو کس سے تشبیہ دی، مگر کوئی انھیں کافر نہیں کہہ سکتا، اسی قسم کی بات دیو بند دی کہنا تو کافر کہا جاتا، استیر کی کتابوں میں ہے کہ جب حدیبیہ میں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) اونٹنی بیٹھ گئی، تو آپ نے فرمایا حبسھا حبس الفیل میری اونٹنی اسی نے روک دی جس نے فیل کو روک دیا تھا، گویا جس ناتمہ حبس فیل ہو گیا، حالانکہ وہ استیصال و تخریک کے لئے آیا تھا، اور آپ نیت خیر لے کر گئے تھے، مگر مقصد صرف مشیت ایزدی کا بتلانا تھا، غرض یہ کہ ہمیشہ غرض تشبیہ کو دیکھا جاتا ہے، تو یہاں حدیث میں غرض باطالت و اتصال و تدارک کو بتلانا تھا اس لئے ایسا فرمایا گیا۔

بَابُ بَدْءِ الْخَلْقِ میں تصریح ہے کہ یا تینی الملائک مثل صلصلة الجرس، معلوم ہوا کہ دونوں صورتوں میں فرشتہ آتا تھا، مگر فرق یہ ہے کہ پہلی صورت میں فرشتہ قلب پر نزول کرتا ہے، دیکھنے کی تصریح نہیں (مگر شیخ اکبر نے تصریح کی ہے کہ رویت ضروری ہے) اور وہ بھاری ہوتی ہے نبی پر اس لئے کہ اس میں نبی کے تویٰ کو سمیٹ کر ملا اعلیٰ کی طرف متوجہ کرتے ہیں، تجرود و حانیت کا غلبہ ہوتا ہے اور بشریت مغلوب ہوتی ہے۔ اسی بنا پر ہوا شنڈ کا علیٰ فرمایا گیا، اور دوسری صورت میں یعنی صورت میں نبی اپنے حال پر رہتا ہے، ملک اپنی شکل بدل کر آتا ہے، مختصر یوں سمجھو کہ ایک قائل ہے یعنی فرشتہ، ایک سامع ہے یعنی نبی، تو کبھی قائل سامع کی صفت اختیار کرتا ہے، اور کبھی سامع پر قائل کی صفت کو غالب کیا جاتا ہے، جب فرشتہ متمثل ہو کر آیا، تو اس نے تشبیہ کیا نبی سے، اور پہلی صورت بہت سخت ہوتی تھی، اور اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت مشقت ہوتی تھی، کیونکہ یہاں نبی کی حالت میں تغیر ہوتا تھا، اور ملک کے اوصاف غالب کرنے پڑتے تھے، اور ممکن ہے جبریل علیہ السلام پر دوسری صورت مشقت کا باعث ہوتی ہو۔ یہ پہلے گزر چکا ہے کہ وحی الہامی اور وحی نبوی میں فرق ہے، وحی نبوی میں رویت ہے ملک کی اور وہاں رویت ممکن، نیز شیخ اکبر نے لکھا ہے کہ وحی الہامی

میں ولی کو مروا دیتی نہیں ہوتا، مرواؤنی کا خطاب صرف نبی کو ہوتا ہے، ولی کیلئے تعریضات و تفہیمات ہوتی ہیں یعنی کھول کر بتلا دینا، شیخ اکبر نے لکھا ہے کہ جو دعویٰ کرے مرواؤنی کا وہ کذاب ہے یا وہ مجنون ہے، اور قصہ کہتا ہے تو قتل کا متقی ہے، یہ اسلئے کہا گیا کہ مرزا قادیانی نے اربعین میں لکھا ہے کہ میری وحی میں مرواؤنی بھی ہے اور شیخ اکبر کا بہت معتقد اور ان کے قول کو جا بجا نقل کرتا ہے، اسلئے اس کے اسکے متبعین کیلئے یہ قول باعث تنبیہ ہو گا تو دو فرق ہوئے وحی نبی اور وحی ولی میں، ایک رویت ملک و عدم رویت کا، دوم یہ کہ وحی نبی میں مرواؤنی ہے، وحی ولی میں نہیں بلکہ اس کا مدعی کاذب ہے۔

آیت قرآنی مَآكَاَنَ لِّشَى (الذیۃ)، میں تین صورتیں بیان کیں اور یہاں دو صورتیں ہیں، تیسری بیان نہیں کی، یہ دو صورتیں بھی ایک ہی قسم کی ہیں یا علحدہ علحدہ، نیز بقیہ کیوں بیان نہیں کیں؟ اس کے سمجھنے سے پہلے آیت کا مطلب سمجھ لو، کوئی بشر اپنی معصی ساخت اور موجودہ قوی کے اعتبار سے یہ طاقت نہیں رکھتا کہ اللہ تعالیٰ اس دنیا میں اس کے سامنے ہو کر مشافہتہ کلام فرمائے اور بشر اس کا تحمل کر سکے، اسلئے کسی بشر سے اس کے حکلام ہونے کی تین صورتیں ہیں (۱) وحی یعنی اشارہ خفیہ، (۲) من و راء حجاب (۳) فرشتہ متجسد ہو کر سامنے آجائے (اور یہاں رسول اللہ) پہلی صورت میں فرشتہ آتا ہے یا نہیں؟ قرآن میں تصریح نہیں، کیونکہ اس میں اشارہ خفیہ ہوتا ہے چاہے توسط ملک ہو یا بلا توسط، خواہ ولی کے حق میں ہو یا نبی کے حق میں۔ ابن تیمیہ اور ابن قیم نے تصریح کی ہے کہ اس پہلی قسم میں سب شامل ہیں نبی اور ولی، اور نفث فی التروع (القلب)، بھی اسی میں داخل ہے، نام بھی اسی وحی میں داخل ہے، بظاہر سب کو شامل ہے مگر آگے جو قسم ہے اور یہاں رسول اللہ کے مقابل سے یہ کہنا چاہئے گا کہ وہاں بلا توسط ملک وحی ہوگی درجہ تقسیم نہ رہے گا۔ تو وحی سے خاص مراد ہے یعنی بلا توسط، خواہ ولی کے قلب پر ہو یا نبی کے، نام میں ہو یا بیداری میں۔

دوسری قسم من و راء حجاب کی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ کانوں سے سننے اور آنکھ سے دیکھ کر نہ دیکھ کر تو اس کا تعلق کان سے ہے، اور وحی یعنی قسم اول کا تعلق قلب سے ہے، نہ کان سے نہ آنکھ سے دیکھتا ہے، من و راء حجاب کی دو نظریں ہیں، اول موسیٰ علیہ السلام کیلئے، کہ وہ طور پر، دوم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے، معراج میں، محققین کہتے ہیں کہ بن و راء حجاب بلا توسط ملک ہوا تھا، پہلی صورت میں حواس کا تعلق نہ تھا اور یہاں حواس کا تعلق ہے، چونکہ حجاب ہے اسلئے آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔

تیسری صورت ارسال رسل کی ہے اور یہ رسل فرشتے ہوتے ہیں، فرشتہ اگر حکم الہی ایا کرتا ہے، اب

فرشتے کے آنے کی دو صورتیں ہیں، ایک نزول علی القلب، دوسرے تمثل، تو حدیث کی دونوں صورتیں آیت کی تیسری صورت میں داخل ہیں، اور آیت کی دو صورتیں اس کے علاوہ ہیں، اول وحی کی، دوم من وراء حجاب کی، ان کا بیان حدیث مذکور میں نہیں ہے، اب سوال ہو سکتا ہے کہ ان دونوں کو ترک کیوں کیا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ پہلی صورت مختص بالنبی نہیں اور سوال وحی مختص بالنبی کا تھا، انعام کی صورت اولیا کو بھی پیش آتی ہے اور من وراء حجاب کی صورت عام نہ تھی، نادر تھی ولی علیہ السلام کو طو پر یا علیہ السلام کو معراج میں حاصل ہوئی، اس لئے اس کا بھی سوال نہ تھا بلکہ سوال اس صورت کا تھا جس صورت سے بکثرت وحی آتی ہے کہ اس کی کیا کیفیت تھی، بحیث یأتی، استمرار پر دال ہے، لہذا آپ نے سوال کے مطابق جواب دیا، اور یہی صورت عام بھی ہے، بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جب وحی آتی تھی دو وحی الفصل کی سی آواز آتی تھی، یعنی جیسے شہد کی مکھڑوں کی بھینبناٹ اور گونج پیدا ہوتی ہے، اسی قسم کی آواز معلوم ہوتی تھی۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے کہا دونوں صورتیں ایک ہی ہیں مگر نبی علیہ السلام کو مصلحت الجرس کی سی اور دیگر سامعین کو دوی الفصل کی سی معلوم ہوتی تھی، چنانچہ غفر فاروق رضی اللہ عنہ کی روایت میں صیغہ دوی الفصل ہے، غلامہ یہ کہ قرآن کی تین صورتوں میں سے صرف تیسری صورت کا ذکر حدیث میں ہے۔

کوئی سوال کر سکتا ہے کہ وحی رویا کی شکل میں بھی ہوتی ہے، اسے کیوں نہیں بیان کیا؟ اس کا جواب بھی یہی ہے کہ رویا مختص بالنبی نہیں ہے اور سوال اس کا تھا جو مختص ہے، بخاری نے کتاب التوحید میں جس طرح اللہ کے لئے یہ اور وجہ وغیرہ کو ثابت کیا ہے اسی طرح صوت کو بھی ثابت کیا ہے مگر ایسی صوت جس کی کیفیت نامعلوم ہے، اب اگر کوئی کہے کہ کلام الہی کی صوت تھی تو ہمیں انکار کی ضرورت نہیں، اور یہاں مراد بظاہر وہی معلوم ہوتی ہے کہ اللہ کی صوت تھی، شہد اس صوت کو مقدمات وحی سے شمار کرتے ہیں جیسے تار کے لئے گھنٹی، یعنی وہ صوت وحی نہ تھی بلکہ نبی کی ساری قوتوں کو مجتمع کرنے اور متنبہ کرنے کے لئے ایسا ہوتا تھا، مگر راجح وہی ہے جو ہم نے بیان کیا۔

فَيَقْصِمُ عَنْيَ وَقَدْ وَعَيْتُ عَنْهُ مَا قَالُوا أَحْيَانًا يَتَمَثَّلُ لِي الْمَلَكُ رَجُلًا
 اور جب یہ کیفیت ختم ہو جاتی ہے تو میں اسے محفوظ کر چکا ہوتا ہوں اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ فرشتہ انسان کی شکل میں
 فَيَكَلِّمُنِي فَأَعْنِي مَا يَقُولُ قَالَتْ عَائِشَةُ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا وَلَقَدْ رَأَيْتُهُ
 مجھ سے گفتگو کرتا ہے تو میں اس کے کلمات محفوظ کر لیتا ہوں حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ میں نے آپؐ کو سخت سردی کے دن اس حال
 يَنْزِلُ عَلَيْهِ الْوُحْيُ فِي الْيَوْمِ الشَّدِيدِ الْبَرْدِ فَيَقْصِمُ عَنْهُ وَابْنُ
 میں دیکھا کہ آپؐ پر وحی نازل ہوتی تھی اور جب یہ کیفیت ختم ہوتی تھی تو آپؐ کی پیشانی مبارک سے اس طرح
 جَبِينَهُ لِيَتَفَعَّدَ عَرَفَاتَا
 پسینہ جاری ہوتا تھا کہ نفس لگائی گئی ہو

قوله وَلَقَدْ رَأَيْتُهُ الخ یہ سخت جاڑے کے موسم میں بھی جب وحی آپؐ کی پیشانی سے
 پسینہ ٹپکتا تھا پسینہ کیوں ٹپکتا تھا؟ اس کے باپ میں شیخ اکبر نے فتوحات میں اور شاہ ولی اللہ صاحب نے حجتہ اللہ البالغہ
 میں کچھ بیان کیا ہے شیخ اکبر کہتے ہیں کہ نبی ایک نور ہے اور ملک بھی نور ہے اور جب نور کا نور سے ٹکرا ہوتا تو حدت کا پیدا
 ہونا ضروری ہوا اور جب حرارت ہوئی تو طبیعت دفع کرے گی وہی پسینہ ہے اور پسینہ آنے کے بعد جو ہو لگتی تھی تو ٹھنڈک
 معلوم ہوتی تھی اسی لئے فرمایا زَمَلُونِي زَمَلُونِي حدیث سے یہ بھی ثابت ہے کہ جب وحی آتی تھی تو آپؐ پر کساء وغیرہ
 ڈال دی جاتی تھی چونکہ تصادم ہوتا ہے تو ایملک اور طبع بشریہ میں اور بوقت وحی نبی کو طبع بشریہ کو چھوڑ دینا پڑتا تھا اس لئے
 شدت ہوتی تھی اور یہ فقط انبیاء ہی کے تلوّب ہوتے ہیں جو اس کو برداشت کر لیتے ہیں اور فرمایا گیا ہے لَوِ اَنْزَلْنَاهُ زُلْ
 الْفَرَانِ عَلَى بَعْضِ الْأَنْبِيَاءِ خَاشِعَةً مَتَصَدِّعًا مِنْ خَشْيَةِ اللَّهِ اور فرمایا گیا : اَنَّا سَنَلْقِيْكَ عَلَيْهِ قَوْلًا ثَقِيلًا
 حتیٰ کہ وہ اونٹنی جس پر سوار ہوتے جب وحی آتی تو اس کی قوت برداشت جواب دے جاتی سوائے آپؐ کی تا تو تصدوا کے حضرت زید
 ابن ثابت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم میری ران پر سر رکھے آرام فرما رہے تھے کہ وحی کا نزول ہوا اور بہت
 غیر اولیٰ الضور نازل ہوا تھا مگر معلوم ہوتا تھا کہ میری ران چور چور ہو جائیگی

بخاری کی غرض اس حدیث سے عظمت وحی کا بتلانا ہے کہ یہ ایسی چیز ہے جو خالق عادت ہے کوئی سمولی چیز نہیں یہ لگانا ہے
 واللہ اعلم کہ قرآن کا نزول بکثرت اغلب احوال میں پہلی صورت سے ہوتا تھا کبھی کبھی تمثیل بھی ہوتا تھا یہی وجہ ہے کہ کہا گیا نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ
 الْأَمِينُ عَلَى قَلْبِكَ الخ ہاں اقلانے احکام و احادیث وغیرہ میں ملک آتا تھا تمثیل کی صورت میں ہوتی تھی چنانچہ صحیح ابی حوازہ
 میں تصریح ہے وھو اھونہ علی پھر تمثیل کی کئی صورتیں تھیں کبھی ملک اپنی اہلی صورت میں آتا تھا اور دعویٰ کیا گیا ہے کہ صرف

دوبار ایسا ہوا ہے، ایک ابتدائے بعثت میں اور دوبارہ میلۃ الاسراء میں جیسا کہ فرمایا گیا، ولقد انازلنا نزلة اخرى (البحر) بشرطیکہ ضمیمہ جبریل علیہ السلام کی طرف راتِ جمع کی جائے (دوبار میں صحر غالباً مبالغتہ کیا گیا ورنہ ایک بار حراء میں، دوسری بار اجیاد (محلہ) میں اور تیسری بار اسرار میں اپنی اصلی صورت میں نظر آئے، اور کبھی ملک بشر کی شکل میں آتا تھا اور بس وقت اکثر حضرت وحیدہ کلینیؓ کی شکل میں آتا جو بہت خوبصورت تھے، اس سے معلوم ہوا کہ ایک اگر جاہل انسانی پہنے گا تو جو حسن صورت ہوگی اس میں مشکل ہوگا، اور کبھی کسی عراقی کی صورت میں ملک کا نزول ہوتا جیسا کہ حدیث جبریل سے معلوم ہوتا ہے۔

قولہ:- وقد وعیت - پہلی صورت میں ماضی کا صیغہ ہے اور ثانی میں مضارع ہے، یہ فرق اس لئے ہے کہ پہلی صورت میں بیان فرماتے ہیں کہ بس وقت فرشتہ وحی ختم کر کے جدا ہوتا تھا تو وحی مجھے یاد اور محفوظ ہوتی تھی، جملہ حالیہ لائے، اور دوسری صورت میں بشر اگر کلام کرتا تھا تو جو وہ بولتا تھا، جیسے جیسے بولتا تھا آپ اس کو تجلّی دیکھتے جاتے تھے تو چونکہ مثل رمل کے مکالمہ ہوتا تھا اس لئے قافی فرمایا اور پہلی صورت میں بسیط چیز ہے اس لئے خاتمہ پر محفوظ ملتی تھی لہذا وعیت ماضی کا صیغہ استعمال فرمایا۔

۳۔ حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ بُكَيْرٍ قَالَ أَخْبَرَنَا اللَّيْثُ عَنْ عُقَيْلٍ عَنْ ابْنِ شَهَابٍ

ہم سے یحییٰ بن بکیر نے حدیث بیان کی کہ لیث نے عقیل (ابن خالد) سے اور انھوں نے ابن شہاب زہریؒ
عَنْ عُرْوَةَ بْنِ الزُّبَيْرِ عَنْ عَائِشَةَ أُمِّ الْمُؤْمِنِينَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا أَنَّهَا قَالَتْ أَوَّلُ
بروایت عروہ بن زبیر۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ روایت نقل کی کہ انھوں نے یہ فرمایا کہ پہلی چیز
مَا بُدِيَ بِهِ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الْوَحْيِ الرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ فِي النَّوْمِ
جس سے آنحضرتؐ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کی ابتدا ہوئی، رویا صالحہ تھی، جنہیں آپ خواب میں دیکھتے تھے
فَكَانَ لَا يَرَى رُؤْيَا إِلَّا جَاءَتْهُ مِثْلَ فَلَقِ الصُّبْحِ ثُمَّ حُبِّبَ إِلَيْهِ الْخَلَاءُ وَكَانَ يُحَلِّوْهُ
چنانچہ جو خواب بھی دیکھتے وہ سچیدہ صبح کی طرح سامنے آتا، پھر غلوٹ گزینی آپ کے نزدیک محبوب
بِغَارِ حِرَاءٍ فَيَتَحَنَّنُ فِيهِ وَهُوَ التَّعَبُّ الدَّلِيَالِي ذَوَاتِ الْعَدَدِ قَبْلَ أَنْ يَنْزِعَ إِلَى أَهْلِهِ
کردی گئی، اور غار حراء میں غلوٹ گزینی فرماتے اور اپنے اہل کی طرف اشتیاق سے پہلے کئی رات تک اس میں عبادت فرماتے تھے

قولہ اول مابدئی، یعنی اقام وحی میں سب سے پہلی قسم رویا، حال کی تھی، چھ ما قبل نبوت سے یہ صورت پیدا
ہوئی تھی، بعد چھ مہینے کے فرشتہ آیا، سلم کی بعض روایات میں ہے کہ کچھ روشنیاں بھی معلوم ہوتی تھیں اور کبھی آواز آتی تھی مگر شکم نظر نہ آتا تھا
اور کبھی شجر و حجر سلام کرتے تھے، اس کے بعد یہ فقرہ ہوا جسے آپ بیان فرما رہے ہیں۔

قولہ فلحق الصبح، تشبیہ و منوہ میں ہے، یعنی اس کی تعبیر بھی آپ کو فوراً معلوم ہو جاتی تھی، ابن ابی جرہ نے
اس تشبیہ میں خاص سر بیان کیا ہے کہ رویا مبادی وحی سے ہے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم انبیاء علیہم السلام میں مثل شمس کے ہیں،
اور شمس کے مبادی میں سے فلحق الصبح ہے، شمس نبوت کے طلوع ہونے کے مناسب یہ تھا کہ اس کا مبادی یعنی فلحق الصبح ہو، جس طرح طلوع
شمس سے پہلے کچھ روشنی ہوتی ہے اسی طرح طلوع شمس نبوت سے قبل بھی کچھ روشنیاں ہونی چاہیے تھیں جن کا بیان فلحق الصبح سے
کیا گیا۔

قولہ ثم حبيب، یعنی اس کے بعد غلوٹ کا اختیار کرنا (یہاں مراد مصدر ہے یعنی فعل خلاء، مکان مراد نہیں)
آپ کے قلب میں محبوب کر دیا گیا، فرماتے ہیں کہ اس کام کے لئے میں نے غار حراء، تجویز کیا تھا، حراء کو اب جبل النور کہتے ہیں مگر کہ
تین میل کے قریب مٹی جاتے ہوئے بائیں ہاتھ پر پڑتا ہے)
اہل سیر کہتے ہیں کہ عبدالمطلب اس غار میں کبھی کبھی اعتکاف کرتے تھے چونکہ آپ ان کے وارث تھے اس لئے

وَيَتَزَوَّدُ لَذَلِكَ ثُمَّ يَرْجِعُ إِلَى خَدِيجَةَ فَيَتَزَوَّدُ مِثْلَهَا حَتَّى جَاءَهُ الْحَوْثُ
اور اس کے لئے زمان خود و نوش ساتھ لیجئے، پھر حضرت خدیجہ کے پاس واپس تشریف لائے اور اتنی ہی راتوں کیلئے پھر سلمان مہیا فرمائے یہاں تک کہ بنی

آپ نے اسے پسند فرمایا مگر جس نے وہ مقام دیکھا ہے وہ فیصلہ کرے گا کہ اس سے بہتر کوئی اور جگہ نہ ملے گی، وہاں قدرت نے ایک جبرہ سا بنا دیا ہے جو شلت سا ہے، ایک آدمی فراغت سے اور دو وقت سے گذر سکتے ہیں اور اس صرف ایک ہے اور وہ بھی ایسا جنگ ہے کہ کوٹ بدل کر نکلتا ہوتا ہو تو وہ جگہ ہی ایسی تھی خواہ عہد المطلب پہنچ کر تے یا نہ کرتے، ممکن ہے وجہ وہ بھی ہو، لیکن اصل وجہ جو کجی خوبی تھی۔

قوله فَيَتَحَنَّثُ فِيهِ وَهُوَ التَّعَبُ، یہ تفسیر مدرج ہے، عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول نہیں ہے، تحنث نازیبا اور ناشائستہ حرکت کے ترک کو کہتے ہیں، کنایہ عبادت مراد لی گئی ہے۔

(اللیالی حدیث کا لفظ ذوات العدد اس کی تائید ہے) اس میں کلام ہوا ہے کہ یہ عبادت کس طریق کے موافق تھی، اس کی تصریح کسی صحیح حدیث میں نہیں، اہل سیر اور علماء کے اقوال ہیں کسی نے کہا کہ یہ عبادت دین ابراہیمی کے مطابق تھی، کسی نے عوی کسی نے عیسیٰ علیہ السلام کے مطابق کہا، کسی نے کہا اہام کے مطابق عبادت تھی کیونکہ قبل نبوت بھی آپ ولی تھے، جیسا کہ یہ مسلم بھی ہے کہ نبی قبل نبوت بھی ولی ضرور ہوتا ہے، کسی نے کہا غور و فکر تھا یہی عبادت تھی، بعضوں نے کہا کہ فقرہ کو کھانا کھلاتے تھے یہ عبادت تھی، بہتر اور قویٰ یہی ہے کہ دین ابراہیم کے بقایا پر جو متواتر تھا عمل کرتے تھے، چنانچہ بعض روایات میں یہ تحنث ہے (سیرۃ ابن ہشام) یعنی ملت ابراہیمی کی اتباع کرتے تھے کیونکہ تحنث کے معنی یہاں ہیں، محافظانے کہا کہ بعض نے دعویٰ کیا ہے کہ فاذک ثناء سے بدل دیا گیا ہے، اور یہ یعنی بدل دینا کلام عرب میں بکثرت رائج ہے اگر تبدیلی نہ بھی ہو تب بھی قرینہ یہی ہے کہ یہ تحنث ہی مراد ہو یہ تحنث سے۔

یمنع کے معنی یشتاہ کے ہیں اور مراد وجوع ہے

وَيَتَزَوَّدُ مِثْلَ تَوَشُّعٍ تِلْكَ رَاتٍ تَحْتِیْ پھر لیکر آپ چلے جاتے تھے، سیرت کی کتابوں میں ہے کہ ایک ایک ماہ گزارنے تھے خصوصیت کے ساتھ رمضان کا، تصریح بھی آئی ہے مگر باریں طو کہ آتے جاتے رہتے تھے، تزو سے معلوم ہوا کہ زاد کا ساتھ رکھنا توکل کے معافی نہیں۔

حتى جاءه الحث (یعنی الوحی)

قوله اقرا فقلت ما انا بقارئ یعنی جیسے کسی کو پڑھنے کا حکم دیا جائے اور وہ اپنے کو عاجز سمجھ کر کہہ دے ما انا بقارئ پھر بار بار فرشتہ زور سے دہاتا تھا حتیٰ مبلغ منی الجھد، یہاں تک کہ اس کا دانا میری تمام طاقت کو ختم کر دیتا تھا، یعنی اس کے تحمل میں میں اپنی ساری طاقت صرف کر دیتا تھا، بعض روایات میں جھد کا لفظ جیم اور وال کی پیش کیساتھ آتا ہے یعنی فرشتہ کے دبانے سے مجھے بڑی شقت معلوم ہوتی تھی، تیسری بار فرشتہ نے کہا اقرا باسم ربك الذی خلق..... ما لم یعلم تک پانچ آیتیں پڑھائیں، باقی سورت مدت کے بعد نازل ہوئی، حقیقت یہ ہے کہ جو واقعات گذرے انھیں کوئی بتا نہیں سکتا،

وَهُوَ فِي غَارٍ جَارٍ فَجَاءَهُ الْمَلَكُ فَقَالَ اقْرَأْ فَقَالَ فَقُلْتُ مَا أَنَا بِقَارِي

جب کہ آپ غار میں تھے چنانچہ فرشتہ پہنچا اور اس نے کہا 'اقْرَأْ (پڑھئے) آپ نے نہ دیا کہ میں نے فرشتہ سے کہا کہ میں
فَاخَذَنِي فَعَطَّنِي حَتَّى بَلَغَ مِنِّي الْجُهْدُ ثُمَّ أَرْسَلَنِي فَقَالَ اقْرَأْ فَقُلْتُ

پڑھا ہوا نہیں ہوں ' آپ نے فرمایا کہ فرشتہ نے مجھے پکڑا اور دیا یہاں تک کہ اس کا دباؤ میری طاقت کی انتہا کو پہنچ گیا ، پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا
مَا أَنَا بِقَارِي فَاخَذَنِي فَعَطَّنِي الثَّانِيَةَ حَتَّى بَلَغَ مِنِّي الْجُهْدُ ثُمَّ أَرْسَلَنِي فَقَالَ

اور کہا 'اقْرَأْ (پڑھئے) پھر میں نے کہا میں پڑھا ہوا نہیں ہوں ' پھر اس نے مجھے پکڑا اور دوسری مرتبہ دیا یہاں تک کہ اس کا دباؤ میری
اقْرَأْ فَقُلْتُ مَا أَنَا بِقَارِي فَاخَذَنِي فَعَطَّنِي الثَّالِثَةَ ثُمَّ أَرْسَلَنِي فَقَالَ اقْرَأْ

طاقت کی انتہا کو پہنچ گیا پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا 'اقْرَأْ (پڑھئے) میں نے اس سے کہا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں ' پھر اس نے مجھے
رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ اقْرَأْ

پکڑا اور تیسری مرتبہ دیا یہاں تک کہ اس نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا 'اقْرَأْ يَا سَمُّرُ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ اقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ

اپنے پروردگار کے نام سے پڑھئے جس نے ان کو جسے ہوئے خون سے پیدا کیا ' پڑھئے آپ کا پروردگار بڑا کریم ہے ۔

مگر ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ جبریل جس وقت اقرا کا حکم کر رہے تھے اس وقت کوئی کتاب نہ تھی نہ بچہ کی تعلیم کا مادہ تھے ہوا جائے گا حضور
تو علی خاندان کے عرب تھے اور الفاظ بھی عربی ہی کے تھے پھر بھی آپ نے انکار کیا ، معلوم ہوا کہ کوئی چیز شدت و ثقل کی تھی جس کی برداشت
مشکل معلوم ہو رہی تھی اور غلط جبریل کو اللہ نے اس کی سہولت کا سبب بنا دیا تھا ' اس وقت آپ پڑھنے لگے جب آپ لوٹ کر آئے تو باوجود
بن پر لرزہ کے الفاظ زبان پر جاری تھے ، شبلی نعمانی وغیرہ نے اس کا مذاق اڑایا ہے کہ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ جبریل آپ کو دہائیں اور
آپ محسوس فرمائیں اور اس سے سہولت ہو جائے اور آپ پڑھنے لگیں ' ہم کہتے ہیں کہ اس سلسلہ کی شروع سے آخر تک سمجھ میں آنے کی ہے
کون سی بات ؟ سب ہی باتیں ہماری عقلوں سے باہر ہیں تو سب کا انکار کر دینا چاہئے ' صحیح کیفیت تو بیان نہیں کی جاسکتی مگر مجھ پر ایک
واقعہ خود گذرا ہے اسے بیان کرتا ہوں ' حیدر آباد کے شفا خانہ میں میں گیا تو بجلی سے علاج کے بہت سے کرشمے دکھائے ' پھر کہا
کہو تو تمہارے بدن میں بجلی داخل کریں ' پہلے تو میں گھبرا گیا مگر اس کے اطمینان دلانے پر راضی ہو گیا تو انھوں نے ایک کرسی پیش کی میں

اس پر بیٹھ گیا۔ انھوں نے ایک پتل کا ڈنڈا مجھے کپڑا دیا اور میں چلا دی۔ کچھ دیر بعد کہا کہ ہم آپ کے بدن میں اس قدر بجلی پہنچا چکے، مجھے پتہ بھی نہ چلا اور تعجب ہوا تو انھوں نے مولوی یحییٰ سے کہا کہ ذرا انھیں ہاتھ لگاؤ، انھوں نے اپنا ہاتھ قریب کر کے ایک انگلی بڑھائی ہی تھی کہ میں نے دیکھا کہ ان کی انگلی سے ایک شعلہ نکلا، وہ سمجھے کہ انگلی کٹ گئی اور مجھے بھی تکلیف ہوئی، معلوم ہوا کہ کوئی اجنبی چیز بدن میں ہے، پھر انھوں نے مولوی یحییٰ سے کہا ایک دم زور سے کپڑو، انھوں نے زور سے کپڑا تو اب کچھ اثر نہ تھا، وہ اسی طرح کپڑے ہوئے تھے کہ انھوں نے تیسرے آدمی سے کہا کہ تم کپڑو، اس کا ہاتھ قریب آنا تھا کہ وہی کیفیت پیدا ہوئی جو پہلے مولوی یحییٰ کے ساتھ ہو چکی تھی، پھر اس سے بھی کہا کہ زور سے کپڑو، جب اس نے بھی زور سے کپڑا تو اس کی بھی وہ کیفیت جاتی رہی، عجیب کرشمہ دیکھ کر جب وہاں سے اٹھا تو میں نے کہا کہ آج ایک بڑا مسئلہ حل ہو گیا، وہ یہ کہ کبھی زور سے کپڑے نہ بھی آسانی ہو جاتی ہے، بس اسی طرح بلاشبہ جبریل کے ملنے پر جب نور کا نور سے اتصال ہوا تو اولاً تو شروع میں تکلیف اور شدت ہوئی مگر جب زور سے دیا تو اب وہ قتل جاتا رہا اور آسانی ہو گئی، فی الجملہ شدت تو پھر بھی باقی رہی جس کو پسینہ آ جانا جاڑوں میں بتانا ہے مگر اس وقت جو زیادہ شدت تھی وہ غلط جبریل سے جاتی رہی۔

غلط کے بارے میں بہت اختلاف ہوا ہے، بعض شراح نے یہاں تک لکھ دیا ہے کہ اس کو چاہئے کہ شاگرد کو فرادہ دے، وغیرہ، مگر یہ بالکل رکیک بات ہے، بہتر مطلب وہی ہے جو ہم نے بیان کیا، یہاں جبریل تو واسطہ میں مگر ایک مزید سبب غلط جبریل کو بتانا والدہ اعلم بالصواب۔

تین مرتبہ غلط کے بعد آیت پڑھی اقرأ، جواب میں آپ نے فرمایا ما لانا بقارئ، اس کا ترجمہ یہ کیا گیا، میں پڑھا ہوا نہیں ہوں، یہ ترجمہ جو صحیح ہے مگر اس سے اچھا ترجمہ یہ ہے کہ "میں پڑھ نہیں سکتا"۔ چونکہ زبان پڑھنے کا اس لئے جو بظاہر کیا، جبریل نے عرض کیا کہ آپ تو بیشک قادر نہیں ہیں مگر اپنے رب کا نام لیکر پڑھنا شروع کیجئے، وہی پڑھا دے گا۔

اقرأ باسم ربك، یا، یا تو استعانت کیلئے ہے یا مصاحبت کیلئے، حاصل دونوں صورتوں کا یہ ہے کہ تم میں تو قدرت نہیں مگر اللہ کی مدد سے پڑھو، بجائے اللہ کے اسم دہش کہا، بظاہر اس میں یاد دلایا گیا کہ جس نے چالیس سال تک عجیب و غریب طور پر تربیت کی ہے وہی پڑھا رہا ہے، امام راغب کہتے ہیں کہ تربیت اس کو کہتے ہیں کہ کسی کو اس کی حد کمال تک بدرجہ شینا نشینا پہنچا دینا، تو رب اس شان سے پہنچا دینے والے کو کہیں گے، اب مطلب یہ ہوا کہ جس نے بدرجہ آپ کی تربیت کی وہ پڑھا رہا ہے، آپ کی تربیت عجیب طرح سے ہوئی، ماں باپ دادا کا سایہ اٹھایا، پھر عجیب و غریب خوارق ظاہر کئے، برکات ظاہر کئے، حلیمہ کے گھر میں عجیب عجیب خوارق ظاہر کئے، ان سب کی طرف اشارہ کر کے بتلایا کہ تم اب اس کے نام سے پڑھو۔

الذی خلق' یہاں خلقت نہیں کہا، بلکہ یہ کہا کہ جس نے سارا عالم پیدا کر دیا (اشارہ ہے کہ وہ خالق اعراض و جہاں اور لغات کا ہے، وہ آپ کے اندر کیا صفت قرأت نہیں پیدا کر سکتا؟ اس سے کچھ بعید نہیں، لہذا انت کہو مانا بقاری بلکہ اسی کی مدد سے پڑھو۔ خلق الانسان من علق: اور تاکید جاری ہے کہ جب وہ خالق تمام اشیاء کا ہے تو یہ بھی پیدا کر سکتا ہے 'پھر کہتا آگے جس نے جسے ہوئے خون سے انسان کو پیدا کیا اس کے نام سے پڑھو' یہ اشارہ اصل انسان کی طرف ہے کہ اس میں کسی چیز کا بالکل اور رک نہیں تھا، حماد الیقین، اللہ نے اس پر روح فائض کر کے عاقل و دانا و فہیم بنادیا، ایک قطرہ آب کو ایسی استعداد عطا کر دی کہ اس میں کائنات انسانیہ پیدا ہو گئے، تو جو حماد الیقین کو عاقل بنا دے کیا وہ عاقل کو عارف اور اُمی کو تباری نہیں بنا سکتا؟ بے شک اس کے لئے کچھ مشکل نہیں۔ ان آیات میں اللہ نے اپنی قدرت کاملہ کا اظہار کر کے اپنے محبوب کو تسلی دی ہے کہ بالکل مت گھبراؤ، ہم نے جب سب چیزوں کو پیدا کر دیا تو کیا تم میں صفت قرأت نہیں پیدا کر سکتے؟ ضرورہ کر سکتے ہیں، یہاں تک ارکان کا بیان تھا، آگے فعلیت کا ذکر ہے۔

اقرأ وریک الاکرم الخ میں وقوع کی دلیل بیان فرمائی، رب کے لفظ کو یاد کرو اور سوچو کہ جس کی تربیت زیرِ نگرانی رب اس طرح ہو اس میں یقیناً استعداد کامل ہوگی، اس لئے فیض بھی کامل ہوگا، کیونکہ فیض کا عدم و طرح ہوتا ہے ایک یہ مستفیض میں افذ کی استعداد نہ ہو، دوسرے یہ کہ فیض اس لائق نہیں اور اگر ہے تو غفل کرتا ہے، تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ چالیس سالہ تربیت مجھ پر تم میں کمال استوار کیا، ثبوت ہے اور ہم فیض پہنچانے میں کامل ہیں اور غفل کا احتمال نہیں ہے کیونکہ ہم اکرم ہیں، کسی قسم کی کمی میں نہیں، تو اب مانع عن فیض کیا چیز رہی؟ تو یہ وقوع کی دلیل ہوئی کہ وہ آپ کی اس استعداد کو یوں ہی ضائع نہیں کرے گا۔

آگے فرمایا: علمہ بالقلم: یعنی قلم کی مدد سے سکھایا، ظاہر ہے کہ جس علوم میں قلم واسطہ بنتا ہے، مطلب یہ ہے کہ جو اللہ ایک کٹڑی اور ایک کام یعنی سیاحی کے ذریعہ انسان کو سکھلانے پر قادر ہے، وہ اللہ کی حمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو جبریل (علیہ السلام) کے ذریعہ علم عطا نہیں کر سکتا؟ اس میں ایک بڑے شبہ کا جواب بھی ہو گیا جو مشہور ہے کہ جبریل ایک طرح کے استاد ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور حضور انما کے تمیز ہوئے، تو بظاہر جبریل کی افضلیت معلوم ہوتی ہے، اس کا جواب لفظ قلم سے ہوا، بخاری کا علم ہم تک قلم کے ذریعہ پہنچا لیکن قلم ہم سے افضل نہیں، ہاں بخاری ہم سے افضل ہیں کیونکہ قلم کو کچھ نہیں معلوم، حرکت کا تب دے رہا ہے، فرشتے بارگاہ الہی میں ایسے ہی ہیں جیسے قلم کا تب کے ہاتھ ہیں، جس طرح قلم کو مجال سرتابی نہیں اسی طرح فرشتوں کو مجال نہیں کہ سرتابی کر سکیں، پس جبریل کی مثال بالکل ایسی ہی ہے جیسے قلم کا تب و مکتوب کے درمیان قلم ہے، چنانچہ کہتے ہیں کہ ملائکہ ایسے ہیں جیسے ہمارے ہمارے جوارح، بلکہ جیسے قلم، جس طرح وہ چیزیں خود کچھ نہیں کر سکتیں اسی طرح ملائکہ کچھ نہیں کر سکتے، اضافت جو کبھی ہو جاتی ہے واسطہ کی طرف وہ محاذزاد ہوتی ہے جیسے نسر ملایا

علمہ شدید القویٰ ' یہاں مجاز ہے کہ جبریل واسطہ ہیں اور واسطہ کا افضل ہونا ضروری نہیں، 'معلم ضرور افضل ہوتا ہے جو یہاں اللہ ہے' اس کی ایک نظیر جدید سائنس سے دیدوں۔

یورپ والوں کی تحقیق ہے کہ سورج سے جو نور اور گرمی ہم تک پہنچتی ہے اس کی حقیقت کیا ہے؟ یہ سئلہ قدیم حکما سے چلا آ رہا ہے، مگر جدید تحقیق یہ ہے کہ نور اور حرارت کوئی علیحدہ مادی چیزیں نہیں ہیں بلکہ کواکب میں ایک حرکت ہوتی ہے (یعنی اجسام ستیزہ میں) اور ان میں ہتزاز ہوتا ہے، اس حرکت حراریہ یا فوٹوئی سے اثر (ایٹھرم یعنی ذرات صغیر جو تقسیم خارجی کو قبول کر سکیں، جن سے ان کے زعم میں تمام عالم بنا ہے اور وہ ذرات صغیر ظاہر میں پھیلے ہوئے ہیں) میں ایک کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، کوئی خارجی چیز نہیں ہوتی بلکہ ایٹھرم میں تنوع پیدا ہوتا ہے اور اس کے آثار ہیں روشنی اور حرارت کی صورت میں معلوم ہوتے ہیں گویا ایسی متوجہ کا اثر روشنی اور حرارت ہے، یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ مکارنے لون کے مصلح کہا ہے کہ وہ کوئی چیز نہیں مگر ہیں دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے ہم کہتے ہیں کچھ سہی، اس دھوپ کا انکار تو نہیں ہو سکتا اور نہ اس کا کہ جہاں آتی ہے اسی کی شکل اختیار کر لیتی ہے، آثار مختلف پیدا ہو جاتے ہیں، اسی طرح حق تعالیٰ جب ارادہ کرتا ہے کہ وحی نازل فرمائے تو حرکت ارادی اور ہتزاز پیدا ہوتا ہے، وہی وحی ہے جو مائیک نبی تک پہنچا دیتے ہیں، تو جبریل ایسے ہیں جیسے ایٹھرم تھا اسے نزدیک، چنانچہ لکھا ہے کہ اگر ایٹھرم ہو تو روشنی کا پھونچنا ناممکن ہے، لیکن پھر خود کہتے ہیں کہ ایٹھرم ہم سے افضل نہیں کو ذریعہ ہے، 'تو جس طرح ایٹھرم واسطہ کہ وہ خود حکیف ہوتا ہے اور ہم تک روشنی پہنچاتا ہے اسی طرح جبریل پہلے خود منکلیف ہوتے ہیں وحی الہی سے، پھر پہنچاتے ہیں حضور کی طرف، تو اس سے جبریل کی افضلیت ثابت نہیں ہوتی اور قلم کا لفظ بول کر اشارہ کر دیا کہ جبریل بالکل قلم کی طرح ہیں۔

تو لا علمہ الا انسان ما لم یعلم : یہ ایک اور دلیل ہے، یعنی بچہ پاں کے پیٹ سے کچھ لے کر نہیں آیا تھا اللہ نے اسے علوم عطا فرمائے، 'تو جو ایک بچہ کو عاقل و عالم بنا سکتا ہے وہ کیا بڑے کو نہیں دے سکتا؟ اللہ نے یہ دلائل اس لئے بیان کر دیے کہ نبی علیہ السلام کو کسی قسم کی رکاوٹ و استبعاد نہ رہے، چنانچہ حضور علیہ السلام پھر فر فر پڑھنے لگے اور ستیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس آنے کے بعد پڑھتے رہے، اب پھر شروع سے چلو کہ اللہ کے نام سے پڑھو جس نے تمہیں پیدا کیا، جس نے تمہاری تربیت کی، کیا وہ اس تربیت کو ضائع کر دے گا؟ جب تربیت کی ہے اور ضائع کرنا مقصود نہیں ہے تو کمالات نبوت بھی عطا فرمائے گا، عدم عطا کی وجہ ہو سکتی ہے؟ ہم ہی تھیں بذریعہ جبریل تعلیم دے رہے ہیں اور جس طرح انسان کو علوم سے فائز کر سکتا ہے اسی طرح تم پر وحی نازل کر سکتا ہے اور تمام علوم سے فائز فرما سکتا ہے، تم گھبراؤ مت، تمہیں سائنس سے سیکھنا ہی ہو جائیگا کہ کلام الہی اصطلاحی ہے لیکن یہاں اس کا اوصاف و حروف کی تشکیل میں جلوہ گر ہوتا ہے جیسے اجسام ستیزہ کا اور ایٹھرم کی تشکیل میں مختلف اشکال اختیار کر لیتا ہے، کہیں بن کہیں شکست کہیں ستیزہ اس طرح لانا ستیزہ کلام الہی اور پیسلہ لکھنا، اگر وہ اس کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

فَرَجَعَ بِهَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَرْجِفُ قُوَادَهُ، فَدَخَلَ

یہ آیات لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واپس ہوئے اور آپ کا دل کانپ رہا تھا، چنانچہ آپ حضرت خدیجہ بنت خویلد

عَلَى خَدِيجَةَ ابْنَتِ خُوَيْلِدٍ فَقَالَ زَمِّلُونِي زَمِّلُونِي، فَرَمَلُوهُ حَتَّى

کے پاس شریف لائے اور نہ مایہ مجھے کل اڑھا دو، لوگوں نے آپ کو کبھی اڑھا دیا، یہ سنا تک کہ آپ کا خوف

ذَهَبَ عَنْهُ الرُّوعُ فَقَالَ لِيَخْدِيحَةَ وَأَخْبَرَهَا الْخَبْرَ لَقَدْ خَشِيتُ عَلَى

نفسی ہوں، پھر آپ نے یہ کیفیت حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے بیان نہ مائی اور پھر سے واقعہ کی اطلاع دی اور نہ مائی

نَفْسِي، فَقَالَتْ خَدِيجَةُ كَلَّا وَاللَّهِ مَا يُخْزِيكَ اللَّهُ أَبَدًا، إِنَّكَ لَنَصِلَ

مجھے اپنی جان کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا، حضرت خدیجہ نے نہ مایہ کہ ہرگز ایسا نہیں ہو سکتا، خدا کی قسم خداوندتوں میں کبھی آپ کو برا نہیں

الرَّحِمُ وَتَحْمِلُ الْكَلَّ وَتَكْسِبُ الْمَعْدُومَ وَتَقْرَى الضَّيْفَ وَتُعِينُ

کرسے گا، بلاشبہ آپ صبر کرتے ہیں اور تواناں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، آپ ناداروں کے لئے کما دیتے ہیں، آپ مہمان نوازی کرتے ہیں اور آپ

عَلَى نَوَائِبِ الْحَقِّ، فَأُطْلِقَتْ بِهِ خَدِيجَةُ

لوگوں کی ان حوادث پر مدد کرتے ہیں جو حق ہوتے ہیں، پھر حضرت خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا آپ کو ساتھ لے کر چلیں

قَوْلًا يَرْجِفُ قُوَادَهُ : اعلیٰ وجہ یہ تھی کہ پہلی بار فرشتہ کو اس کی اصلی شکل میں دیکھا تھا، اس کا رعب سا چھایا، اور میں

کہتا ہوں کہ تحمل کر لینا بھی آپ ہی کا کام تھا، کوئی دوسرا برداشت بھی نہیں کر سکتا تھا، اس بنا پر یہ اثر اس لئے ہرگز نہ تھا کہ آپ کو نبوت میں یا فرشتہ

کے آنے میں کچھ شبہ تھا، جانتے آپ سب کچھ تھے، محض رویت ملک کا اثر ہو گیا، دیکھو سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے پاس جب فرشتے انسانی شکل

میں آئے اور آپ نے ان کی صفات میں پھر ذرا دیکھ کر کے پکار کر رکھ دیا اور فرشتوں کے ہاتھ کھانے کے لئے بڑھے تو ابراہیم علیہ السلام دل میں

ڈرے، تب فرشتوں نے کہا ڈرو مت ہم فرشتے ہیں، ابراہیم علیہ السلام نے انہیں پہچانا نہ تھا، قرآن پڑھو : وَلَقَدْ جَاءَتْ رُسُلَنَا

ابراہیمَ بِالْبَيِّنَاتِ قَالُوا اسْلَمَا قَالِ اسْلَامًا فَلَمَّا رَأَى اٰیٰتِنَا لَمْ يَمْلِكْ اِلَّا اَنْ يَنْصَلَاحَ اِلَيْهِمْ فَلَمَّا رَأَى اٰیٰتِنَا لَمْ يَمْلِكْ اِلَّا اَنْ يَنْصَلَاحَ اِلَيْهِمْ فَلَمَّا رَأَى اٰیٰتِنَا لَمْ يَمْلِكْ اِلَّا اَنْ يَنْصَلَاحَ اِلَيْهِمْ

عن ابراہیم الزروع الخ جب حضرت ابراہیم کی گھبراہٹ جاتی رہی تو ہم سے قوم لوط کے بارے میں جھگڑنے لگے، لفظ رَزَع یہاں بھی ہے، تو ظاہر ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کو یہ ڈر کسی شبہ کی وجہ سے نہ تھا بلکہ اس طرز سے ڈرے اور جب وہ اثر جاتا رہا تو قوم لوط کے بارے میں اللہ عز و جل معرضِ معرض کرنے لگے، یہی لفظ رَزَع حضور کے واقعہ میں بھی ہے تو یہ بھی کسی شبہ کی وجہ سے نہیں بلکہ پہلی بار حلی شکل میں دیکھنے سے بے شکنا بشریت طبعاً آپ پر رَزَع طاری ہو گیا، پوری تلاش پر صرف دو لفظ اس سلسلہ میں ملتے ہیں، ایک لفظ رَعِب، دوسرا لفظ رَزَع، نہ رَزَع شبہ کی بنا پر تھا نہ رَعِب، بلکہ تقاضائے طبع سے تھا، اصحاب کہف کے قصہ میں قرآن کہتا ہے: لَوَاطَلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَلَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعبًا یعنی اگر آپ انھیں جھانک کر دیکھتے تو پیٹھ پھیر کر بھاگتے اور آپ پر رَعِب چھا جاتا، تو کیا یہاں رَعِب کسی شبہ کی بنا پر ہوتا؟ ہرگز نہیں صرف طبعی تقاضا ہوتا، اسی طرح وحی کے آنے اور جبریل کے دیکھنے سے ہوا، میں دعوے سے کہتا ہوں کوئی لفظ ایسا نہیں جو شبہ کو بتاتا ہو، رہا رَعِب وہ منافی معرفت نہیں، جب عادت ہو گئی اور اس ہو گیا تو یہ بات جاتی رہی، اس کی مثال ایسی سہو جیسے کہ رے گھڑے میں پانی بھر تو ایک سنناٹ پیدا ہوگی، پھر وہ بات جاتی رہے گی، اسی طرح پہلے یہ کیفیت تھی پھٹ جاتی رہی تو لے 'وَدَخَلَ عَلَىٰ خَدِيجَةَ' الخ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس پہونچ کر فرمایا رَزَع لونی رَزَع لونی مجھے اڑھاؤ سردی محسوس ہو رہی ہے، انھوں نے اڑھا دیا پھر جب یہ کیفیت جاتی رہی حتیٰ ذہب کی تفریح زمیں پر کی، ابھی حضرت خدیجہ نے گفتگو نہیں ہوئی، بعد ذاب رَزَع گفتگو ہوئی، پھر آپ نے حضرت خدیجہ کو قصہ سنایا، علامہ شبلی کہتے ہیں کہ آپ سرود تھے، حالانکہ تردد کا کوئی ثبوت نہیں۔

تَوَلَّى لَهَا خَشْيَةً الخ عام طور پر اس کا ترجمہ کرتے ہیں مجھے اپنی جان کا اندیشہ ہے کہ کہیں موت نہ آجائے، اگر یہی لے لے گئے تو پھر ڈر کس بات کا تھا جب کہ آپ کو نبوت کا یقین تھا، ملک کا یقین تھا، اس میں حافظ نے بارہ قول نقل کئے ہیں کسی نے کہا جنون نہ ہو جائے، کسی نے کہا مرض نہ ہو جائے، کسی نے کہا کہ قتل کا خوف ہوا حالانکہ یہ سب احتمال غلط ہیں، عور کو یہاں صیغہ ماضی کا ہے، مضارع کا نہیں، یہ دراصل ان واقعات کا جزو ہے جو غار میں گزرے تھے، آپ فرما رہے ہیں خدیجہ! کیا پوچھتی ہو؟ وہ واقعہ اس قدر سخت تھا کہ قریب تھا کہ میری جان نکل جائے، اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ آپ اب گھبرا رہے ہیں کہ میں کیا کر دوں گا۔ شیخ ابوالحسن سندی نے حاشیہ بخاری میں اسے کھول کر بیان کیا ہے، 'سندی کا حاشیہ گو مختصر ہے مگر جہاں ہے باذن تو لے پاؤ رتی ہے، خود اس کے بعد کہا ہے کہ تمام تقاریر سے یہ اقرب و اہل ہے، اور واقعہ بھی یہی ہے کہ یہ اقرب ہے۔

نودی نے بھی کچھ اشارہ کیا ہے، کھول کر نہیں بیان کیا، اور اگر یہی معنی لے جائیں کہ "مجھے اپنی جان کا اندیشہ ہے کہ

کہیں موت نہ آجائے۔ تو یہی کیا مشکل ہے، حضرت فرماتے ہیں کہ وہ واقعہ یاد کر کے موت کا خوف ہوتا ہے کیونکہ نبوت کا بار تو مجھ پر آ ہی پڑا ہے۔ اسی طرح ہر بار سختی ہوگی، اگر چار بار ایسی ہی سختی ہوئی تو مجھے اندیشہ ہے کہ موت نہ آجائے، یعنی یہ سختی بہت زیادہ ہے، اس کی برداشت مشکل ہے مگر یہ بات دوسرے درجہ میں ہے، بہتر معنی وہی ہیں جو سندی نے بیان کئے۔ بخاری تعلیقاً کتاب التفسیر میں لائے ہیں کہ ایک بار وحی آنے کے بعد قرۃ ہوئی، زمانہ قرۃ سیرت کی بعض کتابوں میں چھ ماہ اور بعض کتابوں میں دھائی سال ہے، اس قرۃ کا اثر حضور پر بہت تھا، بعض وقت شدتِ حزن سے پہاڑ پر چڑھ کر اپنے کو ہلاک کر لینے کا ارادہ کر لیتے مگر ایسے وقت میں جبریل علیہ السلام سامنے آ کر کہتے تھے کہ انک لوصول اللہ حقاً یہ سن کر وہ کیفیت شدتِ حزن کی جاتی رہتی، متعدد بار ایسا ہی واقعہ پیش آیا، ہر بار جبریل علیہ السلام آ کر کہتے انک لوصول اللہ حقاً اس کو لوگوں نے یوں کہا کہ اگر آپ کو نبوت کا یقین تھا تو پھر خود کشی کا ارادہ کیوں فرماتے تھے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو تردد تھا، مگر یہ غلط ہے، کوئی لفظ دال علی التردد نہیں بلکہ اس کے برعکس یقین پر دال ہے، حدیث میں حزن کا لفظ ہے اور حزن کہتے ہیں غم کو، تو آپ کو اس کا غم تھا کہ جو نعمت ایک بار حاصل ہو چکی تھی اس کا اعادہ نہ ہو رہا تھا، یہ ایسا ہی ہے جب کہ کبھی مجھ بھٹ جائے تو قدرۃ اسے حزن ہوگا، اسی طرح یہاں ہے کہ انتہائی اشتیاق تھا اسی میں ہلاک کر ڈالنے کا خیال ہوتا تھا، یہ تو کمال یقین کی دلیل ہے اور اللہ چونکہ حفاظت کا مشغول ہے اس لئے جبریل کو حفاظت کے لئے بھیجتا تھا، وہ اگر تسکین دیتے کہ آپ اللہ کے پیچھے رسول ہیں، ضرور ہے کہ اس پہلی کیفیت کی تکمیل ہو، اس سے تردد کو ثابت ہوا، روع، خوف، اضطراب، لرزہ وغیرہ کا پایا جانا سنانی یقین نہیں۔

خدیجہ کہتی ہیں کلا، سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کی زبان کا کمال اس جواب سے معلوم ہوتا ہے، فرماتی ہیں، آپ ہرگز ضائع نہ ہوں گے آپ کے اند اللہ نے وہ ملکات رکھے ہیں کہ آئندہ بڑے بڑے کام آپ سے لے گا۔

واللہ صابغہ لیث ابنا، خدا کی قسم اللہ آپ کو کبھی مروا نہ کرے گا۔

انک لتصل الرحم، یعنی قرابت داروں سے صلہ رحمی کرتے ہیں۔

وتکسب المعدوم، تکسب بفتح مشہور ہے اور بالضم بھی پڑھا گیا ہے، یعنی آپ معدوم کو کماتے ہیں، یعنی جو چیزیں

آپ کے پاس نہیں ہیں ان کے حاصل کرنے کا کمال اللہ نے آپ کو دیا تھا، مشہور تھا کہ آپ تجارت میں بڑے صاحبِ نصیب تھے، (کان مخلصاً فی التجارۃ) اور چونکہ صرف کمالینا کمال نہیں ہے بلکہ اگر دوسروں پر صرف کر ڈالیے کمال ہے اور یہ صفت بھی بدرجہ اتم آپ میں تھی، اس لئے طاہرہ خدیجہ اس صفت کو ان الفاظ سے ادا کرتی ہیں وتقری الضیف۔

بعض نے مکتب پڑھا ہے یعنی کواتے ہیں معدوم کو، دوسرا مفعول محذوف ہے یعنی فقیر، مطلب یہ کہ فقر کو مال کو ادا دیتے ہیں۔

حَقِّ اَتَتْ بِهِ وَرَقَةَ بْنَ نَوْفَلٍ بْنِ اَسَدٍ بْنِ عَبْدِ الْعَزَى ابْنِ عَمِّ

اور ورقہ ابن نوفل کے پاس پہنچیں جو اسد بن عبد العزی کے بیٹے اور خدیجہ الکبریٰ کے چچا زاد بھائی تھے اور یہ خدیجہ، 'وَكَانَ امْرَأَتُهَا فِي الْجَاهِلِيَّةِ وَكَانَ يَكْتُبُ الْكِتَابَ

ورث اپنے آدمی تھے جو جاہلیت کے زمانہ میں دین نصرا نیت اختیار کر چکے تھے اور وہ عمرانی خط کے کاتب تھے، وہ انجیل میں سے عبرانی زبان الْعِبْرَانِيَّةَ فَيَكْتُبُ مِنَ الْاِنْجِيلِ بِالْعِبْرَانِيَّةِ مَا شَاءَ اللّٰهُ اَنْ يَكْتُبَ

میں جو خدا کو منظور تھا لکھا کرتے تھے، وہ بہت عمر رسیدہ آدمی تھے جن کی بشارت بھی جاتی رہی تھی، ان سے حضرت خدیجہ وَكَانَ شَيْخًا كَبِيرًا قَدْ عَمِيَ فَقَالَتْ لَهُ خَدِيْجَةُ يَا ابْنَ عَمِّ اَسْمَعْ مِنِّ

نے سنا لیا، اسے یہ چھپا کے بیٹے! اپنے بھتیجی کی بات سنو، چنانچہ ورقہ نے آپ سے کہا: میرے بھتیجے تم کیا دیکھتے ہو! ابْنِ اَخِيْكَ فَقَالَ لَهُ وَرَقَةُ يَا ابْنَ اَخِيْ! مَاذَا تُرِيْ؟ فَاخْبَرَهُ رَسُوْلَ اللّٰهِ

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو وہ تمام واقعات سنا دیے جن کا مشاہدہ نہ کیا تھا، ورقہ نے کہا، صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَبَرًا رَأَى فَقَالَ لَهُ وَرَقَةُ هَذَا النَّامُوسُ

جو تو وہی راز داں ہیں جو خداوندت دوس کی جانب سے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی لاتے تھے، الَّذِي نَزَّلَ اللّٰهُ عَلَى مُوسٰى يَا لَيْتَنِيْ فِيْهَا جَدُّ عَا

کاش میں تمہاری پینسہری کے زمانہ میں نوجوان اور طاعت ور ہوتا،

وتعين على نواب الحق، نواب جمع نائبہ کی، حادثہ کو کہتے ہیں، لفظ حق کا اضافہ کر کے بتلایا کہ آپ حق کا ساتھ

دیتے ہیں، غیر کے کام میں مددگار ہوتے ہیں، نواب شر سے آپ الگ رہتے ہیں، حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے آپ نے کسی شک اور تردد کا اظہار نہیں کیا، انھوں نے واقعہ آپ کی تسلی کے لئے آپ کے اوصاف کا ذکر کیا تاکہ آپ کا یقین قوی ہو، یہاں بخاری کا مقصد زیادہ تر انھیں اوصاف و اخلاق کا بیان کرنا ہے۔

فانطلقت به خديجة الخ یعنی حضرت خدیجہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لے کر ورقہ بن نوفل بن عبد العزی

کے پاس گئیں، یہ ورقہ حضرت خدیجہ کے چچے سے بھائی تھے، ان کو حق کی طلب تھی اس لئے یہ اور زید بن عمرو بن نفیل تلاش حق میں نکل کر شام پہنچے، ورقہ کو کوئی راہب مل گیا جو صحیح دین نصرا نیت پر تھا تو یہ نصرا نیت بن گئے یعنی اصل دین عیسیٰ علیہ السلام پر قائم ہو گئے، عام طور پر تعریف ہو چکی تھی مگر کوئی کوئی اصل دین پر تھا، پہلا اور بن وغیرہ میں رہتے تھے، ورقہ عیسائی ہونے کے بعد کتابت انجیل کرتے تھے، کیونکہ انجیل کے

حفظ کا مول ز تھا، جس طرح ہمارے یہاں حفظ قرآن کا مول ہے، بعض روایات میں ہے کہ عربی میں کہتے تھے، شامین کہتے ہیں کہ دونوں میں کہتے ہوں گے کیونکہ عبرانی اور عربی قریب قریب ہیں، عبرانی زبان حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان ہے جو اللہ نے انھیں عراق سے شام جاتے ہوئے سکھائی تھی، توریت وغیرہ عبرانی میں تھیں، لیکن انہیں کی زبان میں اختلاف ہے۔

تو لا شیعخا کبیرا، وہ عمر رسیدہ آدمی تھے اور آخر عمر میں نابینا ہو گئے تھے، یہ شبہ کہ کتاب کیسے کرتے تھے، جواب یہ ہے کہ بالکل نابینا نہیں ہوئے تھے یا یہ کہ نابینا ہونے سے قبل لکھتے تھے، اسے بیان کیا گیا۔

تو لا یا ابن عجم، یعنی اسے میرے چچا کے بیٹے، جس روایت میں عجم آیا ہے اس میں ان کو اخترا اچھا کہہ دیا گیا ہے، خدا بخیر نے وردہ سے کہا: اسمع من ابن اخیک، وردہ نے پوچھا ماذاتری؟ یعنی تمہیں کیا نظر آتا ہے، حضرت زید بن عمرو خود خدا بخیر سے کہا اور نہ وردہ سے، ہاں وردہ کے سوال پر جوگندہ تھا بیان فرمایا، وردہ نے سن کر فرمایا ہذا الناموس الاکبر، ناموس رازدار کو کہتے ہیں اور فرشتے اللہ کے رازدار ہوتے ہیں، ایک ناموس ہوتا ہے وہ شرکار رازدار ہوتا ہے اور ناموس خیر کے رازدار کو کہتے ہیں۔

انھوں نے یعنی وردہ نے فرشتے کے آنے کی تصدیق کی اور صحت تصدیق ہی نہیں کی بلکہ کہا یا لیتنی فیہا جذا عا یعنی مشابہا، وردہ بہت خوش ہوئے، انھیں یقین ہو گیا کہ یہ واقعی نبی ہیں اسلئے کہا: کاش میں نوجوان ہوتا تو آپ کی موثر مدد کرتا، اس پر بھی آپ نے کچھ نہیں فرمایا، اتنا بھی نہیں فرمایا کہ مجھے تسلی ہوگئی، اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ آپ کو تردید نہ تھا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس موقع پر وردہ نے عیسیٰ علیہ السلام کا نام کیوں نہیں لیا، موسیٰ علیہ السلام کا کیوں لیا؟ اس کے بہت سے جواب دے گئے ہیں، بہتر جواب کا حاصل یہ ہے کہ یہ اشارہ اس طرف ہے کہ وہی نبی ہیں احکام کا کثیر مجموعہ تھا، عیسیٰ علیہ السلام کی نوبت میں بہت جڑی فرق ہوا ہے، وحیقت شریعت عیسوی شریعت موسوی ہی تھی، چنانچہ قرآن میں ہے: ومصدقا لما بین یدین من التوراة والاحل لک بعض الذی حرّم علیکم، یعنی بعض حرام شدہ کاب حلال ہونا بتا دوں، تو تورات چونکہ جامع تھی اس لئے اس نے شبہ دی کیونکہ قرآن بھی جاتا ہے کہ قال تعالیٰ: ومہمینا علیہ، یعنی قرآن تمام شرائع کے اوپر نگہبان ہے اور سب کا جاتا ہے، قرآن سے پہلے توراة سے زیادہ جان کوئی کتاب نہ تھی، تو اس سے وردہ نے اشارہ کیا کہ تمہاری شریعت جامع ہے، جس طرح موسیٰ علیہ السلام کی شریعت تھی، یہاں انجیل، یہاں انجیل، انجیل میں زیادہ تر قصص و نصائح ہیں، قرآن میں اسی بنا پر کہا گیا: قل فاذا ابکتاب من عند اللہ ہوا ہدیٰ منہما اتبعہ، یعنی ایسی کوئی کتاب لاؤ جو توریت اور قرآن سے زیادہ ہدایت والی ہو، دوسرے مقام پر فرمایا: انارسلنا الیکم رسولا شاہدا علیکم کما ارسلنا الیٰ فرعون رسولا، یہاں بھی تشبیہ ہوئی، علیہ السلام کی رسالت

دی — دوسری مناسبت آپ میں اور موسیٰ علیہ السلام میں یہ ہے کہ جیسے موسیٰ علیہ السلام کا فرعون ہلاک ہوا اسی طرح آپ کی امت کا فرعون
یعنی باوجہ ہلاک ہوگا، فرمایا: **فعمىٰ فرعون الرسول فاخذناه اخذًا وابتلا**، یہ اشارہ ہے کہ جس طرح موسیٰ علیہ السلام کی
مکذیب کرنے والا ہلاک ہوا آپ کی مکذیب کرنے والا بھی ہلاک ہوگا، درود نے آثار دیکھ کر یہ قول کیا۔

حافظ نے ایک روایت لکھی ہے جو ابو نعیم نے دلائل النبوة میں ذکر کی ہے اور اس کی سند بقول حافظ حسن ہے، اسیں
موسیٰ علیہ السلام کے بجائے عیسیٰ علیہ السلام کا نام ہے، **قواب** بظاہر یہ نکتہ بیکار ہو گیا، مگر اب شروع سے سوال ہی متوجہ نہیں ہوتا، لیکن ایک
دوسرا سوال کھڑا ہو گیا اور وہ یہ ہے کہ جب تعدد ایک، گفتگو ایک تو پھر کہیں یہ نام اور کہیں وہ نام کیوں مذکور ہے؟ گفتگو ایک ہی ہے تو کوئی ایک
ہی نام لیا گیا ہوگا، تو وہ کون سا لفظ تھا، صحاح میں تو موسیٰ کا ذکر ہے، حافظ نے خوب جواب دیا ہے، کہتے ہیں کہ سیاق ابونعیم میں یہ نہیں ہے
کہ حضور سے خطاب کر کے درود نے کہا بلکہ اس میں ہے کہ پہلے مدح و تحسینیں اور تعدد بیان کیا تو درود نے بعد میں سے کہا کہ اگر تیرا بیان صحیح ہے تو میں
یقین کرنا ہوں کہ وہ فرشتہ وہ ہے جو عیسیٰ (علیہ السلام) پر آتا تھا، حافظ کہتے ہیں کہ جب مدح و تحسین کی گفتگو کی تو عیسیٰ کا ذکر کیا کیونکہ قرب تھا عیسیٰ
علیہ السلام سے اور یہ انھیں کے دین پر تھے بھی اور اس وقت انھیں اطمینان دلانا تھا مدح و تحسین کہ یہ بہت بڑی بشارت ہے، اور جب حضور سے
گفتگو ہوئی تو موسیٰ علیہ السلام کا ذکر کیا تاکہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ یہ بہت بڑی چیز ہے۔

شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے **ایتدناہ بروح القدس** کی تفسیر میں لکھا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے
پاس جو جبریل آتے تھے تو ان کا تعلق حضرت مسیح سے دیگر انبیاء علیہم السلام کا سا نہ تھا، خود وہ کلام نہیں کرتے تھے بلکہ حضرت مسیح کی زبان سے
خود فرشتہ بولتے تھے، تمہیں سمجھانے کے لئے کہا ہوں کہ جس طرح تم دیکھتے ہو جس پر جن آتا ہے تو دیکھئے والا سمجھتا ہے کہ شخص بول رہا ہے، حالانکہ
بولنے والا وہ جن ہے اور اب تو مسریم کے ذریعہ جو بولتا معلوم ہوتا ہے وہ نہیں ہوتا بلکہ کوئی دوسری روح بولتی ہے، بات شبیہ اب ہی ساملہ تھا
عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کہ جبریل عیسیٰ علیہ السلام کی زبان سے بولتے تھے، یہی خصوصی ساملہ تھا ان کا حضرت مسیح سے، برضوان دیگر انبیاء کے کہ
جبریل بات کہہ دیتے اب وہ انبیاء خود بولتے اور یہ خصوصیت حضرت عیسیٰ کی جبریل سے اس لئے تھی کہ وہ جبریل ہی کے نغصے سے پیدا ہوئے تھے۔

اس سے کہیں انصافیت کا دھوکا نہ ہو کیونکہ یہ مسلم ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام میں ملکی خصائص کا غلبہ تھا مگر اس سے انصافیت ثابت نہیں
ہوتی، درجہ پھر آدم علیہ السلام کو مسجود کیوں بنایا گیا؟ آخر کچھ تو شرف تھا، وہ شرف و حقیقت کمالات آدمیت کے اعتبار سے ہے گو اس کا
ایک جزو ملکیت بھی ہے اور یہی وجہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر اٹھالے جانے کیلئے جبریل ہی کو مقرب کیا گیا کیونکہ خاص خصوصیت تھی، پھر آدم
کو باوجود افضل ہونے کے زمین پر رکھا **منہا خلقتنا** کہ وہ فیہا نعیدکم الخ اور فرشتے آسمان پر رہے تو کیا اس سے فرشتوں کی

انفلیٹ ثابت ہوتی ہے، باوجود انفلٹ، آدم کے عوامیادیر شاہ صاحب کا قول ہے مگر میرے پاس کوئی ماخذ نہیں حدیث سے، ان کے پاس قریت یا انجیل کا کوئی ماخذ ہوگا کیونکہ وہ حضرات درست پڑھتے تھے، ممکن ہے وہاں انھوں نے دیکھا ہو مگر یہیں قرآن و حدیث میں کچھ نہیں ملا۔

قولہ جَدْعًا جذع اصل میں اونٹنی کے اس بچہ کو کہتے ہیں جو قریب پریشاب ہو، یہاں مطلب یہ ہے کہ کاش میں ان ایام میں جب کہ آپ کو وہ چیزیں پیش آئیں گی جو انبیاء علیہم السلام کو پیش آتی ہیں میں جو ان رہتا اور زندہ رہ کر تمہاری مدد کرتا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ درود کو نبوت کا یقین ہو گیا تھا اور انھوں نے تہیہ کر لیا تھا کہ حضور کو نبی تسلیم کر لیں گے اور ایمان لے آئیں گے، اب وہ مومن ہیں یا نہیں؟ تو مشہور ہے کہ سب سے پہلے مومن مردوں میں ابوبکر اور عورتوں میں خدیجہ اور لڑکوں میں علی ہیں اور موالی میں زید و بلال وغیرہ، درود کو کبھی اول مومن نہیں کہا، اگر وہ مومن تھے تو ان کو اول مومن کیوں نہیں شمار کیا؟ اور اگر نہیں تھے تو اس وقت ان کی تصدیق اور وہ نعمت کیوں اودکیا تھا؟ اس سے تو ایمان معلوم ہوتا ہے، جواب مفصلاً آگے سے گا اس وقت مجھے یہ سمجھ لو کہ صرف تصدیق و معرفت ایمان کیلئے کافی نہیں بلکہ اس کے لئے دوسرے دینوں سے تبری اور دین محمدی کا التزام اور قبل کرنا ضروری ہے، اور یہ درود سے ثابت نہیں، تصدیق و وعدہ و نسی ضرور ہے مگر کوئی لفظ ایسا نہیں جس سے قبول کا علم ہو، اب چند آیات پیش کرتا ہوں جن سے معلوم ہوگا کہ معرفت یا تصدیق یا علم سے ایمان مستحب نہیں ہوتا بلکہ التزام ضروری ہے، لکھا قال تعالیٰ: یَعْرِفُونَ مَا یَعْرِفُونَ ابْنَاءَ هُمْ یعنی جس طرح باپ کہیے گا علم ہوتا ہے اور اسے اسی طرح پہچانتا ہے اسی طرح یہ اہل کتاب رسول علیہ السلام کو اللہ کا نبی جاننے اور پہچاننے تھے مگر انھیں کے لئے فرماتے ہیں: وَاَنْ فَرِیقًا مِنْهُمْ لَیْکَتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ یَعْلَمُوْنَ (پارہ سیکول سورہ بقرہ) معلوم ہوا کہ تنہا معرفت و علم کافی نہیں، نیز فرمایا: وَحُجَّتْ اَبَیْہَا وَاسْتَفْتٰہَا اَنْفُسُہُمْ، انھوں نے انکار کیا اور ان حالیکہ انھیں یقین تھا، یہاں انکار ہے باوجود کہ یقین تھا اور انکار ظلم، تکبر، سرکشی اور تردید بنا رہا تھا تو نفس استیقان ہی کافی نہ ہوا، التزام ضروری ہوا، خود فرعون کو مخاطب کر کے نبی علیہ السلام فرماتے ہیں: لَقَدْ عَلِمْتَ مَا اَنْزَلَ ہُوَ اِلَّا رِبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ بَصٰئِرٌ وَاِنِیْ لَظَنَّکَ یَا فِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا یعنی باوجود علم کے ہلاکت میں پڑنا چاہتا ہے، یہاں بھی علم ہے مگر غیر متبر اور ایمان کے لئے ناکافی، ہاں کہا جاسکتا ہے کہ ان تمام آیات میں انکار و نحو وہ ہے اور درود نے مجھ کو نہیں کیا تو میں کہتا ہوں کہ درود کے قول میں اقرار بھی نہیں جو اس کے ایمان پر دلالت کرے، ممکن ہے وہ مومن ہوں اس کا ثبوت ہو جائے تو ہمیں انکار نہیں ہے، لیکن ان الفاظ سے حکم ایمان نہیں کر سکتے، ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ اس کا علم نہیں کہ وہ مومن تھے یا نہیں، خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انھیں سفید کرے پہنے ہوئے دیکھنا اور تعمیر مغفرت سے دینا بلیک ایمان کو بتلاتا ہے لیکن اس حدیث سے ثبوت نہیں ہوتا۔

ابوطالب کا قصد ان سے زیادہ مرشح ہے کیونکہ ابوطالب کو یقین تھا بلکہ زبان سے اعلان کرتے تھے اور مدد کا وعدہ بھی، بلکہ

يَا لَيْتَنِي اَكُوْنُ حَيًّا اِذَا يُخْرِجُكَ قَوْمُكَ ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ
 لاشك کہ میں اس وقت تک زندہ رہتا جب آپ کی قوم آپ کو نکالے گی ، رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ وہ (میری قوم کے)
 وَسَلَّمْ اَوْخْرِجِيْهُمْ قَالَ نَعَمْ ، لَمْ يَأْتِ جُلُّ قَطٍّ بِمِثْلِ مَا جِئْتَ بِهِ اِلَّا
 لوگ مجھ کو نکال دیں گے ؟ ، وقت نے کہا ہاں ! کبھی کوئی شخص اس قسم کی دعوت لے کر نہیں آیا جس طرح کی تم لائے ہو مگر یہ کہ
 عُوْدِيْ وَاِنْ يُّدْرِكْنِيْ يَوْمُكَ اَنْصُرَكَ نَصْرًا مُّؤَزَّرًا ، ثُمَّ لَمْ يَنْشَبْ وَرَقَةٌ
 لوگوں نے اس کے ساتھ دشمنی کا برتاؤ کیا ، اور اگر میں ان دنوں تک زندہ رہا تو آپ کی مضبوط مدد کروں گا ، پھر تھوڑے ہی زمانے کے بعد
 اَنْ تُوَفِّيْ وَفَرَّ الْوُحْيُ
 ورفہ کا انتقال ہو گیا اور وحی بھی موقوف ہو گئی ۔

جس وقت تمام عالم زلزلہ ہوا اس وقت اپنی آبرو اور جان و مال قربان بھی کر دیا ، ان کے اشعار بھی ہیں ' مثلاً

وَاللّٰهُ لَنْ يَصْلُوَا اِلَيْكَ بِجَمْعِهِمْ ۚ حَتّٰى اَوْسَدَ فِى التُّرَابِ دَفِينًا

انہار بھی ہے ' اقرار بھی ہے اور پھر یہ حایت بھی ہے : — دوسرے قصیدہ میں ہے ،

كَذَبْتُمْ وِیْتِ اللّٰهِ بِبِزَى عَمَدٍ ۚ وَلَمَّا نَقَاتِلْ حَوْلَهُ وَنَنَازِلْ

یعنی جب تک ہم زندہ ہیں تم ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے ، تو ایسی حایت تھی مگر چونکہ التزام و قبول نہ تھا اس لئے انھیں
 مومن نہیں کہہ سکتے ، اسی طرح چونکہ ورتو سے التزام و قبول ثابت نہیں اس لئے سکوت کریں گے ، اب اگر ایمان ثابت ہو جائے تو اولیٰ المؤمنین
 میں شمار نہ کرنا دوسری وجہ سے ہوگا ۔

شیخ اکبر کہتے ہیں کہ نبوت و رسالت میں فرق ہے ، نبی صرف وحی آجانے سے ہو جاتا ہے اور وحی اس کی ذات
 تک محدود ہوتی ہے ، اور جب تبلیغ کا حکم ہوا تو وہ رسول ہو گیا (دوسرے لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام تعلیم کرتے ہیں
 لیکن وہ امور نہ تھے اور رسل مامور تھے) شیخ فتوحات میں لکھتے ہیں کہ اقرآن صرف آپ کے لئے محدود تھا ، پھر وحی رکی رہی جب
 یہ زمانہ فرات کا ختم ہوا جو تین سال کا تھا (تاریخ امام احمد) یا ڈھائی سال یا چھ ماہ ، بروایت دیگر تو حکم ہوا یا ایہا المدثر قم انما اب خطاب
 ہے کہ تبلیغ کرو اور لوگوں کو ڈراؤ ، اب آپ رسول ہو گئے ، تین سال تک خوب ثابت و مستقر کر دیا گیا تو حکم تبلیغ ہوا اور رسالت میں دعوت
 بدئی ہے اور اب سنکر کافر ہو گا اور جب تک تبلیغ نہیں اس وقت کاسنکر کافر نہیں ، تو درود کا ایمان زمانہ فرات کا ہے ، اس وقت دعوت
 نہ تھی اور دعوت کے بعد سے پہلے ایمان لانے والے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہیں ، اس لئے انھیں اول المؤمنین کہا جاتا ہے ۔

تو اذ یخرجک قومک ، ایسے مواقع پر اکثر اذالانے میں گراؤ بھی آتا ہے اور نجات نے نصرت کی ہے کہ اذ بھی استقبال کیلئے آتا ہے ۔

فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اؤمخزجی ہم ، یعنی کیا یہ مجھے نکال دیں گے؟ آپ کے ہم وگمان میں بھی یہ بات نہ آئی کہ جس کی یہ شان ہو ، یہ امانت ہو ، یہ صدق و حسن معاملات ہو ، وہ اخلاق ہوں جن کا بیان حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے کیا ، کیا ایسے بلند پایہ انسان کو یہ قریش کہہ سکتی تھی کہ اس نے آپؐ کو انتہائی تعجب سے فرمایا : اؤمخزجی ہم ؟ یہ ، یہ ، یہ مجھے نکال دیں گے ؟ تو ورد نے سیرت انبیاء سے جو سمجھا اور پڑھا تھا اس پر قیاس کر کے اپنے تخمینہ سے کہا : نعم لہ ریأت رجل قط بمثل ما جئت بہ الا عودی ہاں ایسا ہی ہوگا ، جو کچھ آپؐ لائے ہیں یہ جو بھی لایا اس کے ساتھ ہی معاملہ ہوا ، تو آپ کے ساتھ بھی ہوگا اور لوگ عداوت کریں گے ، عراق سے ابراہیم علیہ السلام کو شام آنا پڑا ، موسیٰ علیہ السلام مصر سے نکلے ، لوط علیہ السلام کو سدوم چھوڑنا پڑا ، تو ظاہر ہے کہ تمہارے ساتھ بھی یہی پیش آئے گا ۔

آگے کہتے ہیں کہ اگر زندہ نہ رہا تو نصر موزر کروں گا ، ازکر کے معنی شدت و قوت کے ہیں ، سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کو عرض کیا واشدد بہ ازری یعنی اور اور (علیہ السلام) کے ذریعہ میرا تھم مضبوط کر ، قوت میں اضافہ فرما ۔

ثم لہ ریشب ای لہ ریشب یعنی زیادہ زندہ نہ رہے ، وفات میں زیادہ دیر نہ لگی اور مدد کا موقع نہ مل سکا ۔ بعض کتب سیرت سے معلوم ہوتا ہے کہ جب بلال رضی اللہ عنہ کو ستایا جاتا تھا تو یہ دیکھ کر رم کھاتے تھے یعنی اس ابتدائی دور میں زندہ تھے جس وقت قریش کی سختیاں بڑھیں اس وقت یہ انتقال فرما چکے تھے ۔

اؤمخزجی ہم کا قصہ بعینہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو بھی پیش آیا کہ جب ان کو آپ کے قرآن پڑھنے سے مانع ہوئے یہ کہہ کر اس کو ہمارے نوجوان اور عورتیں متاثر ہوتی ہیں اس لئے ہم پڑھنے نہ دیں گے تو آپ نے ترک وطن کا فیصلہ کر لیا اور ہجرت کے خیال سے نکل پڑے راستہ میں ابن الدغنہ لگیا ، پوچھا ابو بکر کہاں چلے ؟ فرمایا ان کو مجھ رہنے نہیں دیتے تو ابن الدغنہ نے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے لئے بعینہ وہ تمام الفاظ کہے جو سیدہ طاہرہ خدیجہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کہے تھے اور کہا تم میری ضمان میں کہ واپس چلو میں تم کو کچھ بھروسہ نہ جانے دوں گا ، مجوزاً حضرت صدیق واپس ہوئے ، ابن الدغنہ ساتھ ساتھ تھا ، اس نے آکر اعلان کر دیا کہ یہ ابو بکر میرا ، ان میں ہے ، اگر کوئی ایسا ہو کچھ کہے گا تو میں اس سے بدلہ لینے پر مجبور ہوں گا ، صدیق اکبر کو تو گئے گران سے پھر عبرت نہ ہو سکا اور پھر قرآن پاک کی تلاوت شروع کر دی ، لوگوں نے ابن الدغنہ سے شکایت کی تو حضرت صدیق نے اعلان کر دیا کہ میں ، ابن الدغنہ کی امان سے نکل کر ان کی امان میں آ گیا ۔

قَالَ ابْنُ شَهَابٍ وَاخْبَرَنِي أَبُو سَلَمَةَ بْنُ عَبْدِ الرَّحْمَنِ أَنَّ جَابِرَ بْنَ عَبْدِ اللَّهِ
ابن شہاب نے کہا کہ مجھے ابوسلمہ بن عبد الرحمن نے خبر دی کہ حضرت جابر بن عبد اللہ انصاری رضی اللہ عنہ وحی کے وقت ہوجانے کے ایک حدیث بیان فرما رہے تھے
الْأَنْصَارِيُّ قَالَ وَهُوَ يُحَدِّثُ عَنْ فَارِقَةَ الْوَحْيِ فَقَالَ فِي حَدِيثِهِ بَيْنَا أَنَا وَأَمِّشِي
کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حدیث بیان فرماتے سنا کہ میں ایک مرتبہ جابرؓ کے پاس تھا کہ چاہک میں نے آسمان میں ایک آواز سنی، میں نے اپنی نگاہ اٹھا کر
إِذْ سَمِعْتُ صَوْتًا مِّنَ السَّمَاءِ فَرَفَعْتُ بَصَرِي فَإِذَا الْمَلَكُ الَّذِي جَاءَنِي بِحِجَاءٍ جَالِسٌ
دیکھا تو چاہک وہی فرشتہ جو میرے پاس حرا میں آیا تھا آسمان وزمین کے درمیان کرسی بٹھائے بیٹھا ہے، میں اس سے خوف زدہ ہو کر واپس ہوا اور
عَلَى كُرْسِيِّ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ فَرَعَبْتُ مِنْهُ فَرَجَعْتُ فَقُلْتُ زَمِلُونِي زَمِلُونِي فَأَنْزَلَ
میں نے کہا مجھے کہیں اور حادو، پھر باری تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ فَاذْهَبْ وَرَبِّكَ فَكَلِمًا وَثِيَابَكَ فَطَهَّرَ وَالرَّجْزَ فَهَبَّ
اللَّهُ تَعَالَى يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ فَاذْهَبْ وَرَبِّكَ فَكَلِمًا وَثِيَابَكَ فَطَهَّرَ وَالرَّجْزَ فَهَبَّ
اے کھلی والے! کھڑے ہو جائیے اور لوگوں کو خوف دلائے، اپنے پردہ دگاری کی بڑائی بیان کیجئے اور اپنے کپڑوں کو پاک کیجئے، اللہ تمہوں سے عذر دے رہے
جیسا کہ اب تک علیؓ دے رہے ہو

اس سے معلوم ہوا کہ جس میں مکالم اخلاق ہیں لوگ اسے نکالنا نہیں کرتے، اسی بنا پر اللہ کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کو چننا ہوا کہ مجھ جیسے آدمی
کو یہ نکال دیں گے مگر اُنہ کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ درود نے صحیح اندازہ لگایا تھا، حالات نے اللہ کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کو ہجرت پر مجبور کر دیا اور
آپ نے حدیث کو ہجرت فرمادی۔

قَالَ ابْنُ شَهَابٍ، يَعْنِي ابْنَ شَهَابٍ كَچھ زیادہ بیان کرتے ہیں، دوسری سند سے، نیچے کی سند ایک ہے، ابْنُ شَهَابٍ کے
آگے دلائل عروہ عن عائشہ ہے اور یہاں ابوسلمہ عن جابر ہے، اس میں یہ بھی بیان کیا جا رہا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے
ہیں کہ میں چلا جا رہا تھا کہ چاہک میں نے ایک آواز سنی کہ کوئی یا محمدؐ کہہ کر مجھے پکار رہا ہے، میں نے اُٹھ کر اٹھا کر دیکھا تو میں نے اسی ملک کو دیکھا جو
حراء میں اُقرائے کرتا تھا، اس میں یہ تصریح نہیں کہ کس مدت اور کس حالت میں دیکھا، اللہ تعالیٰ نبی کے دل میں ڈال دیتا ہے کہ یہ فرشتہ ہے۔
فَرَجَعْتُ یعنی میں مروپ ہو گیا اور گھروٹ کر زلزلی زلزلی کہا، بخاری کی کتاب التفسیر میں بروایت یونس ذُکِرَ وَفِي هُیْ اسکا
حوالہ اس غرض سے دیا کہ یہ لفظ آیت یا ایہا المدثر کے موافق ہے، گو مراد دونوں کی ایک ہی ہے۔

فَأَنْزَلَ اللَّهُ تَعَالَى يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ فَاذْهَبْ وَرَبِّكَ فَكَلِمًا وَثِيَابَكَ اُسے دن چھپانے والے اٹھو اور اللہ کا نام لے کر
کھڑے ہو جاؤ اور ہدایت کر دو دنیا کو، یا محمدؐ نہیں کہا مدثر کہا، اس میں اشارہ ہے کہ تمہارا یہ کلام نہیں کہ لیٹے رہو، تمہارے لئے بڑا میدان

ہے بڑا کام ہے جسے تمہیں انجام دینا ہے، اس ادا کو پسند بھی فرمایا کہ خطاب اسی سے کیا اگر متنبہ بھی کر دیا کہ تمہارا کام آرام کرنا نہیں ہے، دوسرا کام ہے، انذار ہر تحریف کو نہیں کہتے بلکہ آئندہ ہونے والے خطرات پر تذکرہ کر کے کہتے ہیں، یعنی انھیں اللہ کے عذاب سے جو مستقبل میں آنے والا ہے اور دوزخ سے ڈراؤ۔

وَرَبِّكَ فُكْبَرُ اٰی فَعِظْ یعنی اپنے رب کی تعظیم کرو قَوْلًا وَّفِعْلًا یعنی ہر طرح اپنے مالک کی تعظیم کرو۔ کثیر میں دو چیزیں ہیں (۱) خود تعظیم کرو (۲) دوسروں کو تعظیم کا سبق دو، چونکہ یہاں مفعول مذکور ہے اس لئے لغوی معنی ہی مناسب ہیں، قول اللہ اکبر کہ وہ لازم ہے، یہی معنی اکثر سلف سے مروی ہیں، بعض نے بکیر تحریر میرا دلی ہے، میں کہتا ہوں کہ وہ بھی ایک فرد ہے، معنی عام بہتر ہے کیونکہ یہی معنی انذار کے موافق ہے، دوسرے گاہی جس کے دل میں غفلت رہ ہو۔

وَشِیْءٌ یُّنْفِخُ فِیْہِ اٰی فَعِظْ یعنی اپنے کپڑوں کو پاک رکھو، پاک کرو ترجمہ مناسب نہیں، یہ آئندہ کے لئے تنبیہ ہے، رسول علیہ السلام نجس کپڑے نہیں پہنتے تھے کہ پاک کرنے کا حکم مل رہا ہو، کپڑے تو پاک ہی تھے مگر آئندہ کے واسطے ہدایت فرمائی جارہی ہے کہ مزید اتہام کیا جائے موسیٰ علیہ السلام جب شرف ہنگامی سے نوازے جارہے تھے تو غیر مدبرانہ جملہ کے جوتے پہنتے تھے اس لئے حکم ہوا فَاخْلَعْ نَعْلَیْکَ جوتے اتار دیجئے، اس سے اندازہ ہوا کہ وحی الہی نجس کپڑے والوں کے پاس نہیں آتی۔

بعض نے ثیاب سے نفس مراد لیا ہے کہ نفس کو رزائل سے پاک رکھئے، لیکن یہ معنی بھی ہیں لیکن ظاہر پہلے معنی ہیں پہلے انذار کا پھر تعظیم کا حکم دیا، پھر ظاہری و باطنی پاکیزگی کا حکم دیا کیونکہ ظاہری کے پاس اللہ کی رحمت آتی ہے، اس کی نظر یہ ہے کہ فرمایا: نَظْفُوا اَفْنِیَّتَکُمْ۔ اپنے گھروں کی فنا (کسپوٹ) کو صاف رکھو، فنا، گھر کے آگے جو صحن یا چوڑا ہوتا ہے اس کو کہتے ہیں، مینہ کے یہودی کاشت کرتے تھے، دوازا کے باہر کھاد وغیرہ، کوڑا کرکٹ ڈھیر رکھتے تھے اس سے دروازے گز سے رہتے تھے، مسلمان کاشتکاروں کی تنبیہ کے لئے فرمایا تم اپنے گھر دروازے باہری صحن صاف رکھو، نقہانے لکھا ہے کہ جب فنا، کا صاف رکھنا ضروری ہے تو گھر کی صفائی بطریق اولیٰ مطلوب ہوگی، اسی طریقہ جب کپڑوں کے پاک رکھنے کا حکم دیا تو باطن کی صفائی کا حکم بطریق اولیٰ ہوگا، یعنی ثیاب کا مدلول نفس نہیں، البتہ یوں کہہ سکتے ہیں کہ جب کپڑے کی طہارت کا حکم ہے تو نفس کی طہارت کا بطریق اولیٰ ہوگا۔

وَالرِّجْزُ فَاهْجُرْ بخاری حدیث لائیں گے کہ رجز سے مراد اوثان ہیں، یعنی تہوں کو تھوڑے رکھئے، بت پرستی حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہی، ثابت نہیں اسے، چھوڑ دیجئے، ترجمہ بالکل صحیح نہیں، مگر ہمارے نزدیک یہ تفسیر صحیح ہے، راجع دوسری تفسیر ہے، رجز یعنی رجز (عذاب) کے ہے، یعنی کوئی کام ایسا نہ کیجئے جو باعث عذاب الہی ہو، یا رجز کے معنی میں ہو، یعنی ہر چیز کو پاک رکھئے، حاصل یہ کہ

فَحَمَى الْوَحْيَ وَتَتَابَعَ تَابَعَهُ عَبْدُ اللَّهِ بْنُ يُوسُفَ وَأَبُو صَالِحٍ وَتَابَعَهُ

اس کے بعد وحی ہے مد پے آنے لگی، امام بخاری نے فرمایا کہ عبد اللہ بن یوسف و ابو صالح نے یحییٰ بن یحییٰ کی متابعت کی ہے اور عقیل کی متابعت
ہلال بن رزادہ عن الزہری وقال یونس ومعمرو بوادریہ
ہلال بن رزادہ نے زہری سے کی ہے اور یونس و معمر کی روایت میں یوسف بوادریہ کی جگہ یوسف بوادریہ آیا ہے۔

انذار کا حکم ہوتا ہے مگر وہ جب موثر ہوگا جب سے اس کی تعظیم دل میں ہوگی۔

امام غزالی لکھتے ہیں کہ اگر کوئی کہے کہ اسے مت کھانا اس میں زہر ہے اور خود اس سے کھانے لگے تو طبیعت کون قبول کرے گا
یہی ہی حالت منذر کی ہے کہ انذار جب ہوگا جب اس کا دل غفلت الہی سے لرزہ ہو اور میل کچیل سے صاف ہو، کیسا عمدہ نسخہ ہے اور
کس قدر بہتر نظم ہے۔

قوله فَحَمَى الْوَحْيَ 'وحی گرم ہوگئی یعنی بکثرت آنے لگی، جب کوئی چیز بکثرت آنے لگے اور پوری شدت سے آئے تو کہتے
ہیں گرم ہوگئی، یہی اصل ترجمہ ہے اور یہ مقابل ہے فقر الوحی کے، فقر کے مقابلہ میں حمی بولے۔

قوله تتابع یعنی پے در پے آنے لگی، یعنی بلا انقطاع متتبعہ آنے لگی، مسلم میں جابر کی حدیث محلہ کر کے لائے ہیں
اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے مژگانہ نازل ہوا مگر اس روایت نے شبہ دور کر دیا اور دونوں میں تطبیق ہوگئی، ہدیۃ فضائل
عنہا کافرانہ بھی صحیح کہ اقرأ پہلے نازل ہوئی اور جابر رضی اللہ عنہ کافرانہ بھی صحیح کہ مژگانہ پہلے نازل ہوئی، یعنی بعد فترۃ پہلے وہی نازل ہوئی
ایک مرسل حدیث فتح الباری میں ہے کہ سب سے پہلے نازل فاتحہ کا ہوا، اور میرے نزدیک اس کا مضمون دل کو لگا کر
اور گمان یہ ہوتا ہے کہ جس مجلس میں اِسْمُ نازل ہوئی شاید اسی مجلس میں سورۃ فاتحہ بھی آئی کیونکہ مرسل میں ماذا اَقْرَأَ بھی ہے، معلوم
ہوگا کہ پہلے اقرأ کہا گیا ہوگا، تو بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلے اقرأ کی پانچ آیتیں آئیں پھر آپ نے پوچھا ماذا اَقْرَأَ تو فرشتے نے
کہا: قل بسم اللہ الرحمن الرحیم الحمد للہ رب العالمین اللہ یعنی اول نازل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اول مجلس میں
اِسْمُ آتری تھی اسی میں فاتحہ بھی آتری، اب اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ اسلام میں کوئی وقت بغیر فاتحہ کے نہیں تھا اور نماز کسی وقت فاتحہ کو
خالی نہ تھی، روایت بھی اسی کو ترجیح دیتی ہے کیونکہ اسے ام الکتاب کہا گیا ہے یعنی یہ اصل ہے جیسے تخم اور سارا قرآن اس کی فرع ہے جیسے
درخت، فاتحہ میں اجمال ہے اور سارا قرآن اس کی تفصیل ہے، ترتیب طبعی بھی اسی کی مقتضی ہے کہ پہلے بیج ہو اور بعد کو شجرہ، لہذا
اگر مرسل کو تسلیم کر لیں تو کچھ بعید نہیں۔

تابعہ، ضمیر کو مقام دیکھ کر راجع کیا جاتا ہے، مرتبہ کو طبقہ دیکھ کر نکالتے ہیں، عبد اللہ بن یوسف اور ابو صالح یحییٰ کی

۴۔ حَدَّثَنَا مُوسَى بْنُ إِسْمَاعِيلَ قَالَ حَدَّثَنَا أَبُو عَوَانَةَ قَالَ حَدَّثَنَا مُوسَى بْنُ

ہم سے بیان کیا موسیٰ بن اسماعیل نے کہا ہم سے بیان کیا ابو عوانہ نے کہا ہم سے بیان کیا موسیٰ بن ابی عائشہ نے
ابن عائشہ قَالَ حَدَّثَنَا سَعِيدُ بْنُ جُبَيْرٍ عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا
کہا ہم سے بیان کیا سعید بن جبیر نے انہوں نے سنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس آیت کی تفسیر میں: 'اے پیغمبر! جلدی
فِي قَوْلِهِ تَعَالَى لَا تَحْرُكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ قَالَ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ
وحی کو یاد کرنے کے لئے اپنی زبان کو نہ ہلایا کرو' ابن عباس نے کہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پرت رن اترنے سے (بہت) سختی
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَعْلَمُ مِنَ التَّنْزِيلِ شِدَّةً وَكَانَ مِمَّا يَحْرُكُ
ہوتی تھی اور آپ اکثر اپنے ہونٹ ہلاتے تھے (یاد کرنے کے لئے) ابن عباس نے (سعید سے) کہا میں تمھو کو بتاتا ہوں ہونٹ
شَفْتَيْهِ فَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا فَإِنَا أَحْرَكْنَاهُمَا كَمَا كَانَ
ہلکے جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو ہلاتے تھے اور سعید نے (موسیٰ سے) کہا میں تمھو کو بتاتا
رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُحْرِكُهُمَا وَقَالَ سَعِيدٌ أَنَا أَحْرَكْنَاهُمَا
ہوں ہونٹ ہلکے جیسے میں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کو ہلاتے دیکھا، یہ
كَمَا رَأَيْتُ ابْنَ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا يُحْرِكُهُمَا فَحَرَّكَ شَفْتَيْهِ
سعید نے اپنے دونوں ہونٹ ہلائے

طبقہ کے ہیں یعنی لیث ابن سعد (امام مصر) سے یہ دونوں روایت کرتے ہیں۔

قَوْلُهُ تَابِعَهُ هَلَالُ عَنْ الزَّهْرِيِّ 'بتایا کہ یہ عقیل کے تابع ہیں' یونس اور معمر دو اور تابع بیان کر دئے
تو اب چار تلمیذ زہری کے ہو گئے، فرق یہ ہے کہ عقیل وہاں ایک طرح روایت کرتے ہیں مگر یونس اور معمر نے بجائے فَوَادِحَ کے بُوَادِرَ
کہا، 'یہ معج بادرقہ کی ہے اور بادره اس گوشت کو کہتے ہیں جو منکب اور عنق کے درمیان ہوتا ہے' خوف سے یہ لحم کا سپنے
لگتا ہے' اسے بتا رہے ہیں۔

قَوْلُهُ حَدَّثَنَا مُوسَى بْنُ إِسْمَاعِيلَ 'سعید ابن عباس رضی اللہ عنہما شان نزول بیان کرتے ہیں کہ تنزیل
سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم تکلیف و شدت لیتے تھے (معالجہ کسی چیز کا شقت کے ساتھ لینا) یعنی حضور سختی و مشقت محسوس کرتے
تھے، یہ شدت نزول وحی کی تھی، وکان مِمَّا يَحْرُكُ میں مِمَّا بمعنی رجباً ہے اور کثرت سے ایسا آتا ہے یعنی کثیراً ما

فَأَنْزَلَ اللَّهُ تَعَالَى لَا تَحْرِكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ ۖ إِنَّ

ابن عباس نے کہا نبی اللہ تعالیٰ نے یہ آیت آوری، وحی کو یاد کرنے کے لئے اپنی زبان نہ ہلایا کرو، تدرآن کا ترجمہ
 عَلَيْنَا جَمْعُهُ وَقُرْآنُهُ، قَالَ جَمْعُهُ لَهُ فِي صَدْرِكَ وَتَقْرَأُهُ،
 یاد کرو دینا اور پڑھا دینا ہمارا کام ہے، ابن عباس نے کہا یعنی تیرے دل میں جمادینا اور پڑھا دینا (پھر)
 فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ، قَالَ فَاسْتَمِعْ لَهُ وَأَنْصِتْ، ثُمَّ

جو اللہ نے فرمایا، جب ہم پڑھ چکیں اس وقت تو ہمارے پڑھنے کی پیروی کر ابن عباس نے کہا اس کا مطلب
 إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ، ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا أَنْ تَقْرَأَهُ، فَكَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ
 یہ ہے کہ خاموشی کے ساتھ سننا (پھر یہ جو فرمایا) ہمارا کام ہے اس کا بیان کر دینا یعنی ترجمہ کو پڑھا دینا، پھر ان آیتوں کے اترنے کے
 اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعْدَ ذَلِكَ إِذَا آتَاكَ جِبْرِيلُ اسْتَمِعْ فَإِذَا انْطَلَقَ جِبْرِيلُ
 بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آیا کرتے دک، جب جبریل آپ کے پاس آکر قرآن سناتے تو آپ (چپکے) سننے رہتے، جب وہ چلے جاتے
 قَرَأَهُ النَّبِيُّ ﷺ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَمَا قَرَأَهُ
 تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرح قرآن پڑھ دیتے جیسے حضرت جبریل نے پڑھا تھا۔

يَحْرُكُ، بعض روایات میں ہے کان یحرک لسانہ وشفتیہ، مزید یہ ہے کہ آپ بمقتضائے بشریت جبریل کے ساتھ ساتھ
 پڑھتے تھے تاکہ بھول نہ جائیں، تو محفوظ کرنے کے لئے ایسا کرتے تھے، اس سے اور بھی شدت پیدا ہوتی تھی، اول شدت وحی کی،
 دوم شدت یاد کرنے اور تحریک لسان کی، اس پر اللہ نے تیسیر فرمائی اور فرمایا، لَا تَحْرِكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ، الخ ابن عباس
 رضی اللہ عنہما نے اپنے ہونٹ ہلا کر دکھائے کہ ایسے حرکت دیتے تھے، سید ابن جبر جو ابن عباس کے شاگرد ہیں وہ بھی تحریک کرتے تھے
 اتنا یاد رکھو کہ ابن عباس اس واقعہ کے وقت غالباً پیدا بھی نہ ہوئے تھے، کیونکہ ان کی پیدائش ہجرت سے تین سال پہلے تو اسے یہ کیونکر
 ضبط کرتے، تو یہ حدیث مرسل صحابہ سے ہے، نیز صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث بھی مرسل ہے مگر مرسل صحابہ باتفاق جمہور اہل سنت
 مقبول ہیں لَانِ الصَّحَابَةَ كُلَّهُمُ عَدُولٌ، صحابی کا تاہی سے روایت کرنا اور ہے اور ایسے مقام پر راوی نام ظاہر کر دیتا ہے
 اب یہ بھی احتمال ہے کہ ابن عباس نے کسی صحابی سے سنا ہو اور یہ بھی احتمال ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ہی ان کے سامنے یہ قصہ
 بیان فرمایا ہو، حافظ نے منہ ابی داؤد و طبری سے ایک روایت نقل کی ہے اس میں یہ تصریح ہے کہ خود حضور نے ابن عباس سے واقعہ
 بیان کیا ہے، اب یہ متصل ہوگئی۔

لا تَحْرَافْ' یعنی بالکل ساکت رہ کر سنو لتعجل بہ' اس غرض سے کہ جلدی یاد کر لو زبان مت ہلاؤ، آگے فرمایا کہ تمہارے زبان ہلانے کی ضرورت نہیں، ہمارے ذمہ اس وحی کا تمہارے سینے میں جمع کرنا ہے، یہ ابن عباس کی تفسیر کے مطابق ہے۔ صدرک فاعل ہے یعنی ہمارے ذمہ ہے کہ آپ کا سینہ جمع کر لے وحی کو، بعض میں فی صدرک ہے اور یہ واضح ہے۔

وتقرأہ' یعنی یہ بھی ہمارے ذمہ ہے، تم اس وقت مت پڑھو۔
فاذا قرأناہ' میں نسبت قرأت کی اپنی طرف کی کیونکہ اصل وحی اللہ ہے۔

فاتبع قرآنہ' قرآن بمعنی قراءۃ ہے، یعنی آپ زبان نہ ہلائیں اور خاموش رہیں اور کان لگائیں، انصات بمعنی مطلق سکوت ہے عند الجہور، مگر محققین کے نزدیک انصات، سکوت للاستماع کو کہتے ہیں، کہا جاتا ہے انصت یعنی سکوت مستمع، مفصل بحث ان شاء اللہ قراءۃ خلف الامام کے موقع پر آئے گی۔

ابن عباس کی اس تفسیر سے ہمارے لئے بڑی حجت نکلی ہے، کیونکہ فرمایا اتباع کرو، اس سے معلوم ہوا کہ اتباع ساتھ ساتھ پڑھنا نہیں، بلکہ انصات و استماع اتباع ہے، شریعت کا محاورہ اتباع میں یہی ہے۔

ثم ان علينا بيانہ' ای ثمان علینا ان تقرأہ' یہ ان تقرأہ تفسیر ہے یعنی اس کا پڑھنا ہمارے ذمہ ہے، مطلب یہ کہ آپ اسے پڑھیں یہ ہمارے ذمہ ہے، شرح کہتے ہیں کہ یہاں راوی سے کچھ تقدیم و تاخیر ہو گئی ہے، یہ تفسیر میانہ کی نہیں قرآنہ کی ہے، بیانہ سے یہاں مراد اس کا کشف و ایضاح ہے، یعنی اس کا وضوح اور تمہین بھی ہمارے ہی ذمہ ہے، بعض نے کہا کہ بیانہ سے مراد ہے آپ کا لوگوں سے قرآن کا بیان کرنا اور تبلیغ بھی ہمارے ذمہ ہے، میرے نزدیک معنی ثانی زیادہ مناسب ہے، اور آیت لتبين للناس ما نزل اليهم کے مناسب ہے اور قرآن کی تفسیر میں ایک آیت کا نظم دوسری آیت سے جتنا قریب ہو اتنا ہی بہتر ہے، اب ان تقرأہ میں تقدیم و تاخیر کا تو اب بھی نہ کرنا پڑے گا اور مطلب یہ ہو گا کہ ان تقرأہ علی الناس ہمارے

ذمہ ہے، اس محدث سے مراد ابن عباس معلوم ہو گئی، پہلے تقرأہ سے حضور کا خود پڑھنا مراد ہے اور دوسرے سے قراءۃ علی الناس اس آیت کے بعد آپ نے پڑھنا چھوڑ دیا اور اسی کے موافق ہے دوسری آیت ولا تعجل بالقرآن من قبل ان یقضی الیک وحیہ و قل رب زدنی علماً (سورہ ظہر) جبریل کے آنے پر آپ صرنا استماع فرماتے اور ان کے جانے کے بعد بدب اسی طرح بعینہ پڑھنے لگتے جس طرح جبریل لائے تھے، یہ آپ کا ایک معجزہ تھا، کیونکہ اس وقت پڑھا نہیں صرف ایک بار سن کر محفوظ کر لیا اور اسی طرح سنایا، یہ محض اللہ کی طرف سے ہے۔

حدیث تو ختم ہو گئی مگر ربط آیات میں اس قدر اشکال و اختلاف ہے کہ شاید تمام قرآن میں ربط آیات میں اتنا اشکال کہیں نہیں، سورہ قیامہ کی آیت ہے مگر سوت سے کچھ تعلق نہیں معلوم ہوتا، لاقمر سے آخر تک پڑھو ایحسب الانسان ان

لن نجتمع عظامہ ' کیا انسان جھٹکے کہ ہم اس کے چورے اور ہڈیوں کو جمع نہ کریں گے ؟ بلیٰ ضرور کریں گے ! قادرین علیٰ
 آن نسویٰ بنانہ ' یعنی ہم تو اس پر بھی قادر ہیں کہ اس کے پورے اور کو اسی طرح کھڑا کریں جیسا کہ پہلے تھا ' چونکہ بنان کی گئی بہت باریک
 ہوتی ہیں اور ان کی درستگی بظاہر شکل معلوم ہوتی ہے اس لئے ان کا ذکر کیا کہ ہمارے لئے کچھ بھی مشکل نہیں ' بل یسید الانسان لیخیر
 امامہ ' یعنی اصل گمان دان کچھ نہیں بلکہ انسان یہ چاہتا ہے کہ فسق و فجور کرنا چلا جائے اور آئندہ کا کچھ کھلکا نہ رہے جزا و سزا کا ۔
 یسئل ایان یوم القیامۃ ' ٹلانے کے لئے استہزاء کہتا ہے کہاں ہے یوم قیامت ' مطلب یہ کہ یہ سب ڈھکوسلے ہیں ' واقعہ کچھ نہیں ،
 فاذا برق البصر پس جب آنکھیں چندھیا جائیں گی و خسف القعر اور چاند بے نور ہو جائے گا ' ادھر اس کی نگاہ بے نور ہوگی ادھر
 چاند بے نور ہوگا و جمع الشمس والقمر یعنی سب کرات ٹکرا دئے جائیں گے اور سج کر دئے جائیں گے ' بعض نے کہا کہ بے نور ہونے
 میں دونوں (شمس و قمر) یکساں ہوں گے ' فرما اذالشمس کوڑت ' نگویر عمار کے بیچ دینے کو کہتے ہیں اور جب لپیٹ دیا جائے گا ،
 تو نور ختم ہو جائے گا یقول الانسان یومئذ ان المفزع یناہ گاہ تلاش کرے گا گر کہاں پائے گا کلا لا وزر الی ربک
 یومئذ المستقر ' ہرگز جانا نہیں سکتا ' کہیں ٹھکانہ نہیں ' حاضری تو رب ہی کے دربار میں دینی ہے ینبئ الانسان یومئذ بما
 قد مر و اخر جتنے اعمال و اقوال و افعال کے ہیں وہ سب تیرے سامنے لا کر رکھ دئے جائیں گے ' اگلے پچھلے سب موجود ہوں گے ،
 بل الانسان علی نفسه بصیرۃ و لوالقی معاذیرہ ' یعنی یہ تو مضابطہ ہے ورنہ ہر انسان کو ساری چیزیں خود ہی نظر آئیں گی ' بعض نے
 کہا کہ اب بھی یہ انسان اپنے اچھے برے کو سمجھتا ہے گو نذر کرتا رہے مگر کوئی عذر مقبول نہ ہوگا ' اب فرماتے ہیں لا تحرك به لسانك
 لتعجل به ' اس سے کوئی بھڑ نہیں معلوم ہوتا ' آگے چل کر پھر قیامت کا ذکر ہے کلا بل متعجبون ' اللہ سے یعنی دنیا کو محبوب
 رکھتے ہو اور آخرت کو چھوڑ دیتے ہو ' آگے آخرت کا بیان ہے ' اس کی پہلی منزل یہاں سے شروع ہوتی ہے کلا اذ ابلیغت الترافی
 یعنی جب سانس نہلیں گی بہو بچ جائے گی و قیل من راق ' اب کون مجاہد چھوٹ کر نہ والا ہے و انفتحت الساق بالساق
 یعنی اپنی پنڈلی پنڈلی پر دے مارتا ہے جانکی کی شدت سے الی ربک یومئذ المساق ' اب تجھے رب کی طرف جانا ہے ' یہ موت
 مقدمہ آخرت ہے ' آگے آخرت پر متنبہ فرماتے ہیں فلا صدق ولا صلف ' ربط کے اعتبار سے یہ مشکل ترین مقام ہے جہاں بعض روئیں
 جو غالی ہیں اس آیت کو لے کر کہتے ہیں کہ اگر کلام الہی ہوتا تو ایسا بے ربط کیوں ہوتا ' معلوم ہو کہ درمیان چیزیں کچھ رہ گئی ہیں (ردائیں میں تین
 گردہ ہو گئے ہیں قرآن کے بارے میں ' ایک فریق جو بہت کم ہے کہتا ہے کہ یہ زیادتی کچھ نہیں ہوئی ' ایک کہتا ہے کہ کی ہوئی ہے اور جو ہے
 وہ قرآن ہی ہے ' جمہور کا قول یہی ہے ' تیسرا فریق زیادت کا بھی قائل ہے ' ہمارے یہاں کے اکثر وہ ہیں جنہیں وثوق نہیں ہے اس کے

قرآن ہونے پر اور اسے یاغی عثمانی کہتے ہیں، گوزبان سے تفسیر اسے قرآن کہتے ہیں، ان کا عقیدہ ہے کہ امام غائب جو ان کے بارہویں امام ہیں وہ غار میں ملی قرآن لے بیٹھے ہیں (امام رازی نے اور دیگر مفسرین نے بحثیں کی ہیں مگر انھما یہ ہے کہ شافی جواب اکثر کتابوں میں نہیں ملتا، حافظ نے فتح الباری میں بحث کی ہے اور رازی کے کلام کو پسند نہیں کیا ہے، علامہ ابن کثیر نے جو کلام نقل کیا ہے وہ میرے نزدیک اوروں سے بہتر ہے، حضرت شاہ صاحب کی بھی ایک تقریر ہے اسے بھی ان شاء اللہ بیان کر دوں گا۔

امام رازي نے ایک قول فقال موزی کا جو کبار شوافع میں ہیں نقل کیا ہے، انھوں نے شان نزول سے قطع نظر نظم قرآن پر منطبق کیا ہے، کہتے ہیں ینبتوا الانسان الخ میں بتلایا جارہا ہے کہ قیامت کے دن انسان کو جب بتلائیں گے کہ تو نے یہ کیا ہے تو اس کے ہاتھ میں کتاب دے دی جائے گی اور کہا جائے گا اقرأ کتابک الخ جب وہ پڑھے گا اپنی کتاب کو تو تلخ ہوگا زبان رکھنے لگی تو تیز تر پڑھنے لگے گا اور گھبراہٹ میں ایسا ہی ہوتا ہے، اس وقت یہ حکم ہوگا لا تحزب بہ الخ یعنی جلدی مت کر جو کھائے وہ سب تو پڑھ لیگا اور اس کا پڑھنا ہمارے ذمہ ہے، یہ توجیہ فقال نے کی ہے گریہ توجیہ بالکل غلط ہے شان نزول کے بھی اور انطباق آیات کے بھی، رازی نے دعویٰ کیا ہے کہ جب یہ آیات سورہ تیار کی نازل ہوئی ہوں گی تو حضور نے پڑھنے میں تعیل کی ہوگی لہذا اسی وقت درمیان میں تنبیہ کر دی گئی جیسے تقریر میں میں متنبہ کر دوں کہ بھائی یاد پھر کرنا اس وقت تو کان لگا کر سن لو، تو واقعہ یہ تنبیہ ہے مگر دیکھنے والا کلام کا کڑا سمجھ گیا، اسی طرح یہاں اصل مقصود اس کا بیان کرنا نہیں بلکہ درمیانی چیز جو کہ دی گئی صرف تنبیہ کے لئے، رازی نے یہ احتمال نکالا ہے مگر اس کے لئے نقل کی ضرورت ہے اور اس صمدت کا پیش آنا ثابت کرنا ہوگا، ان سب میں بہتر ابن کثیر کا جواب ہے کہ ہم نے قرآن کا تتبع کیا تو معلوم ہوا کہ قرآن کتاب کا لفظ ہوتا ہے تو کبھی وہ کتاب مراد لیتا ہے جو عشر میں دی جائے گی اور کہا جائے گا اقرأ کتابک الخ اور کبھی کتاب بول کر قرآن کو مراد لیتا ہے اور ثانی پر عمل کرنے یا نہ کرنے پر اول یعنی کتاب عشر مرتب ہے تو قرآن کی عادت یہ ہے کہ جب کبھی ایک کا ذکر کر لے تو مناسب سے دوسری کا بھی ذکر کر لے، مثلاً سورہ کہف میں ہے و وضع الکتاب یعنی کتاب سلنے رکھ دی جائے گی اور رقم جرموں کو دیکھو گے کہ وہ ڈرتے ہوں گے تو کہیں گے انوس یکسی کتاب ہے کہ اس نے کوئی بڑی چھٹی چیز چھوڑی ہی نہیں سب نے لی ووجدوا ما عملوا حاضرا یعنی سب کا ہوا سامنے ہوگا اور آپ کا رب کسی پر ظلم نہیں کرے گا، یہ کتاب کتاب اعمال ہے، اس کے بعد آدم علیہ السلام کا قصہ مناسبت سے ذکر کیا، اس کے بعد نیا ولقد صوفنا للناس فی ہذا القرآن من کل مثل کہ ہم نے انسانوں کے لئے ہر قسم کی مثالیں اس قرآن میں بیان کر دی ہیں مگر وہ بہت ہی محال ہے، یہ دوسری کتاب یعنی قرآن کا بیان ہوا، تو دیکھو یہاں دونوں کتابوں کا ذکر کیا، کیونکہ دونوں میں مناسبت ہے اس لئے کہ ترتیب

کتاب مشترک اسی کتاب قرآن پر ہے ' اسی طرح سورہ بنی اسرائیل میں ہے 'یومئذ عوکل اناس بامامہم فمن اوتی کتابہ یمینہ الخ یہ کتاب اعمال کا ذکر تھا' درمیان میں کچھ دوسری چیزیں مناسبت سے ذکر فرمائیں ' پھر فرمایا ولقد صوفنا الی۔ من کل مثل ' اسی طرح طہ میں ہے 'یعلم ما بین ایدہم وما خلفہم' — الی — وکذلک انزلناہ قرآنا عربیًا — الی — رب زدنی علماً۔ ان تینوں مقام پر دونوں کتابوں کا یہی کتاب اعمال اور کتاب احکام کا ذکر ساتھ ساتھ ہے ' خواہ بالکل متصلاً خواہ کچھ دور چل کر ' تو اسی طرح سورہ قیامہ میں بھی یہی کیا ہے کہ پہلے کتاب اعمال کا ذکر کیا اور بعد کو کتاب احکام و قرآن کا ' ابن کثیر کہتے ہیں کہ اتنی مناسبت تناسب آیات کیلئے کافی ہے ' یہ تفسیر نبیہ اچھی ہے ۔

سیدی انور شاہ صاحب کی تفسیر کا صاحب سمجھنے سے پہلے ایک مقدمہ سمجھ لو کہ مشکم کی مراد میں کبھی دو ہوتی ہیں ' اول ماسبق لہ الکلام ' ثانی وہ جو مع قطع النظر عن تسلسل الکلام سمجھی جاتی ہے ' خواہ اسبق لہ الکلام ہو یا نہ ہو ' شاہ صاحب کہتے ہیں کہ ماسبق لہ الکلام ہی مراد اول ہے یعنی اولاً بالقصد وہی مراد ہوتا ہے اور جو چیز تسلسل عبارت اور تعدد مشکم سے قطع نظر کر کے خارج سمجھ میں آجائے وہ مراد ثانی ہے ۔

اس مقدمہ کے بعد یوں سمجھو کہ یہاں بھی دو مرادیں ہیں ' اول جو نظم قرآن کہتا ہے اور ثانوی جو حدیث سے سمجھ میں آتی ہو ثانوی مراد یہاں ظاہر ہے جو ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب تسلسل کلام دیکھیں تو وہاں کسی چیز کا ذکر نہیں ' اس لئے مراد اول میرے نزدیک یہ ہے کہ جب معاذ ایان یوم القیامۃ استہزاؤ کہتا تھا اور عادت کفار تھی کہ آپ کو حق کرنے کے لئے سوال کیا کرتے تھے کہ کیوں جناب ! کہ آئے گی ؟ کس دن آئے گی ؟ چنانچہ قرآن نے جواب جان کے اعتراضات کے جوابات دے دیے ہیں ' حضور نے فرمایا آئی گی تو ضرور مگر تعین وقت اللہ کا کام ہے ' یہاں جب فرمایا کہ قیامت آئے گی تو انہوں نے پوچھا کہ آئے گی ایان یوم القیامۃ ؟ تو اس کا کچھ جواب دیا اور علامات بتلائیں فاذا برق البصر — الی — بما قد مر و آخر تو ممکن تھا کہ جب جواب کھول کر نہیں دیا تو حضور کچھ تعمیل فرماتے اور جواب دینا چاہتے اس لئے فرمایا لا تحرف بہ لسانک لتعجل بہ الخ یعنی جتنا ہم نے بتلادیا اتنا ہی کہہ دو ' جتنا ہم مناسب سمجھیں نازل کریں گے ان علینا جمعہ وقرآنہ ' قرآن کا پڑھنا حفظ کرنا ' مع کرنا جیسا مناسب ہوگا ہم دیا ہی کریں گے اور اسی قدر نازل کریں گے جس قدر مناسب ہوگا ' تو یہ مراد اولی ہے کیونکہ تسلسل عبارت سے ہی بتلاتا ہے کہ انہیں اشیاء سے متعلق ہے مگر چونکہ حدیث میں آئی تو یہ مراد ثانی ہوگی ' شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ میں ایسا فرق کرتا ہوں ، تلویع کے حاشیہ پر ایک مقام پر ایسا ہی کیا گیا (یعنی تقسیم کی گئی ہے مراد اولی اور ثانوی کی طرف) یہ اور توجہات سے اقرب ہے ۔

اب ایک چیز یہ اور پیش کرتا ہوں، میں نے کئی سال اس پر غور کیا تو ایک چیز مجھ پر کھلی، میں نے شاہ صاحب سے تذکرہ کیا تو شاہ صاحب نے اس کی تصویب فرمائی، وہ یکہ ربط دینے والے اکثر شان نزول کو ملحوظ رکھ کر قفقے کو مرتبط کرنا چاہتے ہیں اسلئے تطبیق میں کہیں اشکال پیدا ہو جاتا ہے یہ حالانکہ ربط دینیئے کے لئے اس کی ضرورت نہیں بلکہ مضمون آیت کو مضمون آیت سے مرتبط ہونا چاہئے، اگر فقہ کوئی غلطی میں رکھ کر مناسبت دیکھ جائے گی تو وقت پیش آئے گی اور اگر مضمون کا لحاظ رکھا جائے تو پھر وقت نہوگی، قرآن سے مثال سن لو فرماتے ہیں فان تولوا فانی اخاف علیکم عذاب یوم عظیم یعنی اگر نہ مانو گے تو تم پر عذاب کا اندیشہ ہے، آگے فرمایا الی اللہ مرجعکم وهو علی کل شیء قدير، اللہ کی طرف ٹوٹنا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے، پھر فرماتے ہیں الا انھم یشنون صد وھھ الخ آگاہ ہو جاؤ، یہ لوگ اپنے سینوں کو دہرا کئے لیتے ہیں (یشنون دہرا کرتے ہیں) تاکہ اللہ سے چپ جائیں، اس کا شان نزول یوں مذکور ہے کہ کچھ لوگوں پر حیا کا اس قدر غلبہ تھا کہ وہ خلوت میں بھی برنگی کی حالت میں غلبہ میا سے جھک جاتے تھے تاکہ ایک درجہ میں اللہ سے استغفار ہو جائے تو فرمایا: الاحین یتستغشون ثیابہم الخ یعنی اس کے سامنے سب کچھ ہے، وہ کھلا پھپھاب جانتا ہے، وہ تو دلوں میں گزرنے والے خیال کو بھی جانتا ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ حیا کریں بلکہ مطلب یہ ہے کہ غلو نہ کریں کیونکہ اس سے امت پر حرج واقع ہوگا اور یہ اسوہ بننے والے تھے اس لئے آگاہ کر دیا کہ غلوت کرو، اب اس شان نزول کو اس جملے سے کیا تعلق ہے، وہاں عذاب کا ذکر تھا اور یہاں یہ شان نزول ہوا، اب اگر اس فقرہ سے ربط تلاش کیا جائے تو سوائے تخریک کے اور کچھ حاصل نہ ہوگا، لہذا شان نزول کو چھڑ کر نفس آیت کے مطلب پر غور کرو، آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ ہر خفی و عیان کو جانتا ہے، اور اس فقرے کی مناسبت سمجھ کر جب کسی قوم کو ڈرایا جاتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ اس سے باز آ جاؤ ورنہ تمھیں سزا دی جائے گی اور سزا کے لئے تین باتوں کی ضرورت ہے اول یہ کہ مجرم حاکم کے تعذیر میں ہو، اگر بھاگ جائے تو کیسے سزا دے گا، دوم یہ کہ حاکم میں اجراء حکم کی قدرت ہو، اگر میں گورنر کے لئے حکم دوں کہ اسے قتل کر دو تو کیا میرا یہ حکم نافذ ہو جائے گا؟ تو معلوم ہو کہ اجراء حکم کی قدرت بھی ضروری ہے، تیسری ضروری چیز قدرت اور حضور مجرم کے باوجود یہ ہے کہ اس مجرم کا ثبوت بھی ہو، اگر ثبوت نہیں پہنچا اور جرائم ثابت نہیں ہوئے تو سزا کیسے دی جائے گی، تو معلوم ہو کہ حاکم کو علم بھی ضروری ہے تاکہ کہیں غیر واقعہ کو واقعہ نہ سمجھ لے، تو اس کی پوری مصل ہوئی چاہئے اور یہ تینوں باتیں اس میں ضروری ہیں :

(۱) قدرت نفاذ حکم (۲) حضور مجرم (۳) ثبوت و علم

اب اس آیت پر غور کرو فان تولوا الخ کہ اگر تم باز نہ آئے تو عذاب آئے گا، کوئی کہہ سکتا ہے کہ ممکن ہے ہم بھاگ جائیں تو اس کا جواب الی اللہ مرجعکم سب کو تاڑے گا، بھاگ نہیں سکتے وہو علیٰ کل شیء قدير میں دو باتوں کی طرف اشارہ کر دیا، ایک یہ کہ تم بھاگ نہیں سکتے، دوسرے یہ کہ ہم کو سزا دینے کی پوری قدرت ہے، اب یہ احتمال تھا کہ شاید کچھ جرائم اس معنی میں چلائیں مسل میں وہ نہ آسکے ہوں یا ان کی رپورٹ ہی نہ ہو تو اس کا جواب انهم یشنون صدور دھڑا الخ کہ سب کھلے چھپے کا علم رکھتے ہیں، بلکہ نبیوں تک کا علم رکھتے ہیں، اب تینوں چیزیں پوری ہو گئیں: قدرت، حضور، احاطہ علم، اب کیا کوئی مجرم بچ سکا اور ہاں معافی الگ شے ہے، خواہ شفاعت سے یا رحمت سے، دیکھا کتنی اچھی مناسبت ہے مگر اس قصہ سے مناسبت نہیں، تو اصل مقصود احاطہ علم ہے اور وہ ظاہر ہے۔

تو یہ اصول ہے کہ جب ربط پر غور کرو تو نظر کو فقط قصہ پر مقصور نہ رکھو بلکہ قصہ سے قطع نظر کر کے مضمون کو مضمون سے منطبق کرو، پھر ان اشارات کا شکل نہ ہوگا۔

اب آیت بھوت عنہا پر غور کرو کہ مقصود سورت یہاں منکرین مشرکوں کے ہیں جو کہ مستبد سمجھتے تھے کہ جب بڑیاں چور چور ہو جائیں گی اور ان میں انتشار ہو جائے گا تو پھر کیسے انھیں جمع کیا جائے گا، ان کا قول قرآن میں یوں نقل ہوا، من یحیی العظام وہی رمیم تو اس کا جواب دیا کہ ہم قادر ہیں پور پور جمع کر دیں گے، تو حاصل استبعاد یہ تھا کہ متفرق چیزیں کیسے جمع ہو جائیں گی؟ اس کا جواب دیا کہ ہم قادر ہیں، ہمیں کچھ مشکل نہیں، پھر غرض انکار بتلائی کہ اپنے منہ سے میں رہنا چاہتا ہے، آگے کہتے ہیں کہ تم کیا چیز ہو تم تو ان کرات کو جو کہ ڈروں درجہ زمین سے بڑے ہیں اور ان کے فاصلے بھی بہت زیادہ ہیں، انھیں بھی جمع کر دیں گے (جمع کے دونوں معنی کل گذر چکے) یقول الانسان الخ [یعنی انسان] اس وقت کہے گا اب کہاں جاؤں کھلا لاؤں؟ الخ یعنی ہرگز نہیں، اب کہیں مگر نہیں پھر تم کہے فرمایا ینبئہ الانسان الخ یہاں بھی جمع مراد ہے کہ لفظ نہیں، اس تھوڑی سی زندگی میں اپنی زبان سے جو کچھ کہا ہے کوئی اس کے معلوم کرنے پر قادر ہے؟ کوئی قادر نہیں، مگر ان بیشک قادر ہے اور وہ یقیناً کوئی جمع کر دے گا بلکہ تو خود دیکھ لے گا تو کوئی ہی عذر کرے مگر کوئی عذر چل نہ سکے گا، اس جمع میں کوئی چیز متروک نہ ہوگی کہ اتنا تعالیٰ لا یغادر صغیرۃ ولا کبیرۃ الا احصیہا اب تو کوئی چیز یاد نہیں رہتی مگر وہاں سب آنکھوں کے سامنے آجائیں گی، تو تین جمع آئے، دو جگہ لفظ جمع لائے اور تیسرے مقام پر کوئی لفظ جمع نہیں لائے مگر یہ جمع ان دونوں جمع سے بڑھ کر ہے کہ ایک ایک چیز معمول سے معمولی بھی موجود ہوگی۔

اب اس کا ایک نمونہ یہاں ذکر کیا ہے کہ سب سے زیادہ اس پر استبعاد ہوگا کہ کیسے جمع ہو جائیں گے تو اس کا نمونہ بتلاتے ہیں

لا تحرك به لسانك، یعنی زبان مت ہلاؤ اور سننے رہو، اکثر شروع کے کوثر نازل ہوتے تھے اور ایسے حال میں پہاڑ کا سا بوجھ حضور پر ہوتا تھا ایسی شدت و ثقل کے وقت حکم ہوتا ہے کہ زبان نہ ہلاؤ، ہمارے ذر ہے اس کا اعادہ کرنا اور حفظ کرنا، تو کیا یہ عجیب بات نہیں کہ اس کو تمہارے سینے میں جمع کر دیا، یہ جو تھامنے کا جو آخرت میں ہوں گے تو جو خدا اس جمع پر قادر ہے وہی خدا آخرت میں بھی جمع کر دے گا۔ اور صغیر و کبیر سب سامنے آجائے گا بعد انقضاء کے جیسا کہ قرآن بعد انقضاء ذہاب جبریل آپ کے سینے میں محفوظ رہتا ہے، تو حقیقت درمیان میں ایک نمونہ پیش کر دیا اور اس کے بعد وہی تفسیر شروع کر دیا اور یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ فرمایا: سبھن الذی الصدی ایضاً یہ آیت سفر معراج کے سلسلہ کی ہے مگر آیت میں ہل معراج کا ذکر نہیں کیا صرف اسرار کا ذکر کیا اسرار کہ کمرہ سے بیت المقدس تک کے سفر کو کہتے ہیں اور معراج بیت المقدس سے صعودی السموات وغیرہ کو، دونوں میں یہ فرق ہے، تو یہاں یہ نہیں کہا کہ کمرہ سے سفر و انجلیا تک لے گیا، یہاں صرف اتنا ذکر ہے کہ مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) تک لے گیا، لکنہ اس میں یہ ہے کہ مکہ والوں کو بیت المقدس کا تجربہ تھا اس لئے کہا گیا کہ جب اس کی تصدیق کرو گے تو آگے تصدیق کرنے میں کیا تردد رہ جائے گا، چنانچہ ایسا ہی ہوا اور انھوں نے کہا کہ آسان کا حال تو ہمیں معلوم نہیں مگر بیت المقدس ہم نے دیکھا ہے، بتاؤ اس میں کتنے طاقے اور کتنے ستون ہیں، سوچو کیا نبی علیہ السلام بیت المقدس اس لئے گئے تھے کہ وہاں طاقے اور ستون گنیں، مگر کفار کو حق کرنا منظور تھا اس لئے اس قسم کے فوسوال کئے، صحیح مسلم میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ مجھے سخت کرب لاحق ہوا اور ایسا کرب کبھی لاحق نہیں ہوا تھا مگر اللہ نے مجھے عظیم میں کھڑا کر دیا اور بیت المقدس میرے سامنے منکشف فرما دیا اور میں نے ان کے سوالات کے جوابات دیکھ دیکھ کر دے دے حتیٰ کہ ایک قافلہ کا واقعہ بیان فرما دیا کہ فلاں مقام پر ہے وہاں بران نے ٹانگ مار کر ان کا پانی گرا دیا تھا، جب قافلہ پہنچا تو پوری پوری تصدیق کر دی، تو اب اس سے انکشاف علی الاسرار کی حکمت معلوم ہوگئی اور جب اسرار کو ان لیا تو پھر آگے تسلیم کر لینے میں کیا تاہل رہ گیا، کیونکہ اس وقت ہوائی جہاز تو تھے نہیں، پھر ایک شب میں آنا طویل سفر کر لینا بلا معجزہ کے کیونکر ہو سکتا ہے لہذا جب اسے تسلیم کر لیں گے تو آگے انکار کی گنجائش نہ ہوگی، تو کبھی بڑے واقعہ کو دشین کرنے کے لئے چھوٹا واقعہ دکھلا دیتے ہیں، اس دنیا میں قیامت کے معاملات نظر نہیں آسکتے مگر ایک چھوٹا سا واقعہ ہے کہ اللہ تمہارے سینے میں قرآن اس طرح جمع فرماتا ہے جو اس کی قدرت کا ملکہ نمونہ ہے تو وہی اللہ حشر میں جمع پر بھی قادر ہے، یہ اپنی سمجھ میں آتا ہے اور اس میں کچھ تعجب کرنا نہیں پڑتا اور حدیث بھی اپنی جگہ پر مبنی ہے مگر صرف یہ کرنا پڑتا ہے کہ قصہ سے ربطات دو جگہ مضمون کو مضمون سے ربط دو لائن علم کا

عہ زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا واقعہ یاد کرو، یہ مجھے گذر چکا ہے۔

۵۔ حَدَّثَنَا عَبْدَانُ قَالَ أَخْبَرَنَا عَبْدُ اللَّهِ قَالَ أَخْبَرَنَا يُونُسُ عَنْ

ابن زہری سے بیان کیا عبدان نے کہا ہم کو خبر دی عبد اللہ ابن مبارک نے کہا ہم کو خبر دی یونس نے

وَحَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ مُحَمَّدٍ قَالَ أَخْبَرَنَا عَبْدُ اللَّهِ قَالَ أَخْبَرَنَا يُونُسُ

ابن زہری سے دوسری سند اور ہم سے بشر بن محمد نے بیان کیا کہا ہم کو خبر دی عبد اللہ ابن مبارک نے کہا ہم کو خبر دی یونس اور

وَمَعْمَرُ مَخْوَرَةٌ قَالَ عَنِ الزَّهْرِيِّ أَخْبَرَنِي عَبْدُ اللَّهِ ابْنُ عَبْدِ اللَّهِ عَنْ ابْنِ

معمر نے ان دونوں نے زہری سے انہ اس کے زہری نے کہا مجھ کو عبد اللہ ابن عبد اللہ نے خبر دی انہوں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما

عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا قَالَ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَجْوَدَ

سے سنا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سب لوگوں سے زیادہ سخی تھے اور رمضان میں تو جب جبریلؑ آپ سے

النَّاسِ وَكَانَ أَجْوَدَ مَا يَكُونُ فِي رَمَضَانَ حِينَ يَلْقَاهُ جَبْرِيلُ وَكَانَ يَلْقَاهُ فِي

ملا کرتے بہت ہی سخی ہوتے اور جبریلؑ رمضان کی ہر رات میں آپ سے ملا کرتے اور آپ کے ساتھ

كُلِّ لَيْلَةٍ مِنْ رَمَضَانَ فَيُدَارِسُهُ الْقُرْآنَ فَلِرَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

قرآن کا دور کرتے غرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم (لوگوں کو) بھلائی پہنچانے میں چلتی ہوا سے بھی

أَجْوَدَ بِالْخَيْرِ مِنَ الرِّيحِ الْمُرْسَلَةِ

زیادہ سخی تھے ۔

قولہ عبدان، یہ تثنیہ ہے عبد کا اور علم ہے ۔

قولہ مخوہ : بظاہر منبع مذکور نہیں ، مگر اکثر ایسا ہوتا ہے ۔

كان أجود الناس : یعنی حضور بہت سخی تھے ، جو کہ کثرت مال کا نام نہیں بلکہ غنی قلب کا نام ہے اور اس میں چھوٹا

آدمی بھی بڑے مالدار پر سبقت لے جا سکتا ہے چنانچہ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کا واقعہ مشہور ہے کہ جب حضورؐ نے مال کا چندہ کیا تو عمرؓ سمجھ کر

آج میں ابوبکرؓ سے بڑھ جاؤں گا کیونکہ میرے پاس بہت مال ہے اور وہ خالی ہاتھ ہیں ، آدھا مال لائے ، حضورؐ نے پوچھا کتنا لائے ؟

عرض کیا نصف ، ابوبکرؓ بھی اپنا مال لائے ، ان سے پوچھا کتنا لائے ؟ جواب دیا سب لے آیا ، گھر میں اللہ و رسول کا نام چھوڑ آیا ہوں !

عمرؓ کہتے ہیں مجھے یقین ہو گیا کہ ابوبکرؓ سے کبھی نہیں بڑھ سکتا ، تو دراصل غنی کا تعلق قلب سے ہے ، جو دو سخا میں فرق ہے ، سخا میں

خرچ کرنے والے کو اپنا فائدہ بھی مد نظر ہوتا ہے خواہ اسی قدر ہو کہ میری شہرت ہوگی ، لوگوں میں عزت ہوگی ، میری بات چلے گی وغیرہ ۔ اور

جو اسے کہتے ہیں کہ اس میں اپنا کچھ حصہ نہ ہو، حفظ نفس سے خالی ہو، یہ بات حضورؐ میں بطریق اکمل تھی، اسی کو فرماتے ہیں کہ حضورؐ اجداد اس تھے اور اس کا نظور خاص طور پر رمضان میں ہوتا تھا، اس میں آپؐ اپنے جو میں اور اضافہ فرماتے تھے، چنانچہ آتا ہے کہ رمضان میں جو کچھ چیز کو انکا آپؐ دے دیتے تھے۔ جو کے معنی شریعت میں اعطاء ما ینبغی لمن ینبغی ہیں تو اب صرف مال پر انحصار نہ رہا اور آپؐ کی جو اس پر منحصر نہ تھی بلکہ آپؐ کی جو وہ ہے کہ حق تعالیٰ کی طرف سے جو علوم آب کو ملے تھے وہ ہم تک پہنچانا اور ہدایت کرنا آگے کہتے ہیں کہ دیکھ کیا تھی؟ وجہ یہ تھی کہ جبریلؑ رمضان کی ہر رات میں آتے تھے اور قرآن کا دور کرتے تھے۔

(مَدَامَسَّہ: دور کرنا) جبریلؑ کا یہ معمول محکم الہی تھا، ملا علی قاریؒ نے اس لفظ دارستہ ایک مسئلہ نکالا ہے، شرح تقایہ میں لکھتے ہیں کہ قرآن کا ایک ختم سنون ہے، رمضان تک ہر سال جتنا قرآن اتر چکا تھا اس کا دور کر لیا کرتے تھے، اور جب قرآن سب اتر چکا تو سب کا دور کیا اور آخری عمر میں دو دور کئے اور اعتکاف میں بھی زیادتی کی، چنانچہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا سے آپؐ نے فرمایا بھی تھا کہ اب میں عنقریب رحلت کر جاؤں گا کیونکہ اس سال جبریلؑ نے دو دور کئے۔ مگر میں اس استدلال سے خوش نہیں ہوں کیونکہ تصریح ہے کہ ایک رمضان سے دوسرے رمضان تک جس قدر اترتا تھا اس کا دور کرتے تھے، سارے قرآن کا دور ثابت نہیں ہاں صحابہؓ کے آثار بیشک ختم قرآن کے ہیں، دارستہ غالباً نماز میں تھی، کیونکہ جاب صغیر میں حدیث ہے کہ نماز میں قرآن افضل ہے خارج سے، تو بات سمجھ میں نہیں آتی کہ حضورؐ ہمیشہ مریح پر عمل کرتے اور افضل کو ترک کرتے رہے ہوں، وجہ جو فی رمضان نازل یعنی جبریلؑ علیہ السلام بھی تھے اور نزول پر (قرآن) بھی اور وقت نزول (رمضان بھی) دارستہ وذاکرہ بھی، یہ سارا مجموعہ جوہر کا سبب تھا (ابن حجر)

نزول جبریلؑ خود برکت ہے، رمضان وقرآن بھی سبب رحمت ہے تو اس مجموعہ سے جوہر کی زیادتی ہوتی تھی، اکثر علماء وفضلا کا خیال ہے کہ کسی خاص جگہ یا زمان میں فضیلت نہیں بلکہ اس میں فعل سے عظمت وفضیلت ہوتی ہے جیسا کہ ماہ رمضان کہ خود اس میں فی نفسہ عظمت نہیں مگر چونکہ نزول قرآن اس میں ہے اس لئے وہ عظمت کی چیز ہے یا جیسے خانہ کعبہ کی عظمت، مگر متعین کا خیال ہے کہ مکان و زمان میں فی نفسہ بھی عظمت وفضیلت ہے اور نزول قرآن وعبادت باعث زیادتی ہے، چنانچہ ابن قیمؒ نے زاد المعاد کے شروع میں بہت عمدہ بحث کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ فی نفسہ اس کے اندر فضیلت ہے گو نزول قرآن وعبادت سے زیادتی ہو جاتی ہے، آیت ورتب

عہ اور وہ بالکل گری ہوئی بھی نہیں ہے۔

۶۔ حَدَّثَنَا أَبُو الْيَمَانِ الْحَكَمُ بْنُ نَافِعٍ قَالَ أَخْبَرَنَا شُعَيْبٌ عَنِ الزُّهْرِيِّ

ہم سے بیان کیا ابو الیمان حکم بن نافع نے کہا ہم کو خبر دی شعیب نے انھوں نے زہری سے
 قَالَ أَخْبَرَنِي عَبْدُ اللَّهِ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُثْمَةَ بْنِ مَسْعُودٍ أَنَّ عَبْدَ اللَّهِ بْنَ
 کبا خبر دی مجھ کو عبد اللہ ابن عبد اللہ ابن عتبہ ابن مسعود نے ان سے عبد اللہ ابن عباس نے بیان کیا ،
 عَبَّاسٍ أَخْبَرَهُ أَنَّ أَبَا سَفْيَانَ بْنَ حَرْبٍ أَخْبَرَهُ أَنَّ هِرْقَلَ أَرْسَلَ إِلَيْهِ
 ان سے ابوسفیان ابن حرب نے کہا کہ ہرقل (روم کے بادشاہ) نے ان کو تشریف کے اور کئی سواروں کے ساتھ

يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ وَيَخْتَارُ سے استدلال کیا ہے یعنی پہلے پیدا کر دیتا ہے اور پھر وہ چھانٹ لیتا ہے اور وہ اسے جانتا ہے تو کیا
 اختیار کرنا اور چھانٹنا بلا کسی حکمت کے ہے؟ اور لفظ یختار بملتا ہے کئی نفسہ فضیلت ہے اس کے بعد جو میں آکر لکھا ہے کہ کیا گلاب
 و بول اپنی ذات سے کیساں ہیں ؟ صرف خوشبودار و بوکا فرق ہے ؟ نہیں ! ہرگز نہیں ! پس جس طرح بول اور گلاب میں فرق ہے
 اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ فرعون و موسیٰ علیہ السلام میں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور ابو جہل میں فرق ہے ، پھر فرماتے ہیں
 هَذِهِ اعْظَمُ جَنَاحَاتِ الْمَلَائِكَةِ عَلَى الشَّرِيعَةِ ' یعنی یہ کہ سب جگہیں اور سب زمانے برابر ہیں اللہ نے جو کچھ فلاں زمانہ میں
 یا فلاں مکان میں یہ کام کر دیا اسے اس میں فضیلت آگئی یہ بالکل غلط ہے ' یہی تحقیق قبلہ نما میں مولانا قاسم نانوتوی رحمہ اللہ نے لکھی ہے اور یہ بہت
 بہتر ہے اور یہی حق ہے اور جس نے اس کے خلاف کہا وہ یقیناً درست نہیں ، کیا لیلۃ القدر اور تمام راتیں برابر ہیں ؟ ہرگز نہیں ، تو کیا لیلۃ القدر
 میں فضیلت محض عبادت سے ہے ؟ نہیں بلکہ عبادت اس میں اس لئے ہوئی کہ اس میں خود فضیلت تھی ، اسی طرح رمضان کی فضیلت صرف اس
 وجہ سے نہیں کہ اس میں نزول قرآن ہوا بلکہ نزول قرآن اس میں اس لئے ہوا کہ وہ فی نفسہ افضل تھا ، اس میں نزول قرآن سے شرف میں اضافہ ہو گیا ،
 اب تم نے چند آیات سے استدلال کیا ہے منجملہ ان کے آیت اللہ اعلم وحیث یجعل رِسَالَتَهُ ^(۱) ہے اس کے علاوہ اور بھی ہیں مگر
 یہاں نقل کی گنجائش نہیں ، میں نے مستقل طور پر اس فصل کا خلاصہ کیا ہے من شارح فیطالع ^(۲)

تو یہ دلیل راتی ہے ہی نہیں ، یعنی نزول قرآن فی رمضان لم نہیں ہے فضیلت رمضان کی ، کہ رمضان میں فضیلت نزول قرآن سے
 آئی بلکہ نزول ان سے کہ نزول اس لئے ہوا کہ رمضان میں فضیلت تھی ، اس کو یوں سمجھو کہ انسان پر جو روح فاضل ہوئی وہ بیل کو یوں نہیں دی گئی ؟
 اس لئے کہ اس کا نقشہ اسی کا مقتضی ہے ورنہ پھر حکمت کے کوئی معنی ہی نہ ہوں گے ۔

قوله 'اجود من الریح المرسلة' یعنی جس طرح ہوائے تمام مخلوق کو فیض پہنچتا ہے اور بے روک ٹوک سب کو پہنچتا ہے، اسی طرح ہمارے بھی زیادہ فیض ہوتا تھا حضور کا رمضان میں۔

حدیث ابو الیمان: سیدنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ مفصل تصدیق کر رہے ہیں اس وقت کا جب کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بادشاہوں کو دین کی دعوت دی تھی، حاصل تصدیق ہے کہ مسلمانوں میں جب صلح حدیبیہ ہوئی جس کا مفصل واقعہ ان شاندار مذاہن میں آئے گا۔ تو معاہدہ ہوا کہ دس سال تک طرفین سے لڑائی بند رہے گی اور بھی بہت سی شرائط تھیں اور بظاہر اکثر شرطیں اہل اسلام کے مفادات تھیں بخلہ ان کے (ایک شرط یہ تھی) کہ اگر (کوئی کافر) مسلمان (ہو کر بھی) مدینہ جائے تو واپس کرنا پڑے گا اور اگر کوئی مسلمان (کھچا آئے) تو واپس نہ کیا جائے گا۔ تو بظاہر اس میں غلو بہت نظر آ رہی ہے مگر اللہ نے اسے فتح میں کہا ہے: (لَا تَحْزَنْكَ فَتْحًا مُبِينًا) اسی میں نازل ہوئی، حضرت عمر کو اس سے بہت تشویش تھی اس لئے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے پاس جا کر سوال کیا تو انھوں نے جواب دیا اللہ اور اس کا رسول خوب جانتا ہے، پھر جب نزول آیات ہوا تو حضور نے حضرت عمر کو بلا کر سنایا اس وقت بھی حضرت عمر نے وہی کہا کہ یا رسول اللہ یہی فتح میں ہے، آپ نے فرمایا ہاں یہی ہے، درحقیقت یہ فتح تھی کیونکہ کفار اب تک مسلمانوں کی طاقت تسلیم نہ کرتے تھے اور اب (ان کی طاقت) تسلیم کر لی، ایک فتح (تو یہی) ہے، نیز اب احتیاط ہوا اہل اسلام اور اہل کفر میں، صحبتوں سے ان کے اخلاق و تقویٰ وغیرہ کا حال معلوم ہوا تو کثرت سے مسلمان ہو گئے اور یہی معاہدہ سبب بنانے کا کہ دو سال بعد قریش نے نقص عہد کیا، حضور نے چڑھائی کی اور مسلمانوں میں کو فتح کر لیا، تو مسلمانوں میں صلح حدیبیہ مسلمانوں میں عہد القضا، مسلمانوں میں فتح مکہ، مسلمانوں میں حجۃ الوداع، معاہدہ گودس سال کا تھا مگر چونکہ قریش نے نقص عہد کیا اس لئے حضور نے کو فتح فرمایا، ابوسفیان رضی اللہ عنہ ہمیشہ جنگ کرتے رہتے تھے، بدر کی لڑائی انھیں کی وجہ سے ہوئی تھی کیونکہ یہ تجارت کے لئے شام گئے تھے تو یہی سبب بنے تھے، اسی جنگ انھوں نے شرکت کی تھی اور کہا تھا کہ آج ہم نے بدر کا بدلہ لے لیا، اسی طرح ہمیشہ جنگ کی تیاری کرتے رہتے تھے، جب صلح ہو گئی تو ہر شخص مطمئن ہو گیا اور اب موقع ملا تجارت وغیرہ کا، ابوسفیان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے شام کا ارادہ کیا اور ایک تلافی لے کر چل دیا، بعض روایات میں ہے کہ میں آدمی اور تھے اور بعض روایات میں ہے کہ میں آدمی اور تھے، ادھر یہ زمانہ ہوا اور حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تبلیغ کا کام شروع کیا اور تمام مسلمانین کے پاس تھامہ روانہ فرمائے تاکہ جنت تمام ہو جائے چنانچہ مصر و بحرین وغیرہ بھی قاصد بھیجے، عرب سے بڑی اس وقت دو سلطنتیں تھیں، ایک فارس (کی) دوسری روم (کی) اہل فارس جو کسی تھے اور اہل روم نصاریٰ، لفظ روم اکثر نصاریٰ کے لئے ہی بنا پڑا ہے، مگر یہ حقیقت نہیں، روم وہ قوم تھی جو ایشیائے کوچک کو چمک سکتی تھی، اہل عرب بھی تھے اور اس کا پایہ تخت روم اکبر تھا جو اب بھی ایطالیہ کا پایہ تخت ہے، اہل عرب اسے روم کہتے ہیں، قسطنطنیہ تک

پہلے ایک ہی ملک تھا، جب آپس میں اختلاف ہوا تو پھر قسطنطنیہ دار السلطنت بن گیا اس ملک کے حکمران کا نام ہرقل ہے اور قیصر اس کا لقب ہے، اس کے پاس بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قاصد بھیجا اور ایران بھی مگر سلاطین کبار میں سے کسی نے دعوت قبول نہ کی ہاں ایک دو چھوٹے موٹے (والیان ملک) نے قبول کر لیا جیسے والی حبشہ شاہ نجاشی نے [دعوت] قبول کر لی [ہاں] ان بڑوں میں باہم اتنا فرق تھا کہ بعض نے نامہ رسول کی توقیر کی اور بعض نے تذلیل کی، کسریٰ شاہ ایران نے آپ کے نام مبارک کو چاک کر دیا اور ہرقل نے بہت تعظیم کی اور اعتراف کیا کہ یہ وہی ہیں جن کا ذکر اور جن کی بشارتیں کتب سابقہ میں ہیں، مجھے یقین تھا کہ ایک نبی ظاہر ہونے والا ہے مگر میں یہ نہ سمجھتا تھا کہ وہ تم میں سے ہوگا۔ اور کہا وہ میرا ملک ضرور فتح کرے گا، اس نے قوم کو دعوت دی مگر قوم نے قبول نہ کیا اور یہ خود ہوس ملک میں چنس گیا۔

حافظ کہتے ہیں کہ یہ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام مبارک بہت تعظیم سے محفوظ رکھتے تھے اور یہی اوداد کو وصیت کرتے تھے کہ اسے محفوظ رکھنا، جب تک محفوظ رکھو گے تم محفوظ رہو گے، جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دونوں اطالیا میں پہنچیں تو کسریٰ کے بارے میں فرمایا [جیسے اس نے میرا نام چاک کر دیا اسی طرح] اس کا ملک چاک کر دیا جائے گا۔ اور قیصر کیلے فرمایا تھا واما هؤلاء فستکون لہم بقیۃ۔ لوگ روم خوبصورت اور حسین لوگوں کے ہاتھ سے نامہ قبول کرتے تھے، اگر یہ المنظر اور بد صورت لوگوں کے ہاتھ سے قبول نہ کرتے تھے، حضرت وحیہ بہت خوبصورت تھے [اسی لئے ان کو نامہ بری کی خدمت سپرد فرمائی گئی] میں سمجھتا ہوں کہ اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے اللہ کی طرف سے جو سفیر آیا کرتا تھا وہ وحیہ کی شکل میں آتا تھا، اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تفاؤلاً حضرت وحیہ قاصد منتخب فرمایا تاکہ فی الجملہ مناسبت ہو جائے سفیر اللہ اور سفیر رسول اللہ میں قاعدہ یہ تھا کہ بڑے بادشاہ کوئی نامہ بلا واسطہ قبول نہ کرتے تھے، اس لئے [حضرت وحیہ] حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام مبارک حارث ابن ابی اشمر [عسائی] کے پاس لے گئے، حارث کو عظیم بھڑکی کہتے تھے (بھری ایک ٹہر ہے) مدینہ اور دمشق کے درمیان) وہاں کا یہ رئیس تھا، اور اسی کو ملک غسان بھی کہتے ہیں حسن اتفاق سے قیصر اس وقت بیت المقدس آیا ہوا تھا اور آنے کی وجہ یہی کہ فارس و روم میں لڑائی چھڑی تھی اور رومی مغلوب ہو گئے تھے، اس کو کہ والوں کو خوشی ہوئی تھی کیونکہ ان کو قرب تھا جو بیویوں سے اہل اسلام کو رنج ہوا تھا انہوں نے یہ آیات نازل فرمائیں غَلَبَتِ الرُّومُ فِیْ اَدْنٰی الْاَرْضِ وَلَکِنَّ الْاَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ (۲) چنانچہ ایسا ہی ہوا، چند برسوں میں اللہ نے حالات بدلے اور رومیوں کو فتح حاصل ہوئی، مسلمانوں کو خوشی

فِي رَكْبٍ مِنْ قُرَيْشٍ وَكَانُوا تَجَّارًا ابِلِشَامِ فِي الْمَدَّةِ الَّتِي كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى

ﷺ اوجھا اور یہ قریش کے لوگ اس وقت شام کے ملک میں سوداگری کے لئے گئے تھے اور یہ وہ زمانہ ہے جس میں آنحضرت

اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا دَفِيهَا ابِاسْفِيَانِ وَكَفَّارَ قُرَيْشٍ فَاتَوْهُ وَهُمْ بِإِيلِيَاءِ قَدَّ عَاهُمُ

صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوسفیان اور قریش کے کافروں کو (مٹ کر کے) ایک مدت دی تھی، غرض یہ لوگ اس کے پاس پہنچے جب ہرقل اور اسکے

فِي فِجْلِسِهِ وَحَوْلَهُ عُظَمَاءُ الرُّومِ ثُمَّ دَعَاهُمْ وَدَعَا بِتَرْجُمَانِهِ فَقَالَ أَتَيْكُمْ أَقْرَبُ

ساتھی ایلیا میں تھے، ہرقل نے ان کو اپنے دربار میں بلایا اور اس کے گرداگرد روم کے رئیس بیٹھے تھے، پھر ان کو (پاس) بلایا اور اپنے مترجم کو بھی

نَسَبًا يَهْدِي الرَّجُلَ الَّذِي يَزْعُمُ أَنَّهُ نَبِيٌّ، قَالَ ابُوسُفْيَانٍ فَقُلْتُ أَنَا أَقْرَبُهُمْ نَسَبًا

بلایا، وہ کہنے لگا (اے عرب کے لوگو!) تم سے کون شخص اس کا نزدیک کا رشتہ دار ہے جو اپنے میں پیغمبر کہتا ہے، ابوسفیان نے کہا میں اس شخص کا

فَقَالَ أَذْنُؤُهُ مِنِّي وَقَرِيبُوا أَصْحَابَهُ فَاجْعَلُوهُمْ عِنْدَ ظَهْرِي، ثُمَّ قَالَ لِيَرْجُمَانِهِ قُلْ لَهُمْ

قریب کا رشتہ دار ہوں، تب ہرقل نے کہا اچھا اس کو میرے پاس لاؤ اور اس کے ساتھیوں کو بھی (اس کے) نزدیک رکھو اس کے پیچھے پر، پھر

إِنِّي سَأَلْتُ هَذَا عَنْ هَذَا الرَّجُلِ فَإِنْ كَذَبَنِي فَلَذِبُوهُ فَإِنَّهُ لَوَلَا الْحَيَاءُ مِنْ أَنْ يَأْتِرُوا

اپنے مترجم سے کہنے لگا ان لوگوں سے کہیں اس سے (ابوسفیان سے) اس شخص کا (پیغمبر صاحب کا) کچھ حال پوچھنا ہوں، اگر یہ مجھ سے جھوٹ بولے

عَلَى كَذِبٍ أَلَا كَذَبْتُ عَنْهُ، ثُمَّ كَانَ أَوَّلَ مَا سَأَلَنِي عَنْهُ أَنْ قَالَ كَيْفَ نَسَبُهُ فَبَيَّكُمُ

تو تم کہہ دینا مجھ کو، ابوسفیان نے کہا تم خدا کی اگر مجھ کو یہ قسم نہ ہوئی کہ یہ لوگ مجھ کو جھوٹا کہیں گے تو میں آپ کے باب میں جھوٹ کہہ دیتا، خیر

پہلی بات جو اس نے مجھ سے پوچھی وہ یہ تھی کہ اس شخص کا تم میں خاندان کیسا؟

ہوئی اور یہ خوشی دو بالا ہوگئی اس سے کہ اسی وقت بدر میں مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی تھی۔

ایک تفسیر یہ ہے کہ روم کی فتح کی وجہ سے مسلمانوں کو خوشی ہوئی تو نصرت گو (جنگ) بدر (کے سال) میں ہو چکی تھی مگر فتح

نہیں ہوئی تھی، جنگ جاری تھی، سترہ ہجری میں کامل فتح ہوئی اور فتح کی عجیب صورت ہوئی کہ فارس کے سپہ سالار قیصر سے سازش کر لی

اور فتح قیصر سے مل گیا، تو قیصر کو مکمل فتح ہوگئی، قیصر نے نذرانی تھی کہ اگر مجھ کو فارس پر فتح حاصل ہوئی تو میں تم سے ایسا

(بیت المقدس) تک پایادہ جاؤں گا، چنانچہ اسی نذر کو پورا کرنے کے لئے بیت المقدس گیا تھا، مورخین نے لکھا ہے کہ اس کی آمد پر راستہ میں

(۱)۔ حصہ، شام کا ایک بڑا شہر ہے۔

فرش بچائے گئے تھے اور پھول ڈالے گئے تھے تاکہ پاؤں میں چھلے نہ پڑیں ' ادھر [قیصر الیاء] پہونچا اور ادھر نامہ مبارک اللہ کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کا پہونچا اور اسی وقت حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ ایک قافلہ کے ہمراہ تجارت کے لئے [ملک شام] پہونچے تھے اور غزہ میں ٹھہرے ہوئے تھے [یہ عجیب اتفاق تھا کہ سب کا اجتماع ہو گیا] معلوم ایسا ہوتا ہے کہ خط پہونچنے سے پہلے ہی [بشت نبوی کی] کچھ خبریں [قیصر کو] پہونچ چکی تھیں ' جب خط پہونچا تو اس نے کہا کہ کیا اس ملک میں کوئی ایسا ہے جو نسب میں حضور کا شریک ہو اور حضور کے حال سے خوب واقف ہو! پھر تلاش شروع ہوئی تو حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ لے جو اس وقت مہلمان : تھے بلکہ پورے مقابل [اور حریف] تھے ' انھوں نے کہا کہ میں پوری طرح واقف ہوں ' چنانچہ یہ فتح قافلے کے چلے .

مَنْ كُنْتُ . اِسْمُ حَسَبِ .

مَاذَا . مصالحت کی .

نَاوَقَ . یعنی لوگ ہرقل کے پاس گئے ' ضمیر منصوب ہرقل کی طرف لٹکتی ہے ' یہی بہتر ہے .

وَهُمْ بِأَيْلِيَاءَ . ایل اللہ کو کہتے ہیں اور یا ، شہر کو ' یعنی اللہ کا شہر جیسے ہم بیت اللہ کہتے ہیں .

جب یہ پہونچے تو بڑے بڑے حکام متح تھے ' انھیں میں ان کو بھی بھلا دیا .

ثُمَّ دَعَاهُمْ ' پہلے اپنے دربار میں بلایا اور پھر اپنے قریب بلایا اور ترجمان کو بھی بلایا (ترجمان بضم تار اور بفتح تاء دونوں

ہیں اور دونوں صبیح ہیں) اور سب سے پہلے یہ سوال کیا کہ تم لوگوں میں کون ایسا ہے جو مرسل سے نسب میں زیادہ قریب ہو ' یہ اس کے کمال عقل کی بات تھی کیونکہ گھر کا آدمی خوب واقف ہوتا ہے اور اس کا اعتقاد شکل سے جتنا ہے اس لئے اس نے اقرب کی تلاش کی ' ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں اقرب ہوں ' چوتھی پشت میں ان کا سلسلہ نسب حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مل جاتا ہے ' ان کا نام مصرعے نسب یہ ہے : مصرع بن حرب ابن امیہ ابن عبد شمس ابن عبد مناف .

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نسب ہے : محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بن عبد اللہ بن عبد المطلب بن ہاشم بن عبد مناف .

یہ سن کر ہرقل نے کہا کہ انھیں ہمارے اور قریب کر دو اور ان کے ساتھیوں کو بھی قریب کر دو مگر اس طرح کہ ان کی پیٹھ کے پیچھے بٹھاؤ اور غرض اس سے اس کی یہ قہمی کہ جھوٹ نہ بول سکیں ' چنانچہ اسی روایت میں ہے کہ قیصر نے ان کے رنقار سے کہا تھا کہ اگر یہ جھوٹ کہیں تو تم گذیب کر دینا کیونکہ سامنے سے گذیب میں ذرا حیا آتی ہے اور یہ اہل غریب میں بہت سخت تھا کہ جھوٹ بولیں ' وہ جھوٹ نہیں بولتے تھے چنانچہ گردن کٹ جائے .

قُلْتُ هُوَ فِينَاذُ وَنَسَبٍ قَالَ فَهَلْ قَالَ هَذَا الْقَوْلَ مِنْكُمْ أَحَدٌ قَطُّ قَبْلَهُ قُلْتُ لَا

میں نے کہا کہ اس کا خاندان تو ہم میں جڑا ہے، کہنے لگا کہ اچھا پھر یہ بات (کہ میں پیغمبر ہوں) اس سے پہلے تم لوگوں میں کسی نے کہی تھی؟ میں نے
 قَالَ فَهَلْ كَانَ مِنْ آبَائِهِ مِنْ مَلِكٍ قُلْتُ لَا قَالَ فَاشْرَافُ النَّاسِ يَتَّبِعُونَهُ أَمْ
 کہا نہیں، کہنے لگا اچھا اس کے بزرگوں میں کوئی بادشاہ گذرا ہے؟ میں نے کہا نہیں، کہنے لگا اچھا بڑے آدمی (امیر لوگ) اس کی پیروی کر
 ضَعْفَاءُ هُمْ قُلْتُ بَلْ ضَعْفَاءُ هُمْ قَالَ أَيْزِيلُونَ أَمْ يَنْقُصُونَ قُلْتُ بَلْ
 رہے ہیں یا غریب لوگ؟ میں نے کہا نہیں غریب لوگ، کہنے لگا اس کے تابعدار لوگ (زور بردار) بڑھے جاتے ہیں یا گھٹتے جاتے ہیں؟ میں نے
 يَزِيدُونَ قَالَ فَهَلْ يَرِيدُ أَحَدٌ مِنْهُمْ مَسْخَطَةً لِدِينِهِ بَعْدَ أَنْ يَدْخُلَ فِيهِ
 کہا نہیں بڑھتے جاتے ہیں، کہنے لگا اچھا پھر کوئی ان میں سے ایمان لاکر اس دین کو برا سمجھ کر پھر جاتا ہے؟ میں نے کہا نہیں، کہنے لگا یہ بات
 قُلْتُ لَا قَالَ فَهَلْ كُنْتُمْ تَهْمُونَهُ بِالْكَذِبِ قَبْلَ أَنْ يَقُولَ مَا قَالَ قُلْتُ لَا
 جو اس نے کہی (میں پیغمبر ہوں) اس سے پہلے کبھی تم نے اس کو جھوٹ بولتے دیکھا؟ میں نے کہا نہیں، کہنے لگا اچھا وہ عہد شکنی کرتا
 قَالَ فَهَلْ يَغْدِرُ قُلْتُ لَا وَنَحْنُ مِنْهُ فِي مَدَّةٍ لَا نَذَرُ مَا هُوَ فَاعِلٌ
 ہے؟ میں نے کہا نہیں، اب ہم سے اس سے (صلحی) ایک مدت ٹھہری ہے، معلوم نہیں اس میں وہ کیا کرتا ہے، ابوسفیان نے
 فِيهَا شَيْئًا غَيْرَ هَذِهِ الْكَلِمَةِ

کہا مجھ کو اور کوئی بات اس میں شدید کرنے کا موقع نہیں ملا پھر اس بات کے

اسی کو ابوسفیان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ فَوَاللَّهِ لَوْلَا الْحَيَاءُ مِنْ أَنْ يَأْتِرُوا عَلَيَّ كَذِبًا لَكُنْتُ بَت عَنْهُ يَمِينًا يَهَا تَوَكَّلًا
 چل جائے گا مگر کہ پہونچ کر مجھے وطن و شہر کیس گے کہ یہ وہی تو ہے قیصر کے سامنے جھوٹ بولا تھا، ان کو یقین تھا کہ اگر میں یہاں جھوٹ
 بولوں گا تو یہ ہرگز یہاں میری تائید نہ کریں گے لیکن آئندہ ساری عمر کیلئے عرب میں جھوٹا مشہور ہو جاؤں گا اس لئے جھوٹ بولنے سے
 مانع ہوئی، اس کے بعد قیصر نے سب سے پہلا سوال نسب کے بارے میں کیا، ابوسفیان نے جواب دیا ہُوَ فِينَاذُ وَنَسَبٍ، وہ عالی نسب
 ہے، تزوین تنظیم کے لئے ہے، یعنی عرب میں ان سے بہتر کوئی نہیں (ابوسفیان اس اقرار پر مجبور تھے، اگر تکذیب کرتے تو خود ان کے اوپر
 بھی حرف آتا اس لئے کہ وہ اوپر آپ سے اقرب نسب ہونے کا دعویٰ کر چکے ہیں)

پھر سوال کیا کہ کسی اور نے بھی ان سے پہلے ایسا دعویٰ کیا تھا؟ کہا نہیں، بعض روایات میں ہے کہ انھوں نے جواب میں
 یہ بھی کہا ہُوَ سَاحِرٌ كَذَّابٌ تو قیصر نے کہا کہ تم نے تم کو اس لئے نہیں بلایا کہ سب پر شکم کرو۔

قَالَ فَهَلْ قَاتَلْتُمُوهُ؟ قَالَتْ نَعَمْ، قَالَ فَكَيْفَ كَانَ قِتَالُكُمْ إِيَّاهُ؟ قَالَتْ الْحَرْبُ بَيْنَنَا
 كَبْنِ لُغَا أَجَاهِمْ اس سَنَ (کبھی لڑے؟ میں نے کہا ہاں: کہنے لگا پھر تمہاری اس کی لڑائی کیسے ہوتی ہے؟ میں نے کہا ہم میں اور
 وَبَيْنَهُ سِبْغَالٌ يَنَالُ مِنَّا وَنَنَالُ مِنْهُ، قَالَ مَاذَا يَأْمُرُكُمْ؟ قَالَتْ يَقُولُ اعْبُدُوا اللَّهَ
 اس میں لڑائی دونوں کی طرح ہے، وہ ہمارا نقصان کرتا ہے ہم اس کا نقصان کرتے ہیں، کہنے لگا اچھا وہ تم کو کیا حکم کرتا ہے؟ میں نے
 وَحَدَّثَهُ وَلَا تَشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا وَاتْرَكُوا مَا يَقُولُ آبَاءَكُمْ وَيَأْمُرُنَا بِالصَّلَاةِ وَالصَّدَقِ
 کہا وہ کہتا ہے بس اکیسے اللہ ہی کو پوجو اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ بناؤ اور اپنے باپ دادا کی (شرک کی) باتیں چھوڑ دو، اور
 وَالْعِفَافِ وَالصَّلَةِ، فَقَالَ لِلرَّجُلَانِ قُلْ لَهُ سَأَلْتُكَ عَنْ نَسَبِهِ فَذَكَرْتُ
 ہم کو نماز پڑھنے، حج بولنے (حرام کاری) سے بچنے اور ناپا جوڑنے کا حکم دیتا ہے، تب ہر قس نے مترجم سے کہا اس شخص سے کہہ میں نے
 أَنَّهُ فِيمَكُمُ ذُو نَسَبٍ، فَكَذَلِكَ الرَّسُلُ تَبِعْتُ فِي نَسَبِ قَوْمِهِمَا،
 مجھ سے اس کا خاندان پوچھا تو تو نے کہا وہ ہم میں غالی خاندان ہے اور پیغمبر (ہمیشہ) اپنی قوم میں غالی خاندان ہی بیٹے جاتے ہیں،

اسی طرح کے بہت سے سوالات کئے، اور یہ سوالات نہایت عقلمندی کے تھے، خود ہر قس بہت بڑا عالم تھا، کتب سابقہ
 سے بھی خوب واقف تھا۔

قَوْلُهُ وَلَحْنٌ مِّنِّي مَدَّةً، الخ یعنی ہمارا ان کا ایک عہد ہوا ہے، ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس میں ان کا طرز عمل کیا رہے گا؟
 بخاری کے علاوہ اور دوسری روایتوں میں ہے کہ قیصر نے پوچھا کہ تمہیں یہ اندیشہ کیوں ہے کہ وہ غدر (عہد شکنی) کریں گے؟ ابوسفیان نے
 جواب دیا کہ میری قوم نے اپنے حلفدار کی مدد کی ہے ان کے حلفدار کے مقابل میں، تو قیصر نے یہ سن کر کہا إِنَّ بَدَأْتُمْ فَلَتَمَّ غَدْرُكُمْ
 جب تم نے عہد شکنی کی ابتداء کی پھر تو تم ہی بد عہد ٹھہرے۔
 قَوْلُهُ سِبْغَالٌ یعنی ڈالو اوڑھل ہے، یہ ٹیٹھڑ ترجمہ ہے۔

قَوْلُهُ وَلَا تَشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا، اس قید سے یہ بتلایا کہ کسی قسم کا شرک نہ ہو، نہ فی الذات، نہ فی الصفات، شرک سے مراد
 یہاں وہ فعل ہے جس کی وجہ سے اسلام سے خارج ہو جائے، سجدہ وغیرہ بشرطیکہ تعمیری نہ ہو اسلام سے خارج نہیں کرتا۔

اس شرک کے معنی یہ ہیں جس سے خروج عن الاسلام ہو جائے سخت اختلاف ہے، شرک کے معنی کہ ہر بات میں اللہ کے
 مساوی قرار دے اگر کہیں جائیں تو پھر کوئی بھی شرک نہیں، کردار کے کہتے تھے مَا تَعْبُدُ هُمْ إِلَّا لِيُقَرَّبُوا إِلَى اللَّهِ زُلْفَى^(۱۱)

ہم انھیں صرف اس لئے پوجتے ہیں کہ یہ ہم کو اللہ کا مقرب بنائیں گے۔ اس سے مسلم ہوا کہ وہ اپنے بتوں کو خدا کے برابر نہیں سمجھتے تھے تو پھر شرک کیسے کہے جائیں؟ اہل ہند بھی سڑن کا عطر بڑا معبود اللہ ہی کہتے ہیں، یہود و نصاریٰ بھی شرک ہیں مگر ان کا شرک اور طرح کا ہے، یہ بھی اللہ کے مساوی کسی اور کو نہیں قرار دیتے، ان سب شواہد سے ثابت ہوا کہ شرک کی وہ تفسیر صحیح نہیں جو اوپر مذکور ہوئی، دراصل شرک کے معنی منفع و بہتر یہی ہیں کہ کسی پر یہ عقیدہ رکھ کر (کہ کوئی چیز بھی جو خواہ تشریع خواہ تکوین اس میں وہ مستقل اختیار رکھتا ہے) سر جھکائے اور منڈل ظاہر کرے میں اور واضح کرتا ہوں۔ اہل عرب اپنے تئیں یہ کہتے تھے لَبَّيْكَ لَبَّيْكَ لَا شَرِيكَ لَكَ إِلَّا شَيْئًا كَهَوْلِكَ تَمْلِكُهُ وَمَا مَلَكَكَ، ہم حاضر ہیں، ہم حاضرین، تیرا کوئی شریک نہیں لیکن وہ ایک شریک جس کا تو مالک ہے اور وہ خود مستقل مالک نہیں۔

اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک بادشاہ ہے اور اس کے تابع کلکٹر وغیرہ کہ ہیں تو وہ سب محکوم لیکن بادشاہ ہی کے سونے ہوئے اجمالی اختیارات کلکٹر کثیر وغیرہ ہا کو بھی ہیں اور ان اختیارات کے نفاذ میں وہ مستقل بھی ہیں گو نفس اختیارات کا حصول ان کا اپنا نہیں بلکہ گورنمنٹ سے انھیں حاصل ہوا ہے تو من وجہ وہ مستقل ہیں اور من وجہ غیر مستقل، اعتقاد مشرکین پر یہ مثال بالکل منطبق ہے، وہ جانتے ہیں کہ یہ بت مستقل نہیں ہیں بلکہ (ان کے اپنے اعتقاد کے مطابق) انھیں اختیارات اللہ سے ملتے ہیں اور ان کا نفاذ ان کے اختیار سے ہوتا ہے، اسی کو یہ لوگ مَا تَعْبُدُوهُمْ إِلَّا لِيُفَرِّجُوا نَاسًا سے تعبیر کرتے تھے، یعنی عبادت تو ان بتوں کی، ہم ضرور کرتے ہیں مگر اس لئے کہ ہم بڑے خدا کے قریب ہو جائیں، ایک شرک تو یہ ہے اور ایک شرک وہ ہے جو حدیث عدی بن حاتم میں ہے (جو پہلے نعمانی تھے پھر اسلام قبول کر لیا تھا) کہ عدی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں یا رسول اللہ! قرآن میں ہے: اَتَّخِذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهَبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ وَالْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ، یعنی کافروں نے اپنے علماء اور زاہدوں اور مسیح ابن مریم کو اللہ کے سوا دوسرا خدا بنا رکھا ہے، حالانکہ ہم نے کبھی احبار و رہبان کو رب نہیں بنایا، پھر ارشاد ربانی کیسا ہے؟ آپ نے فرمایا کیا ایسا نہیں ہے کہ تم نے انھیں تحلیل و تحریم کا مالک بنا دیا ہے؟ عرض کیا ہاں یہ ٹھیک ہے، ایسا ضرور کیا ہے، تو آپ نے فرمایا بس یہی شرک ہے، چنانچہ وہ لوگ کتابیں بدل دیتے تھے، احکام منسوخ کر دیتے تھے، حالانکہ تشریع کا حق اللہ کے سوا کسی کو نہیں، تو یہ شرک فی التشریع ہے یعنی تشریع یا تکوینی طور پر حلال و حرم جیسے شرعی احکام میں کسی کو کسی درجہ میں بھی مستقل یا اختیار سمجھنا کہ جس کو وہ چاہے حرام قرار دے دے اور جس کو چاہے حلال ٹھہرا دے، تو یہی شرک اسلام سے خارج کر دیتا ہے۔

اس کے علاوہ جس کا مسلک تعظیم کے لئے سجدہ وغیرہ کا ہے تو وہ مبتدع ہے، گمراہ ہے، مگر شرک نہیں، نجدی علماء کہتے ہیں کہ سجدہ غیر اللہ کا حرام ہے خواہ نیت ہو یا نہ ہو، تعظیماً ہو یا تنقیہاً بہر نوع شرک ہی ہوگا اور اس کا مرتکب مشرک، مباح الدم، واجب القتل ہو جائے گا، اس مسئلہ پر میرزا اور ابن سعود والی مجاز و نجد کا مکالمہ بھی ہوا تھا جب میں سلطان کی دعوت پر ہندوستانی وفد کے ہمراہ مجاز گیا تھا تو ایک مجلس میں علمائے نجد وغیرہ کی موجودگی میں یہ مسئلہ ایک روز زیر بحث آیا تھا، میں نے کہا تھا کہ اگر ہر سجدہ عبادت ہو تو ہر ساجد عابد ہوگا اور جس کو سجدہ کیلئے وہ سجدہ نہ ہوگا اور جب یہ تسلیم ہے کہ ہر سجدہ عبادت ہے اور ہر ساجد عابد تو لازم آیا کہ ہر سجدہ واجب ہو، یہ ایک مقدمہ ہوا، دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ بعض قرآنی و حدیثی یہ ثابت ہے کہ ابتدائے عالم سے آج تک کسی مذہب و ملت میں ایک آن کیلئے بھی شرک جلی کی اجازت نہیں دی گئی اور کسی کو ایک منٹ کے لئے بھی معبود نہیں بنایا گیا، خود قرآن فرماتا ہے: وَ سَتَلِمْنَ مَنْ أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُسُلِنَا أَجَعَلْنَا مِنْ دُونِ الرَّحْمَنِ إِلَهًا يَعْْبُدُونَ (۱۲) پوچھئے اپنے سے پہلے کے رسولوں سے کیا تم کبھی تم کے سوا کوئی دوسرے معبود تجویز کئے ہیں جن کی عبادت کی جاتی ہے؟ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ غیر اللہ کو کبھی معبود نہیں بنایا گیا حالانکہ غیر اللہ کو سجدہ بنایا گیا ہے جیسا کہ حضرت آدم و یوسف علیہما السلام کو، اور خود یوسف علیہ السلام جیل میں کہہ چکے تھے: يَا صَاحِبِ النَّيِّبِ ؕ اَذْرَبْ أَبْ مَسْقَرٍ قَوْلٍ حَيَّرَ أَمْرَ اللَّهِ الْوَاحِدَ الْقَهَّارَ (۱۳) مگر جب ماں باپ اور بھائیوں کے آنے پر سخت پریشان ہوئے تو ان بھائیوں نے سجدہ کیا، اب اگر ہر سجدہ عبادت ہوتا تو کمال قلم تو پھر آدم و یوسف علیہما السلام معبود بنے حالانکہ یہ مقدمہ ثابت ہو چکا ہے کہ معبود غیر اللہ کبھی نہیں ہوا، تو آپ کے قول کے مطابق لازم آتا ہے کہ خود اللہ نے ایک وقت شرک جلی کی اجازت دی تھی، نعوذ باللہ منہ تاویل سے یہاں کام نہ چلے گا کیونکہ گفتگو یہاں قرآن و حدیث میں ہے، معلوم ہوا کہ سجدہ اور چیز ہے اور عبادت شے دیگر اور ان دونوں میں فرق ہے، حجۃ اللہ الباقی میں شاہ صاحب نے اس پر لکھا ہے مگر بہت مختصر، میں نے تقریباً اسے بیس بار دیکھ کر حل کیا ہے، اشکال اس لئے پیش آیا ہے کہ عبادت غایت تذلّل کا نام ہے اور سجدہ میں یہ سنی بطریق اکمل پائے جاتے ہیں اور جب سجدہ عبادت ہے تو غیر اللہ کیلئے ہرگز جائز نہیں، یہ سنی نبوی ہیں، ان سے انکار بھی نہیں کیا جاسکتا، شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ بیشک عبادت غایت تذلّل کا نام ہے مگر غایت تذلّل جب ہوگا جب قلب و تقاب دونوں سے جو اور یہاں سجدہ دونوں سے نہیں ہے بلکہ صرف تقاب سے ہے لہذا غایت تذلّل: ہوا اور چونکہ غایت تذلّل نہیں اس وجہ سے سجدہ شرک بھی نہیں ہو سکتا۔

وَسَأَلْتُكَ هَلْ قَالَ أَحَدٌ مِنْكُمْ هَذَا الْقَوْلَ فذَكَرْتُ أَنْ لَا، قُلْتُ لَوْ كَانَ أَحَدٌ قَالَ

اور میں نے تجھ سے پوچھا یہ بات تم لوگوں میں اس سے پہلے کسی نے کہی تھی؟ تو نے کہا نہیں، اس سے میرا مطلب یہ تھا کہ اگر اس سے پہلے

هَذَا الْقَوْلَ قَبْلَهُ لَقُلْتُ رَجُلٌ يَأْتِي بِقَوْلٍ قِيلَ قَبْلَهُ، وَسَأَلْتُكَ هَلْ كَانَ مِنْ

دوسرے نے بھی یہ بات کہی ہوتی (پیغمبری کا دعویٰ کیا ہوتا) تب میں یہ کہتا یہ شخص اگلی بات کی پیروی کرتا ہے، اور میں نے تجھ سے پوچھا اسکے

أَبَائِهِ مِنْ مَلَكَ فذَكَرْتُ أَنْ لَا، قُلْتُ فَلَوْ كَانَ مِنْ آبَائِهِ مِنْ مَلَكَ قُلْتُ رَجُلٌ

بزرگوں میں کوئی بادشاہ گذرے تو نے کہا نہیں، اس سے میرا مطلب یہ تھا کہ اگر اس کے بزرگوں میں کوئی بادشاہ گذرے تو یہ سمجھ لوں کہ وہ شخص

يَطْلُبُ مَلَكَ أَبِيهِ، وَسَأَلْتُكَ هَلْ كُنْتُمْ تَقُولُونَ بِالْكَذِبِ قَبْلَ أَنْ يَقُولَ مَا قَالَ

(پیغمبری کا بہا کر کے) اپنے باپ کی بادشاہت لینا چاہتا ہے، اور میں نے تجھ سے یہ پوچھا کہ اس بات کے کہنے سے پہلے تم نے کبھی اس کو جھوٹ

فَذَكَرْتُ أَنْ لَا، فَقَدْ أَعَرَفْتُ أَنَّهُ لَمْ يَكُنْ لِيَذَرَ الْكَذِبَ عَلَى النَّاسِ وَيَكْذِبَ عَلَى اللَّهِ

بولتے دیکھا تو تو نے کہا نہیں، تو اب میں نے سمجھ لیا کہ ایسا کبھی نہیں ہو سکا کہ وہ لوگوں پر تو جھوٹ باندھنے سے پرہیز کرے اور اللہ پر جھوٹ باندھے

میری اس تقریر پر ابن سود کی مجلس میں ہر طرف سناٹا چھا گیا اور سلطان ابن سعود نے فرمایا کہ آپ ہمارے علماء سے گفتگو کیجئے، اگر

وہ قبول کر لیں تو ہم بھی قبول کر لیں گے، کیونکہ ہم عالم نہیں ہیں ہمیں رد قبول کا حق حاصل نہیں، یہ بھی فرمایا کہ آپ نے ہمیں بڑے دھوکے سے

دکالا۔

قَوْلُهُ وَاتَّكَوْا مَا يَقُولُ آبَاءُكُمْ، یہ اس لئے کہا کہ ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے کہا تھا کہ یہ اسی چیز کہتے ہیں جس سے ہمارے

باپ دادا کی توہین ہوتی ہے تو کیسے قبول کر لیں اور ایک طرح یہ حجت ہے ہر قلم کے مقابلہ میں کیونکہ یہ بھی اپنے آباؤ کے دین پر قائم تھا تو انھوں نے

یہ کہنا چاہا کہ تم اپنے دین کو نہیں چھوڑ سکتے اسی طرح ہم معذور ہیں۔

تَوَرَّيْنَا مِنَ الْصَّلَاةِ، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی درجہ میں یہ جانتے تھے کہ صلوٰۃ کی کچھ حقیقت ہے گو تفصیلاً انھیں علم تھا

قَوْلُهُ وَالصَّدَقِ، بعض روایات میں بالصّدقۃ ہے۔

فَقَالَ لِلدَّرَجَانِ، سوالات کے بعد اب ہر قلم ان سوالات (کے جوابات) پر تبصرہ کرتا ہے کہ جب تم سے ان کے خاندان کی

نسبت دریافت کیا گیا تو تم نے کہا کہ وہ ذنوب ہے، بیشک انبیاء اپنی قوم کے عالی خاندان ہی سے ہوتے ہیں۔

بعض لوگوں نے یہاں پر کچھ تنقیص کی ہے اور یہ کہا ہے کہ جب لوط علیہ السلام کی قوم نے ان کا گھر گمیر لیا اور وہ فرشتوں کو (جو خوبصورت

لڑکوں کی شکل میں انھیں تباہ کرنے آئے تھے) لوط علیہ السلام سے مانگ رہے تھے، لوط علیہ السلام بھی ان فرشتوں کو لڑکے ہی سمجھ رہے تھے،

وَسَأَلْتُكَ أَشْرَافُ النَّاسِ اتَّبَعُوهُ أَمْ ضَعَفَاءُ هُمْ فَذَكَرْتَ أَنَّ ضَعَفَاءَ هُمْ اتَّبَعُوهُ

اور میں نے تجھ سے پوچھا کیا بڑے (امیر) آدمیوں نے اس کی پیروی کی یا غریبوں نے؟ تو نے کہا کہ غریب لوگوں نے اس کی پیروی کی ہے اور وہم اتباع الرسل، و سألْتُكَ ايزيدون أم ينقصون فذكرْتَ أنَّهم پیغمبروں کے تابعدار (اکثر) غریب ہی ہوتے ہیں اور میں نے تجھ سے پوچھا وہ بڑھ رہے ہیں یا گھٹ رہے ہیں تو نے کہا وہ بڑھ رہے

يزيدون و كذلك امرُ الايمان

ہیں اور ایمان کا بھی حال رہتا ہے۔

اور سمجھا رہے تھے کہ تم اپنے مطالبے سے باز آ جاؤ اور وہ لوگ فرشتوں کو ان سے زبردستی جھین لینا چاہ رہے تھے تب حضرت لوط علیہ السلام نے نہایت حسرت سے کہا تھا: لَوْنِي بِكُمُ قُوَّةً أَوْ اُدِيْ اِلَى رُكْنٍ شَدِيْدٍ (۱) کاش مجھ میں قوت ہوتی یا میرا کنبہ ہوتا جو میری مدد کرتا کیونکہ حضرت لوط علیہ السلام غیر قوم کی طرف مبعوث ہوئے تھے اس کے بعد اللہ نے جو نبی بھیجا اس کی ہی قوم کی طرف بھیجا۔

گر میرے نزدیک تخصیص کی کچھ حاجت نہیں کیونکہ ہر قتل کا مطلب یہ نہیں، دراصل یہاں دو چیزیں الگ الگ ہیں، ایک تو یہ کہ نبی جن کے پاس بھیجا گیا وہ نبی کی ہم قوم ہو، دوسری یہ کہ غوثی عالی نسب و حسب ہو، مبعوث خواہ کسی کی طرف ہو، لوط علیہ السلام کا خاندان بھی کوئی گھٹیا خاندان نہ تھا، وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خاندان سے تھے، ہم قوم نہ ہونا اور چیز ہے اور ہر قتل یہ نہیں کہہ رہا بلکہ وہ یہ بتانا چاہتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام ہمیشہ شریف نسب والے ہی ہوتے ہیں، کم ظرف و ذلیل خاندان کے نہیں ہوتے، تاکہ لوگ انھیں ذلیل سمجھ کر ان کی اطاعت میں عار و ننگ نہ محسوس کریں

قیصر نے کہا کہ تم نے کہا ان کے گھرانے میں پہلے کوئی بادشاہ نہیں ہوا تو اب یہ خیال نہیں ہو سکتا کہ اس نے بھی گڑھ کر یہ بات اس لئے نکالی ہے کہ اس ڈھنگ سے وہ اپنی کھوئی ہوئی بادشاہت حاصل کرنا چاہتا ہے، پس یہ بھی ایک قرینہ ہے کہ منجانب اللہ کہتا ہے، اور کسی نے اس خاندان میں نبوت کا دعویٰ نہیں کیا تو یہ بھی قرینہ ہے اس کی صداقت کا۔

تم نے کہا کہ وہ مہتمم بالکذب بھی نہیں ہے، جب وہ لوگوں پر جھوٹ نہیں بولتا تو یہ کیسے ممکن ہے کہ آدمیوں پر تو جھوٹ بولے اور اللہ پر جھوٹ باندھنے لگے۔

تم نے کہا ضعفاء ان کے تیس ہیں تو [یہ بھی ان کے پیغمبر ہونے کی علامت ہے، اس لئے کہ] انبیاء کے متبعین اکثر ضعفاء ہی ہوتے ہیں

حَتَّىٰ يَتَمَّ ، وَسَلَّاتِكَ اِيْرَتَدُّ اَحَدٌ سَخَطَةً لِّدِيْنِهِ بَعْدَ اَنْ يَدْخُلَ فِيْهِ ،

جب تک وہ پورا نہ ہو ، اور میں نے تجھ سے پوچھا کوئی اس کے دین میں اگر اس کو بُرا سمجھ کر اس سے پھر جاتا ہے ؟ تو نے کہا نہیں ، اور ایسا نہ کا
فَذَكَرْتُ اَنْ لَا ، وَكَذَلِكَ الْاِيْمَانُ حِيْنَ نَخَالِطُ بَشَائِشَتَهُ الْقُلُوْبُ ، وَسَلَّاتِكَ هَلْ

یہی حال ہے ، جب اس کی خوشی دل میں سما جاتی ہے (تو پھر نہیں نکلتی) اور میں نے تجھ سے پوچھا وہ ہمیشہ کنی کرتا ہے ؟ تو نے کہا نہیں ،
يَعْدِرُ ، فَذَكَرْتُ اَنْ لَا ، وَكَذَلِكَ السُّلُّ لَا تَعْدِرُ ، وَسَلَّاتِكَ بِمَا يَأْمُرُكُمْ فَذَكَرْتُ

اور پیغمبر ایسے ہی ہوتے ہیں ، وہ ہمیشہ نہیں تڑتے ، اور میں نے تجھ سے پوچھا وہ تم کو کب حکم دیتا ہے ؟ تو نے کہا وہ تم کو حکم
اَنَّهُ يَأْمُرُكُمْ اَنْ تَعْبُدُوْا اللّٰهَ وَلَا تَشْرِكُوْا بِهِ شَيْئًا وَبَيْنَهُمْ عَنْ عِبَادَةِ الْاَوْثَانِ

دیتا ہے کہ اللہ کو پوجو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ اور بت پرستی سے تم کو منع کرتا ہے اور نماز اور سچائی کا اور
وَيَأْمُرُكُمْ بِالصَّلٰوةِ وَالصَّدَقِ وَالْعَفَا ، فَاِنْ كَانَ مَا تَقُوْلُ حَقًّا فَيَسِيْلُكَ مَوْضِعُ

سہرام کاری سے بچے رہے گا حکم دیتا ہے ، پھر توجہ تو لیتا ہے اگر حق ہے تو وہ عنقریب اس جگہ کا مالک ہو جائے گا
تَدَقَّقْ هَاتَيْنِ ، وَقَدْ كُنْتُ اَعْلَمُ اَنَّهُ خَارِجٌ وَلَمْ اَكُنْ اَظُنُّ اَنَّهُ مِنْكُمْ ، فَلَوْ

جہاں میرے یہ دونوں پاؤں ہیں (یعنی شام کے ملک کا) اور میں مانتا تھا کہ یہ پیغمبر آنے والا ہے لیکن میں نہیں سمجھتا تھا کہ وہ تم میں سے ہوگا ، پھر
اِنِّيْ اَعْلَمُ اَنِّيْ اَخْلَصُ اِلَيْهِ لَتَجْشِمُنَّ لِقَاءَ كَا ،

اگر جہانوں کے میں اس تک پہنچ جاؤں گا تو اس سے ملنے کی ضرور کوشش کروں گا

کیونکہ [بڑے لوگوں کے لئے] نعت و ثروت اور تکبر و غرور ان سے منع قبول ہوتا ہے ۔

چنانچہ قرآن میں ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کی اس دعوت پر کہ : مَنْ اَنْصَارِيْ اِلٰى اللّٰهِ ، قَالَ الْخَوَارِثُونَ نَحْنُ اَنْصَارُ

اللّٰهِ (۱) یعنی کون میرا مددگار ہے اللہ کی راہ میں ؟ حواریوں نے بلیک کہا ، اور مشہور ہے کہ حواری لوگ دھویوں کی جماعت سے تھے ۔

بہنوں نے لکھا ہے کہ مسیح علیہ السلام جب ادھر سے گزرے جہاں یہ لوگ کپڑے دھو رہے تھے تو مسیح نے ان سے کہا اؤ تمہیں

دلوں کا دھونا بھی سکھا دوں تو ان لوگوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کی یہ دعوت قبول کر لی ، پھر ان میں بڑے بڑے ولی ہوئے ۔

قیصر آگے کہتا ہے کہ تم نے کہا وہ بڑھ رہے ہیں ، یعنی خواہ عدد کے اعتبار سے ہوں یا دین میں قوت و کیفیت کے اعتبار سے

وَلَوْ كُنْتَ عِنْدَهُ لَفَسَلْتُ عَنْ قَدَمَيْهِ ۚ ثُمَّ دَايَكَتَابَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْأَذَى بَعَثَ بِهِ مَعَ دِحْيَةَ الْكَلْبِيِّ إِلَى عَظِيمِ بَصْرَى ۚ فَدَفَعَا ۚ

آپ نے وحیہ کلبی کو دے کر دستہ میں بھری کے حاکم کو بھیجا تھا اس نے وہ خط ہرقل کے پاس بھیج دیا تھا ہرقل نے اس کو عَظِيمِ بَصْرَى إِلَى هِرَقْلٍ فَقَرَأَهُ ۚ فَاذًا فِيهِ بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ مِنْ مُحَمَّدٍ

پڑھا اس میں یہ لکھا تھا : شروع اللہ کے نام سے جو بہت مہربان ہے رحم والا ، محمد اللہ کے بندے اور اس کے رسول کی طرف سے عِبْدِ اللَّهِ وَرَسُولِهِ إِلَى هِرَقْلٍ عَظِيمِ الرُّومِ سَلَامٌ عَلَى مَنْ اتَّبَعَ الْهُدَى ۚ

ہرقل روم کے رئیس کو معلوم ہو جو سیدھے رستے پر چلے اس کو سلام ، اس کے بعد تجھ کو اسلام کے کلمہ (لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ) کی اَمَّا بَعْدُ فَاِنَّ اَدْعَاكَ بِدَعَايَةِ الْاِسْلَامِ اَسْلَمَ سَلَّمَ يُؤْتِكَ اللَّهُ اَجْرَكَ

طرف ملتا ہوں ، مسلمان ہو جا تو پورا ہے گا ، اللہ تجھ کو دوسرا ثواب دے گا ، پھر اگر تو یہ بات نہ مانے تو میری رعایا کا (بھی) گناہ مَرَّتَيْنِ ۚ فَاِنْ تَوَلَّيْتَ فَاِنَّ عَلَيَّ اِثْمَ الْارِيسِيِّينَ ۚ

تجھ ہی پر ہوگا (اور یہ آیت لکھی تھی) :

تو انبیاء کا یہ معاملہ ہوتا ہے ۔

[كَذَلِكَ اَمَرَ الْاِيْمَانُ حَتَّى يَتِمَّ] تمام ہونے کے دو معنی ہیں ، ایک یہ کہ احکام تمام ہو جائیں یا عہدیں زیادتی ہو جائیں اس پر اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ^(۱) دلالت کرتا ہے ، اور دوسرا تمام وَاللّٰهُ مُتِمِّمُ دِيْنِهِ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ^(۲) میں ہے پہلا احکام کا اتمام ہے اور دوسرا غلبہ و قوت کا ۔

تم نے کہا کہ کوئی اس کے دین میں داخل ہو کر پھرتا نہیں ، یعنی اس دین سے ناغوش ہو کر مرتد نہیں ہوتا ، تو ایمان کی یہ شان ہوتی ہے کہ جب انشراح دلوں میں رقع جاتا ہے تو رگ و پے میں ایسا سما جاتا ہے کہ اب ممکن نہیں کہ وہ پھر جائے ، بَشَاتَةِ الْقُلُوبِ کی دو قراءتیں ہیں ایک ہمارے ساتھ ، دوسری ہمارے ۔

آگے کہتا ہے کہ تم نے کہا وہ غدر نہیں کرتے (غدر مقابل عہد ہے اور عہد طرفین سے ہوتا ہے اور وعدہ ایک طرف سے

ہوتا ہے) تو رسولوں کی یہی شان ہوتی ہے کہ وہ غدر نہیں کرتے — تبصرہ کے بعد قیصر کہتا ہے کہ بھائی ان کی نبوت میں کوئی شبہ نہیں معلوم ہوا، مگر اے قرآنِ تعبدیت کرتے ہیں (گو دلائل یقینی نہ ہوں) اور اگر جو کچھ تم نے بیان کیا یہ سچ ہے تو یہ زمین جو میرے قدموں کے نیچے ہے انکے قبضہ میں آجائے گی۔ یعنی بیت المقدس بھی فتح کر لیں گے (چنانچہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں اس کا ظہور ہوا) اور یہ بات تو مجھے پہلے سے معلوم تھی کہ نبی ظاہر ہوتا ہے لیکن میرے دیم و خیال میں بھی نہ تھا کہ وہ تم میں سے (عرب) ہوں گے۔

قولہ انی اخلص الیہ یعنی اگر مجھے یقین ہوتا کہ میں ان کے پاس پہنچ سکوں گا تو ضرور پہنچنے کی کوشش کرتا اور کلفتیں اٹھا کر جاتا۔ یہ اس لئے کہا کہ وہ جانتا تھا کہ میری قوم اس وقت مجھ کو قتل کر دیگی (اور اگر پہنچ جاتا تو ان کے پیروں کو دھوکہ دیتا)۔

پھر کہا اب وہ نامہ مبارک لاؤ، چنانچہ وہ تحریر لائی گئی تو ہر تل نے اس کو پڑھا جس کا یہ مضمون تھا بسم اللہ الرحمن الرحیم، من محمد عبد اللہ و رسولہ الی ہرقل عظیم الروم، سلام علی من اتبع الهدی، اذل ہرقل پھر اپنا نام، اس میں عبد اللہ لکھ کر نصاریٰ کا رد فرمایا کہ وہ جن کو اسنے ہیں وہ کیا خدا ہوں گے میں جو افضل الرسل ہوں اپنے کو خدا نہیں کہتا اور نہ نغمہ اپنے کو عبد کہنے میں کوئی عار ہے، اسی کو فرمایا، لن یستکف المسیح ان یکون عبد اللہ الخ یعنی مسیح یا مقرب فرشتے ناک نہیں چڑھاتے کہ اپنے آپ کو اللہ کا عبد کہیں۔

عرب کا دستور یہی تھا کہ کاتب اپنا نام پہلے لکھتا اور مکتوب الیہ کا بعد کو، اور یہی طبعی ترتیب بھی ہے کیونکہ یہ فاعل کتابت ہے اور یہ مصدر ہے اور مکتوب الیہ کو بعد میں لے گا، اور یہی اصول صحابہ تھا اور اس میں سادگی بھی ہے۔

العاب میں بجائے شہنشاہ یا سلطان کے عظیم الروم کہا کیونکہ اسلام کسی کافر کے حق میں غلبہ قبول نہیں کرتا، اس سے مسئلہ نکال لیا کہ کسی کافر کا اکرام کسی حد تک جائز ہے بشرطیکہ بالفائدہ ہو۔

دوسرا جملہ ہے سلام علی من اتبع الهدی، سلام علیکم نہیں کہا اس لئے کہ وہ اب تک کافر تھا، اسلئے لکھا، سلام اس پر جو ہدایت کی اتباع کرے۔

ثانی ادعوا الخ دعایۃ بروزن شکایۃ مصدر ہے، اس سے مراد اسلام کی طرف بلانا ہے، بعض نسخوں میں بداعیۃ الاسلام ہے اور وہ داعیہ کلمہ شہادت ہے۔

وَيَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ
 كِتَابَ وَلَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ يَوْمَ يَكُونُ لِكُلِّ شَيْءٍ حُكْمٌ ۚ هُوَ الَّذِي يُسَوِّدُ لَيْلَكُمْ إِذْ تَبْتَغُونَ مِنْهُ مَالًا وَلَمْ يُغْنِ عَنْكُمْ كَثْرَتُهُمْ مِنْهُ ۚ يُغْنِي عَنْكُمْ اللَّهُ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ۚ
 جہڑ کر ہم میں سے کوئی دوسرے کو خدا نہ بنائے۔ پھر اگر وہ (اس بات کو) نہ مانیں تو (مسلمانوں) تم ان سے کہو گواہ رہنا ہم تو (ایک خدا کے)

تاہدیار ہیں

ضرر پڑے گا۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ غضاب سے آزاد ہو جائیں گے، غضاب ان پر بھی ہوگا مگر اس پر اپنا بھی ہوگا اور ان سب کا بھی جن کے
 عدم اسلام کا یہ سبب بنا ہے۔

قرآن میں ویَا اَہْلَ الْکِتَابِ واو عطف کے ساتھ نہیں ہے، یہاں اذ عطف بدعا یتہ الاسلام پر عطف کرنے
 کے لئے لایا گیا ہے، حاصل آیت کریمہ کا یہ ہے کہ اے اہل کتاب اس ایک لکڑی کی طرف جاؤ جو ہم میں تم میں مشترک ہے اور دونوں
 کے نزدیک یکساں ہے، برابر ہونے کا مطلب کیا ہے؟ اس میں اختلاف ہے کیونکہ یہود^(۱) غیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا کہتے تھے اور انھاری
 مس علیہ السلام کو، نیز اپنے احباب اور زبان کو ارباب بنا لئے ہوئے تھے پھر وَلَا یَتَّخِذْ بَعْضُنَا اَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللّٰہِ کیے صحیح
 ہوگا اور کلمۃ سوائے بیننا کیونکر درست ہوگا؟ — جواب سے پہلے یہ سمجھ لو کہ دنیا کے تمام فرقوں پر نظر ڈالو تو معلوم ہوگا کہ ہر فرقہ کسی
 ایک درجہ میں اقرار کرتا ہے کہ خدا ایک ہے، توحید کا تعنی منکر ہوا یا نہیں ہے، اہل ہندو تینتیس کرڈرت مانتے ہیں، درخت، پتھر، بجلی
 چاند، سورج سب کو معبود مانتے ہیں، مگر ان سے پوچھو کہ سب سے بڑا کون ہے جو سب کا مالک ہے، تو کہیں گے وہ پریشور ہے، پریشور
 اسے کہتے ہیں جسے ہم معبود کہتے ہیں۔ مجس و دھما مانتے ہیں، ایک خالق خیر (یزدان) دوسرا خالق شر (اہرن) بظاہر یہ شرک فی الذات
 ہے مگر جب ہم نے ان سے سوال کیا تو معلوم ہوا کہ اصل منتج ایک ہی ہے پھر دو شاخیں ہو گئی ہیں جس طرح ہم امیس کے متعلق کہتے ہیں کہ اس کا خالق
 بھی اللہ تعالیٰ ہی ہے اسی طرح وہ لوگ اہرن کو یزدان کے ماننے کو دیتے تھے، اہل کو بھی اللہ کو ایک درجہ میں داخل ہی مانتے تھے، قرآن نے
 فرمایا: وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَنَحْنُ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ لَيَقُولُنَّ اللّٰهُ (۳) آگے فرمایا: وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ

(۱) وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللَّهِ وَقَالَتِ النَّصَارَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللَّهِ (سورہ توبہ : ۳۰)

(۲) اَتَّخَذُوا اَحْبَارَهُمْ وَرُهَبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ وَالْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ (سورہ توبہ : ۳۱)

(۳) سورہ آل عمران : ۶۴ (۴) سورہ عبس : ۶۱

مَنْ نَزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ مِنْ بَعْدِ مَوْتِهَا يَقُولُونَ اللَّهُ^(۱) دوسری جگہ فرمایا: قُلْ مَنْ رَبُّ السَّمَوَاتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ سَيَقُولُونَ اللَّهُ^(۲) اس کے بعد فرمایا: قُلْ مَنْ يَبْدَأُ مَلَكُوتَ كُلِّ شَيْءٍ وَهُوَ يُخَيِّرُ وَ لَا يُجَارُ عَلَيْهِ^(۳) یہ سب آیات شرکین کو کا عقیدہ بتا رہی ہیں، مگر یہاں بحث یہود و نصاریٰ سے ہے، نصاریٰ حضرت مسیح علیہ السلام کو ثالث ثلاثہ کہتے تھے اور بعض ابنِ اشد کہتے ہیں گویا مثلث تو ہے مگر غیر متساوی الاضلاع کیونکہ باپ سب سے بڑا ہے، بعض نے بجائے روح القدس کے مریم کو شامل کر دیا مگر ان سے جب سوال کرو کہ خدا کتنے ہیں تو یہی جواب دیں گے کہ ایک ہے، اس کا نام توحید فی التثلیث اور تثلیث فی التوحید ہے، یہ عقیدہ بالکل بے بنیاد ہے کیونکہ حقیقتاً اس کا ایک بھی ہونا اور تین بھی ہونا ناممکن ہے اسلئے کہ یہ اجتماع نقیضین ہے، جب گفتگو میں اس مسئلہ کو سمجھانے کے تو ان کے سب سے بڑے پادری فنڈر نے ایک کتاب میزان الحق لکھی اس کا اردو ترجمہ میں نے دیکھا ہے اس نے آخر میں لکھا ہے کہ یہ ایک سرسہ ہے اور مشابہات میں سے ہے، عقل وہاں تک نہیں پہنچ سکتی اس لئے اس کا سمجھنا ریاضت پر موقوف ہے، مگر اس سے پوچھئے کہ پھر تو عیسائی بننے کے بعد (اور وہ بھی مکمل ریاضت کے بعد) یسوع مسکشف ہوگا حالانکہ یہ بات بطور عقیدہ سب سے پہلے قبول کرائی جاتی ہے اور اسی کو مدار عیسائیت قرار دیا گیا ہے، تو جب یہ مدار عقل میں آجائے تب ہی تو قبول کرے گا، اور اس کو مشابہات سے قرار دینا بھی دھوکہ ہے کیونکہ مشابہ اسے کہتے ہیں کہ عقل اس کا انکار نہ کرے بلکہ کہے کہ عقل انسانی سے بالاتر ہے جیسے اللہ کی صفات کو جمع و بصر اور کلام سب مسلم ہیں مگر کیفیت نہیں معلوم نہیں تو یہ مشابہات سے ہیں، اور اگر کوئی کہے کہ یہ دن ہے اور رات بھی ہے اور جب پوچھیں کہ یہ کیسے تو کہہ دے کہ یہ مشابہات سے ہے تو یہ باطل ہے کیونکہ یہ اجتماع نقیضین ہے اور جب اجتماع نقیضین وارفعہا جائز ہوا تو پھر دنیا میں محال کیا رہا، بہر حال مشابہ کے یہی نہیں مگر مشابہ کے معنی وہی ہیں کہ عقل انکار نہ کرے بلکہ یہ ہے کہ کیفیت نہیں معلوم نہیں، اور تمہارے عقیدے کو تو عقل ٹھکراتی ہے اور اسے محال قرار دیتی ہے تو یہ مشابہات میں سے کیسے ہوا؟ اور اگر مشابہات میں سے ان بھی ہیں تو مشابہات کا ماننا اسلام کا بنیادی عقیدہ نہیں بلکہ بنیادی عقیدہ کلہ توحید ہے اور تمہارے مذہب کی بنیاد ہی اس پر ہے۔

مقصود یہاں یہ بتانا ہے کہ جو قوم تین مانتی ہے وہ بھی توحید کی منکر نہیں تو آخر کیا چیز انہیں ایک کہنے پر مجبور کرتی ہے؟ سنو! اس کی وجہ یہ ہے کہ کتب سماویہ توحید کی تعلیم سے بھری ہوئی ہیں، بائبل کے صفحات ملو ان میں توحید کی تعلیم جو پھر کیسے انکار کر سکتے ہیں؟

(۱) سورہ عنکبوت: ۶۳ (۲) سورہ مؤنون: ۸۶، ۸۷ (۳) سورہ مؤنون: ۸۸، ۸۹

اس لئے ایسی صورت نکالی کہ توحید بھی رہے اور تثلیث بھی، تو توحید کو اس قدر مضبوطی سے کپڑا کر اجتماع نقیضین کو بھی جائز قرار دے دیا جائے، بتلاتا ہے کہ فطرت انسانی کا تقاضا یہ ہے کہ ایک ہی ہستی ہونی چاہئے جو سب سے ارغ و اعلیٰ جو، اس لئے سب توحید کے قائل ہیں، یہود اپنے کو سب سے بڑا موصوفہ کہتے ہیں حتیٰ کہ مسلمانوں سے بھی زائد، عزیر علیہ السلام کو ابن اللہ جمہور یہود نہیں کہتے بلکہ انکا ایک فرقہ تھا جس کے بارے میں فتح الباری میں لکھا ہے کہ وہ اب منقرض ہو گیا اور اب اس کا کوئی قائل نہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ضرور تھے، ورنہ یہود اس کی تردید کرتے، مگر قرطبی وغیرہ نے لکھا ہے کہ اب ان میں سے کوئی عزیر علیہ السلام کو ابن اللہ نہیں کہتا، میں اس پر ایک حکایت نقل کرتا ہوں، حاجی امیر شاہ خاں صاحب ایک بزرگ تھے، یہ عالم نہ تھے مگر صحبت بزرگوں کی اٹھائی تھی، ان کا حال یہ تھا کہ بڑے بڑے استادہ ان سے پوچھتے تھے کہ یہ سلسلہ کیسا ہے؟ اور آپ نے کیا سنا ہے؟ تو وہ ایسا جواب دیتے تھے کہ سننے والا سمجھتا تھا کہ بڑے عالم ہیں، تعبیر و تقریر نہایت عمدہ تھی، وہ مجھ سے بیان کرتے تھے کہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ اب عزیر کو ابن اللہ کہنے والا کوئی نہیں، تو مجھے اس کی فکر تھی اور جہاں جہاں مجھے یہود ملے میں نے سب پوچھا، سب نے انکار کیا اور کہا یہ نسبت ہماری طرف غلط ہے، حتیٰ کہ جب میں بیت المقدس پہنچا تو ان کے علماء سے میں نے حلف دیکر پوچھا، سب نے انکار کیا مگر ایک بوڑھے شخص نے جو بہت متراض تھا کہا ہاں! اب بھی ایک فرقہ ہے جو عزیر کو ابن اللہ کہتا ہے، اس فرقہ کا نام بھی عزیر ہے۔ مگر اب وہ بہت کم ہیں اور ایک قریہ میں رہتے ہیں اور ذلت و سکت ان پر سلطہ ہے، میں وہاں پہنچا اور دریافت کیا کہ تمہارا عقیدہ کیا ہے؟ تو انھوں نے کہا کہ ہم کو عزیر کے ابن اللہ ہونے کا ایسا ہی یقین ہے جیسا کہ اللہ کا، یہ آدمی یعنی حاجی امیر شاہ خاں صاحب بہت ثقہ تھے، ہمارے بزرگ انھیں صادق القول کہتے تھے، میں نے شرح مسلم میں بھی اس کو نقل کیا ہے، بہر حال جمہور یہود اس کے قائل نہیں وہ توحید ہی کے قائل ہیں، اب رہا یہ کہ ان کی توحید میں کیا نقص ہے، اسے بعد میں بیان کر دوں گا، یہاں یہ قصود ہے کہ ایک مرتبہ میں سبھی خدا کو ایک کہتے ہیں، یہ اساسی اور بنیادی عقیدہ ہے مگر آگے جا کر تعریف کر کے ایک کو تین کہہ دیا۔

اس کے بعد سنو کہ نبی علیہ السلام کی دعوت کا حاصل یہ ہے کہ میں اس چیز کی طرف دعوت دیتا ہوں جو ہم میں تم میں مشترک ہے اور جب تم بھی ایک کہتے ہو تو پھر تین کیسے کہنے لگے؟ یہ تغیر کیوں کرتے ہو؟ اور جب وہ ایک ہے تو عبادت بھی صرف اسی ایک کی ہونا چاہئے، ایک کہنے کا منفعی ایک ہے کہ تنہا اسی کی عبادت کی جائے، اگر پھر بھی وہ زانیں اور کسی دوسرے کو بھی پوچھتے ہیں لیکن تو اس سے ثابت ہو گا کہ ایک بات پر قائم نہ رہے اور پھر گئے، اب اگر وہ ایسا کریں تو تم کہہ دو کہ اسے لوگو تم شاہد رہو کہ ہم مسلم ہیں، ہم کسی طرح کا تغیر نہیں کرتے صرف اسی اللہ واحد کو معبود سمجھتے ہیں اور تم کہنے کو تو ایک کہتے ہو مگر اس پر قائم نہیں رہے بلکہ تم نے اپنا دعویٰ خود توڑ دیا، تو اگر تم پھر کے تو ہم

اس مکمل الہی کے مفاد اور تسلیم میں ۔

اب یہ بھی سمجھ لو کہ شرک کی کئی قسمیں ہیں، شرک فی الذات، شرک فی الصفات، شرک فی الالوہیت، امت محمدیہ کے سوا دنیا کا کوئی فرقہ خالص توحید کا علمبردار نہیں، کہتے سب ہیں کہ اللہ ایک ہے، لیکن ان میں سے عیسائی اسی کے ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ مسیح علیہ السلام جو آدمی ہو ہی کی طرح سب کام کرتے تھے خدا ہیں، تو جو بشر کو خدا بنا دے وہ ایک کہنے پر کب قائم رہا، اور ان میں سے کسی نے خدا کو بشر بنا دیا جیسے یہود کہ انھوں نے خدا کو بشر بلکہ بشر سے بھی آدمی درجہ پر پہنچا دیا، اس میں ایسے صفات ماننے کہ آدمی آدمی میں بھی ایسے راز الٰہ نہیں ہو سکتے، توراۃ میں ہے کہ جب نوح علیہ السلام کے طوفان سے تمام خدائی بہہ گئی اور اللہ کو خبر ہوئی تو بڑا رنج ہوا اور روتے روتے اللہ کی آنکھیں سوچ گئیں اور فرشتے عیادت کے لئے گئے۔ ایک جگہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور یعقوب علیہ السلام کے درمیان کشتی ہوئی اور یعقوب علیہ السلام نے اللہ کو پچھاڑ دیا، بعض نے توحید کی کہ یہ استعارے ہیں، معاذ اللہ، استغفر اللہ، کیا اللہ کے لئے ایسے ہی استعارے رہ گئے تھے؟ اور استعارے کیسے مانے جائیں؟ انھیں یہود کا یہ قول بھی تو اللہ تعالیٰ نقل کرتا ہے: وَقَالَتِ الْيَهُودُ يَدُ اللَّهِ مَغْلُولَةٌ ﴿۱۳﴾ نیز یہود کا یہ قول بھی قرآن نے نقل فرمایا: إِنَّ اللَّهَ فَعَلْدَرُؤُوسِ الْأَعْيُنِ ﴿۲۶﴾ تو جو اللہ کے بارے میں ایسی بات کہتا ہو اس سے کیا بعید ہے کہ اللہ کے بارے میں اس نے یہ بھی کہہ دیا ہو کہ یعقوب نے کشتی میں اللہ کو پچھاڑ دیا۔ تو ایک نے بشر کو خدا کہا اور دوسرے نے خدا کو بشر بنا دیا، اب رہے ہندو تو انھوں نے کرڑوں بت بنا ڈالے اور وہ اپنی گستاخی میں اس حد تک پہنچ گئے کہ ہر چیز کی پرستش کرنے لگے حتیٰ کہ انسان کے ان اعضاء کی بھی پرستش کرنے لگے جن کا ذکر ہم مجلس میں نہیں کر سکتے، تو جن کا حال یہ ہو وہ کیوں مستقیم فی التوحید ہوں گے۔

الحاصل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت اسی فطرت کی طرف ہے جس پر انسان پیدا کیا گیا ہے، یہ اصل اسلام کے عقیدے کی بات ہے، اگر کوئی مسلمان اس کے خلاف کرے تو ہمیں اس سے کچھ سروکار نہیں۔ ہم تو ایک ہی کو مسمود کہتے ہیں، ایک ہی کو خالق، ایک ہی کو حلال و حرام کرنے والا، ایک ہی کو نفع و نقصان پہنچانے والا، غرض یہ کہ ایک ہی ایک ہے، کسی چیز میں اس کا کوئی شریک نہیں، کوئی ضد نہیں کوئی نہ نہیں، خطا کا مضمون ختم ہوا۔

اب اسلام کے متعلق کچھ کہنا ہے، اس مقام پر اسلام کا لفظ تین جگہ آیا ہے، اس میں گفتگو ہے کہ کیا ہر دین برحق اسلام ہے؟ اسلام خاص اسی دین محمدی کا نام ہے یا ادیان سوا یہ جہد میں سے ہر ایک کا نام اسلام ہو سکتا ہے؟ اسی پر تفرع ہے، یہ بات کہ مسلم صرف اسی کو کہیں گے جو دین محمدی کا ماننے والا ہے، یا سب کو کہیں گے؟

زرقانی نے اس سلسلہ پر بہترین بحث کی ہے، اسی طرح امام سیوطی نے بھی اپنے رسالہ ”اتمام النعمۃ“ میں اچھی بحث کی ہے زیادہ تر لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ اس کا اطلاق صرف دین محمدی پر ہے، مگر متعین علماء یہ کہتے ہیں کہ قرآن میں بہت سے مقامات میں دوسری امتوں پر بھی یہ لفظ بولا گیا ہے، چنانچہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا: **فَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ** ^(۱)۔ یہاں اسلام کی نسبت اپنی امت کی طرف فرمائی، اسی طرح ان کے بیٹوں سے جب سوال کیا گیا، **مَا تَعْبُدُونَ مِنْ بَعْدِي** ^(۲)، میرے بعد کسی پرستش کرو گے؟ تو جواب دیا، **تَعْبُدُ الْهَيْكَلَ وَالْهَابِئَةَ اَبَاءُكَ اِبْرَاهِيمَ وَاسْمَاعِيلَ وَاسْحَاقَ الْهَبَا وَاحِدًا وَاعْتَنَ لَهُ مُسْلِمُونَ** ^(۳)۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کے سب بیٹے کہہ رہے ہیں کہ ہم مسلم ہیں۔ خود حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جہاں خطاب کیا گیا وہاں فرمایا، **اِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ** ^(۴)۔ جب ابراہیم سے ان کے رب نے کہا **اَسْلِمْ** (اسلام لاؤ) انھوں نے کہا **اَسْلَمْتُ** (میں اسلام لایا) اسی طرح حضرت یوسف علیہ السلام کہتے ہیں، **وَوَيْلٌ لِّمُسْلِمًا وَّالْحَقْفَىٰ بِالصَّالِحِينَ** ^(۵) (مجھے مسلم بنکر وفات دے اور صالحین کے ساتھ شامل کر دے)

بہر حال مسلم کا لفظ دوسری امتوں پر بولا تو ضرور گیا ہے مگر اس بارے میں امت محمدیہ کی کچھ خصوصیت ہے اور وہ یہ ہے کہ دوسری امتوں پر نفوی اعتبار سے اطلاق کیا گیا ہے اور لقب کے طور پر یہ صرف دین محمدی کے لئے ہے جیسے حافظ کا لفظ کہ حافظ سیکڑوں ہوئے مثلاً ابن قیم، ابن تیمیہ، تقی الدین، ابن قیم، العید وغیرہ سب حافظ ہیں مگر جب کہا جائے یا لکھا جائے کہ حافظ نے کہا یا حافظ نے لکھا تو یہی سمجھا جائے گا کہ حافظ ابن حجر عسقلانی نے کہا یا لکھا، یعنی ان کا یہ لقب ٹھہر گیا اس لئے کسی دوسرے کا یہ لقب نہیں بنے گا اسی طرح گو دوسروں کے لئے اسلام اور مسلم کا اطلاق کیا گیا ہے انبیاء علیہم السلام پر بھی اور دوسری امتوں پر بھی مگر لقب خاص صرف اسی امت کے لئے ہے اس کا نام ہی مسلم رکھ دیا گیا جیسا کہ دوسری امتوں میں سے کسی کا یہود، کسی کا نصاریٰ نام رکھ دیا گیا۔ تو اب جب اسلام بولیں تو ہمیں دین محمدی مراد ہوگا اور یہی متبادر ہوگا، اصل یہ ہے کہ اسلام کے نفوی معنی تسلیم و توفیق کے ہیں گو اس کے اور بھی کئی معنی ہیں مگر میری بحث اس وقت اس معنی سے ہے، تو جتنے بھی انبیاء علیہم السلام تشریف لائے سب نے اسی اسلام کی تعلیم دی اور تمام انبیاء و رسل کی یہی دعوت تھی کہ اللہ کے احکام کے سامنے گردن ڈالیں اور اس کے اوامیر کی بجا آوری اور نواہی سے احتساب کریں اور اپنے تمام امور کو اللہ کے سپرد کر دیں، تواضع، خضوع، خشوع، جھکنا، پستی، جس کا خلاصہ توفیق ہے سب اللہ کے لئے ہو چنانچہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے بلقیس کو یہ لکھا تھا

(۱) آل عمران: ۱۰۲ (۲) بقرہ: ۱۳۳ (۳) بقرہ: ۱۳۳ (۴) بقرہ: ۱۳۱ (۵) یوسف: ۱۰۱

وَأَوْفَىٰ مُسْلِمِينَ (ای مطیعین)

یہاں لغوی معنی مراد ہیں کہ خود کو ہمارے سپرد کر دو، قرآنوں نے کہا کہ میں تو پہلے ہی اپنے کو آپ کے سپرد کر چکا ہوں، اور اس کا اصل آیت فَلَمَّا أَصْلَمَا سے ہوا، یہاں اَسْلَمَا سے کیا مراد ہے؟ کیا یہ مراد ہے کہ اب کلمہ پڑھا؟ نہیں! بلکہ یہ کہ باپ نے بیٹے کو ذبح کرنے میں تامل نہ کیا حالانکہ [اس کو] بڑی بڑی تمناؤں سے پالا تھا مگر حکم ہونے پر اسے اللہ کے سپرد کر دیا اور بیٹے نے بھی کہا: "بادا جان! جو حکم کیا گیا ہے کر گزرتے کیون تاخیر ہے؟ ہم تو [اپنے کو] سپرد کر چکے" دوسرے لفظوں میں کہو کہ "مسلمانی" حکم پر داری کا نام ہے خواہ کوئی حکم ہو اور کسی وقت ہو اس اسلام کی دعوت تمام انبیاء نے دی اور حضور نے بھی اسی کی دعوت دی، تو اسلام کے معنی یہ ہوئے کہ جس وقت جو حکم جس شخص کے ذریعہ بندے کی طرف پہنچے جس اسے فوراً قبول کرے، جب اسلام کے یہ معنی ٹھہرے تو کیا منکر مسیح مسلم ہو سکتا ہے؟ اسی طرح جتنے بعد کو نبی آئے وہ پہلے کی تصدیق کرتے ہیں لہذا جب کسی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مان لیا تو گویا تمام انبیاء کو مان لیا، تو اسلام کا یہ فرد کامل کہ کوئی چیز اس سے خارج نہ ہو سوائے اہل اسلام کے اور کسی کے اندر نہیں پایا جاتا، اللہ کے کلام کی سب نے دعوت دی مگر آخری پیام اور آخری احکام چونکہ حضور نے پہنچائے اس لئے یہ پیام اکمل تر ہے، نیز یہ عالمگیر، ابدی اور جامع تر ہے، یہ اس کی خصوصیات ہیں، ان وجوہ مرتبہ کی وجہ سے اس کا نام اسلام ہو گیا۔

اب اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا یاد کرو، وَادِّيرْغَ اِبْرَاهِيمَ الْقَوَّادِ مِنَ الْبَيْتِ وَاسْمِعِلْ رَمًا نَقَبَلْ مِمَّا لَكَ اَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ (۱) رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ (۲) حضرت ابراہیم علیہ السلام دعا لگ رہے ہیں تو اس میں کہتے ہیں وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ یعنی ہم کو اپنا فرماں بردار بنائے رکھ، یہاں مراد وہی ہے کہ ایسا کامل و فادار اور ثابت قدم رکھ کہ کبھی ٹھوکر نہ کھائیں، آگے کہتے ہیں کہ ہماری اولاد سے امت مسلمہ بنادے، اس سے امت محمدیہ مراد ہے، قرینہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام دونوں ل کر دعا کر رہے ہیں اور دونوں کی ل کر ذریت صرف امت محمدیہ ہے، دوسری امتیں (یہود و نصاریٰ) اسحاق علیہ السلام کی اولاد ہیں، سیکڑوں نبی آئے مگر اسماعیل علیہ السلام کی ذریت میں سوائے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کوئی نبی نہیں آیا اور حضور نے نبوت ختم کر دی کہ نبی کی توفیق کے وقت دعا کرنا قرینہ ہے کہ جہاں دعا مانگی ہے وہیں سے قوم اٹھے گی، دوسرے مقام پر ہے: هُوَ مَعَكُمْ اَلْمُسْلِمِينَ (۳) اسی نے تمہارا نام (مسلمین) مسلمان رکھا۔ اکثر علماء نے اسم جلالہ کو کھوکھو کا مرجع قرار دیا ہے اور میں نے کہا کہ ابراہیم مرجع ہیں، صحیح تو یہی ہے کہ اللہ ہی مرجع ہے

قَالَ ابُوسُفْيَانٍ فَلَمَّا قَالَ مَا قَالَ وَفَرَغَ مِنْ قِرَاءَةِ الْكِتَابِ كَثُرَ عِنْدَكَ الصَّخَبُ

ابوسفیان نے کہا جب ہرقل کو جو کہنا تھا وہ کہ چکا اور خط پڑھ چکا تو اس کے پاس بہت شور مچا اور آوازیں بلند ہوئیں اور ہم باہر نکال
وَارْتَفَعَتِ الْأَصْوَاتُ وَأَخْرَجْنَا فَقُلْتُ لِأَصْحَابِي حِينَ أَخْرَجْنَا لَقَدْ أَمَرَ أَمْرًا بِي كِبَشَةٍ
دے گئے، میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا جب ہم باہر نکالے گئے، ابوکش کے بیٹے کا تو بڑا درد ہو گیا، اس سے روہیوں کا
إِنَّمَا يَخَافُهُ مَلِكُ بَنِي الْأَصْفَرِ فَلَزَلْتُ مُوقِنًا أَنَّهُ سَيُظْهِرُ حَتَّىٰ ادْخُلَ اللَّهُ عَلَى الْإِسْلَامِ
بادشاہ ڈرتا ہے (اس روز سے) مجھ کو برابر یقین رہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غالب ہوں گے یہاں تک کہ اللہ نے مجھ کو مسلمان کر دیا۔

گرمیں یوں کہتا ہوں کہ جس نے ابراہیم کی طرف نسبت کی اس نے واسطہ کی طرف نسبت کی اور جس نے اللہ کو مرجع کہا اس نے واسطہ کا ذکر نہیں کیا۔
الحمد لله سيوطي رحمه الله كوان کے اپنے رسالہ میں جو اشکال پیش کرتے ہیں اب وہ باقی نہیں رہے۔

ان آیتوں میں إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِينَ أُوُوا إِلَهُاتٍ إِلَّا فِي أَمْنٍ بَعْدَ مَا جَاءَهُمُ
الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ وَمَنْ يَكْفُرْ بِاللَّهِ فَإِنَّ اللَّهَ سَوَّعَ الْحِسَابَ (۱) ۵ فَإِنْ حَاجَّكَ فَقُلْ أَصْلَحْتُ وَجْهِيَ لِلَّهِ وَمَنِ ابْتَعِطُ
وَقُلْ لِلدِّينِ أَدْوَا الْكِتَابِ وَالْأَمِيتِينَ ءَاسَلَمْتُعَطُ فَإِنْ أَسْلَمْنَا فَقَدْ أَهْتَدُوا وَإِنْ قَوْلُوا فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ ط وَاللَّهُ
بَصِيرٌ الْعَبَاد (۲) ۵ سوال یہ ہے کہ وہ جھوٹے کیا تھے جن کی طرف فَإِنْ حَاجَّكَ میں اشارہ کیا ہے؟ دراصل وہ جھوٹے یہی تھے کہ ان کتاب
بھی اپنے آپ کو مسلم کہتے تھے چنانچہ تیسرے بھی خود کو مسلم کہا تھا، تو حضورؐ نے فرمایا کذب وہ جھوٹا ہے، اسی طرح دند بخران نے بھی
اسی کا دعویٰ تھا اور حضورؐ نے اس کی بھی تردید کی تھی، حضورؐ نے اس کے جواب میں فرمایا تھا: جب اللہ کا بیٹا بناتے ہو، سو رکھتے ہو شراب
پیتے ہو اس کے باوجود اسلام کا دعویٰ کرتے ہو تو یہ دعویٰ کیوں کر صحیح ہو سکتا ہے؟ یہی بات تیسرے کے جواب میں بھی کہی تھی، اکثر مفسرین کا
خیال یہی ہے کہ انھیں خیالات و نزاع کے دفعیہ کے لئے یہ آیت نازل ہوئی ہے، مگر میں اس کی تفسیر کچھ کہی بیان کروں گا۔

فَلَمَّا قَالَ مَا قَالَ یعنی جب وہ سب کچھ کہ چکا اور گفتگو اس کی ختم ہو گئی تو

كَثُرَ عِنْدَكَ الصَّخَبُ یعنی شور و غل مچ گیا کیونکہ پادری اور پوپ سمجھے کہ یہ مسلمان ہو گیا اس لئے شور برپا ہوا۔
وَأَخْرَجْنَا ہم نکال دے گئے۔

فَقُلْتُ لِأَصْحَابِي اس کے بعد میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ ابن ابی کبشہ کی بات بہت بڑھ گئی، یعنی ابوسفیان نے

وَكَانَ ابْنُ النَّاطُورِ صَاحِبُ إِيلِيَاءَ وَهَرَقْلُ سُقْفًا عَلَى نَصَارَى الشَّامِ يُحَدِّثُ أَنَّ

(زہری نے کہا) ابنِ ناطور جو ایلیا کا عالم اور ہرقل کا مصاحب اور شام کے نصاریٰ کا پیر پادری تھا وہ بیان کرتا تھا کہ ہرقل جب ایلیا (ہیت القدس)

هَرَقْلُ حِينَ قَدِمَ إِيلِيَاءَ أَصْبَحَ يَوْمًا خَبِثَ النَّفْسِ فَقَالَ بَعْضُ بَطَارِقَتِهِ قَدْ اسْتَنْكَرْنَا

میں آیا تو ایک روز صبح کا بخبیہ تھا اس کے بعض مصاحب کہنے لگے (کیون خبیہ تو ہے) ہم دیکھتے ہیں (آج) تیری صورت اتنی ہوئی جو

هَيْئَتِكَ قَالَ ابْنُ النَّاطُورِ وَكَانَ هَرَقْلُ حَزَاءً يَنْظُرُ فِي النُّجُومِ فَقَالَ لَهُمْ حِينَ سَأَلُوهُ

ابنِ ناطور نے کہا ہرقل غمی تھا اس کو ستاروں کا علم تھا جب لوگوں نے اس سے پوچھا (تو کیوں بخبیہ رہے) تو کہنے لگا میں نے

إِنِّي رَأَيْتُ اللَّيْلَةَ حِينَ نَظَرْتُ فِي النُّجُومِ مَلِكَ الْجَنَانِ قَدْ ظَهَرَ مَنْ يَخْتَنُ مِنْ هَذَا

آج کی رات ستاروں پر نظر کیا تو ایسا معلوم ہوا کہ (ختم کرنے والوں کا بادشاہ غالب ہوا تو اس زمانہ والوں میں کون لوگ ختم کرتے ہیں؟ اس کے

الْأَمَةِ قَالُوا لَيْسَ يَخْتَنُ إِلَّا الْيَهُودُ فَلَا يُمْنُكَ شَأْنُهُمْ وَاصْتُبَّ إِلَى مَدَائِنَ مَلِكِ

مصاحب کہنے لگے یہودیوں کے سوا کوئی ختم نہیں کرتا تو ان کی کچھ نہ کر دو اور اپنے علاقہ کے شہروں میں (وہاں کے ماکوں کو) کھو بیچ دینے

فَيَسْتَلُوا مَنْ فِيهِمْ مِنَ الْيَهُودِ فَيَبْنَاهُمْ عَلَى أَمْرِهِمْ أَيْ هَرَقْلُ بِرَجُلٍ أَرْسَلَ بِهِ مَلِكُ

یہودی دہانگان کو ارڈا دیں وہ لوگ یہاں کر رہے تھے اتنے میں ہرقل کے سامنے ایک شخص کو لائے جس کو خسان کے بادشاہ (حارث ابن

عَسَّانُ يُخْبِرُ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

ابنِ ثمر) نے بھیجا تھا وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حال بیان کرتا تھا

قیصر پر کتب کا جب یہ اثر دیکھا تو اپنے رفقاء سے کہا کہ جب یہ ڈر گیا تو اس کی بات بہت بلند ہو گئی اور بہت آگے جا چکی

ابنِ ابی کبشہ کہنے کی ایک وجہ تو یہ کہ گئی ہے کہ ابوکبشہ یا علیر سعدی رضی اللہ عنہا کے شوہر کا نام ہے یا ان کے آباء واجداد میں

کسی کا نام ہے اس بنا پر بیضوں کا یہ خیال ہے کہ اسی ادنیٰ مناسبت کی وجہ سے یہ نسبت کر دی بیضوں نے یہ کہا ہے کہ بنی خزاہ کے ایک شخص ابوکبشہ

نامی نے بت پرستی چھوڑ کر "شعرلی" سارے کی سرپرستی شروع کر دی تھی تو اسی مناسبت سے نسبت کر دی کہ جس طرح اس نے اپنی قوم کا دین

چھوڑ دیا تھا ایسے ہی انھوں نے بنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے

قوله بنی الاصفر اس سے مراد وہی ہیں ان کی رنگت کے لحاظ سے اور یعنی دیگرہ نے کہا کہ ان کے آباء واجداد میں سے کسی

کی طرف نسبت کی گئی ہے

حتی داخل اللہ علی الاسلام یعنی اس وقت سے برابر یقین رہا اس میں تغیر نہیں ہوا

فَلَمَّا اسْتَخْبَرَهُ هِرَقْلُ قَالَ اَذْهَبُوا فَانظُرُوا اَفْخَتْنِ هَؤُمًا لَا ، فَنَظَرُوا اِلَيْهِ فَاَحْدَثُوهُ

جب ہرقل نے سب خبر اس سے سن لی تو (اپنے لوگوں سے) کہنے لگا ذرا جا کر اس شخص کو دیکھو اس کا ختنہ ہوا ہے یا نہیں، انہوں نے
 اَنَّهُ فُخْتْنِ وَسَالَهُ عَنِ الْعَرَبِ فَقَالَ هُمْ يَخْتَنُونَ فَقَالَ هِرَقْلُ هَذَا امْلِكُ هَذِهِ
 اس کو دیکھا اور جا کر ہرقل سے بیان کیا کہ اس کا ختنہ ہوا ہے اور ہرقل نے اس شخص سے پوچھا کیا عرب ختنہ کرتے ہیں؟ اس نے کہا
 الْاُمَّةُ قَدْ ظَهَرَ ثُمَّ كَتَبَ هِرَقْلُ اِلَى صَاحِبِهِ لَهُ بِرُومِيَّةٍ وَكَانَ نَظِيرُهُ فِي الْعِلْمِ
 ہاں ختنہ کرتے ہیں، تب ہرقل نے کہا: یہی شخص (پیغمبرِ مہاب) اس امت کے بادشاہ ہیں جو غالب ہوئے ہیں، پھر ہرقل نے اپنے ایک
 دوست (دعاظر) کو رومیہ میں کھا، وہ ہرقل کا جوتھا،

حدیثِ شرم ہوگئی قال ابن الناطوس سے نہری کا قول ہے اور یہ مدرج ہے، ابن الناطوس کوئی مذہبی پیشوا تھا، بیت المقدس
 میں حکمران اور ہرقل کا تابع تھا، صاحب کا حقیقی معنی مامی یا دوست ہے اور مجازی معنی امیر، یہاں دونوں معنی لیکر ایک کے لحاظ سے ہرقل کی
 طرف اور دوسرے کے لحاظ سے ایلیا کی طرف اضافت کر دی گئی۔

ناطوس اہل یں باغبان کو کہتے ہیں مگر عیسائیوں کے ہاں ایک عہدہ بھی ہے جیسے بطریق اور پوپ (جو سب سے بڑا پیشوا ہو)
 یہ اسقف تھا اس کو مسقف سین وفاق کے صدر کے ساتھ پڑھا گیا ہے اور سین کے صدر اور فان کے کسرہ کے ساتھ جی معنی باب تغیل سے
 ماضی بھل اور اسقف بھی۔

یہ خلافتِ عمری میں مسلمان ہو گئے تھے، وہ مسلمان ہونے کے بعد بیان کرتے ہیں کہ ہرقل جب ایلیا، میں پہنچا تو ایک روز صبح کو
 بہت کدور اور پریشان حال اور بدمزہ سا تھا۔

بَطَارِقَةٌ جج ہے بطریق کی، اور یہاں خواص مراد ہیں۔
 حُرَّاءُ، اصل میں اسے کہتے ہیں جو قیادہ اور قرآن سے کچھ معلوم کر لیں گے مگر مراد یہاں کاہن ہے، ہرقل کاہن بھی اور نجی بھی
 ملکہ المختان، ملک بھی پڑھا گیا ہے اور ملک بھی۔

قَدْ ظَهَرَ فَمِنْ يَخْتَنُ مِنْ هَذِهِ الْاُمَّةِ یعنی من هذا القرن ومن هذا الزمان یہاں غلبہ سے یہ مراد ہے
 کہ ساری دنیا پر چھا جائیگا اس لئے اسے اپنی بھی ٹکڑی ہوئی۔

فَيَقْتُلُوهُمِنْ فِيهِمْ، یہ ایسی ہی تجویز تھی جیسی فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کے باب میں سوچی تھی اور اچل کیا تھا، بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ
 ہرقل نے اس کو قتل نہیں کیا، کیونکہ وہ سمجھتا تھا اس سے کیا ہونے والا ہے، چونکہ وہ عالم بھی تھا اس لئے اسے یہ مشورہ پسند نہیں آیا۔

وَسَارَ هَرَقْلُ إِلَى حِمصَ فَلَمَّ يَرْمِ حِمصَ حَتَّى أَنَاكَ كِتَابٌ مِنْ صَاحِبِهِ يُؤَانِقُ رَأَى
 اور ہرقل خود حمص گیا ، ابھی حمص سے نکلا تھا کہ اس کے دست (مضاطر) کا خط اس کو پہنچا ، اس کی بھی رائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
 ہرقل علی خروج النبی صلی اللہ علیہ وسلم وَاِنَّهُ نَبِیُّ نَادِنِ هَرَقْلَ لِعِظَاءِ الرُّومِ
 کے ظاہر ہونے میں ہرقل کے موافق تھی ، یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پیغمبر ہیں ، آخر ہرقل نے روم کے سرداروں کو
 فِی دَسْكَرَتِهِ لَمْ يَجْهَضْ ثُمَّ اَمْرًا بِاَوْبَابِهَا فَعَلَقَتْ ثُمَّ اَطْلَعَ فَقَالَ يَا مَعْشَرَ الرُّومِ هَلْ نَكُ
 اپنے حمص والے محل میں آنے کی اجازت دی (جب وہ آگئے) تو دروازوں کو بند کر دیا ، پھر اوپر بالاخانہ میں براہ ہوا اور
 فِی الْفَلَاحِ وَالرَّشْدِ وَاِنْ يَنْبِتْ مُلْكُكُمْ فَيَبَايِعُوا هَذَا النَّبِیَّ فَاَصَوَّاحِیْمَةَ حَمْرَ
 کہنے لگا : روم کے لوگو ! کیا تم اپنی کامیابی اور بھلائی اور اپنی بادشاہت پر قائم رہنا چاہتے ہو ؟ اگر ایسا ہے تو اس (دعوت) پر پیروی
 الْوَحْشِ إِلَى الْاَبْوَابِ فُجِدَ وَهَاتِدٌ عَلِقَتْ فَلَمَّا رَأَى هَرَقْلُ فَرَفْتَهُمْ وَاَیْسَ
 بیت کرلو ، یہ سننے ہی وہ جھکی گدھوں کی طرح دروازوں کی طرف لپکے ، دیکھا تو وہ بند ہیں ، جب ہرقل نے دیکھا کہ ان کو ایمان سے
 مِنَ الْاِیْمَانِ قَالَ رُدُّوهُمْ عَلٰی ،

ایسی نفرت ہے اور ایمان لانے سے ناامید ہو گیا تو کہنے لگا : ان سرداروں کو پھر یہاں لاؤ

اَبِیْ هَرَقْلُ یُوجِلُ یَنْکُنْ ہے یہ قاصد عدی بن حاتم ہوں جو اسلام سے پہلے نصرانی تھے یہ بھی پہنچنے والے اس کے بعد وحی
 بھی پہنچ گئی ، بعض روایات میں ہے کہ وحی اور عدی ساتھ ساتھ پہنچے تھے ۔

اسرسل به ملک غسان یخبر عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ، یہ فقرہ ہے اور یہ خط دوسرا تھا جسے
 تبوک کے موقع پر بھیجا تھا اور اس میں وحی ہی قاصد تھے ایک احتمال یہ ہے ، دوسرا احتمال یہ ہے کہ اسی پہلے خط کا ذکر ہو ، بعض تاریخوں میں ہے کہ وحی
 ہی مدینہ اکبریٰ خط لے کر پہنچے تھے ، اس سے ان کی ہمت معلوم ہوتی ہے ۔

تَوَلَّى فَلَمْ يَرَوْهُ ، نہیں چھوڑا ، اس پوپ نے بھی ہرقل کی رائے سے اتفاق کیا ، اب یہ پوپ مسلمان ہوا یا نہیں ؟ تو اگر پہلا خط
 ہے تو بظاہر مسلمان نہیں ہوا اور اگر دوسرا خط ہے تو یہ پوپ جس کا نام مضاطر تھا ضرور مسلمان ہوا اور وحی کے ذریعہ اپنا سلام بھی بھجوا یا اگر اس کی قوم نے
 اس کو قتل کر دیا ، ہرقل کو یہ بہانہ ہاتھ آگیا کہ جب قوم نے اسے نہیں چھوڑا اور قتل کر دیا تو مجھے یکب چھوڑے گی ۔

اس باب میں یونین کا اختلاف ہے کہ جو قیصر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تھا اسی سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں
 جنگ ہوئی یا دوسرا تھا ؟ دونوں قول ہیں ۔

وَقَالَ إِنِّي قُلْتُ مَقَالَتِي إِنَّمَا اخْتَبَرْتُ بِهَا شِدَّةَ تَكْمُّ عَلَى دِينِكُمْ فَقَدْ رَأَيْتُ فَسَجَدُوا
(جب وہ آئے) تو کہنے لگا میں نے جو بات، ابھی تم سے کہی وہ تمہارے زمانے کو کہی تھی کہ دیکھوں تم اپنے دین میں کیسے معیوٹا ہو! اب میں
لَهُ وَرَضُوا عَنْهُ كَكَانَ ذَلِكَ 'اِخْرُشَانِ هِرْمَلِ' .

وہ دیکھ چکا، تب سب نے اس کو سجدہ کیا اور اس سے راضی ہو گئے، یہ ہرقل کا آخری حال ہوا،

قَالَ أَبُو عَبْدِ اللَّهِ رَوَاهُ صَالِحُ بْنُ كَيْسَانَ وَيُونُسُ وَمَعْمَرُ عَنِ الزُّهْرِيِّ .
امام بخاری نے کہا اس حدیث کو صالح بن کيسان اور یونس اور معمر نے بھی (شیب کی طرح) زہری سے روایت کیا ہے۔

دَسْكِرَةٌ 'وہ محل جس کے گرد باغ ہوں'، اَطْلَاعُ 'اوپر سے نیچے دیکھنا' اِشْرَافُ 'نیچے سے اوپر دیکھنا' اپنی مفاہ
اور جان کے غم کی وجہ سے اوپر ہی سے کہا اور نیچے نہیں اترا۔

حافظ نے س شد، نفع شین ضبط کیا ہے گو بسکون بھی صحیح ہے، قرآن پاک میں دونوں لفظ آئے ہیں اور یہی صحیح کا مقابل ہے
قوله 'وَانْ يَثْبِتْ مَلِكُهُ' اسے اس بات کا یقین تھا کہ اسلام قبول نہ کروں گا تو ملک نہ رہے گا۔
سما روٹی میں سب جانوروں سے زیادہ نفور ہوتا ہے۔

قوله 'اِنِّي قُلْتُ مَقَالَتِي إِنَّمَا اخْتَبَرْتُ بِهَا' یعنی میں تو یہ بات کہہ کر تمہارا امتحان لے رہا تھا ورنہ میں اپنے دین پر
قائم ہوں، اب مجھے معلوم ہو گیا کہ تم بھی بڑے کپے ہو۔

فسجد والہ، یعنی سب راضی اور خوش ہو گئے اور اسے سجدہ کیا۔

نَكَانَ ذَلِكَ 'اِخْرُشَانِ هِرْمَلِ'، یعنی پھر وہ اسلام نہ لایا اور یہی حال اس کا آخر عمر نکرا۔
ابو عبد اللہ، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی کینت ہے۔

کتاب الایمان

کتاب ایمان کے بیان میں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

امام بخاری نے کتاب الایمان کے آغاز میں بہت ساری آیات اور احادیث و آثار جمع کر دیے اور اس سے ان کا کیا مقصد ہے یہ بعد میں بیان ہوگا۔ پہلے بطور مقدمہ کے ایمان کے متعلق چند امور بیان کرنا ہوں تاکہ تفہیم میں سہولت ہو۔ اصل یہ ہے کہ ایمان کا ایک معنی لغوی جو اور اس کا مادہ اسن ہے اور یہ خوف کی ضد ہے۔ اس نام سے زوال خوف اور حصول طمانیت کا قرآن میں تصریح ہے اَمَنَهُمْ مِنْ خَوْفٍ (۱) نِزْفَرْنَا وَلَیْسَ لَکُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا (۲) اس سے معلوم ہوا کہ اسن ضد خوف ہے تو اسن نام ہوا زوال خوف اور مطمئن ہو جانے کا اور ایمان باب افعال سے ہے اس کے معنی اب کیا ہوں گے؟ تو سنو کہ کبھی تو یہ متعدی بنفس ہوتا ہے اور کبھی متعدی بالآخر آتا ہے جب متعدی بنفس ہو جیسے اَمَنْتُ زَیْدًا تو معنی ہوں گے میں نے زید کو اسن سے دیا جس طرح اَمَنَهُمْ مِنْ خَوْفٍ میں کہ اللہ نے قریش کو خوف سے امون کر دیا، حرم میں انھیں رکھا جس کی تعظیم ساری دنیا کرتی ہے۔

اور جب متعدی بالآخر ہوتا ہے تو کبھی بار کے ساتھ تعدیہ ہوتا ہے جیسے اَمَّنَ الرَّسُولُ بِمَا اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ (رسول ایمان لائے اس پر جو ان کی طرف ان کے رب کے پاس نازل کیا گیا اور ایمان والے بھی) کثرت سے تعدیہ بار کے ساتھ ہی ہوتا ہے اور کبھی لام کے ساتھ ہوتا ہے جیسے وَمَا اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا (الایہ) یہ قول اخوان یوسف کا ہے جو انھیں نے یعقوب علیہ السلام سے کہا تھا، یہاں تعدیہ بالام ہوا، جب تعدیہ بالام یا بار ہوتا تو اس میں ایک ضمی معنی پیدا ہوتے ہیں، وہ ضمی کیا ہے، مثلاً کوئی کہے کہ ہاں ٹھیک ہے تو سچا ہے، تو اس شخص اس کو تکذیب و مخالفت سے امون کر دیا اور مطمئن کر دیا کہ مخالفت نہ کرے گا، تو جب تک انسان کی تصدیق نہ ہو اس وقت تک اطمینان نہیں ہوتا اور جب تصدیق کر دی گئی تو اطمینان ہو گیا تو تصدیق ایمان کا اصل معنی نہیں مگر چونکہ ذریعہ حصول اطمینان ہے اس لئے اس کو ایمان کے معنی میں شامل کر کے ایمان کی تفسیر تصدیق سے کر دیتے ہیں اور چونکہ تصدیق کا صلہ بار آتا ہے جیسے وَصَدَقَ بِهِ اس لئے ایمان کا صلہ بھی بار لے آئے جیسے اَمَّنَ الرَّسُولُ بِمَا اُنْزِلَ (الایہ) اور جب تصدیق کر دی گئی تو گویا سچائی کے سامنے جھک گیا تو اب ایمان اذعان و اقیاد کے معنی کا بھی متضمن ہو گیا

اس لئے لام سے بھی اس کا تعدیہ ہوا کیونکہ اذعان کا صلا لام آتے ہی وہ امانت ہو من لانا والیہ، اسی مذعن ومنقاد لانا یعنی آپ باری
خبر کو تسلیم نہیں کریں گے، تو تعدیہ تین طرح کا ہوا، ایک نفع، دوسرا بابا، تیسرا بالام، صحیح مسلم میں کتاب الایمان میں ایک حدیث ہے إلا
اعطی من الايات ماثله آمن عليه البشیر^(۱) صرف یہ ایک مقام ہے جہاں ایمان کا صلا علی آیا ہے اس کے علاوہ اور کہیں ایمان کا
صلا علی نظر سے نہیں گذرا، اور اس کی تفسیر یہ کی گئی کہ آمن معتد اعلیہ البشیر۔

یعنی تحقیق تھی اور اس سے سمجھ میں آگیا ہوگا کہ کبھی ایمان کے معنی تصدیق کے آتے ہیں اور کبھی وثوق کے بھی آتے ہیں جیسے آمن بہ
اور جب علی صلا ہو تو مفسرین ہوگا اعتماد کے معنی کو جیسا کہ صحیح مسلم کی حدیث میں ہے جو ابھی گذری، تو ایمان تہامی معانی کو مفسرین ہے۔

لنت کی تحقیق کے بعد سنو کہ شریعت میں ایمان نام ہے التصدیق بما علم بجہی الرسول بہ ضرورتاً کا، آگے تیسرے
تفصیلاً فیما علم تفصیلاً واجلاً فیما علم اجمالاً۔ خلاصہ یہ کہ ایمان تصدیق ہے اس چیز کی جس کی نسبت بالضرورة معلوم ہو کہ اس کو
پیغمبر علیہ السلام اللہ کی طرف سے لائے ہیں جس کا اجمالی علم ہو اس کی تصدیق اجمالاً اور جس کا تفصیلی علم ہو اس کی تصدیق تفصیلاً، یہ تعریف مشکین
نے کی ہے، فقہاء کبھی ضرورتاً کو ترک کر دیتے ہیں، اس تعریف میں جو تصدیق کا لفظ آیا ہے اس سے کیا مراد ہے؟ لغوی معنی یا اس کے علاوہ
چونکہ قسمتی نے ہمارے ہاں علوم یونانیہ کا رواج ہو گیا ہے اس لئے جب کوئی ایسا لفظ بولا جاتا ہے جو فنونِ حکمت میں مستعمل ہے اور ان کی اصطلاحات
میں معروف ہو گیا ہے تو اس کا وہی معنی متبادر ہوتا ہے جو مصطلحِ فلسفہ ہے مگر یہ یاد رہے کہ ان مصطلحات پر مدار شریعت نہیں ہے اس لئے وہاں لغوی
بحث ہوگی الا ان یزید علیہ الشریعة شیئاً تو یونانیوں بلکہ فقہاء کی مصطلحات کا بھی حدیث و قرآن میں دخل نہیں، قرآن اور حدیث
میں تولد اور مصطلحات شرعیہ کا اعتبار ہے۔

تصدیق کے لغوی اور شرعی معنی میرے نزدیک بظاہر (واشرا علم) ایک ہیں تصدیق کے لغوی معنی باور کروں اور گردین کے ہیں
یعنی کسی کو سچا ماننا اور سچا کہنا تصدیق ہے جاننا کافی نہیں، مثلاً کوئی کہے کہ یہ میری کتاب ہے، دوسرا باوجود کہ یہ سمجھتا ہے کہ اسی کی ہے مگر ماننا نہیں
کہ ہاں میری ہے تو نعت میں اسے تصدیق نہ کہیں گے، معرفت، علم، یقین کہہ دیں گے مگر تصدیق نہ کہیں گے گو منطقین تصدیق کہہ دیں، لنت
والے تصدیق اس وقت کہیں گے جب وہ تسلیم کر لے اور مان لے، چنانچہ یاد ہوگا کہ قرآن میں علم، معرفت، یقین کا لفظ کفار کے لئے ہے مگر انھیں
مومن نہیں کہا گیا۔

علم، جاننا، معرفت، پہچانا، یقین، ایک جانب متعین ہو جانا، شک نہ ہونا۔

(۱) ایہ حدیث بخاری ص ۸۰ میں بھی ہے۔

قرآن میں اہل کتاب کے لئے فرمایا: **الَّذِينَ آمَنُوا هُمُ الْكِتَابُ يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ آبْنَاءَهُمْ** ^(۱) (جنہیں ہم نے کتاب دی وہ اس کو اس طرح پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں) یہاں معرفت ہے مگر ایمان نہیں۔
 دوسری جگہ ارشاد ہے: **لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَا أَنْزَلَ هَؤُلَاءِ إِلَّا رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ بِصَافِرٍ** ^(۲) (تو جان چکا ہے کہ یہ چیزیں کسی نے نہیں اتاریں مگر آسمان و زمین کے مالک نے تمہارے لئے) یہاں علم ہے مگر ایمان نہیں۔
 ایک اور مقام پر فرمایا: **وَوَحَّدُوا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا أَنْفُسُهُمْ** ^(۳) (اور انہوں نے انکار کیا حالانکہ ان کے نفسوں کو یقین تھا) یہاں یقین ہے مگر ایمان نہیں۔

ان مذکورہ آیات میں علم، معرفت اور یقین فرمایا گیا مگر تصدیق کا لفظ نہیں فرمایا گیا نہ ایمان فرمایا گیا، یہ لفظ عموماً وہیں بولا جاتا ہے جہاں قبول ہو، اگر قبول نہیں ہے تو وہ تصدیق لغوی نہیں۔ تو تصدیق ضد انکار ہے اور معرفت ضد نکارت ہے، نکارت نہ پہچاننے کو کہتے ہیں جیسے کتب حدیث میں منکرات آتے ہیں اسے معرفت کے مقابل لستے ہیں، یہاں بھی (یعنی منکر) نکارت سے ہے اور انکار میں عدم قبول ہے اور انکار اس وقت ذائل ہوتا ہے جب قبول آتا ہے، چنانچہ محققین کہتے ہیں کہ تصدیق لغوی و شرعی ایک چیز ہے، دوسری چیز پر اطلاق ہو گیا تو شاذ ہے۔

یہ کہا کرتا ہوں کہ دو لفظ یاد رکھو تو کبھی کوئی دقت نہ ہوگی، وہ یہ کہ تصدیق نام جاننے کا نہیں بلکہ ماننے کا ہے، یہی شرعاً ہی لغت تصدیق ہے، تو تصدیق کے معنی ماننا ہیں، جاننا نہیں۔

صاحب تفسیر روح المعانی نے یومنون بالغیب کے تحت بہترین متون اور جات کلام کیا ہے، انہوں نے لکھا ہے کہ ابن سینا کہتا ہے کہ تصدیق کے معنی گردین اور باور کر دین کے ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ منطقی بھی وہی کہتے ہیں جو لغوی کہتے ہیں، مگر بعض نے کہا ہے کہ نسبت تاریخہ کے علم کا نام تصدیق ہے، مثلاً دور سے کوئی جانور دیکھا اگر متین نہیں، قریب پہنچ کر جو ہی نظر پڑی تو ذوق پہچان لیا کہ پیشہ ہے تو یہ تصدیق منطقی ہے مگر شرع اسے معرفت کہتی ہے یعرفون ابناءہم تصدیق نہیں، تو متحققین کے ہاں تصدیق علم کا نام ہے اور اس میں اختلاف ہے کہ وہ کس قول سے ہے، اور شریعت میں تصدیق فعل ہے افعال نفس سے، دوسرے یکے متحققین کے ہاں تصدیق ظنیات کو بھی شامل ہے اور از دوسرے شریعت وہ یقینات میں منحصر ہے۔

روح المعانی میں لکھا ہے کہ یہ جرجانی وغیرہ کہتے ہیں کہ جب منطقی علم منطق کی ضرورت کو ثابت کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ علم یا تصور ہے یا تصدیق اور ان میں سے ہر ایک بدیہی ہے یا نظری اور نظری میں کبھی خطا ہوتی ہے ' لہذا ایسے قانون کی ضرورت ہے جو عاجم عن الخطا ہو ' اسی کا نام منطق ہے ' لہذا ہم منطق کے محتاج ہیں اور منطق میں تیاس جہد بھی ہے اور تیاس خطابی اور تیاس شعری بھی ' تیاس جہد کی سمات خصم پر موقوف ہے اور خطابی محض ظنیات پر اور شعری محض تخیلات کا نام ہے ' تو یہاں اگر قطعیات کو لے لیں تو پھر یہ قیاسات ثلاثہ اس سے خارج ہو جائیں گے ' حالانکہ ان کی طرف بھی احتیاج ہے اور یہ جزو منطق ہیں لہذا بدیہی بات ہے کہ تصدیق کو عام رکھنا چاہئے گا تا کہ منطقیات اور قطعیات دونوں کو نام و نشان رہے ' اور تصدیق شعری صحت قطعیات میں مخصوص ہے ۔

حاصل یہ کہ ایمان تصدیق لغوی کا نام ہے اور سب کا حاصل یہ کہ ماننا اور قبول کرنا اور اذعان و یقین و تصدیق فعل ہے افعال نفس سے ' اسی کو امام محمد بن عیسیٰ اور امام الحرمین نے لکھا ہے کہ تصدیق کلام نفس کے جس سے ہے یعنی اقرار کر لینا قلب سے اور یہ فعل امر افعال نفس سے ' سمجھنے کو تصدیق نہیں کہیں گے ۔

بعض نے اسی کو کہلے کہ التصدیق قول القلب یعنی جیسے زبان سے کہتا ہے ایسے ہی دل سے بھی کہے ' یہ صحت الفاظ اور جبر کا فرق ہے ' مطلب سب کا ایک ہے کہ دل سے ماننے کو تصدیق کہتے ہیں اور وہی ایمان ہے ' خالی سمجھنا نہ تصدیق ہے نہ ایمان ۔ حضرت کو دینے والوں میں سے بہت سے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ یہ نبی ہیں مگر چونکہ اختیار نہیں تھا یعنی اننا نہیں تھا اس لئے انھیں یسوع نہیں کہتے ' لہذا محض معرفت ' علم ' یقین کافی نہیں بلکہ تسلیم و اختیار ضروری ہے ۔

تفسیر فائز میں ابو طالب کے دشمن نقل کئے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت علیہ السلام کا نبی ہونا جانتے تھے مگر چونکہ انہیں اس لئے یسوع نہ کہلائے ' شعریہ ہیں :

وَلَقَدْ عَلِمْتُ بِأَنَّ دِينَ مُحَمَّدٍ ۖ مِنْ خَيْرِ آدْيَانِ الْبَرِيَّةِ دِينًا

مجھے معلوم ہو گیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دین سارے جہان کے دینوں سے بہت دین ہے
لَوْلَا الْمَلَأَمَةُ أَوْحَدًا أَمْ مَسْبِيَّةٌ ۖ لَوْجَدْتُ نَبِيَّ سَمَحًا يَدُ الْكَافِرِينَ
اگر لوگوں کی طاعت اور ان کے برا بھلا کہنے کا اندیشہ نہ ہو تا تو آپ مجھے کشادہ دل اور واضح طور سے اس کو ماننے والا پاتے

امام ابو حنیفہ سے ایک لفظ منقول ہے الايمان معرفة واقتراس ' ایمان پہچاننے اور اقرار کرنے کا نام ہے ' اس کو

دھوکہ نہ ہو اس لئے کہ امام کی مراد اس معرفت سے معرفت اختیار یہ کہ ہے، نہ مطلق معرفت، خواہ بالا اختیار ہو یا بلا اختیار، ورنہ پھر وہ جہیت کا مذہب ہو جائے گا۔

امام ابو حنیفہؒ سے اور جہم بن صفوان بانی مذہب جہمیہ سے اسی مسئلہ پر مناظرہ ہوا ہے اور اس میں امام صاحب نے خود بتلایا کہ معرفت مطلقہ کا نام ایمان نہیں بلکہ ایمان اختیار کر لینا اور قبول کر لینا ہے۔

یاد رکھا جائے کہ معرفت موقوف علیہ ہے ایمان کا، کیونکہ تصدیق اسی وقت ہوگی جب کہ معرفت ہو، تو امام موقوف علیہ کو بیان فرما رہے ہیں، یا منویہ کی معرفت مراد ہے اور وہ ذکر کی کثرت کے بعد ہوتی ہے، یعنی ایمان کا نام ایمان ہے، بہر حال تاویل ضروری ہے کیونکہ جہم ابن صفوان سے امام صاحب کا مناظرہ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ ان کی مراد یہ نہیں ہے، جہمیہ نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ ان کا ایمان، ایمان صدیق کے شل ہے، و بطلانہ ظاہر۔

دوسرا جزو، بما علمہ مجیثہ علیہ السلام بہ ضرورت ہے، یعنی ایمان امام ہے نبی کو سپمانے کا ان تمام اشیاء میں جو نبی علیہ السلام اللہ کی طرف سے لائے اور ہیں اس کا علم ضرورت ہوگا، ضرورت کی قید اس لئے لگائی کہ جو چیزیں خبر واحد یا قیاس سے ثابت ہوں ان کے انکار سے کفر لازم نہیں آتا، اور اگر ضروریات میں سے کسی چیز کا انکار کر دے تو بیشک کافر ہوگا، ضرورت کے معنی یہ ہے کہ جس کے متعلق علم قطعی ہو کہ حضور علیہ السلام سے یہ منقول ہے، گو وہ مستحب ہی کیوں نہ ہو، جیسے مسواک کا انکار کہ حضور سے ثابت نہیں تو یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی کہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم غوثِ باندہ کوئی پیدای نہ ہوئے، تو چونکہ قرآن بعد قرنِ وائر چلا آ رہا ہے اس لئے اس کا منکر کافر ہوگا، تو ضرورت کے معنی قطعی کے ہیں مگر ایسا قطعی جس سے ہر عام و خاص واقف ہے۔

اور بعض اشیاء نظری ہیں، مگر علم اس کا ضروری ہے جیسے عذابِ قبر کہ اس کا علم اور ثبوت بالضرورت ہے، اگر کوئی عذابِ قبر کے ثبوت کا منکر ہو جائے تو وہ کافر ہے، اسی لئے مسئلہ رویت باری تعالیٰ کے منکر کو مبتدع کہا گیا ہے، نہ کافر، کیونکہ پھر بھی کچھ نظری چیزیں باقی ہیں۔ ایمان کی تعریف میں اس کے بعد یہ قید نہ کر رہے کہ اجمالاً فیما علمہ اجمالاً، نیز میں اگر ایک حکم اجمالی طور پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے تو تو من ہونے کے لئے اس کا اجمالی علم کافی ہے جیسے عذابِ قبر، کہ اس کا اجمالی علم کافی ہے، باقی ہی یہ تفصیل کہ اس کی کیفیت کیا ہے تو اس کا تسلیم کہ نا ضروری نہیں، نہ اس کا منکر کافر ہوگا، ہاں مبتدع ضرور ہو جائے گا۔

ایمان کی تعریف ختم ہوگی، مگر اس میں یکہیں نہیں آیا کہ اقرار بھی جزو ایمان ہے یا نہیں؟ — دراصل اس میں یہ قول ہے، بعض کہتے ہیں اقرار نہ شرط ہے نہ جزو، صرف تصدیق کافی ہے خواہ ہم اسے مومن نہ کہیں اور احکام اسلام اس پر جاری نہ کریں، تو ایک ایسا حکم ظاہری کا اجراء ہے اور ایک احکام اخروی کا، تو وہ ہمارے عرف میں مومن نہیں مگر فی ما بینہ و بین اللہ مومن ہے، 'مرجئہ کا مسلک یہی ہے، اہل حق کہتے ہیں کہ اس میں کچھ تفصیل ہے، ایک یہ کہ ایک شخص نے قلب سے تصدیق کی مگر اسے نطق کا موقع نہ ملا، مثلاً اس کو سکتا یا لقمہ ہو گیا یا وہ انحرس (گولنگا) ہے، تو محققین کہتے ہیں کہ جو عاجز عن النطق ہو خواہ عجز کسی وجہ سے ہو تو وہ مومن ہے کیونکہ ایمان تصدیق قلبی ہی کا نام ہے فرمایا: **أُولَٰئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ** ^(۱) نیز فرمایا: **وَلَمَّا يَدْخُلِ الْإِيمَانُ فِي قُلُوبِكُمْ** ^(۲) ان دونوں آیتوں سے معلوم ہوا کہ ایمان صفت قلب ہے، تو قلب سے ماننے والا اگرچہ اقرار لسانی سے عاجز ہو مومن ہے، اور ایک وہ ہے جسے اقرار کا موقع ملا مگر اس نے اقرار نہیں کیا، تو یہ کافر ہے، اس کے حق میں اقرار جزو ایمان ہے، تو اب ان تاملین جزئیات کے ہاں اکراہ کی صورت میں بھی ایمان متحقق نہ ہوگا، اور بعض لوگوں نے اقرار کو جزو نہیں کہا کیونکہ اکراہ کی صورت میں ان کے نزدیک اقرار کا اعتبار ساقط ہو جاتا ہے، ہاں انھوں نے افسار کو شرط کہا ہے۔

ابن ہمام نے نقل کیا ہے کہ جو لوگ اقرار کو شرط نہیں کہتے ان کی مراد یہ ہے کہ اگر اس سے مطالبہ کیا جائے اور اقرار نہ کرے تو وہ کافر ہے، مطالبہ کے وقت اسے اقرار کرنا ضروری ہے اور اس میں گفتگو اسی وقت تک ہے جب تک اس سے مطالبہ نہ ہو، تو ایمان تصدیق کا نام ہے اور اقرار شرط ایمان ہے یا جزو، یا بالکل ضروری نہیں، اس بارے میں امام صاحب سے دو قول منقول ہیں، ایک یہ کہ شرط ہے، دوسرا یہ کہ شرط ہے، یہ تو اصل تعریف ایمان ہے، آگے ایک تیسری چیز ہے جس میں اختلاف ہے کہ وہ بھی جزو ایمان ہے یا نہیں اور اگر جزو ہے تو کس حیثیت کا، تیسری چیز اعمال ہیں، اس میں چار مذہب مشہور ہیں، چاہو تو پانچ بھی بنا سکتے ہو۔
 اول متزلزلہ خوارج کا ہے، کہ اعمال جزو ہیں، اگر ایک عمل بھی چھوڑا، یا ایک کبیرہ کا مرتکب ہوا، تو وہ مومن نہ رہا، وہ قطعاً خارج عن الایمان ہے، لیکن ایمان سے نکل کر کافر ہوا یا نہیں؟ خوارج کہتے ہیں کہ وہ کافر ہو گیا کیونکہ بیعت میں کوئی چیز نہیں، متزلزلہ کہتے ہیں کہ وہ کافر ہے نہ مومن بلکہ وہ ایسا بن گیا جیسے خضیٰ مشکل، اور اس کا نام فاسق رکھا، فاسق ہمارے یہاں بھی ہے مگر وہ مومن ہی کے تحت داخل ہے، مگر ان کے ہاں تین نوعیں ہو گئیں، ایک مومن، ایک کافر، ایک فاسق، اسی کو اقلب متقاد میں

کہتے ہیں واسطۃ بین الایمان والکفر جیسے مرد ایک صنف، عورت ایک صنف، خنثی شکل ایک صنف، تو معتزلہ و خوارج اس میں تو متفق ہیں کہ اعمال جزو ایمان ہیں اور ان کے نہ رہنے سے مومن نہ رہے گا، پھر آگے وہ اختلاف ہے جو مذکور ہوا۔

اس کے بالکل بالمقابل مرجعہ ہیں، وہ کہتے ہیں کہ عمل کا کوئی تعلق ایمان سے نہیں، نہ جزو، نہ کچھ اور، مذاب میں عمل کو دخل بالکل نہیں، غیر مال ایک سنت کو بھی داخل فی الایمان نہیں ہو سکتا، خواہ کیسے ہی عمل کرو، ثواب و عذاب میں اسے کچھ دخل نہیں، صرف تصدیق قلبی کافی ہے، حتیٰ کہ قول کی بھی ضرورت نہیں، تو ان کے اہل اعمال معطل ہیں، عجیب بات ہے، معتزلہ نے ایک کبیرہ کے ترکب کو ابدالاً باد کے لئے جہنم میں جھونک دیا اور مرجعہ نے کہا کہ چاہے اعمال بغیر جھونکا رہے، ایک سنت کو بھی جہنم میں نہ جائے گا دونوں ایک ایک سرسے پر ہیں، درمیان میں اہل السنۃ ہیں جو کہتے ہیں کہ نہ تو ایسا جزو ہے کہ ایمان سے خارج کر دے، اور نہ ایسا غلطہ کہ اسے کوئی دخل ہی نہ ہو، تمام اہل السنۃ اس بات پر متفق ہیں کہ تارک عمل کے لئے غلو فی الایمان نہیں لیکن وہ سختی عذاب ہے، اہم تمام ائمہ متفق ہیں، آگے تعبیر اور عنوان میں فرق ہے، 'جمہور محدثین'، امام اوزاعی، اسحاق، امام مالک، امام شافعی وغیرہ ائمہ نے کہا دیا کہ ایمان قول و عمل و اعتقاد کا نام ہے (۱)، اور امام ابوحنیفہ اور جمہور متکلمین کہتے ہیں کہ عمل جزو ایمان نہیں، صرف تصدیق کا نام ایمان ہے، نفس حقیقت (۲) ایمان میں اعمال داخل نہیں، محدثین کی تعبیر قریب بہ مذہب معتزلہ ہے اور امام و متکلمین کی قریب بہ مذہب مرجعہ، حتیٰ کہ بعض نے (جیسے ابن قتیبہ وغیرہ) امام کو مرجعہ میں شمار کر دیا، محدثین نے بھی امام کو مرجعہ سے شمار کیا، مگر اس کے معنی دوسرے ہیں جو بعد میں بیان کئے جائیں گے، تمام اہل سنت ثمرہ و نتیجہ میں متفق ہیں، تعبیر اور عنوان کے اختیار کرنے میں مختلف ہیں، بیت ایک ہے، دروازے مختلف ہیں اور ہر ایک الگ الگ دروازے سے داخل ہوتا ہے، گناہاں،

عباساً اتناشست و حسنک واحد، وکل الی ذاک المجمال یثیر

تو اہل سنت کی بھی یہی حالت ہے، ثمرہ میں سب ایک ہیں اور عنوان میں باہم اختلاف ہے، یہ نہ سمجھنا کہ یہ نزاع لفظی ہے کیونکہ یہ ائمہ کی شان کے خلاف ہے، اہل مشابہہ نزاع لفظی ضرور ہے۔

ایک بحث ایمان کے زیادہ اور نقصان کی بھی ہے، عامر محمد بن یزید و یعقوب کہتے ہیں اور امام اعظم لایزید و لایعقوب فرماتے ہیں، اس میں بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک طرف تو زیرہ ہے آیات و احادیث کا، اور دوسری طرف معاملاً بالکل

(۱) لَا يُزْنِي الرَّائِي حِينَ يَزْنِي وَهُوَ مُؤْمِنٌ نَزَلَ لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ ثَلَاثَ وَغَيْرَ ثَلَاثَ أَحَادِثَ كَسِ كَرْمِيسَ (۲) وَإِنْ زَنَى وَإِنْ سَوَّى وَغَيْرَ ذَلِكَ يُؤَيِّدُ

نالی نظر آئے، مگر انشراح حقیقت کے بعد سب بھی طرح سمجھ میں آجائے گا اور مسلم ہو جائے گا کہ سب ٹھیک کہنے ہیں اور سوائے تعبیر و عنوان کے کچھ اختلاف نہیں، معنون سب کا ایک ہے۔

پہلی چیز یہ ہے کہ جو لوگ ایمان کو مکب کہتے ہیں ان کے نزدیک تین چیزیں ہیں، 'اعتقاد'، 'قول'، 'عمل'۔ تو ان کے نزدیک عمل ایمان صرف قلب نہ ہوا، بلکہ تین چیزیں ہوں، 'حلاکہ بکثرت قرآن میں عمل ایمان قلب کو بتایا گیا ہے جیسے اُولَئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ ۖ وَلَكِنَّ اللَّهَ حَبِيبُ إِلَيْكُمْ إِلَّا إِيمَانًا وَرَبِّتَهُ فِي قُلُوبِكُمْ' (۲) 'وَقَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالْإِيمَانِ' (۳) وغیرہ۔

اسی طرح حدیث میں آیا ہے، 'يُخْرِجُ مِنَ النَّاسِ مَنْ كَانَ فِي قَلْبِهِ مَشْغَالٌ ذَرَّةً مِنَ الْإِيمَانِ' تو اگر ایمان میں اعمال جوارح بھی داخل ہوتے تو صرف قلب کو عمل ایمان کیوں کہتے؟ دوسرے یہ کہ قرآن و حدیث میں بکثرت عمل کا عطف ایمان پر کیا گیا ہے جو منافیہ کی دلیل ہے، اگر یہ جزو ہوتا تو عطف سے کیوں بیان کرتے؟ اور یہ کہنا کہ جزو کا عطف کل پر ہے، صحیح نہیں، کیونکہ اول تو پیش لاء نہیں، دوم یہ کہ اصل عطف کی منافیہ ہے، نیز قرآن کریم میں عمل صالح کے ساتھ 'وَهُوَ مُؤْمِنٌ' کی تید لگائی گئی ہے، اگر عمل جزو ہوتا تو یہ تید کیوں لگاتے؟ یہ بھی شعر ہے کہ عمل ایمان سے علمہ شے ہے، کہیں باوجود عصیان کے ایمان کا اطلاق ہوا ہے، جیسے 'وَأَنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلَحُوا بَيْنَهُمَا فَإِنْ بَغْتُمْ أَحَدٌ عَلَى الْآخَرِ يُعَاوِذُكَ اللَّهُ الَّذِي مَتَّعَهُمْ يَوْمَئِذٍ أَنْ تَقْتُلُوا بَعْضُكُمْ بَعْضًا إِنَّ اللَّهَ كَانَ غَفُورًا حَكِيمًا' (۴) اگر دو فریق مسلمانوں کے آپس میں لڑ پڑیں تو ان میں لاپ کرادو، پھر اگر چڑھا چلا جائے ایک ان میں سے دوسرے پر تو تم سب لڑو اس چڑھائی والے سے یہاں تک کہ پھر آئے اللہ کے حکم پر، تو باوجودیکہ باغی گروہ امر اللہ سے ہٹا ہوا تھا مگر اس کو مومن کہا گیا، چوتھی چیز یہ کہ تو بکے ساتھ ایمان کو جمع کیا گیا، 'يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُورُوا إِلَى اللَّهِ فَوْبَةً نَصُوحًا' (۵) معلوم ہوا کہ مصیبت کے ساتھ ایمان جمع ہو سکتا ہے، اسی طرح اور بہت سی دلیلیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ عمل ایمان سے خارج ہے، ہاں کہیں کہیں لفظ ایمان کا اطلاق عمل پر کیا گیا ہے جیسے 'مَا كَانَ اللَّهُ لِيُضِلَّ إِيْمَانَكُمْ' (۶) مگر اطلاق میں کلام نہیں، کلام اس میں ہے کہ آیا حقیقت ایمان میں اعمال داخل ہیں یا نہیں علاوہ بریں یہ معلوم ہو چکا ہے کہ ایمان تصدیق کا نام ہے اور تصدیق یا تو زبان کا وصف ہے یا قلب کا، وہ کسی تیسری چیز کا وصف نہیں بن سکتی۔ دوسرے لفظوں میں اسے یوں کہہ سکتے ہیں کہ تصدیق یا تو زبان کا فعل ہو سکتا ہے یا قلب کا، کسی تیسری چیز کا فعل نہیں ہو سکتا، اب اگر ایمان تصدیق و عمل کے مجرور کا نام رکھا جائے تو گویا شریعت نے ایمان کو لغوی معنی سے علمہ کر دیا اور اس کا اطلاق ایسے معنی میں کیا جس کو اہل عرب نہیں

جانے تھے۔ حالانکہ اہل عرب کو خطاب کرنے میں انھیں کے نہم کے مطابق کلام ہونا چاہیے اور جو معنی وہ سمجھتے ہوں وہی مراد ہونے چاہئیں، تو جب اہل عرب لغوی معنی ہی سمجھتے ہیں اور اس میں اعمال داخل نہیں ہیں تو اعمال کو جزو ایمان کہنا صحیح نہ ہوگا۔

حدیث جبریل میں دیکھو کہ جب ایمان کا سوال ہوا تو عقائد کا ذکر کیا اور جب اسلام کا سوال کیا تو اعمال کا ذکر کیا، یہ واقعہ ہے کہ ایمان پر اسلام کا اور اسلام پر ایمان کا اطلاق ہوتا ہے مگر یہ تو سنا ہے، حقیقت میں یہ دونوں علمدہ ہیں، یہاں سے اسلام دایمان کا فرق بھی معلوم ہو گیا، یہ بھی ایک اختلافی مسئلہ ہے کہ آیا یہ دونوں ایک ہی ہیں یا علمدہ علمدہ؟ کسی نے ایک کہا اور استدلال کیا وَمَنْ يَتَّبِعْ عَذْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ^{۱۱} اسے اور استدلال کیا إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ^{۱۲} اسے کسی نے کہا کہ اسلام نام ہے انقیاد اور انقیاد وہ وصف ہے جو زبان اور قلب و جوارح سب کو شامل ہے، اور ایمان خاص انقیاد قلبی کا نام ہے، لہذا یہ دونوں خاص و عام ہیں، بعض نے کہا دونوں متضاد ہیں اور فرق ایسا ہی ہے جیسا بدن اور روح میں یا قلب و قلاب میں، غالب اسلام ہے اور روح ایمان، مگر اسلام معتد ہے جب ہوگا کہ اس میں روح یعنی ایمان ہو، اگر صرف بدن ہے تو اس کا اعتبار نہیں، جیسے مردہ انسان، ہاں صورت کے اعتبار سے کبھی لے انسان کہہ دیتے ہیں، ایسے ہی حقیقی اسلام یہ ہے کہ زبان سے تلفظ یا شہادہ اور اعمال مفروضہ و غیر مفروضہ کی ادائیگی ہو، مگر یہ معتد بہ اس وقت ہوگا جب روح ایمان موجود ہو، جس طرح کہ ایمان اگرچہ تصدیقی قلبی کا نام ہے فرمایا: دَهْوَانُ قَوْمٍ بَادِلَتْهُ أَخْ غَرِيہِ اِيْمَانِ کَامِلِ اس وقت ہوگا جبکہ اس دُعا پڑھیں ہو، اور اسلام معتد ہے جب ہوگا جب کہ اس میں یہ روح ہو، روح اگر تنہا ہو اور بدن نہ ہو تو بھی حال حقیقت انسان یہ ہو سکتی ہو، گواہ بھی بہت سے وہ اعمال جو بدن سے مطلوب ہیں پائے نہ جائیں گے، تو یہ نقصان ہے مگر وہ حقیقت کی حال ضرور ہے گو مکمل طور پر نہ ہو، اور بدن میں اگر روح نہ ہو تو وہ بالکل بیکار اور لاشے، محض ہے، وہ صرف صورت ہے اور انسانیت سے بے بہرہ ہے، یہی حال منافق کا ہے کہ جہاد میں شریک ہوتا ہے، نماز پڑھتا ہے اور اَشْهَدُ اَنْكَ لِمَوْلٰی اللہ کہتا ہے، مگر چونکہ یہ صرف صورت ہے اس لئے دنیا میں کام چل جاتا ہے مگر چونکہ روح نہیں اس لئے آخرت میں بے بہرہ رہتا ہے، تو ایمان (روح) بطن اسلام (بدن) کے گو معتبر ہے مگر ناقص ریگا اور کمال حاصل نہ ہوگا اور اسلام بدن ایمان (روح) کے بالکل بیکار ہے، کچھ مفید نہیں، توصیف جبریل بہت بڑی دلیل ہے کیونکہ ایمان و اسلام دونوں کے متعلق الگ الگ اور دونوں میں امتیاز کا سوال ہے اور اسی کا جواب دیا گیا ہے، اب اگر اعمال پر ایمان کا اطلاق ہو جائے تو کچھ مضائقہ نہیں، جیسے اِیْ اَلْاَعْمَالِ اَفْضَلُ کے جواب میں فرمایا: اَلْاِيْمَانُ بَادِلَتْهُ أَخْ، اسی طرح ایمان پر عمل کا اطلاق ہو جائے بھی

مفائقہ نہیں: 'یسے قُلْ مَا يَعْبُوْا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْلَا دُعَاؤُكُمْ' (۱) اِیْ اِیْمَانُكُمْ (۲) یا یسے فرمایا: فَوَسَّیْتَ لَنَسْتَلْتَهُمْ اٰمِیْنِ عَاكَوْا یَعْمَلُوْنَ (۳) یہاں عمل سے مراد قول لا الہ الا اللہ ہے، جیسا کہ بخاری میں ہے، نیز فرمایا: وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِیْ اُذْخَرْتُمْ بِاٰكُفْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۴) یہاں عمل سے مراد ایمان ہے، پس عمل کا اطلاق ایمان پر کیا گیا، مگر ہم حقیقت بیان کر رہے ہیں، توسع اور مجاز سے بحث نہیں ہے، ایمان و اسلام میں تفریق پر سعد ابن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی حدیث بھی دلالت کرتی ہے کہ جب مال آیا اور حضور علیہ السلام قسم فرمانے لگے تو ایک شخص کو آپ نے نہ دیا تو سعد نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ انھیں چھوڑ دے دیئے ہیں 'وہو مومن'، آپ نے نہ فرمایا 'اَوْ مُسْلِمٌ'، تین بار سوال و جواب کے بعد فرمایا: اَقْتَالًا یَا سَعْدُ! (۵) پھر فرمایا: بعض کو یہ سمجھ کر دیتا ہوں کہ ان کے ایمان میں کمزوری ہو اس حدیث میں سب لکھتے ہیں کہ سعد کو متنبہ کرنا مقصود ہے کہ ایمان قلب کا فعل ہے، انھیں کیا حق ہے کہ اس کے قلب پر حکم لگاؤ اور پھر اصرار کر دے، تم یہی کہو کہ وہ مسلم ہے، اس سے معلوم ہوا کہ مومن اور مسلم میں وہی فرق ہے جو ایمان و اسلام میں ہے، تو عند اللہ مسلم وہ ہوگا جو مومن ہو، مگر خدا اس مسلم کیلئے مومن ہونا ضروری نہیں، قرآن میں خود موجود ہے: قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّهٗ قَوْلُكُمْ وَ لٰكِنْ قَوْلُوْا اٰمَنَّا (۶) ان اعراب میں یا تو ایمان ہی نہ تھا، صرف زبان سے اظہار تھا، یا ایمان تو لائے تھے مگر رسوخ نہ ہوا تھا، اسی کو فرمایا: وَلَمَّا یَدْخُلِ الْاِیْمَانُ فِیْ قُلُوْبِكُمْ (۷) مسلم ہوا کہ ایمان قلب میں ہوتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ اسلام و ایمان میں ظاہر و باطن اور روح و بدن کا فرق ہے، مگر یہ یاد رہے کہ روح بلا بدن پھر ایک چیز رہتی ہے اور بدن بلا روح لاشے، شخص ہے اور غالباً لاشہ جو ہمارے یہاں مشہور ہے اسی لاشہ سے لیا گیا ہے، تو عمل و حقیقت مکمل ہے اور آثار میں سے ہے مگر نفس ایمان میں داخل نہیں۔

دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ سلف کے وقت سے کہتے چلے آئے ہیں کہ ایمان قول و عمل کا نام ہے (یہ نہیں کہا کہ مرکب ہے: نہ جزو و کل کا اطلاق کیا ہے) قرآن و حدیث سے تو معلوم ہوتا ہے کہ عمل علیحدہ چیز ہے اور ایمان علیحدہ، اور سلف کا قول یہ ہے حق کہ صحابہ و تابعین بھی اس میں شریک ہیں، تو پھر اس قول کا مطلب کیا ہوگا؟

یہاں پر ایک اشکال پیش آیا ہے، حتیٰ کہ امام شافعی رحمہ اللہ کے کچے متبع امام رازی تک گھبرا گئے ہیں اور تفسیر کبیر اور منتخب الشافعی میں بھی یہ کہہ گئے ہیں کہ جب عمل نہ رہا تو جزو فوت ہوا اور انتفاء جزو مستلزم ہے انتفاء کل کو، اور جب کل فوت ہوا تو ایمان کہاں رہا، یہ تو منکر الکامل کا

(۱) فتران: ۷۷ (۲) کما ورد فی البخاری من تفسیر ابن عباس رضی اللہ عنہ (جامع) (۳) الحجر: ۹۳

(۴) زخرف: ۷۳ (۵) مسلم (ص ۱۳) مرتب (۶) حجرات: ۱۴ (۷) البیض

ہو گیا، جب اشکال پیش آیا تو کثرت لوگ مثلاً حافظ و رازی وغیرہ وہ ہیں جنہوں نے فیصلہ کیا کہ عمل نفس ایمان کا جزو ہو، یہ تو صحیح نہیں، ایمان کا لکھہ جزو ہے، اور ایمان کامل میں تمام اعمال و عقائد داخل ہیں، اب بناؤ کہ نزاع کیا رہا، امام ابوحنیفہ بھی تو یہی کہتے ہیں کہ عمل نفس ایمان کا جزو نہیں ہے، اس کو ایمان کامل کا جزو نہ کہہ دو، یہ بھی مانتے ہیں

شکرا یردک میان من واد صلیح قتادہ ✽ حوریاں رقص نکلاں ساغر و پیمانہ زردند

مگر میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ یہ نزاع عقلی نہیں ہے کیونکہ بڑے بڑے ائمہ کا قول ہے، کچھ نہ کچھ اختلاف حقیقی ماننا پڑے گا، لہذا تعبیر اس کی کچھ اور ہونا چاہئے، چنانچہ ابن تیمیہ کہتے ہیں کہ لوگوں نے رازی کے اشکال سے متاثر ہو کر یہ قول اختیار کر لیا، حالانکہ یہ غلط ہے ہم کہتے ہیں کہ اعمال جزو ہیں نفس ایمان کے، مگر جزو کی دو قسمیں ہیں (۱) جزو حقیقی (۲) جزو عرفی، جزو حقیقی جیسے انسان نام ہے حیوان ناطق کا، ان میں سے کوئی جزو خواہ حیوان، خواہ ناطق فوت ہوگا تو انسان نہ رہے گا، اور یہ قاعدہ کہ انتفاء جزو، مستلزم ہے انتفاء کل کو، وہ صرف اجزائے حقیقیہ میں ہے، اور یہ اصطلاح غلط ہے، لغوی معنی نہیں، اور ایک اجزائے عرفیہ ہیں جیسے غزو، عام میں اجزاء اعضاء بدن کہتے ہیں، تو زید کے تمام اعضاء اجزاء ہیں، اب اگر اجزائے عرفیہ میں سے کوئی جزو فوت ہو جائے تو یہ انتفاء کل کو مستلزم نہیں۔ لنگڑے اور اندھے کو انسان ہی کہتے ہیں، چنانچہ اس قاعدہ کو ملکا، بھی تسلیم کرتے ہیں، تو اب ہمارا قول یہ ہے کہ اعمال ایمان کے عرفی اجزاء ہیں، مگر اجزائے عرفیہ میں بھی تفاوت ہوتا ہے، دیکھو اگر شرر گٹ جائے تو حیات ختم، لیکن بال اترنے سے یا ٹانگ ٹوٹنے سے حیات باقی رہتی ہے، تو اجزائے عرفیہ میں بھی بعض اجزاء کے انتفاء سے کل کا انتفاء ہوتا ہے اور بعض کے انتفاء سے نہیں، ایسے ہی یہاں ایمان نام ہے قول دلی اور اعتقاد کا، مگر اعمال میں باہم ایسا ہی تفاوت ہے جیسا کہ اجزائے انسانیہ میں، کبھی رئیس، کبھی فریئر، بعض کے جانے سے انسانیت ختم ہو جاتی ہے اور بعض کے جانے سے نہیں، ایسے ہی ایمان کے لئے اعمال ہیں، کبھی بعض کے انتفاء سے ایمان جاتا رہتا ہے جیسے امام احمد کے یہاں ترک صلوٰۃ سے، یا جیسے انتفاء سے اقرار سے یا انتفاء تصدیق سے کہ ان سب صورتوں میں ایمان کا انتفاء ہو جائے گا، اور بعض کے انتفاء سے ایمان باقی رہے گا، گو ناقص ہوگا، جیسے صوم در کو ذبح وغیرہ، کہ یہ اعمال نہ ہوں تو ایمان کا انتفاء نہ ہوگا۔ ابن تیمیہ کہتے ہیں کہ یہ ہے ملکہ حقیقت، نہ کہ وہ جو اہل رازی نے سمجھی ہے، امام ابوحنیفہ کہتے ہیں کہ ایمان وہی ہے جو حدیث جبریل میں ہے اور جو قرآن میں ہے اور جو اعمال کا معطوف علیہ ہے۔ اور وہ فرماتے ہیں کہ ایمان دخل میں وہ نسبت نہیں ہے جو تم کہتے ہو بلکہ ان دونوں میں وہ نسبت ہے جو اصل و فرع میں ہے، ایمان اصل ہے اور اعمال فرع، تو جزو، دخل کی نسبت نہیں ہے، اصل و فرع کی ہے، یا یوں کہنے کو نسبت وہ ہے جو قلاب کو قلاب سے اور بدن کو روح سے ہے، عنوان و تعبیر کے اس اختلاف کے باوجود نتیجہ دونوں کے نزدیک ایک ہی ہے، تارک صلوٰۃ [دونوں کے نزدیک] مستحق عذاب ہے نہ کہ خلفہ فی النار۔

سب ہی کہتے ہیں، اور معتزلہ، مرجئہ، خوارج کے سب خلاف ہیں، نہ کوئی تاک علی کو محمد بنی الناکر کہتا ہے، جیسا کہ خوارج و معتزلہ کہتے ہیں، نہ کوئی یہ کہتا ہو کہ علی کو کچھ دخل ہی نہیں، جیسا کہ مرجئہ کہتے ہیں، اہل حق ان خوارج و معتزلہ اور مرجئہ کے بین بین ہیں، اہل حق میں کچھ اختلاف ضرور ہے مگر یہ اختلاف انطا کا ہے نتیجہ کا نہیں، ایک نے اعمال کو جزو کہا اور ایک نے فرع، تو احناف کہتے ہیں کہ ایمان و کمانہ ہے اور اعمال اس کی شاخیں، ہاں تاک اعمال سے حق ناراض ہو رہا ہے تو اب نزاع صرف لفظی نہ رہا بلکہ انطا کا فرق ہوا، یہ اس لئے کہ ہر باہول کہ ابن تیمیہ کہتے ہیں کہ اعمال کو جزو نہ کہنا بدعت، اعتقاد سے تو نہیں مگر بدعت الفاظ و اقوال سے ضرور ہے، اور یہ تعبیر سلف کی نہیں، آگے کہتے ہیں کہ اس بدعت لفظی کے اختیار کرنے سے بہت بڑا ناسد پیدا ہو گیا، کیونکہ لوگوں کے دلوں سے دعت عمل جاتی رہی اور مرجئہ کو اس سے مدد ملی ہے اور فرقہ فجور کا شیعہ دینا ہوتا ہے، لہذا اس تعبیر سے یہ سمجھتے ہیں کہ اعمال کے نہ کرنے سے کچھ نہیں ہوتا، میرے استاد [شیخ الحداد] فرماتے تھے کہ ابن تیمیہ جدھر بھجکتے ہیں بھجکتے چلے جاتے ہیں، میں کہتا ہوں کہ اگر جزو کہو گے تو پھر معتزلہ اور خوارج کو مدد ملے گی، ایسی صورت میں تم کو بھی مطلب کی تحلیل کرنی پڑے گی تو اس صورت میں ہم بھی مراد کو مل کریں گے، خوارج کا فتنہ تو مرجئہ سے بڑھ کر ہے، اس فتنہ سے ہزاروں خون ہو گئے، کیونکہ علی جب جزو ایمان ہے تو بے عمل مومن نہیں رہا اور جب مومن نہیں تو کاذب و نفاق اور جب کافر ہے تو باطن الدنیا و جائز العقل، حقیقت یہ ہے کہ ابن تیمیہ نے غلطی کی ہے، سلف کا وہ قول نہ ہو مگر قرآن کا قول تو ہے اور سلف نے تو جسہ وکل کہا نہیں، ان کے الفاظ تو یہ ہیں کہ ”الایمان قول و عمل“ ہمارے استاد فرماتے تھے کہ یہ اختلاف نہ نظر کا ہے نہ ثمرہ کا، بلکہ مقتضیات مقام و احوال کا اختلاف تھا، فرض کرو ایک مرجئہ تم سے کہے کہ علی ہرگز جزو ایمان نہیں، بالکل بیکار ہے، تو اس وقت تم بھی یہی کہو گے کہ نہیں، جسہ ایمان ہے اور بہت ضروری ہے، اور جب تم یہی کہو گے تو تمہاری مراد یہ ہوگی کہ اس قسم کا جزو ہے جس قسم کے جزو کی نفی کر رہے ہیں، وہ جزئیت کی نفی اس معنی میں کر رہے ہیں کہ اس کو کوئی مدخل ہی نہیں، اور ہم اس کا اثبات کر رہے ہیں کہ وہ جزو اعراف سے ہے اور اس سے کمال ہوتا ہے اور اگر کوئی خارجی آکر کہے کہ علی جزو ہے اور بلا اس کے مومن نہیں ہوگا اور ترک سے غلو فی النہاد ہوگا، تو ہم کہیں گے غلط ہے، وہ ہرگز جزو نہیں ہو اور اس قسم کی جزئیت کی نفی تم کریں گے جس کا وہ مدعی ہے یعنی یہ کہ اس کے بدون ایمان نہ رہے گا، تو استاد فرماتے تھے کہ محدثین کو زیادہ سابقہ مرجئہ سے پڑا ہے اور وہ منکر جزئیت ہیں، لہذا محدثین نے کہا کہ ضرور جزو ہے، اور امام صاحب کا سابقہ زیادہ تر خوارج سے پڑا اور ان سے بڑے بڑے مناظرے ہوئے ہیں اور وہ جزئیت کے اثبات کے درپے تھے، اس لئے امام ابو حنیفہ نفی کرتے تھے کہ وہ ہرگز ایسا جزو نہیں ہے جیسا تم کہتے ہو، تو اب فرق یہ ہوا کہ یہ اختلاف نہ نظر کا ہے نہ ثمرہ کا، بلکہ اختلاف مقتضیات احوال کا ہے، یہ استاد کا حکم تھا، پس اگر اختلاف ہے تو نظر کا ہے، اور اگر اختلاف نہیں ہے تو مقتضیات احوال کی بنا پر ایسا قول کیا گیا، ہاں مرجئہ اور خوارج کا اختلاف بیشک حقیقی ہے کیونکہ وہ افراط و تفریط میں پڑ گئے، انہوں نے ایک طرف نظر کی اور انہوں نے دوسری طرف طریقین کا احاطہ نہیں کیا اس لئے غلطی کھائی، ایک کوزہ پر معتزلہ و خوارج اور ایک کوزہ پر مرجئہ،

در بیان میں اہل اسنہ ہیں جن کا مسلک کتاب و سنت کے عین مطابق ہے اور افراط و تفریط سے پاک اور معتدل ہے۔

ایک دوسرا معتزلہ آثارِ اسلہ یہاں یہ ہے کہ ایمان زائد و ناقص ہوتا ہے یا نہیں؟ اس سلسلہ کے بارے میں یہود و کفار نے جو الفاظ نقل کئے ہیں وہ پورے نہیں ہیں، سلف کے پورے الفاظ یہ ہیں: **يَزِيدُ بِالطَّاعَةِ وَيَنْقُصُ بِالْمَعْصِيَةِ (هَكَذَا قَالَ)** **المحافظ في الفتن (وابن تیمیہ فی رسالت)** امام ابو حنیفہ اور ان کے استاد حماد رحمہما اللہ سے **لا يزيد ولا ينقص** کے الفاظ منقول ہیں۔

امام رازی نے کہا کہ یہ سلسلہ فرع ہے پہلے سلسلہ کی [اگر یہ کہے کہ ایمان تصدیق کا نام ہے تو وہ متفاوت (کم و بیش) نہ ہوگا اور اگر یہ کہے کہ اعمال بھی ایمان میں داخل ہیں تو یہ متفاوت (کم و بیش) ہو سکتا ہے] تو یزید کے معنی یہ ہیں کہ اس کے اجزاء (اعمال) زائد ہیں، اور **ينقص** کے معنی یہ ہیں کہ اس کے اجزاء (اعمال) کم ہیں، حاصل اس کا یہ ہوا کہ **يزيد وينقص باجزائه (يعني بالاعمال)** اور جس نے [صرف تصدیق کو ایمان کہا اس کے نزدیک اعمال جن پر کمی و بیشی کا مدار ہے ایمان میں داخل ہی نہیں ہیں، تو ایمان کم و بیش نہیں ہو سکتا] اس نے کہا: **لا يزيد ولا ينقص** اور ٹھیک ہی کہا کیونکہ اس کے نزدیک اعمال جن سے کمی و بیشی ہوتی ہے ایمان میں داخل ہی نہیں ہیں تو یہ سلسلہ متفرع ہوا پہلے سلسلہ پر، امام رازی کے علاوہ اوروں نے بھی یہی لکھا ہے۔

مگر متاخرین کہتے ہیں کہ ایمان میں اعمال کے داخل ہونے سے قطع نظر کرتے ہوئے یہ دیکھنا کہ آیا اس میں زیادہ و نقصان ہے یا نہیں؟ تو بعض بگ اس کے قائل ہیں اور بعض منکر۔

میں کہتا ہوں سلف شاہِ مدلل ہیں، ان کے الفاظ میں غور کرو، ان سے یہ چیز نکلتی ہے کہ ان کے نزدیک بھی عمل ایمان سے علاوہ چیز ہے اور وہ ایمان کا جزو نہیں ہے بلکہ ایمان سے الگ ایک چیز ہے جس سے ایمان بڑھتا ہے اس لئے کہ کوئی چیز اپنی ذات سے زائد نہیں ہوتی یعنی اس کی ذات سے اس میں زیادتی نہیں پیدا ہوتی مثلاً یہ کہنا صحیح نہیں کہ انسان میں اس کے سر سے اضافہ ہوتا ہے، ہاں یہ کہنا صحیح ہے انسان میں اس کی داڑھی سے اضافہ ہوتا ہے!

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ بھی یہی کہتے ہیں [کہ اعمال ایمان سے زائد ہیں، اس کی ذات میں داخل نہیں ہیں]

اب رہا زیادہ و نقصان ایمان کا سلسلہ، تو نصابت یہ ہے کہ قرآن اس سے بھرا پڑا ہے، کتنی آیات ہیں جن میں زیادہ کی تصریح ہے نقص کا لفظ اگرچہ نہیں ہے مگر زیادہ [کے ثبوت سے بالمقابل نقص کا ثبوت لازم ہے] تو جب یہ سلسلہ قرآن سے ثابت ہے، پھر ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کیونکر ممکن ہے کہ قرآن کی ان آیات کے ہوتے ہوئے وہ **لا يزيد ولا ينقص** کہیں، قطعاً یہ ناممکن بات ہے کہ قرآن کی ان آیات کی طرف ان کا ذہن

دیا جو چار چالیس ہزار بارستان نذر کئے ہوں اس سے کیونکر ممکن ہے کہ اس نے غور نہ کیا ہو، حقیقت یہ ہے کہ ابو حنیفہ کا اس پر اتفاق ہے کہ زیادہ و نقصان ہوتا ہے اور اس کی تصریح موجود ہے، یہی وہ کمی بیشی جس کے امام صاحب منکر ہیں، وہ دوسری شے ہے، اس کے بارے میں امام صاحب کہتے ہیں کہ ایمان تصدیق کا نام ہے، یعنی نبی علیہ السلام کی اطاعت و انقیاد کا التزام کرنا اور قبول کرنا اور گردن ڈال دینا، تو اب اس کی ایک صورت یہ ہے کہ ایک شخص بھی ایمان لایا تو اس کے دل میں یہ التزام ہے کہ جو فرمان رسول ہوگا وہ سب کروں گا، تو یہ ایک التزام حاوی ہے تمام جزئیات شرعیہ کو، اس لئے اگر کوئی شخص کسی ایک جز کے بھی التزام کا قائل نہ ہو تو کیا وہ مومن ہو سکتا ہے؟ ہرگز نہیں: **أَفْتَوْهُمُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَكَفَرُوا بِبَعْضٍ** (۱) اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ جس چیز کو طبیعت چاہے قبول کرے اور جس کو جی نہ چاہے قبول نہ کرے، ایسا آدمی مومن نہیں ہو سکتا، ایک جز، یہ بھی تفریق کرے گا تو وہ مومن ہرگز نہ رہے گا، عمل بعد کی چیز ہے، ابھی التزام کی بات ہو رہی ہے، دوسری جگہ نہ آیا، **يُرِيدُونَ أَنْ يُفَرِّقُوا بَيْنَ اللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيَقُولُونَ ذُو مِنْ بَعْضٍ وَكَفَرُوا بِبَعْضٍ** **وَيُرِيدُونَ أَنْ يُقَيِّدُوا بَيْنَ ذَلِكَ سَبِيلًا** **أُولَئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ حَقًّا** **وَأَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ عَذَابًا مُهِينًا** (۲) — معلوم ہوا کہ تفریق سے ایمان نہیں رہتا، التزام کی کا لازم ہے اور اس کا نام ہے ایمان، اور یہ التزام یا یہ تصدیق لازماً لا ینقص ہے، اس میں کمی زیادتی مطلقاً کسی قسم کی نہیں ہو سکتی، اور اس میں ابو یوسف و غرضی اللہ عنہما اور زید و غرضی شریک ہیں، اس میں کمی بیشی کا کوئی امکان نہیں، یعنی جس طرح کل ملجاء بہ الرسول کا لازم و کاسر التزام کرنا اور ماننا، ایک کے لئے ضروری ہے، اسی طرح دوسرے کے لئے بھی ضروری ہے، دونوں میں کوئی تفاوت نہیں (۳)

اب طلب ہوا کہ نوٹنہ (جس پر ایمان لایا جائے) کے اعتبار سے کمی زیادتی، کہ ایک تو سو باتوں پر ایمان رکھتا ہو اور دوسرا پچاس باتوں پر یہ ناممکن ہے (مومن ہونے کے لئے لازم ہے کہ ہر مومن، ہر ایک مومن، ہر کا التزام کرے) خواہ دلی ہو، قطب ہو، غوث ہو، صحابی ہو، سب اس میں برابر شریک ہیں، آج اگر ایک شخص سب باتیں مان لے اور کہے کہ میں صرف شراب کے علم کو نہ انوں گا تو کیا یہ شخص مومن ہو سکتا ہے؟ چنانچہ زار روں نے بھی کہا تھا مگر علمائے جواب دیا کہ یہ ناممکن ہے کہ کسی مولیٰ سے مولیٰ چیز کا انکار کیا جاسکے۔ الغرض اس ایمان میں کمی بیشی نہیں ہو سکتی، تو جس مومن میں کوئی فرق نہیں، ہاں صرف اجمال و تفصیل کا فرق ہے، مثلاً جو لوگ ابتداء سے اسلام میں ایمان لائے اور احکام بہہ بہہ کو

(۱) بقدرہ : ۸۵ (۲) ن : ۱۵۰ : ۱۵۱

(۳) راجع لہ القسطانی ص ۴۴۳ باب الکفر فی القمیس الذی یکنف (لا یکنف) بات :

آئے رہے، تو یہ لوگ سب کا التزام پہلے اجماعاً کر چکے تھے اور اب یہ تفصیل ہے اسی ایمان محل کی، امام ابوحنیفہؒ نے اسی کو فرمایا: اھنوا بالجملة ثم بالتفصیل، یہ الفاظ خاص انھیں کے ہیں، یاس وقت فرمایا تھا جب لوگوں نے اعتراضات کئے تھے اور دلیل کے طور پر آیات پیش کی تھیں معلوم ہوا کہ یہ زیادہ نہیں ہے بلکہ اسی اجماع کی تفصیل اور یہ ایرای ہے جسے پہلے کی قوت صرف قبلہؒ کہا جاتا ہے مگر اس ایجاب و قبول میں جو کہ محل ہے جہد حقوق زوجیت کا ایجاب و قبول مندرج ہے، اسی کو امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ مومن بہ اجمال و تفصیل کے لحاظ سے کم اور بیش ہوتا ہے مگر مومن کا التزام نہیں بڑھتا اور وہ اول سے آخر تک ایک ہے۔ میرے نزدیک اس جواب سے بہتر کوئی جواب نہیں ہو سکتا، اب تمام آیات کو پڑھ جاؤ، امام صاحب کا قول کسی آیت کے بھی خلاف معلوم نہ ہوگا، ہاں قوت ہوتی ہے، نور پیدا ہوتا ہے اور بڑھتا ہے اور سن آتا ہے، سب ستم ہے مگر نفس ایمان میں کچھ اضافہ نہیں ہوتا وہ علی حال باقی رہتا ہے، اب ایمان زید و ایمان صدیق اکبر کا مطلب بھی مل ہو گیا، یعنی جو التزام ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کیا تھا وہی التزام زید نے کیا، ہاں قوت کا فرق ہے شک ہے، اس سے انکار نہیں، اس کی نظیر یہ ہے کہ ایک آنکھ کا نور ہے اور ایک بصرت ہیں، ایک شخص کو ٹھہری میں بیٹھا ہے مگر اس کی بصرت کم ہیں گو وہ حدیدہ النظر ہے اور ایک ضعیف البصر ہے مگر اس کے بصرت بہت ہیں، تو اس کی قوت میں کچھ فرق ہے: ہاں بصرت بہت ہیں۔

تو ایمان درحقیقت ایک نور ہے، كما قال تعالى: اٰمَنَ شَرَحَ اللهُ صَدْرَكَ لَا اِسْلَامَ فَهوَ عَلَى نُوْرٍ مِنْ رَبِّكَ^(۱) — نیز فرمایا: اَوْ مَنْ كَانَ مِيْنًا فَاحْيَيْنَاهُ وَجَعَلْنَاهُ فَوْرًا يَمْشِي بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَثَلُهُ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِنْهَا ط^(۲) تو یہ دو مقامات نہیں ہوا مومن بہ کے اجمال و تفصیل سے، بلکہ یہ اپنی جگہ پر ہے خلاصہ یہ کہ ابوحنیفہؒ مطلقاً زیادہ نقصان کے منکر نہیں، اب تمام آیات کو پڑھ لو:

لِيَزِدْ اَدُوَّ اِيْمَانًا مَعَ اِيْمَانِهِمْ^(۳) وَزِدْهُمْ هُدًى^(۴) — وَبِيْزِيْدُ اللهُ الَّذِيْنَ اهْتَدَوْا هُدًى^(۵) وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا نَزَادَهُمْ هُدًى وَاتَّبَعَتْهُمْ تَقْوَاهُمْ^(۶) وَبِيْزَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِيْمَانًا^(۷) اَلَيْكُمْ مِّنْ اَدْنٰى هٰذَا اِيْمَانًا^(۸) — فَاتَّخَذُوْهُمْ قُرَادًا هُمْ اِيْمَانًا ط^(۹) — وَمَا نَزَادَهُمْ اِلَّا اِيْمَانًا^(۱۰)

(۱) زمر: ۲۲ — (۲) انفصاف: ۱۲۳ — (۳) فتح: ۴ — (۴) کہف: ۱۳ — (۵) مریم: ۷۶ —

(۶) محمد: ۱۷ — (۷) مدثر: ۳۱ — (۸) قیوم: ۱۲۳ — (۹) آل عمران: ۱۷۳ — (۱۰) احزاب: ۲۲

ان تمام آیات میں نیکی کی توفیق اور ثمرات و آثار وغیرہ کا بیان ہے جس کا انکار نہیں، متکلمین نے اس بارے میں بہت بحثیں کی ہیں۔

ابن حزم نے "الملل والاخل" میں لکھا ہے کہ ایمان تصدیق کا نام ہے، اور اس میں سب برابر ہیں، زیادتی خارج ہوئی ہے، نفس تصدیق میں تفاوت نہیں ہوتا تفاوت خارج سے آتا ہے اور الكل اعظم من الجزء کی تصدیق اور العالم حادث کی تصدیق میں صرف سرعت اور بطور کا تفاوت ہے، فی نفسہ اس تصدیق اور اس تصدیق میں کوئی تفاوت نہیں ہے لہذا معلوم ہوا کہ دونوں برابر ہیں، اب اگر تھائی میں نقصان ہے تو یہ تصدیق کیا ہوئی یہ تو شک یا تردد ہوا، یا وہم و ظن جو حزم کی حد تک نہیں پہنچا، لیکن جو چیز حزم کی حد تک پہنچ جائے اس میں کمی بیشی کا سوال ہی نہیں، رہا طاعات سے نور کا بڑھنا، تو نور نفس ایمان نہیں ہے، ایمان کے لواحق سے ہے، لہذا ثابت ہوا کہ ایمان میں جو کمی بیشی اعمال کے سبب سے ہے، وہ اس کے آثار میں ہے، نفس ایمان میں نہیں۔

تیسرے صاحب نے کہا کہ ایک ایمان منجی ہے وھولایزید ولاینقص، اور ایک ایمان کامل ہے جس کے ذریعہ یوں دخول اولیٰ کاستی یا مقررین میں شامل ہوتا ہے، وھویزید وینقص، تو وہ ایمان جو معنی لَوْلَاہُ لَمُنْع ہے، وہ لایزید ولاینقص ہے اور جو ایمان رافع درجات ہے وہ کم زیادہ ہوتا ہے۔

میں جواب ہونے ایک التزام مومن کا، کہ اس میں کچھ زیادہ و نقصان نہیں ہوتا، ہاں تمہیں واخل و کافرق ہے، دوسرا جواب ابن حزم کا ہے کہ نفس تصدیق میں زیادہ و نقصان نہیں، ہاں آثار ایمان میں کمی زیادتی ہوتی ہے، تیسرا وہ ہے جو قریب قریب دوسرے کے ہے کہ ایمان منجی لایزید ولاینقص اور ایمان کامل یزید وینقص۔

اس تیسرے جواب کے متعلق شیخ اکبر کا لفظ نقل کرتا ہوں، وہ فقرات میں ایمان منجی کی حقیقت بتاتے ہیں کہ وہ ایمان فطرت ہے جسے حدیث میں کہا گیا ہے: كُلُّ مَوْلُودٍ يُولَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ فَأَبَوَاهُ يَهُودَانِهِ أَوْ نَصْرَانَانِهِ أَوْ مَجَسَّانَانِهِ، یعنی اسلام فطری چیز ہے (مقابلہ سے معلوم ہوا کہ علاوہ اسلام کے اور کوئی مذہب فطرت نہیں) جس پر ہر بچہ پیدا ہوتا ہے، اور جو تبدیلی بڑے ہونے پر اس میں پیدا ہوتی ہے وہ خارجی تاثیرات سے پیدا ہوتی ہے، تو اس کی موت فطری ایمان برآئی ہے، اور درمیانی مدوجنہ جو طاری ہوتے ہیں، اصلی نہیں، وہ کہتے ہیں کہ ایمان طاری میں زیادہ و نقصان ہے اور ایمان منجی فطری ہے وھولایزید ولاینقص۔

خلاصہ یہ کہ ایمان نبی ایمان فطری ہے اور درمیان میں جو طریق ہے احوال کا وہ خارجی چیز ہے، یہ خلاصہ ہے مسئلہ یزید و نیقص کا، اب کوئی آیت اور کوئی حدیث ہمارے خلاف نہیں۔
یہ تو ایمان کا بیان تھا، اب کفر کے متعلق کچھ کہہ دوں :

کفر کی چار قسمیں ہیں :
کفر اِستکارؑ ، کفر جھوٹؑ ، کفر عنادؑ ، کفر نفاقؑ .
اگر آدمی کو تصدیق یعنی تسلیم نہ قلبی حاصل ہے اور نہ زبانی، تو کفر انکار ہے .

اگر دل میں تسلیم ہے، زبان سے اقرار نہیں تو کفر جھوٹ ہے : رَوَّحُ دُورِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا
اَنْفُسُهَا^(۱)

اگر دل سے بھی تسلیم ہے، یعنی یقین رکھتا ہے اور زبان سے اظہار بھی ہے مگر التزام نہیں جیسے ابو طالب (کافر) تو یہ کفر عناد ہے خواہ کسی وجہ سے ہو، حب جاہ و مال کی بنا پر جیسے ہرقل کافر، یا تقلید ابا کی وجہ سے ہو جیسے ابو طالب کافر، یا کسی اور وجہ سے .

اور اگر دل میں تسلیم و تصدیق نہیں اور زبان سے تسلیم اور ظاہر میں انقیاد و التزام سب کچھ ہے، تو یہ کفر نفاق ہے .

اور کفر ضد ایمان ہے، کیونکہ ایمان نام ہے ضروریات دین کے ماننے کا، اور ضروریات وہ ہیں جو متواتر ہیں .

شاہ صاحب (حضرت مولانا انور شاہ رحمۃ اللہ علیہ) نے تواتر کی چار قسمیں قرار دی ہیں، یہ تقسیم اور کہیں نہیں ملتی، جزئیات ملتے ہیں مگر تقسیم کہیں نہیں،
فرماتے ہیں تواتر چار قسم کا ہے :
تواتر اسناد ، تواتر طبقہ ، تواتر عمل ، تواتر قدر مشترک

اسناد کا تواتر یہ ہے کہ سلسلہ اسنادیں اس قدر روایت کرنے والے ہوں کہ ان کا اجتماع علی الکذب محال ہو [حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ فتح الملہم کے مقدمہ میں فرماتے ہیں : وَهُوَ أَنَّ يَرَوِي الْحَدِيثَ مِنْ أَوَّلِ الْإِسْنَادِ إِلَى آخِرِهِ جَمَاعَةً يَسْتَحِيلُ اجْتِمَاعُهُمْ عَلَى الْكُذْبِ 'یعنی تو اسناد وہ ہے جس کو اول سے آخر تک ایک ایسی جماعت روایت کرے جس کا جھوٹ پر اجتماع محال ہو — آگے فرماتے ہیں : وَهَذَا تَوَاتُرُ الْمُحَدِّثِينَ كَحَدِيثِ مَنْ كَذَبَ عَلَى مُتَعَبِّدٍ فَلْيَتَبَيَّنْ أَمَقْعَدُهُ مِنَ النَّاسِ 'یعنی یہی محدثین کے نزدیک تواتر کے نام سے مشہور ہے 'پیسے حدیث مَنْ كَذَبَ عَلَى مُتَعَبِّدٍ' الخ اس کے تسلسل کہا گیا ہے کہ یہ تواتر ہے] (۱)

تواتر طبقہ ' پیسے قرآن کا تواتر کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کو نقل کرنے والے 'سننے والے' پڑھنے پڑھانے والے ، ہر طبقہ میں صحابہ کے عہد سے لے کر آج تک ای کثرت سے ہیں جن کا کذب پر اتفاق محال ہے ، قرآن پاک بالاتفاق جملہ بعد جیل ہم تک حرف بحرف اسی طرح پہنچا ہے جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا گیا اور وہ اسی سنی میں تواتر ہے ' ہر چند کہ کتابوں میں حَدَّثَنَا فُلَانٌ عَنْ فُلَانٍ کے طرز پر اس کی ایک سند بھی نہیں ہے ' (مگر بایں ہمہ اس کا تواتر شرق سے مغرب تک سارے عالم میں درست و قاطعاً وقراءۃ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے برابر چلا آ رہا ہے ' جس میں نہ تو کسی مومن کو اختلاف اور انکار ہے ' نہ کسی کافر کو (۲) ' یعنی دوتہ دشمن سب اس پر متفق ہیں)

تیسرا تواتر مل ہے [وَهُوَ أَنَّ يَعْمَلُ بِهِ فِي كُلِّ قَرْيَةٍ مِنْ عَهْدِ صَاحِبِ الشَّرِيعَةِ إِلَى يَوْمِنَا هَذَا جَمْعٌ غَيْرُ مِنَ الْعَامِلِينَ بِحَيْثُ يَسْتَحِيلُ عَادَةً تَوَاطُّفُهُمْ عَلَى كُذْبٍ أَوْ غَلَطٍ 'یعنی تواتر مل وہ ہے جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سے لے کر آج تک ایک جم غفیر کا برابر عمل رہا ہو ' جن کا کسی غلط اور جھوٹی بات پر ایسا مسلسل عمل عادت محال اور ناممکن ہوا (۳) ' جیسے حج کے موقع پر جمعہ بین المصلاتین اور مسواک کی سنت وغیرہ کو علماء یہ تواتر ہیں ۔

تواتر مل کے باب میں ابن رشد نے باریۃ الجہتہ میں کچھ کلام کیا ہے ' اس لئے اس میں مجھ کو کچھ تردد ہو گیا ہے ' لیکن بقیہ تینوں قسموں میں سے کسی ایک قسم کا کوئی انکار کروے تو بالاتفاق کافر ہے ۔

چوتھا تواتر قدر مشترک ہے ' اس میں کسی معین واقعہ یا قول و فعل کی نقل تواتر کے ساتھ نہیں ہوتی مگر بہت سے ایسے

واقعات و جزئیات بکثرت منقول ہوتے ہیں جن میں سے کوئی ایک بھی متواتر نہیں ہوتا مگر ان سب میں ایک قدر مشترک پایا جاتا ہے جو ان روایات کثیرہ سے ثابت ہوتا ہے 'تو وہ قدر مشترک متواتر ہے۔ [مولانا مقدمہ میں فرماتے ہیں: وَهُوَ مَا تَخْتَلِفُ فِيهِ الْفَاطَةُ الرَّوَاةُ بِأَنْ يَرَوِي قَبْلَهُمْ مِنْهُمْ وَاقِعَةً وَغَيْرَهُ وَاقِعَةً أُخْرَى وَهَلُمَّ جَرًّا غَيْرَ أَنَّ هَذِهِ الْوَقَائِعَ تَكُونُ مُشْتَمِلَةً عَلَى قَدَرٍ مُشْتَرَكٍ فَهَذَا الْقَدَرُ الْمَشْتَرَكُ بِالتَّوَاتُرِ الْعَنَوِيِّ وَالتَّوَاتُرِ مِنْ جِهَةِ الْعَنْوِي] 'جیسے ماتم کی سخاوت' کہ اس کا کوئی خاص واقعہ متواتر نہیں، مگر ایسے واقعات بحد کثرت سے منقول ہیں جن کا قدر مشترک ماتم کی سخاوت ہے 'اس لئے ماتم کی سخاوت متواتر ہے' اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شجاعت قدر مشترک کے طور پر متواتر ہے 'معجزات نبوی کے واقعات کا قدر مشترک بھی متواتر ہے' لہذا کوئی اگر نفس پیغمبر کا منکر ہے تو وہ کافر ہے، لیکن اگر کسی خاص معجزہ کو نہیں مانتا تو کافر نہ ہوگا بلکہ مبتدع ہوگا۔



بَابُ قَوْلِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَنِي الْأِسْلَامُ عَلَى خَمْسٍ وَهُوَ قَوْلُ وَفِعْلٌ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمانے کے بیان میں کہ اسلام کی عمارت پانچ چیزوں پر اٹھائی گئی، اور ایمان قول اور فعل کو کہتے ہیں
وَيَزِيدُ وَيُنْقُصُ قَالَ اللَّهُ تَعَالَى لِيَزِدَّادُ الْإِيمَانِ مَعَ إِيْمَانِهِمْ وَزِدْنَهُمْ
اور وہ بڑھتا ہے گھٹتا ہے، اللہ تعالیٰ نے (سورہ فتح میں) فرمایا تاکہ (ان کے پہلے) ایمان کے ساتھ اور ایمان زیادہ ہو، اور :-

هُدًى وَيَزِيدُ اللَّهُ الَّذِينَ اهْتَدَوْا هُدًى -

(سورہ کہف میں) ہم نے انکو اور زیادہ ہدایت دی اور (سورہ مریم میں) جو لوگ سیدھے رہے ہیں

قوله بنی الاسلام علی خمس الخ یہ مترجم بہ ہے اور یہی مترجم لہ بھی ہے، فرق یہ ہے کہ مترجم بہ مفصل نہیں ہے اور مترجم لہ مفصل ہے بمقتور بخاری یہ ہے کہ ایمان مرکب ہے کیونکہ زہد و تقویٰ، براہ و ہدی سب ایمان میں داخل ہیں۔
یہاں قول وفعل کا ذکر کیا، اعتقاد کا ذکر نہیں کیا یا تو اس وجہ سے کہ وہ سب کو معلوم اور مفروض عنہ ہے یا اسلئے کہ قول عام ہے قول سان کو اور قول قلبی کما مر نقلا عن امام الحرمین والرازی وغیرہما، یا فعل عام ہے فعل جوارح اور فعل قلب کو،

بہر حال اگر داخل ہے تو اسکی یہ وجہ ہیں اور اگر خارج ہے تو اس وجہ سے کہ وہ مفروض عنہ ہے، بعض نسخوں میں فعل کے بجائے عمل کا لفظ ہے لیکن معنی دونوں کے ایک ہیں (لغویین نے کچھ فرق کیا ہے)
یہاں بخاری نے آٹھ آیات جمع کی ہیں اور غالباً اور کہیں ترجمہ میں اتنی آیات و احادیث جمع نہیں کی ہیں۔

قوله ليزداد الخ ایمان کے اعتبار سے زیادت ثابت ہوتی ہے۔ اور موجب زیادت نہ پائے جانے کی صورت میں نقص، خود بخود اس سے ثابت ہو جائے گا۔

ایک تو لفظ زیادہ ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان میں کمی زیادتی ہوتی ہے، اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسئلہ یزید و ينقص صحیح ہے، دوسرے لفظ مع زیادہ کو بتلا رہا ہے، لیکن زیادہ سے کیا مراد ہے، بخاری نے اس کی تشریح نہیں کی، مگر میری تقریر کے بعد کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا، کیونکہ میں معنی میں زیادہ و نقصان کی نفی کی گئی ہے، اس کا اثبات اس آیت میں نہیں ہے، اور جو کچھ اس آیت میں بیان کیا گیا ہے اس کا انکار نہیں کیونکہ ہمارے نزدیک ایمان التزام کا نام ہے، وہ کم زیادہ نہیں ہوتا، یا ایمان سے ایمان منہی مراد ہے اور اس میں زیادہ و نقصان نہیں، اور آیت میں ایمان منہی کا ذکر نہیں بلکہ ایمان طاری کا ذکر ہے، جیسا کہ عنقریب بیان ہوگا۔ یہاں تفسیر

بیان کرنے سے پہلے یہ کہتا ہوں کہ حنفی مفسرین نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ یہ زیادہ مومن بہ کے اعتبار سے ہے، کیونکہ ابتداءً صرف چند احکام پر ایمان لانا ضروری تھا، اسکے بعد بتدریج احکام کا نزول ہوتا رہا اور ان پر ایمان لانا ضروری ہوتا رہا، مثلاً صوم و حج و زکوٰۃ وغیرہ، کہ یہ سب بعد میں آئے، تو مطلب یہ ہوا کہ مومن بہ کی زیادت کی وجہ سے ایمان میں زیادہ ہے، حنا کشاف نے (جو اصول کے اعتبار سے معتزلی اور فروع کے اعتبار سے حنفی تھے، اور عربیت کے امام تھے، عربیت میں ان کی امامت کے سب قائل ہیں) اسے نقل کیا ہے، میں نے امام اعظم کا ایک لفظ مناقب کروری سے نقل کیا تھا، اٰمنوا بالجملة ثم بالتفصيل یعنی جملاً التزام تو سب کے لئے لازم ہے خواہ کوئی احکام ہوں اور کتنے ہی آئین، تو مومن بہ تفصیل کے اعتبار سے کسی وقت کم اور کسی وقت زیادہ ہوتا ہے مگر درحقیقت یہ زیادہ و نقصان نہیں ہے، بلکہ اجمال و تفصیل ہے خواہ تم اسے کچھ کہہ لو۔

”زمخشری کا یہ جواب دل کو نہیں لگتا، خصوصاً اس آیت کے متعلق، کیونکہ اس کا سیاق یہ ہے والذی اٰفزل السکینۃ فی قلوب المؤمنین لیزدادوا الایمان ما مع ایمانہم“ اور اس میں انزال سکینہ کا مقصد ایمان دہ بتایا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ انزال سکینہ اس لئے ہوا تاکہ ایمان بڑھے کسی حکم کے نازل ہونے کا ذکر نہیں ہے نہ نزول حکم کی وجہ سے ایمان کے بڑھنے کا ہے، اس لئے یہاں یہ جواب نہ بنے گا، ہاں واذا ما انزلت سورۃ فمنہم من یقول ایتکم ذرأتہ ہذا الایمانا، فاما الذین اٰمنوا فزاد قہم الایمانا وھم یستبشرون ھو اما الذین فی قلوبہم مرض فزاد قہم رجسا الی رجسہم واما تو اودھم کافر وذن“ میں ضروریہ معنی بن سکتے ہیں اور جواب منطبق ہو سکتا ہے مگر آیت بالا میں نہیں،

اصل یہ ہے کہ شاہ عبدالقادر صاحب نے فوائد میں کچھ اس طرف اشارہ کیا ہے کہ ایمان کے بہت سے شعبے ہیں، جیسا کہ حدیث میں ہے الایمان بضع وسبعون شعبۃ، اور ان شعبوں میں سے بعض بعض کو بیان بھی فرمایا کہما ودر الدلیا شعبۃ من الایمان، اور وہ شعبہ متفاوت و متنوع ہیں، اور ہم اپنے لفظوں میں یوں کہتے ہیں کہ ایمان کے الوان مختلف ہیں کہیں ایک رنگ سے کہیں دوسرا، اور ان کے مراتب بھی مختلف ہیں، یہاں پہلے واقعہ سمجھ لو تاکہ مطلب

(۱) سورۃ فتح: ۴۰

(۲) سورۃ توبہ: ۱۲۷، ۱۲۵

سمجھنے میں سہولت ہو، یہ واقعہ مدینہ مکہ ہے، شروع میں جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو مکہ بھیجا تو یہاں افواہ پھیل گئی کہ عثمان کو کفار نے روک لیا یا قتل کر دیا نہ حضرت کے ساتھ تقریباً دویسھ ہزار کا محج تھا اور سب کے سب جاں نثار تھے جو تمام دنیلکے لئے کافی تھے، اس خبر پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس محج سے بیعت جہاد لی (لیکر کے دزت کے نیچے یہ بیعت ہوئی تھی) قرآن نے کہا ان الذین ینایعونک انما ینایعون اللہ الخ تمام صحابہ نے بیعت کی بعد میں خبر غلط ثابت ہوئی، اور انجام کار صلح پر معاملہ ختم ہوا مگر جس معاہدہ کی بنیاد پر صلح ہوئی تھی وہ معاہدہ اب بھٹہ کہ تمام صحابہ حتیٰ کہ عمر فاروق تک گھبرا گئے، معاہدہ کے شرائط بہت مایوس کن تھے، اور بظاہر نہت دب کر صلح لی گئی تھی، مثلاً معاہدہ کی ایک دفعہ یہ تھی کہ اگر کوئی مسلمان مدینہ سے مکہ چلا آئے گا تو اس مکہ اس کو واپس نہ کریں گے، اور اگر کوئی دالو کا کوئی آدمی مدینہ آجائے گا تو مدینہ والے اس کو اپنے یہاں رہنے نہ دیں گے، یہ کتنی مغلوبیت کی بات تھی؟ مگر اللہ نے اپنے رسول کو یہ بتا دیا تھا کہ اس میں کتنے فوائد ہیں اور کتنے اسرار مخفی ہیں، لیکن دیکھنے میں دب کر صلح ہوئی تھی، اور یہ صلح وئس سال کے لئے ہوئی تھی، صلح سے پہلے جو بیعت ہوئی تھی وہ جہاد کے لئے پہلی بیعت تھی اور اس کے لئے سب تیار تھے، پورے مح میں جوش ایمان بھرا ہوا تھا، اسکے بعد جب صلح کا حکم آیا تو صحابہ پریشان ہو گئے، حتیٰ کہ عمر نے جو ابو بکر کے بعد مرتبہ رکھتے ہیں حضور کی خدمت میں حاضر ہو کر سوال کیا، تو آپ نے فرمایا اللہ ورسولہ اعلم، ابو بکر کے پاس گئے تو انہوں نے بھی اللہ ورسولہ اعلم کہا، تو خاموش ہو گئے، یہاں تک کہ آیات انا فتحنا لک الخ نازل ہوئیں اور آپ نے عمر فاروق کو بلا کر سنایا (اس وقت آپ اومنی پر سوار تھے) تو عمر فاروق نے عرض کیا افتحیہ ہو؟ حضرت نے فرمایا، ہاں، تو درحقیقت یہ صلح مبادی و مقدمات فتح سے تھی، مگر ظاہر حالات سے تمام صحابہ کو اندازہ نہ ہو سکا۔ اس موقع پر ایمان والوں کے ایمان کا دوطرح امتحان ہوتا ہے، اول یہ کہ جان دینے کا حکم ہو تو گھر کی طرف مڑ کر بھی نہ پھینکا اور جان پیش کر دینا، دوسرے یہ کہ جب بندوق چل رہی ہو اور اس وقت حکم ہو جائے کہ کُندے نیچے کر لو، اور کچھ ہاتھ پیر مت چلاؤ، تو یہ امتحان پہلے سے مشکل ہے، خصوصاً جب قدرت و طاقت بھی ہو، اس وجہ سے تمام صحابہ بے چین تھے اور اس تمنائیں کچھ کہ حکم بدل جائے اور قتال کی اجازت مل جائے، اسی بنا پر احرام کھولنے کا حکم ملنے پر بھی احرام نہیں کھولتے تھے۔ اس سفر میں ازدواج مطہرات میں ام المؤمنین سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا ساتھ تھیں، آپ ان کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا میں نے اعلان کا حکم دیا، مگر فرط غم سے نیز اس خیال سے کہ شاید حکم بدل جائے کوئی بھی احرام

نہیں کھولتا، انھوں نے بہترین مشورہ عرض کیا، وہ یہ کہ حضور آپ اپنی ہدی کا جانور ذبح فرمادیں اور احرام کھول دیں، تاکہ حالت منتظرہ باقی نہ رہے، اور صحابہ سمجھ لیں کہ اب حرمیم نہ ہوگی، چنانچہ آپ نے جانور ذبح کر دیا اور احرام سے باہر ہو گئے تو سب نے احرام کھول دیا، واقعہ ختم ہوا،

اب آیت پر غور کرو تو معلوم ہوگا کہ ایک وہ ایمان تھا کہ بیعت کی اور جان دینے پر راضی ہو گئے، دوسرا یہ ایمان تھا کہ حکم خدا و حکم رسول کے سامنے تسلیم ختم کر دیا، اور باوجود قدرت کے حکم نبی کو ترجیح دیکر انقیاد و تسلیم کا ثبوت دیا، اسی کا ایمان ہے ہواللہ الذی انزل الخ یعنی وہ رنگ جو پہلے تھا اور بیعت کی تھی، اس میں ایک رنگ دوسرا یعنی صلہ میں انقیاد کا ملا لیا، تو معلوم ہوا کہ یہ ایمان کے دو شعبے، دو رنگ دو اثر اور دو مرتبے ہیں، اور مومن کا یہی کام ہے کہ جس وقت جیسا حکم ہو اس پر سر جھکا دے۔

قولہ :- زدناہم ہدی، یہ سورۃ کہف کی آیت کا جز رہے، اور آیت اصحاب کہف کے بارے میں ہے فرماتے ہیں انھم فتیۃ اٰمنوا بربہم وزدناہم ہدی، پہلے کے الفاظ لانے سے مطلب واضح ہوتا ہے، کہ ایمان تو پہلے سے تھا ہی، اس میں اور زیادتی اور انشراح ہو گیا، پھر یہاں تو ایمان کا لفظ بھی نہیں، ہدی کا لفظ ہے، ابو حنیفہ نے ہدی میں زیادت کا کب انکار کیا، ہدی، تقویٰ، بر، خیر وغیرہ میں ہم زیادۃ کے منکر نہیں، مگر بخاری چونکہ اعتقاد، اخلاق، اعمال وغیرہ سب کو ایمان کہتے ہیں اسلئے ان کا استدلال صحیح ہو سکتا ہے، مگر ہمارے نزدیک ایمان التزام کا نام ہے، اس میں کچھ فرق نہیں ہوا، ہاں سمجھ پیدا فرمائی، ہدایت فرمائی تاکہ دقائق کا علم انھیں ہو سکے، تو زیادۃ ہدایت میں ہے، نہ ایمان میں۔

قولہ :- ویزید اللہ الذین اھتدوا ہدی، یہ درحقیقت دوسرے مضمون کے مقابل ہے، اس سے پہلے کی آیت یہ ہے قل من کان فی الضلالۃ فلیمد دلہ الرحمن مداء یعنی جو گمراہی کو اختیار کرتا ہے اس نے اپنے سونے سے اگر گمراہی پسند کی تو پھر ہم اُسی میں اُسے اور گھسیٹتے ہیں، حتیٰ اذا ما رادوا ما یوعدون فسیعلون من ہوشم مکانا واضعفت جندا، یہاں تک کہ جب وہ عذاب دیکھنے لگیں جبکہ ان سے وعدہ کیا جاتا تھا، تو سمجھ لیں کہ کون بدر مقام پر ہے اور کون شکر میں کمزور ہے، اسکے بعد فرمایا، ویزید اللہ الخ تو یہ مقابل ہے فلیمد دلہ الرحمن مداء کا، یعنی جو چاہے ادھر چلے، اور جو چاہے اُدھر چلے، تو فی الجملہ بندے کو آزادی بخشی اور دونوں راستے بتلا دیئے، اور سمجھا دیئے، اس کے بعد بھی اگر ضلالت میں پڑنا رہنا چاہے تو فلیمد دلہ الرحمن، اور لفظ الرحمن نے بتلادیا کہ ہماری

وَالَّذِينَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَآتَاهُمْ تَقْوَاهُمْ وَيَزِدُّ الَّذِينَ آمَنُوا إِيمَانًا
اور (سورہ قتال میں) جو لوگ راہ پر ہیں انکو اللہ نے اور زیادہ ہدایت دی، اور انکو پرہیزگاری عطا فرمائی، اور (سورہ مدثر میں) جو لوگ ایماندار ہیں ان کا اور

طرف سے کچھ نہیں، مگر جب یہ اسی کو پسند کرتا ہے تو یہی سہی، پھر اس کے بالمقابل فرمایا، ویزید اللہ الخ تو مراد یہ ہوتی کہ ہدایت کا ابقاء اور اس کو مستمر رکھنا ہمارا فعل ہے۔ توفیق عطا ہوتی ہے نور بڑھتا ہے، بصیرت زیادہ ہوتی ہے، اس میں سے کسی چیز کا انکار نہیں، مگر التزام میں اس سے کوئی اضافہ نہیں ہوتا لامذا التزام ہی کا نام ایمان ہے۔

قوله :- وَالَّذِينَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَآتَاهُمْ تَقْوَاهُمْ، اس سے پہلے یہ آیت ہے وَمِنْهُمْ مَّنْ يَسْمَعُ الْكَيْفَ حَتَّىٰ إِذَا خَرَجُوا مِنْ عِنْدِكَ قَالُوا لِلَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ مَاذَا قَالَ أَیُّهَا، اُولَٰئِكَ الَّذِينَ طَبَعَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَاتَّبَعُوا أَهْوَاءَهُمْ، یعنی منافقین بظاہر تو آپ کی باتوں کی طرف کان لگاتے ہیں، مگر ان میں تذکرہ حفظ اور تدبر و فہم کچھ بھی نہیں، اسی نے جب باہر جاتے ہیں تو صحابہ سے پوچھتے ہیں کہ نبی نے کیا کہا۔ حَتَّىٰ إِذَا خَرَجُوا مِنْ عِنْدِكَ قَالُوا الخ چونکہ توجہ نہیں، سمجھ نہیں، اسلئے یہ سوال کرتے ہیں، آگے فرماتے ہیں اُولَٰئِكَ الَّذِينَ طَبَعَ اللَّهُ الخ یعنی جنہیں اس توجہ نہیں ان سے بہتری کی کیا امید ہو سکتی ہے، اسی نے ہم ان کے قلوب پر مہر کر دیتے ہیں، وَاتَّبَعُوا أَهْوَاءَهُمْ اور وہ تو اپنی خواہشوں کے پیچھے لگ گئے ہیں، آگے فرمایا وَالَّذِينَ اهْتَدَوْا الخ تو اب مقابلہ پورا ہو گیا، کہ جس نے توجہ نہ کی اس کے دل پر مہر لگا دی۔ تاکہ آگے توجہ کر بھی نہ سکے، اور اس نے چونکہ توجہ کی اس نے ہم نے بھی ہدایت میں زیادتی کر دی، تو نفس تسعیتی نہیں بڑھتی، بلکہ اس کے آثار بڑھتے ہیں اور ثمرات میں اضافہ ہوتا ہے، چنانچہ یہاں بھی ہدی کا لفظ ہے۔ آگے فرماتے ہیں وَآتَاهُمْ تَقْوَاهُمْ یعنی اور ہم تقویٰ کی راہیں کھول دیتے ہیں، تقویٰ کی اضافت انہیں کی طرف کی، کہ وہ لوگ جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں اس میں زیادہ کر دیتے ہیں،

قوله :- وَيَزِدُّ الَّذِينَ آمَنُوا إِيمَانًا، اس سے پہلے ہے عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ، جنہم میں جو فرشتے مقرر ہیں ان کی تعداد اللہ نے بتلائی کہ انیسٹل ہے، تو مشرک اس کا مذاق اڑاتے تھے، اور کہتے تھے کہ ہم سب کے لئے کافی ہیں، ایک نے کہا ستارہ کو میں تنہا کافی ہوں باقی کو تم بھگت لینا، اس کا جواب دیا وَمَا جَعَلْنَا أَصْحَابَ النَّارِ إِلَّا مَلَائِكَةً الخ کہ ہم نے جنہم کا محافظ فرشتوں کو بنایا ہے، جن کی قوت کا یہ حال ہے کہ ان میں سے صرف ایک نے قوم لوط کی بستی کو اٹھا کر پٹخ دیا تھا، جامع ترمذی میں آیا ہے کہ یہی انیسٹل کی عدد پہلی کتب سماویہ میں بھی مذکور ہے، جب قرآن اسکی تصدیق کرے گا،

وَقَوْلُهُ عَزَّوَجَلَّ اَيُّكُمْ زَادَتْهُ هَذِهِ اِيْمَانًا، فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا فَرَزَادَتْهُمْ

اور (سورۃ براءۃ میں) فرمایا اس سورت نے تم میں سے کس کا ایمان بڑھایا جو لوگ ایمان لائے ان کا ایمان بڑھایا، اور (سورۃ آل عمران میں) فرمایا

اِيْمَانًا وَقَوْلُهُ فَاخْشَوْهُمْ فَرَزَادَ هُمْ اِيْمَانًا

(لوگوں نے مسلمانوں سے کہا) تم کافروں سے ڈرتے رہنا تو ان کا ایمان اور بڑھ گیا۔

قولہ :- اَيُّكُمْ زَادَتْهُ هَذِهِ اِيْمَانًا کفار استہزاء کرتے تھے کہ اس میں کون سے حقائق ہیں جن سے

ایمان میں زیادتی ہوئی، تو اس کا جواب دیا، فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اَلَيْسَ يَحْصِيْهِمْ يَغْيِرُ كَيْ مَدْلِقِ كَالْيَقِيْنَ ہے، ان کا ایمان ضرور بڑھتا ہے، اور کفار کے لئے یہی چیز فدیہ گندگی (رجس) ہے، اس کی مثال یہ ہے کہ ایک تندرست شخص عیدِ غذا کھائے

تو غذا سے اسے تقویت حاصل ہوگی، لیکن اگر وہی غذا کوئی نازک مریض کھائے تو مر جائے، تو ایک ہی غذا ایک کے لئے جو صحت مزاج ہو، مضر، مقوی و مسکن ہے، (اور دوسری) غذا بد مزاج کے لئے مہلک ہے، تو یہ غذا کا قصور نہیں، بلکہ مزاج و اخلاط کا قصور ہے، اسی کو فرماتے ہیں کہ تم نہ سمجھتے کیا ہو، ان میں اچھی استعداد ہے اسلئے اضافہ ہوتا ہے، اور تم میں سورا استعداد

کی وجہ سے باعثِ زیادہ رجس ہے، جیسا کہ سعدی کہتے ہیں سہ

باران کہ در لطافت طبعش خلافت نیست در بارغ لاله روید و در شورہ بوم خمس

در حقیقت یہ زمین کی استعداد کا فرق ہے نہ بارش کا، منافقین نے اپنی فطری استعداد کو خراب کر لیا اور اسکے بعد اگر وہ چاہیں کہ ایمان کی زیادتی ہو، تو کیونکر ممکن ہے، یہ بھی اشارۃً معلوم ہو گیا کہ وہ مرض ان کا خود پیدا کیا ہوا ہے اللہ کی طرف سے نہیں، یہ ایک مستقل مسئلہ ہے، جس کا یہ موقع نہیں،

قولہ :- فَاخْشَوْهُمْ فَرَزَادَ هُمْ اِيْمَانًا اس کا مختصر قصہ یہ ہے کہ جب جنگ اُختم ہوئی تو چونکہ مسلمانوں کو

بظاہر ہزیمت ہوئی تھی اور اہل اسلام بہت زخمی ہوئے تھے، حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ [جو اس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے کافروں کی طرف سے] امیرِ لشکر تھے، وہ جب اپنا قافلہ لے کر خوشی خوشی واپس جانے لگے تو اچانک انھیں خیال آیا کہ تم سے غلطی ہوگئی مسلمان زخمی ہو چکے ہیں، ہمیں اس وقت ان کو بالکل ہی نیست و نابود کر دینا چاہیے تھا، لہذا واپسی کا ارادہ کیا، مگر غیبی انتظام ایسا ہوا کہ بجائے اس کے کہ وہ خود آگے بڑھیں، عبدالقیس کا ایک تجارتی قافلہ مدینہ جا رہا تھا، انھیں کو کچھ دے دلا کہ یہ کہا کہ مدینہ جا کر کہہ دینا کہ ابوسفیان بڑا لشکر لے کر آ رہا ہے، اس قافلہ نے اگر خبر دی، اسی کی حکایت اللہ تعالیٰ

وَقَوْلِهِ وَمَا زَادَهُمْ إِلَّا إِيمَانًا وَتَسْلِيمًا، وَالْحُبُّ فِي اللَّهِ وَالْبُغْضُ فِي اللَّهِ مِنْ أَيْمَانٍ

اور (سورہ احزاب میں) فرمایا ان کا کچھ نہیں بڑھا مگر ایمان اور اطاعت کا شیوہ، (اور حدیث کی روشنی میں) حب خدا کی راہ میں محبت رکھنا اور اللہ کی راہ میں دشمنی رکھنا ایمان میں داخل ہے۔

فرماتا ہے، إِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ (تم ڈرو کہ وہ لوگ آرہے ہیں) جب مسلمانوں نے وہ خبر سنی تو ان کی کیا کیفیت ہوئی اس کو اندر نقل فرما رہا ہے کہ فَزَادَهُمْ إِيمَانًا، یعنی ان کا ایمان بڑھ گیا، چنانچہ حضور علیہ السلام نے حکم دیا کہ تیار ہو جاؤ اور انھیں لوگوں کو مکم دیا جو امد میں شریک تھے اور زخم خوردہ تھے، تو سب فوراً تیار ہو گئے، کافروں نے تو ڈرانا چاہا تھا، مگر یہاں ایمان میں زیادتی ہو گئی اور مسلمانوں نے کہا، حَسْبُنَا اللَّهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ ۝ فَانْقَلَبُوا بِنِعْمَةِ رَبِّهِمْ إِلَى الْمَدِينَةِ ۚ فَمَنْ تَفْسِيرُ ۚ یہ ایک تفسیر ہے،

دوسری تفسیر یہ ہے کہ ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے جو اس وقت مسلمان نہ تھے اور کافروں کا جھنڈا ان کے ہاتھ میں تھا، اُحد کے دن ہی یہ کہہ دیا تھا کہ آئندہ سال پھر جنگ ہوگی، جب سال گزر گیا اور وقت آگیا تو ابوسفیان اپنا لشکر لے کر نکلے، مگر راستہ سے لوٹ گئے اور جنگ کے مقام تک نہیں آئے،

اس کے برخلاف حضور صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کو لے کر وہاں تک پہنچ گئے، مگر مقابل فوج آئی نہیں، اس نے لڑائی نہیں ہوئی، اس واقعہ کو بدر صغریٰ کے نام سے یاد کرتے ہیں، لڑائی تو نہیں ہوئی مگر اس راہ میں مسلمانوں کو تجارت کا موقع مل گیا اور اللہ نے غیب نفع دیا، اس لئے اس کو ”جیش التَّوَلُّو“ کہتے ہیں، فَانْقَلَبُوا بِنِعْمَةِ رَبِّهِمْ إِلَى الْمَدِينَةِ ۚ (۲) میں انھیں مجاہدین کا ذکر ہے، کہ اللہ کی نعمت لے کر لوٹے، اور کسی قسم کا گزند نہیں پہنچا، پہلے معنی کا لمانا کیا جاتا ہے، تو معنوی نعمت مراد ہوگی، اور زیادت ایمان سے زیادت توکل مراد ہوگی، جس پر ان کا حَسْبُنَا اللَّهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ دیکھنا دلالت کرتا ہے، اور ہم زیادت توکل کے منکر نہیں،

راجح یہی معنی ہے کیونکہ ”حرمہ الاسد“ تک صحابہ کرام گئے تھے، جو مدینہ تہ تقریباً آٹھ میل دور ہے۔

قَوْلُهُ -: وَمَا زَادَهُمْ إِلَّا إِيمَانًا، پوری آیت یہ ہے، وَلَمَّا دَرَأَى الْمُؤْمِنُونَ الْأَحْزَابَ قَالُوا هَذَا مَا وَعَدَنَا اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَصَدَقَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَمَا زَادَهُمْ إِلَّا إِيمَانًا وَتَسْلِيمًا، (۳) یعنی جب ایمان والوں نے دیکھا کہ تمام لشکر ہم پر ٹوٹ پڑے تو کہنے لگے ہمیں پہلے ہی خبر دی گئی تھی، کہ ایسا ہونی والا ہے۔ کوئی نئی بات نہیں ہے، اللہ اور رسول سچے ہیں، وَمَا زَادَهُمْ إِلَّا إِيمَانًا، یعنی اس مشاہدہ سے ان کے یقین کی پختگی اور اطاعت شناری بڑھی۔

(۱) ایضاً ص ۱۴۱ (۲) وہ لشکر جو معنی ستو کھائے گیا تھا، (۳) آل عمران، آیت ۱۶۴ (۴) احزاب، آیت ۲۴

هَذَا مَا وَعَدَنَا اللَّهُ وَرَسُولُهُ، میں جس وعدہ کا ذکر کیا گیا ہے، اس کے باب میں بعضوں نے کہا کہ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمْ يَأْتِكُمْ مَثَلُ الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ^(۱) کا وعدہ مراد ہے، اور بعضوں نے کہا کہ جَنْدَ مَا هَذَا لَكَ مَهْرُومٌ مِنَ الْأَحْزَابِ، میں جو وعدہ ہے، وہ مراد ہے، اس میں احزاب کی شکست کی پیشین گوئی کی گئی ہے اور اس کو کہہ رہی میں بتلادیا گیا تھا، یہاں بھی احزاب کا لفظ ہے اور وہاں بھی احزاب کا لفظ ہے، اب غور سے دیکھو تو ان آیات میں سے کوئی آیت ہمارے خلاف نہیں، ہم اس کا انکار نہیں کرتے کہ ایمان کی کیفیات میں زیادت و نقصان ہوتا ہے، ہم تو یہ کہتے ہیں کہ التزام میں زیادت و نقصان نہیں ہوتا، اور یہی آیت سے ثابت نہیں ہوا کہ نفس تصدیق و التزام میں زیادت و نقصان کا متعلق ہوتا ہے۔

قوله :- الْحُبُّ فِي اللَّهِ، امام بخاری کے نقطہ نظر سے یہ پیر زیادت و نقص ایمان کے مسئلہ سے بے تعلق نہیں ہے، کیونکہ ان کے ہاں زہد و تقویٰ اور بر و غیرہ سب ایمان میں داخل ہیں، اور ہمارے یہاں چونکہ سب ثمرات و آثار و انوار اور توالج و فروع وغیرہ ہیں، اس لئے نفس ایمان سے خارج ہیں، اور اگر جزء ہیں بھی، تو ایمان کامل کے جزء ہیں، اور یہ اس وقت ہے جب مِنَ الْإِيمَانِ کا لفظ حدیث نبوی کا لفظ ہو، ورنہ البوداؤس تو من الایمان کے بجائے اِسْتَمَلَّ الْإِيمَانُ ہے اور اگر یہی لفظ حدیث ہے تو بعید نہیں کہ یہ ہماری دلیل بن جائے، کیونکہ تب حُبُّ فِي اللَّهِ ایمان کامل کا جزء ثابت ہوگا۔ پس اگر یہ بخاری کا لفظ ہے، تو جواب کی ضرورت نہیں، اور اگر سلف کا لفظ ہے تو ہم جواب دے چکے کہ من تعین فیہ نہیں، کَمَا فَهِمُ الْبُخَارِيُّ، بلکہ اس کی مراد من آثار الایمان و من فروع الایمان وغیرہما ہے، اور حدیث کا مطلب یہ ہے کہ نفس و حب محض اِشْرَکِیَّہ ہو، اپنی غرض سے نہ ہو،

قولہ :- کَتَبَ عُمَرُ بْنُ عَبْدِ الْعَزِيزِ الخ عمر بن عبد العزیز کے بارے میں لکھا ہے کہ ان کی خلافت تکلمہ ہے خلافت عمرؓ کا، یہ صحابی تو نہیں ہیں، مگر ان میں اسلامی محاسن و کمالات استقدر ہیں کہ لوگوں نے انکو صحابہ میں شمار کیا ہے۔

ابن مبارک رحمہ اللہ جو خود حدیث رجال کے امام اور زہد و فقہ میں قدوہ ہیں اور بہت اعلیٰ مرتبہ رکھتے ہیں،

وَحُدُودًا وَسُنَنًا فَمَنْ اسْتَكْمَلَهَا اسْتَكْمَلَ الْإِيمَانَ وَفَمَنْ يَسْتَكْمِلُهَا

اور مستحب و سنن باتیں پھر جو کوئی ان کو پورا ادا کرے اس نے اپنا ایمان پورا کر لیا اور جو کوئی ان کو پورا ادا نہ کرے۔

لَمْ يَسْتَكْمِلْ الْإِيمَانَ فَإِنْ أَعَشْ فَمَا بَيَّنَّهَا لَكُمْ حَتَّى تَعْمَلُوا بِهَا وَإِنْ أَمِتْ

اس نے اپنا ایمان پورا نہیں کیا، پھر اگر (امتدہ) میں جتنا رہا تو ان سب باتوں کو ان پر عمل کرنے کیلئے تم سے بیان کر دوں گا، اور اگر میں مر گیا تو مجھ کو

فَمَا أَنَا عَلَى صُحْبَتِكُمْ مَجْرِيصٌ قَالَ إِبْرَاهِيمُ عَلَيْهِ السَّلَامُ وَلَكِنْ لَيُطَيَّنَنَّ قَلْبِي

تمہاری صحبت میں رہنے کی کچھ ہوس نہیں ہے، اور ابراہیم علیہ السلام نے کہا لیکن میں چاہتا ہوں کہ میرے دل کو تسلی ہو جائے

ان سے جب سوال کیا گیا، عمر بن عبدالعزیز افضل ہیں یا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ، تو چونکہ امیر معاویہ صحابی ہیں اور یہ تابعی، اسلئے

ابن مبارک جواب دیتے ہیں اور یہ جواب انھیں کا حق ہے، کہ معاویہ تو معاویہ، ان کے گھوڑے کی گرد کے برابر بھی ایک

عمر بن عبدالعزیز کیا، ہزار عمر بن عبدالعزیز بھی نہیں ہو سکتے، اور اس کی وجہ بھی بیان کر دی کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھنے، اور حضور کے وَلَا الضَّالِّينَ پڑھنے کے بعد آمین کہنے کا جو شرف حاصل ہوا،

وہ عمر بن عبدالعزیز کو کہاں نصیب؟ یہی وجہ افضلیت ہے، تو صحابی کا درجہ کسی قطب، ولی، ابدال کو نہیں مل سکتا،

باایں ہمہ عمر بن عبدالعزیز اتنے بلند مرتبہ ہیں کہ بعض لوگوں نے انھیں زمرہ صحابہ میں شامل کر لیا ہے۔

حن بصری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جب مشر میں ساری امتیں اپنے مظالم بیان کریں گی تو ہم حجاج کے مظالم کو

پیش کریں گے، اور جب ساری امتیں اپنے عدل و انصاف کو پیش کریں گی تو ہم عمر بن عبدالعزیز کے کارنامے پیش کریں گے،

تو (بظن غالب) یہ کارنامے غالب رہیں گے۔

اب سنو کہ عمر بن عبدالعزیز عدی بن عدی کو خط لکھتے ہیں، إِنَّ لِلْإِيمَانِ فَرَائِضَ وَشَرَائِعَ وَحُدُودًا وَ

سُنَنًا، فَمَنْ اسْتَكْمَلَهَا اسْتَكْمَلَ الْإِيمَانَ وَمَنْ لَمْ يَسْتَكْمِلْهَا لَمْ يَسْتَكْمِلْ الْإِيمَانَ، اللہ یہاں لِلْإِيمَانِ

لام کے ساتھ ہے، اور بعض نسخ میں إِنَّ الْإِيمَانَ ہے، دونوں کی تعبیر میں فرق ہے، دوسری صورت صریح ہے،

مقصود میں، اور پہلی صورت مترک فی المقصود نہیں،

عمر بن عبدالعزیز لکھتے ہیں کہ ایمان کے لئے کچھ شرائع (اموال اطلاق، عقائد) ہیں اور کچھ فرائض اور کچھ

حدود ہیں، یعنی تحدیدات احکام ہیں، اور بعض نے کہا کہ حدود سے مراد منہیات ہیں جس کے ذریعہ اللہ نے روک ٹکادی ہے،

کہ اس سے آگے مت بڑھو، داخلہ ممنوع ہے، یا حدود سے زواج مراد ہوں مثلاً قطع یہ اور زہم وغیرہ، مگر نیک ہر مہر میں تعدیہ احکام ہی مراد ہے۔

قولہ:- وَسُنُّنًا، سنن سے مراد بظاہر مندوبات ہیں اور ممکن ہے کہ مراد اعلم ہو،

آگے لکھتے ہیں فَمَنْ اسْتَشْكَمَهَا إلخ یعنی جتنا ان امور کو پورا کرے گا اتنا ہی ایمان میں کمال ہوگا۔

اس سے بخاری نے استدلال کر دیا، حالانکہ لام سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ جزر ہیں اور اگر دوسرے نسخے

کو لیں تو احتمال ہے کہ مبالغہ کہا گیا ہو، ایمان کا اطلاق اصل و فروع دونوں پر ہے، جیسے پتہ، آم، جڑ سب کو آم ہی کہیں گے،

لفظ استكمل ہمارے لئے مفید ہے چنانچہ حافظ نے لکھا ہے کہ ایمان کامل کے اجزاء ہیں نفس ایمان کے، فَإِنْ أَعْرَضَ

یعنی اگر میں زندہ رہا تو تمام احکام و ابواب مرتب کر جاؤں گا اور تمام تفصیل و فروع تمہارے پاس موجود ہو جائیں گی،

وَأِنْ أَمُتْ، اور اگر میں مر گیا تو مجھے اس کی حرص بھی نہیں کہ تمہارے پاس رہوں، جیسا کہ کہا گیا ہے

وزیریم عذر مایہ پذیر
اے بے آرزو کہ خاک شدہ

قَالَ إِبْرَاهِيمُ عَلَيْهِ السَّلَامُ وَلَكِنْ لِيُكَلِّمَنَّ قَلْبِي اسکو علیحدہ لائے یا تو اس نے کہ وہاں خیال نہیں رہا بعد کو

یا دیا، یا اسے کہ اس کا تعلق وہاں سے نہ تھا اسے علیحدہ بیان کیا، مقصود یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام ایسے تو نہ تھے کہ پہلے

سے ایمان نہ تھا اور اس کی نسبت تو کسی ادنیٰ مومن کی طرف بھی نہیں کی جاسکتی چہ جائیکہ ایک صاحب غرہ منہی دہوں

کی طرف کیجائے، اطمینان قلب کے لئے سوال کیا تھا تو جواب ملا أَوَلَكُمْ تَوْحُّدٌ کیا تم ایمان نہیں لائے؟ انھوں نے عرض کیا

بلی، ہاں ایمان تو میں یقیناً لایا، مگر صرف دلی اطمینان کی خاطر دیکھنا چاہتا ہوں اِئِدِمَ ایمان یا انکار و نفی تو درکنار وہ تو

اس کو مستبد بھی نہیں سمجھتے تھے، انھوں نے تو صرف حصول اطمینان قلب کے لئے یہ فرمایا تھا! امام بخاری کے نزدیک یہی

زیادہ ہے کہ طمانینت حاصل ہوگئی، اگر یہی مراد ہے تو ہمارے خلاف نہیں۔

ابن ہمام لکھتے ہیں کہ مقصد یہ نہ تھا کہ آپ کیونکر احیاء موتی کرتے ہیں، یا کر سکتے ہیں یا نہیں، بلکہ مقصود یہ

تھا کہ مجھے دکھلا دیجئے، رَبِّ اِذْنِي کہا، تو رویت کا اشتیاق کمال یقین پر دال ہے نہ فقدان پر، جب آدمی مکہ کی تشریف

کرتا ہے تو یقین تو ہوتا ہے مگر شوق ہوتا ہے رویت کا، ایسے ہی ابراہیم علیہ السلام کا سوال تھا، اور بظاہر جو کلام ابراہیم علیہ السلام

کا مرتبہ اعلیٰ ہے، اس نے شاید یہ سوال کچھ مناسب اور پسند نہ آیا ہو اسے اَللّٰهُ تَعَالٰی نے فرمایا اَوَلَكُمْ تَوْحُّدٌ اسکی تفسیر

وَقَالَ مُعَاذُ اجْلِسْ بِنَا نُؤْمِنُ سَاعَةً وَقَالَ ابْنُ مَسْعُودٍ الْيَقِينُ الْإِيمَانُ كُلُّهُ

اور معاذ نے (اسود بن ہلال سے) کہا ہمارے پاس بیٹھ ایک گھڑی ایمان کی باتیں کریں، ابن مسعود نے کہا یقین پورا ایمان ہے، اور ابن عمر نے کہا

وَقَالَ ابْنُ عُمَرَ لَا يَبْلُغُ الْعَبْدُ حَقِيقَةَ التَّقْوَى حَتَّى يَدْعَ مَا حَاكَ فِي الصَّدْرِ

بندہ تقویٰ کی اصل حقیقت (یعنی کلمہ) کو نہیں پہنچ سکتا اس وقت تک کہ جو بات دل میں مجھے اس کو چھوڑ دے، اور مجاہد نے

وَقَالَ مُجَاهِدٌ شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ مَا وَصَّى بِهِ نُوحًا أَوْ صَيْنِكَ يَا مُحَمَّدٌ وَآيَاهُ

کہا اس آیت کی تفسیر میں (اس نے تمہارے لئے دین کا وہی رشتہ ٹھہرایا جس کا نوح کو مکمل دیا تھا) ہم نے تمہارے لئے محمد اور نوح

دیناً واحداً وَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ شِرْعَةٌ وَمِنْهَا جَسَدٌ بَدِيلٌ وَسُنَّةٌ وَدَعَاؤُكُمْ

کو ایک ہی دین کا حکم دیا، اور ابن عباس نے کہا (اس آیت کی تفسیر میں) شریعت دہنہا جاسی یعنی راستہ اور طریقہ اور (سورہ فرقان کی یہاں

إِيمَانُكُمْ

آیت کی تفسیر میں کہا) دعاؤکم یعنی ایمانکم

انشاء اللہ حدیث انا الحق الخ جہاں بخاری میں آئے گی وہاں ہوگی، تو درحقیقت حصول طہانیت مقصود تھا، اور وہ زیادہ

فی نفس الایمان نہیں ہے،

قوله :- اجْلِسْ بِنَا نُؤْمِنُ سَاعَةً . بخاری نے مراد لیا کہ ذکر سے یا تسبیح و تہلیل سے یا تذکیر و موعظت

سے ایمان کو برہائیں اور ہم اسے تجدید ایمان سے تعبیر کرتے ہیں، تجدید کے معنی یہ ہیں کہ انسان پر جب غفلت طاری ہو، تو

جو چیزیں باعث تازگی ایمان ہوتی ہیں، اور غفلت کو دور کرتی ہیں، انکو اختیار کرنا۔

قوله :- الْيَقِينُ الْإِيمَانُ كُلُّهُ ، لفظ کل سے امام بخاری نے استدلال کیا کہ جب ایمان کا ”کل“ ہوگا

تو اس کے اجزاء بھی ہوں گے، کیونکہ ”کل“ مجموعہ اجزاء کو کہا جاتا ہے، اور اس سے صاف یہ جملہ ہے الصَّبْرُ نِصْفُ الْإِيمَانِ

ہم کہتے ہیں کہ پہلے فقرہ میں یقین سے یقین کا وہ مرتبہ مراد ہے جو اولیاء اللہ کے ہاں ہوتا ہے، یعنی کمال یقین۔

قوله :- لَا يَبْلُغُ الْعَبْدُ حَقِيقَةَ التَّقْوَى الخ یعنی ٹھیک ٹھیک اور پوری طرح تقویٰ کا تحقق اس وقت

تک نہیں ہوتا جب تک کہ شک کی چیزیں بھی نہ چھوڑ دے، ہم بھی یہی کہتے ہیں کیونکہ تقویٰ کے بہت سے مراتب ہیں ایک

یہ کہ شرک و کفر چھوڑے، ایک یہ کہ بائز چھوڑے، ایک یہ کہ توکل علی الغیر کو چھوڑے، ایک یہ کہ صنادار کو بھی ترک کر دے،

ایک یہ کہ بہت سے مباحات بھی ترک کر دے، یہ سب مراتب تقویٰ ہیں۔

۔ حَدَّثَنَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ مُوسَى قَالَ أَخْبَرَنَا حُظَلَّةُ بْنُ أَبِي سُفْيَانَ

ہم سے بیان کیا عبید اللہ بن موسیٰ نے، کہا ہم کو خبر دی حظلہ بن ابی سفیان نے
عَنْ عِكْرَمَةَ بْنِ خَالِدٍ عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
انہوں نے سنا عکرمہ بن خالد سے انہوں نے ابن عمر سے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

قوله :- شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ مَا وَصَّى بِهِ نُوحًا إِبْرَاهِيمَ اس کی تفسیر میں مجاہد کہتے ہیں کہ اے محمدؐ میں نے
آپ کو اور نوح علیہ السلام کو ایک ہی دین کی نصیحت کی، اور یہ بھی مسلم ہے کہ ہر ہر شریعت کے فروع و احکام میں کسی پیشی
ضرور ہوتی ہے۔ لہذا ایمان میں بھی کسی وزیادتی ہوگی۔

شُرْعَةٌ :- بڑا راستہ، منہاج :- چھوٹا راستہ، سَبِيلًا وَسُنَّةً میں لف و نشر غیر مرتب
شرعۃ کی تفسیر سنت سے اور منہاج کی سبیل سے کی ہے؛

قوله :- دُعَاؤُكُمْ، اِيَّاكُمْ، قرآن میں ہے، قُلْ مَا يَعْجُبُكُمْ فِي ذُلِّكُمْ (۲) میرا رب
تمہاری ذرا بھی پرواہ نہیں رکھتا اگر تم اسے نہ پکارو، کما و رد فی الحدیث لا تقوم الساعة متقی لایقَالَ
فی الکفر فی اللہ اللہ (۳) تو درحقیقت بقا اس وجہ سے ہے کہ دعا اور ذکر اللہ جاری ہے اس آیت میں دعا و کم کی تفسیر
ابن عباس نے ایسا نکم سے کی ہے، یعنی دعا کا اطلاق ایمان پر کیا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ دعا عمل ہے، پس یہ اطلاق بھی
مصحح ہو گا کہ ایمان عمل ہے جیسا کہ فتح الباری میں ہے، ہمارا کہنا ہے کہ اس اطلاق کے جواز کا کوئی منکر نہیں ہے وہ جائز بلکہ
واقع ہے، انکار نفی ایمان میں کسی پیشی ہونے کا ہے، وھولم یثبت بعد،

حدیث ۷۷، حَدَّثَنَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ مُوسَى الخ یہ حدیث ابن عمر کی ہے، اس میں اسلام
کو غیہ سے تشبیہ دی گئی ہے کہ جس طرح غیہ میں اوتا و اطناب و دعائم ہوتے ہیں اور اس کا دار و مدار انھیں پانچ کھونٹیوں
پر ہوتا ہے، ایسا ہی اسلام کہ اس کے بھی پانچ دعائم اور ستون ہیں، اور اس میں بیچ کا جسے قطب کہتے ہیں شہادۃ ہے،
اور بقیہ طغات و تواج ہیں، پانچ میں حصر کیوں کیا حالانکہ اور بھی ہو سکتے تھے، مثلاً جہاد وغیرہ، اس کی وجہ یہ ہے کہ بہتر اور
اصل اصول یہی ہیں، عقائد کا حصہ شہادۃ میں آگیا، اور یہ سب کے لئے عنوان ہے، اور چار اعظم فرائض سے ہیں، اور باقی لواحق

ذاتیہاں پر فرض الباری میں جو بیان کیا گیا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ دیکھو فتح الباری ص ۳۱ (۲) سورۃ النہر تان آیت ۴۴ (۳) رواہ مسلم
عہ یعنی شہادت ہی تمام احکام شرعیہ کا عنوان ہے جس نے اس کا اقرار کر لیا گیا تمام کا اقرار کر لیا۔

بَنَى الْإِسْلَامَ عَلَى خَمْسٍ شَهَادَةُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللَّهِ
 اسلام کی عمارت پانچ چیزوں پر اٹھائی گئی ہے، گواہی دینا اس بات کی کہ اللہ کے سوا کوئی سچا خدا نہیں اور محمد اللہ کے بھیجے ہوئے ہیں
 وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ وَحَجَّ وَصُومَ رَمَضَانَ
 اور نماز کو درستی سے ادا کرنا، اور زکوٰۃ دینا، اور حج کرنا، اور رمضان کے روزے رکھنا۔

و آثار میں سے ہیں۔ استقرار سے یہ معلوم ہوا کہ شہادۃ کے لئے جب یہ کلمہ لاتے ہیں تو توحید و رسالت کو جمع کر دیتے ہیں
 اور جہاں شہادۃ کے لئے نہ ہو وہاں بسا اوقات اکتفا کلمہ توحید پر کرتے ہیں اور رسالت کا ذکر نہیں کرتے، اس میں کیا بعید
 ہے کچھ سمجھ میں نہیں آتا مگر اتنا کہہ سکتے ہیں کہ اقرار بالشہادتین درحقیقت تصدیق قلبی کا اظہار ہے۔ تو اصل موضوع لا
 شہادۃ کا یہ ہے کہ دل میں جو ہے اس کی وہ خبر دے رہا ہے، اقرار و تسلیم کر رہا ہے، اور اسے حجت کے طور پر پیش کرتا ہے
 کہ میں مومن ہوں، تو قلب میں جو عقیدت کنون ہے شہادت سے اس کا اظہار ہے۔

اور صرف لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ میں کبھی تو مقصود کا اظہار ہوتا ہے، اور کبھی محض ذکر مقصود ہوتا ہے، کیونکہ یہ خود متفضل
 ایک ذکر ہے، بلکہ افضل الاذکار ہے، اور ذکر و درود محض لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ بتا ہے، محمد رسول اللہ کا ذکر معروف فی الشریعہ
 نہیں، یہی وجہ ہے کہ صوفیاء کے اذکار میں محمد رسول اللہ داخل نہیں، درود تو اذکار میں سے ہے مگر یہ نہیں ہے تو
 کلمہ شہادت بطور ذکر مستعمل نہیں ہے اور کلمہ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ بطور ذکر مستعمل ہے (یہ شاہ صاحب کی مضمون اور کہیں نہیں نظر آئے گا)
 حاجی امداد اللہ مہاجر کی رحمت اللہ نے ضیاء القلوب میں لکھا ہے کہ جب ذکر کرے تو کرتا رہے، اور تنبیہ نفس
 کے لئے کبھی کبھی درمیان میں محمد رسول اللہ بھی کہہ لیا کرے، تاکہ ادھر سے غفلت نہ ہو، تو سب بڑا ستون شہادت ہے
 اور یہ کلمہ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ اسلام کا شعار ہو گیا ہے، اور یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی کہتا ہے کہ قل هو اللہ، پڑھ لو، تو یہ
 مطلب نہیں کہ صرف قل هو اللہ، قل هو اللہ رٹے رہو، بلکہ تمام سورت کا پڑھنا مراد ہوتا ہے، اسی طرح کلمہ لَا إِلَهَ
 إِلَّا اللَّهُ عنوان ہے جمیع امور شریعہ کا۔

قولہ :- وَأَقَامَ الصَّلَاةَ، قرآن میں بہت سے مقامات میں اس کا ذکر ہے، اور اقامۃ سے مراد
 صرف نماز پڑھ لینا نہیں ہے بلکہ جمیع شرائط اور حقوق کے ادائیگی کے ساتھ پڑھنا مراد ہے۔
 قولہ :- وَآتَى الزَّكَاةَ وَالْحَجَّ وَصُومَ رَمَضَانَ۔ مسلم بھی ابن عمر کی روایت سے یہ حدیث ہے
 مگر وہاں وصوم رمضان والحج ہے یعنی وصوم رمضان وہاں مقدم ہے۔ بظاہر مطلب ایک ہے، مگر اس تقدم

تآخر میں ایک واقعہ پیش آیا ہے وہ یہ کہ ابن عمرؓ نے جب یہ حدیث بیان کی تو ان کے ایک شاگرد نے اسے دہرایا، اور ابن عمرؓ نے جس ترتیب سے بیان کیا تھا اس کو بدل کر حج کو مقدم کر دیا، جیسا کہ بخاری میں ہے، تو ابن عمرؓ نے اس کا رد فرماتے ہوئے کہا لا، "فصیام رمضان والحج،" لہذا سمعت من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (۱) تو اس سے صراحت ہوئی کہ کلام نبویؐ کی اس ترتیب یہ ہے کہ صوم مقدم اور حج مؤخر ہے۔

ابن الصلاح نے (جو نووی کے شیوخ میں ہیں) یہ واقعہ نقل کر کے لکھا ہے کہ جو لوگ "واد" کو ترتیب کیلئے مانتے ہیں، ان کے لئے یہ ایک دلیل ہے، کما قالہ الشوافع، ورنہ ابن عمرؓ کیوں رد کرتے خصوصاً جبکہ معنی میں بھی فرق نہیں ہوتا، معلوم ہوا کہ "واد" ترتیب کے لئے ہے، اور ابن عمرؓ کا مقصود یہ ہے کہ جو روایت حضورؐ سے ہے اس میں تصرف کیوں کیا جائے، دراصل اس پر تنبیہ کرنا تھا کہ الفاظ حدیث کی جہاں تک ممکن ہو حفاظت کی جائے، اسلئے ابن الصلاح کا قول درست نہیں اور نہ [وجہ رد کی مذکورہ بالا تصریح کے بعد] اس سے استدلال صحیح ہے۔

ابن حجر نے کسی کا قول نقل کیا ہے کہ جب بخاری میں یہ ترتیب ہے اور مسلم میں اس ترتیب کا رد کیا ہے تو ممکن ہے ابن عمرؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دونوں طرح سنا ہو، اور جو وقت اس آدمی پر رد کیا ہو، اس وقت دوسرے طریقہ پر یعنی حج کی تقدیم کے ساتھ سنا سچول گئے ہوں، حافظ کہتے ہیں کہ یہ قول ٹھیک نہیں، بہتر یہ ہے کہ نیچے کے راوی کے متعلق کہا جائے کہ اسے نسیان ہو گیا، یہ اس سے سہل ہے کہ ابن عمرؓ کی طرف نسیان کو منسوب کریں، حافظ سے پھر دوسرا کلام یہ کیا ہے کہ چاہے "واد" ترتیب کے لئے نہ ہو، مگر ایک چیز ضروری ہے کہ تقدیم و تاخیر فی الذکر کی حفاظت جوگی ہے، تو اس میں کوئی نہ کوئی نکتہ ضرور ہے، پھر انھوں نے اس نکتہ کو بیان کیا، کہ حکم میام مسلمہ میں نازل ہوا ہے، اور حکم حج (علی اختلاف القولین) سہ یا سہ میں نازل ہوا ہے تو صوم چونکہ نزل میں مقدم ہے، لہذا ذکر میں بھی مقدم رکھنا مناسب ہوا، اور یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ حضورؐ نے صفا و مروہ کی سعی فرمائی تو فرمایا اَبْدَأْ بِمَا بَدَأَ اللہُ بِهِ اور پھر یہ آیت پڑھی اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَابِرِ اللہِ، تو تقدیم نزل کا لحاظ رکھ کر صوم رمضان کو بھی مقدم رکھا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور علیہ السلام جو کلام فرماتے ہیں وہ یوں ہی، کیف ما اتفق نہیں ہوتا بلکہ اس میں (یعنی اسکی ترتیب میں) بھی کوئی نہ کوئی نکتہ ہوتا ہے، یہ نکتہ یہاں ماقضیٰ بیان کر دیا۔

ارکان اربعہ کی حقیقت

شاید ترمذی میں گزر چکا ہے کہ عبادات دو طرح کی ہیں، ایک وہ جو مظہر حکم باری ہیں، جن میں بلال باری تعالیٰ کا اظہار ہوتا ہے، دوسری وہ جو مظہر محبوبیت ہیں پہلی قسم کی دو عبادتیں ہیں، ایک نماز، دوسری زکوٰۃ، اور دوسری قسم کی بھی دو ہیں، یعنی صوم اور حج۔ زکوٰۃ و صلوٰۃ محمود کی مالکانہ شان کو بتاتی ہیں، تمام اوضاع و اطوار [ارکان و احکام] دیکھ لو، جیسے ایک ذلیل غلام اپنے آقا کے سامنے اور محکوم حاکم کے روبرو عرض و معروض کرتے ہوئے کبھی تو اپنے آقا کے سامنے جھکتا ہے، اور کبھی ہاتھ باندھتا ہے، سر ٹیکتا ہے، اور عرض و معروض اور درخواست پیش کرنے میں پورے سکون و وقار کا اظہار کرتا ہے، بعینہ یہی سب کچھ اللہ کا بندہ بھی اپنے اللہ کے سامنے کرتا ہے، اسی طرح جب سورۃ فاتحہ کے بعد قرآن کی کوئی سورہ پڑھتا ہے، تو وہ معروضہ (فاتحہ) کا جواب ہے، پھر جیسے بادشاہ کے دربار میں ہر یہ (نذرانہ) گزارا جاتا ہے ایسے ہی جھیکر (قدمہ میں) ادب کا نذرانہ التحیات پڑھ کر گزارتا ہے، یہی نماز ہے، اور زکوٰۃ تاج صلوٰۃ ہے، جب صلوٰۃ کے ذریعہ اپنے غلام ہونے کا اقرار و اظہار کر دیا، کہ میں غلام ہوں، تو اب جو کچھ اس کے پاس ہے، وہ سب آتا ہی کا ہے، جس طرح رعیت پرنسکس لگایا جاتا ہے، اور پھر وہ رعیت ہی پر صرف کیا جاتا ہے، اسی طرح یہاں بھی جب بندے نے اپنی محکومیت کا اظہار کیا، تو کہا، اچھا تم سے سب تو نہیں لیتے، البتہ کہیں چالیسواں، کہیں دسواں، کہیں پانچواں حصہ مقرر کرتے ہیں، یہ محکوم خوشی خوشی ادا کرتا ہے اور اس کو اپنی سعادت سمجھتا ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن میں اکثر نماز کے ساتھ زکوٰۃ کا ذکر ہے، مثلاً یَقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَ یُوْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ، نِزْرًا یَا وَ یَقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَ مِمَّا دَرَسْنَا فَتَاھُمْ یَنْفَعُوْنَ (۱)، اس بیان سے جمع [یعنی دونوں کو ساتھ ساتھ ذکر کرنے کا سر سچ میں آگیا ہوگا،

ابتداءً خلافت صدیقی میں جب کچھ لوگوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کیا تو حضرت صدیق اکبرؓ نے انکے خلاف جہاد کا فیصلہ صادر فرمایا، بعض اکابر صحابہ کو اس میں تردد تھا، اس سلسلہ میں عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے جب گفتگو کی، تو آپ نے فاروق اعظم کو ایک جواب یہ دیا تھا، وَاَنْھُمَا الْقَرْبَتَانِ فِی الْعِثْرَانِ چونکہ نماز سے معبود کی حاکمیت اور عابد کی عبدیت کا اظہار ہوتا ہے، لہذا حکم ہوتا ہے کہ اب اس کی تصدیق کیلئے کچھ پیش کرو، تو یہ دونوں مالکانہ نشان کی مظہر ہیں، اور یہ تعلق جو حاکم و محکوم میں ہوتا ہے، جبری ہے، خواہی خواہی تعلق پیدا کرنا ہے

دوسرا تعلق وہ ہے جو محبوب اور محب کے درمیان ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کے ساتھ بندہ کو وہ تعلق بھی ہونا چاہئے، اللہ تعالیٰ جمع مخلوق سے زیادہ محبت کا مستحق ہے، فرمایا، **وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ**، عشق نہیں کہا کسی حکمت سے، بلکہ **أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ** کہا، جو درحقیقت عشق ہی کا مرتبہ ہے، اور جب وہ محبوب اور ہم محب ہوتے تو پھر محب کے سے اعمال بھی ہونے چاہئیں، عاشق کا سب سے پہلا کام اور پہلی منزل یہ ہے کہ محبوب و محب میں جو چیزیں حائل ہوں، محب کو چاہئے کہ سب سے قطع تعلق کر دے، دنیاوی محبتوں میں دیکھا جاتا ہے کہ کھانا، پیانا تک چھوٹ جاتا ہے، تو پہلی چیز یہ ہے کہ ہر ماسوا سے جو خارج دماغ ہوں، تعلق منقطع کر لے، چاہے وہ اولاد اور والدین ہی کیوں نہ ہوں، ہاں جو خارج دماغ نہ ہوں ان سے تعلق منقطع کرنا نہیں ہے، یہ مرتبہ تخلیہ کا ہے، دوسرا مرتبہ تحلیلہ کا ہے، اس میں نہ اسے کھانے پینے کی خبر، نہ تن بدن کا ہوش، نہ کسی سے تعلق نہ لگاؤ، جگن میں مارا مارا پھرتا ہے، محبوب کے شہر کا چکر لگاتا ہے، گلیوں اور کوچوں کی خاک چھانتا ہے، اس کا آخری درجہ یہ ہوتا ہے کہ اپنی جان سے ہزار ہو کر جان تک دینے کو تیار ہو جاتا ہے، شیخ اکبر اور مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی تحقیق یہ ہے کہ یہ دونوں عبادتیں (موم و ج) مفاد و محبوبیت کی مظہر ہیں۔ پہلی عبادت میام ہے، کہ اس میں ماسوا اللہ کو ترک کرنا ہے، تین ہی چیزیں ایسی ہیں جنکے ترک کے بعد انسان کو کو پھر کسی چیز کی حاجت نہیں رہ جاتی، اور وہ تینوں چیزیں، کھانا، پینا اور جماع ہیں، امام غزالی کہتے ہیں کہ ریاضت و شہوتوں کے کسر اور انقطاع کا نام ہے، اور وہ شہوة بطن، اور شہوة فرج ہے، اور ان شہوتوں کے ترک کا نام روزہ ہے، بشرطیکہ نیت ہو حکم الہی کی بجا آوری اور اسی کی طرف انتساب کی۔

جب انسان نے ان شہوتوں کو چھوڑ دیا، تو گویا تمام دنیا کو چھوڑ دیا، اور اب اسے دنیا سے دشت ہونے لگی، اور اس نے ان تین چیزوں کو چھوڑ کر ثابت کر دیا کہ وہ سب سے بیزار ہے سوائے محبوب کے۔

اب اس کے آگے کا درجہ یہ ہے کہ اگر ملاقات و امکان ہو تو محبوب کے گھر کا راستہ لے، اور یہی حج ہے، حج کے تمام حالات جنوں ہی کے سے ہیں، مثلاً مَرَدے کے کفن کی طرح دو کپڑے دے دیے، اور کہا کہ تمام لباسِ فاخرہ اتار دو، ناخن بڑھ رہے ہیں، کاٹنے کی اجازت نہیں، بدن پریل پریل ہے، دور کرنے کی اجازت نہیں، بال بڑھے ہوئے ہیں، کٹا نہیں سکتا، بدن میں پسینہ کی بو ہے، خوشبو نہیں لگا سکتا، غرض تمام آثارِ دیوانگی جمع ہیں، اور یہی محبوب ہے،

بلکہ جو جس قدر زیادہ پریشان حال ہوتا ہی زیادہ محبوب ہے، فرماتے ہیں کہ حج میں جو بھقڑ میل کچل میں ملوث ہو، اور نقل جس پر جتنا زیادہ ہو، اور جس کی حالت بتنی زیادہ گسٹلکی اور پریشانی کی ہو، وہی ہمیں زیادہ محبوب ہے، نمازیں تو ہر طرح کا تزکیہ ہے، حکم ہے کہ کھجاؤ مت، حرکت مت کرو، کَاذِبٌ عَوْدٌ رہو، بالکل ادھر ادھر مت دیکھو، مگر یہاں جنت کا راستہ ہے، تمام حرکت ہی حرکت ہے، طواف میں حرکت ہے، اور عرفات میں تو حرکت ہی حرکت ہے، یہ سب دیوانگی ہی تو ہے، مگر دیوانے کس کے ہیں؟ اللہ کے۔

تو یہ دو عبادتیں (صوم و حج) مہمود کی شانِ محبوبیت کو ظاہر کرتی ہیں، اور وہ دونوں (صلوٰۃ و زکوٰۃ) حکومت کی شان کو، ہمارے اس بیان کے بعد یہ بات بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ صوم کو طبعاً حج پر مقدم ہونا چاہیے، کیونکہ پہلے تخلیہ ہونا چاہیے، پھر تخلیہ، پہلے اگر تخلیہ نہیں ہوگا تو تخلیہ کیسے ہوگا، جب تک چیز صاف نہیں ہوگی تو چمک کہاں سے آئے گی، عجیب معاملہ ہے، کہ ادھر رمضان ختم ہوا، ادھر یکم شوال سے ایامِ حج شروع ہو گئے، یہ کیوں؟ اس لئے کہ عاشق صرف مکہ ہی میں تو نہیں، کوئی ہند میں، کوئی سندھ میں، کوئی فرانس میں، کوئی چین میں، اسی طرح ساری دنیا میں، تو اشہر حج کی تہبیین میں اس بات کو ملحوظ رکھا کہ سب حج ہو سکیں، اس طرح روزہ بدایت ہے حج کی، جب روزہ رکھ کر ماسوی اللہ سے قطع تعلق کو ثابت کر دیا، تو فرمایا کہ اب بیت اللہ کی راہ لے، حافظ نے جو سر بیان کیا وہ یہی تھا، اور جو تشریح اور اسرار ہم نے بیان کئے، وہ سراسر ہے، اس سے معلوم ہو گیا کہ نزولِ میام پہلے کیوں ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ طبعی ترتیب یہی ہے کہ روزہ مقدم ہو، اسی طرح نماز و زکوٰۃ میں بھی طبعی ترتیب یہی ہے، کیونکہ جب نماز سے حکومت ثابت کر دی تب حکم ہوگا کہ زکوٰۃ دو،

یہاں سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ قربانی کی کیا مصلحت ہے، اصل میں مناسب تو یہ تھا کہ ہر مسلمان شخص اپنی جان خود قربان کر دے، مگر چونکہ یہ منشا تخلیق کے خلاف تھا، اسلئے فرمایا کہ اس کے عوض میں فدیہ دو، چنانچہ ادھر قربانی کی گئی اور ادھر حکم حق ہو گیا، کہ کلم ادا ہو گیا اور سب کچھ ہو چکا، اور اسکے بعد ناصح نادان جو شیطن ہے، اس پر جرات میں رمی کا حکم دے کر ثابت کرنا ہے کہ یہ ناصح نادان ہے، اور اس سے اس موقع کی تذکیر مقصود ہے، جب ابلیس نے حضراتِ ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کے دل میں دوسوہ ڈالا تھا، گویا کنکری مار کر ہم بتاتے ہیں کہ تم تیرے دشمن پر پتھر پھینک کر تیری طرف آتے ہیں، اس سے کمالِ انقیاد معلوم ہوتا ہے، جس طرح ہم رکوع کرتے ہیں، تو یہ علامت ہے انقیاد کی۔

اسی بیان سے یہ بھی معلوم ہو گیا ہو گا کہ عبادت کے لئے انھیں چاروں کو مخصوص کیوں کیا اور چار میں منحصر کیوں کیا، بات یہ ہے کہ عبادت نامہ ہے غایت تذل کا، اور اس کی صرف دو بنیادیں ہیں۔ یا حکومت یا محبت، جس کی بنیاد حکومت پر ہو اس کی دو شاخیں ہوں گی، ایک بدنی، دوسری مالی، بدنی نماز ہے، اور مالی زکوٰۃ، اسی طرح محبت کی دو منزلیں ہیں ایک ماسوائے پزاری، دوسری صرف محبوب کا ہو رہنا، اول صوم ہے، دوم حج ہے، تو حقیقت میں یہی چار چیزیں بنیادی ہیں، اور باقی دوسری چیزیں جو بھی ہیں ان میں سے کچھ تو مبادی اور کچھ مکملات ہیں، مثلاً نکاح یا طلاق، جس کا ذکر آگے آئے گا، اس کے تمام احکام اس لئے ہیں کہ مرد و عورت سکون کے ساتھ زندگی گزاریں

فَرَّأَا وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً، (۱)

اور یہ سکون عبادت کیلئے مطلوب ہے، اسی طرح جتنے سلسلے کھانے پینے پہننے کے ہیں یا اور کسی اور چیز کے، سب کی غرض یہ ہے کہ آدمی کو سکون نصیب ہو، اور سکون اس لئے ضروری ہے، کہ عبادت کا حق ادا ہو، تو ان چاروں میں تمام اشیاء آگئیں، اب ضرورت نہیں کہ کہا جائے کہ یہ اصل ہیں باقی فردغ، بلکہ یہ کہا جائے گا کہ سب انھیں میں داخل ہیں،

(۱) سورۃ روم، آیت ۲۱



بَابُ أُمُورِ الْإِيمَانِ

ایمان کے کاموں کا بیان

وَقَوْلِ اللَّهِ عَزَّوَجَلَّ لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُولُوا وَجُوهَكُمْ قَبْلَ الْمَشْرِقِ
اور اللہ تعالیٰ کے اس قول میں نیک ہی نہیں ہے کہ (منہ اذیں) اپنا منہ پورب یا پچھم کی طرف
وَالْمَغْرِبِ وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ إِلَى قَوْلِهِ الْمُتَّقُونَ،
کر لو، بلکہ اصل نیک ان کی ہے جو اللہ پر ایمان لائے۔ آخر آیت متقون تک۔

قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ الْآيَةُ

اور تداصل المؤمنون اخیر تک

بَابُ أُمُورِ الْإِيمَانِ

بخاری کی ترتیب بھی عجیب، پہلے نَبِيُّ الْإِسْلَامِ کا ترجمہ لائے، پھر امور الایمان کا باب باندھا، کیا
اصل یہ نہ تھے؟ تھے تو مگر اس کی کچھ تفصیل بیان کریں گے، ان ابواب کے علاوہ کچھ اور بھی بیان کریں گے، جیسے خیمہ
کے لئے ایک تودعائم ہیں، دوسرے اس کے لواحق، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مقصود بخاری کچھ تفصیل کرنا ہے، اور
تمام قرآن سے صرف دو آیتیں لائے ہیں، اسلئے کہ اتنا بطور سے یہ بیان شاید تمام قرآن میں سوائے ان دو آیتوں کے
اور کہیں نہ ملے گا، چنانچہ پڑھ لو، لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُولُوا وَجُوهَكُمْ قَبْلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنْ
آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ وَآتَى الْمَالَ عَلَى حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَى
وَالْيَتَامَى وَالْمَسْكِينِ وَابْنُ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ
وَالْمُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوا وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ
أُولَئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ ۝ تمام آیات و عقاید بیان کر دئے، کہہ سکتے ہو کہ

پوری آیت میں تین چیزوں کا بیان ہے، حسن اعتقاد، حسن معاشرت، اور تہذیب نفس، یہی اصول ہیں۔ وَالْبَیِّنِ
تک حسن اعتقاد، اور فی الزَّوْجِ اب تک حسن معاشرت، حِیْنَ الْبَیِّنِ تک تہذیب اخلاق۔ پھر فرمایا
أُولَئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا (۱)۔ غالباً اس کا تعلق ایمان کے ساتھ ہے، اور مُقْلَعُونَ کا تعلق غالباً بعد کی
عبارت سے ہے۔

تھوڑی سی تفسیر لَئْسَ الْبِرُّ کی کرتا ہوں، ترجمہ ظاہری تو یہی ہے کہ نیکی نہیں ہے کہ آدمی اپنا چہرہ
مشرق و مغرب کی طرف پھیرے، حالانکہ نیکی تو ہے کیونکہ اگر قبلہ کی طرف منہ نہ کریں تو نماز نہ ہوگی، جواب یہ ہے
کہ یہود نے اعتراض کیا تھا کہ یہ نبی بھی عجیب ہیں کہ ہر بات میں ہماری مخالفت کرتے ہیں، حتیٰ کہ ہمارا قبلہ جس طرف
اب تک نماز پڑھتے تھے اس کو بھی ترک کر دیا، اسی کو فرمایا سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ (۲)۔ پھر اس کا جواب
دیا، کہ یہ سوال ہی باطل ہے، کیونکہ ایک جہت سے دوسری جہت کی طرف پھرنے والا وہی ہے جس کا مشرق و مغرب
ہے، فرمایا قُلْ لِلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ (۳) اس کے بعد کچھ دور چل کر یہ آیت ہے، اس میں بتلاتے ہیں کہ بَرُّ کی
حقیقت یہ نہیں ہے کہ مشرق یا مغرب کی طرف منہ کرے، ہمارے لئے توجہ الی القبلہ کا حکم ضروری ہے، مگر یہ بَرُّ کی
حقیقت نہیں ہے صحت ہے حقیقت برکی یہ ہے کہ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ الْيَمِينِ مومن وہ ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام
پر یقین رکھتا ہو اور اللہ کے تمام احکام کو ماننا ہو، اور جب اسے یقین ہوگا اور وہ ماننا ہوگا تو کیا اس سے ممکن ہے کہ
وہ یہ سوال کرے مَا وَلَّهُمْ مِنْ قِبَلِهِمُ اتِّبَاعُ كَانُوا عَلَيْهَا (۴)۔ اگر کوئی آقا غلام سے کسی کام کو کہے تو کیا
وہ کہہ سکتا ہے کہ تم نے ان کو کیوں نہیں کیا؟ ہرگز نہیں، ایک معمولی بات ہے کہ حکومت کی جانب سے یہ حکم ہے
بائیں جانب چلو، تو کیا کوئی سوال کر سکتا ہے کہ داہنے ہاتھ کی طرف چلنے کا حکم کیوں نہیں ہے، ہرگز نہیں، تو
پھر اللہ کے حکم کے بارے میں کیوں سوال ہو رہا ہے، اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان میں اخلاص نہیں ہے، جذبہ ایمان
نہیں ہے، تو بَرُّ کی حقیقت یہ ہے کہ پہلے ایمان لاؤ، پھر اللہ کا حکم سمجھ کر توجہ الی القبلہ کرو، اگر کوئی ہزار سال
متوجہ الی القبلہ رہے، مگر وہ مومن نہ ہو تو اس کا کچھ اعتبار نہیں، فرمایا أُولَئِكَ الَّذِينَ لَيْسَ لَهُمْ وَالْآخِرَةُ

(۱) بقرہ، آیت ۱۷۷، (۲-۳-۴) بقرہ، آیت ۱۷۷،

إِلَّا النَّارَ، وَحَبِطَ مَا صَنَعُوا فِيهَا وَبِطُلَّ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ^(۱)،

وایضاً قال: - وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَعْمَالَهُمْ كَسَرَابٍ بِقِيَعَةٍ يُخَسِبُهَا الظَّانُ مَاءً^(۲) حَتَّى إِذَا جَاءَهُ لَمْ يَجِدْهُ شَيْئًا وَوَجَدَ اللَّهَ عِنْدَهُ فَوَفَّيَهُ حِسَابَهُ وَاللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ^(۳)،
وایضاً قال: - مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أَنْثَى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُخَوِّدَهُ حَيَوتَهُ
طَيِّبَةً^(۴)

تو خلاصہ یہ ہے کہ ایک صورت ہے برکی، اور ایک حقیقت ہے، منافقین کی نماز صورت تھی برکی، اور حقیقت برکی یہ ہے کہ پہلے ایمان لاؤ پھر نماز پڑھو، تو انہیں بتلایا کہ اہتمام کے ساتھ پہلے ایمان لانا ہے، ایمان ہو تو یہ سمجھنا آسان ہے کہ ہمارے مالک نے پہلے یہ حکم دیا تو ہم اس کو بجالائے، اور جب دوسرا حکم دیا، تو ہم اسکے لئے بھی تیار ہیں، اسکے بعد تواضع و مکملات ایمان بیان کرتے ہیں، کہ محض اعتقاد کافی نہیں، بلکہ کچھ خرچ کرو، اور خرچ بھی کرو تو مال محبوب، لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ^(۵)

وَإِنِّي الْمَالُ عَلَى حَبِطٍ مِمَّنْ رَجَعَ زَمِيرًا^(۶) اگر اللہ کو بنایا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ اللہ کی محبت میں خرچ کرو، الْبِرَّ قَابِ مِی سَبِّ دَاخِلِی، خَوَادِ غَلَامِ کُوْا اَزَادِ کَرَمِ، خَوَادِ مِکَاتِبِ بِنَادِ، خَوَادِ مَدِ بَرِ بِنَادِ، وَالْمُؤْمِنُونَ بَعْدَهُمْ، یعنی جو عہد کیا ہے اسے پورا کرتے ہیں، اگر جے نہ رہے تو پھر کمال نہیں، کمال تو جب ہے کہ بَأْسَاءُ، آفَاتِ مَالِ، اَوْرَضَاءُ، اَنَامَاتِ بَدَنِ مِی جَمِ رَہِی، خُصُوصًا جہاد میں۔

اُولَئِكَ الَّذِیْنَ هَدٰی قُوًّا، یہی ہیں سچے جنھوں نے اپنی سچائی ثابت کر دی، اور یہی متقی ہیں۔
دوسری آیت قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ الَّذِیْنَ هُمْ فِيْ صَلٰوةٍ تٰخِضُوْنَ خَاشِعُونَ الْخِیَی، یعنی مفلحین وہ لوگ ہیں جن میں یہ کمالات اور یہ صفات پائی جاتی ہوں، اب معتزضین اپنے کو تول کر دیکھیں کہ ان آیات میں مومن کی جو صفات بیان کی گئی ہیں، ان میں یہ صفات و کمالات پائے جاتے ہیں؟ اگر نہیں پاجا تو وہ کس منہ سے مومنین مخلصین پر معتزض ہوتے ہیں،

ہم سے بیان کیا عبد اللہ بن محمد الجعفی نے کہا ہم سے بیان کیا ابو عامر عقدی نے کہا

تَسْلِيْمَانُ بْنُ بِلَالٍ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ دِينَارٍ عَنْ أَبِي صَالِحٍ عَنْ

ہم سے بیان کیا سلیمان بن بلال نے انھوں نے عبداللہ بن دینار سے انھوں نے ابی صالح سے انھوں نے

أَبِي هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الْإِيمَانُ بَعْضُ

ابو ہریرہ سے انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا کہ ایمان کی ساٹھ پر

وَسِيتُونَ شُعَبَةً

کئی شاخیں ہیں

بخاری کا اشارہ ادھر بھی ہے کہ یہ اجزاء ایمان ہیں، جس معنی میں ان کا اجزاء ہونا ثابت ہوتا ہے اسکے ہم منکر نہیں ہیں اسلئے ہمارے لئے مضر نہیں، کما صرّ مراداً، کیوں کہ ہم انھیں فروغ کہتے ہیں، اور اگر چاہو تو اجزاء بھی کہہ سکتے ہو مگر ایسے اجزاء نہیں کہ ان میں سے کسی جزو کے نہ ہونے سے ایمان کا انتقار ہو جائے۔

حدیث ۷۵ حَدَّثَنَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ هُمَيْدٍ الْخَزَنَدِيُّ رَوَى ابُو عَامِرٍ عَنْهُدَى كِي هِے، حدیث میں فرماتے ہیں کہ ایمان کے کچھ اور ساٹھ شعبے ہیں، بِضْعَةُ شَيْءٍ کے معنے ہیں بہت سے اقوال ہیں، اَغْلَبَ یہ ہے کہ وہ قول اصح ہے جس میں بغض کی مراد سات بتائی گئی ہے، ویسے اس کا اطلاق تین دلیکروں تک تلپے نویسات تک بھی کہا جاتا ہے، تو اگر کوئی یہ ترجمہ کرے کہ ایمان کے ۶۷ شعبے ہیں تو کچھ مضائقہ نہیں، اتنا اداریا درکو کہو کہ حضرت ابو ہریرہؓ کی اس حدیث کی روایات مختلف ہیں، کسی میں ستون کے بجائے سبعون ہے، اور بعض میں شک کے ساتھ سبعون اوستون ہے،

اد پر جو میں نے یہ کہا کہ یہ ابو عامر کی روایت ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ حافظ نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ کسی روایت میں ستون اور کسی میں سبعون آیا ہے، مگر ابو عامر کی روایت میں سب جگہ ستون ہے، میں کہتا ہوں کہ حافظ کو ذہول ہوا ہے، مسلم کتاب الایمان میں بھی ایک روایت ابو عامر کی ہے، اور وہاں سبعون کا لفظ ہے، حافظ کو یہ روایت متحضر نہیں رہی، دونوں روایتوں میں جن حضرات نے جمع و تطبیق کی کوشش کی ہے انہیں سے بعض نے یہ فرمایا کہ ممکن ہے کبھی (ستون) فرمایا ہوا اور کبھی (سبعون) رہا یہ سوال کہ ایسا کیوں ہوا تو اس کا جواب یہ ہے کہ ممکن ہے پہلے (ستون) کا حکم دیا گیا ہو اور بعد کو اضافہ ہو گیا ہو، میں کہتا ہوں کہ یہ احتمال تو ضرور ہے مگر اس کو

میرا وجدان قبول نہیں کرتا، احادیث میں وہ احتمال لینا چاہیے کہ اسے ذوق بھی قبول کرے، اس سے بہتر تو یہ ہے کہ کہا جائے کہ اصل شعبے تو ستون ہی ہیں اور دوس ایسے ہیں کہ اگر چاہیں تو ان کو جزئی طور پر علیحدہ بھی شمار کر سکتے ہیں، تو وہ چیز فی حد ذاتہ بھی شعبہ ہے اور اس کے کچھ اصناف ایسے بھی ہیں کہ انھیں مستقلاً بھی شمار کر سکتے ہیں، بعض دستوں میں اصول سکھلا دیئے اور سبعون میں بعض ایسے ہیں کہ انھیں اگر چاہیں تو مستقل کہہ سکتے ہیں مگر انکے شمار کا تذکرہ نہیں، بہت سے لوگوں نے ان شعبوں کے بیان میں کتابیں لکھی ہیں، شعبہ الایمان للبیہقی بھی اسی موضوع پر ہے۔ (جو غیر مطبوع ہے) ہاں اس کا خلاصہ چھپا ہے، حافظ دین نے لکھا ہے کہ ابو حاتم ابن جان نے جو کتاب لکھی ہے وہ سب سے بہتر ہے، میں نے ان کی کتاب نہیں دیکھی، نہ حافظ نے دیکھی ہے اس نے دیا ہے میں لکھا ہے کہ جب میں نے یہ حدیث پڑھی تو میں ان احادیث کا تتبع شروع کیا جن میں کسی چیز کو ایمان میں سے قرار دیا گیا ہے، جب سب کو جمع کر چکا اور شمار کیا تو یہ عدد پورا نہ ہوا، پھر میں نے قرآن کا تتبع کیا تو اس میں جو ملا وہ بھی کم رہا، پھر میں نے دونوں کو جمع کیا تو تعداد پڑھ گئی اس کے بعد میں نے مکرر کوستا قرا دیا، یعنی جو قرآن و حدیث دونوں میں تھے ان میں سے ایک لے لیا تو ٹھیک عدد نکل آیا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے کتاب بہتر لکھی ہوگی، ابن حجر نے اور عینی نے بھی ان امور کو شمار کیا ہے اور ہم نے بھی کوشش کی ہے، چونکہ قرآن سے کچھ فطری مناسبت رہی ہے اس لئے غور کرنے سے یہ بات سمجھ میں آئی ہے کہ شعبہ تو وہی ہیں جو کلام اللہ میں ہیں مگر ان کی تعداد وہ نہیں ہے جو حدیث میں ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوا کہ کئی جوارح الی الایمان ہیں لے لیا جائے اور کچھ تو سے کیا جائے تو اس طرح پورے ۶۷ نکلتے ہیں، پھر میں نے دوبارہ کوشش کی اس طرح جیسا کہ میں نے ابھی کہا کہ بعض مستقل بھی ہو سکتے ہیں اور مثال بھی ہو سکتے ہیں تو اسطرح تلاش سے تہتر نکلا، اور لفظ بعض اس پر بھی صادق ہے، اور اس صورت میں دونوں ہدایات میں انطباق ہو گیا،

پہلے بحوالہ شاہ ولی اللہ گزر چکا ہے کہ اس میں شافعی ہیں تو اصل ایمان ہوا اور یہ منسوع

(۱) جامع تقریر کی تعبیر واضح نہیں ہے، غالباً مراد یہ ہوگی کہ شعبہ ایمان کے اصول تو ثابٹ ہیں، مگر ان اصول کی بعض جزئیات یا فروع ایسے ہیں کہ ان کو مستقل طور پر بھی شعبہ قرار دیا جاسکتا ہے، انھیں فروع کو ملا کر دوسری روایت میں سبعون

اب اتنا اور سمجھ لو کہ محدثین یہ تعبیر کریں گے کہ ایمان و اعمال میں ایسا تعلق ہے جیسا کہ شجرہ کا فروغ سے، یعنی جزو کا کل کے ساتھ ہے، اور ہم کہیں گے کہ جو تعلق اصل کا فرع سے ہے وہی تعلق یہاں ہے، تو ایمان کی تشبیہ اصل شجرہ سے ہوتی نہ شجرہ سے، اور اعمال کی فروغ سے تشبیہ ہوتی، اور یہ واضح ہے، قرآن میں فرمایا اَللّٰهُ تَزَكِيَّكَ فَمَرْبِّ اَللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ (یعنی کلمہ طیبہ شجرہ ہے اور اسکی جڑ مومنین کے قلوب میں ہے اور اس کا پھیلاؤ آسمان تک ہے، تو تشبیہ میں کلمہ کو شجرہ کہا ہے، اور یہاں ایمان کہا تو یہ اصل ہے شجرہ نہیں، تو آیت وحدیث میں فرق ہے،

قوله :- اَلْجِبَاءُ شُعْبَةٌ مِنَ الْاِيْمَانِ اسے علیحدہ کیوں لائے بعضوں نے کہا کہ حیا ایک خلق ہے، جو اناہد کرتا ہے، اعمال صالحہ پر اور بیزار کرتا ہے منہیات سے اور یہ ایک بڑی شاخ ہے، اسلئے اسے علیحدہ بیان کیا، شاہ مباحث فرماتے تھے کہ حیا کے شعبہ ہونے میں شعبہ تھا، کیونکہ شعب اعمال ہیں، اور حیا غرائز میں سے ہے، اور وہ ملکات ہیں جو فطری طور پر انسان میں ہوتے ہیں، اور وہ کسی نہیں ہوتے، تو شعبہ ہونا تھا کہ شعب تو وہ ہیں کہ جن میں کسب کو دخل ہو اور حیا میں کسب کو دخل نہیں، اس کو دفع کرنے کے لئے فرمایا اَلْجِبَاءُ شُعْبَةٌ مِنَ الْاِيْمَانِ۔ توضیح اسکی یہ ہے کہ حیا دو ہیں، ایک فطری، ایک کسبی، پہلی غریزہ ہے اور دوسری خلق۔ انسان جب برائی سے اجتناب کرتا رہتا ہے تو اجتناب ایک ملکہ بن جاتا ہے، یہاں ملکہ مراد جو کسب سے پیدا ہوتا ہے مگر مسلم میں جو زیادہ ہے وہ اس تقریر کے منافی ہے، اسلئے کہ وہاں افضل و ادنیٰ کا پھر حیا کا بیان ہے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ درحقیقت ان شعب کے تفاوت کو بتانا مقصود ہے کہ ایک اعلیٰ کنارہ ہے اور ایک ادنیٰ، اور میان میں کچھ متوسط ہیں، افضل تو قول لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ہے، ایمان اصل ایمان اور جڑ ہے اور قول لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ تناسل ہے، اور دیگر اعمال فروغ ہیں، تناسل بھی گوشاخ ہی ہے، مگر یہ اعلیٰ ہے۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام سے پہلی چیز یہی کہی گئی، فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوحٰى اِنْ سَخِیْنَا اَنَا اللّٰهُ الْغَیْثُ اور جب ایسا ہے تو فَاَعْبُدْنِيْ وَاَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِيْ (۱۷) اور ادنیٰ شاخ (ادنیٰ نسبتاً ہے ورنہ ہر ایک کمال ہے) اعاطہ اذی عن الطريق ہے، پھر بیج کے شعب میں ایک بیان کر دیا جس طرح اعلیٰ اور ادنیٰ کی ایک ایک مثال دے دی،

اب رہا یہ کہ متوسطات میں سے حیا ہی کو مخصوص کیوں کیا، تو اس کی وجہ وہ لے لو، جو شاہ صاحب نے

بیاض فرائی ہے یا دوسری تفسیر لے لو، بعض لوگوں نے حیا کی دو قسمیں بیان کی ہیں ایک عرفی دوسری شرعی، وہ اس طرح کہ با اذنا انسان کسی سے شرار کمانع کو ترک کر دیتا ہے یعنی حیا ہے حیا شرعی یہ ہے کہ اللہ سے شرار کو ترک کرے، حدیث میں حیا شرعی مراد ہوگی نہ عرفی، کیونکہ حدیث میں ہے نَهَمَتِ النِّسَاءُ النَّسَاءَ الْأَنْصَارَ، فَإِنَّهُ لَمْ يَمْنَعَهُنَّ الْحَيَاءُ عَنِ التَّفَقُّهِ فِي الدِّينِ تو یہ عرفی حیا تھی، اور شارح کی نظر میں اسکی کچھ وقعت نہیں، ہاں اگر حیا شرعی کے مخالف نہ پڑے تو بیشک ایک حد تک اس کا بھی اعتبار ہے، اور محمود ہے، بعضوں نے ایک قسم اور نکالی، یعنی حیا عقلی، حیا شرعی کا تارک فاسق کہلا گیا، حیا عقلی کا تارک مجنون، اور حیا عرفی کا تارک ابلہ، دراصل حیا کی حقیقت وہ ہے جو امام راغب نے لکھی ہے یعنی هُوَ انْقِبَاضُ النَّفْسِ عَنِ الْفَبَاحِ وَتَرْكُهُ لِدَلِّكَ^(۱) اب اگر وہ شرعاً قبیح ہے تو اس سے انقباض حیا شرعی ہے اور اگر عرفاً قبیح ہے تو عرفی، اور عقلاً قبیح ہے تو عقلی،

عارفین نے حقیقت حیا یہ بتلائی ہے اِنَّ لَا يَزَالُكَ مَوْلَاكَ حَيْثُ تَهَالِكُ^(۲)، یعنی حیا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمکو اس جگہ نہ دیکھے جہاں ہونے کو اس نے منع کر دیا ہے، یہ حقیقت ہے کہ مجرم کو حضور الہی کا یقین ہو، تو سچ کوئی جرم نہیں کر سکتا، چنانچہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے کہ صرف دیکھ کر مجرم کو یہ فرمایا تھا کہ لوگ زنا کرتے ہیں اور ہماری مجلس میں آتے ہیں،

ترمذی میں ہے، فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِسْتَحْيُوا مِنْ اللّٰهِ حَقَّ الْحَيَاءِ (اللہ سے حیا کرو جیسا کہ اس کا حق ہے) صحابہ نے کہا اِنَّا نَسْتَحْيِي مِنَ اللّٰهِ يَا نَبِيَّ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ (اے اللہ کے نبی، اے اللہ شرم تو خدا سے حیا کرتے ہیں) آپ نے فرمایا لَيْسَ ذَٰلِكَ (یہ وہ حیا نہیں ہے) وَلَكِنْ مِنْ اِسْتَحْيَا مِنَ اللّٰهِ حَقَّ الْحَيَاءِ (بلکہ جو شخص اللہ سے حیا کرے جیسا کہ اس کا حق ہے) فَلْيَحْفَظْ الرِّاسَ وَمَا وَعَىٰ تَوْحَافَتِ كَرَسِيٍّ سُرِّي اَوْرَانِ خِيَالَاتِ وَعَقَائِدِ كِي جُوسَرِ مِيں ہوں، وَ لِيَحْفَظَ الْبَطْنَ وَمَا حَوَىٰ (اور پیٹ کی حفاظت کرے اور ان چیزوں کی جو پیٹ میں ہیں) مِیْنِ حَرَامِ سَے بچے اور حلال پر نفاعت کرے، وَغَیْرَہٗ، وَلَیْذُکْرِ الْمَوْتِ وَالْبَلَاءِ (اور یاد کرے موت کو اور وہاں کی سبکی کو) وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ تَرَكَ زَيْنَةَ الدُّنْيَا (اور جو طالب آخرت ہوگا وہ دنیا کی زیب و زینت کو چھوڑ دے گا)

(۱) مفردات میں اسی طرح ہے، تقریر میں عَنْ فِیْلٍ قَبِیْحٍ، اَفْضَلُ الْبَارِیِّ مِیْنِ "عَنِ الْبَقِیْرِ الْعَقْلِ" ہے (۲) میرے نزدیک یہ صحیح ہے

فَافْضَلُ الْبَارِیِّ مِیْنِ اور اس تقریر میں بھی اِنَّ مَوْلَاكَ لَا یَزَالُكَ ہے۔ جو میرے نزدیک صحیح نہیں ہے،

فَمَنْ فَعَلَ ذَلِكَ فَقَدْ اسْتَمْتَعَ مِنَ الْحَيَاءِ^(۱۱) (پس جس شخص نے یہ سب کچھ کر لیا، اس نے بیشک اللہ سے حیا کی، جیساکہ حیا کا حق ہے) یہ ہے کمال حیا کا، سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ میں یہ وصف بصد اتم موجود تھا، اسی بنا پر آنحضرتؐ نے فرمایا تھا اَصْدَقُهُمْ حَيَاءً عُثْمَانُ (سب سے سچی حیا، ولے عثمان ہیں) مجلس والا واقعہ بھی ان کے کمال حیا کی دلیل ہے، ان کی حیا لطیف نے آنے والے کی نگاہ دیکھ کر سمجھ لیا کہ اس نے آنکھ کا زنا کیا ہے، اور آنے والے نے اعتراف کیا کہ اس نے آنے ہوئے ایک انجبی عورت کو ناکا تھا۔

بَابُ السُّلَامِ مِنْ سَلَامِ الْمُسْلِمُونَ مِنْ لِسَانِهِ وَيَدِهِ

حدیث نمبر ۱۰۰۰ قولہ المسلم من مسلم المسلمون من لسانہ ویدک (مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ مسلمان محفوظ رہیں) یعنی جو شخص مسلم کہلاتا ہے تو کم از کم اس نام کی لاج رکھنی چاہئے، کیونکہ مسلم کا مادہ 'سلم' ہے جس کے معنی صلح و اشتی کے ہیں اور یہ لفظ 'حرب' کا مقابل ہے (تو شخص (ناحق) ایذا پہنچائے، خواہ ہاتھ کے ذریعہ ہو یا زبان کے، وہ اس لقب کا مستحق نہیں ہاتھ کی ایذا میں ہاتھ سے کسی کی برائی لکھنا، تحریری طور پر بے وقسمت، بہتان طرازی اور غیبت بھی داخل ہے، اور زبان سے ایذا ظاہر ہے۔

(۱) یہ حدیث مشکوٰۃ باب تمنی الموت و ذکرہ میں بروایت مسند احمد و ترمذی انھیں لفظوں کے ساتھ مذکور ہے۔

قَالَ أَبُو عَبْدِ اللَّهِ وَقَالَ أَبُو مُعَاوِيَةَ ثَنَا دَاوُدُ بْنُ أَبِي هِنْدٍ

امام بخاری نے کہا اور معاویہ نے بیان کیا، ہم سے بیان کیا داؤد نے، انھوں نے عامر بنی سے، کہا کہ میں نے
عَنْ عَامِرٍ قَالَ سَمِعْتُ عَبْدَ اللَّهِ بْنَ عَمْرٍو يُحَدِّثُ عَنْ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ
سنا عبد اللہ بن عمرو سے، انھوں نے سنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے (پھر یہی حدیث بیان کی) اور
وَسَلَّمَ، وَقَالَ عَبْدُ الْأَعْلَى عَنْ دَاوُدَ عَنْ عَامِرٍ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ عَنْ
عبد الاعلیٰ نے اس کو روایت کیا داؤد سے، انھوں نے عامر سے، انھوں نے عبد اللہ سے، انھوں نے
النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے

بعض لوگ اس میں تاویل کرتے ہیں کہ مسلم سے مسلم کا مراد ہے، مگر اس سے حدیث کا وزن گھٹ جاتا ہے، اور جس
چیز سے تنفیہ مقصود تھی وہ حاصل نہیں ہوتی، کیونکہ ہر شخص کہہ دے گا کہ ہم کون سے جنید و شبلی ہیں، ہم تو پیسے ہی سے ناواقف ہیں، ایک نقص یہ
بھی ہے، لہذا اسے سطح کام ہی پر رکھنا چاہئے اور مبالغہ پر عمل کرنا چاہئے جیسا کہ ہم محاورات میں کہتے ہیں کہ آدمی وہ ہے جو کسی کو ایذا نہ پہنچائے
تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ اس کے خلاف کرنے پر آدمیت سے نکل گیا بلکہ مطلب یہ ہے کہ یہ خصلت آدمیت کی ہے، ایسے ہی مسلم وہ ہے
یعنی خصلت مسلم یہ ہے کہ وہ ایذا نہ پہنچائے۔

یہ بھی یاد رکھو کہ من سلم المسلمون کی تہ سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ غیر مسلم کو ایذا پہنچا سکتا ہے، کیونکہ مفہم مخالف
یہی ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ کفار کی ایک قسم وہ ہے جن کو حسرتی کہا جاتا ہے، جن کے ساتھ نہ ہم نے عقد ذمہ کیا ہے اور نہ ہمارے
ان کے درمیان باہمی رواداری اور صلح و شنتی کا معاہدہ یا معمول ہے، اور ان سے ہم محفوظ نہیں تو وہ بھی ہم سے محفوظ نہیں ہیں، دوسری قسم
کفار کی وہ ہے جن سے ہم نے عقد ذمہ کیا ہے یا جن کے ساتھ باہمی رواداری کا معاہدہ یا معمول ہے، کفار کی یہ قسم ذمہ کھاتی ہے اور ایذا رسانی
کے معاملہ میں مسلمانوں کے حکم میں ہے، حتیٰ کہ اسلام نے ذمیوں کے جان و مال بلکہ ان کے مذہب کی حفاظت کا بھی ذمہ لیا ہے۔
تو اب مراد یہ ہوئی کہ مسلمین اور وہ جو مسلمین کے ذمہ میں ہیں معاملات میں المسلمون کے حکم میں ہیں اور جو کافر محارب ہیں وہ اس حکم سے خارج
ہیں اس لیے کہ قرآن نے فرمایا لَا يَهْدِي اللَّهُ الْكَاذِبِينَ الَّذِينَ لَمْ يُقَالُوا لَهُمْ فِي الدِّينِ وَلَمْ يُخَيَّرُوا لِمَنْ دِيَارَهُمْ (الآیہ)

باب آئِ الْإِسْلَامِ أَفْضَلُ

کون سا اسلام افضل ہے۔

۱۰۔ حَدَّثَنَا سَعِيدُ بْنُ يَحْيَى بْنُ سَعِيدٍ الْأُمَوِيُّ الْقُرَشِيُّ قَالَ ثَنَا

ہم سے بیان کیا سید ابن یحییٰ ابن سید اموی قرشی نے، کہا ہم سے بیان کیا والد نے، کہا
 أَنِي قَالَ ثَنَا أَبُو بَرْدَةَ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ أَبِي بَرْدَةَ عَنْ أَبِي بَرْدَةَ عَنْ أَبِي مُوسَى
 ہم سے بیان کیا ابو بردہ بن عبد اللہ ابن ابی بردہ نے، انھوں نے ابو بردہ سے، انھوں نے ابو موسیٰ اشعری سے
 قَالَ قَالُوا يَا رَسُولَ اللَّهِ! آئِ الْإِسْلَامِ أَفْضَلُ؟ قَالَ: مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُونَ
 صحابہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! کون سا اسلام افضل ہے؟ آپ نے فرمایا: جس کے ہاتھ اور زبان سے
 مِنْ لِسَانِهِ وَيَدِهِ.
 مسلمان بچے رہیں۔

قَوْلُهُ وَالْمُهَاجِرُ مَنْ هَاجَرَ مَا نَهَى اللَّهُ عَنْهُ (مہاجر وہ ہے جو ان چیزوں کو چھوڑ دے جن سے اللہ نے منع فرمایا ہے) ہجرت کی دو قسمیں ہیں: ایک ہجرت ظاہرہ، یعنی مکہ مکرمہ سے یا کسی جگہ سے مدینہ منورہ یا کسی دارالاسلام کی طرف منتقل ہونا اور کافرانہ ماحول کو ترک کر دینا، اور دوسری ہجرت باطنیہ ہے، اور وہ محارم و منہیات کا ترک کرنا ہے، ایک شخص نے دارالکفر کو چھوڑ دیا مگر دارالاسلام میں پہنچ کر محارم و فواحش کا ارتکاب شروع کر دیا تو یہ ہجرت کیا ہوئی؟ ہجرت اس لئے ہے کہ دین کی حفاظت ہو اور جب اس نے یہ نہ کیا تو ہجرت کی غرض مفقود ہوگئی۔

قَوْلُهُ قَالَ أَبُو عَبْدِ اللَّهِ وَقَالَ أَبُو معاوية، یہاں امام بخاری کو یہ بتلانا مقصود ہے کہ پہلی روایت شعیب کی ہے اور ان کے دو شیخ ہیں، ابن ابی اسفر اور اسلمیل، اور دونوں کی متابعت داؤد ابن ابی ہند نے کی ہے، شعیب سے ان دونوں نے بھی روایت کی ہے اور داؤد نے بھی، فرق صرف یہ ہے کہ پہلے دونوں نے سماع کی تصریح نہیں کی ہے اور داؤد نے تصریح کی ہے کہ عاصم نے سمعت عبد اللہ ابن عمرو کہہا۔

قَوْلُهُ وَقَالَ عَبْدُ اللَّهِ عَلِيُّ الْخَمَّ، یہاں پر امام بخاری نے یہ بتایا ہے کہ داؤد کی روایت میں سماع کی تصریح

(۱) شعیب اور عامر ایک ہی شخص ہیں، عامر نام ہے اور شعیب نسبت، اور یہ امام ابو حنیفہ کے استاد اور شیخ ہیں۔

بَابُ اطْعَامِ الطَّعَامِ مِنَ الْإِسْلَامِ

کھانا کھانا، اسلام کی فحلت ہے

۱۱ — حَدَّثَنَا عَمْرُو بْنُ خَالِدٍ قَالَ ثَنَا اللَّيْثُ عَنْ يَزِيدَ عَنْ

ہم سے بیان کیا عمرو بن خالد نے ، کہا بیان کیا ہم سے لیث نے ، انہوں نے یزید سے

أَبِي الْخَيْرِ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو أَنَّ رَجُلًا سَأَلَ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ

انہوں نے ابو الخیر سے ، انہوں نے عبداللہ ابن عمرو سے : ایک مرد نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے

وَسَلَّمَ أَيْ الْإِسْلَامِ خَيْرٌ قَالَ تَطْعَمُ الطَّعَامَ وَتَقْرَأُ السَّلَامَ عَلَى مَنْ

پوچھ : اسلام کی کون سی فحلت بہتر ہے ؟ آپ نے نہ پایا : کھانا کھانا اور (ہر ایک مسلمان کو) سلام کرنا

عَرَفْتُ وَمَنْ لَمْ يَعْرِفْ .

اس کو پہچانتا ہو یا نہ پہچانتا ہو .

ان کا شاگرد ابو معاویہ کرتا ہے ، اور داؤد کا دوسرا شاگرد عبدالاعلیٰ سماع کی تفریع نہیں کرتا بلکہ عن عبد اللہ کہتا ہے .

بَابُ اِتْيِ الْإِسْلَامِ أَفْضَلُ

اول ارکانِ خمسہ کو اسلام کا ستون ثابت کرنے کے بعد اب کچھ دوسری تفصیلات بیان کرتے ہیں .

المسلم من سلم المسلمون کو ذکر کر کے بتایا کہ اللہ اور زبان سے کسی مسلم کو ایذا نہ پہونچانا بھی شیوۂ اسلام ہے

اس کے بعد اِتْيِ الْإِسْلَامِ أَفْضَلُ کا ذکر کر کے بتا رہے ہیں کہ کوئی اسلام فاضل اور کوئی مفضول ہوتا ہے ، یعنی

اسلام کے مراتب متفاوت ہیں اور جب اسلام کے مراتب متفاوت ہوئے تو ایمان کے بھی متفاوت ہوں گے ، کیونکہ امام بخاریؒ کے یہاں دونوں ایک ہیں .

بَابُ اطْعَامِ الطَّعَامِ مِنَ الْإِسْلَامِ

حدیث ۱۱۱۱ قولہ اِتْيِ الْإِسْلَامِ خَيْرٌ یعنی اِتْيِ خَصَالِ الْإِسْلَامِ خَيْرٌ ، اسلام کی کون سی فحلت

بہتر ہے ، یا کون سی فحلت والا بہتر ہے .

قولہ تَطْعَمُ الطَّعَامَ ، اس میں مفعول اول کو محذوف کر دیا تاکہ دلالت کرے کہ کھانا کھانا ، بلکہ تخصیص خصالِ اسلام

میں سے ہے ، نادار کو کھلائے یا غنا دار کو .

قَوْلُهُ وَقَفَرُ السَّلَامِ عَلَى مَنْ عَرَفَتْ وَعَلَى مَنْ لَمْ تَعْرِفْ، یعنی ہر ایک کو سلام کرنا چاہئے، خواہ پہچان ہو یا نہ ہو، یہ بات اشرافیت میں سے ہے کہ اخیر زمانہ میں مرن پہچان والوں کو ہی سلام کیا جائے گا۔

ایک ہی طرح کے سوال کے مختلف جواب کی تحقیق | اس قسم کی حدیثیں متعدد ہیں جن میں بعض اعمال کی بعض پر فضیلت بیان فرمائی گئی ہیں، سب میں سوالات قریب قریب یکساں ہیں، مگر جوابات مختلف ہیں

ترمذی میں ہے: اِیْ الْاَعْمَالِ الْاَفْضَلُ؟ جواب میں فرمایا گیا: الْاِیْمَانُ بِاللّٰهِ، مسلم کی حدیث اِیْ الْاِسْلَامِ خَیْرُ کے جواب میں فرمایا: اَنْ تَطْعَمَ الطَّعَامَ وَقَفَرُ السَّلَامِ عَلَى مَنْ عَرَفَتْ وَعَلَى مَنْ لَمْ تَعْرِفْ، ترمذی میں اِیْ الْاَعْمَالِ الْاَفْضَلُ کے جواب میں فرمایا: الصَّلٰوةُ عَلَى مَوَاقِیْتِہَا، غرض سوالات متقارب ہیں، مگر جوابات متفاوت، اور بظاہر ان میں تغایر بھی ہے، اور ترتیب لمبی الگ الگ ہے، ایسا کیوں ہوا؟ مشہور جواب یہ ہے کہ سائین، یا اوقات، یا احوال کے لحاظ اور امتثال سے جوابات بھی مختلف دے، جس نے پوچھا: اِیْ الْاِسْلَامِ خَیْرُ؟ اس میں آپ نے کچھ بدل دیکھا ہوگا اس لئے نہ فرمایا: اَنْ تَطْعَمَ الطَّعَامَ، مطلب یہ نہیں ہے کہ علی الاطلاق سب سے بہتر مل ہی ہے، بلکہ اس شخص کے حق میں یہی بہتر ہے۔

یابھی اوقات یا احوال کے اعتبار سے جواب دیا، مثلاً جہاد کا وقت ہے اور اخراجات کی ضرورت ہے اور موساسۃ مقصود ہے تو اطعام طعام کو افضل فرمایا چنانچہ اَنْ تَطْعَمَ الطَّعَامَ کے بارے میں تصریح ہے کہ یہ اوائل اسلام کی حدیث ہے، جب اس کی سخت ضرورت تھی، یہ تو مشہور جواب کا خلاصہ ہوا، مگر جہاں تک ہم نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ کہیں کہیں یہ ضرورتیں پیش آتی ہیں اور اس کی بنا پر جوابات مختلف ہوتے ہیں، مگر یہاں پر الفاظ حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سوال کے الفاظ کا تفاوت بھی اختلاف جواب کا باعث ہے، مثلاً ایک رعایت میں لفظ افضل ہے، یہ سب کو شامل ہے اَنْ تَطْعَمَ الطَّعَامَ میں اکثر روایات میں لفظ خیر آیا ہے، جس حدیث کے آخر میں صحیح مکرر ہے اس کی تمام روایات میں افضل کا لفظ ہے، ترمذی کی حدیث جو بخاری میں ہے اس میں احب کا لفظ ہے اور اس کے جواب میں نہ فرمایا الصَّلٰوةُ لَوْ تَقَاتَلَا، چونکہ فضیلت ہر ایک میں ہے اس لئے رواۃ ہر جگہ افضل بول دیتے ہیں، خیر مقابل شر ہے، جب خیر کا سوال کیا تو مراد یہ ہے کہ جس میں شر کا بالکل شائبہ نہ ہو، نہ صورت نہ معنی، اس لئے فرمایا: اَنْ تَطْعَمَ الطَّعَامَ، یہ وہ وصف ہے جس میں کسی کے نزدیک بھی شر نہیں

(۱۱) یہ توجہات امام نووی اور حافظ ابن حجر وغیرہ نے بیان کی ہیں۔

فطرت سمیعہ بتلائی ہے کہ مطلقاً شر نہیں ہے، تجربہ بھی شاہد ہے کہ جس شخص میں یہ وصف موجود ہے اس کی نیک نامی اور سرخروئی ہوتی ہے۔ تو اس کی کسی عنوان سے کسی بھی شر کا شبہ نہیں، جس پر تمام عالم کا اتفاق ہو، بلکہ کانسرہ ہوا محمد سب کے نزدیک وہ بہتر ہے اور اس میں کسی قسم کے فتنہ کا احتمال بھی نہیں۔

اسی سوال کے جواب میں دوسری روایت میں آتا ہے ان یسلم المسلمون عن انہ تو معلوم ہوا کہ تمام دنیا کے نزدیک آپس میں غیر مفس ہے، شر بالکل نہیں، نہ صودۃ نہ حقیقۃ [در بعض امور ایسے بھی ہوتے ہیں جن میں بظاہر شر کا پہلو بھی نکلتا ہے] مثلاً جہاد کہ اس میں غیر ہے مگر فقہار کہتے ہیں کہ حسن لغیرہ ہے، چونکہ علامہ کلمۃ اللہ ہے، اس مقصد اور استرمار الہی کے اعتبار سے حسن ہے، مگر بظاہر فساد و ظلم ہوتا ہے کہ لیکن اطعام طعام میں کسی کے نزدیک فساد نہیں تو خیر کے سوال کا جواب ایسا ہی ہونا چاہئے تھا جس میں شر کا شبہ بھی نہ ہو، اور جب سوال ہوا کہ اتی الاعمال افضل^(۱)، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جس میں اجر زائد ہو وہ کون سا عمل ہے؟ تو آپ جواب میں فرماتے ہیں کہ الایمان باللہ، اور اس زمانہ میں ایک کافر کو چھوڑ کر ایمان کا اختیار کرنا سب سے مشکل کام تھا، اس کے مقابل میں ہر چیز آسان تھی اس کا ثبوت یہ ہے کہ اہل عرب نے مر جانا اور تباہ ہو جانا گوارہ کر لیا مگر کلمہ پڑھنا گوارہ نہ کیا، معلوم ہوا کہ اس سے بڑھ کر کوئی مجاہدہ نہیں، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ جان مال سب سے بڑھ کر مذہب کی محبت ہوتی ہے، فرق یہ ہوتا ہے کہ مومنین کو اللہ تعالیٰ سے محبت ہوتی ہے اور اہل باطل کو باطل سے کہ مال اللہ تعالیٰ: وَمِنَ النَّاسِ مَن يَتَّخِذُ مِن دُونِ اللَّهِ أَندَادًا يُحِبُّونَهُمْ كَحُبِّ اللَّهِ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ^(۲)

پھر اس کے بعد فرمایا: جہاد افضل ہے، کیونکہ ایمان کے بعد سب سے مشکل کام یہی ہے، اس لئے کہ تمام بیوی بچوں کو چھوڑ کر اعزاء اقرباء کو چھوڑ کر دولت و تجارت کو چھوڑ کر جانا پڑتا ہے، خود قرآن کہتا ہے: إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَى مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنَّهُمْ أَجَبْتَهُ^(۳) (اللہ) تو مسلم ہوا کہ دوسرے درجہ میں شاق مل جاتا ہے۔

اس کے بعد فرمایا جہاد مجہود، شاہد ہے کہ یہاں انفاق مال بھی ہے اور مشقت بھی، مجاہد گری اور لڑاؤ میں چلتا ہے اور تمام راحت و آرام ترک کرتا ہے، اسی لئے فرمایا کہ عورتوں کا جہاد حج ہے، تو بعد جہاد کے سب سے مشکل اور سب سے افضل حج ہے، اسی کو فرمایا: الْعَطَايَا عَلَى مَنِّ النَّبَلَايَا۔

(۱) افضل، افضل سے ہے اور اس کے معنی زیادہ کے ہیں (۲) بغیر ۱ ۱۶۵ (۳) توبہ ۱۱۱

کتوبات میں مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں :

كيف الوصول الى سعاد ودونها ۞ قلل الجبال ودونهن قطوف
 نوآئدک پہونچنا عین مقصود ہے مگر کام مشکل ہے، اور بڑا جزا خورد ہے وہ جو اس راہ پر چل پڑے اور ب کچھ جھیلنے کو تیار
 ہو جائے اسی کو فرماتے ہیں :

هنيئاً لاسراباب النعيم نعيمهم ۞ وللعاشق المسكين ما يتجرع

تیسرے کچھ بزرگ اور ہے، وہ یہ کہ بعض اعمال اپنی ہیئت ظاہری صورت کے اعتبار سے وظیفہ عبودیت کے مناسب ہوتے ہیں
 جیسے نماز کہ اس میں کوئی اتنی مشقت نہیں مگر جہاد و ج میں ہے، مگر یہاں بندوں کی ہوا سے تذل اور انکساری ظاہر ہوتی ہے اور قاعدہ یہ ہر
 کس کی ملک کو اس سے بڑھ کر محبوب کوئی چیز نہیں ہو سکتی کہ اس کا غلام غایت انکساری کا مظاہرہ کرے، اور اس سے بنو فی کوئی شے نہیں کہ غلام
 نخواستہ و سرکشی سے پیش آئے، لہذا جب سوال کیا اِیْ اَلْاَعْمَالِ اَحَبُّ اِلَى اللّٰهِ، تو سوال محبوب چیز کا ہو رہا ہے اور اس سے زیادہ
 محبوب کوئی چیز نہیں کہ انہماک تذل ہو، اسلئے فرمایا، الصَّلٰوةُ لَوْ تَقَمَّا، کیونکہ اس میں بادرت ثابت ہوتی ہے امثال امر میں اور یہ منظر اکمل ہر
 عبودیت کا۔

اس کے بعد فرمایا بِنِّوَالِدَیْنِ، کیونکہ باپ صفت ایمان کے اعتبار سے عالم اسباب میں قائم مقام اللہ کے ہیں اور تخلیق کا
 وجود ان کے واسطے سے ہوا ہے، اسی لئے قرآن میں کئی جگہ اپنے حقوق کے ساتھ والدین کے حقوق کا بھی ذکر فرمایا، ارشاد باری ہے : اَنْ
 اَنْشُکْرُکَیْ وَ لِوَالِدَیْکَ ۙ تَوَالِدَیْنِ کے ساتھ بزرگ کون کرے گا؟ وہی جو خالق کا حق پہچانتا ہو، کیونکہ جو شخص والدین کے ساتھ احسان و
 ان کی اطاعت نہ کرے تو اللہ کے حقوق کی ادائیگی کی اس سے کیا امید ہو سکتی ہے،

تیسرے درجہ میں اطاعت اولی الامرؑ مراد ہے اور اس کا سب سے بڑا مظاہرہ جہاد کے وقت ہوتا ہے، اس لئے فرمایا : اَلْجِهَادُ
 فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ، تو اول درجہ میں اللہ کی اطاعت، دوم درجہ میں بڑا والدین اور تیسرے درجہ میں اولی الامر کی اطاعت رکھی، اس اعتبار
 بندہ سرالہ اطاعت ہے اور اس صورت میں یہی ترتیب رہنی چاہئے، اسی لئے فرمایا : وَاِنْ جَاهَدَاکَ عَلٰی اَنْ تَشْرِکَ بِیْ مَا
 لَیْسَ لَکَ بِہٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا مگر آگے یہ بھی فرمایا کہ : وَصَاحِبَهُمَا فِی الدُّنْیَا مَعَهُمْ وَفَا (۳) بس یہ انتہا ہے،

۱۱ (۱) نعمان : ۱۳ (۲) اسی کو فرمایا : اَطِيعُوا اللّٰهَ وَاطِيعُوا الرَّسُوْلَ وَادْبِیْ اَلْاَمْرَ مِنْکُمْ (نساء : ۵۹) (۳) نعمان : ۱۵

اب اگر یہاں باپ شرک کا حکم دیں تو ان کی اطاعت واجب نہیں^(۱) مگر والدین کے ساتھ منسلک کے مساو کا حکم جب بھی ہے، یہ اس لئے کہ ان کا حق بہت بڑا ہے، جو فرمایا: **وَ اخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذِّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ**^(۲) اور کہا اللہ سے ان پر رحمت کی دعا کر کہ **وَقُلْ سَرِّبْ اَرْسَهُمَا كَمَا سَرَّ بَيَّائِنِي هَافِيًا**^(۳) قرب کی صفت ربوبیت کا ظہور ان سے ہوتا ہے، اس لئے ان کا رب اللہ کے بعد ہے، بالفاظ افضل وہ ب کو شامل ہے، مگر جس میں صرف افضل آیا ہے وہاں میرے نزدیک صرف زیادہ کے معنی میں ہے اور جہاں دوسرے الفاظ کے ساتھ میں آیا ہے وہاں اس نوسا کے اعتبار سے نفیلت ہوگی، نفیلت کلی ایمان باللہ کو ہے اس کے بعد صلوة کو علماء نے لکھا ہے۔

ایک وجہ یہ بھی ہے کہ شئون بتوت بھی مختلف ہوتے ہیں، جس صفت کا میں وقت ظہور ہوتا تھا اسی کے اعتبار سے اس وقت اس کا بیان بھی فرمادیتے تھے (مزید ان شاء اللہ حضرت ابو ہریرہ کی حدیث فلیں میں آئے گا)

اب ان دو حدیثوں کے بارے میں جو یہاں بخاری میں ہیں کچھ کہنا ہے، ان کے بارے میں حافظ تو کہتے ہیں کہ جو شخص کسی کو کھانا کھلائے تو اغلب یہ ہے کہ اس کے ہاتھ سے لگ محفوظ بھی رہیں گے، اسی طرح جو ہر ایک کو سلام کرتا ہے تو اغلب یہ ہے کہ لوگ اس کی زبان سے محفوظ رہیں گے یہ امید نہیں کی جاسکتی کہ جو کھانا کھلائے وہی لافٹ لے کر اس پر چڑھ بھی آئے، یا سلام کرے اور پھر برا بھی کہے، چنانچہ جب دل میں کچھ ہوتا ہے تو سلام ترک کر دیتے ہیں، تو **تقطع الطعام** کنا یہ ہے سلامت سے اور **تقرئ السلام** کنا یہ ہے سلامت لسان سے۔ تو اس طرح انھوں نے (حافظ نے) ان کو پہلی حدیث کی طرف راجع کر دیا۔

اپنی سمجھ میں یہ آیا ہے کہ بخاری ایک خاص ترتیب اور عجیب لطافت کے ساتھ ابواب لارہے ہیں، پہلے ادنیٰ مرتبہ بیان کیا، کہ ایک شخص فاسق ہے، فاجر ہے، بدکار ہے، عاصی ہے، مگر لوگ اس کی ایذا سے محفوظ ہیں، اسلام ہی کا نہیں بلکہ آدمیت کا ادنیٰ مرتبہ یہی ہے [دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ دوسروں کے ساتھ بھلائی کرے] تیسرا مرتبہ یہ ہے کہ مومن اپنے بھائی کے لئے وہ بات پسند کرے جو اپنے لئے پسند کرنا ہے، تو یقینی اچھی ترتیب ہے، ادنیٰ مرتبہ یہ ہے کہ ایذا نہ پہنچائے، اس سے اعلیٰ مرتبہ یہ ہے کہ دوسروں کے ساتھ بھلائی کرے، اس سے اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ **يُحِبُّ اَخِيَهٗ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهٖ** اور اس سے بھی اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ اپنی جان سے بڑھ کر دوسرے سے تعلق ہو اور وہ پیغمبروں کی ذات ہے کہ ان کے ساتھ ایسی محبت ہو کہ تمام دنیا کو ان کے مقابلہ میں حتیٰ کہ اپنی محبوب جان

(۱) کیونکہ وہ کافر ہوئے اور کافر کی اطاعت واجب نہیں (اتجا) جات تقریر نے یہی لکھا ہے، مگر ادنیٰ یہ ہے کہ کہا جائے یہ سمیعت خالق ہے **وَلَا طَاعَةَ لِمَخْلُوقٍ فِي مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ** (مرتب) (۲) بنی اسرائیل ۱ ۲۴

بَابُ مِنَ الْإِيمَانِ أَنْ يُحِبَّ لِإِخِيهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهِ

ایمان کی بات یہ ہے کہ جو اپنے لئے چاہے وہی اپنے بھائی (مسلمان) کیلئے چاہے

۱۲۔ حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ قَالَ حَدَّثَنَا يَحْيَى عَنْ شُعْبَةَ عَنْ قَتَادَةَ عَنْ

ہم سے بیان کیا مسدد نے کہا ہم سے بیان کیا یحییٰ نے انھوں نے روایت کی شعبہ سے انھوں نے قتادہ کو

أَنَسَ عَنِ النَّبِيِّ، وَعَنْ حُسَيْنِ الْمُعَلِّمِ قَالَ سَمِعْتُ قَتَادَةَ عَنْ أَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ
انھوں نے انس سے انھوں نے آنحضرت سے دوسری سند یہ یحییٰ نے اس کو روایت کیا حسین معلم سے کہا ہم سے بیان کیا قتادہ نے انس نے
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّى يُحِبَّ لِإِخِيهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهِ
روایت کی انس سے انھوں نے آنحضرت سے فرمایا کہ کوئی تم میں سے اس وقت تک مومن نہیں ہوتا یہاں تک کہ اپنے لئے جو چاہتا ہے وہی اپنے بھائی (مسلمان) کیلئے

بھی پس پشت ڈال دے اس سے اعلیٰ مرتبہ یہ ہے کہ اس کے متعلقین سے بھی محبت کرے اس لئے کہ قاعدہ یہ ہے کہ جب برتن پانی سے
بھر جائے گا تو پانی اس کے ارد گرد گرے گا اسی طرح جب محبت کا پیمانہ بھی بھر جائے گا تو ارد گرد گرتا ہے اور متعلقین سے محبت ہو جاتی ہے
اسی کو لائے ہیں باب حب الانصار من الایمان میں اور درمیان میں حللۃ الایمان کا باب لائے ہیں (اے بعد میں
آگے بیان کروں گا) حاصل یہ کہ میرے نزدیک اس حدیث کو پہلی حدیث کی طرف مابج کرنا ایک طرح کا قصور ہے جس کی وجہ سے تیب
کی وہ خصوصیت اور لطافت باقی نہ رہے گی کما بیش تھا۔

مَنْ عَرَفَتْ وَمَنْ لَمْ تَعْرِفْ کے عوم سے یہ بات نکالی ہے کہ کافر کو بھی سلام جائز ہے، مگر
یہ مسئلہ کتب فقہ میں منصوص ہے کہ کافر کو پہلے سلام نہ کرے بلکہ محض جواب دے اور جواب بھی وہ نہیں جو مسلم کے لئے ہے، بلکہ
هَذَا اَللّٰهُ وَغَيْرُهُ سے جواب دے تو مَنْ عَرَفَتْ کا عوم خاص سلین کے لئے ہے، مگر یہ مسئلہ اس وقت کے لئے ہے جب
اسلام کو شریعت و حکومت حاصل ہو، ورنہ جب چارہ نہ رہے تو اپنی جان بچانے کے لئے آداب وغیرہ کہہ دیا جائے اسلام
نکلیا جائے۔

اسلام نے سلام کا طریقہ سکھایا ہے، دنیا کے تمام فرقہ شکنے کے وقت ایک تحفہ پیش کرتے ہیں، مگر اس سے
بہتر کوئی لفظ نہیں کیونکہ یہاں سلامتی کی دعا بھی ہے اور شہادت بھی اور ایک دوسرے کو مطمئن بھی کر دیتا ہے کہ یہ میرا خیر خواہ ہے اور میری
سلامتی چاہتا ہے، سنا ہے کہ اہل بدو (ڈاکوؤں) کا تعین حراہی کہتے ہیں، یہ قاعدہ ہے کہ جیل سے پہلے اگر انھیں سلام کیا جائے تو
اگر انھوں نے جواب دے دیا تو سمجھ لو کہ لوٹیں گے نہیں اور اگر جواب نہ دیا تو اب خطرہ ہے، گو یا سلام کے جواب سے مطمئن کر دیا گیا، چنانچہ

ایک واقعہ بھی میرے ساتھ پیش آیا کہ چند ہمارے قافلہ کے ساتھ تھے مگر انہوں نے سلام کیا، نہ ہم نے، نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑی ہی دیر میں ہمارے قافلہ کو ٹھہرایا۔

باب من الایمان ان یحب لآخریہ ما یحب لنفسہ

حدیث ۱۱۱۱۔ یعنی کے دو شیخ ہیں، ایک شعبہ دوسرے میں، اور دونوں قافلہ پر جا کر مل گئے۔

لَا یُؤْمِنُ أَحَدُکُمْ کَاوِیَی مَطْلَب ہے کہ اس میں مومن کی خصلت نہیں، جیسے کہا جاتا ہے کہ بیٹا باپ کو مارے تو وہ بیٹا نہیں، تو کیا وہ نسل سے خارج ہو جائے گا اور میراث نہ پائے گا؟ نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے اس فعل کی وجہ سے اسلاف کی نہیں کہ اسے بیٹا کہا جائے ایسے ہی یہاں ہے کہ تعلق کو معدوم کے مرتبہ میں قرار دے دیا ہے، ارشاد ہے کہ مومن وہ ہے جو اپنے بھائی کے لئے وہی پسند کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے، یعنی مومن کی خصلت یہ ہے۔

اس میں کئی اشکال وارد کئے جاتے ہیں، 'یحب لآخریہ' کی ایسی تفسیر جس سے سب اشکال مٹنے ہو جائیں میرے نزدیک مطروح سے ہے، ایک یہ کہ میں جس قسم کے معاملہ کا اپنے بھائی سے امید دار ہوں، اسی قسم اور اسی نوع کا معاملہ مجھ ان سے کرنا چاہیے۔

دوسرے یہ کہ اگر میں اس مقام پر ہوتا جس پر بھائی ہے تو میں اس وقت جو اپنے لئے پسند کرتا، وہی اب اس وقت اپنے بھائی کے لئے پسند کروں، فرض کر دیرا بھائی تاجر ہے اور وہ مجھ سے تجارت کا کچھ مشورہ لے تو کیا میں اس حدیث کو سامنے رکھ کر یہ کہوں کہ میں اپنے لئے بخاری پڑھا یا پسند کرتا ہوں لہذا تو بھی بخاری پڑھا جیسا کہ میں پڑھا رہا ہوں، تو حدیث کے یہی ہرگز نہیں ہیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ میں سوچ کر جواب دوں کہ اگر میں اس کی جگہ ہوتا تو اپنے لئے کیا کرتا، جو اپنے لئے چاہتا وہی اس کے لئے بھی چاہوں، یعنی کہ بعینہ وہی چاہیے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے تو کیا ایک بادشاہ یہ چاہے گا کہ سب مجھ جیسے بادشاہ ہو جائیں، ظاہر ہے کہ یہ معنی درست نہیں، ہمارے والد صاحب مرحوم (جو مجدد بانیان مدرسہ دیوبند تھے) اور شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے والد مولانا ذوالفقار علی صاحب مرحوم (بھی بانیوں میں سے تھے) دونوں مدرسہ کے مسبر تھے اور دونوں دیندار تھے اور دونوں کے لڑکے مدرسہ میں تعلیم دیتے تھے، مولانا ذوالفقار علی کے فرزند حضرت شیخ الہند اور والد صاحب کے لڑکے مولانا عزیز الرحمن صاحب تھے تو جب کبھی مجلس شوریٰ میں کوئی ایسا مسئلہ پیش ہوتا جس میں بیٹوں کا معاملہ ہوتا تو مولانا ذوالفقار علی صاحب بالکل غلطہ ہو جاتے اور والد صاحب فرماتے کہ تم تو رائے دیں گے، مگر یہ سمجھ کر کہ اس کی جگہ کوئی غیر ہوتا تو ہم کیا رائے دیتے، اپنے سینے کے لئے بھی وہی رائے دیں گے جو غیر کے لئے دیتے۔

اس وقت میری سمجھ میں آیا کہ حدیث کا مطلب یہ ہے، نہ کہ کچھ اور، ورنہ پھر ان شکالات پیش آئیں گے، کیونکہ ہر شخص چاہتا ہے کہ میں

بَابُ حُبِّ الرَّسُولِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الْإِيمَانِ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت رکھنا ایمان کا ایک جزو ہے

۱۳۔ حَدَّثَنَا أَبُو الْيَمَانِ قَالَ سَمِعْتُ أَبَا الزِّنَادِ عَنِ الْأَعْرَجِ عَنْ

ہم سے بیان کیا ابو الیمان نے، کہا ہم کو خبر دی ثیب نے، بیان کیا ابو الزناد نے، انھوں نے اعرج سے، انھوں نے ابی ہریرہ سے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم ہے اس (خدا) کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے

افضل رہوں تو کیونکہ پھر ہر ایک کے لئے چاہے گا کہ سب افضل ہو جائیں اور یہ اجتماع کیونکر ممکن ہے، داخل چاہے کہ سب داخل ہو جائیں، درویش چاہے کہ سب تسبیح لے کر بیٹھ جائیں، قویہ حالت ہوگی، مطلب وہی ہے کہ جو دوسرے کے حالات کے موافق ہو اس کے لئے اسے بہتر سمجھ، ادب یہ مطلب فطرت کے مناسب ہوگا، پہلے معنی میں اور اس میں کچھ تھوڑا سا فرق ہے، پہلے معنی کا مطلب یہ ہے کہ میں معاملہ کی جو امید دوسروں سے رکھوں، وہی معاملہ میں اس کے ساتھ کروں، مثلاً چاہوں کہ وہ میرے ساتھ حسن اخلاق سے پیش آئے تو مجھے بھی چاہئے کہ میں اس سے حسن اخلاق سے پیش آؤں، اس کی تائید میں ابن کثیر کی ایک حدیث ہے کہ ایک شخص دربار نبوی میں حاضر ہوا اور کہا کہ میں اس شرط سے ایمان لاتا ہوں کہ مجھے زمانگی اجازت دی جائے، میں نہ کہ صما کے چہرے متغیر ہو گئے اور انھوں نے اسے ڈانٹا، مگر آپ حکیم تھے آپ نے صما کو روکا اور اسے قریب بلایا اور فرمایا کہ کیا تو پسند کرتا ہے کہ لوگ تیری ماں کے ساتھ ایسا کام کریں، یا تیری بیٹی یا تیری چھوٹی وغیرہ کے ساتھ یہ فعل کریں، کہا ہرگز نہیں، آپ نے فرمایا کہ جس سے یہ کام تو کرنا چاہے گا، وہ بھی کسی کی ماں، کسی کی بیٹی، کسی کی چھوٹی وغیرہ ہوگی، سبحان اللہ! اس خوبی کو سمجھایا کہ اس کی سمجھ میں آگیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی کہ اے اللہ اس کی آنکھ اور فہم کو بجا شہوت سے محفوظ فرما، لکھا ہے کہ وہ مسلمان ہو گیا اور پھر کبھی کسی کی طرف غلط طور پر آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا، اس سے زمانگی حرامت کی ایک حکمت بھی معلوم ہوگئی کہ اگر فطرت اجازت دیتی تو اپنی ماں بہن وغیرہ کے لئے کیوں نہیں پسند کرتا، دیکھو اگر کوئی ماں بہن کی گالی دیتا ہے تو کیا حالت ہوتی ہے، عالاکم صرف زبانی الفاظ ہیں، فعل کا تحقق نہیں ہے، تو جب اس پر اس قدر ناراضگی ہے پھر زمانہ اس سے بڑھ کر ہے، اب یحب لاخیه کے معنی واضح ہو گئے کہ جس طرح دوسرے سے چاہے اسی طرح دوسرے کے ساتھ بھی کرے۔

بَابُ حُبِّ الرَّسُولِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الْإِيمَانِ

قولہ حب الرسول صلی اللہ علیہ وسلم، محبت رسول ہر چیز سے زیادہ ہونی چاہئے، اس میں کام ہے کہ کون کی محبت ملوے، بظاہر یہ اشکال ہوا ہوگا کہ اولاد کی محبت فطری ہے اور حضور کی محبت عقلی ہے تو جب طبی سے کیونکر بڑھ جائے گی؟ اس لئے

لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّىٰ أَكُونَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ وَالِدِهِ وَوَلَدِهِ .

تم میں سے کوئی مومن نہیں ہو تا جب تک اس کو میری محبت اپنے باپ اور اولاد سے زیادہ نہ ہو ۔

علامہ بیضاوی و غیرہ نے اس سے حب عقلی مراد لی ، یعنی عقلی محبت سب سے زیادہ ہونی چاہئے ، خواہ طبعی محبت دوسرے سے زیادہ ہو ، مگر اس تاویل سے کلام وزن دار نہ رہا ، خصوصاً مثال سے تو کلام بالکل ہلکا ہو گیا ، مثال یہ دی جاتی ہے کہ کڑوی دوا کا پینا طبعاً مکروہ ہے ، مگر عقلاً چونکہ اس سے تندرستی حاصل ہوتی ہے اس لئے اسے پینا ہے ، حالانکہ کوئی دوا کو محبوب نہیں رکھتا مگر مجبوراً اسے اختیار کرتا ہے ۔ تو کیا یہ مطلب ہے کہ حضورؐ سے ایسی ہی محبت ہو جیسی دوا سے ؟ نہیں ! ہرگز نہیں ! بلکہ یہاں حب ایمانی مراد ہے ، مراد یہ ہے کہ حب ایمانی جب تک غالب نہ ہو جائے اس وقت تک کامل مومن کہلانے کا مستحق نہیں ہو سکتا ، بیضاوی کی تقریر ابتداء کے لحاظ سے تو ٹھیک ہے کہ ابتداء بیشک حب عقلی سے ہوتی ہے مگر پڑھتے پڑھتے اس حد تک پہنچ جاتی ہے کہ اولاد و والدین کی محبت چھوٹ جاتی ہے ، یہی کہ صحابہ کرامؓ کی ہجرت کا واقعہ اس پر شاہد ہے کہ حب نبویؐ سب پر غالب ہو گئی اور ساری محبتیں مغلوب ہو گئیں اور سب کو چھوڑ چھاڑ کر حضورؐ کے قدموں پر بیٹھ کر رہ گئے ۔

عبداللہ ابن زید رضی اللہ عنہ کا واقعہ بھی اس محبت کا ایک نمونہ ہے ، وہ اپنے کسی کھیت یا باغ میں تھے ، وہیں انھیں وفات نبویؐ کی خبر پہنچی ، یہ خبر سن کر انھوں نے فریاد مارا ، مانگی کہ یا اللہ ! میری بنیائی سلب کر لے ، میں اپنی اس آنکھ سے اپنے حبیبؐ کے بدکسی اور کو دیکھنا نہیں چاہتا ، ان کی یہ دعا مقبول ہو گئی اور بینائی جاتی رہی ۔ کیا اس محبت کے بارے میں کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ محبت دینی ہی تھی جیسی دوا سے ، استغفر اللہ !

حضرت مولانا اسماعیل شہید رحمۃ اللہ نے اسے حب عشقی کہا ہے ، مگر میں عشقی نہیں کہتا ، کیونکہ یہ نام قرآن و حدیث سے مستفاد نہیں ہوتا ، ایسے مواقع پر قرآن و حدیث میں یہ لفظ استعمال نہیں ، میں اسے حب ایمانی سے تعبیر کرتا ہوں اور کہتا ہوں کہ حب ایمانی اتنی ہونی چاہئے کہ حب طبعی سے مراد جائے ، صحابہؓ میں یہی حب ایمانی تھی جو حب طبعی پر غالب تھی ، اس کے بہت سے شواہد ملتے ہیں

ایک انصاری عورت کا مشہور واقعہ ہے کہ غزوہ احد میں ان کے باپ ، بھائی اور شوہر شریک ہوئے تھے اور وہ ان میں سے ہر ایک کی خیریت دریافت کر رہی تھیں ، لوگوں نے بتایا کہ وہ سب شہید ہو گئے ، اس کے بعد انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت پوچھی ، جواب ملا کہ آپؐ محمد اللہ محفوظ ہیں ، کہنے لگیں مجھے دکھلا دو ، جو ہی دیدار سے شرف ہو میں بولیں ، کُلُّ مُصِيبَةٍ بَعْدُكَ جَلَلٌ (اُمی حَقِیْقٌ) حضور آپؐ کے ہوتے ہر مصیبت نہایت ہلکی ہے ۔ تو کیا باپ ، شوہر اور بھائی سے حب طبعی نہ تھی ؟

۱۳ حَدَّثَنَا يَعْقُوبُ بْنُ إِبْرَاهِيمَ قَالَ سَمِعْتُ ابْنَ عَبَّادٍ عَنِ عَبْدِ الْعَزِيزِ

ہم سے بیان کیا یعقوب بن ابراہیم نے کہا ہم سے بیان کیا ابن علی نے انھوں نے عبدالعزیز بن صہیب سے
 ابْنِ صُهَيْبٍ عَنْ أَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَحَدَّثَنَا آدَمُ بْنُ
 انھوں نے اس سے انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دوسری سند اور ہم سے بیان کیا آدم بن ابی اس نے کہا ہم سے
 أَبِي إِيسَى قَالَ ثَنَا شُعْبَةُ عَنْ قَتَادَةَ عَنْ أَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ
 بیان کیا شعبہ نے انھوں نے قتادہ سے انھوں نے انس سے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کوئی شخص اس وقت
 عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَوْمُنُ أَحَدَكُمْ حَتَّى أَكُونَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ وَالِدِهِ وَوَلَدِهِ
 تک (پورا) مومن نہیں ہوتا جب تک اس کو میری محبت اپنے باپ اور اپنی اولاد سب لوگوں سے
 وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ
 زیادہ نہ ہو۔

ضرورتی گرجے طبعی پر حب ایمانی غالب تھی۔

ابن اثیر نے کال میں عبداللہ ابن مضاف ہبی رضی اللہ عنہ کا واقعہ نقل کیا ہے کہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں یہ
 امیر لشکر بن کر رومیوں کے مقابلہ میں لڑنے کے لئے گئے، اتفاقاً مغلوب ہو کر قید ہو گئے، بادشاہ نے ان سے کہا: ہم تمہارے مرتبہ سے واقف
 ہیں، تم اگر ہماری بات مان لو اور اپنا دین چھوڑ کر عیسائی مذہب قبول کر لو تو نہ صرف یہ کہ ہم تمہیں چھوڑ دیں گے بلکہ تم کو اچھا عہدہ دیں گے اور
 شاہی خاندان میں شادی بھی کر دیں گے، وغیرہ، حضرت عبداللہ ابن مضاف نے تحارت کے ساتھ یہ پیشکش ٹھکرا دی تو انھیں مع سائبیوں
 کے قید کر دیا گیا اور کھانا پانی بند کر دیا گیا حتیٰ کہ جان پر بن آئی اور غصہ کی حالت کو پہنچ گئے تو خنزیر کا گوشت اور شراب پیش کی گئی، فرمایا
 ہر چند کہ اس وقت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت یہ تھی اور ایسی حالت میں شریعت جان بچانے کے لئے اس کی اجازت دیتی ہے، مگر میری غیرت ایمانی اسے
 قبول نہیں کرتی، میں اسے نہ کھاؤں گا، صاف انکار کر دیا اور سبھوں نے انکار کر دیا، پھر اس نے یہ تمیز اختیار کی کہ ایک جڑے کڑھواؤں میں تیل
 گرم کر لیا اور ان کے سامنے ایک مسلمان مجاہد کو اس میں ڈلوا دیا، فردا دیر میں وہ جل کر کباب ہو گئے (اللہ کی ہزار رحمتیں ان پر) پھر ان کی
 طرف مخاطب ہو کر بولا: تمہارے ساتھ بھی یہی معاملہ کرنے والا ہوں، مگر ایک بار اور موقع دیتا ہوں اور پھر کہتا ہوں کہ میری بات
 مان لو، اس کے بعد بھی انھوں نے انکار ہی میں جواب دیا، تب اس نے جل کر حکم دیا کہ ان کو بھی اس کڑھواؤں میں ڈال دو، جب لوگ
 ان کو لے کر چلے تو ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، بادشاہ کو اطلاع دی گئی کہ وہ رو رہے ہیں، حکم ہوا کہ ٹوٹا لاؤ، لاسے گئے تو بولا: شاید اب

عقل لگتی، موت نے ہوش ٹھیک کر دئے، مخالفین کو ہنسنے اور فرمایا: میرے آنسوؤں سے تجھے دھو لگا۔ ۱۰۰ خدا کی قسم میں موت کے ڈر سے نہیں دو رہا ہوں بلکہ اس وقت دل میں یہ حسرت اور تپا پیدا ہوئی کہ انسو میرے پاس صرف ایک جان ہے جو اس وقت پیش کر رہا ہوں، کاش! میرے پاس ہزار جانیں ہوتیں تو ان میں بھی اسی طرح اللہ کی راہ میں قربان کر دیتا، بس یہ تمنا آنسوؤں کی ٹپک پڑی اور تجھ کو خیال ہوا کہ میں موت سے ڈر گیا، بادشاہ اس جذبہ حق سے مرعوب ہو گیا اور کہنے لگا کہ میں تجھے چھوڑ دوں گا بشرطیکہ تم میری پیشانی کو ایک بوسہ دے دو، سوچ کر بولے: تنہا مجھے چھوڑ دیگا یا میرے سب ساتھیوں کو؟ جواب دیا سب کو، فرمایا: منظور ہے، بادشاہ نے دربار سجایا اور انھوں نے اس کی پیشانی کو بوسہ دیا اور سب کو چھڑا لائے۔ کیا فہم تھی صحابی کی؟ سبحان اللہ! جہاں صرف اپنی جان کی حفاظت کا سوال تھا تو انکار کر دیا اور یہاں چونکہ تمام حماقت کی جان بچ رہی تھی، اس لئے گوارہ کر لیا، جب یہ دین پہنچے اور امیر المومنین کو واثق کی اطلاع ملی تو دربار کیا اور فرمایا کہ اس جاناں کا حق ہے کہ حج ہر شخص اس کی پیشانی کو بوسہ دے چنانچہ سب مسلمانوں نے بوسہ دیا اور خود انھوں نے بھی بوسہ دیا۔

ان شواہد نے بتایا کہ اس حدیث میں وہ مرتبہ مراد نہیں ہے جو بیضاوی نے بیان کیا ہے، بلکہ آخری مرتبہ مراد ہے، جہاں حب الیہائی طبعی پر غالب آجاتی ہے، اور یہی مطلوب ہے، شاہد اس پڑی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضور سے عرض کیا: یا رسول اللہ لَأَنْتَ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ (یا رسول اللہ میں ہر چیز سے زیادہ آپ کو محبوب رکھتا ہوں گراہنے نفس سے زیادہ نہیں) کیا یہ حب عقلی کے متعلق تھا؟ وہ تو ایمان کے لئے لازم ہے، وہ نہ ہو تو ایمان کہاں؟ پھر کیا مراد تھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی؟ وہ کس محبت کی نفی کر رہے ہیں؟ بالکل ظاہر ہے کہ محبت الہی کی نفی کر رہے ہیں، پہلے یہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لَا وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ أَحَبُّ أَكُونَ الْبَيْتُ مِنْ نَفْسِي فَقَالَ لَهُ عُمَرُ فَإِنَّهُ الْآنَ وَاللَّهِ لَأَنْتَ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْ نَفْسِي، فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْآنَ يَا عُمَرُ (نہیں، قسم اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، جب تک میں تمہارے نفس سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں، حضرت عمرؓ نے عرض کیا: بے شک! اب خدا کی قسم آپ میرے نفس سے زیادہ محبوب ہیں، حضورؐ نے ارشاد فرمایا: ہاں! اسے عرب صحیح بات ہوئی، کھلی بات ہے کہ یہاں مطالبہ اسی محبت کا ہے جو حب طبعی پر غالب جائے اور اسی کو میں نے حب الیہائی کہا ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ عرض کرتے ہیں کہ اب مجھ میں وہ محبت آگئی۔

علمائے کبار نے لکھا ہے کہ عمر فاروقؓ میں وہ محبت تھی تو پہلے سے مگر اس طرف توجہ نہ تھی، ذہول تھا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

(۱۱) بخاری شریف (۹۸۱ھ) حضرت عمرؓ کے جواب میں یہ ہی فرمایا گیا تھا، جامع تقریر نے سہواً دوسرے الفاظ لکھ دئے تھے (مرتب)

باب حلاوة الایمان

ایمان کا مزہ

۱۵۔ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ الْمُثَنَّى قَالَ سَمِعْتُ عَبْدَ الْوَهَّابِ الثَّقَفِيَّ قَالَ

ہم سے بیان کیا محمد بن ثنی نے، کہا ہم سے بیان کیا عبد الوہاب ثقفی نے، کہا ہم سے بیان کیا
ثَنَا أَيُّوبُ عَنْ أَبِي قِلَابَةَ عَنْ أَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ ثَلَاثٌ
أَيُّوبُ نے، انھوں نے ابو قلابہ سے، انھوں نے انس سے، انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے، فرمایا، جس میں
مَنْ كُنَّ فِيهِ وَجَدَ حَلَاوَةَ الْإِيمَانِ أَنْ يَكُونَ اللَّهُ وَرَسُولَهُ أَحَبَّ إِلَيْهِ
مِنْ بَاقِي شَيْءٍ هُوَ الْإِيمَانُ الْكَامِلُ، ایک یہ کہ اللہ اور اس کے رسول کی محبت اس کو سب سے زیادہ ہو،
مِمَّا سَوَاهُمَا، وَأَنْ يُحِبَّ الرَّعْيَ لِأَيُّوبَةَ الْإِيمَانِ، وَأَنْ يُكْرَهُ أَنْ يَعُودَ فِي الْكُفْرِ
دوسرے یہ کہ فقط اللہ کے لئے کسی سے دوستی رکھے، تیسرے یہ کہ دوبارہ کافر بننا اس کو اتنا ناگوار ہو
كَمَّا يَكْرَهُ أَنْ يُقْدَفَ فِي النَّارِ۔
جیسے آگ میں جھونکا جانا۔

انھیں متوجہ فرمایا اور سنایا کہ اتنی محبت کافی نہیں، تب انھوں نے توجہ کی اور اپنے نفس کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ آپ کی وہ محبت جو ساری محبتوں پر غالب
ہو، اصلاً میرے اندر موجود ہے، مگر میں نے خیال نہیں کیا تھا اور اب وہ مستحضر ہو گئی، یہ جو فرمایا کہ اب وہ محبت آگئی، اس کا مطلب یہی ہے کہ استحضار ہو گیا
فرمایا: ہاں ہاں اب اسے علم! اب ایمان بھی کامل ہو گیا۔ تو میرے آخری ہے، نہ ابتدائی، ابتدائی وہ ہے جو بیضادی نے کہا، خود قرآن میں ہے
قُلْ إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَمْثَلُكُمْ وَأَحِبُّكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا
وَمَسَاكِينُ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرْتَوُونَ أَمَّا بِأَنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ
الْغَافِلِينَ (۱) (کہہ دیجئے اگر تمھارے باپ اور بیٹے اور بھائی اور بیویاں اور کنبے اور وہ مال جو تم نے کمایا ہے اور وہ سود آگری جس کے بندھونے
سے تم ڈرتے ہو اور وہ حواریاں جن کو تم بندہ کرتے ہو تم کو زیادہ پیاری ہیں اللہ اور اس کے رسول سے اور لڑنے سے اس کی راہ میں تو انتظار کرو،
یہاں تک کہ اللہ کا حکم آجائے، اور اللہ نافرمانوں کو راہ نہیں دکھاتا)۔ حدیث مذکور اسی آیت قرآنی کا اقتباس ہے۔

انصار سے محبت رکھنا ایمان کی نشانی ہے

١٤ - حَدَّثَنَا أَبُو الْوَلِيدِ قَالَ ثَنَا شُعْبَةُ قَالَ أَخْبَرَنِي عَبْدُ اللَّهِ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ

ہم سے بیان کیا اور الولید نے کہا ہم سے بیان کیا شب نے کہا مجھ کو خبر دی عداۃ ابن جبر نے کہا میں نے اس
 بن جابر قال سمعت انس بن مالک عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال آية الإيمان
 ان ناک سے سنا انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا : ایمان کی نشانی انعام سے محبت رکھنا ہے اور نفاق کی

حُبُّ الْأَنْصَارِ، وَآيَةُ الْفَيْاقِ بَعْضُ الْأَنْصَارِ

نشان انصار سے بر رکھنا ہے۔

بَابُ حَلَاوَةِ الْإِيمَانِ

۱۵۔ **تَوَلَّ حَلَاوَةَ الْإِيمَانِ** ، درحقیقت یہ مستقل چیز نہیں بلکہ حب رسول کا ثمرہ ہے ، اس کو ظاہر کرتے ہیں کہ عبادت ایمان اس وقت ملتی ہے جب حب رسول ہو ، عبادتِ لغت میں شیرہ بنی اور مٹھاس کو کہتے ہیں ، تو ایمان کی مٹھاس اور لذت اس وقت نصیب ہوتی ہے جب یہ تین چیزیں ہوں ، وہ مٹھاس اور شیرہ بنی ہے کیا ؟ ابن ابی جرہ جو عارف کامل اور کبار اولیاءِ اقدس میں سے ہیں فرماتے ہیں (جیسا کہ فتح الباری میں نقل کیا ہے) کہ عبادتِ منویہ بھی مراد ہو سکتی ہے اور حسد بھی ، دونوں ہی احتمال ہیں ، منویہ یہ ہے کہ انشراح صدر ہو ، کشادہ دل ہو جیسے شیشی چیز کھاکر دل خوش ہوتا ہے اسی طرح اس سے خوشی حاصل ہو ، اسی کو امام نوویؒ نے استلذاذ بالطاغات سے تعبیر کیا ہے ، یعنی طاعتِ مزے دار ہو جانے اور مزہ حب آئے گا یہ تین چیزیں ہوں ، یہ تو ہوئی عبادتِ منویہ ، مگر عارف ابن ابی جرہ کہتے ہیں کہ عبادتِ محی رابع ہے اور اسے وہی سمجھے گا جس نے کچھا ہوگا ، ہر شخص نہیں سمجھ سکتا ، چنانچہ امام غزالی وغیرہ نے اس موقع پر پشیم کو دیا ہے ۔

اذا لم تر الهلال فسلم : لاناس رأوه بالابصار

جب تمہیں جائز نظر آئے تو ان کی بات ان لوگوں نے اسے آنکھوں سے دیکھا ہے

تو چمکے والے جب کہتے ہیں تو ماننا چاہئے، 'اسی کو کہا ہے :

طر ذوق ایسا باہ نہ دانی بخدا تانہ حسی

قوله ان يكون الله ورسوله اخر: یہ پہلی چیز ہے اور میرے نزدیک ہی اسل اصول ہے ' اسی پر دوسری چیز متفرع ہے جب اللہ و رسول کی سچی محبت ہوگی تو اس کا نتیجہ ہوگا کہ دوسرے سے بھی محبت اللہ اور رسول کے واسطے ہوگی ' اور اگر غرض اللہ کے لئے ہوگی تو مظلوم

قوله وان يكره ان يعود الى الكفر انما يعني بس طرح آگ میں ڈالا جائے برداشت سے باہر ہے، اسی طرح عود الی الکفر (دوبارہ کفر اختیار کرنے) سے بھی بزرگ رہے، بعض روایات میں ہے کہ اس سے بھی زیادہ کمرہ سمجھا، چنانچہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا واقعہ مشہور ہے کہ وہ سختی کی حالت میں بھی اصرار ہی کہتے تھے، یہی اسی محبت کا نتیجہ اور اللہ و رسول کی محبت کے غلبہ کا اثر ہے۔

لفظ عود شہسہ پیداکرتا ہے کہ جو شخص غیر مسلم ہو پھر مسلمان ہو جائے تو عود الیٰ عکفر یعنی کفر کی طرف لوٹنا اسے ناپسند ہو۔ یہ لازم اور ضروری نہیں، چونکہ نبی علیہ السلام کے زمانہ میں کثرت سے یہی صورت تھی اس لئے لفظ عود لایا گیا، اور اگر عوم رکھا جائے تو عود کے معنی میراثہ کے ہوں گے۔

حدیث طے کرنا۔ آیت الایمان حُب الانصار و آیت النفاق بغض الانصار، یہاں انصار کا معنی صحت کے ساتھ ذکر کر کے مہاجرین کو توجہ دلائی ہے کہ ان کے حقوق کا پورا پورا لحاظ رکھنا کیونکہ ان کا تیرا اند کے ہاں بہت بند ہے، قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ان کی تعریف فرمائی: **وَالَّذِينَ تَبَوَّءُوا الدَّيْنَ وَالْإِيمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّونَ مَنْ هَاجَرَ إِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُونَ فِي صُحُفِهِمْ حَاجَةً مِمَّا أُوتُوا وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ** ط ۳۱ (اور وہ لوگ جو در اسلام میں اور ایمان میں ان کے قبل سے قرار کھڑے ہوئے ہیں جو ان کے پاس ہجرت کر کے آئے ہیں اس سے محبت کرتے ہیں اور مہاجرین کو جو کچھ ملتا ہے اس سے اپنے دلوں میں کوئی رشک نہیں پاتے اور اپنے سے مقدم رکھتے ہیں اگرچہ ان پر فائدہ ہو) اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کا ذکر خاص طور سے کیا، اور انصار کو بھی رسول علیہ السلام سے ہمیشہ گہرا تعلق رہا، چنانچہ فتنہ کے زمانہ میں جب کہ مہاجرین کے دو حصے ہو گئے تھے، ایک حضرت علیؑ کے ساتھ تھا، دوسرا خلافت، مگر انصار اہل کے کل حضرت علیؑ کے ساتھ تھے، یہ اسی تعلق کا ثمرہ تھا۔

’ایہ کے معنی علامت و نشانی کے ہیں، عنوان انصار کا رکھا، خاص کسی کا نام نہیں لیا، اس طرح بتا دیا کہ انصار میں حیث الانصار سے محبت رکھنا ایمان کی نشانی ہے اور واقعہ یہی ہے کہ میں حیث الانصار کوئی بھی ہرگز ہرگز انصار سے بغض نہیں رکھ سکتا، ربی بعد میں آپس کی ناچاقی تو وہ بغض کی راہ سے نہ تھی بلکہ آپس میں معاشرت میں ہو جاتی تھی، جیسے دو بھائیوں سے رہن سہن میں ہو جاتی ہے، تو لڑائی جھگڑا اور جیز ہے

== باب ==

۱۰۔ حَدَّثَنَا أَبُو الْيَمَانِ قَالَ حَدَّثَنَا شُعَيْبٌ عَنِ الزُّهْرِيِّ تَالِ

ہم سے بیان کیا ابو الیمان نے کہا ہم سے بیان کیا شعیب نے انھوں نے زہری سے کہا ہم کو خبر دی
 اَنَا أَبُو أَدْرِيسٍ عَائِدُ اللَّهِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ أَنَّ عُبَادَةَ ابْنَ الصَّامِتِ وَكَانَ شَهِيدَ بَدَلٍ
 ابو ادريس عائدہ ابن عبد اللہ نے ان سے (بیان کیا) عبادۃ ابن صامت نے اور یہ عبادہ وہ تھے جو بدر میں شریک تھے
 وَهُوَ أَحَدُ النَّقَبَاءِ لَيْلَةَ الْعَقَبَةِ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ وَحَوْلَهُ
 اور عقبہ کی رات میں وہ بھی ایک نقیب تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے (صحابہ سے) فرمایا ان کی ایک جماعت آپ کے
 عَصَابَةٍ مِنْ أَصْحَابِهِ بَايَعُونِي عَلَى أَنْ لَا تُشْرِكُوا بِاللَّهِ شَيْئًا وَلَا تَسْرِقُوا وَلَا تَزْنُوا وَ
 گرداگرد تھی : تم مجھ سے اس بات پر بہت کرو کہ اللہ کا کسی کو شریک نہ بناؤ گے اور چوری نہ کرو گے اور زنا نہ کرو گے اور

لَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ

اپنی اولاد کو نہ مارو گے۔

اور بغض و عناد اور چیز، دو بھائی آپس میں لڑتے ہیں مگر جب کبھی کسی ایک بھائی پر مصیبت آتی ہے تو ب سے پہلے وہی بھائی سڑپ جاتا ہے
 اور امداد کرتا ہے، اسی طرح ان صحابہؓ کا معاملہ تھا، وہ کبھی کبھی آپس میں لڑ بھی جاتے تھے مگر جب وقت پڑتا تو محبت اپنا کام کر جاتی اور بڑھ بڑھ کر
 ایک دوسرے کا ساتھ دیتے، تو لڑنا اور چیز ہے اور محبت شے دیگر، لڑنے سے محبت نہیں جاتی۔

== باب ==

حدیث ۱۱۔ حَدَّثَنَا أَبُو الْيَمَانِ 'عبادہ اس کے راوی ہیں اور ابو ادريس عبادہ کی نسبت میں کہتے ہیں کہ وہ اصحاب بدر سے
 ہیں، نیز یہ نقباء مدینہ سے ہیں، بیت عقبہ میں شریک تھے (یہ دوسری مرتبہ آئے تھے)۔

نقیب کے معنی چودھری کے ہیں، جمع نقباء ہے، آپ نے بارہ نقیب (انسر) مقرر فرمائے تھے، بارہ کا عدد قرآن سے
 اخذ ہے: وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيبًا

لَيْلَةَ الْعَقَبَةِ اس رات کو کہتے ہیں جس رات میں آپ نے ان سے بیت ل تھی۔ عقبہ ایک گھائی کا نام ہے، وہاں
 مسجد بنی ہوئی ہے جو مٹی جاتے ہوئے بائیں طرف پڑتی ہے، یہ مسجد عید گاہ کی طرح تھی۔

عصابتہ کے معنی میں 'تسطانی وغیرہ نے لکھا ہے کہ دس سے چالیس تک کے عدد پر بولا جاتا ہے، 'راوی کا مقصد یہ ہے کہ اس وقت مجلس مبارک میں دس سے زیادہ اور چالیس سے کم صحابہ تھے، تعداد معین معلوم نہیں۔

توہ بایعونی، یہ معلوم ہو چکا کہ یہ سب صحابہ تھے اور مسلمان تھے، بعض ان میں سے بدر میں شریک ہو چکے تھے، پھر ان سے بایعونی (مجھے بیت کرو) فرمایا یا تجدید ایمان کے لئے ہے یا یہ بیت تو بہ ہے، یعنی ان امور سے تو بہ کرو، یہیں سے صوفیہ کے اہل بیت تو بہ کا رواج ہوا۔

توہ لا تبتوکوا باللہ شیئاً، حدیث مذکور میں منافی کا بیان ہے، شرک نہ کرنا، یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات اور افعال میں کسی کو خدا کے برابر نہ سمجھنا، اسی کو دوسری جگہ ایک صحابی کے سوال پر اُجی الذنوب اکبر عند اللہ (اللہ کے نزدیک کون سا گناہ سب سے بڑا ہے) کے جواب میں فرمایا: ان تدعو اللہ ندأ و هو خلاق، یعنی سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ جس خدا نے تجھ کو پیدا کیا اس کے برابر کسی اور کو بنائے، اہل نار اپنے مبودوں سے جہنم میں کہیں گے، تالله ان کنا لفی ضلالٍ مبین یہ اذ فتوٰکم پرست الغالین^(۱)، (خدا کی قسم ہم کھلی گمراہی میں تھے کہ تم کو رب العالمین کے برابر قرار دیتے تھے) یہی ہے وہ شرک جس کی یہاں ممانعت کی جا رہی ہے کہ کسی بات میں بھی کسی کو رب العالمین کے برابر نہ سمجھنا۔

توہ ولا تقربوا، چھری نہ کرنا، یہ بھی ایک گناہ کبیرہ ہے، قرآن پاک میں مکہ و مکہ چور کے ہاتھ کاٹ دو خواہ مرد ہو یا عورت۔
توہ ولا تنزفوا، یہ بھری بات ممانعت کی بیان فرمائی، زنا نہ کرنا، یہ بھی ایک گناہ کبیرہ ہے، قرآن پاک میں اس کی سزا سو کوڑے قرار دی گئی جب کہ یہ غیر شادی شدہ ہوں، اور شادی شدہ کے لئے حدیث پاک میں بچہ کی سزا تجویز فرمائی گئی، نبی علیہ السلام اس کی پٹل فرمایا۔

توہ ولا تقتلوا اولادکم، چوٹھی بات بیان فرمائی کہ اپنی اولاد کو قتل نہ کرنا، یہ بھی گناہ کبیرہ ہے، عرب میں بعض لوگ عار کی وجہ سے مرثیہ لڑکی کو قتل کرتے تھے، قرآن پاک میں فرمایا: وَاِذَا بَشِيرًا اَحَدٌ هُمْ بِالْاُنثٰى ظَلَّ وَجْهُهُ مَسْوُودًا وَّ هُوَ كَظِيمٌ۔ یَتَوَارَى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوءِ مَا بُشِّرَبِهِ اَیْمُکَ عَلٰی هٰؤُلَاءِ اَمۡ یَدُسُّهُ فِی التُّرَابِ (۲) (جب ان میں سے کسی کو لڑکی پیدا ہونے کی خبر دی جاتی ہے تو اس کا منہ بگڑ جاتا ہے اور وہ گھٹنے ٹکتا ہے، قوم سے اسی خبر بد کی وجہ سے چھپا چھپا پھرتا ہے

وَلَا تَأْتُوا بِنِهَايَ تَفَرُّونَهُ بَيْنَ أَيْدِيكُمْ وَأَرْجُلِكُمْ وَلَا تَعْرُوفِي مَعْرُوفٍ فَمَنْ
 اور اپنے ہاتھ اور پاؤں کے سامنے (جان بوجھ کر) کوئی نہایت بنا کر نہیں اٹھاؤ گے۔ اور نیک کاموں میں آزمائی نہ کرو گے۔ پھر جو کوئی
 وَفِي مِنْكُمْ فَأَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ وَمَنْ أَصَابَ مِنْ ذَلِكَ شَيْئًا فَعُوقِبَ فِي الدُّنْيَا فَهُوَ كَفَّارٌ
 تم میں سے یہ اقربہ پورا کرے اس کا ثواب اللہ پر ہے، اور جو کوئی ان (گناہوں) میں سے کچھ کر بیٹھے اس کو دنیا میں اس کی سزا مل جائے گی
 لَهُ وَمَنْ أَصَابَ مِنْ ذَلِكَ شَيْئًا ثُمَّ سَتَرَهُ اللَّهُ فَهُوَ إِلَى اللَّهِ إِنْ شَاءَ عَفَا عَنْهُ
 (مدد پڑھائے) تو اس کا گناہ اتر جائے گا، اور جو کوئی ان (گناہوں) میں سے کچھ کر بیٹھے پھر اللہ (دنیا میں) اس کو چھپائے رکھے تو
 وَإِنْ شَاءَ عَاقَبَهُ، فَبَايَعْنَاهُ عَلَى ذَلِكَ،

وہ اللہ کے عواطف سے انکار پڑے (آخرت میں بھی) اس کو معاف کر دے اور اگر چاہے عذاب کرے، پھر ہم نے ان باتوں پر پکے بیت کر لی۔

اور سوچئے کہ ذات پر دائرہ کر کے اسے زندہ رہنے دے یا اسے مٹی کے نیچے دفن کر دے)

اللہ تعالیٰ نے اس نسل کی مذمت کی اور نبی علیہ السلام نے توبہ کرائی۔ اور بعض لوگ اپنی اولاد کو لڑکی یا بڑا بچہ قتل کر دیتے
 تھے، یا تمام اولاد ان کے دوسرے ہوتا تھا کہ انہیں کہاں سے کھلائیں گے۔ قرآن میں اس موقع پر ایک جگہ مِنْ اِمْلَاقٍ اور دوسری جگہ
 خَشْيَةِ اِمْلَاقٍ فرمایا، اسی طرح ایک جگہ فرمایا: عَنْ نَزْرِ تَكْمُرُ وَاَيَاھُمْ۔ پوری آیت یوں ہے: لَا تَقْتُلُوا اَوْلَادَكُمْ مِنْ
 اِمْلَاقٍ عَنْ نَزْرِ تَكْمُرُ وَاَيَاھُمْ۔ (اپنی اولاد کو غلطی سے مار نہ ڈالو، ہم رزق دیتے ہیں تم کو اور ان کو) دوسری جگہ فرمایا:
 لَا تَقْتُلُوا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ عَنْ نَزْرِ تَكْمُرُ وَاَيَاھُمْ۔ (اور نہ مار ڈالو اپنی اولاد کو غلطی کے خوف سے، ہم رزق
 دیتے ہیں ان کو اور تم کو) دونوں آیوں کا مطلب بظاہر ایک ہے مگر دونوں میں لطیف فرق ہے، علامہ ابن کثیر نے بیان کیا ہے اور درج
 یہ تفسیر کی جان ہے، کہتے ہیں: ایک جگہ عَنْ نَزْرِ تَكْمُرُ کو میں (املاق) پر مشتمل کر گیا اور دوسری جگہ خَشْيَةِ اِمْلَاقٍ پر، اور یہ فرق
 اس لئے ہے کہ اولاد کو قتل کرنے والے دو قسم کے تھے: ایک وہ جو فی الحال غلط تھے، یہ کہتے تھے: ہمارے ہی کھانے کو نہیں ہے تو اولاد کو
 کہاں سے کھلائیں گے، دوسرے وہ تھے جو فی الحال تو غلط نہ تھے، ان کے پاس ان کے کھانے بھر کو تھا مگر آئندہ کا خوف تھا کہ ابھی تو ہے
 اولاد جو جائے گی تو پھر ہم غلط ہو جائیں گے، ان کے واسطے کہاں سے لائیں گے، اللہ کا کلام عجیب و غریب ہے، اس کا کوئی شوشہ
 بھی دقائق سے خالی نہیں، یہاں دونوں گروہوں کو الگ الگ سمجھایا، جو فی الحال غلط تھے، انہیں اپنی فکر قطعی تو ایک مقام پر انہیں مقدم

رکھا، فرمایا: 'مَنْ تَزَوَّجَهُ' ہم تم کو دیں گے گھبرائے کیوں ہو، اور ان کو بھی دیں گے جو پیدا ہوں گے 'وَأَيُّاهُمْ' لہذا بے فکر رہو، انہیں قتل نہ کرو، رازقی ہم ہیں، تم نہیں ہو، اور جن کو آئندہ کا ذکر تھا کوئی الحال تو ہے آئندہ کیا ہو گا؟ تو دوسرے مقام پر انہیں آنے والوں کی طرف سے پہلے مطمئن کیا کہ ان کو ہم دیں گے، ہم رازقی ہیں تم بے فکر ہو، فرمایا: 'مَنْ تَزَوَّجَهُ' ان کو ہم دیں گے تم کیوں گھبراتے ہو، پھر بعد میں وایاکہم فرما کر آگاہ کیا کہ اب تک تمہیں بولا ہوا ہے وہ بھی تو ہمارا ہی دیا ہوا ہے، جس نے تم کوئی الحال دے رکھا ہے وہی آئندہ بھی دے گا۔ سبحان اللہ! کیسا عجیب کام ہے۔

تو رہ بین ایدیکم وارحکمہ کیا ہے خدا و جبارا طوفان اٹھانے سے، جیسے ہمارے یہاں دن و رات اور کھینچتے کہتے ہیں۔

تو زانی معروف، یعنی معقول بات ہیں، یہ قید اس لئے لگائی کہ قرآن نے بھی یہ قید لگائی ہے (یہ حدیث تزان پاک کی آیت کا اقتباس ہے، سورہ محمد میں فرمایا: 'يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا جَاءَكَ مِنَ الْمُؤْمِنَاتِ يُبَايِعْنَكَ عَلَى أَنْ لَا يُغَوِّكَ بَدَنُهُنَّ وَلَا أَمْوَالُهُنَّ وَلَا أَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَفْتَرِيَنَّ بَيْنَكَ بَيْنَ أَيْدِيَهُنَّ وَأَسْرِهِنَّ وَلَا يُعْصِيَنَّكَ فِي مَعْرُوفٍ مَعْرُوفٍ' وَأَسْعَفُوهَا لَهِنَّ اللَّهُ ۖ إِنَّ اللَّهَ عَفُورٌ رَحِيمٌ ۝۱۱)

بیٹھا دی نے لکھا ہے کہ طاعت معروف ہی میں ہوتی ہے، غیر معروف (منکر) میں کسی کی طاعت نہیں، یہ بات مسلم ہے کہ نبی معروف ہی کا حکم دیتے ہیں مگر یہاں متبرک و پاک طاعت کسی کی بھی ہو صرف معروف ہی میں ہے، منکر میں نہیں، (یہ ہیں سے یہ کہیے بت، لَطَاعَةُ الْمَخْلُوقِ فِي مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ)

قوله فَاجْرِكَا عَلَى اللَّهِ، یعنی اس کا اجر ثابت ہو گیا، اللہ کے وعدہ کے موافق۔

قوله وَمَنْ أَصَابَ أَخْبَرُ مَسْئِلَ کے دو حال ہیں، یا تو دنیا میں سزا مل گئی، تو یہ عقوبت کفارہ گناہ بن گئی اور محدود وغیرہ کفارہ ہوں گے، بظاہر ایسا ہی معلوم ہوتا ہے، یا دنیا میں اللہ نے پردہ پوشی فرمائی اور سزا دہلی تو وہ تحت المشیئہ ہے، چاہے سزا دے، چاہے معاف فرما دے، اس سے معلوم ہوا کہ کبار مفسرین الی اللہ ہیں کہ اقامت المعتزلة والخوارج، اگر کبار مسلمان ہوئے تو پھر قرآن کے خلاف ہو گا کیونکہ اس نے غیر مشرک کو تحت المشیئہ رکھا ہے: 'إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ ۝۱۱۰'

(اللہ شُرک کو نہ بخشے گا اور شرک کے سوا نیچے کے گناہ بخشا ہے جہاں کو چاہے)

یہاں ترمذی کچھ نہیں رکھا صرف حدیث بیان کر دی، مقصود کچھ نہیں بتلایا، 'بعض شرائط بخاری نے یہ کہا کہ ایسے وقت میں یہ باب باب سابقہ کا تکرار اور اس کی ایک فصل ہوگا، منگول اس طرح ہوگا کہ پہلے امور ایمان میں سے چند امور ملے اور یہ بھی امور ایمان میں سے ہے اس لئے منگول اس کو بھی بیان کر دیا، استاد (حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ) فرماتے تھے کہ بخاری کبھی کبھی قصداً ترجمہ ترک کر دیتے ہیں اور مقصود تشفیۃً ازبان ہوتا ہے کہ اللہ نے تمہیں توفیق اور فہم دیا ہو تو تم بھی غور کر کے کوئی مسئلہ نکال لو، اپنی سمجھ میں یہ آتا ہے کہ بخاری یہاں معتزلہ اور خوارج کا رد کر رہے ہیں کہ امور ایمان میں سے جو اجزاء بیان کئے گئے ہیں یہ ایسے نہیں ہیں کہ بعض کے انکار سے ایمان کا انتفاء ہو جائے یہاں اِنْ شَاءَ عَفَا عَنْہُ فرمانے کا نشانہ ہی ہے کہ ایمان باقی ہے اور یہ جرم ہے، خدا چاہے تو جرم کی سزا دے اور اگر چاہے تو بغیر سزا دے ہی بخش دے، اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب جرم کا ایمان تسلیم ہو ورنہ غرضوں کی بخشائیں کسی؟ تو دراصل یہ روئے معتزلہ اور خوارج کا۔

یہاں ایک مسئلہ ہے، فقہ الباری میں اس کے متعلق تقریباً پانچ صفحے لکھے ہیں، مسئلہ یہ ہے کہ حدود و زواجر ہیں یا سوا تر کفار شت سوا تر کا مطلب یہ ہے کہ یہ حدود و ملوک دینی ہیں اور کفارہ بن جاتی ہیں، زواجر کا مطلب یہ ہے کہ حدود و محض آئندہ کے روکنے کے لئے ہیں، دوسرے لفظوں میں یوں کہو کہ حدود پاکہ کر دیتے ہیں یا صرف روکنے کے لئے ہیں؟ احکام کہتے ہیں کہ زواجر ہیں اور جہور سوا تر کہتے ہیں جہور میں سے شوائع اس حدیث کو مسئلہ بناتے ہیں کہ سزا کفارہ ہے، تو یہ حدیث ضعیفہ کے خلاف ہوئی، یہ بات یاد رہے کہ اسماء بنت ابی بکر (امام اعظم رحمہ اللہ) سے کوئی روایت نہیں ملتی، فقہاء فروعی کرتے ہیں کہ احکام کا یہ مسلک ہے، مگر یہ کہیں نہیں دیکھا کہ ابو حنیفہ اور مالکین کا یہ مسلک ہے، حاصل یہ کہ کیا حدیث تو یہ باب کی ہے جو مسئلہ شوائع ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حدود و کفارہ بن جاتے ہیں دوسری حدیث ابو ہریرہ کے ہے جو مسئلہ میں ہے، مانتظنہ بھی اس کو صحیح کلی شرط ابی حنیفہ کہا ہے، اس کا مضمون ہے: لَا أَدْرِي الْحَدُّ كُفَّارَةً وَلَا هَلْهَا أَمَلًا (۱) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو حدود کے کلمات بننے کا علم نہ تھا، احکام کہتے ہیں کہ جب خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں تو ہم کیسے کہیں کہ کلمات بنتے ہیں، شوائع کو جواب میں تھا تو کہا کہ یہ حدیث عبادہ کی اصل ہے، پہلے علم نہ تھا اس لئے

(۱) شمس الدین کے معنی تیز کرنے کے ہیں، یعنی ذہن کو تیز کر کے اور اس پر زور دے کر مطلب نکالو، (مرتب)

(۲) فقہ الباری میں بھی الفاظ ہیں، فضل الباری میں اسی طرح جامع تقریر نے بھی اس سے مختلف الفاظ نقل کئے ہیں (مرتب)

لَا اَدْرِي فَرِيَا اور جب علم ہو گیا تو فرمایا وہ کفار تہیں، تو لادھی والی حدیث پہلے کی ہے اور یہ بعد کی، وجہ ان بھی اسی کو قبول کرتا ہے کہ علم کو عدم علم سے سوخا رکھا جائے لا بالکس، احناف نے اس پر یہ اعراض وارد کیا کہ ہر حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لیلۃ العقبہ کی بیت کا واقعہ ہے جو انصار سے لی گئی تھی اور یہ کہ کافہ ہے اور ابو ہریرہ کی روایت یقیناً اس کے بعد کی ہونی چاہئے، کیونکہ حضرت ابو ہریرہؓ میں ایمان لائے ہیں، تو طبی اور عقلی ترتیب اگرچہ وہی ہے جو تم نے بیان کی ہے مگر تاریخ بتاتی ہے کہ واقعہ یوں نہیں ہے، شوان نے جواب میں کہا کہ اکی تصریح کہاں ہے کہ یہ بیت لیلۃ العقبہ کی ہے؟ وہ تو صرف حضرت عبادہ بن الصامت جو حدیث کے راوی ہیں ان کی تنویہ شان کو بتانا تھا کہ یہ وہ راوی ہیں جو لیلۃ العقبہ میں شریک تھے، تو ممکن ہے جس کا ذکر ہے وہ بعد کی ہو، اور یہ ثابت ہے کہ ایک بیت فسخ کر کے بعد ہوئی ہے اور آپس بھی حضرت عبادہؓ شریک تھے، اس کا مضمون بھی یہی ہے، تو معلوم ہوا کہ ایک بیت لیلۃ العقبہ کی ہے، دوسری فسخ کر کے بعد کی، مگر یہاں بخاری کس کا ذکر کر رہے ہیں اس کی تصریح نہیں، لہذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ فسخ کر کے بعد کا واقعہ نقل کر رہے ہیں، اب یہ احتمال تو ہے کہ یہ بعد کا واقعہ ہو اور ابو ہریرہؓ والی بات پہلے کی ہو، مگر خفیہ کہتے ہیں کہ سنن نسائی کی اس روایت میں تصریح ہے کہ یہ بیت لیلۃ العقبہ میں تھی چنانچہ قسطلانی نے نسائی کی روایت نقل کر کے کہا ہے کہ یہ صریح ہے کہ یہ بیت لیلۃ العقبہ میں تھی، خفیہ اس سے اگرچہ مطمئن ہو گئے ہیں مگر سب بات ہے کہ اب تک مجھے پورے طور پر انشراح نہیں ہوا ہے کہ یہ لیلۃ العقبہ کا ذکر ہے یا بعد کا، کیونکہ مخالفین کے پاس بھی بہت سی روایات ہیں، لہذا اسے چھوڑ کر میں کہتا ہوں کہ جو حضرات حدود کو کفارہ قرار دے رہے ہیں وہ یہاں لفظ فعوقب سے استدلال کر رہے ہیں، یہی سزا دی گئی لفظ حد نہیں ہے بلکہ لفظ عقاب ہے اور ان مراد لینے والوں نے اس عقوبت کو حد پر عمل کر لیا، اب اگر لیلۃ العقبہ ہی میں رکھیں مگر بعض روایات میں تصریح ہے تو اس عقوبت سے حد مراد ہو ہی نہیں سکتی، کیونکہ حدود مدینہ میں نازل ہوئی ہیں تو اس صورت میں حدود کا کفار تہ بنا کیسے ثابت ہوگا؟ اسی بنا پر یعنی نے کہا کہ یہاں عقوبت سے مراد مطلق سزا ہے ذکر حد کا قال تعالیٰ اِنَّمَا اسْتَرٰ لَہُمْ الشَّیْطٰنُ بِبَعْضِ مَا کَسَبُوْا^(۱) پس اگر عقوبت سے مطلق سزا اور مصائب و بلا یا مراد ہیں تب تو معنی بھی بن جاتے ہیں اور ان کے کفارہ ہونے میں کسی کو کلام نہیں ہے۔

حد اور دوسری عقوبتوں میں فرق یہ ہے کہ حدیں جرم کی معین سزا ہوتی ہے اور عقوبت میں بہم اور کوئی سزائیں ہوتی ہیں جنہیں مصائب و آفات کہا جاتا ہے، تو معنی کہتے ہیں کہ بخاری کی حدیث میں عقوبت سے مصائب مراد لئے جائیں اور حدیث کا مضمون یہ ہے کہ

مصاب دہلایا من کے لئے کفارہ ہے۔ ایسی جوبتلا ہوا اور سزا مل گئی تو یہ مصاب دہلایا اس شخص کے حق میں کفارہ بن جائیگی، ”فہو کفارة لمن“ میں لمن کی ضمیر کا مرجع من کی طرف ہے۔ اب اگر یہ حدیث یلۃ العقبہ کی مائیں اور عوقب سے مصاب دہلایا مائیں تو من بھی صحیح ہو گئے اور حدود کے کفارات بننے کے سلسلہ سے اس کا کوئی لگاؤ بھی نہ رہا کیونکہ اس وقت حدود اس میں داخل ہی نہ رہے، مگر کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ عوقب کو عام رکھا جائے خواہ شرعی ہوں یا کوئی، اس عدم میں آنے والی حدود بھی شامل ہیں کیونکہ وہ بھی عتاب میں داخل ہیں، تو مطلب یہ ہوگا کہ مقصود بالذات مطلق عوقب ہے خواہ حدود کی صورت میں ہو یا غیر حدود کی صورت میں، قرینہ یہ ہے کہ جب احادیث سے یہ ثابت ہو کہ من کو کافرا بھی چھو جائے تو وہ اس کے لئے کفارہ بنتا ہے، تو اسی کو ذرے جیسے حدود شرعیہ تو بطریق ادنیٰ کفارہ نہیں گئے۔

ایک چیز اور بھی ہے جس سے عدم معلوم ہوتا ہے، یعنی حدود وغیر حدود سب کو شامل ہونا معلوم ہوتا ہے، وہ ہے جلا و من اصابك من ذلالت، ذلالت کا اشارہ بظاہر تمام اشیاء ہیں، تمام اشیاء میں شرک بھی ہے، پس اگر مرتد کو قتل کر دیا گیا تو کیا جرم ارتداد معاف ہو جائے گا؟ ہرگز نہیں، اس کے باب میں تو صراحت ہے کہ وہ غلہ فی النار ہے، لہذا اسے یا تو مستثنیٰ کر دیا کوئی اور منیٰ، وہ اکثر نے اسے مستثنیٰ قرار دیا ہے بقیہ جرائم کے حدود کے متعلق حکم ہے کہ کفارہ ہوتے ہیں گران میں سے بھی سرتق اور ذرے کے حدود میں تو تسلیم ہے کہ کفارہ ہوتے ہیں مگر تنزیل اولاد کی حدی نہیں، حتیٰ کہ تعصم تک میں بھی گفتگو ہے، اسے بھی چھوڑو، بہتان پر کیا حد ہے؟ کچھ نہیں (تقد اور پیڑ) تو اب عوقب کو عام رکھنا پڑے گا اور مخصوص بالحد نہ کیا جائے گا، اور عام رکھنے کی صورت میں بہر حال حدود کفارہ نہیں گئے، تو خفیہ کو تسلیم کرنا پڑا کہ حدود کفارات ہیں، میں کہتا ہوں بیشک درست ہے، لیکن خفیہ کا یہ کہنا کہ حدود کفارہ نہیں بنتے، بھی غلط نہیں ہے کیونکہ خفیہ کہتے ہیں کہ من جو کفارہ نہیں بنتے، اس کو یوں سمجھو کہ حدیں دو چیزیں ہیں، ایک حد من جو حد، یہ کفارہ نہیں، ایک من حیث ہو مصیبتہ و ایذا، یہ کفارہ ہو، یعنی اس کی وضع تو اس لئے نہیں کہ کفارہ بنے مگر چونکہ اس سے تکلیف پہنچتی ہے اس لئے ضرورت کفارہ بننے کی، اس کو یوں بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ حد کی غرض کیا ہے؟ پاک کرنا مقصود ہے یا دوسروں کو روکنا؟ خفیہ کہتے ہیں کہ اصل غرض حدود کی یہ ہے کہ لوگ اس سے عبرت حاصل کریں اور ان گناہوں سے باز رہیں، نہ کہ پاک کیا جائے، یہ غرض فتناء حاصل ہو جائے تو اور بات ہے، اگر حد کی وضع تطہیر کے لئے ہوتی تو حد سے وہ بالکل پاک ہو جاتا تو یہ کی حاجت نہ رہتی، مالا کہ ایسا نہیں ہے، ہاں اگر ذرے کے لئے ہے تو اب بالکلیہ حد سے تطہیر ہوگی، من و جہر ہوگی، اور پوری تطہیر تو بے ہوگی، حد سے تطہیر صرف اسی طرح ہوگی جس طرح مصاب سے ہوتی ہے، ہاں جب تو برے کا تو بالکلیہ تطہیر ہو جائے گی اس سے معلوم ہوا کہ حد تکلیف کیلئے ہوتی ہے، فرمایا: فَجَعَلْنَا هَا كَالْآيَاتِ يَذَكِّرُهَا وَمَا خَلَقَهَا ۚ الْآيَةُ - نکال وہ عذاب،

جس سے روکنا مقصود ہو، 'نَکَلُ' اس بڑی کو کہا جاتا ہے جو جانور کے پیروں کے لئے ڈال دیا جائے تو ٹیکل ہے ایسا آیت سے نکلنا ہے
وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوا أَيْدِيَهُمَا جِزَاءً بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِنَ اللَّهِ ط (۱) کہ قطع یہ روپیہ وغیرہ مال سرزد کا معاوضہ
نہیں بلکہ اس فعل سرزد (بہا کسباً) کی سزا ہے، آگے فرماتے ہیں نَكَالًا مِنَ اللَّهِ، اب اس کی کیا ضرورت تھی، مقصود تو حاصل ہو چکا تھا،
اس سے معلوم ہوا کہ روکنا مقصود ہے، زواج کا ترجمہ نکل کا ہے، اس کے بعد فرمایا: وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۝ چونکہ وہ غالب ہے اسلئے
اسے حق ہے کہ قانون جاری کرے، اور چونکہ حکیم ہے اس لئے وہ ایسی سزا تجویز کرتا ہے جس سے عبرت اور جلازم کا انداز ہو، چنانچہ شاہدہ کو
جہاں چند آدمیوں کو سزا دی گئی اور ہاتھ کاٹے گئے، سب کانپ گئے اور پھر کوئی سرزد کی بات نہیں کرتا اور جہاں جیل کی سزا ہے تم دیکھ رہے
ہو کہ کہیں چوری نہیں ختم ہوئی، اہل یورپ اعراض کرتے ہیں کہ یہ وحشیانہ سزا ہے، لیکن میں نے فولڈ (۲) میں لکھا ہے کہ چوری ہی کون سی
مہذب چیز ہے کہ اس کی سزا بھی مہذب ہو، اور اگر یہ سزا وحشیانہ ہی ہے تو ایک وحشت کی سزا سے اگر ہزار وحشتوں کو دنگ کر دیا جائے تو کیا
مصلحت ہے۔

محمد علی قادیانی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ سزا تو بیشک ہے قطع یہ کی مگر یہ انتہائی سزا ہے اس سے پہلے کچھ امتیازات
ہیں، ماکم چاہے تو سزا میں تخفیف کر سکتا ہے — مگر میں نے لکھا ہے کہ نئے زمانہ میں ایک چور کو بھی ابتدائی سزا نہیں دی گئی بلکہ سب کو
آخری سزا کا متعلق شمار کیا گیا۔

ایک محدثؒ نے اعراض کیا کہ جس ہاتھ کی دیت پانچ سو دینار ہے اس کو دس درم میں کاٹ دیا جائے، یہ عکت کے خلاف ہے
کسی حکم نے اس کا جواب دیا: لَمَّا كَانَتْ أَمِينَةً كَانَتْ جَمِينَةً فَأَذَاخَانَتْ هَانَتْ (۳) یہی ہاتھ بڑا تہمتی تھا جب یہ امین تھا
اور جب یہ خان بن گیا تو اس کی قیمت نہ رہی، غرض لفظ نَكَالًا مِنَ اللَّهِ میں تہریع ہے کہ مقصود عبرت و ٹیکل ہے، آگے فرماتے ہیں: فَنَنْ
تَابَ مِنْ بَعْدِ ظُلْمِهِ وَأَصْلَحَ فَإِنَّ اللَّهَ يَتُوبُ عَلَيْهِ ط (۴) سب کہتے ہیں کہ اس آیت میں ظلم سے مراد سرزد ہے اور اسی کے
متعلق فرمان ہے کہ اگر توبہ کر لی اور اپنی اصلاح بھی کر لی تو اللہ کے ہاں راحت میں کمی نہیں، تو پورا مسئلہ خفیہ کا آیت سے ثابت ہے کہ

(۱) اُمّہ: ۳۸ (۲) اس سے مراد وہ فولڈ ہیں جو مولانا عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت شیخ ابنہ رحمۃ اللہ علیہ کے ترجمہ قرآن کے حاشیہ پر تحریر
فرماتے ہیں (مرتب) (۳) ابو العلاء، معری (مرتب) (۴) جامع تقریر نے پہلی جگہ "اذا" دوسری جگہ "واذا"
(۵) اُمّہ: ۳۹۔

١٨— حَدَّثَنَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ مَسْلَمَةَ عَنْ مَالِكٍ عَنْ عَبْدِ الرَّحْمَنِ

ہم سے بیان کیا عبداللہ ابن مسعود نے ۱ انھوں نے امام مالک سے ۲ انھوں نے عبدالرحمن ابن عبداللہ ابن عبد الرحمن
بْنِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ أَبِي صَعْصَعَةَ عَنْ أَبِيهِ عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ

ان ابی موسیٰ سے انھوں نے اپنے باپ (عبداللہ) سے انھوں نے ابوسعید خدری سے انھوں نے آنحضرت
 اَنَّهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمَئِذٍ أَنْ يَكُونَ خَيْرَ مَالِ الْمُسْلِمِ
 مَالُ اللَّهِ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ، فرمایا : وہ زمانہ قریب ہے جب مسلمان کا بہتر مال بکریاں ہوں گی جن کے پیچھے پہاڑ کی چوٹیوں اور
 غنم شیع بہا شَعَفُ الْجِبَالِ وَمَوَاقِعُ الْقَطْرِ يَفْرُ بَدِينِهِ مِنَ الْفِتَنِ
 ہرش کے غلاموں میں وہ اپنا دین فتنوں سے بچائے ہوئے بھائے پھرے گا ۔

اصل وضع حد کی زجر کے لئے ہے، ہاں بلا، وصیبت ہونے کی وجہ سے وہ فی الجملہ ستر و کفارہ ضرور دین جائے گی، یہ استاد کے الفاظ ہیں کہ وضع حد و زجر کے لئے ہے نہ تطہیر کے لئے، شوائع زجر کو مقصود ثانوی کہتے ہیں اور تطہیر کو اولاً و بالذات مقصود کہتے ہیں، خفیہ کی طرف سے اس جواب میں پوری صفائی سے کہتے ہیں کہ لفظ تَكَفَّرَ اِنْ اُتِدَ سے مراد معلوم ہوتا ہے کہ اصل وضع اس کی زجر کے لئے ہے، تطہیر اگر ہے بھی تو ثانی ہے اور اس میں کوئی مضائقہ بھی نہیں، یہ بھی سمجھ لو کہ ابو ہریرہؓ کی حدیث میں یہ لفظ ہیں لَا اَدْرِي اَنْ اُحْدُوْهُ كَفَّارَةً اَوْ لِغُلَامٍ اَمْرًا، مجھے معلوم نہیں کہ حد و کفارہ ہیں یا نہیں، لفظ زواج نہیں بولا گیا، اور حدیث عبادہ میں فرمایا فَكُفِّرَاكَ لِيْ بِعِقَابِيْ یعنی یہ عقیبت اس کے لئے کفارہ ہے۔

ادپر کی تفصیل سے معلوم ہو گیا کہ کفارہ فی الجملہ بیگی من حیث انہما مصائب، لیکن اصل وضع مذہبی ہے، وجہ ان یہ کہتا ہے کہ یقیناً لیلۃ العقبہ کے بعد کا ہے، لیلۃ العقبہ کا مضمون تو یہ ہے کہ میری مدد کرو، حفاظت کرو اپنی بیٹیوں کی، بیٹوں سے زیادہ میرا خیال کرو، وغیرہ۔ معلوم ہوتا ہے کہ جس نے لیلۃ العقبہ کہا اس کو وہم ہو گیا۔

باب من الدين الفرا من الفتن

چونکہ امام بخاری کے ہاں اسلام، ایمان، دین وغیرہ سب ایک ہی چیز ہے اس لئے الفرائض من الفتن کو کتاب الایمان میں لائے، اب تک جو چیزیں بیان ہوئیں وہ ثبوتی اور وجودی چیزیں تھیں، اس لئے اب چند وہ چیزیں لاریں

بَابُ قَوْلِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَا أَعْلَمُكُمْ بِاللَّهِ وَأَنَّ الْمَعْرِفَةَ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمانا کہ میں تم سے زیادہ اللہ کا جاننے والا ہوں اور معرفت (یقین) دل کا فعل القلب لقول الله تعالى وَالْكَافِرُ يَأْخُذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوبُكُمْ نفس ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا (سورہ بقرہ میں) لیکن ان قسموں پر تم کو پکڑے گا جو تمہارے دلوں نے (جان بوجھ کر) کھائیں۔

جو ہم اور ترک کی ہیں، اسی سلسلہ کی یہ حدیث بھی ہے۔

حدیث ۵۸۱ شَعَفٌ حج ہے شَعْفَةُ کی، پہاڑ کی چوٹی — مَوَاقِعُ الْقَطْرِ، بارش کی جگہیں، مراد وادیاں اور گڑھے ہیں، ترجمہ یہ ہے کہ حفاظت دین کے لئے پہاڑوں اور غاروں میں چلا جائے — بکری کا لے جانا اس لئے ہے کہ دودھ غذا اور شراب (کھانے اور پینے) دونوں کا کام دیتا ہے — مَوَاقِعُ الْقَطْرِ اور شَعَفُ الْجِبَالِ اس لئے پند کہے گا کہ وہاں بارش کی وجہ سے پشے اور چراگاہیں ہوتی ہیں — بکری میں انحصار مقصود نہیں ہے، بلکہ مقصود یہ ہے کہ مختصر مسافت پر لے کر چلا جائے، ربانیت کی تعلیم نہیں دی جا رہی ہے بلکہ یہ بتایا جا رہا ہے کہ ایک وقت ایسا آئے گا کہ صحبت سے فائدہ نہ ہوگا اور جب صحبت مضرب ہونے لگے اور تنہائی و عزت نشینی بقائے ایمان کے لئے مفید ہو تو اس وقت بھی کرنا چاہئے، یہ اس شخص کے بارے میں نہیں ہے جس کی صحبت سے لوگوں کو فائدہ پہنچ سکتا ہو، بلکہ جو شخص اس خرابی کا رخ موڑ سکتا ہو اس کو تو ہم کر دین برحق کی تبلیغ کرنی چاہئے۔

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ فتنے سے مراد عرف شرعی میں یہ ہے کہ دینی امور کی مخالفت عام ہو جائے اور دین کی حفاظت مشکل ہو جائے اور اسباب و ذرائع مفلوج ہو جائیں تو کمزوروں کو اجازت ہے کہ وہ حفاظت دین کی خاطر کل جھانگیں، لفظ ہدینہم کی بار کو بعض نے سبب کے لئے لیا ہے کہ وہ اپنے دین کے سبب سے اس کے چلنے کے لئے بھاگ جائے اور چونکہ دین کو بچانے کے لئے جھانگ بھی دینہو اس لئے امام بخاری نے یہ ترجمہ رکھ دیا — بعض نے بار ابتدائی لیا ہے اور بار ابتدائی کا مطلب یہ ہے کہ فرار ناشی عن دین ہو، یعنی نشاؤ فرار دین ہو — میں کہتا ہوں کہ بار کو معیت کے لئے لیا جائے، یعنی اپنے دین کو ساتھ لے کر بھاگ جائے، جیسے (حضر موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ میں) فَرَسٌ بِشَوْبَةٍ کے معنی ہیں کہ وہ پتھر کپڑے کر بھاگ گیا، یہ میرے نزدیک لطیف ہے۔

بَابُ قَوْلِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَا أَعْلَمُكُمْ بِاللَّهِ

امام بخاری نے ترجمے کے دو جز کر دئے ہیں، ایک "أَنَا أَعْلَمُكُمْ بِاللَّهِ" دوسرا "أَنَّ الْمَعْرِفَةَ فَعَلَ الْقَلْبُ" مؤلفا شارحین سمجھتے ہیں کہ دونوں ترجمے غلط ہیں، پہلے جز کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کا علم رکھنے والا سب سے زیادہ میں ہوں، اور اعلم

اسم تفضیل کا صیغہ ہے اور اس میں مراتب ہیں اور علم باللہ ایمان ہے، تو ایمان کے بھی مراتب ہوئے، دوسرے جزو سے مراد کرامیہ فرقوں کا رد کرنا مقصود ہے، جو یہ کہتے ہیں کہ صرف قول لا الہ الا اللہ کافی ہے، چاہے معرفت ہو یا نہ ہو، ان کا جواب دیا کہ صرف قول کافی نہیں ہے، معرفت ضروری ہے اور معرفت قلب کا فعل ہے، زبان کا نہیں، اس لئے صرف زبان سے کہہ دینے سے ایمان نہیں ہوتا۔

میرے نزدیک یہ دونوں جزو علیحدہ نہیں ہیں بلکہ دوسرے جزو سے پہلے کی تشریح مقصود ہے، کیونکہ پہلا جزو حدیث کا ٹکڑا ہے اور کوئی علم کو ایمان نہیں کہتا بلکہ ایمان میں معرفت جو فعل قلب ہے اور امتیازی چیز ہے معتبر ہے، تو حدیث کے لفظ کو اپنی جگہ پر رکھا اور بتلادیا کہ علم کے مراتب ہیں، لہذا معرفت کے بھی مراتب ہیں اور معرفت ایمان ہے لہذا ایمان کے بھی مراتب ہیں، اب یہ کہ معرفت فعل قلب ہے، اس کی دلیل ”وَلَكِنْ يَوَازِئُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ فُلُوكُمْ“ (المع) شراح پریشان ہیں کیونکہ دعویٰ تو یہ ہے کہ معرفت فعل قلب ہے، اور دلیل میں وہ آیت پیش کی جو ایمان (قسم) کے بارے میں ہے، ایمان کو ایمان سے کیا تعلق؟ چنانچہ توجیہات کے درپے ہوئے، حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اس آیت میں امام بخاری کا مقصود ”بِمَا كَسَبَتْ“ سے صرف یہ بتلانا ہے کہ تلو بہ کسب کرتے ہیں یعنی ان سے بھی فعل ہوتا ہے، فعل مخصوص بالجوارح نہیں ہیں، لہذا یہ دعویٰ کہ معرفت فعل قلب ہے کچھ بعید نہیں۔

حاصل یہ نکلا کہ استشہاد صرف اس پر ہے کہ فعل قلب کا بھی ہوتا ہے، مگر یہ بات کہ معرفت جو عقیدہ اسلام ہے وہ فعل قلب ہے یا نہیں؟ اس سے نہیں ثابت ہوا، اس توجیہ سے یا اور دوسری توجیہات سے اب تک تشریح نہیں ہوئی، اپنی سمجھ میں یہ آتا ہے کہ اس آیت کے متعلق حافظ نے مشہور تاجی اور مفسر حضرت زید ابن اسلم کا ایک اثر نقل کیا ہے جس میں زید ابن اسلم اس آیت لَا يَوَازِئُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ فُلُوكُمْ فِي آيَاتِكُمْ وَلَكِنْ يَوَازِئُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ فُلُوكُمْ کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اگر کوئی قسم کھائے کہ میں فلاں کافر کروں تو کافر ہوں (العیاذ باللہ) تو دیکھا جائے گا کہ اس نے گریوں ہی منہ سے لفظ بک دیا ہے تو وہ کافر نہ ہوگا، بلکہ وہ لَا يَوَازِئُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ فُلُوكُمْ بِاللَّعُوفِ (ایمان لکھو) میں داخل ہوگا، اور اگر دل کے عقیدے سے کہہ لے اور سمجھتا ہے کہ واقعی میں کافر ہو جاؤں گا اور پھر کر گذر تو اب وہ کافر ہو گیا اور وَلَكِنْ يَوَازِئُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ میں داخل ہو گیا، اس لئے کہ یہ رضا بالکفر ہے اور رضا بالکفر کفر ہے۔ انتہی قول نزدیک بن اسلم اب مسئلہ صاف اور واضح ہو گیا کہ معرفت فعل قلب ہے، یعنی یہ عقیدہ کہ اس فعل کے کرنے سے کافر ہو جاؤں گا، فعل قلب ہے غالب گمان یہ ہے کہ امام بخاری نے اس تفسیر کو پیش نظر رکھ کر یہ ترجمہ رکھا ہے اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امام بخاری نے

۱۹۔ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ سَلَامٍ قَالَ أَنَا عَبْدُ اللَّهِ عَنْ هِشَامٍ عَنْ أَبِيهِ

ہم سے بیان کیا محمد بن سلام بکندی نے 'خبر دی ہم کو عبدہ نے' انہوں نے ہشام سے ' انہوں نے

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا أَمَرَهُمْ أَمْرَهُمْ

اپنے باب (عروہ) سے ' انہوں نے حضرت عائشہ سے ' کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب صحابہ کو کوئی حکم دیتے تو انہیں کاموں کا

مِنَ الْأَعْمَالِ بِمَا يُطِيقُونَ قَالُوا إِنَّ لَنَا كَهَيْئَتِكَ يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ قَدْ عَفَرَ

حکم دیتے جن کو وہ کر سکتے تھے ' وہ عرض کرتے یا رسول اللہ ! ہم آپ کی طرح تھوڑے ہیں ' آپ کے تواتر نے سب اگلے پچھلے گناہ

لَكَ مَا تَقْدَمُ مِنْ ذُنُوبِكَ وَمَا تَأْخِرُ فَيَغْفِبُ حَتَّى يَعْرِفَ الْغَضَبُ فِي وَجْهِهِ

معاف کر دے ہیں ' پس کہ آپ اتنی غفہ ہوتے کہ آپ کے (مبارک) چہرہ پر فرقہ نمودار ہوتا ' پھر آپ فرماتے

ثُمَّ يَقُولُ إِنَّ أَتَقَلُّمُ وَأَعْلَمُكُمْ بِاللَّهِ أَنَا۔

(کیا تم کو معلوم نہیں) تم سب میں زیادہ پرہیزگار اور اللہ کو زیادہ جاننے والا میں ہوں

اسی تفسیر کو لے کر یہاں مطلق کر دیا ' کیونکہ امام بخاری کے علومات بڑے وسیع اور نظر بہت دقیق ہے ' اس لئے 'اذا سی چیز کے اشارے سے چل پڑتے ہیں ' واللہ اعلم بالصواب ۔

حدیث ۱۹۔ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ سَلَامٍ ، سلام بانحیف ہے ، بالتشديد کو بعضوں نے لحن شمار کیا ہے ۔

حدیث میں حضرت عائشہ صدیقہ فرائی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اتنا ہی عمل بتلاتے تھے جتنا سہولت کے ساتھ

اٹھایا جاسکے ' بھاری کام نہ بتلاتے تھے ' نیز خود بھی اپنے لئے وہ چیز اختیار فرماتے جس میں امت کو تیسر اور آسانی ہو ' اہل کہیں کہیں عزیمت

کے لئے جانب اثنی (دشوار اور پرشقت پہلو) بھی اختیار فرمائیے ' صحابہ چونکہ سوہ بننے والے تھے اس لئے انہیں بھی ویسی ہی تعلیم فرماتے ۔

قَوْلُ يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ قَدْ عَفَرَ لَكَ مَا تَقْدَمُ مِنْ ذُنُوبِكَ وَمَا تَأْخِرُ ، صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ

ہم آپ کی طرح نہیں ' آپ تو معصوم ہیں ' بلاشبہ اللہ تعالیٰ آپ کے اگلے پچھلے سب تصور معاف فرما چکا ہے اور ہم سے خطائیں ہوتی ہیں لہذا

ہم محتاج ہیں کہ کثرت سے عبادت کریں ۔

قَوْلُ فَيَغْفِبُ حَتَّى يَعْرِفَ الْغَضَبُ فِي وَجْهِهِ ، ہو کہ انہوں نے حضور کے فعل کو تلیل سمجھا اس بنا پر کہ ہا کہ

آپ کو ضرورت نہیں مگر ہم محتاج اور ضرور مند ہیں ' اس لئے اس بات پر آپ کو غفہ آگیا اور فرمایا کہ گویا میرے گناہ معاف ہو چکے ہیں اس لئے

میں مطمئن ہوں ۔

اس سے ایک تو صحابہؓ کی حرمِ مسلم ہوتی ہے اور ان کی عزیت و ہمت کا حال معلوم ہوتا ہے اور دوسرے یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ آسانی اور سہولت کی صورت اختیار فرماتے تھے۔

مشکوٰۃ باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ میں حضرت انسؓ سے یہ واقعہ تفصیل کے ساتھ منقول ہے کہ تین آدمی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حضورؐ کی عبادت (مادِ شب کی عبادت ہے) اس لئے کہ دن میں تو وہ سب کچھ دیکھتے ہی رہتے تھے) کے بارے میں سوال کیا تو انھوں نے شب کا پورا نظام بیان کر دیا (اس میں گھر کے کام کاج، مصائب کے سائل، ازواج کے حقوق آرام فرمانا اور پھر عبادتِ خداوندی کی تفصیل شامل تھی) جب انھوں نے تفصیل سنی تو ان کے ذہن میں جو عبادت نبوی کا تصور تھا اس سے یہ کم معلوم ہوئی، حدیث کے الفاظ ہیں: **كَانَهُمْ تَقَاتُلُوْهَا**، گویا انھوں نے اس عبادت کو قلیل شمار کیا، اس پر انھیں خیال ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو مصمم ہیں ان کے تو لگے پچھلے سارے گناہ معاف ہیں، تب بولے: کہاں ہم کہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے سب اچھے پچھلے گناہ معاف ہیں آپ اگر عبادت کم بھی کریں تو کوئی حرج نہیں مگر ہم تو قصور وار اور گنہگار ہیں، ہم کو زیادہ عبادت کرنی چاہئے، اس لئے ایک نے کہا میں تو ہمیشہ رات بھر نمازیں پڑھتا ہوں گا، دوسرے نے کہا میں ہمیشہ دن کا روزہ رکھا کروں گا، تیسرے نے کہا میں ہمیشہ عورتوں سے کنارہ کش رہوں گا کبھی نکاح نہ کروں گا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب یہ باتیں معلوم ہوئیں تو آپ باہر تشریف لائے اور فرمایا: تم نے ایسی ایسی باتیں کہی ہیں؟ سنو! خدا کی قسم میں تم سب سے زیادہ خشیتِ خداوندی رکھتا ہوں اور تم سب سے زیادہ متقی ہوں بائیں ہمدیں روزہ بھی رکھتا ہوں اور نفل بھی کرتا ہوں، نمازیں بھی پڑھتا ہوں اور آرام بھی کرتا ہوں، عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں، (تم نے جو یہ باتیں کہیں ان سے ادا نہ ہوتا ہے کہ یہ کم ہیں اور تم مجھ سے بھی بڑھ جانا چاہتے ہو) تو سنو! جو بھی میری سنت اور میرے طریقے سے اعراض کرے گا وہ میرا نہیں ہے۔ اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ غصہ کا سبب حضورؐ کی عبادت کو کم سمجھنا تھا تو آپ نے اس کی اصلاح فرمادی اور فرمایا میں سارے عالم میں سب سے زیادہ اعظم باللہ اور اتقی ہوں، میری عبادت میں کوئی کمی نہیں۔

یہ لفظ **اعلمکم** کہنے کی ایک مثال پیش کرتا ہوں تاکہ خوب واضح ہو جائے، بادشاہوں اور سلاطین کا ایک قانون ہوتا ہے جس میں دفعات مقرر ہوتی ہیں، جرائم کی تفصیل ہوتی ہے، اس کا علم تمام رعایا کو کر دیا جاتا ہے، تو تمام رعایا کا مرتبہ تو یہ ہے کہ وہ اس قانون اور اس کی دفعات کی پابندی کریں، لیکن ایک طبقہ مصاحبین خاص کا ہوتا ہے، ان کا حال اور نوعیت یہی نہیں ہوتی کہ صرف قانون اور اس کی دفعات کا لحاظ رکھیں بلکہ وہ دن رات بادشاہ کی ادا شناسی اور اس کی مزاج دانی کا خیال رکھنا اپنے فرائض منصبی کا کمال سمجھتے ہیں، وہ ہمیشہ اس کی مرضی دیکھتے ہیں اور جب چیز میں اس کی خوشی پاتے ہیں وہی اختیار کرتے ہیں، پھر ان مصاحبین خاص میں سے بھی جو زیادہ قرب و احتصاص رکھتے ہیں وہ اور زیادہ ہر وقت مزاج دانی و ادا شناسی کی فکر رکھتے ہیں، ان کی نگاہ قانون پر نہیں رہتی بلکہ مزاج شناسی پر رہتی جو تو یہی مزاج دانی اور ادا شناسی معنوت ہے اور یہ چیز برسوں کے بعد حاصل ہوتی ہے، اسی کو فرماتے ہیں **انما اعلمکم باللہ**، مزاج شناسی کا

باب ۳ مَن كَرِهَ أَنْ يَعُودَ فِي الْكُفْرِ كَمَا يَكْرَهُ أَنْ يُلْقَى فِي النَّارِ مِنَ الْإِيمَانِ

جو شخص پھر کافر ہو جائے کو اتنا برا سمجھے جیسے آگ میں ڈالا جانا ، وہ سچا مومن ہے ۔

۲۔ حَدَّثَنَا سُلَيْمَانُ بْنُ حَرْبٍ قَالَ سَمِعْتُ شُعْبَةَ عَنْ قَتَادَةَ عَنْ أَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ
ہم سے بیان کیا سلیمان بن حرب نے ، کہا ہم سے بیان کیا شعبہ نے ، انھوں نے قنادہ سے ، انھوں نے انس سے

صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ ثَلَاثٌ مَنْ كُنَّ فِيهِ وَجَدَ حَلَاوَةَ الْإِيمَانِ : مَنْ كَانَتْ
انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا جس میں تین باتیں ہوں گی وہ ایمان کا مزہ پائے گا ، ایک تو اُذِہ اور اُس کے رسول کی محبت
اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِمَّا سِوَاهَا وَمَنْ أَحَبَّ عَبْدًا لِأَحِبَّةِ اللَّهِ وَمَنْ يَكْرَهُ
اس کو سب سے زیادہ ہو ، دوسرے کسی بندہ سے خالص اللہ کے لئے دوستی رکھے ، تیسرے پھر کفر میں جانا جب اللہ نے
أَنْ يَعُودَ فِي الْكُفْرِ بَعْدَ إِذْ أَنْقَذَهُ اللَّهُ كَمَا يَكْرَهُ أَنْ يُلْقَى فِي النَّارِ
اس سے کفر چھڑا دیا اتنا برا سمجھے جیسے آگ میں ڈالا جانا ۔

لفظ وہاں نہیں ہے اسلئے اسے استعمال نہیں کر سکتا کیونکہ یہ قرآن کے خلاف ہوگا مگر انبیاء علیہم السلام جو فرماتے ہیں کہ ہم اِعلم " ہیں اس کا
مطلب یہ ہے کہ وہ مزاج دان اور دانشناس ہوتے ہیں ، وہ ہر وقت اسی فکر میں رہتے ہیں کہ اللہ کن چیزوں سے خوش ہوتا ہے تاکہ
وہ اسی کو اختیار کریں ۔

دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ معرفت کبھی ہے ، یہ وہ معرفت نہیں جو عام اشخاص کو ہوتی ہے بلکہ یہ مخصوص بالانبیاء ہے
انھیں کو یہ معرفت ہوتی ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم توسیع الانبیاء ہیں اس لئے آپ " اعرف " بھی ہوں گے اور جو اعرف ہوں گے وہی
زیادہ مقرب بھی ہوں گے ، اور جو جس قدر زیادہ مقرب ہوں گے وہی سب سے زیادہ ڈرنے والے بھی ہوں گے اور جب معرفت کامل
اور تقویٰ کامل ہوگا تو عبادت بھی اکمل ہوگی اور ان کا ایک بار سبحان اللہ کہنا ہمارے دس لاکھ مرتبہ کہنے سے بڑھ کر ہوگا ، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم
نے مسئلہ حل فرمادیا اور صحابہ کو بتلادیا کہ کیت مت دیکھو ورنہ جوگی وہاں سب جان مارتے ہیں مگر چونکہ تقویٰ اور معرفت صحیح اور تقویٰ نہیں
اس لئے سب بیکار ہے ، اور جب معرفت ہے تو گو مقدار میں کم ہے مگر اعلیٰ وارفع ہے ، معلوم ہو کہ معرفت ایمان کا اعلیٰ مرتبہ ہے ، تو اب
امام ابو حنیفہ کا قول (کہ ایمان معرفت بالجمان و اقارب باللسان کا نام ہے) بھی حل ہو گیا کہ معرفت نامہ کا نام ایمان ہے ، فالحمد للہ علی ذلک

باب ۳ مَن كَرِهَ أَنْ يَعُودَ فِي الْكُفْرِ

(حدیث ۱۸۵) یہ حدیث پہلے گذر چکی ہے ، وہاں اس کا تشریح بھی بیان ہو چکی ہے ، اس سے معلوم ہو کہ فضائل ایمان

باب تَفَاضُلِ اَهْلِ الْاِيْمَانِ مِنَ الْاَعْمَالِ

ایمان داروں کا اعمال کے دوسرے ایک دوسرے پر افضل ہونا

۲۱۔ حَدَّثَنَا اِسْمَاعِيلُ قَالَ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ عَمْرِو بْنِ يَحْيَى الْمَدَنِيِّ

ہم سے بیان کیا اسامیل (ابن ابی اوس) نے کہا مجھ سے بیان کیا امام مالک نے 'انھوں نے عمرو بن یحییٰ مدنی سے 'انھوں نے

عَنْ اَبِيهِ عَنْ اَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ
اِذَا بَلَغَ الْاِيْمَانُ اَهْلَ الْجَنَّةِ وَالْجَنَّةِ اَهْلُ النَّارِ النَّارُ ثُمَّ يَقُولُ اللهُ اَخْرِجُوْهُمْ
بہشت والے بہشت میں اور دوزخ والے دوزخ میں چل دیں گے ، پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا جس شخص کے دل میں رائی کے دانے کے برابر

كَانَ فِي قَلْبِهِ مِنْ ثِقَالِ حَبَّةٍ مِنْ خَرْدَلٍ مِنْ اِيْمَانٍ فَيُخْرِجُوْنَ مِنْهَا قَدْرًا سَوْدُوْا
ایمان ہو اس کو دوزخ سے نکال لو ، پھر ایسے لوگ دوزخ سے نکالے جائیں گے ، وہ (جل کر) کالے ہو گئے ہوں گے ،

فَيُلْقَوْنَ فِيْ نَهْرِ الْحَيَاةِ اَوْ الْحَيَاةِ - شَكَتْ مَالِكٌ - فَيَنْبُتُوْنَ كَمَا تَنْبُتُ الْحَبَّةُ فِي
پھر برسات کی نہر یا زندگی کی نہر میں ڈالے جائیں گے - امام مالک کو شک ہے - وہ اس طرح (نئے سرے سے) اُگ
جَانِبِ السَّيْلِ الْمَرْتَرَانَهَا تَخْرُجُ صَفْرَاءُ مُلْتَوِيَةً ، قَالَ وَهَيْبٌ حَدَّثَنَا عَمْرُو
آئیں گے جیسے دانہ ندی کے کنارے اُگ آتا ہے ، کیا تو نہیں دیکھتا کیہ زرد زرد لپٹا ہوا نکلتا ہے ، وہیب نے کہا مجھ سے

الْحَيَاةِ وَقَالَ خَرْدَلٍ مِنْ خَيْرٍ

عمرو بن یحییٰ نے یہ حدیث بیان کی اس میں 'زندگی کی نہر' کہی اور ایمان کے بدل خیر کا لفظ کہا ۔

ایک یہ بھی ہے کہ انسان کفر کو بُرا سمجھے اور اس سے بیزار رہے (تظلائی نے کہا اللہ اور اس کے رسول سے محبت کی نشانی یہ ہے کہ دین کی مدد
کرے ، قول اور فعل سے اور آپ کی شریعت کی حمایت کرے اور اسلام کے مخالفین جو اسلام پر اعتراض کریں ان کا جواب دے اور
اخلاق و عادات مثلاً سخاوت ، ایثار ، حلم ، صبر اور تواضع میں آپ کی پیروی کرے ۔

باب تَفَاضُلِ اَهْلِ الْاِيْمَانِ مِنَ الْاَعْمَالِ

عنوان باب کی عبارت کا مطلب بالکل ظاہر ہے کہ اہل ایمان اعمال کے اعتبار سے فاضل و مغضول (اور باہم متفاضل
ہوتے ہیں ، ایک کا ایمان عمل کی زیادتی کے اعتبار سے زیادہ اور دوسرے کا عمل کی کمی کی وجہ سے کم ہوتا ہے) اور امام بخاری کا

مقصود یہ ہے کہ اس سے ایمان کی کمی اور یاقینی کا ثبوت ہوتا ہے، اس حدیث کو امام بخاری نے مختصر کر کے ذکر کیا ہے، یہ حدیث مسلم کتاب الایمان میں مفصل مذکور ہے پہلے اسے سنو!

باب معرفۃ طریق الترویۃ میں ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی ایک طویل حدیث منقول ہے اس کے آخر میں ہے کہ ایمان والے اللہ تعالیٰ سے عطا مومنین کی شفاعت کریں گے اور یوں عرض کریں گے:

اے ہمارے رب یہ تو ہمارے ساتھ روز سے رکھتے تھے اور نماز پڑھتے تھے اور حج کرتے تھے، تو ان سے کہا جائے گا کہ نکال لو جسے پہچانتے ہو، ان کی صورتوں کا جلا نا آگ پر حرام ہوگا، پھر وہ لوگ بہتوں کو نکالیں گے اس حال میں کہ بعض کو نصف پندلیا اور کسی کو گھٹنوں تک آگ نے جلایا ہوگا، پھر وہ کہیں گے کہ اے ہمارے رب جن کے لئے آپ نے فرمایا تھا ان میں سے کوئی اب نہیں رہ گیا پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ پھر جاؤ جس کے دل میں دینار کے برابر ایمان پاؤ اسے نکال لو، تو وہ بہتوں کو نکالیں گے اور کہیں گے کہ اے ہمارے رب جن کو آپ نے فرمایا تھا ان میں سے کسی کو ہم نے اس میں نہیں چھوڑا، پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ پھر جاؤ جس کے دل میں نصف دینار برابر ایمان پاؤ اسے نکال لو، تو بہتوں کو نکالیں گے پھر کہیں گے اے ہمارے رب جن کو آپ نے فرمایا تھا ان میں سے کسی کو ہم نے اس میں نہیں چھوڑا، پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ جاؤ جس کے دل میں ذرہ بھر ایمان پاؤ اسے نکال لو، تو وہ بہتوں کو نکالیں گے اس کے بعد کہیں گے اے ہمارے رب ہم نے اس میں کسی ایمان والے کو نہیں چھوڑا (ابوسعید خدری فرماتے تھے کہ اگر اس حدیث میں تم میری تصدیق نہیں کرتے تو چاہو تو ان اللہ لا یظلمہم فی شئ)

رَبَّنَا كَانُوا يَعْمُرُونَ مَعَنَا وَيُصَلُّونَ
وَيُحْجُّونَ فَيَقَالُ لَهُمْ اَخْرِجُوا مِنْ عَرَضِ
مُحَرَّمٍ مَوْصُورِهِمْ عَلَى النَّارِ فَيُخْرِجُونَ خَلْقًا كَثِيرًا
قَدْ اخَذَتِ النَّارُ اِلَى نِصْفٍ سَاقِيَةٍ وَاِلَى
رُكْبَتَيْهِ ثُمَّ يَقُولُونَ رَبَّنَا مَا بَقِيَ فِيهَا اَحَدٌ
مِمَّنْ اَمَرْتَنَا بِهِ فَيَقُولُ اَرْجِعُوا فَمَنْ وَجَدْتُمْ
فِي قُلُوبِهِمْ مِثْقَالَ دِينَارٍ مِنْ خَيْرٍ فَاَخْرِجُوهُ
فَيُخْرِجُونَ خَلْقًا كَثِيرًا ثُمَّ يَقُولُونَ رَبَّنَا
لَمْ نَذَرْ فِيهَا اَحَدًا مِمَّنْ اَمَرْتَنَا بِهِ ثُمَّ يَقُولُ
اَرْجِعُوا فَمَنْ وَجَدْتُمْ فِي قُلُوبِهِمْ مِثْقَالَ
نِصْفِ دِينَارٍ مِنْ خَيْرٍ فَاَخْرِجُوهُ فَيُخْرِجُونَ
خَلْقًا كَثِيرًا ثُمَّ يَقُولُونَ رَبَّنَا لَمْ نَذَرْ
فِيهَا مِمَّنْ اَمَرْتَنَا اَحَدًا ثُمَّ يَقُولُ اَرْجِعُوا
فَمَنْ وَجَدْتُمْ فِي قُلُوبِهِمْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ مِنْ خَيْرٍ
فَاَخْرِجُوهُ فَيُخْرِجُونَ خَلْقًا كَثِيرًا ثُمَّ يَقُولُونَ
رَبَّنَا لَمْ نَذَرْ فِيهَا اَحَدًا وَكَانَ أَبُو سَعِيدٍ يَخْتَصِمُ
يَقُولُ اِنْ لَمْ تُصَدِّقْنِي بِهَذَا الْحَدِيثِ فَاقْرَأُوا

ذَرَّةٍ وَإِنْ تَكَ حَسَنَةً يَّضَاعِفْهَا وَيُؤْتِ مِنْ لَدُنْهُ أَجْرًا عَظِيمًا) پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ فرشتوں، نبیوں اور مومنوں نے سفارش کر لی، اب ارحم الراحمین رہ گیا ہے، پھر مٹی بھر لوگوں کو جہنم سے نکالے گا، مومنوں نے کبھی کوئی نیکی نہیں کی، وہ مجلس کر کوئلہ کی طرح ہو گئے ہوں گے پھر ان کو جنت کے دروازے کی نہریات میں ڈالے گا تو وہ تروتازہ ہو کر نکلیں گے جیسے بچہ اگت ہے سیلاب کے بہاؤ کوڑا کرکٹ میں، (الی قولہ) یہ اللہ کے وہ آزار کردہ لوگ ہیں جن کو کفر کی عمل اندیشی کے جو انھوں نے عمل کر کے اگلے جیسی ہو، اللہ نے جنت میں داخل کر دیا۔

انس ابن مالک کی حدیث کا ایک حصہ اور سن لو جو حدیث شفاعت میں ہے کہ جب شفاعت کی اجازت مل جائیگی :

تو حکم ہوگا جا، جس کے دل میں یہ گہوں یا جو کے دلنے کے برابر بھی ایمان ہو اس کو نکال لے دوزخ سے، میں ایسے سب لوگوں کو نکال لوں گا اور پھر اپنے مالک کے پاس آن کر ویسی ہی تعریفیں کروں گا، پھر سجدے میں گر پڑوں گا، حکم ہوگا اے محمد! اپنا سہ اٹھا اور کہہ جو کہنا ہے، تیری بات سنی جائے گی، مالک جو مانگتا ہے، ملے گا، سفارش کر، تیری سفارش قبول ہوگی، میں عرض کروں گا مالک میرے! امت میری امت میری (یعنی اپنی امت کی بخشش چاہتا ہوں) حکم ہوگا، جا اور جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی

إِنْ شِئْتُمْ إِنَّ اللَّهَ لَا يَظْلِمُ مُتَقَالِ ذَرَّةٍ وَإِنْ تَكَ حَسَنَةً يَّضَاعِفْهَا وَيُؤْتِ مِنْ لَدُنْهُ أَجْرًا عَظِيمًا) ۱۱) فَيَقُولُ اللَّهُ تَعَالَى شَفَعْتَ الْمَلَائِكَةُ وَشَفَعَ النَّبِيُّونَ وَشَفَعَ الْمُؤْمِنُونَ وَلَمْ يَبْقَ إِلَّا أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ فَيَقْفُ قَبْضَةً مِنَ النَّارِ فَيُخْرِجُ مِنْهَا قَوْمًا لَمْ يَعْلَمُوا خَيْرًا أَطَقُوا دَا حَمِيمًا فَيُلْقِيهِمْ فِي نَهْرٍ فِي أَفْوَاهِ الْجَنَّةِ يُقَالُ لَهُ نَهْرُ الْحَيَاةِ فَيُخْرِجُونَ كَمَا تُخْرَجُ الْحَبَّةُ فِي حَمِيلِ السَّيْلِ (الی قولہ) هَؤُلَاءِ عِقَاءُ اللَّهِ الَّذِينَ أَدْخَلَهُمُ اللَّهُ الْجَنَّةَ بِغَيْرِ عَمَلٍ وَلَا خَيْرٍ قَدْ مَوَّهَ .

فَيَقَالُ انْطَلِقْ مَنْ كَانَ فِي قَلْبِهِ مُتَقَالِ حَبَّةٍ مِنْ بَرَةٍ أَوْ شَعِيرَةٍ مِنْ إِيْمَانٍ فَأَخْرِجْهُ مِنْهَا، نَاظِلِمْ فَأَنْعَلْ ثُمَّ أَرْجِعْ إِلَى رَبِّي تَعَالَى فَأَحْصِدْهُ بِتِلْكَ الْمُحَامِدِ ثُمَّ أَخْرِجْهُ سَاجِدًا فَيَقَالُ لِي يَا مُحَمَّدُ ارْفَعْ رَأْسَكَ وَتَلْ يَسْمَعُ لَكَ، وَرَسْلَ نَعْطَهُ وَاشْفَعْ تَشْفَعُ فَأَقُولُ يَا رَبِّ أُمَّتِي أُمَّتِي، فَيَقَالُ لِي انْطَلِقْ فَمَنْ كَانَ فِي قَلْبِهِ مُتَقَالِ حَبَّةٍ مِنْ خَيْرٍ مِنْ إِيْمَانٍ فَأَخْرِجْهُ مِنْهَا، نَاظِلِمْ فَأَنْعَلْ

ثُمَّ أَعُوذُ إِلَى رَبِّي فَأَحْمَدُهُ بِمَلَكَ الْمَحَامِدِ ثُمَّ
أَخْبَرَهُ سَاجِدًا فَقَالَ لِي يَا مُحَمَّدُ ارْفَعْ رَأْسَكَ
وَلَنْ يَمُوتَ لَكَ وَرَسُولُكَ تَعْطُهُ وَاشْفَعُ تَشْفَعُ فَاَقُولُ يَا
رَبِّ أُمِّي أُمِّي فَقَالَ لِي انْطَلِقْ نَمَنَّكَ فِي
قَلْبِهِ أَذَى أَذَى أَذَى مِنْ مُشْقَالِ حَبَّةٍ مِنْ
خَرْدَلٍ مِنْ إِيْمَانٍ فَأَخْرَجَهُ مِنَ النَّارِ فَأَنْطَلِقُ
فَأَفْعَلُ .

ایمان ہو اس کو جہنم سے نکال لے، میں ایسا ہی کروں گا اور پھر لوٹ کر
اپنے پروردگار کے پاس آؤں گا اور ایسی ہی تعریفیں کروں گا اور بعد سے
میں گرہوں کا، حکم ہوگا اے محمد! اپنا سر اٹھا اور کہہ ہم نہیں گے،
مالک! دیکھئے، سفارش کر قبول کریں گے، میں عرض کروں گا اے میرے
مالک! میری امت میری امت، حکم ہوگا جا اور جس کے دل میں رائی
کے دانے سے جھکم، بہت کم، بہت ہی کم ایمان ہو اس کو جہنم سے
نکال لے، پھر میں جاؤں گا اور ایسا ہی کروں گا۔

هَذَا حَدِيثٌ أَنَسُ بْنُ أَنَسٍ أَنَّهُ قَالَ أَخْرَجَنَا مِنْ عِنْدِهِ فَلَمَّا كُنَّا بَظَهَرِ الْجَبَانِ قُلْنَا لَوْ مَلْنَا إِلَى
الْحَسَنِ نَسَلَمْنَا عَلَيْهِ وَهُوَ مُسْتَخْفٍ فِي دَارِ أَبِي خَلِيفَةَ قَالَ نَدْخُلُنَا عَلَيْهِ فَنَسَلَمُنَا عَلَيْهِ قُلْنَا يَا أَبَا سَعِيدٍ
جِئْنَا مِنْ عِنْدِ أَخِيكَ أَبِي حَمْزَةَ فَلَمْ نَسْمَعْ بِشَيْءٍ مِنْ حَدِيثِ حَدَّثَنَا فِي الشَّفَاعَةِ فَقَالَ هِيَ نَحْدُثُ الشَّاهِدَ
نَقَالَ هِيَ قُلْنَا مَا زِدْنَا قَالَ قَدْ حَدَّثَنَا مِنْ عَشْرِينَ سَنَةً وَهُوَ مِثْلُ جَمِيعٍ وَلَقَدْ تَرَكْتُ شَيْئًا مَا أَدْرِي
أَيُّ الشَّيْءِ أَوْ كَرِهَ أَنْ يَحْدُثَ لَكُمْ فَتَكَلَّمُوا قُلْنَا لَهُ حَدَّثَنَا فَضَحِكُ وَقَالَ خَلَقَ الْإِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ مَا ذَكَرْتُ
لَكُمْ هَذَا إِلَّا وَأَنَا أَرِيدُ أَنْ أَحَدِّثَ لَكُمْهُ قَالَ ثُمَّ رَاجِعْ إِلَى رَبِّي فِي الرَّابِعَةِ فَأَحْمَدُهُ بِمَلَكَ الْمَحَامِدِ ثُمَّ
أَخْبَرَهُ سَاجِدًا فَقَالَ لِي يَا مُحَمَّدُ ارْفَعْ رَأْسَكَ وَتَلْ يَمُوتَ لَكَ وَرَسُولُكَ تَعْطُهُ وَاشْفَعُ تَشْفَعُ فَاَقُولُ يَا رَبِّ
أَذْنُ لِي فِيمَنْ قَالَ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ قَالَ لَيْسَ ذَاكَ لَكَ أَوْ قَالَ لَيْسَ ذَاكَ إِلَيْكَ وَلَكِنْ وَعِزَّتِي وَكِبْرِيَايَ
وَعِزَّتِي وَجَبْرِيَايَ لَا خَرَجْتَ مِنْ قَالَ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ ۱۱

چونکہ ان دونوں حدیثوں کے الفاظ پر کلام کرنا ہے اس لئے ان دونوں روایتوں کا پیش نظر رہنا ضروری تھا۔
حدیث ۱۱۱۱ حیا بالقصر، بارش کو کہتے ہیں، اور چونکہ بارش کے ذریعہ دانے اگتے ہیں اور انھیں زندگی ملتی ہے
اس لئے وہ سب حیا ہے، حیا اور حیا یہاں نہر کا نام ہے، مطلب دونوں کا ایک ہے، بعض نے حیا بالذہن پڑھ لیا ہے

مگر خطاب نے جزا بیان کیا ہے کہ بالقصر صبح ہے اور بالمد کے یہاں کوئی معنی بھی نہیں۔

یہ نیتون انہ مراد اس سے تشبیہ ہے کہ بہت تیزی اور پوری شادابی کے ساتھ اُگے گا۔ حَبَّةُ الْبُکْر، صحرائی تخم۔ حَبَّةُ الْبَاقِعِ عام ہے، حَبَّةُ کی جمع حَبَب ہے اور حَبَّةُ کی جمع حُوب آتی ہے، مشبہہ کو محسوس کرنے کے لئے فرمایا۔ المتر انہ یعنی اس کی رنگت دیکھ کر دیکھنے والے کی طبیعت خوش ہوتی ہے، اسی طرح جہنم کے لوگ بڑھیں گے اور دیکھ کر خوشی ہوگی۔

قال وَهَيْبٌ، یعنی وہیب کی اس روایت میں راوی نے لفظ حیاة بلا شک نقل کیا ہے اور ابوسعید خدریؓ کی روایت میں امام مالک کو شک ہے کہ لفظ حیا بولے یا لفظ حیاة، دوسرا فرق یہ ہے کہ یہاں خَرَدَلٌ مِنْ خَيْرٍ ہے اور ابوسعیدؓ کی روایت میں خَرَدَلٌ مِنْ اِيْمَانٍ ہے۔

اکثر شراح لکھتے ہیں کہ استہاد خردل من ایمان سے ہے کہ اہل ایمان، ایمان میں تفاوت ہیں، شراح کا ذہن اس طرف نہ گیا ہوگا کہ ترجمہ تو تھا تفاضل اهل الايمان في الاعمال کا اور یہاں نکلا فضل نفس ایمان میں، نہ کہ اعمال میں، تو ترجمہ سے ربط نہ رہا۔ یہاں ایک اشکال اس سے بھی بڑا ہے وہ یہ کہ یہاں ترجمہ ہے تفاضل الاعمال کا جس میں ابوسعید خدریؓ کی حدیث بیان کی ہے اور دوسرا اسی کے مشابہ اُگے آ رہا ہے جس کا عنوان ہے باب زيادة الايمان ونقصانه وقول الله تعالى ونزدناهم هدى انہ اور مضمون قریب قریب وہی ہے جو ابوسعید خدریؓ کی روایت کا ہے، اس میں حضرت انسؓ کی روایت یہاں کی گئی ہے جس میں "من خیر" کا لفظ آیا ہے، مگر ابوسعید خدریؓ کی روایت میں "من ایمان" آیا ہے، بظاہر اس کے برعکس ہونا چاہئے تھا کیونکہ ابوسعید خدریؓ کی روایت کا ترجمہ تفاضل اعمال کا تھا، اور خیر کا لفظ اعمال میں اکثر بولا جاتا ہے، اس لئے وہاں "من خیر" لانا چاہئے تھا، اور حضرت انسؓ کی آگے آنے والی روایت میں "من ایمان" ہونا چاہئے اس لئے کہ ترجمہ زیادۃ الايمان ونقصانه قائم کیا ہے، مگر امام بخاری نے برعکس کر دیا جو خلاف ظاہر ہے، اسی کے ساتھ اتنی بات اور یاد رکھو کہ حدیث ابی سعیدؓ میں جو باب کی اصل حدیث ہے گو لفظ "من ایمان" ہے مگر وہیب کی جو روایت تعلقاً بیان کی ہے اس میں "من خیر" ہے اور اسی طرح انسؓ کی روایت میں جو باب کی اصل حدیث ہے "من خیر" کا لفظ ہے اور دوسری روایت میں جو بطور متابعت کے لائے ہیں من ایمان ہے۔ حاصل یہ کہ امام بخاری نے ترتیب یہ رکھی ہے کہ جہاں عنوان باب میں اعمال کا ذکر تھا وہاں تو "من ایمان" والی روایت بیان کی اور "من خیر" والی روایت تعلقاً لائے اور جہاں ایمان کا ذکر تھا وہاں "من خیر" والی حدیث پہلے لائے

اور ثابت میں وہ حدیث لائے جس میں "من ایمان" کا لفظ آیا ہے، حالانکہ بالکل واضح اور صاف ترتیب یہ تھی کہ تفاعلِ اعمال کے ترجمہ میں "من خیر" والی حضرت انسؓ کی روایت لاتے اور زیادہ الایمان، وقفہ کے ترجمہ میں "من ایمان" والی حضرت ابوسمیدہؓ کی روایت درج فرماتے، مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا۔

حافظ دیغہ نے اس پر کلام کرتے ہوئے دونوں ترجموں میں یہ فرق بیان کیا ہے کہ اعمال چونکہ جزو ایمان ہیں اس لئے جب عمل میں کمی بیشی ہوگی تو ایمان میں کمی بیشی ہوگی، مگر اسی کے ساتھ یہ بھی ممکن ہے کہ جس طرح اعمال سے کمی بیشی ہوتی ہے اسی طرح نفس ایمان یعنی تصدیق میں بھی کمی بیشی ہوتی ہو، تو ایک کو یہاں بیان کیا اور دوسرے کو آگے لائے، یہاں مطلعِ نظرِ اعمال میں اور وہاں اعمال سے قطعِ نظر نفسِ تصدیق میں تفاعلِ مقصود ہے، اس طرح ان سرائح نے دونوں حدیثوں کو دونوں ترجموں کے ساتھ تطبیق دینے کی کوشش کی ہے، مگر پھر بھی ہمارے سوالات کامل نہیں ہوا، اس لئے کہ صرف دونوں ترجموں کا فرق بیان کر دیا گیا مگر اس کی وضاحت نہیں کی گئی کہ حدیث کو ترجمہ کے ساتھ کیا مناسبت ہے؟ اسی طرح اس کا حل بھی نہیں نکلا کہ اس حدیث کو وہاں اور دوسری کو یہاں کیوں لائے؟ اس لئے جو بات نقلی بحث ثابت نہیں ہوئے، میں کہتا ہوں کہ یہ اشکالات صرف اس وقت تک ہیں جب تک کہ مفصل حدیث سامنے نہ ہو، میں نے صحیح مسلم کی دونوں حدیثیں اسی لئے پہلے بیان کر دی ہیں، اس کے بعد ان شارِ افتد سلسلہ متعہ ہو جائے گا، بخاری بھی یہ حدیث باب الشفاعۃ میں لائیں گے، مگر صحیح مسلم میں ابوسمیدہؓ کی روایت بہت مفصل ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب اہل ایمان شفاعت کر چکیں گے تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا: سب شفاعت کر چکے، اب صرف ارحم الراحمین باقی رہا، پھر اللہ تعالیٰ جہنم سے ایک ایسی قوم کو نکالے گا جس کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ لَعِیمُوا خِیْرًا قَطًّا یعنی بالکل غل خیر تھا ہی نہیں۔

لَعِیمُوا خِیْرًا قَطًّا سے یہاں اس حدیث میں کیا مراد ہے؟ یہ مراد تو ہو ہی نہیں سکتی کہ ان کے اندر ایمان، بالکل نہیں تھا، کیونکہ نصوص کتاب و سنت شاہد ہیں کہ ایمان کے بغیر خروج عن النار نہیں ہوگا، لہذا یہاں پر کہا جائے گا کہ ایمان کے سوا اور کوئی چیز لازمہ نہ تھی، دوسرے لَعِیمُوا سے عمل جوارح اور عملِ قلب دونوں کی نفی ہے، عمل یہاں عمل جوارح اور عملِ قلب کو عام کر دیا اور دونوں ہی کی نفی کی گئی ہے، اہلِ مشرکین سے بعض کے پاس دونوں طرح کے عمل ہوں گے، عمل جوارح بھی اور عملِ قلب بھی، مگر بعض کے پاس اعمال جوارح تو نہ ہوں گے، مگر ایمان کی حرارت ضرور موجود ہوگی، وہ مبتلائے معاصی محروم ہوں گے مگر ساتھ ہی مذلت و پشیمانی کی کسک بھی محسوس کرتے ہوں گے، تو یہاں اسی طرح کے لوگ مراد ہیں کیونکہ اعمال جوارح والے تو شفاعت و مومنین کے وقت جہنم سے نکالے جا چکے ہوں گے، اب وہی باقی رہ جائیں گے جن کے اعمالِ قلب ہوں گے، اور اعمالِ قلب میں بھی مدارج و مراتب ہیں، بعض مراتب

میں اہل ایمان ان اعمالِ قلب سے واقف ہوں گے اور انھیں وہ اعمال دکھائے جائیں گے اور بعض اعمالِ قلب وہ ہوں گے جو مومنین کو بھی معلوم ہوں گے ' تو اب ابوسعیدؓ کی روایت میں تین قسم کے لوگ ہوئے ، اولیٰ اعمالِ جوارح والے ، دوم وہ اعمالِ قلب والے جن کے اعمالِ قلب اہل ایمان کو بتلائے جائیں گے ، ان دونوں قسموں کے لوگ شفاعتِ مومنین سے نکال لئے جائیں گے ، تیسری قسم اعمالِ قلب والوں کی وہ ہوگی جن کے اعمالِ قلب پر صرف ربِّ العالمین مطلع ہوگا اس لئے انھیں اللہ ہی نکلے گا ، یہ وہ گروہ ہوگا جن کے دل میں ایمان کے علاوہ عملِ قلب کے آثار میں سے کچھ نہ ہوگا ، بس یہ گروہ صرف خدا کی رحمت سے نکلے گا — چنانچہ مسلم کی دوسری حدیث میں ہے 'بَغِيضٌ عَمَلٌ يَمْلُوكُهُ وَلَا يَخْدُرُ قَدَمُوهُ' یعنی نہ عملِ جوارح تھا نہ عملِ قلب ۔

دوسری روایت انسؓ ابن مالک کی دو تین صفحے کے بعد ہے جو پہلے آپکی ہے اسے پڑھو ، اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کا مفصل بیان ہے ، حضورؐ فرماتے ہیں :

روزِ محشر میں جب لوگ بے چین ہو کر شفاعت کی خاطر حضرت آدمؑ و ابراہیمؑ و موسیٰؑ و عیسیٰؑ علیہم السلام کے پاس سے مایوس ہو کر میرے پاس آئیں گے تو میں اسے منظور کروں گا اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہو کر اجازت چاہوں گا اور جب اجازت مل جائے گی تو پہلے میں اس کے سامنے کھڑے ہو کر اس کے حامد ایسے الفاظ اور ایسے طرق سے بیان کروں گا کہ آج اس دنیا میں اس پر قدرت نہیں ، وہ الفاظ اور وہ انداز بیان مجھے اسی وقت خاص طور پر افشاء کئے جائیں گے (" الْمَحَامِدُ مَجْمُوعَةٌ ") خلافِ تیاس جیسے " مَحَاسِنُ " جمع " حُسْنُ " کی — یا جمع " مُحَمَّدٌ " کی (پھر میں اس کے سامنے سجدے میں گر جاؤں گا) اور سجدہ میں پڑا رہوں گا جب تک اللہ چاہے گا کہ کافی (روایت) پھر حکم ہوگا : اے محمدؐ ! اپنا سر سجدے سے اٹھاؤ اور کہو جو کہنا چاہتے ہو ، تمھاری بات سنی جائے گی اور مانگو تمھیں دیا جائے گا ، اور شفاعت کرو تمھاری شفاعت قبول کی جائے گی ، تو میں عرض کروں گا : اے رب ! میری امت میری امت (یعنی میری امت کو بخش دیجئے) تو مجھ سے کہا جائیگا جاؤ ! تم کو اجازت ہے جس کے دل میں گہوں یا جو کے برابر بھی ایمان ہو اس کو جہنم سے نکال لاؤ (دوسری روایت میں ہے فیصلۃً لِّی حَسْبًا) یعنی لیک حد بتادی جائے گی کہ اس قسم کے لوگ نکال لاؤ) میں جاؤں گا اور جہنم سے اس حد تک کے لوگوں کو نکال لاؤں گا پھر دوبارہ دربارِ الہی میں حاضر ہوں گا پھر انھیں حامد کو بیان کروں گا اور سجدہ میں گر جاؤں گا ، پھر حکم ہوگا : اے محمدؐ ! سر اٹھاؤ کہو تمھاری بات سنی جائے گی ، سوال کرو ، پورا کیا جائے گا ، شفاعت کرو قبول کی جائے گی ، تو میں عرض کروں گا یا رب ! امتی امتی ، تب حکم ہوگا جاؤ جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان ہو ، جہنم سے نکال لاؤ ، میں جاؤں گا اور اس

علم ہوگا جاؤ جن کو تم پہچانتے ہو نکال لاؤ، تو وہاں اعمال کا ذکر تھا اور یہاں اعمال کا ذکر نہیں ہے بلکہ ایمان کا ذکر ہے، اس لئے ترتیب میں اس حدیث کو اس حدیث کے بعد رکھو کیونکہ ایک تو اعمال جوارح ہیں جن کا ذکر وہاں ہے، اور ایک اعمال قلب ہیں، اور ان میں بھی تفاوت ہے جیسے بیاض شدید و بیاض ضعیف اور سواد شدید و سواد ضعیف، تو غالباً انسؓ کی روایت میں نفس ایمان کی کمی بیشی اور تفاضل اور قوت و ضعف کا ذکر ہے اور ان میں سے آخری درجہ وہ ہے کہ پیغمبر علیہ السلام کے دل میں بھی یہ خیال نہ ہوگا کہ اب بھی ایسا کوئی شخص قیہ کیا ہے جس میں ایمان ہو، یعنی ظاہر ان میں ایمان نہ ہوگا مگر قلب میں اس قدر خفیف ایمان موجود ہوگا جس کا احساس نبی علیہ السلام کو نہ ہوگا لیکن بایں ہمہ حضورؐ و فررمت کی وجہ سے اللہ سے عرض کریں گے کہ خداوند! جو لوگ خالی عن التصدیق والکذب ہیں اور جو صرف زبان سے ایمان کا اظہار کرتے تھے ان کی مغفرت کی بھی اجازت ہو تو ان کی بابت حق تعالیٰ فرمائے گا کہ یہ تمہارا حق نہیں ہے کیونکہ تمہیں وہیں تک حق ہے جہاں تک تمہارا علم ہے اور بظاہر نبی کو اس کا علم نہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ تم اس کے مقدار نہیں ہو۔ یہ میری تشریح ہے، البتہ شرح کہتے ہیں کہ یہ تعلقات ایمان کے مراتب ہیں نہ کہ نفس ایمان کے، تم خواہ کوئی معنی لو، نفس ایمان کے مراتب کو، یا تعلقات ایمان کے، بہر حال وہ ایمان کے مراتب نہیں، اس لئے کہ حدیث میں اعمال جوارح کے مراتب ہیں اور یہاں اعمال قلب کے اب دونوں کے طائفے سے ترتیب ملے ہوگی کہ پہلے اعمال جوارح والے نکالے جائیں گے پھر اعمال قلب والے، پھر وہ لوگ جن کے قلوب میں سوائے نفس ایمان کے اور کچھ نہ ہوگا جن کے متعلق اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ انہیں میں اپنی رحمت سے بخشوں گا، کسی کی شفاعت ان کے حق میں قبول نہ ہوگی، اس تقریر و تشریح کے بعد بخاری کی حدیث دیکھو۔

جب یہ معلوم ہو گیا کہ حدیث ابو سعید میں اعمال کا ذکر ہے تو اب من ایمان سے مراد نفس ایمان کے مراتب نہیں بلکہ عمل خیر کے مراتب ہیں، اسی لئے بخاری نے اشارہ کیا کہ حبیب کہتے ہیں من خیر لہذا یہاں ایمان مراد تو، بلکہ من خیر مراد لو، یعنی عمل، مگر عمل قلب، اور انسؓ کی روایت میں عمل قلوب کا ذکر ہے، تو اگرچہ لفظ من خیر آیا ہے مگر مراد دوسری روایت لاکر بتلادیا کہ خیر سے مراد یہاں ایمان ہے، اور جب ایمان مراد ہوا تو کمی بیشی نفس ایمان میں ہوئی لہذا اب مناسبت ہوگئی، یہ شاہ صاحب کی تقریر ہے اور بہترین تقریر ہے، اس کے ساتھ آنا اور اضافہ کر لو کہ ابوسعیدؓ کی روایت میں ہے کہ بعض نصف السائقین تک اور بعض ربعین تک تار میں ہوں گے، اس سے معلوم ہوا کہ اعمال جوارح میں بھی تفاوت ہوگا۔ سزا کا تفاوت اس پر صراحۃً وال ہے، اگر اعمال میں تفاوت نہ ہوتا تو سزا میں بھی تفاوت نہ ہوتا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے عمل و حکمت کے خلاف ہے یہ امر کہ غیر مستحق کو بھی ایک ہی قسم کی سزا دی جائے، تو اب ہر جگہ تفاوت ہوا، اعمال جوارح کا تفاوت ہوا اور اعمال قلوب کا بھی اور نفس ایمان میں بھی تفاوت ہوا، شرح کہتے ہیں کہ تفاوت آثار میں ہے، میں کہتا

ہوں کہ تفاوت نفس ایمان میں بھی ہے۔

بسا اوقات بخاری لفظ ایسا لاتے ہیں کہ مناسبت ترجمہ سے نہیں ہوتی، تو شرع کہہ دیتے ہیں کہ مناسبت نہیں، مگر بخاری چونکہ وسیع النظر ہیں اس لئے صرف اشارہ کر کے چھوڑ دیتے ہیں تاکہ تم دیگر طرق پر نظر رکھو اور تلاش کر کے ان تمام روایات کو جمع کرو، پھر مناسبت پر غور کرو تو ضرور مناسبت نکل آئے گی، چنانچہ یہاں بھی دوسرے طرق جمع کرنے سے مناسبت نکل آئی اور دونوں بابوں کا مطلب بھی خوب عہدہ صل ہو گیا، یہ بھی معلوم ہو گیا کہ نفس تصدیق میں بھی تفاوت ہے، ہاں تصدیق معنی میں بیشک تفاوت نہیں، اس کی مثال میں ایک حدیث مسلم کی ہے: **مَنْ رَأَى مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ يَدًا فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهِ فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهِ وَذَلِكَ أَضْعَفُ الْإِيمَانِ** — دوسری روایت میں ہے: **فَمَنْ جَاهَدَهُمْ يَدًا ۖ فَهُمْ مُؤْمِنٌ ۖ وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِلِسَانِهِ فَهُمْ مُؤْمِنٌ ۖ وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِقَلْبِهِ فَهُمْ مُؤْمِنٌ ۖ وَلَيْسَ ذَٰلِكَ مِنَ الْإِيمَانِ حَبَّةُ خَرْدَلٍ**، تو تغیر بالقلب کے کیا معنی ہیں شرعاً لکھ دیتے ہیں کہ دل سے برا سمجھ، مگر یہ تو شخص سمجھا ہی ہے، اس میں تغیر کیا ہوا، برا سمجھنا تو عقیدہ ہوا اور تغیر کا مطلب تو یہ ہے کہ اسے بدلے، نیز لفظ جاهد اس پر صراحۃً دل ہے، محققین لکھتے ہیں کہ یہ مطلب نہیں کہ بس دل سے برا سمجھ بلکہ مطلب یہ ہے کہ ہر وقت فکر میں لگا رہے اور کوشش کرتا رہے اور صرف ہمت کرے کہ جس طرح بھی ممکن ہو اسے بدل دوں گا اور ضرور اس کا استیصال کروں گا تو یہ مجاہدہ بالقلب اور تغیر بالقلب ہے، ملا علی قاری نے مرقاۃ میں لکھا ہے کہ بقلب سے مراد یہ ہے کہ اس فکر میں رہے کہ اگر قادر ہوں گا تو ضرور بدلوں گا، یہ پہلے دل میں میرے گذرنا تھا، بہت دنوں بعد مبسوط شمس الائمہ شرحی میں دیکھا کہ **ذَٰلِكَ** اَدْنٰی الْإِيمَانِ کی تشریح کی ہے **”وَذَٰلِكَ أَضْعَفُ الْإِيمَانِ“** سے، یعنی ایمان کے اثرات میں ضعیف تر اثر ہے، یہ درجہ معلوم ہو کہ دل سے تغیر ادنیٰ آثار ایمان سے ہے، اس لفظ نے بصیرت پیدا کر دی کہ جس طرح یہاں آثار مراد ہیں، یہی انس ابن مالک کی حدیث میں بھی مراد لے لو، مگر جس کے دل میں ادنیٰ آثار ایمان بھی نہیں اور غرض نفس ایمان ہے اس کے بارے میں کسی کی بھی حتیٰ کہ محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی شفاعت قبول نہیں ہوگی، صرف اللہ انھیں جہنم سے نکالے گا — الحمد للہ مسئلہ بالکل منقطع ہو گیا۔

(۱) باب تفاضل الایمان اور باب زیادۃ الایمان وفضانہ۔

اور اگر بالفرض ہو بھی تو ہم کہیں گے کہ خاص اعتبار سے یہ دکھلایا گیا ہے اور وہ یہ کہ فتوحات وغیرہ ان کے دور میں اتنی زیادہ ہوئیں کہ کسی دور میں اتنی زیادہ نہیں ہوئیں اسی طرح اور ظاہری فائدے جس قدر ان سے پہنچنے کی سے نہیں پہنچنے، تو فی نفسہ اپنے کمالات خصوصاً کے اعتبار سے ابوبکر ہی افضل الائمہ ہیں جیسا کہ امت کا اس پر اجماع ہے مگر ظاہری طور پر علیہ عمر فاروق ہی کے دور میں ہوا، ابوبکر رضی اللہ عنہ کا زمانہ زمین ہموار کرنے کا تھا، انھوں نے سارے کلام کا نقشہ بنایا، پورا منصوبہ انھیں کا بنایا ہوا تھا، فیض نبویؐ نے انھیں نمونہ نبیؐ بنا دیا تھا۔

صلح حدیبیہ میں عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے نبی علیہ السلام سے دب کر صلح کر کے وقت عرض کیا تھا: اَلَسْنَا عَلَى الْحَقِّ وَهُمْ عَلَى الْبَاطِل؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں فرمایا: بیشک ہم حق پر ہیں اور وہ باطل پر مگر میں اللہ کا نبی ہوں، اس کی نافرمانی نہیں کر سکتا، حضرت عمرؓ نے یہ جواب پا کر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر ہوئے تو انھوں نے بھی بالکل وہی جواب دیا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا تھا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عکس نبوی تھے جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مَا صَبَّ اللَّهُ فِي قَلْبِي صَبْتٌ فِي قَلْبِ ابْنِ بَكْرٍ جو چیزیں اللہ نے میرے قلب میں الفتا فرمائیں میں نے وہ ابوبکرؓ کے قلب میں ڈال دیں — جیسا اس ارشاد کے ردائے کرنے کے سلسلہ میں جو استقلال حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ظاہر فرمایا اس پر تو عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو بھی رشک ہوتا تھا، لہذا افضل واقفیٰ تو [ابوبکرؓ] ہی ہیں، ہاں عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں فتوحات زیادہ ہوئیں مگر وہ بھی نقشہ ابوبکرؓ کے مطابق، لہذا اصل کا زمانہ تو انھیں کا تھا کہ راستہ صاف کر دیا، پھر انھیں وقت بہت کم ملا، اور جو ملا بھی تو اس میں مرتدین کا استیصال کیا، مدعیان نبوت کا مقابلہ کر کے اس فتنہ کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا، رومیوں کے باقاعدہ لشکر روانہ کیا، جب راستے کے کانٹے دور ہو گئے تو عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں کثرت فتوحات، انشاء السلام اور کمال دین ظاہر ہوا، اور یہی حدیث کا منشا ہے۔

”جرح فیص علی الارض“ سے اشارہ ہے کہ دین ان کے زمانہ میں روئے زمین پر پھیلے گا، یہ ایک جزئی فضیلت ہوئی — (مزید سمجھنے کے لئے وہ حدیث پڑھو جس میں فرمایا گیا ہے کہ قیامت کے دن موزنین کو نورانی ممبروں پر بٹھایا جائے گا)

باب ۱۶ الحیاء من الایمان

(یا شرم) ایمان کا ایک جزو ہے

۲۳۔ حَدَّثَنَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ يُوسُفَ قَالَ أَخْبَرَنَا مَالِكُ بْنُ أَنَسٍ عَنْ

ہم سے بیان کیا عبد اللہ بن یوسف نے کہا ہم کو خبر دی امام مالک ابن انس نے انہوں نے

ابن شہاب عن سالم بن عبد اللہ عن ابيه ان رسول الله صلى الله عليه

ابن شہاب سے انہوں نے سالم ابن عبد اللہ سے انہوں نے اپنے باپ (عبد اللہ ابن عمر) سے کہ آنحضرت صلی اللہ

وسلم مرَّ على رجلٍ من الأنصار وهو يعظ أخاه في الحياء فقال رسول الله

علیہ وسلم ایک انصاری مرد پر گذرے اور وہ اپنے بھائی کو سمجھا رہا تھا اتنی شرم کیوں کرتا ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے

صلى الله عليه وسلم دَعَاهُ فَإِنَّ الْحَيَاءَ مِنَ الْإِيمَانِ

اس سے فرمایا، جانے دے، کیونکہ شرم تو ایمان میں داخل ہے۔

باب الحياء من الایمان

حدیث ۲۳۔ حیاء شگ اچھی چیز ہے، ہاں اگر مانع عن التفتہ ہو تو مضر ہے، حیاء شرمی خیر ہی خیر ہے، اگر اس میں شر آئے ہے تو

عواض اور غارجی اشیاء سے، پیسے، ہتھیار فی مددات اچھی چیز ہے مگر کوئی شخص اس سے کسی کا تقی شہید کر دے تو یہی اچھی چیز اس عارض کی بنا پر

بری ہو جائے گی، امر مباح میں حیاء باب مروت سے ہے اور اس میں حیاء کرنی چاہئے کیونکہ وہ ایک اچھی چیز ہے، شریعت جس چیز کو منع کرتی ہو

مومن کے لئے اس میں حیاء اعلیٰ دار فسخ ہے، ضرور کرنا چاہئے اور کبھی اس بیع کا ارتکاب نہ کرنا چاہئے، ہاں جسے عرف برا سمجھے اور شریعت اچھا

سمجھے تو پھر وہاں حیاء نہ کرنی چاہئے، بات شریعت ہی کی اور جی رہے گی مہیا کہ حدیث میں انصاری عورتوں کی تعریف فرمائی کہ یہ بہت اچھی

عورتیں ہیں کیونکہ حیاء انھیں دین سیکھنے سے نہیں روکتی۔

امام راغب نے لکھا ہے کہ چار کب ہے عین اور عفت سے۔ آگے لکھے ہیں کہ حیاء اور کبھی فاسق نہ ہوگا کیونکہ عفت کے خلاف ہے اور شجاعت بہت کم

مستحبی ہوتا ہے کیونکہ شجاعت میں ایک جزو جس کی کمی ہے اسلئے حیاء ہادی کو کم کر دیتی ہے اور چونکہ حیاء کا ایک جزو عفت ہے اس لئے حیاء دار

میں فتنہ نہ ہوگا، عبد اللہ ابن مسعود کی ایک روایت میں بہت شافی بیان ہے، فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو مخاطب

کرتے ہوئے فرمایا: اسْتَحْيُوا مِنْ اللَّهِ حَقَّ الْحَيَاءِ اللہ سے ایسی حیاء کرو جیسی کرنی چاہئے، صحابہ نے عرض کیا: اِنَّا اسْتَحْيِي

مِنَ اللّٰهِ يَا رَسُولَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ اے اللہ کے محبوب اللہ کا شکر ہے ہم اللہ سے حیاء کرتے ہیں، آپ نے فرمایا لَيْسَ ذَٰلِكَ

یہ نہیں، یعنی جس کو تم نے حیا کرنا سمجھا ہے وہ مراد نہیں ہے، حیا کا مفہوم بہت وسیع ہے، پھر نبی علیہ السلام نے خود ہی وضاحت فرمائی:

وَكَيْفَ الْإِسْتِحْيَاءُ مِنَ اللَّهِ حَقَّ الْحَيَاءِ أَنْ تَحْفَظَ الرَّأْسَ وَمَا وَجْهُهُ، اللہ سے حیا کرنے کا حق یہ ہے کہ سر اور سر میں جو کچھ انکار خیالات وغیرہ ہوں ان سب کی نگہداشت کرو، کوئی برائیاں اور کوئی غیر حق اس میں جگہ نہ پائے، برے خیالات سے دماغ و ذہن ہمیشہ صاف رہیں وَالْبَطْنَ وَمَا حَوِیْ، اور پیٹ کی اور جو کچھ پیٹ میں بھرا ہے اس کی نگرانی کرو، یعنی حرام و ناجائز غذا سے پوری طرح پرہیز کرو (کیونکہ جو بدن حرام غذا سے پلتا ہے وہ جہنم کے لائق ہوتا ہے، اس لئے اس سے پوری طرح پرہیز) وَتَذَكُّرُ الْمَوْتِ وَالْبَلَى، اور موت اور موت کے بعد قبر میں جو حالت ہوتی ہے اس کو یاد کرو، موت ہمیشہ سامنے ہے اور سمجھتا رہے کہ مرنے کے بعد قبر آخرت کی پہلی منزل ہے، اسے بنانے کی نگر میں لگا رہے، آگے ایک اصول بتایا کہ حیا کا حق کون ادا کر سکتا ہے، فرمایا: وَمَنْ أَسَادَ الْآخِرَةَ تَرَكَ نَيْبَةَ الدُّنْيَا وَآثَرَ الْآخِرَةِ عَلَى الْأُولَى، اور جو شخص آخرت کا طلبگار ہو گا وہ دنیا کی زیب و زینت سے غلغلہ رہے گا اور اس چند روزہ دنیوی عیش کی زندگی کے مقابلہ میں آنے والی زندگی کی کامیابی کو اپنے لئے پسند کرے گا اور اسی کو ترجیح دے گا، پھر فرمایا: فَمَنْ يَعْمَلْ ذَلِكَ فَقَدْ اسْتَحْيَى مِنَ اللَّهِ حَقَّ الْحَيَاءِ پس جس نے یہ سب کچھ کر لیا اس نے اللہ سے حیا کرنے کا حق ادا کر لیا، اس حدیث نے بتایا کہ حیا کا مفہوم کس قدر وسیع ہے اور کیوں اسے الْحَيَاءُ مِنَ الْإِيمَانِ سے تعبیر فرمایا، اب جو آدمی دنیا کا طالب ہے فکر آخرت سے اس کا دماغ نکالی ہے، دنیا کی زندگی بنانے میں مرنے کے بعد والی زندگی کا بناؤ اور بگاڑ اس کے سامنے نہیں، تو زبانی جمع خرچ کتنا ہی کرے وہ اللہ سے حیا کرنے کا حق ادا کرنے والا نہیں ہو سکتا، یہی حقیقت دوسری جگہ یوں بیان فرمائی: اِنْ لَا يِرَاكُ مَوْلَاكَ حَيْثُ نَهَاكَ تَعَارَا أَفَا تَكُمُ اَوْ اس مقام نہ دیکھ جہاں موجود ہونے سے اس نے منع کیا ہے، وہاں ہرگز قدم نہ جائیں جہاں جانا رب تعالیٰ کو پسند نہ ہو، اسی طرح پوری زندگی گذرے اور ہمیشہ منوعات و منہیات سے دور بھاگے — یہ ہے اللہ سے حیا کرنا، راغب نے توحیا کی تعریف کی تھی انقباض النفس عن القبلیہ، بری بات سے نفس کا انقباض ہونا چاہیے، دوسری تعریف یہ کی گئی: هُوَ انقباض النفس خشية ارتكاب ما يكره اعم من ان يكون شوعياً او عقلياً او عرْفياً، مکروہ کے ارتکاب کے خوف سے نفس کا رک جانا، چاہے وہ شرعی ہو یا عقلی ہو یا عرفی، اب اگر مکروہ شرعی کا مرتکب ہوتا ہے تو وہ فاسق کہلائے گا اور مکروہ عقلی میں پڑتا ہے تو مجنون اور پاگل کہلائے گا اور اگر عرفی مکروہ میں پڑے گا تو وہ ابلہ اور بے وقوف کہلائے گا، اس سے معلوم ہوا کہ حیا ہر حال میں بہتر ہے جیسا کہ حدیث میں ہے الْحَيَاءُ خَيْرٌ كُلِّهِ

باب فان تابوا واقاموا الصلوة واؤا الزکوة فخلوا سبیلهم

اس آیت کی تفسیر میں کہ پھر اگر وہ توبہ کریں اور نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں تو ان کا راستہ چھڑ دو۔

۲۴ — حَدَّثَنَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ مُحَمَّدٍ الْمُسَدِّقِيُّ قَالَ حَدَّثَنَا أَبُو مَرْوَجٍ الْحَرَوِيُّ

ہم سے بیان کیا عبداللہ ابن محمد نے کہا ہم سے بیان کیا ابو مروج بن عمارہ نے کہا ہم سے بیان کیا شعبہ نے انھوں نے

ابن عمارۃ قَالَ حَدَّثَنَا شُعْبَةُ بْنُ وَقْدٍ بْنُ مُحَمَّدٍ قَالَ سَمِعْتُ ابْنَ مُحَدَّثٍ

واقہ ابن محمد سے انھوں نے اپنے باپ سے کہہ سنا کہ وہ عبداللہ ابن عمر سے نقل کرتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

عَنِ ابْنِ عُمَرَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ أَمَرْتُ أَنْ أَقَاتِلَ النَّاسَ

نے ہندو یا مجھے (خدا کا) حکم ہوا ہے کہ لوگوں سے (کافروں سے) اس وقت تک لڑوں جب تک یہ گواہی نہ دیں کہ اللہ کے

حَتَّى يَشْهَدُوا أَنَّ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللَّهِ وَيَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَيُؤْتُوا الزَّكَاةَ

سوا کوئی پکا خدا نہیں ہے اور محمد اس کے رسول ہیں اور نماز درستی سے ادا کریں اور زکوٰۃ دیں جب وہ یہ کرنے لگیں تو

فَإِذَا فَعَلُوا ذَلِكَ عَصَمُوا مِنِّي دِمَاءَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ إِلَّا بَحْثَ الْإِسْلَامِ وَحِسَابُهُمْ عَلَى اللَّهِ

انھوں نے اپنی جانوں اور مالوں کو مجھ سے بچا لیا مگر اسلام کے حق سے اور ان (کے دل کی باتوں) کا حساب اللہ پر رہے گا۔

باب فان تابوا واقاموا الصلوة واؤا الزکوة فخلوا سبیلهم

شرک کی توبہ یہی ہے کہ ایمان لے آئے اور اقامت صلوٰۃ بھی کرے اور زکوٰۃ بھی دے، اگر مشرک یہ طریقہ اختیار کرے

تو حکم ہے: فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ، اس کا راستہ چھڑ دو، اس سے تعرض نہ کرو۔ چند آیات کے بعد یہ مضمون ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ فِي الدِّينِ اگر وہ توبہ کریں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو وہ

تمہارے دینی بھائی ہیں، امام بخاری نے ان آیتوں کی تفسیر حدیث سے بیان کر دی کیونکہ دونوں کا مضمون ایک ہے، مذکورہ آیت میں

جن تین چیزوں کا بیان ہے وہ تین چیزیں حدیث میں بھی مذکور ہیں اور یہی ان میں وجہ مناسبت ہے۔

الاحتمی الاسلام فرما کر بتا دیا کہ مومن ہونے کے بعد بھی اگر کوئی شخص اسلامی قانون توڑنے کا مرتکب ہوگا تو اس کے خلاف

کارروائی کی جائے گی، مسلمان کو بھی قانون شکنی کی اجازت نہیں دی جائے گی، مثلاً کسی کو تصدق اقل کر دیا تو اس سے قصاص لیا جائیگا

یادیت لی جائے گی، اسی طرح کسی نے اگر زکوٰۃ زدی تو اس سے بھی مطالبہ کیا جائے گا، ہاں اب اسے کافر نہ کہا جائے گا۔

قولہ وحسبہم علی اللہ کہہ کر یہ بتلایا کہ جو آدمی شہادت دے اور نماز پڑھے، زکوٰۃ دے، تو ہم اس کے باطن کی تفتیش نہ کریں گے، ظاہر حال پر قناعت کر کے اسے مسلم قرار دیں گے، اس کی تجویز کریں گے کہ یہ دل سے مسلمان ہوا ہے یا نہیں، یہ ہم اللہ کے حوالہ کر دیں گے (ہاں اگر دلائل و شواہد سے وہ اپنے اس اعلان و اقرار میں جھوٹا ثابت ہوگا تو اب معاملہ دوسرا ہوگا) یہی فقہاء کا مسلک ہے کہ ظاہر پر معاملہ کیا جائے گا، باطن اللہ کے حوالہ کر دیا جائے گا، اب یہاں دو چیزیں بیان کرنے کی ہیں، پہلی بات یہ ہے کہ عصمت دم و عصمت مال کو تین چیزوں پر مرتب کیا گیا ہے، اگر ان میں سے کوئی چیز فوت ہو جائے گا تو وہ معصوم نہ رہے گا اور اس کے ساتھ قتل مباح ہوگا، وہ تین چیزیں یہ ہیں: ادائے شہادت، اقامت صلوٰۃ، ایثار زکوٰۃ، اب اشکال یہ ہے کہ ایک معاملہ یا ذاتی کادم و مال بھی محفوظ ہے، اسی طرح مودی چیز کا بھی دم محفوظ ہے، حالانکہ وہ نماز پڑھیں نہ زکوٰۃ دیں اور یہ سب مبنی معاملہ مذوی اور جزیہ دینے والے شہادت سے بھی خالی ہیں تو جو شرطیں معصوم ہونے کی تھیں وہ بالکل نہیں پائی جاتیں پھر بھی معصوم قرار دے جاتے ہیں یہ اشکال کا خلاصہ ہے، حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں اس کے پانچ جھجہ جواب دے ہیں، ایک یہ کہ یہ آیت پہلے کی ہے اور حکم جزیہ بعد کا ہے، دوسرے جواب میں فرمایا کہ اس فرمان کی مراد یہ ہے کہ جان و مال اس شخص کا محفوظ ہے جو یہ تین کام کرے یا ان تین کام کرنے والوں کے سامنے ایسا منقاد ہو جائے کہ ان کا حکم بن جائے اور ان کی اتنی قبول کرے، مثلاً معاملہ کرے یا جزیہ دے، خلاصہ یہ کہ اسلام کے سنا گردن نہ اٹھائے بلکہ اس کے ناستے جھکا رہے تو وہ بھی معصوم المال و لہم ہو جائے گا، میرے نزدیک یہی جواب بہتر ہے۔
واللہ اعلم۔

دوسری بات اقامت صلوٰۃ کے بارے میں بیان کرنے کی ہے، حدیث بالا سے معلوم ہوا کہ جو شخص مومن تارک صلوٰۃ ہے اس کا قتل مباح ہے، کیونکہ معصوم ہونے کے لئے جس مجموعہ کی ضرورت تھی وہ مجموعہ اب نہ رہا تو معصومیت بھی نہ رہی، چنانچہ تین امام یعنی امام احمد، امام شافعی، امام مالک کہتے ہیں کہ تارک صلوٰۃ معصوم نہیں بلکہ اس کا قتل واجب ہے، آگے کچھ اور تفصیل بھی ہے کہ امام احمد کہتے ہیں کہ ایسا شخص مرتد ہو جاتا ہے اور مرتد چونکہ واجب اقتل ہے اس لئے قتل ارتداد و کفر ہوا، اور اس کا نکاح بھی باطل ہو جائے گا اور میراث سے بھی محروم ہوگا، اور امام شافعی و امام مالک کہتے ہیں کہ قتل تو کیا جائے گا مگر یہ قتل حد ہے نہ کہ ارتداد، اس لئے کہ یہ مرتد نہیں کیونکہ خود نہیں پایا گیا، صرف تارک عمل ہے، ہاں اگر فرضیت صلوٰۃ ہی کا انکار کرنے لگے تو بیشک اب یہ قتل ارتداد و کفر ہوگا، ورنہ ایک حد شرعی کے تحت اسے قتل کر دیا جائے گا اور اس وقت یہ نہ میراث سے محروم ہوگا اور نہ اس کا نکاح باطل ہوگا۔

امام اعظم ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ تاک صلوٰۃ نہ کافر ہے نہ واجب اقل اس لئے وہ تعزیر کا مستحق ہے 'امیر کو اس کا مارنا' باندھنا 'تیک کر مناسب جائز ہے اسے مختلف قسم کی سزائیں دی جائیں گی اور اتنا ستایا جائے گا کہ وہ نماز پڑھنے پر مجبور ہو جائے 'ابن عابدین نے تو امام صاحب کا مذہب یہ نقل کیا ہے کہ یہ سب اس وقت تک کیا جائے گا حتیٰ یتوب اور یحوت ' یہاں تک کہ توبہ کرے یا مرنے لے۔

اگر لڑکے اتباع اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں، اگر حق یہ ہے کہ اس حدیث سے یہ استدلال بالکل غیر صحیح ہے، اگر میں خود امام شافعیؒ سے یہ رد نہ قول ہے، چنانچہ ایک بہت بڑے شافعی عالم شیخ نقی الدین ابن دقین العید جو پہلے مالکی تھے، بعد میں شافعی ہو گئے تھے، شرح عمدہ میں لکھتے ہیں: ایسی دلیلوں سے استدلال علی اقل غلطی ہے، کیونکہ قتال اور قتل دو الگ الگ چیزیں ہیں، قتال کے معنی لڑائی کرنے کے ہیں، مار ڈالنے کے نہیں ہیں، اور قتل کے معنی مار ڈالنے کے ہیں، اور حدیث میں قتال آیا ہے اس کو قتل کے معنی میں نہیں لیا جاسکتا اس کا بہترین شاہد حدیث کے وہ الفاظ ہیں جو سترہ کے باب میں فرمائے گئے، فلیقاتل فانہ شیطان، ظاہر ہے یہاں قتال سے مار ڈالنا مراد نہیں بلکہ صرف دین کر نامزد ہے، الفاظ حدیث یہ ہیں: اذ اکان احدکم یصلی فلا یدع احداً ابین یدیه و لیدلہما الاستطاح فان ابی فلیقاتلہ فانہ شیطان (۱) (جب تم میں سے کوئی نماز پڑھے تو کسی کو اپنے سامنے سے گھڑنے نہ دے اور جس قدر ممکن ہو اس کو دفع کرے اور روکے، پھر بھی اگر وہ نہ مانے اور گزرنے ہی پر اڑ جائے تو اس سے قتال کرے کیونکہ وہ شیطان ہے، ذکر ایک نمازی کو خراب کرنے کے درپے ہے) صاف ظاہر ہے کہ یہاں قتال سے قتل مراد نہیں ہے اور اسی طرح اُصْرَتْ اَنْ اُقَاتِلَ سے بھی مراد قتال ہے نہ کہ قتل، تو تبارک صلوٰۃ کا قتل کرنا اس حدیث سے نہیں ثابت ہوتا، اس بنا پر تبارک صلوٰۃ کے قتل پر اس حدیث سے استدلال درست نہیں — دوسری دلیل قرآن میں ہے: وَ اِنْ طَائِفَتَيْنِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اُفْتَلَتْ وَ اَوْصِلَتْ اِلَیْہِمَا (۲) (اگر ایمان والے دو گروہ آپس میں لڑنے لگیں تو تم صلح کرادو) یہاں قتل مراد نہیں، قتل ہوا تھا، اسی آیت میں آگے ہے: فَلَنْ یُبَغْضَ اِحْدَاهُمَا عَلٰی الْاُخْرٰی فَقَاتِلُوا الَّتِیْ تَبْغِیْ حَتّٰی یَفِیْقُوْا اِلٰی اَمْرِ اللّٰہِ (۳) (اگر ان میں سے ایک دوسرے پر زیادتی کرنے لگے تو تم اے مسلمانو! اس زیادتی کرنے والے سے قتال کرو، یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم پر اپٹ آئے) یہاں قتال سے قتل ہرگز مراد نہیں، اسی طرح تبارک صلوٰۃ سے قتال تو ہوگا مگر قتل نہ ہوگا، چنانچہ بیہقی نے امام شافعیؒ کا قول نقل کیا ہے کہ لیس القتال من القتل بسبیل فقد یجوز قتال الرجل بجلد یجوز قتله یعنی لڑا حال ہے قتل کا حال نہیں، طرح شد سترہ کی لڑا حال قتل حال نہیں، اب حاصل یہ ہوا کہ تبارک صلوٰۃ سے لڑیں گے، قتال کریں گے، اگر کسی بستی والے

متفقہ طور پر نماز چھوڑ دیں تو امام ان سے قتال کرے گا، اس کے تعلق امام عظمؑ سے کوئی تصریح نہیں ملی، مگر امام محمدؑ سے منقول ہے کہ اگر کسی والے اذان چھوڑ دیں تو امام وقت ان سے قتال کرے گا۔ اسی طرح تارک خفتہ سے بھی امام وقت قتال کرے گا، جب اذان و خفتہ جیسے امور میں جو نماز کے مقابل میں ادنیٰ درجہ رکھتے ہیں، یہ حکم ہے تو اعلیٰ میں بطریق کوئی ہوگا۔ غلام یہ کہ تارک صلوٰۃ کا قتل اس حدیث سے نہیں نکلتا۔

دوسرا قرینہ یہاں عدم قتل کا یہ ہے جس کا خصم کے پاس کوئی جواب نہیں ہے کہ آگے حدیث میں دِقْوَالِ الزَّكَاةِ بھی ہے اور مانع زکوٰۃ کے قتل کو کوئی نہیں کہتا بلکہ یوں فرماتے ہیں کہ تمہارا وصول کر لی جاوے گی، قتل نہ کیا جائے گا، اگر تمہارا بھی وصول نہ ہو سکے تو امام قتال کرے گا، تو اب سلیک صاف ہو گیا کہ جس طرح مانع زکوٰۃ مستحق قتل نہیں، اسی طرح تارک صلوٰۃ بھی زکا فر ہے نہ مستحق قتل۔

آئیادیر کو کہ ابن تیم نے اپنی کتاب الصلوٰۃ میں عمدہ مواد جمع کر دیا ہے، وہ عین آگے آئیں گی، یہاں تمہارا مضمون نقل کرتا ہوں اس نے ہمارے سارے جوابات کا قتل قع کر دیا، وہ کہتے ہیں کہ یہاں تو (یعنی حدیث مذکور میں) توجیہ کر لی مگر قرآن میں کیا کر کے جہاں فرمایا گیا ہے: **نَاسُوا الشِّرْكَیْنَ حَيْثُ وَجَدُوهُمْ وَخُذُوهُمْ وَاصْطَبِدُوهُمْ وَاقْعُدُوا لَهُمْ كُلَّ مَرْصِدٍ ۚ فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ** (۱) (تو مارو شُرکین کو جہاں پاؤ، اور پکڑو اور گھیرو اور بیٹھو ہر جگہ ان کی تائید پھر اگر وہ توبہ کریں اور قائم رکھیں نماز اور دیار کریں زکوٰۃ تو چھوڑ دو ان کا راستہ) ابن قیم کہتے ہیں کہ یہاں تو صاف قتل کا ذکر ہے نہ کہ قتال کا اور شُرکین اس وقت تک قتل کرنے کا حکم ہے جب تک وہ تائب ہو کر نماز بھی قائم نہ کریں، اس استدلال سے (ابن قیم العید کی ساری تقریریں بیکار ہو گئیں اور قتل والا مسلک ثابت ہو گیا، اس کا جواب کہیں نہیں دیکھا، اپنی سمجھ میں جو کچھ آ رہا ہے اس کو ذیل میں بیان کر رہا ہوں، واللہ اعلم بالصواب۔

اولاً تو حدیث باب مقبض ہے سورہ براءت کی آیت سے اور آیت میں قتل کا ذکر ہے اور حدیث میں قتال کا، تو اب وہی صورتیں ہیں یا تو آیت میں قتل سے قتال مراد لیا جائے اور حدیث کو آیت کی تفسیر قرار دیا جائے یا حدیث میں جو لفظ قتال ہے اسے قتل کے معنی میں لیا جائے یہ سب آیت کے، عقلی قرآن بتلاتے ہیں کہ آیت میں قتال مراد ہے اس لئے کہ حدیث مفسر اور شرح ہوتی ہے آیت کی، تو گویا حضورؐ نے تنبیہ فرمادی کہ آیت میں قتل صبر مراد نہیں ہے بلکہ قتال مراد ہے، ایسے تجويزات شائع فی اللغة ہیں۔

دوسرا قرینہ یہ ہے کہ تارک زکوٰۃ کے قتل کا کوئی قائل نہیں، ہاں اگر تارک زکوٰۃ بہت سی جماعت ہو تو امام کو محاربہ کا حکم ہے اور یہ مسئلہ اجماعی ہے اور جب تارک زکوٰۃ پر عدم قتل کا اجماع ثابت ہو گیا تو اب دیکھو کہ قرآن میں تخلیہ سبیل کی جو تین شرطیں مذکور ہیں ان میں زکوٰۃ بھی ہے

اب اگر آیت میں لفظ قتل کو اپنے ہی معنی میں لیا جائے تو تارک زکوٰۃ کو قتل کرنا ہوگا، حالانکہ سب اس پر متفق ہیں کہ اس کے قتل کا حکم نہیں ہے تو لامحالہ ماننا پڑے گا کہ آیت میں بھی قتل ہی مراد ہے اور حدیث کو آیت کی تفسیر قرار دیا جائے گا، اس سے بخاری کی دقت نظر معلوم ہوتی ہے کہ ترجمہ الباب میں آیت کو رکھا اور حدیث لائے اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ والی، بخاری کی اس دقت نظر پر نظر رکھتے ہوئے میرا گمان یہ ہے کہ ان کا منشا یہ ہے کہ اپنا اشکال رفع کر لو اور سمجھ لو کہ آیت میں گو لفظ قتل ہے مگر مراد قتل ہے جیسا کہ حدیث باب نے اسے واضح کر دیا، میرے نزدیک اب ابن تیم کا جواب مکمل ہو گیا، اسی طرح اس جواب سے امام بخاری کی دقت نظر بھی واضح ہو گئی۔

اوپر میں نے تارک زکوٰۃ کے عدم قتل پر اجمل نقل کیا ہے، گو امام احمد کی ایک روایت عدم فرق بین الصلوٰۃ والزکوٰۃ کی ہے مگر مع دہی ہے جو میں نے نقل کیا۔

اب میں ایک اور چیز نقل کرتا ہوں، امام نووی نے کہا ہے کہ مَنْ تَرَكَ الصَّلَاةَ عَدُوٌّ يَقْتُلُ (جس نے تصلاً نماز چھوڑی) (اسے قتل کیا جائے گا) اور جب تارک زکوٰۃ کے متعلق پوچھا گیا تو کہا حکمہما واحد (دونوں کا حکم ایک ہی ہے) یعنی تارک صلوٰۃ ہی کی طرح تارک زکوٰۃ کو بھی قتل کیا جائے گا، امام نووی کی اس بات کا حفاظ نے رد کیا ہے، حافظ ابن حجر نے بھی رد کیا ہے، میرے خیال میں نووی کا مقصد لفظ قاتل سے نہیں ہے نہ نووی نے اس سے استدلال کیا ہے بلکہ نووی کا استدلال یہ ہے کہ مَنْ تَرَكَ الصَّلَاةَ عَدُوٌّ يَقْتُلُ (جس نے تصلاً نماز چھوڑی) اور عصمت جان اور عصمت مال دونوں کے اس مجموعہ کا ترتیب اس دقت ہوگا جب یہ تین امور متفق ہو جائیں، یعنی عصمت جان و مال اس دقت ہوگی جب شہادت، اقامت صلوٰۃ اور ایثار زکوٰۃ تینوں موجود ہوں، اگر کوئی جزو فوت ہو تو عصمت بھی فوت ہو جائے گی، آگے تفصیل ہے کہ اگر پہلا جزو یعنی شہادت فوت ہے تو مجموعہ عصمت دم و عصمت مال بھی فوت ہے، نہ اس کی جان محفوظ ہے نہ مال^(۱) اور اگر دوسرا جزو یعنی صلوٰۃ فوت ہے تو اس وقت عصمت مال منتفی نہیں ہوتی بلکہ عصمت دم اٹھ جاتی ہے (یعنی تارک صلوٰۃ کے قتل کے جو لوگ قاتل ہیں وہ اس سے استدلال کرتے ہیں) اور اگر تیسرا جزو ایثار زکوٰۃ فوت ہو تو عصمت مال اٹھ جاتی ہے نہ کہ عصمت دم، اس تبصرے سے یہ کلام نہایت یکساں ہو جاتا ہے، اگر تینوں میں تو سب کچھ ہے اور تینوں نہیں تو کچھ نہیں، نہ عصمت دم، نہ عصمت مال، اگر ایک جزو صلوٰۃ فوت ہو تو عصمت دم اٹھ گئی^(۲) اور اگر ایثار زکوٰۃ فوت ہو تو عصمت مال جاتی رہی کیونکہ یہ روح ہے اعمال مال کی^(۳)۔

اس تقریر کے بعد اب شیخ تقی الدین کی تقریر نہیں کام دے گی اور اس کا جواب احناف کو دینا ہوگا کیونکہ خفیہ ہی تارک صلوٰۃ کے

(۱) صاحب الغنیمۃ (ج ۱) (۲) کیونکہ یہ روح ہے اعمال مال کی (ج ۱) (۳) اس تشریح سے معلوم ہوگا کہ امام نووی تارک زکوٰۃ کے بھی قتل کا فتویٰ دیتے ہیں (ج ۱)

قتل کے منکر ہیں۔ یہ بہت قوی اشکال ہے اور بظاہر اس کا جواب نہیں، میں کہتا ہوں کہ اگر امام اعظم سے منقول لفظ حتیٰ یتوب اور یموت کو یاد کرو تو اس اشکال کا جواب مل جائے گا، غور کرو امام صاحب کی کیا مراد ہے؟ مراد یہ ہے کہ تاک صلوٰۃ امام صاحب کے نزدیک بھی معصوم الم نہیں ہے فرق صرف اتنا ہے کہ دیگر اکابر مہلت نہیں دیتے فوراً قتل کا حکم دیتے ہیں اور امام صاحب مہلت دیتے ہیں اور فرماتے ہیں بس کا بس کا مارو، مرنے کی پرواہ مت کرو، مرنے دو، مگر جلدی نہ کرو، قید کرو، بھوکا رکھو، آنا مارو کہ خون بہنے لگے، پھر بھی جان محفوظ نہیں حتیٰ یتوب اور یموت — تو کون کہہ سکتا ہے کہ امام ابو حنیفہ جان کو محفوظ کہتے ہیں، ہاں موقع ضرور دیتے ہیں ورنہ یہ الفاظ کیوں کہتے کہ اگر تو بکرے تو بیچ جائے گا۔ اس کے بعد آیت قرآن پر غور کرو فرمایا: **فَإِذَا سَلَخَ الْأَشْهُرَ الْحَرَامَ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدْتُمُوهُمْ وَخُلَدُوا وَاحْصِرُوهُمْ وَاعْبُدُوا إِلَهُكُمْ كُلَّ مَرْصِدٍ**، بکڑو، باندھو، لگات لگاؤ، جلنے مت دو، قتل کرو، اس کے بعد فرماتے ہیں: **فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ**، اب اگر وہ توبہ کر کے مسلمان ہو جائیں اور نماز قائم کریں، زکوٰۃ دیں تو ان کا راستہ چھوڑ دو، سوچو کہ قاتل تو اس میں نایت نہیں بیان کی گئی اور حدیث میں نایت بیان کی گئی حتیٰ یشہدوا، آخر ہدایت میں ایک متنافر حکم فرماتے ہیں: **فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ**، تغلیہ سبیل نام ہے اس کا بھی ہو سکتا ہے جس کو مارا جائے اور اس کا بھی جس کو گھیرا جائے اور اس کا بھی جس کو باندھا جائے، معلوم ہوا کہ یہ صرف قاتل کے مقابل میں نہیں لایا گیا ورنہ فرماتے **فَلَا تَقْتُلُوا** یعنی آیت یوں ہوتی **فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ**، مگر آیت یوں ہے: **فَلَنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ**، یعنی اگر وہ توبہ کر لیں اور نماز پڑھیں، زکوٰۃ دیں تو اب راستہ چھوڑ دو، نہ مارو، نہ باندھو، نہ لگات میں بٹھو۔ تو ابو حنیفہ کہتے ہیں کہ راستہ نہیں چھوڑا جائے گا جب تک تین چیزیں پائی جائیں، تو قرآن نے دو باتیں بتلائی ہیں، مشرکین کے لئے قتل و حصر وغیرہ اور غیر مشرکین کے لئے تغلیہ سبیل بشرطیکہ اشیائے ثلاثہ پائی جائیں، اس تلقیر سے امام ابو حنیفہ کا مسلک قرآن و حدیث کے عین مطابق ہے، کوئی چیز بھی اس کے خلاف نہیں، بلکہ **فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ** دعا کو اور واضح کر رہا ہے کہ یہ صرف قاتل کے مقابل میں ورنہ **فَلَا تَقْتُلُوا** فرمایا جاتا، عصمت دم نہ ہونے کے معنی ہی تو ہیں کہ اس کا خون محترم نہ رہے اور یہ واقعہ ہے کہ امام ابو حنیفہ اس کے خون کو محترم نہیں کہتے، اسی لئے فرماتے ہیں مارو، باندھو، حتیٰ یتوب اور یموت — الحمد للہ حنفیہ کا مسلک پوری طرح واضح ہو گیا اور قرآن و حدیث کے ساتھ اس کی مطابقت ثابت ہو گئی (۱)

(۱) اتنی بات، اور واضح ہو گئی کہ تاک صلوٰۃ کا خون محترم نہیں اور اس کو بیچنے کا حق نہیں، یہ تو کچھ نزدیک ہے اور چاروں امام اس پر متفق ہیں، فرق یہ ہے کہ تین امام تو فرماتے ہیں قتل دو ورنہ زکوٰۃ دینا، امام احمد فرماتے ہیں کہ قتل اور مالدوبے اور امام شافعی و امام مالک فرماتے ہیں قتل حد ہے، مگر امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں اس کی زندگی مخلوق اور اس قدر راجح کر دو کہ وہ خود مر جائے اور تین تہاں قتل نہ پیش ہے نہ قتل کی بات اس کو نہیں رہا، دوسری بات یہ واضح ہو گئی کہ امام نووی کے نزدیک بھی اگر تک قاتل میں یہ کچھ اجاعا است و قدر عصمت لکھا جاتا ہے یا کیا۔

بَابُ مَنْ قَالَ إِنَّ الْإِيمَانَ هُوَ الْعَمَلُ يَقُولُ اللَّهُ تَعَالَى (وَتِلْكَ الْجَنَّةُ

الَّتِي أُورِشْتُمْوهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ) کیونکہ اللہ تعالیٰ نے (سورہ نازعہ میں) فرمایا : یہ جنت جس کے

آپ اور شتموہا بہا کنتم تعملون) وقال عدۃ من اهل العلم فی قوله تعالیٰ (وَرَبَّكَ
تم وارث ہوئے تمہارے عمل کا بدلہ ہے۔ اور کئی عالموں نے اس آیت کی تفسیر (جو سورہ ہجر میں ہے) فرمایا قسم تیرے ملک کی
لَسْتُمْ لَهُمْ أَجْمَعِينَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ) عَنْ قَوْلِ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، وَقَالَ (لِيُثَلِّ هَذَا
ہم ان ب لوگوں سے ان کے عمل کی باز پرس کریں گے، یہ کہا ہے کہ لا الہ الا اللہ کہنے سے، اور (سورہ الصافات میں) فرمایا ائیس ہی کامیابی

فَلْيَعْمَلِ الْعَامِلُونَ)

کے لئے عمل کرنے والوں کو عمل کرنا چاہیے۔

لطیفہ

امام شافعی امام احمد کے استاد ہیں، طبقات الشافعیہ میں ان دونوں استادوں کا ایک دلچسپ مناظرہ منقول ہے کہ امام شافعی نے امام احمد
سے فرمایا : میں نے سنا ہے کہ تم تارک صلوٰۃ کو کافر کہتے ہو؟ جواب دیا : ہاں! امام شافعی نے پھر پوچھا : کیا ترک صلوٰۃ سے
کافر ہو گیا؟ تو جواب میں کہا : ہاں! اس کے بعد امام شافعی نے دریافت فرمایا : اگر تو بکرنا چاہے تو کیا کرے؟ امام احمد نے کہا : کلمہ پڑھے۔
بَابُ مَنْ قَالَ إِنَّ الْإِيمَانَ هُوَ الْعَمَلُ

ایمان عمل ہے، اس سے کیا مراد ہے؟ احتمال کے درجہ میں دو معنی مراد ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ عمل سے قلب کا عمل مراد ہو، تو اس
ان لوگوں کا رد ہوگا جو کہتے ہیں کہ ایمان نفس معرفت کا نام ہے خواہ اضطراباً ہو یا اختیاراً، یہ قول کرامیہ و مرجئہ کا ہے، اہل سنت کہتے ہیں کہ نفس غیر
ایمان نہیں قرآن میں ہے، الَّذِينَ آمَنُوا لَكُنْهُمْ أَهْلُ الْجَنَّةِ يَعْرِفُونَ لَمْ يَكُنْ لَهُمْ أَهْلٌ (جن کو ہم نے دی ہے کتاب پہچانتے
ہیں اس کو جیسے پہچانتے ہیں اپنے بیٹوں کو) مگر وہ اس معرفت سے ہونے ہو سکے، معلوم ہوا کہ نفس معرفت ایمان نہیں بلکہ اس میں التزام (ماننا)
شرط ہے، اسی التزام کا نام ایمان ہے اور یہ افعال نفس میں سے ہے، تو اب امام بخاری کا مطلب یہ ہوگا کہ ایمان عمل قلب ہے، نفس معرفت نہیں
دوسری مراد یہ ہو سکتی ہے کہ ایمان میں عمل یعنی عمل جوارح بھی داخل ہیں، پہلی صورت میں مرجئہ وغیرہ کا رد ہوگا اور دوسری صورت
میں جزیئہ ایمان کے منکرین کا۔

قَوْلُهُ وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِي أُورِشْتُمْوهَا أَخْرَجَ (اور یہ جنت وہ ہے جس کے تم وارث بنائے گئے ہو) یہاں سوال پیدا

ہوتا ہے کہ ارث تو آیا، واصلہ دوسے ملتی ہے، 'جنت کیونکر ارث بنی جو ان کو وراثت میں ملی؟ تو اس کی مختلف توجیہات کی گئی ہیں، 'میرے نزدیک بہتر توجیہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو جنت دی تھی تو گویا وہ اس کے مالک تھے اور جب حضرت آدمؑ مالک تھے، تو انھیں کی اولاد ہم ہیں اور باپ دادا کا ترکہ اولاد ہی کو ملتا ہے، لہذا ہم کو ان کی ارث ملی اور ہم اس کے وارث ہونے، اسی بنا پر لفظ ارث ارشاد فرمایا گیا ہے یہ توجیہ شاہ عبدالقادر نے فوائد میں ذکر فرمائی ہے، یہ تو وراثت کا جواب ہوا۔

امام بخاریؒ نے آگے جو دلائل پیش کئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے پہلے معنی یعنی مٹی سے مراد لے لی ہیں اور اسی کو ثابت کرنے کے لئے یہ آیت "وَبَلَدَاتِ الْجَنَّةِ النَّاتِيَةِ" اور "وَمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ" پیش کی ہے، 'یہ سلم مرے کہ دخول جنت کا مدار ایمان پر ہے، یہاں 'مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ' سے معلوم ہوا کہ ایمان مراد ہے، یعنی تم جنت کے وارث ایمان کی وجہ سے بنائے گئے ہو، تو امام بخاریؒ نے کہا دیکھو اللہ نے ایمان پر عمل کا لفظ ارشاد فرمایا، بجائے 'مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ' کے 'مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ' ارشاد فرمایا، معلوم ہوا کہ ایمان ہی عمل ہے، اگر عمل کو عمل بوجہ اور عمل قلب و دونوں کے لئے عام لیا جائے تب بھی درست ہے، اللہ نے فرمایا: اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ جَنّٰتٌ (۱) (بیشک جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے ان کے لئے جنتیں ہیں) مگر ظاہر یہی ہے کہ عمل قاب مراد ہے قَالَ عِدَّةٌ مِّنْ اَهْلِ الْعِلْمِ فِيْ قَوْلِهِ تَعَالٰی: فَرَسَّ بَلَاكٌ لِّسَبْلِنَهُمْ اَجْمَعِيْنَ آخر یعنی جنت سے اہل علم نے اس آیت میں 'عَمَلًا' کو اذیعاملوں سے قول "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" کے بارے میں، 'مراۃ وال' ہے کہ ایمان پر عمل بولا گیا، قرینہ اس پر یہ ہے کہ یہاں کفار کا ذکر ہے، اس سے پہلے کی آیت سے انھیں کفار کا ذکر چلا آ رہا ہے کَمَا اَنْزَلْنٰ عَلٰی الْقَتْبِيْنَ ؕ الَّذِيْنَ جَعَلُوْا الْقُرْاٰنَ عِضِيْنًا (۲) (مسیح) ہم نے ان کو ٹوک پر نازل کیا ہے جنھوں نے حق کو رکھ کر تھے، یعنی آسمانی کتب کے مختلف اجزاء تفرادے تھے (ظاہر ہے کہ یہ کافر ہی تھے، تو یہ سوال کافروں سے ہوگا، کیونکہ یہ متفقہ طور پر ثابت ہے کہ کفار سے ایمان کا مطالبہ ہوگا اور اسی کے مکلف ہیں، اس میں تو کوئی اختلاف نہیں، ہاں اعمال کے لحاظ سے بھی مکلف ہیں یا نہیں؟ اس میں اختلاف ہے، تو ان اہل علم کا یہ کہنا ہے کہ یہاں آیت میں 'عَمَلًا' کو اذیعاملوں سے یقیناً قول لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مراد ہے کیونکہ عمل کے مکلف ہونے میں اختلاف ہے، تو عمل مراد کیسے بن سکتے ہیں، لہذا امام بخاریؒ کی بات ثابت ہو گئی کہ عمل بول کر ایمان مراد لیا۔

۲۵۔ حَدَّثَنَا أَحْمَدُ بْنُ يُونُسَ وَمُوسَى بْنُ إِسْمَاعِيلَ قَالَا حَدَّثَنَا إِبْرَاهِيمُ

ہم سے بیان کیا احمد ابن یونس اور موسیٰ ابن اسماعیل نے کہا دونوں نے ہم سے بیان کیا ابراہیم بن سعد نے

بْنُ سَعْدٍ قَالَ حَدَّثَنَا ابْنُ شَهَابٍ عَنْ سَعِيدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ

کہا ہم سے بیان کیا ابن شہاب نے انہوں نے سعید ابن مسیب سے انہوں نے ابو ہریرہؓ سے کہ (لوگوں نے) آنحضرت

رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَأَلَ أَيُّ الْعَمَلِ أَفْضَلُ؟ فَقَالَ إِيْمَانٌ بِاللهِ

صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کون سا عمل افضل ہے؟ آپ نے فرمایا: اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانا، کہا پھر

وَرَسُولِهِ، قِيلَ ثُمَّ مَاذَا؟ قَالَ الْجِهَادُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ، قِيلَ ثُمَّ مَاذَا؟

کون سا (عمل)؟ فرمایا: اللہ کی راہ میں جہاد کرنا، کب پھر کون سا عمل؟ فرمایا:

قَالَ حَبْ حَبُّ مَبْرُورٍ

وہ حج جو مبرور ہو

تَوَلَّى لِبَشَلِ هَذَا أَفْلَعُ الْعَامِلُونَ (ایسی ہی کامیابی کیلئے عمل کرنے والوں کو عمل کرنا چاہیے) "ہذا" سے

اشارہ "فوز عظیم" کی طرف ہے جس کا اس سے پہلی آیت میں ذکر ہے، "إِنَّ هَذَا الْهُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ" (یقیناً یہی عظیم شان کا میابی جز)

اور یہ فوز عظیم ہی ایمان ہے۔

ان آیات ثلاثہ سے اشارہ ہے کہ ایمان از قبیل نفل نفس ہے اور قول قلب ہے ذکر از قبیل اوراک، کہا قال النطقیون۔

حدیث ۲۵۔ تَوَلَّى أَيُّ الْعَمَلِ أَفْضَلُ؟ کون سا عمل افضل ہے؟ جواب میں فرمایا: "الْإِيْمَانُ بِاللَّهِ وَ

رَسُولِهِ" یہاں ایمان کو عمل کے جواب میں بولا گیا جب ہی تو جواب سوال پر منطبق ہوگا، ورنہ انطباق نہ ہوگا، اس قسم کی متعدد روایتیں ہیں

اس کی پوری تقریر باب الطعام من الاسلام میں نذر چکی ہے، ناظر رہنا کہ۔

یہاں تین باتیں بیان فرمائیں اور تینوں عمل میں بہت شاق ہیں، ان میں جو کامیاب ہو گیا بس وہی حقیقہ کامیاب ہے،

ان میں سے سب سے مشکل کام بھلا دین (شرک و کفر) چھوڑنا اور اللہ و رسول پر ایمان لانا ہے، دیکھو اہل کفر و شرک نے جانیں دے دیں

مگر ایمان باللہ قبول نہ کیا، تو اپنے مذہب کو چھوڑنا بہت شاق عمل ہے اسی لئے اس کو افضل فرمایا گیا، اور یہ

باب ۱۹ اِذَا لَمْ يَكُنِ الْإِسْلَامُ عَلَى الْحَقِيقَةِ وَكَانَ عَلَى الْإِسْتِسْلَامِ

کبھی اسلام ہے اس کے حقیقی (مشرقی) معنی مراد نہیں ہوتے، بلکہ ظاہری تائیداری یا جان کے ذریعے مان لینا جیسے اللہ تعالیٰ نے (سورہ بقرہ میں) فرمایا: مَنَافِلُ لَمْ تَوْمِنُوا وَلَكِنْ قَوْلُوا أَسْلَمْنَا فَاِذَا كَانَ عَلَى الْحَقِيقَةِ فَهُوَ عَلَى قَوْلِهِ جَلَّ ذِكْرُهُ اِنَّ بَيْنَ الدِّينِ (اسے پیڑھ!) ان سے کہہ دے تم ایمان نہیں لائے، یوں کہو ہم اسلام لائے، لیکن اسلام جب اپنے حقیقی معنی (مشرقی) میں ہوگا تو وہ اسلام ہوگا جو (سورہ آل عمران) کی اس آیت میں مراد ہے کہ اللہ کے نزدیک (سچا) دین اسلام ہے، (آخر تک)

عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ الْاَلِیَّةُ

نفس سے شتق ہے، اس کے معنی زیادتی کے ہیں، مشہور ہے العطا یا علی متن البلیا۔ اس کے بعد جہاد کا نمبر ہے اور یہ واقعہ ہے کہ یہ بھی بہت مشکل کام ہے، اس میں جانی اور مالی ہر قسم کی قربانی دینی پڑتی ہے اور یہ بڑے دل گردے کا کام ہے، اسی لئے ایمان کے بعد یہاں اس کا ذکر فرمایا۔

اس کے بعد درج ہر دور ہے، یعنی ایسا جج جس میں کسی جنایت کا ارتکاب نہ ہو، فَمَنْ فَوَّضَ فِيْهِنَّ الْحُجَّ فَلَا رَفْثَ وَلَا ضَوْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحُجَّ (پھر جس نے لازم کر لیا ان میں جج کو بے حجاب ہونا جائز نہیں عورت سے اور نہ گناہ کرنا اور نہ جھگڑا کرنا ج کے زمانہ میں) یعنی جج میں یہ سب چیزیں چھوڑنی ہوں گی، ایسا جج جس میں جنایت کا ارتکاب نہ ہو اور فاضل خدا کی خوشنودی کے لئے ہو اس کا درجہ بہت بلند ہے، ایسا حاجی اس طرح ٹوٹتا ہے جیسے ماں کے پیٹ سے بے گناہ پیدا ہوا تھا اسی طرح اب پاک منہ ہو کر ٹوٹا، اس کی علامت یعنی جج مقبول کی علامت یہ بتلائی گئی کہ حج کے بعد زندگی دینی اعتبار سے حج سے پہلے کی زندگی سے بہتر ہو

باب ۲۰ اِذَا لَمْ يَكُنِ الْإِسْلَامُ عَلَى الْحَقِيقَةِ

پہلے یہ سمجھ لو کہ بخاری کا مقصود اب تک تمام ابواب کے مجموعہ سے یہ معلوم ہوا کہ دین اسلام ایمان، زہد، تقویٰ، برہنہ وغیرہ درصورتیکہ سب ایک ہیں مگر وہ بڑا مؤثر واقعہ ہوتا ہے کہ بخاری تو ان میں کوئی فرق نہیں کرتے اور سب کو ایک بتاتے ہیں مگر قرآن کی اس آیت میں تو فرق بیان کیا جا رہا ہے، فرمایا: قَالَتِ الْاَعْرَابُ اَبْ اَمْتًا قُلْ لَمْ تَوْمِنُوا

۴۸۔ حَدَّثَنَا أَبُو الْيَمَانِ قَالَ أَخْبَرَنَا شُعَيْبٌ عَنِ الزُّهْرِيِّ قَالَ

ہم سے بیان کیا ابوالیمان (حکم ابن ثانی) نے کہا ہم کو خبر دی شعیب نے انھوں نے زہری سے

أَخْبَرَنِي عَامِرُ بْنُ سَعْدِ بْنِ أَبِي وَقَّاصٍ عَنْ سَعْدِ بْنِ أَبِي وَقَّاصٍ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ

کہا مجھ کو خبر دی عامر ابن سعد ابن ابی وقاص نے اپنے باپ سعد ابن ابی وقاص سے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَعْطَى رَهْطًا وَسَعْدًا جَالِسَيْنِ فَتَرَكَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

نے چند لوگوں کو کچھ مال دیا اور سعد بیٹھے ہوئے تھے آپ نے ایک شخص (جلیل ابن سراقہ) کو چھوڑ دیا (نہ دیا) وہ

وَسَلَّمَ رَجُلًا هُوَ أَحَبُّهُمْ إِلَيَّ فَقُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ مَا لَكَ عَنْ فَلَانٍ فَإِنَّ اللَّهَ

ان سب لوگوں میں مجھے زیادہ پسند تھا میں نے کہا یا رسول اللہ آپ نے فلاں شخص کو چھوڑ دیا، تم خدا کی

إِنِّي لَأُرَاهُ مُؤْمِنًا فَقَالَ أَوْ مُسْلِمًا فَسَكَتَ قَلِيلًا

میں تو اس کو مومن سمجھا ہوں آپ نے فرمایا یا مسلم؟ پھر تھوڑی دیر میں چپ رہا

وَلَكِنْ قَوْلُوا أَسْلَمْنَا (اعراب نے کہا ہم ایمان لائے، آپ فرما دیجئے کہ تم ایمان نہیں لائے لیکن یوں کہو کہ ہم اسلام لائے)

اس سے ایمان اور اسلام الگ الگ معلوم ہوتے ہیں نیز یہ بھی بتلا رہا ہے کہ ایمان کی طرح اسلام کے بھی مراتب ہیں ایک وہ کہ

آخرت میں نافع ہو، ایک یہ کہ صرف دنیا میں نافع ہو جیسا کہ منافقین کا اسلام ہے کہ دنیا میں ان کو نفع پہنچ گیا مگر آخرت میں کچھ نہیں بلکہ

إِنَّ الْمُنَافِقِينَ فِي الدَّرَكِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ (یشک منافق جہنم کے سب سے نیچے کے طبقے میں ہوں گے) اور مفید

وہ اسلام ہے جو مع الایمان ہو، بخاری اس شبہ کا جواب دے رہے ہیں کہ ہماری مازودہ اسلام ہے جو دل میں گڑا ہوا ہو اور حقیقت پر ہو

وہ عین ایمان ہے اور اگر صرف اسلام ہے بمعنی ظاہری انقیاد و اطاعت۔ یا قتل کے خوف سے مکر پڑھ لیا، غور کرو دو لفظ ہیں ایک اسلام

دوسرا خون قتل یہ دونوں عام و خاص ہیں، اسلام عام ہے کہ کبھی قتل اور کبھی طع وغیرہ سے ہوتا ہے اور الخوف من القتل

خاص ہے اذالمیکن الاسلام علی الحقیقة کی جزا "لا ینفع فی الآخرة" محذوف ہے، یعنی یہ اسلام آخرت میں نافع نہیں

اور غیر نافع ہونے کی دلیل ہے؛ قالت الاعراب امنا انھ یعنی یہ آیت ان کے حق میں ہے جن میں صرف ظاہری اطاعت تھی ایمان تھا

لیکن بعض کہتے ہیں کہ ایمان تھا مگر راسخ د تھا ان کے لئے فرمایا "امنا مت کہو" "اسلمنا کہو" کیونکہ "امنا" ان کی شان کے لائق ہے

ثُمَّ غَلِبَنِي مَا أَعْلَمُ مِنْهُ فَعُدْتُ لِمَقَالَتِي فَقُلْتُ مَا لَكَ عَنْ فَلَانٍ فَوَافَقَنِي إِيَّيَّ
 پھر جو حال میں اس کا جانتا تھا اس نے زور کیا ، میں نے دوبارہ عرض کیا آپ نے فلاں شخص کو کیوں چھوڑ دیا ، قسم خدا کی میں اس کو
 لَأَرَاهُ مُؤْمِنًا فَقَالَ أَوْ مُسْلِمًا ، فَسَكَتُ قَلِيلًا ثُمَّ غَلِبَنِي مَا أَعْلَمُ مِنْهُ فَعُدْتُ
 مومن جانتا ہوں ، آپ نے فرمایا : یا مسلم ؟ پھر تھوڑی دیر میں چپ رہا ، پھر جو حال میں اس کا جانتا تھا اس نے زور کیا ، میں نے
 لِمَقَالَتِي وَعَادَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ قَالَ يَا سَعْدُ إِنِّي لَأَعْطِي الرَّجُلَ
 تیسری بار وہی عرض کیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وہی فرمایا اس کے بعد یہ فرمایا : اے سعد ! میں ایک شخص کو کچھ دیتا ہوں اور
 وَغَيْرُهُ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْهُ خَشْيَةً أَنْ يَكْبَهُ اللَّهُ فِي النَّارِ ، رَوَاهُ يُونُسُ وَصَالِحٌ وَمَعْمَرٌ
 دوسرے شخص کو اس سے اچھا سمجھتا ہوں ، مجھے یہ ڈر رہتا ہے کہ کہیں اللہ اس کو اونڈھا دوزخ میں نہ دھکیل دے ، اس حدیث کو یونس اور
 وَابْنُ أَخِي الزَّهْرِيُّ عَنِ الزَّهْرِيِّ

صالح اور زہری کے جیسے نے (شعب کا طرح) زہری سے روایت کیا ہے

جن کے قلوب میں ایمان راسخ ہو ، فاذا كان على الحقيقة لعن اسلام كان شاكرا لما تلبى به فوهو على قوله إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ
 الْإِسْلَامُ (۱) اللہ کے نزدیک اسلام ہی معتبر ہے اس سے مراد ظاہری انقیاد نہیں ، کیونکہ محض ظاہری انقیاد نار کے درک اسفل میں پہنچاتا ہے ،
 بلکہ وفاداری کا دل قلوبا و قلوبا ، ظاہرا و باطنا مراد ہے ۔

حدیث ۲۶۱ . رَهْطُ تین سے دس تک کی جماعت کو کہتے ہیں ۔

سَعْدُ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ ، یعشرہ بشرو میں سے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتے میں ماموں ہوتے تھے ، اور وہ آدمی جس کو
 حضورؐ نے نظر انداز فرمایا تھا اعلیٰ طبقہ کے مسلمان تھے ، ان کا نام جمیل ابن سراقہ تھا ، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چند لوگوں کو کچھ
 مال دیا اور انھیں نظر انداز فرمایا تو حضرت سعد ابن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو خیال ہوا کہ یہ تو بڑے اچھے صحابی ہیں ، اس عطیہ سے یہ کیوں محروم رہ
 گئے ، تو فرماتے ہیں کہ میں نے حضورؐ سے عرض کیا ۔ اور انھیں روایات میں فساد ارتکاب آیا ہے ، یعنی میں نے چپکے سے عرض کیا ، اس سو
 ادب معلوم ہوا ، حضورؐ کی تعلیمات نے صحابہ کو بڑا ہی مودب بنادیا تھا ، وہ اگر کوئی بات کہنا بھی چاہتے تھے تو ادب نبویؐ کا پورا لحاظ رکھتے
 تھے ۔ دنیا کے لئے اس میں سبق اور تعلیم بھی ہے کہ اگر چھوٹے کو کسی بات میں شبہ ہو تو بڑے کا ادب و لحاظ رکھ کر چپکے سے عرض کرنا

جمع میں زور سے دیکھے۔ حضرت سید نے عرض کیا: حضور! آپ نے انھیں چھوڑ دیا، واللہ انہی لارہ مؤمننا خدا کی قسم میں تو ان کو مومن لگانا چاہوں یہاں ”اڑا“ بالفتح ہے، بفتح نہیں ہے، ”اڑا“ ”اُڑا“ کے معنی ہیں، یعنی میں لگانا کرتا ہوں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اَوْسَلِمًا یعنی تر قطعی مومن ہونے کا حکم کیوں لگاتے ہو، تم قلب کا حال کیا جانو، یا یہ مطلب ہو کہ مسلم کا لفظ کہو یا مومن و مسلم دونوں لفظ بولو، اس سے معلوم ہوا کہ مومن اور مسلم میں فرق ہے، اسلئے کہ اسلام تو ظاہری انقیاد میں بھی ہے اور ایمان مخفوس ہے قلب کے راسخ پر، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ سمجھنا مقصود ہے کہ کسی کو حق نہیں ہے کہ باطنی امور پر قطعی حکم لگائے خاص طور سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے موجود ہوتے ہوئے ایسا قطعی حکم لگانا بگڑ مناسب نہ تھا اس لئے اس کی اصلاح فرمائی کہ ایسا مت کرو، خواہ وہ صدیق ہی کیوں نہ ہو مگر تمہیں ایسا حکم لگانے کا حق نہیں خصوصاً حضور نبوی میں، پھر ایک بار بھی نہیں تین تین بار اور وہ بھی تم کے ساتھ۔ مسلم وغیرہ میں ایک لفظ نازل ہے اِقْتُلُوا يَاسَعْدُ! اے سعد کیا تو مجھ سے جھگڑتا ہے اور لڑتا ہے۔ دیکھو لفظ قتال فرما رہے ہیں اور یہ لفظ قتال وہی ہے جو حدیث اَمَرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ میں آیا ہے، ظاہر ہے یہاں قتال کے معنی قتل کے نہیں ہیں، اسی طرح اَمَرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ میں بھی قتل مراد نہیں ہے، خیر درمیان میں ایک موقع کی بات آگئی، اس سے آگاہ کر دیا۔ تو نبی علیہ السلام نے حضرت سعد کو ایک بات تو یہ سمجھائی کہ کسی کے ہلن پر حکم لگانے کی اجازت نہیں اور دوسری بات یہ فرمائی کہ تم نے یہ سمجھا کہ میں نے اس کو اس بنا پر نظر انداز کر دیا کہ میرے نزدیک وہ اچھا آدمی نہیں ہے، اس لئے تم بار بار اصرار کر کے یقین دلارہے ہو کہ وہ اچھا آدمی ہے، تو تمہارا ایسا سمجھنا غلط ہے، میرے چھوڑنے کی وجہ وہ نہیں ہے جو تم سمجھو ہو، بلکہ میرا انشا ضعیف اور مومنین کے دین کی حفاظت ہے، یعنی میں نے جن کو زیادہ ضعیف الایمان اور مولفہ القلوب میں سے ہیں، اگر انھیں کھانے کو نہ لے تو ممکن ہے بھوک کی وجہ سے اسلام سے پھر جائیں اور جو قوی الایمان ہے اسے کتنے ہی فائدے کیوں نہ ہوں وہ گھبرا نہیں سکتا، تو جسے ضعیف الایمان سمجھتا ہوں اسے دیتا ہوں (اور جیل ایسے ہیں نہیں اس لئے انھیں نہیں دیا)

یہاں دو مسئلے ہیں اور دونوں کا الگ الگ حکم ہے، ایک ضعیف الایمان کا مسئلہ ہے کہ وہ مسلمان تو ہو چکا ہے مگر ابھی مکمل پختگی نہیں آئی، خطرہ ہے کہ کہیں معاشی تنگی کی وجہ سے اس کے قدم نہ اکھڑ جائیں، تو اس کی مدد کرنا، تاکہ وہ جم جائے، اچھا رویہ ہے، اور ایک مومن کے دین کی حفاظت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جماعت کے دین کی حفاظت کی خاطر مدد فرمائی، جیسا کہ خود فرمایا کہ اس ڈر سے دیتا ہوں کہ کہیں اس کو اللہ دوزخ میں اندھا مار ڈھکیل دے، تو یہ بھی دین کی حفاظت۔

اور دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ ایمان لانے سے پہلے کوئی کہے کہ روپیہ دو تو ایمان لاؤں جیسے ملکائے کہتے تھے، جب مجھ سے انکے بارے میں دریافت کیا گیا تو میں نے کہہ دیا تھا کہ ایک پیسہ بھی دینے کا وعدہ نہ کیا جائے، بلکہ ان سے صاف کہہ دیا جائے کہ فائدہ سستی میں

بَابُ إِفْشَاءِ السَّلَامِ مِنَ الْإِسْلَامِ وَقَالَ عَمَّارٌ ثَلَاثٌ مِنْ جَمْعِهِنَّ

انشاء سلام کرنا اسلام میں داخل ہے ، اور عمار نے کہا تین باتیں جس نے اکٹھا کر لیں
فَقَدْ جَمَعَ الْإِيمَانَ ، الْإِنصَافَ مِنْ نَفْسِكَ ، وَبَذَلَ السَّلَامَ لِلْعَالَمِ ، وَالْإِنْفَاقَ
اس نے ایمان کو جوڑ لیا ، ایک تو اپنا انصاف اپنے جی میں کرنا اور دوسرے ب کو سلام کرنا (ہر سلمان کو)

مِنَ الْإِقْتَارِ

اور تیسرے تنگی ہونے پر خرچ کرنا

شریک ہو جاؤ تو ٹھیک ہے ورنہ کچھ ضرورت نہیں ، امت آؤ ، اس لئے ایمان کی طرف لالچ دلا کر نہیں بلایا جاتا ، ہاں جو حق سمجھ کر قبول کر لیں اور غریب
و حاجت مند ہوں ، ان کے ایمان کی حفاظت کی خاطر ان کی مدد کرنا ، یہ بہتر اور نیک کام ہے ، یہ بھی یاد رکھو کہ فقہاء نے لکھا ہے کہ اب مولفہ اعلیٰ
کی کوئی مذہب نہیں کیونکہ اسلام غالب ہے ، مگر کثیر سواد کی کچھ حاجت نہیں ، کوئی نکلتا ہے تو نکل جائے ، تاہم یہ بھی تصریح ہے کہ امام کی مصلحت اور اس کی
صوابدید پر موقوف ہے ، وہ اگر مناسب سمجھے تو ضرور خدمت کر سکتا ہے ، ممنوع نہیں ہے ۔

ایک بات یہ بھی یاد رکھنے کی ہے کہ عمیل ابن سراوق رضی اللہ عنہ بڑے دوسرے صحابی ہیں ، مہاجرین میں سے ہیں اور کالمین میں
اعلیٰ طبقہ کے ہیں ، حضرت ابوذر غفاریؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ جیلؓ گزرے تو حضورؐ نے مجھ سے پوچھا تم اسے کیا سمجھتے ہو ؟ میں نے کہا
”کُتْلَمَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ“ یعنی جیسے اور مہاجرین میں دیے ہی یہ بھی ہیں ، اس کے بعد ایک دوسرے صحابی گزرے تو حضورؐ نے پوچھا :
”یَکِیْسُ یَہ؟“ میں نے کہا ”سِتِّیدَ مِنَ سَادَاتِ النَّاسِ“ انھیں کیا پوچھنا سرداروں میں سے ایک ہیں ، حضورؐ نے فرمایا : اگر ساری
زمین ایسے سادات سے بھری ہو تو یہی اکیلا جمیل ان سب سے بہتر ہے — تو یہ تم سمجھا جائے کہ یہ ضعفا میں سے تھے ، خود حضورؐ کا یہ
فرمانا اتی لا عی علی الرجل وغیرہ احب الی منہ (میں ایک آدمی کو دیتا ہوں حالانکہ دوسرا اس سے زیادہ مجھ کو محبوب ہوتا ہے) اس پر
وال ہے کہ جمیلؓ حضورؐ کو محبوب ہیں ، لیکن حضرت سعد کو اس پر متنبہ فرمایا کہ تمھیں حق نہیں کہ لو اظن پر حکم لگاؤ ۔

بعض نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے کہ مظلون پر حلف ہو سکتا ہے ، مگر یہ صحیح نہیں ، اس لئے کہ ایک حلف ہے وجہان
ظن پر اور ایک حلف ہے مظلون پر ، حضرت سعد یہاں ظن کرنے پر قسم کھا رہے ہیں نہ اس مظلون پر ، تو ظن کا پایا جانا تو قطعی ہے ، حافظ نے
فتح الباری میں اس پر تنبیہ کی ہے (۱)۔

۲۷۔ حَدَّثَنَا قُتَيْبَةُ قَالَ حَدَّثَنَا اللَّيْثُ عَنْ يَزِيدَ بْنِ أَبِي حَبِيبٍ

ہم سے بیان کیا قتیبہ نے، کہا ہم سے بیان کیا لیث نے، انھوں نے سنا یزید بن ابی حبیب سے
عَنْ أَبِي الْخَيْرِ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو أَنَّ رَجُلًا سَأَلَ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ
وآلِهِ وَسَلَّمَ أَيُّ الْإِسْلَامِ خَيْرٌ قَالَ تَطْعَمُ الطَّعَامَ وَتَقْرَأُ السَّلَامَ عَلَى مَنْ
اسلم کی کون سی غصت بہتر ہے؟ آپ نے فرمایا کھانا کھانا اور ہر ایک کو سلام کرنا،
عَرَفْتُ وَمَنْ لَمْ يَعْرِفْ
اس سے تیری پہچان ہو یا نہ ہو

يَكْتُبُ يَعْنِي لَفْظُهُ عُمُومًا الْفَاعِلُ بَابُ الْفَعَالِ فِي أَمْرِ تَعَدَّى بَن جَاتٍ هِيَ لَمْ يَجِدْ هُوَ تَعَدَّى هُوَ تَابَعُ
باب الافعال میں آئے تو لازم ہو جاتا ہے۔

بَابُ إِفْشَاءِ السَّلَامِ مِنَ الْإِسْلَامِ

یعنی افشاء سلام بھی اسلام کا ایک شعبہ ہے، حضرت عمار فرماتے ہیں کہ تین چیزیں ہیں جس کے اللہ جمع ہو جائیں، اس نے اسلام کے
تمام شعبے جمع کر لئے، بخاری کی غرض تو یہ ہے کہ اسلام کے اجزاء ہیں مگر ہم کہیں گے کہ اس کے شعبے مراد ہیں۔
قوله الْإِنصَافُ مِنْ نَفْسِكَ، اِی الْإِنصَافُ النَّاشِئُ مِنْ نَفْسِكَ، یعنی دل سے انصاف ہو، بعضوں نے
کہا کہ اپنے نفس سے انصاف کا مطلب یہ ہے کہ اپنے معاملہ میں بھی انصاف کرے اِی مع نَفْسِكَ یا فی معاملۃ نَفْسِكَ، یعنی
وصف ہے کہ انصاف انصاف رہے خواہ اپنے نفس کا معاملہ ہی کیوں نہ پیش آجائے، ایسا نہ ہو کہ دوسروں کے ساتھ انصاف، اور اپنی بات
ہو تو بے انصافی۔

قوله وَبَذَلُ السَّلَامِ، یعنی ہر ایک کو سلام کرنا، چاہے جان پہچان ہو یا نہ ہو بلا تخصیص صرف مسلمان ہونے کی وجہ سے
سلام کرے۔

قوله وَالْإِنْفَاقُ مِنَ الْإِقْتَارِ، غلہ دہی کے وقت خرچ کرنا، اور یہ بہت مشکل کام ہے، ایک طالب علم نے مجھ سے دست
غیب کے مثل کا سوال کیا تو میں نے کہا تیرا ن پاک کی اس آیت پر عمل کرو وَمَنْ قُدِّرَ عَلَيْهِ رِزْقُهُ فَلْيَسْقُ مِمَّا آتَاهُ اللَّهُ ۖ

(اور جس کو پنی تلی ملتی ہے اس کی روزی تو خرق کرے جیسا کہ دیا ہے اس کو اٹھانے) گویا بت طلاق کے باب میں فرمایا جا رہی ہے مگر اشارہ عام مضمون کی طرف ہے، تو میں نے کہا یہ وعدہ ایزوی ہے، اس کا خلاصہ نامکین ہے اور امت میں سے بہت سے لوگوں کا کھنجر ہے حضرت مولانا رفیع الدین صاحب ہتھم دار العلوم دیوبند جو دستخط کرنا بھی نہ جانتے تھے مگر شاہ عبدالغنی صاحب کے اہل خلفا میں سے تھے اور بڑے کمال تھے، فرماتے تھے کہ ہمارا مدرسہ دیوبند مثل کنویں کے ہے جتنا کھانا نکلتا اُسے گا، اگر نہ کھینچو گے تو زیادتی نہ ہوگی اور نہ بڑے کا بلکہ مکین ہے خرابی ہو جائے، عجیب لفظ فرماتے ہیں بالکل حقیقت پر مبنی ہے۔

حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ یہ حضرت عمار کا قول ہے مگر بعض لوگوں نے اسے مرفوعاً بھی روایت کیا ہے، آگے لکھا ہے کہ حیثیت صناعت اسناد کے معلول ہے، مرفوع نہیں بلکہ موقوف ہے، یہ درست ہے، ہیں اس سے انکار نہیں مگر کسی بات یہ ہے کہ اس کلام کے معنایں شاید ہیں اس ذات مقدس کے کلام کے جن کو اٹھانے جواسع الکلم کی شان عطا فرمائی تھی، اس نے لگان ہوتا ہے کہ حضرت عمار نے حضور سے ضرور سنا ہوگا۔

حافظ ابن حجر کے اس کلام سے یہ بھی معلوم ہوا کہ محدثین اگرچہ اسناد کے اعتبار سے کچھ کہیں مگر کہیں کہیں ان کا وجدان گواہی دیتا ہے کہ یہ کلام منبر ہے اگرچہ اسے وہ ثابت نہ کر سکیں۔

پچھلی صدی میں شیخ عبدالعزیز دباغ رحمۃ اللہ علیہ ایک بزرگ گذرے ہیں، وہ قطب وقت اور آتی محض تھے، قرآن بھی نہیں پڑھا تھا لیکن بڑے بڑے علماء ان سے علم حاصل کرتے تھے، ان کے ایک خادم جو خود بہت بڑے عالم تھے اور چالیس سال تک علم کی خدمت میں مشغول رہ چکے تھے، انھوں نے شیخ کے لمغوظات میں ایک کتاب ”الابوین“ لکھی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ جس قدر میں علم حاصل کر چکا تھا وہ یہاں آئے پر بیچ معلوم ہوتا تھا، شیخ کے علوم کا حال یہ تھا کہ معلوم ہوتا تھا یہ ابھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر چلے آ رہے ہیں، ایک دفعہ بعض متوسلین نے خواہش ظاہر کی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی چال چل کر ہمیں دکھائیے، تو شیخ نے فرمایا کیا آنا، اگلے دن ان لوگوں کو جنگل میں لے گئے اور فرمایا کل میں نے اس لئے نہیں دکھلایا کہ اس وقت مجھے بھی معلوم نہ تھا، تمہارے سوال کے بعد شب میں میں نے حضور سے عرض کیا کہ یہ لوگ مجھ آپ کے چلنے کی ہیئت دریافت کرتے ہیں اس لئے آپ چل کر دکھلا دیجئے تو میں ان کو دکھلا دوں، حضور نے میری درخواست کو شرف پذیرائی نہتے ہوئے دکھلادیا، لہذا اب میں تم کو دکھلاتا ہوں، پھر انھوں نے چل کر دکھلادیا، مگر وہ لوگ اس کی تاب نہ لاسکے اور سب کے سب گئے، اس پر شیخ نے فرمایا کہ وہ تو صحابہ کرام تھے کہ برداشت کر لیتے تھے، اور نہ دوسرا کوئی اسے برداشت نہیں کر سکتا۔

شیخ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں یہ بھی لکھا ہے کہ ان کے سامنے جب کوئی شخص کچھ پڑھتا تو سن کر بتا دیا کرتے تھے کہ قرآن کی آیت ہے۔

بَابُ كُفْرَانِ الْعَشِيرِ وَكُفْرُ دُونِ كُفْرٍ فِيهِ عَنْ ابْنِ مَعِينٍ عَنْ

غافدہ کی اشکری بھی ایک طرح کا کفر ہے اور ایک کفر دوسرے کفر سے کم ہوتا ہے اس

الَّتِي صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

باب میں ابوسعیدؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ۔

یا حدیث نبویؐ ، لوگوں نے دریافت کیا کہ آپ کیسے سمجھ لیتے ہیں کہ یہ آیت ہے یا حدیث ؟ شیخ نے فرمایا کہ یہ میرے لئے بالکل بڑھی ہے خدا کی قسم میں دیکھتا ہوں کہ جب کوئی قرآن پڑھتا ہے تو اس کے منہ سے مثل سورج کے روشنی نکلتی ہے اور جب حدیث پڑھتا ہے تو چاند کی طرح روشنی محسوس ہوتی ہے اور جب کسی اور کا کلام ہوتا ہے تو کوئی روشنی نہیں ہوتی بلکہ تاریکی رہتا ہے ، چنانچہ ایک بار لوگوں نے امتحاناً یہ آیت اس طرح پیش کی : حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةِ الْوُسْطَى (وَصَلَاةِ الْعَصْرِ) وَقَوْمُوا لِلَّهِ قَانِتِينَ ، فَرَّ ابْوَلْ ، وَصَلَاةِ الْعَصْرِ حدیث ہے ، اس میں حدیث کا نور ہے ، بقیہ قرآن ہے ۔

ان واقعات سے معلوم ہوا کہ عارفین کا لین کشف کے ذریعہ معلوم کر لیتے ہیں مگر وہ حجت نہیں ، اسی طرح محدثین کو بھی ایسے اشتغال بالحدیث کی وجہ سے ایک ملکہ حاصل ہوتا ہے جیسے صراف سونے چاندی کا صرف دیکھ کر بتلا دیتا ہے کہ کھرا ہے یا کھوٹا ، مگر اس کی وجہ نہیں بتلا سکتا ، بس ذوق سے پہچان لیتا ہے ، اسی کو حافظ نے کہا کہ ذوق حدیث بتلاتا ہے کہ یہ کلام عقاربہ نہیں ہے بلکہ قرآن نبویؐ معلوم ہوتا ہے ۔

بَابُ كُفْرَانِ الْعَشِيرِ وَكُفْرُ دُونِ كُفْرٍ

امام بخاری ترجمہ کے دو لفظ لائے ہیں : ایک کُفْرَانِ الْعَشِيرِ دوسرا کُفْرُ دُونِ كُفْرٍ "عشیر وہ ہے جس کے ساتھ زندگی بسر کی جائے ، زوج کو عشیرہ اسی بنا پر کہتے ہیں ، اس ترجمہ میں ایک تو زوج کے کُفْرَانِ نعت کا ذکر کریں گے اور دوسرے مدارج کُفْرِ بیان کریں گے ، اس لئے کُفْرُ دُونِ كُفْرٍ لائے ۔

دُون کے معنی کبھی غیر کے آتے ہیں جو مثال ہو اور کبھی دُون کے معنی افضل کے آتے ہیں ، حافظ وغیرہ نے دونوں قول نقل کئے ہیں ، مگر شاہ صاحب نے غیر کے معنی لئے ہیں اور میرے نزدیک ثانی معنی بہتر ہیں ، بخاری کا مقصد یہاں یہ بتانا ہے کہ ایمان کے مراتب ہیں ، اس لئے کہ جب کُفْر کے مراتب ثابت ہیں تو ایمان کے بھی مراتب ہوں گے ۔ تشکیک دونوں میں ہے "کُفْرَانِ عشیرہ کے ساتھ ، کُفْرُ دُونِ كُفْرٍ" لانے سے بخاری کا مقصد تو یہ ہے کہ کُفْرَانِ زوج بھی ایک شعبہ کُفْر ہے مگر کُفْر کے مراتب ہیں ، ایک مرتبہ تو یہ ہے کہ ت سے خروج ہو جائے ، اور ایک یہ کہ خروج تو نہ ہو مگر کام ہو کُفْر کا ، اسے یوں سمجھو کہ جتنی اچھائیاں ہیں وہ سب ایمان کی خصلتیں ہیں

۲۸۔ حَدَّثَنَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ مَسْلَمَةَ عَنْ مَالِكٍ عَنْ زَيْدِ بْنِ أَسْلَمَ عَنْ

ہم سے بیان کیا عبد اللہ بن مسلم نے ، انھوں نے امام مالک سے ، انھوں نے زید ابن اسلم سے ،

عَطَاءِ بْنِ يَسَارٍ عَنْ بَنِي عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أُرِيتُ النَّارَ

انھوں نے عطاء ابن یسار سے ، انھوں نے ابن عباس سے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (ایک ایسی حدیث میں) اور

فَإِذَا أَكْثَرُ أَهْلِهَا نِسَاءُ يَكْفُرْنَ ، قِيلَ أَيْ كَفَرْنَ بِاللَّهِ ؟ قَالَ يَكْفُرْنَ الْعَشِيرَ وَيَكْفُرْنَ

میں نے دوزخ کو دیکھا ، کیا دیکھا ہوں کہ وہیں عورتیں بہت ہیں ، وہ کفر کرتی ہیں ، لوگوں نے کہا کیا اللہ کا کفر کرتی ہیں ؟ آپ نے فرمایا

الْإِحْسَانَ لَوْ أَحْسَنْتَ إِلَى أَحَدَاهُنَّ الدَّهْرَ ثُمَّ رَأَتْ مِنْكَ شَيْئًا قَالَتْ مَا رَأَتْ

انہیں ، غاویہ کا کفر (اسکما شکاری) کرتی ہیں اور احسان نہیں مانیں ، اگر تو ایک عورت سے ساری عمر احسان کرے پھر وہ (ایک ذرا سی)

مِنْكَ شَيْئًا ، قَالَتْ مَا رَأَيْتُ مِنْكَ خَيْرًا قَطُّ .

میں نے تو تجھ سے کوئی بات بھی نہ دیکھی (جس کو پسند نہ کرتی ہو) تو کہنے لگتی ہے میں نے تو تجھ سے کبھی کوئی بھلائی نہیں پائی .

کوئی بات تجھ سے دیکھی (جس کو پسند نہ کرتی ہو) تو کہنے لگتی ہے میں نے تو تجھ سے کبھی کوئی بھلائی نہیں پائی .

اور جتنی برائیاں ہیں وہ سب کفر کی خصلتیں ہیں ، تو شعبے دونوں کے ہیں مگر ان میں تفاوت ہے ، اب جہاں کہیں عمل مصیبت

پر کفر کا اطلاق ہوگا تو وہاں امام بخاری تامل نہیں کرتے اور یہ کہتے ہیں کہ تامل کی حاجت نہیں صحیح من تراث الصلوٰۃ متعللاً فقد

کھس میں عام طور پر لوگ اس کی توجیہ کرتے ہیں کہ اس نے فعل کفر کیا یا قریب بکفر ہو گیا ، مگر امام بخاری کہتے ہیں کہ کسی توجیہ کی ضرورت

نہیں ہے ، وہ کفر ہے مگر ایسا نہیں کہ دین سے نکال دے ، اور تارک صلوٰۃ نے بلاشبہ کفر کیا مگر وہ کفر ایسا نہیں ہے کہ اسے خروج من الاسلام

قرار دیا جائے ، ایسی طرح من ادعی غیرابیہ وانتمی الی غیرموالیہ میں بخاری توجیہ نہیں کرتے ، ایسے ہی اس حدیث

میں نیا حاحۃ (نور) کو کفر کہا گیا ، یا وہ حدیث جس میں فرمایا گیا ہے سبب السلف فوق و قتالہ کفر اس قسم کی جملہ صورتوں

میں امام بخاری کوئی توجیہ نہیں کرتے بلکہ ان سب میں یہی کہتے ہیں کہ کفر تو ہے مگر کفر کے مراتب ہیں ، اس لئے ان باتوں سے وہ دین سے

خارج ہو کر کافر نہیں ہو جاتا ، کفر جب ہوگا جب تجوۃ (انکار) ہوگا .

شرح حدیث کے نزدیک یہ الفاظ کفر دون کفر یا ظلم دون ظلم عطاء ابن یسار کے ہیں جو تابعی اور حضرت

عبد اللہ ابن عباسؓ کے شاگرد ہیں ، اور ان کے یہ الفاظ غالباً جبر الامت سیدنا عبد اللہ ابن عباسؓ سے استفادہ و اخوذ ہیں جو انھوں نے اس

آیت وَمَنْ لَمْ يَحْكَمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ کے ذیل میں فرماتے ہیں یعنی مَا أَنْزَلَ اللَّهُ کے مطابق

عبد اللہ ابن عباسؓ کے شاگرد ہیں ، اور ان کے یہ الفاظ غالباً جبر الامت سیدنا عبد اللہ ابن عباسؓ سے استفادہ و اخوذ ہیں جو انھوں نے اس

آیت وَمَنْ لَمْ يَحْكَمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ کے ذیل میں فرماتے ہیں یعنی مَا أَنْزَلَ اللَّهُ کے مطابق

عبد اللہ ابن عباسؓ کے شاگرد ہیں ، اور ان کے یہ الفاظ غالباً جبر الامت سیدنا عبد اللہ ابن عباسؓ سے استفادہ و اخوذ ہیں جو انھوں نے اس

آیت وَمَنْ لَمْ يَحْكَمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ کے ذیل میں فرماتے ہیں یعنی مَا أَنْزَلَ اللَّهُ کے مطابق

بَابُ الْمَعَاصِي مِنْ أَمْرِ الْجَاهِلِيَّةِ وَلَا يَكْفُرُ صَاحِبُهَا بِإِتِكَابِهَا

گناہ جاہلیت کے کام ہیں اور گناہ کرنے والا گناہ سے کافر نہیں ہوتا ، البتہ اگر شرک

إِلَّا بِالشِّرْكَ لِقَوْلِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّكَ أَمْرُؤُفِيكَ جَاهِلِيَّةٌ وَقَوْلِ

کرمے (یکفر کا اعتقاد رکھے) تو کافر ہو جائے گا ، کیونکہ آنحضرتؐ نے (بوزرے) فرمایا تو ایسا آدمی ہے جس میں جاہلیت کی غفلت

اللَّهُ تَعَالَى إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ وَإِنَّ

ہے ، اور اللہ نے (سورہ نساء) فرمایا اللہ تو شرک کو نہیں بخشتے گا اور اس سے کم جس کے چاہے گا (گناہ) بخش دے گا

طَائِفَتَيْنِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتُلُوا فَاصْلِحُوا بَيْنَهُمَا ، فَمَّا هُمُ الْمُؤْمِنُونَ

اور اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان میں میل کرادو ، اللہ نے دونوں کو مسلمان کہا ۔

فیصلہ کرنا کفر تو ہے مگر ایسا کفر نہیں ہے جو دین اسلام سے خارج کر دے ، حضرت ابن عباسؓ نے تنبیہ فرمادی کُفْرًا لَا يَنْقِلُ عَنْ الْمِلَّةِ

معلوم ہوا کہ کفر کے مراتب ہیں ، اور بعض کفر ایمان کے ساتھ جمع ہو سکتا ہے مگر وہ کفر جو حق سے خارج کرنے والا نہ ہو یوں کہہ لو کہ ایک کفر اللہ

ہے ایک کفر اللہ ، چنانچہ کفرانِ معصیہ یہی ہے کہ شوہر کے اعلیٰ پر نا شکری کی گئی ہو ، لطیف بات یہ ہے جو حدیث میں مروی ہے کہ اگر عین اللہ

کو سجدہ کی اجازت دیتا تو عورت کو حکم دینا کہ خاوند کا سجدہ کیا کرے ، اس سے معلوم ہوا کہ زون کا حق شاہ ہے اللہ کے حق کے ، کیونکہ سجدہ شرک

ہے مگر اس کے متعلق ایسا فرما رہے ہیں تو معلوم ہوا کہ اس کا مرتبہ بہت بڑا ہے اس لئے جہاں جہاں کفر کا لفظ آیا ہے اس کو اسی پر عمل کریں گے

قوله فيه عن ابني سعييل ، یعنی اس ترجمہ کے مناسب ایک حدیث مرفوع ہے اور اس کو کتاب الحیض

میں لائیں گے ۔

قوله يكفرن ، یعنی علت کفرانِ نعمت ہے ، بخاری نے کہا بس ہمارا مدعا ثابت ہو گیا کہ یہاں کفر کا اطلاق کیا گیا ہے

اور یہ کفر وہ نہیں ہے جو حق سے خارج کر دے ، تو کفر کے مراتب ثابت ہو گئے ۔

بَابُ الْمَعَاصِي مِنْ أَمْرِ الْجَاهِلِيَّةِ اخ

فرماتے ہیں کہ معاصی امر جاہلیت سے ہیں ، اشارہ ہے کفر و دین کفر کی طرف ، جاہلیت سے وہ زمانہ مراد ہے جو ہشت

نبوی سے قبل کفر کا گذرا ، یعنی ہر عصیت کفر کا ایک شعبہ اور ایک علامت ہے لیکن صرف اس سے تکفیر نہیں ہو سکتی ، ہاں اگر کفر صرف کامرب

ہو تو تکفیر کی جائیگی ، پہلے جزد کا ثبوت حدیث سے دیں گے اور دوسرے کا ثبوت سے پہلے کا ثبوت إِنَّكَ أَمْرُؤُفِيكَ جَاهِلِيَّةٌ

ہے ، تم ایسے آدمی ہو جس میں جاہلیت ہے ۔

یہ ایک خاص مقصد تھا، انھوں نے (ابو ذر غفاریؓ نے) کسی کو باندی بچہ (یا ابنت السوداء) کہہ دیا تھا، حضورؐ نے سنکر فرمایا: **اِنَّكَ اَمْرٌ اَخ** تم میں جاہلیت ہے، یعنی آپ نے سمجھا یا کسی کو عار دلانا (یا گالی دینا) یہ جاہلیت کی نشانی ہے اور یہ نشانی تم میں باقی ہے، اس لئے تمہیں اسے چھوڑ دینا چاہئے، دوسرا جزو **ولا یکفر صاحبها** اَخ ہے، اس کی دلیل ہے **اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْفَاسِقِ** اَنْ یُشْرَکَ بِهِ^(۱)۔ یعنی شرک بھی ایک فرد کو کفر کا ہے، علاوہ کفر و شرک کے کسی پر تخلیق فی النار کا حکم نہیں لگا سکتے، اب یہ سوال باقی ہے کہ آیت میں شرک کیوں فرمایا، کفر کیوں نہیں فرمایا گیا؟ اس پر مفسرین نے بہت کچھ لکھا ہے، مگر شافی جواب اب تک نہیں ملا، یوں کہا جاسکتا ہے کہ مشرکین کی کثرت کی وجہ سے یہ عنوان رکھا گیا ہو، مگر اصل یہ ہے کہ کوئی قوم دولت جو اسلام کے اعتبار سے کافر ہو، شرک سے خالی نہیں، گویا یہ شرک ایک حیثیت سے کفر کو لازم ہو گیا ہے، ہنود کا شرک تو کھلا ہوا ہے، عیسائی زبان سے توحید کے قائل ہیں مگر ساتھ ہی توحید فی التثلیث اور تثلیث فی التوحید کا عقیدہ بھی رکھتے ہیں جو منافی توحید ہے، جو کسی کہتے ہیں دوستقل خدا ہیں، ایک کا تعلق غیر سے ہے اور ایک کا شر سے، یہودی توحید ان سب سے بڑھ کر ہے، وہ ایک کے سوا کسی کو خدا نہیں ماننے لیکن شرک کا انھما شرک فی اللہ میں نہیں بلکہ اگر حق تعالیٰ کے لئے ایسے صفات ثابت کئے جائیں جو ایک مسمولی انسان کے لئے ہیں تو یہ بھی شرک ہے اور بہت بڑا شرک ہے چنانچہ پہلے کہیں گندرجکا ہے کہ اب بھی ان کی تورات میں اس طرح کے خرافات بھرے پڑے ہیں، مغلہ ان کے یہ بھی ہے کہ ایک دفعہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی کشتی ہوئی اور یعقوب علیہ السلام نے (العیاذ باللہ ثم العیاذ باللہ) اللہ تعالیٰ کو پچھاڑ بھی دیا تھا کَبُرَتْ کَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ اِنْ یَقُولُوْنَ اِلَّا کَذِبًا^(۲)

یہود کے قلوب ان کی حد سے زیادہ کشری اور بدکاری کے سبب بسخ ہو گئے تھے اور وہ اللہ کی بارگاہ اقدس میں بے انتہا گستاخ ہو گئے تھے، اللہ کے بارے میں ان کی بے باکی اس قدر بڑھ گئی تھی کہ وہ ہزار باری کی حد تک کہو اس کرنے لگے تھے، قرآن نے انہیں کا یہ قول نقل فرمایا ہے **یَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ**^(۳) (اللہ کا ہاتھ بند ہو گیا) اس سے ان کی مراد یا تو یہ تھی کہ اللہ تنگدست ہو گیا، اب اس کے پس کچھ نہیں رہا، یا غل ید، غل و اساک سے کنایہ قرار دیا ہو، یعنی وہ تنگدست تو نہیں مگر بغیل ہو گیا۔

اسی طرح جب قرآن کی آیات نازل ہوئی **مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا**^(۴) (کون ایسا ہے جو قرض دے اللہ کو اچھی طرح) تو انہیں یہود نے مذاق اڑاتے ہوئے یہ کہا تھا: **اِنَّ اللّٰهَ فَقِیْرٌ وَنَحْنُ اَغْنِیَاءُ**^(۵) (اللہ فقیر ہے اور ہم مالدار)

دیکھو اللہ تعالیٰ ہو گیا ہے اور ہم فنی ہیں اس لئے ہم سے قرض الگت ہے، یہ ان یہود کا حال تھا جو توحید کے تائل تھے، میں تو کہا کرتا ہوں کہ نصاریٰ نے آدمی کو خدا بنادیا اور یہود نے خدا کو آدمی، بلکہ آدمی سے بھی کم بنادیا۔ الغرض کافروں کی کوئی قوم شرک سے خالی نہیں، پتا چلتا ہے کہ سب مسلمان ہی ہے، میری مراد ان مسلمانوں سے ہے جو اصل اسلام سے تمک کرنے والے ہوں، مبتدعین کا ذکر نہیں، مسلمانوں میں مبتدعین میں ان میں اور مشرکین میں باریک فرق ہے جو پھر کبھی بیان ہوگا۔ تو متنبہ کر دیا کہ کفر و شرک تو اہم ہیں اور دونوں ساتھ رہتے ہیں، کوہن یا شریع میں یا ذات و صفات میں، کسی نہ کسی میں ضرور شریک ہیں اور یہ اتفاق کفر و شرک کے اجتماع کے سبب ہے، از دم عقلی تو نہیں ہے مگر واقعہ یوں ہی ہے، یہی حال آریہ سماج کا بھی ہے، ان کے یہاں تین خدا ہیں، ایک مادہ، دوسرا روح، تیسرا خدا، بلکہ ان کے معبود ہنؤ کے معبودوں سے بھی بڑھ کر ہیں، کیونکہ ان کے (آریہ کے) یہاں وہ ذات جن کو فلاسفہ اجزائے ذی مقراضیہ کہتے ہیں، غیر مخلوق ہیں، فرق اتنا ہے کہ خدا کی قدرت غیر محدود ہے اور ان اجزاء کی محدود۔ سنات دھرم تو کہتے ہیں کہ غیر مخلوق صرف اللہ ہے، باقی سب مخلوق ہیں، گو وہ ان کے معبود بھی ہیں، مگر یہ آریہ تو روح اور مادہ کو بھی غیر مخلوق کہتے ہیں اور یہ کہ وہ اپنے وجود میں اللہ کے محتاج نہیں ہیں بلکہ اللہ کا محتاج ہے، وہ قادر نہیں کہ بلا روح و مادہ کے کوئی کام کر سکے، تو ان میں خالص توحید کہاں، رہے سگھ تو ان کا مجھے کافی علم نہیں، کسی کھ کی لکھی ہوئی صرف ایک کتاب دیکھی ہے جو مسلمان ہو گیا تھا، سکھوں کے پیر گرو نانک حضرت بابا فرید الدین گنج شکر کے شریک مجلس رہ چکے ہیں اور ان کے دو بے بھی ہیں جن سے توحید و رسالت ثابت ہے، ان کے چولے میں آیہ الکرسی اور دوسری آیات بھی لکھی ہیں، بعض لوگوں کے نزدیک موصد اور سچے مسلمان تھے، ان کا مقصد یہ تھا کہ ہنؤ سے گھل مل کر انھیں مسلمان بنایا جائے مگر ان کے بعد ان کا گروہ مسلمانوں کا حریف ایک سیاسی گروہ بن گیا اور گروہ داروں کو پوجنے لگا۔ الحاصل اہل موصد سوائے اہل اسلام کے اور کوئی نہیں۔

قوله المَعاصِي مِنَ الْجَاهِلِيَّةِ گناہ جاہلیت کے کام ہیں (اگر جاہلیت سے مراد امور کفر ہیں، اسلئے کہ دور جاہلیت کا اطلاق دور کفر پر ہوتا ہے) اس سے شبہہ گندرسے لگا کر جب معاصی شعب کفر ہیں تو ہر عامی میں شعبہ کفر بھی موجود ہے، پھر اسے کافر کیوں نہیں کہتے؟ کیوں کہ شتق کامل دہاں ہوگا جہاں مبداء قائم ہو، اسی شبہہ کا جواب دے رہے ہیں کہ شتبیہ کفر تو ہے، مگر لا یکفر صاجبھا یعنی اس کے مرکب کی کفر نہ کی جائے گی نہ وہ غلڈنی انار ہوگا، غلڈنی انار اس وقت ہوگا جب وہ جہاز کفر کا التزام کرے۔ جس طرح اعضاء انسانی میں تفاوت ہے، اسی طرح ایمان و کفر میں تفاوت مراتب ہے، اکثر شرار یہی کہتے ہیں گزیرے نزدیک سب سے بہتر اور عمدہ جواب وہ ہے جو ان قیم نے اپنی کتاب الصلاۃ میں دیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ ضروری نہیں کہ جب مبداء اشتقاق قائم ہو تو عرفا شتق کامل کیا جائے، مثلاً کوئی فقہ کے چند مسئلے جانتا ہو تو اسے فقہیہ نہ کہیں گے، ایسے ہی طیب اس کو

کہیں گے جس کو چند سئلے یا چند نسخے طب کے آتے ہوں، اسی طرح مالدار اسے نہ کہیں گے جو چند روپے رکھتا ہو، تو یہ ضابطہ کلیہ: ہوا کہ جب مبداء اشتقاق قائم ہو تو مشتق کا محل ضرور ہو، کسی کو طبیب یا عالم یا مالدار اسی وقت بولیں گے جب اس میں ایک خاص وجہ طب یا علم یا مالدار کا موجود ہو، اسی طرح ہم کہتے ہیں کہ ہر معصیت کفر ہے اور ہر طاعت ایمان، مگر یہ لازم نہیں کہ جہاں کوئی معصیت پائی جائے تو اس کا مرکب کافر ہو جائے اور جہاں کوئی طاعت پائی گئی تو مومن ہو جائے، بلکہ کافر اس وقت کہیں گے جب وہ مخصوص پر پہنچ جائے جیسا کہ ابن ہمام نے تصریح کی کہ اگر کوئی صم کو سجدہ کرے یا نوذ باشد معصیت کو قاذورات میں ڈال دے تو اب یہ حد ہے کہ اس کو کافر کہا جائے، اس حد مخصوص سے نیچے یہ تو کہیں گے کہ فعل کفر کیا مگر یہ نہ کہیں گے کہ کافر ہو گیا۔ اب بخاری کے لفظ کو دیکھو (لَا يَكْفُرُ صَاحِبُهَا) یعنی کفر تو ہے مگر جس نے کیا ہے اسے کافر نہ کہیں گے ملت خارج نہ کریں گے۔

تَوَلَّوْا وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنْكُمْ فِرَاقَ بَيْنِهِمَا فَلْيُحْلِلْ أَحَدُهُمَا لِبَاسَ الْآخَرِ وَأَكْلًا ۖ وَلَا تَجْرِمُوا ظُلْمًا وَلَا تَتَّبِعُوا الْأَمْرَ الَّذِي يَتَّبِعُ السُّفَهَاءُ ۚ إِنَّهُمْ يُضِلُّونَ سُبُلَ اللَّهِ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ

بھی سرسری گذر گئے اور کچھ زائد اعتناء نہیں کیا، ورنہ بخاری بڑی گہری بات کہہ گئے ہیں، شروع میں گذر چکا ہے کہ جزئیت و عدم جزئیت اعمال میں نظر کا فرق ہے، غمہ کا فرق نہیں، ہاں اس میں اختلاف ہے کہ کیا مطلقاً لفظ مومن بلا کسی شرط و قید کے کسی معصیت کے مرکب یا فرفر و واجب کے نامک پر بولا جائے گا؟ تو جہر کہتے ہیں کہ مطلق نہ کہیں گے بلکہ کوئی نہ کوئی قید لگائیں گے، چنانچہ ابن تیمیہ نے کتاب الایمان میں بیان کیا ہے کہ مطلق مومن تو کہیں گے لیکن مومن مطلق نہ کہیں گے، مومن یا ایمان ناقص وغیرہ کہیں گے۔

یہاں بخاری آیت وان طائفتان کے بارے میں کہتے ہیں کہ اگر مومنین کی دو جماعتیں جھگڑیں تو ان میں باہم صلح کرادو، فان بغت الایۃ یعنی ان میں کوئی ایک تعدی کرے (یعنی کے معنی یہاں تعدی کے ہیں) تو اب باہمی سے لڑو، حَتَّىٰ تَقِيَعَ ۚ الایۃ یہاں تک کہ اللہ کے امر کی طرف لوٹ آئے۔ تو ان دو لڑنے والی جماعتوں کے احکام بیان کر رہے ہیں اور ساتھ ہی فرماتے ہیں 'مِنَ الْمُؤْمِنِينَ' مسلمان بھی نہیں کہتے، اس ترجمہ کے ساتھ یہ آیت لاکر بتا دیا کہ معاصی کے مرکب کو مومن کہیں گے، آگے بخاری خود کہتے ہیں فَسَبَّاهُمُ الْمُؤْمِنِينَ معلوم ہوا کہ مرکب کبیرہ یا بزرگ صلوٰۃ وغیرہ پر مومن ہی کا اطلاق ہوگا، اب بھی اسے مومن ہی کہیں گے، امام بخاری نے بڑی چیز بیان کر دی ہے، مگر شاہین نے زیادہ اعتناء نہیں کیا۔

حدیث ۲۹۰ اگلی حدیث بھی اسی کے مناسب ہے، اس میں اخف ابن قیس کا واقعہ ہے کہ میں اپنے گھر سے باہر چلا (میںنا علی رضی اللہ عنہ) کی مدد کرنے کے لئے نکلا، یہ اپنی قوم کے سردار تھے، اور بعض روایات میں ہے کہ میں سح اپنی قوم کے نکلا، فتح باری میں تصریح ہے کہ یہ واقعہ محل کا ہے، راستہ میں جو بکرہ قتل گئے اور سوال کیا کہاں جا رہے ہو؟ میں نے جواب دیا کہ ان کی مدد کرنے کے لئے، کہنے لگے لوٹ چلو، نئے سے

۲۹۔ حَدَّثَنَا عَبْدُ الرَّحْمَنِ بْنُ الْمُبَارَكِ قَالَ حَدَّثَنَا حَمَادُ بْنُ زَيْدٍ قَالَ
ہم سے بیان کیا عبد الرحمن بن مبارک نے کہا ہم سے بیان کیا حماد بن زید نے کہا ہم سے بیان کیا ایوب دیوس نے

علحدہ رہو، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جب دو مسلمان تلوار لیکر گھٹکھ جائیں (التقاء؛ گھٹکھ جانا) تو قاتل و مقتول دونوں ناراض ہیں، میں نے کہا یا رسول اللہ! مقتول کا کیا تصور ہے؟ آپ نے فرمایا یہ بھی اس کے قتل پر حزیں تھا، اتفاق سے اس کا وار نہ چلا اور نہ مستعدی میں کچھ کمی نہیں تھی، یعنی قاتل بھی قاتل بننا چاہتا تھا، اس کی تیاری بھی کی تھی، مستعد بھی تھا، اس لئے یہ بھی سزا کا مستحق ہوا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم لفظ حزیں بولے، یعنی یہ کہ صرف عزم و ارادہ نہیں تھا، عزم میں تو اختلاف ہے کہ اس پر مواخذہ ہے یا نہیں، بعض کے نزدیک عزم پر بھی مواخذہ ہے اور بعض کہتے ہیں کہ نہیں، البتہ میرے نزدیک عزم پر اس وقت تک کوئی مواخذہ نہیں جب تک اسے کرتا نہیں، راہبیا جو حدیث میں مذکور ہے، تو اس کے متعلق میری سمجھ میں آتا ہے کہ اس کا مرتبہ عزم سے بڑھ کر ہے اور اس پر ضرور عذاب ہے، حزیں کا مطلب یہ ہے کہ وہ کوشش کرے، اسباب ہیا کرے اور جدوجہد میں لگا رہے اور یہ عزم سے آگے کا مرتبہ ہے، عزم میں حب یا حسد وغیرہ کو داخل کرنا صحیح نہیں کیونکہ وہ علاوہ عزم کے افعال قلب میں سے ہیں، یہی مفہوم ہے اس آیت کا اِنْ الَّذِينَ يُحِبُّونَ اَنْ تَنِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِي الذِّمَنِ اَمْ وَاللَّهِ عَذَابُ ابْنِ الْيَمْرِ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ط۔ یہ حب، اشاعت فحش، سبب عذاب ہے یہ عزم نہیں ہے۔

حضرت ابو بکرؓ نے حدیث کے اطلاق و عدم کو دیکھ کر اس موقع پر اس کو بیان کر دیا، حالانکہ یہ ان حضرات پر ہرگز چسپاں نہیں ہوتی، دراصل حدیث ان لوگوں کے حق میں ہے جو بدوُن کسی تاویل اور ہلکی اجتہادی غلطی کے ناحق لڑیں، ان ناحق لڑنے والوں میں چونکہ اکثر پر نفسانیت غالب رہتی ہے اور افتد واسطے نہیں ہوتی، اس لئے حضورؐ نے ان کی مذمت فرمائی، لیکن جو شخص دین کے لئے لڑتا ہوا اور یہ سمجھتا ہو کہ یہی اہل اسلام کے لئے اصل ہے تو وہ اس حدیث کے تحت داخل نہیں، اسی صورت میں فریقین میں سے کسی کے بارے میں فی انذار نہیں کہہ سکتے، ہاں خطا، اجتہادی ہو تو ہو، مگر خطا، اجتہادی ہرگز قابل گرفت نہیں اور اگر درمیان میں کچھ زیادتی بھی ہو گئی ہو تو وہ ان کے حسنات کے مقابل میں کچھ نہیں اس کی مثال ایسی ہے جیسے قرآن میں موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کا قصہ بیان ہوا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وہ طرز پر جب فرمان خداوندی لینے کو جانے لگے تو اپنے بھائی ہارون علیہ السلام کو اپنا قائم مقام بنایا اور انھیں تاکید کی کہ میرے جانے کے بعد میری قوم کی دیکھ بھال کرتے رہیں، جب موسیٰ علیہ السلام چلے گئے تو سامری نے ایک بچھڑا بنا کر قوم سے کہا کہ اِنَّ هَذَا اَللّٰهُمَّ وَاللّٰهُمَّ مَوْسٰیؑ (۳۱) یہ تمہارا معبود ہے اور موسیٰ علیہ السلام کا بھی، قوم نے سامری کی بات مان لی اور گو ساکہ کو پوجنے لگے، ہارون علیہ السلام نے انھیں بہت سبھایا اور پورا زور لگا دیا مگر قوم نے نہ مانا بلکہ ہارون علیہ السلام کی مخالف ہو گئی جیسا کہ خود ہارون علیہ السلام نے کہا وَكَذٰلِكَ اَوۡفَقْنَا لَنُوۡنٰی (۳۲) (قریب تھا کہ تجھے قتل ہی کر ڈالیں) تو ہارون علیہ السلام مجبور ہو کر پت

خَدَّثَنَا أَيُّوبُ وَيُونُسُ عَنِ الْحَسَنِ عَنِ الْأَحْنَفِ بْنِ قَيْسٍ قَالَ ذَهَبْتُ لِأَنْصُرَهُ هَذَا
 حَسَنٌ ۱ انھوں نے احنف بن قیس سے کہا میں چلا اس شخص کی مدد کرنے کو ۱ راستہ میں مجھ سے ابوبکر نے پوچھا ۱
 الرَّجُلُ فَلْيَقِنِي أَبُو بَكْرَةَ فَقَالَ أَيْنَ تَرِيدُ قُلْتُ أَنْصُرُهُ هَذَا الرَّجُلُ ۱ قَالَ ارْجِعْ فَإِنِّي
 کہاں جاتے ہو؟ میں نے کہا اس شخص کی مدد کرنے کو ۱ کہا اپنے گھر کو لوٹ جائیں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا
 سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ إِذَا لَقِيَ الْمُسْلِمَانِ بِسَيْفَيْهِمَا فَالْقَاتِلُ
 آپ فرماتے تھے جب دو مسلمان اپنی تلواریں لے کر لڑ جائیں تو قاتل و مقتول دونوں دوزخی ہیں ۱ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ
 وَالْمَقْتُولُ فِي النَّارِ قُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ هَذَا الْقَاتِلُ فَمَا بِالْمَقْتُولِ قَالَ إِنَّهُ كَانَ
 قَاتِلٌ تَوَنُّيرٌ (مرد دوزخی ہوگا) مقتول کیوں دوزخی ہوگا؟ فرمایا ۱ اس کو اپنے بھائی کو مار ڈالنے کی
 حَرِيصًا عَلَى قَتْلِ أَخِيهِ
 خواہش تھی ۔

ہو رہے ۱ اللہ نے موسیٰ علیہ السلام کو خبر دی کہ سامری نے قوم کو گمراہ کر دیا ۱ موسیٰ علیہ السلام آئے تو بھائی ہارون پر غلبہ تھا ہوسے اور فرمایا اَللّٰهُو
 مَا مَعَكَ اِذْ رَاَيْتَهُمْ ضَلُّوْا ۚ اَلَا تَتَّبِعُنَّ اَمْرِيْ ۚ قَالَ يَبُوءُ مَا لَا تَاْخُذُ بِصَيْحِيْ وَلَا بِرَاْيِيْ ۚ اِنَّ اٰلِيَّ تَمَنَّوْا بِمِيْرٍ
 نافرمانی کی اور ان کو روکا نہیں ۱ اور اتنا خفا ہونے کہ ان کی دائرہ میں اور سر کے بال پڑ کر جھنجھوٹا ۱ تب ہارون علیہ السلام نے کہا آپ میری دائرہ میں اور
 سر کے بال نہ پکڑیں ۱ دیکھئے اس سے دشمنوں کو اور خوش ہونے کا موقع ملے گا ۱ میں نے کوئی کسر نہیں اٹھا دی مگر قوم میرے قتل کے درپے ہو گئی ۱
 اور اس نے میری بات نہ مانی ۱ اس کے بعد موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رب سے اپنے اور اپنے بھائی کے لئے معافی چاہی ۱ یہ واقعہ قرآن میں مذکور
 ہے ۱ تو کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ہارون علیہ السلام جو نبی تھے اور موسیٰ علیہ السلام نے اللہ سے کہہ کر ان کے لئے نبوت کا پروانہ لیا تھا ۱ بڑے
 بھائی تھے ۱ ان کی موسیٰ علیہ السلام نے توہین کی؟ ہرگز نہیں ۱ کوئی اسے توہین بنی نہیں کہہ سکتا ۱ تو جس طرح یہ ایک مشاجرہ تھا موسیٰ و ہارون
 علیہما السلام میں ۱ اسی طرح صحابہؓ کے مشاجرات کو سمجھو ۱ اللہ نے ایک نمونہ دکھلادیا کہ آپس کے ایسے مشاجرات کی وجہ سے ناریں جانا ضروری نہیں
 ان وقت تو احنف ابن قیسؓ واپس آگئے ۱ مگر دوسرے معرکوں میں شرکت کی ۱ جنگ جمل کے بارے میں اتنی بات یاد رکھو کہ یہ
 تکلیف دہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب شہادت عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر مدینہ میں بیت ہوئی ۱ اس بیعت

میں قاتلین عثمان بھی تھے، بلکہ وہ آگے آگے تھے، عبداللہ ابن سبا یہودی نے جو گروہ دین اسلام کی دشمنی میں بنایا تھا اسی گروہ نے عثمان رضی اللہ عنہما کے علی رضی اللہ عنہما کو خلافت کے لئے منتخب کیا، اہل مدینہ نے بھی بیعت کر لی، اس وقت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا حج کو گئی تھیں، عشرہ مبشرہ میں دو صحابی طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما ام المومنین کے پاس حاضر ہوئے اہد بلایا کہ عثمانؓ کو گھر میں تلاوت قرآن کی حالت میں غلطاً شہید کر دیا گیا اور قاتل حضرت علیؓ کی جماعت میں شامل ہو گئے ہیں، اس لئے حضرت علیؓ سے قصاص عثمانؓ کا مطالبہ کرنا اور قاتلین کو سزا دلوانا چاہئے، ام المومنینؓ نے تائید فرمائی، اس کے بعد یہ حضرات انھیں لے کر بصرہ پہنچے اور وہاں کے لوگوں کو ہم خیال بنایا، سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو جب معلوم ہوا کہ اس طرح مقابلہ کی تیاری ہو رہی ہے تو انھوں نے بھی جوابی تیاری کر لی لیکن لڑائی سے پہلے کی گھٹنگوں میں یہ بات طے ہو گئی کہ قاتلین عثمانؓ کو حضرت علیؓ اپنے لشکر سے ہٹا کر دیں گے کیونکہ ان سے قصاص لینے کی ابھی گنجائش نہ تھی، ان قاتلین نے سوچا کہ یہ تو کچھ نہ ہوا، انھوں نے صلح کر لی اور ہم پٹے، تو انھوں نے آپس میں سازش کر کے اپنے کچھ آدمیوں کے ذریعہ رات کے وقت حضرت علیؓ کے لشکر پر پتھر اڑا دیا، یہ سمجھ کر ہم سے غدر کیا گیا، اسی طرح کچھ لوگوں نے ام المومنینؓ کے لشکر پر پتھر اڑا دیا، انھوں نے بھی یہی سمجھا کہ ہم سے دھوکہ کیا گیا، اس طرح لڑائی شروع ہو گئی اور فریقین کے بہت سے صحابہ شہید ہو گئے، اس کے بعد حضرت علیؓ نے پورے احترام کے ساتھ ام المومنینؓ کو مدینہ پہنچا دیا، اس موقع میں طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما بھی شہید ہو گئے، حضرت علیؓ نے قاتل زبیرؓ کو جہنم کی بشارت سنائی، جو انھوں نے حضور سے سنی تھی اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کا وہ ہاتھ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدافعت میں غزوہ احد میں ل ہو گیا تھا، حضرت علیؓ بار بار چومتے اور روتے ہوئے کہتے، اے یہ وہ ہاتھ ہے جس نے غزوہ احد میں حضور پر بستے ہوئے تیر روکے تھے، ان قاتلین عثمانؓ کو اور پورے ل ل گیا اور وہ زیادہ ذلیل ہو گئے اور ان دشمنانِ دین نے حضرت علیؓ کو خانہ جنگی میں جھونک دیا اور ایسے فتنے قائم کر دیے جو آج تک پل رہے ہیں، انھوں نے حضرت علیؓ سے بڑے بڑے عہدے بھی حاصل کئے اور سیاست پر کچھ اس طرح چھائے۔

رہے کہ حضرت علیؓ بے بس ہو گئے، پھر اسی گروہ کے ایک طبقے نے خارجی بن کر حضرت علیؓ کو باجم شہادت نوش کرایا (۱۱) اس واقعہ مجلس میں جتنے صحابہ شہید ہوئے وہ سب جنتی ہیں خواہ وہ کسی فریق کے ہوں، اور چونکہ یہ لڑائی انصافیت کی نہ تھی حتیٰ پر لڑائی گئی اس لئے کوئی بھی ان میں سے خدا کے ہاں مجرم نہیں اور نہ اس حدیث کے تحت آتا ہے جس میں القتال والمقتول کلاهما فی النار فرمایا گیا ہے، ابو بکرہ رضی اللہ عنہ نے حدیث کے اطلاق و عموم کو دیکھ کر غلط فہمی کی بنا پر اس حدیث کو اس موقع پر بیان کر دیا، یہ بات خوب

(۱۱) اور دوسرا گروہ روافض کے نام سے آج بھی اس فتنہ کو زندہ کئے ہوئے ہے (جانت)

۳۔ حَدَّثَنَا سُلَيْمَانُ بْنُ حَرْبٍ قَالَ حَدَّثَنَا شُعْبَةُ عَنْ وَاصِلِ الْأَعْدَبِ

ہم سے بیان کیا سلیمان بن حرب نے ، کہا ہم سے بیان کیا شعبہ نے ، انھوں نے واصل اعدب سے
عَنِ الْمَعْرُورِ قَالَ لَقِيتُ أَبَا ذَرٍّ بِالرَّبَذَةِ وَعَلَيْهِ حُلَّةٌ وَعَلَى غُلَامِهِ حُلَّةٌ فَسَأَلْتُهُ
اَنْھوں نے معرور سے ، کہا میں نے ربذہ میں ابو ذر سے ملاقات کی وہ ایک جوڑا پہنے تھے ، اور ان کا غلام بھی ویسا ہی ایک جوڑا
عَنْ ذَلِكَ فَقَالَ إِنِّي سَابَبْتُ رَجُلًا فَعَيَّرْتُهُ بِأَمِّهِ فَقَالَ لِي النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
پہنے ہوئے تھے ، میں نے ان سے اس کی وجہ پوچھی ، انھوں نے کہا میں نے ایک شخص سے گالی گلوچ کی اور اس کو ماں کی گالی دی ۔
يَا أَبَا ذَرٍّ أَعَيَّرْتَهُ بِأَمِّهِ إِنَّكَ أَمْرُؤُفِيكَ جَاهِلِيَّةٌ إِنْ خَالَكُمُ خَوْلَكُمُ جَعَلَهُمُ اللَّهُ تَحْتَ
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا : تو نے اس کو ماں کی گالی دی ، تو وہ آدمی ہے جس میں جاہلیت کی خصلت ہے ، تمہارے غلام
أَيُّدِيكُمْ فَمَنْ كَانَ أَخُوهُ تَحْتَ يَدَيْهِ فَلْيُطْعِمْهُ مِمَّا يَأْكُلُ وَلْيُلْبِسْهُ مِمَّا يَلْبَسُ
تمہارے بھائی ہیں ، اللہ نے انھیں تمہارے ہاتھ کے کر دیا ، پھر جس کا بھائی اس کے ہاتھ تلے ہو وہ اس کو وہی کھلانے جو آپ
وَلَا تَكْفُرُوهُمْ مَا يَغْلِبُهُمْ فَإِنْ كَفَفْتَهُمْ فَاعِينُوهُمْ
کھائے اور وہی پہنائے جو آپ پہنتے اور ان سے وہ کام نہ لو جو ان سے نہ ہو سکے ، اگر ایسا کام لینا چاہو تو ان کی مدد کرو

یاد رکھنے کی ہے کہ مشاجرات صحابہ میں کسی فریق کے خلاف کچھ نہ کہا جائے ، معاملہ ان کا اور خدا کا ہے ، دونوں خدا کے جیتے ہیں ،
دین کے فدائی اور نبی علیہ السلام کے جان نثار ہیں ، ان کے بارے میں گستاخی سے سلب ایمان کا خطرہ ہے ، حضور کا ارشاد گرامی ہے : إِذَا رَأَيْتُمُ
الَّذِينَ يَسْتَوْنَ أَصْحَابِي فَقُولُوا لَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى شَرِكُمْ ، اى لعنة الله عليكم بسبب شرككم (جب تم دیکھو ان لوگوں
جو برے اصحاب کو برا کہتے ہیں تو کہو اللہ کی لعنت تمہارے شر پر ، یعنی اللہ کی لعنت تم پر تمہارے شر کی وجہ سے) اس لئے سب مسلمانوں کو اس
پنچا بہت ضروری ہے ۔

یہاں ترجمہ کو حدیث سے دو طرح سے مناسبت ہے ، اول تو یوں کہ باوجودیکہ علم فرما رہے ہیں القاتل والمقتول
فی النار ، لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی فرما رہے ہیں کہ اذا التقى المسلمان اثنی معلوم ہوا کہ وہ اسلام سے خارج نہیں ہیں ، لہذا
ولا یکفر صاحبھا (اس لڑنے والے کی کفریز کی جائے گی) بالکل صحیح اور درست ہوا ، اور امام بخاری اسی کو ثابت کرنا چاہتے تھے ۔

انی سبابت رجلاً فعیرتہ بامہ ، ایک بار میں نے غلام کو باندی بچہ کھدیا تو حضور نے فرمایا اَعِیْرَتَہُ بِأُمِّہُ ؟ کیا تم نے اس کو اس کی ماں کی طرف سے عار دلایا ، انک امرؤ فیک جاہلیۃ (تم ایسے آدمی ہو جس میں جاہلیت موجود ہے) یعنی بات اسلامی تہذیب کے خلاف ہے کہ کسی کو حقیر اور ذلیل سمجھ کر اسے طعن دیا جائے ۔

لفظ "امرو" کی یہ عجیب خصوصیت ہے کہ جیسا اعراب اس کے لام کلمہ پر ہوگا اسی طرح کا اعراب عین کلمہ پر بھی ہوگا، یہاں لام کلمہ ہمزہ ہے اور اس پر ضمہ ہے اس لئے عین کلمہ میں راء پر بھی ضمہ ہوگا۔

پھر آپ نے سمجھایا: اِخْوَانُکُمْ خَوَلُکُمْ۔ یہ تمہارے خدمت گار تمہارے بجائے ہیں "خول" سے مراد محض غلام نہیں، بلکہ عام خدمت گار کے معنی میں ہے، خواہ غلام ہو یا نہ ہو، چونکہ انسان ان سے متبع حاصل کرتا ہے اس لئے ان کو خول کہتے ہیں۔
 جَعَلَهُمُ اللّٰهُ تَحْتَ اَیْدِیْکُمْ، ہاں اتنا فرق ضرور ہے کہ اللہ نے انہیں تمہارے ہاتھ کے نیچے کر دیا ہے لہذا تم ان کے ساتھ سختی نہ کرو۔

پھر فرمایا فہن کان اخوہ تحت یدہ فلیطعمہ مہمایا گل اخڑ بلکہ جب کسی مومن کا بجائی اس کی ماتحتی میں ہو تو اس کو چاہئے کہ جو خود کھائے وہی اس کو بھی کھلائے اور جو خود پینے وہی اس کو بھی پینائے اور اس سے دشوار کام مت لو اور اگر کوئی ایسا کام پڑ ہی جائے تو تم خود بھی اس کی مدد کرو تاکہ اس کی حوصلہ افزائی ہو۔

اس کا اثر ابوذر رضی اللہ عنہ پر ایک تو یہ چڑکا انھوں نے اپنے اس غلام^{۱۱} سے معافی مانگی اور معاف کر کے ہی چھوڑا، دوسرا یہ کہ اپنے غلام کے ساتھ وہ بنا تو کیا جس پر معذور کو تعجب ہوا، یہاں بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ دونوں برکیاں ملے تھیں جیسا ابوذرؓ کا تھا

بَابُ ظَلَمٌ دُونَ ظَلَمٍ

ایک گناہ دوسرے گناہ سے کم ہوتا ہے

۳۱۔ حَدَّثَنَا أَبُو الْوَلِيدِ قَالَ حَدَّثَنَا شُعْبَةُ قَالَ وَحَدَّثَنِي بِشْرُ بْنُ

ہم سے بیان کیا ابو الولید نے کہا ہم سے بیان کیا شعبہ نے ، دوسری سند : امام بخاری نے کہا اور مجھ سے بیان کیا بشیر نے
حَدَّثَنَا مُحَمَّدٌ عَنْ شُعْبَةَ عَنْ سَلِيمَانَ عَنْ إِبْرَاهِيمَ عَنْ عَلْقَمَةَ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ
کہا ہم سے بیان کیا محمد نے ، انھوں نے شعبہ سے ، انھوں نے سلیمان سے ، انھوں نے ابراہیم سے ، انھوں نے علقمہ سے ، انھوں نے عبد اللہ بن مسعود

دیا یہی غلام کا بھی تھا ، مگر بعض روایات میں تصریح ہے کہ حد کی اس نہ تھا بلکہ شکل یہ تھی کہ دو حملے تھے اور ان میں سے ایک کی نوعیت کچھ اور
تھی ، دوسرے کی کچھ اور ۔ حملہ میں دو کپڑے ہوتے ہیں ، ایک تہبند کے کام آتا ہے ، دوسرا اوپر کے بدن پر اور دونوں ایک ہی طرح کے
ہوتے ہیں ، مگر یہاں حضرت ابوذرؓ نے یہ کیا تھا کہ ایک حملہ کا ایک کپڑا خود پہنا اور اسی حملہ کا دوسرا کپڑا غلام کو پہنایا ، اسی طرح دوسرے حملہ کا
ایک اپنے لئے منتخب کیا اور دوسرا غلام کے لئے ، اس پر معذور کو تعجب ہوا اور سوال کیا ، ابوذرؓ نے اس کا جواب دیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے
غلاموں اور خدمتگاروں کے ساتھ سلوک کے یہ اخلاق سکھائے ہیں اس لئے میں اس پر عمل ہوں ۔

یہ بات یاد رکھو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ راہ نہیں تھی کہ بالکل مساوات ہو بلکہ راوی یہ تھی کہ ان کے ساتھ مواساتہ اور ہمدردی ہونی
چاہئے جیسا کہ دوسری روایت میں ہے فانہ ولی علاجہ کیونکہ اس نے شفقت برداشت کی ہے اور محنت کی ہے ، تو تم اس کے ساتھ ہمدردی
کرو ، اسی کھانے میں سے کچھ اس کو بھی دیدو ، اسی طرح اگر بھاری کام تو تم بھی اس کی مدد کرو ، کچھ شرکت کرو ، یعنی اس کی غمخواری کرو ، مگر یہ حضرت
ابوذر رضی اللہ عنہ کا کمال تقویٰ تھا کہ انھوں نے مواساتہ کو مساوات تک پہنچا دیا ۔

حدیث پاک سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیسے بلند اخلاق سکھائے ہیں اور غلاموں کا درجہ کتنا اونچا
کر دیا ہے ، پھر دنیا نے دیکھ لیا کہ وہی غلام اسلامی تعلیم سے فیض پاکر کس طرح دنیا میں چلے اور کس کس طرح اسلام کو دنیا میں پکڑا یا ، منہ بڑھنے
والے یورپ نے بھی غلامی کو مٹانے کی کوشش کی ، مگر میں کہتا ہوں کہ غلامی کو مٹانے کی کوشش کرتے ہو لیکن کالے اور گورے میں ان ان و
کے کا سامنا کرتے ہوئے اس غلامی کو جاری بھی کرتے ہو ، ادھر دیکھو ہمارے ایک پیشوا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے جب تم سے
بیت المقدس لینے کے لئے سفر کیا تو اس سفر میں انھوں نے اپنے غلام کے ساتھ کیسا سلوک کیا تھا ، غلاموں کے ساتھ اس قسم کے سلوک
کی کوئی نظیر پیش کر سکتے ہو ؟ ۹۔

امام بخاری کا مقصد یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوذرؓ کو تنبیہ فرماتے ہوئے اس فعل کو کمالیت کا فعل قرار

لَمَّا نَزَلَتْ: الَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يَلْبِسُوا إِيمَانَهُمْ بِظُلْمٍ، قَالَ أَصْحَابُ رَسُولِ اللَّهِ
 جب سورہ انفاس کی یہ آیت الذین آمنوا اُنہی تو صحابہ نے عرض کیا (یا رسول اللہ یہ تو بہت مشکل ہے) ہم سے کون
 صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: أَيْتَانِ لَمْ يَظْلَمْ، فَأَنْزَلَ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ: إِنَّ الشِّرْكَ
 ایسا ہے جس نے گناہ نہیں کیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے سورہ انفاس کی یہ آیت آماری کو شرک قرار
 لَظْلَمٌ عَظِيمٌ
 ظلم ہے۔

دیا گرا ایمان سے خارج نہیں فرمایا، لہذا معلوم ہوا کہ معاصی امور جاہلیت میں سے ضرور ہیں مگر معصیت سے آدمی کافر نہیں ہوتا۔

باب ۳ ظلمٌ دُونَ ظلمٍ

حدیث ۴۲۰ یہ عبد اللہ ابن مسعود ہیں، صحابہ کے دور کی یہ گویا اصطلاح بن گئی ہے کہ جب صرف عبد اللہ بولیں گے تو مراد
 ابن مسعود ہوں گے، وہ فرماتے ہیں کہ جب یہ آیت الذین آمنوا ولم یلبسوا ایمانہم بظلم نازل ہوئی تو صحابہ پر بہت شاق
 ہوئی، انھوں نے عرض کیا ایتنا لم یظلم اور بعض روایت میں آیا ایتنا لم یظلم نفسہ (ہم میں سے کون ایسا ہے کہ اس نے
 اپنے نفس پر ظلم نہ کیا ہو) تو کوئی بھی امن میں نہیں۔

تم پہلے پوری آیت سامنے رکھ کر صحابہ کے سوال کا منشا اور غرض سمجھ لو، الذین آمنوا ولم یلبسوا ایمانہم
 بِظْلَمٍ أُولَٰئِكَ لَهُمُ الْآمَنُ وَهُمْ مُهْتَدُونَ^(۱۱) "لبس یلبس" ضرب سے اس کے معنی غلط ملط کرنا، گمراہ کر دینا
 کہ امتیاز نہ رہے اور "لبس یلبس" مع سے پہننے کے معنی میں آتا ہے، آیت کا ترجمہ یہ ہوا (وہ لوگ جو ایمان لائے اور اپنے
 ایمان کو ظلم سے غلط ملط نہیں کیا تو وہی ہیں جن کے لئے امن ہے اور وہی ہدایت یافتہ ہیں) یہ جملہ کلمہ ہے کہ ایمان لائے اور
 غلط ملط نہ کیا ظلم سے تو انھیں کے لئے امن ہے اور یہی ہدایت پر ہیں) تو صحابہ نے امن کو اس میں مختصر سمجھا کہ کسی قسم کا ظلم نہ کریں،
 چونکہ "بظلم" نکرہ ہے اور نفی کے تحت میں ہے اس لئے عموم و استغراق پر دلالت کرتا ہے کہ کسی قسم کا ظلم نہ ہو، صحابہ ڈر گئے
 کہ دنیا میں کوئی شخص (بجز انبیاء علیہم السلام کے) اس سے محفوظ نہیں رہ سکتا اس لئے عرض کیا ایتنا لم یظلم نفسہ ہم میں سے
 کون ہے جس نے کوئی نہ کوئی ظلم نہ کیا ہو، کبھی نہ کبھی کوئی جنایت تو ہو ہی جاتی ہے تو پھر امن بھی نہ رہا، یہ منشا تھا اس سوال کا، جواب دیا
 إِنَّ الشِّرْكَ لَظْلَمٌ عَظِيمٌ^(۱۲) (ظلم عظیم شرک ہے) یہ روایت بالحق ہے ورنہ یہ آیت اس موقع پر نازل نہیں ہوئی، بعض روایت

میں یہ تصریح موجود ہے کہ آپ نے فرمایا: **الْمَسْمُوعُ قَوْلَ لِقَانِ ابْنِهِ** "اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ" کیا تم نے لقمان کا قول نہیں سنا جو انھوں نے اپنے بیٹے سے کہا تھا کہ بیشک شرک ظلم عظیم ہے، تو یہ آیت پہلے نازل ہو چکی تھی، حدیث میں اسی کا حوالہ دیا گیا، مراد یہ ہے کہ یہاں ظلم سے مراد شرک ہے اور بظلم کی تئوین عظیم کے لئے ہے نہ کہ تعسیم کے لئے، کما فہمہ الصَّحَابَةُ اب مطلب یہ ہوا کہ جو ایمان لائے اور کسی قسم کا شرک نہ کرے تو ان کے لئے امن ہے اور وہ ہدایت یافتہ ہیں، ظلم کا اطلاق کبھی شرک پر بھی ہوتا ہے، کیونکہ اللہ کے مقابل میں کسی کو معبود ٹھہرانا اللہ سے بہت بڑی بغاوت ہے، تو یہاں روایت باسنی ہے یا میں کہہ دو کہ فَاَنْزَلَ کے معنی نہیں کہ خاص اسی معاملہ میں آماری گئی، بلکہ مطلب یہ ہے کہ جس کے لئے آیت نازل ہوئی تھی اس کے مضمون کے تحت یہ بھی داخل ہے، اس سے امام بخاری کا مطلب ظاہر ہو گیا کہ ظلم کے مراتب ہیں جس طرح ایمان و کفر کے مراتب ہیں۔

اب میں آیت کے متعلق کچھ علاوہ سے کہنا چاہتا ہوں، علماء فرماتے ہیں کہ کیا اس تفسیر پر کوئی ایسا قرینہ بھی موجود ہے کہ ظلم سے مراد شرک ہے، یا یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی طرف سے یہ تفسیر فرمادی، تو بظاہر کوئی قرینہ موجود نہیں ہے مگر حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ آیت میں قرینہ موجود ہے اور وہ لفظ "لبس" ہے، وہی اس بات کا قرینہ ہے کہ شرک مراد ہے، زنا اور چوری وغیرہ مراد نہیں، کیونکہ "لبس" کے معنی ہیں ایک طرف میں دو چیزوں کو اس طرح مخلوط کرنے کے کہ امتیاز نہ ہو سکے، اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب دو فوں کا ظرف اور عمل ایک ہو جیسے شربت کہ یہ اسی وقت بن سکتا ہے جب پانی میں شکر ملا دی جائے، اس کے بعد امتیاز باقی نہیں رہتا، تو یہاں اگر جوارج کے اعمال مراد لئے جائیں تو اتحاد نہ ہوگا، اتحاد جب ہوگا کہ ظلم کے وہ معنی ہوں جو ایمان کے ساتھ ایک ظرف اور عمل میں جمع ہو جائیں، اور یہ شرک ہو۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھلادیا اور حق تعالیٰ کی مراد ظاہر فرمادی، یہ مصداق ہے **وَيَعْلَمُ سِرَّهُمُ الْكِتَابُ** کا۔

معتزل کہتے ہیں کہ ظلم سے مراد اعمال جوارج ہیں نہ کہ کفر و شرک، وہ کہتے ہیں کہ اگر شرک مراد لیا جائے تو ایمان و کفر کا اجتماع کیونکر ہو سکتا ہے، ایمان و کفر تو نفیضین ہیں اور نفیضین کا اجتماع ایک محل میں ناممکن ہے، "لَا يَلْبِسُوا" اس وقت صحیح ہو سکتا ہے جبکہ فی انفسہم اجتماع ناممکن ہو، اور یہاں اجتماع ناممکن ہے لہذا "لَا يَلْبِسُوا" کا مکمل اور اس کی نفی کیونکر صحیح ہوگی، یہ معتزل کا قول ہے، مگر کوئی ان سے پوچھے کہ یہ تفسیر کس کی ہے؟ یہ تفسیر تو خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے اور یہ روایت مصمیمین کی ہے، مگر بائیں ہمد وہ کہتے ہیں کہ ہم ایسی روایت کو ہرگز نہیں مانتے جو خلاف عقل ہو۔

(۱) کیونکہ اعمال کا ظرف اور محل جوارج ہیں اور ایمان کا لقب، اس شرک ہو سکتا ہے کیونکہ اس کا ظرف بھی لقب ہے۔ منہ۔

مفسرین نے اس مقام پر الزامی جواب دیتے ہوئے یہ فرمایا ہے کہ تم اعمال جوارح مراد لیتے ہو اور ایک کیہو گناہ کے ارتکاب سے اسے خارج از اسلام قرار دیتے ہو تو پھر اجتماع کیسے ہو سکتا ہے کیونکہ جب ایمان ہو تو لازم ہے کہ ہر گناہ سے پاک ہو، اب اگر ایک گناہ بھی کیا تو خارج از اسلام ہو گیا، تو ایمان اور کفر کا اجتماع کیسے ہو گا؟ نماہوجو ابکہ فہوجوابنا۔

چنانچہ زعفرانی معتزلی وغیرہ نے گہرا کر کہا کہ ایمان سے لغوی معنی یعنی تصدیق مراد ہے نہ شرعی معنی، ہم کہتے ہیں کہ جب ایمان کے لغوی معنی مراد ہیں تو 'يُظْلَمُ' سے شرک مراد لینے میں کیا قیاحت ہے؟ اور پھر نبوی تفسیر کو رد کیوں کرتے ہو؟ قرآن میں یہ صراحت موجود ہے: وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللَّهِ الْإِلَٰهَ مُشْرِكُونَ^(۱) یہاں ایمان و شرک کا اجتماع ہو گیا، تو تم کہتے ہو کہ ایمان سے لغوی معنی مراد ہیں، اسی طرح یہاں بھی یہی کہو اور ظلم سے شرک مراد لے کر جس طرح آیت بالا میں ایمان و شرک کا اجتماع جائز قرار دیتے ہو اسی طرح الذین امنوا ولهم یلبسوا ایمانہم بظلمہ میں بھی جائز قرار دو۔

اب ہم اس حدیث سے قطع نظر کر کے تمہاری تفسیر لیتے ہیں اور ظلم سے مراد عمل لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ امن اسے ہے جو مرکب معصیت نہ ہو، تو امن کس چیز سے؟ ہم کہیں گے دخول نارسے مامون ہوں گے، اور تم کہو گے غلودنی النار سے مامون ہوں گے، گفتگو یہاں مفہوم میں ہے نہ کہ منطوق میں، یعنی اگر تبس کیا تو ہمارے ہاں دخول نار ہو سکتا ہے، اور معتزلہ کے ہاں غلود ہو سکتا ہے، تو تمہارا کیا مدعا ثابت ہوا؟

اگر کوئی مجھ سے پوچھے تو میں کہوں گا کہ نفس قرآن میں امن نہ دخول سے ہے نہ غلود سے، قرآن میں غور کرو، ارشاد فرمایا وَحَاجَّتْهُ قَوْمُهُ، ابراہیم کی قوم نے ان سے حجت کی، قَالَ اتَّخَذُوا نِي فِي اللَّهِ وَقَدْ هَدَانِ ط اللہ کے معاملہ میں جھگڑتے ہو حالانکہ اس نے مجھے ہدایت کی ہے، کیا میں اس تمہارے جھگڑے سے متاثر ہو جاؤں گا؟ وَلَا آخَافُ مَا تُشْرِكُونَ بِهٖ، میں ہرگز خوف نہیں کھاؤں گا اس چیز سے جس کو تم شریک کرتے ہو، إِلَّا أَنْ يَشَاءَ رَبِّي شَيْئًا لیکن میرا رب ہی اگر چاہے تو سب ہو سکتا ہے، ابراہیم علیہ السلام نے انہیں اس بات کا جواب دیا جو وہ کہتے تھے کہ کیا تم ڈراتے ہو تم خود بل جاؤ گے، یہ بت جن کی تم مذمت کرتے ہو یہ کہیں تم کو پاگل نہ بنادیں، آگے کہتے ہیں: وَسَبِّحْ رَّبِّي كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا اس کا علم ہر شخص کو محیط ہے، وہ دیکھ کر نبی بناتا ہے، یہ بت کیا نقصان پہنچا سکتے ہیں وکیفَ آخَافُ مَا أَشْرَكْتُمْ میں کیونکر ڈرسکتا ہوں، ڈرنا تم کو چاہئے کہ تم اللہ کا شریک بناتے ہو

باب علامۃ المنافق

منافق کی نشانیاں ،

۳۲۔ حَدَّثَنَا سُلَيْمَانُ أَبُو الرَّبِيعِ قَالَ حَدَّثَنَا إِسْمَاعِيلُ بْنُ جَعْفَرٍ قَالَ

ہم سے بیان کیا سلیمان ابو الربیع نے ، کہا ہم سے بیان کیا اسماعیل بن جعفر نے ، کہا ہم سے بیان کیا مالک بن مالک

حَدَّثَنَا نَافِعُ بْنُ مَالِكٍ بْنُ أَبِي عَامِرٍ أَبُو سَهْلٍ عَنْ أَبِيهِ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ

ابن ابو امیہل نے ، انھوں نے اپنے باپ سے ، انھوں نے ابو ہریرہ سے ، انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ، اندھا

صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ : آيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ ، وَإِذَا

منافق کی تین نشانیاں ہیں ، جب بات کہے جھوٹ کہے اور جب وعدہ کرے غلط کرے اور جب اس کے پاس

وَعَدَ أَخْلَفَ ، وَإِذَا أُؤْتِنَ خَانَ .

اگر بات کہیں خیانت کرے .

دوسروں کو اور پھر اللہ کے قہر سے نہیں ڈرتے فَأَيُّ الْفَرِيقَيْنِ أَحَقُّ بِالْأَمْنِ إِنَّكُمْ تَعْلَمُونَ^(۱) بتاؤ کون سا فرقہ احق ہے مامون و

بے خوف رہنے کا اگر جانتے ہو۔ وہ کیا بتلاتے خود ہی بتلاتے ہیں الَّذِينَ آمَنُوا اخذوا امن و ہم سے جو پہلی آیت سے مفہوم ہوتا ہے

یعنی جس چیز سے وہ ڈرتا رہے تھے اس سے بے خوفی مراد ہے ، تو معلوم ہوا کہ ظلم کے معنی شرک ہی ہیں ، دوسرے معنی کوئی بن ہی نہیں کہتے

جس چیز کا سوال ہے اس کا جواب ہے ، الحمد للہ اب بالکل شرح صدر ہو جاتا ہے اور اس سے امن کی بھی تفسیر ہو گئی کہ امن دنیا کا مراد

ہے نہ آخرت کا۔ مگر دوسرا جملہ وَهُمْ مُهْتَدُونَ آخرت سے متعلق ہے ، یا امن کو عام رکھو گراں وقت بھی امن دنیوی اولاً معتبر ہے نہ

اس میں متزلزل کی کچھ جلتی ہے نہ اور کسی کی ، زعفرانی نے مذہب کے تعصب میں اگر ایسا لکھ دیا ورز کوئی مولیٰ شخص بھی پورے رکوع پر نظر رکھتے

ہوئے وہ بات نہیں کہہ سکتا جو زعفرانی نے کہی (۲) ہے ۔

باب علامۃ المنافق

حدیث ۳۲ ، بخاری کی غرض یہ ہے کہ جیسے ایمان و کفر اور ظلم کے مراتب ہیں ایسے ہی نفاق کے بھی مراتب ہیں چنانچہ

(۱) انعام : ۸۰ ، ۸۱ — (۲) لطیفاً علی : حضرت شیخ الہندؒ کے قریب بتائے پر علامہ کشمیری نے کہا کہ یہی قرینہ تاج الدین سبکی

نے عروس الانوار میں لکھا ہے : ایضاح البخاری ص ۳۲۹ ، (جامع)

۳۳۔ حَدَّثَنَا قُتَيْبَةُ بْنُ عُقْبَةَ قَالَ حَدَّثَنَا سَفِيَّانُ بْنُ الْأَعْمَشِ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ مَرْثُومٍ عَنْ

ہم سے بیان کیا قتیبہ ابن عقبہ نے کہا ہم سے بیان کیا سفیان نے انھوں نے امش سے انھوں نے

عَبْدُ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: إِنْ لَمْ يُمْرِنْ كُنْ فِيهِ كَانَ مُنَافِقًا خَالِصًا وَمَنْ
عَبْدُ اللَّهِ ابن عمرو سے انھوں نے عبد اللہ ابن عمرو سے کہ فرمایا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے: چار باتیں جن میں ہوں گی وہ برا
کُنْتُ فِيهِ خَصْلَةٌ وَمَنْ كَانَتْ فِيهِ خَصْلَةٌ مِنَ النِّفَاقِ حَتَّى يَدَّعِيَهَا: إِذَا أُوْمِنَ خَانَ
منافق ہوگا اور جس میں ان چار باتوں میں سے ایک بات ہوگی اس میں نفاق کی ایک خصلت ہوگی جب تک کہ وہ اسے چھوڑ نہ دے،
وَإِذَا أَحَدٌ كَذَبَ 'وَإِذَا عَاهَدَ غَدَرَ' وَإِذَا خَاصَمَ فَجَرَ، تَابَعَهُ شُعْبَةُ
جب اس کے پاس امانت رکھیں تو خیانت کرے اور جب بات کہے تو جھوٹ کہے اور جب عہد کرے غدائے اور جب
عَنِ الْأَعْمَشِ

جھگڑے تو ناحق کی طرف چلے، سفیان کے ساتھ شعبہ نے بھی اس حدیث کو امش سے روایت کیا

اس کی علامات بتاتے ہیں کہ جس میں زیادہ علامات ہیں وہ پکا منافق ہے اور جس میں کم ہیں وہ ناقص، تو معلوم ہوا کہ نفاق کے بھی درجے
ہیں، یہ ابو ہریرہؓ کی حدیث ہے، اس میں مفعول کو حذف کر کے بتلادیا کہ اس کی عادت ایسی ہو، یعنی ان تینوں باتوں کا وہ عادی ہو۔
یہاں تین چیزیں بتلائیں: کذب، اُفلاط وعدہ اور خیانت، آیت شناخت کی نشانی کو کہتے ہیں، یعنی
جس میں یہ تین چیزیں پائی جائیں وہ مشابہ ہے منافق کے: منافق کے لفظ میں شراح نے تین طرح تقریر کی ہے، اسے میں اگلی حدیث
میں بیان کروں گا، یہاں اتنا سمجھ لاکہ علامات مطرو و منکس نہیں ہو کر تیں کہ جہاں علامات پائی جائے وہ منافق ہو ہی جائے، جائز ہے
کہ علامات ہو اور منافق نہ ہو، دوسری بات یہ ہے کہ یہاں تین خصلتیں بیان کیں اور اگلی حدیث میں چار بیان کیں، معلوم ہوا کہ حصر مقصود
نہیں ہے تین میں، جیسا موقع ہوا بیان فرمادیا، قرینہ یہ ہے کہ مسلم میں بجائے آیت المنافق کے من علامۃ المنافق فرمایا، من
تبعیضیہ لاکر مطلب صاف کر دیا۔

وَعَدًا كَلَفَ خَيْرٌ وَشَرٌّ دُونَ مِمَّا سَمِعَ يَوْمَئِذٍ أَوْ وَعَدًا اس وقت کہیں گے جب
وہ مکی دنیا ہو، یہاں لفظ وَعَدًا ہے تو بظاہر خیر و شر دونوں کو عام ہوگا، مگر قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ خیر کا وعدہ مراد ہے کہ اس میں
خلاف نہ کرے اور شر کے وعدہ کا خلاف محمود ہے بلکہ بعض جگہ خلاف واجب ہے، تو یہاں خیر کا وعدہ ملو ہوگا اور یہی علامات نفاق
فرار پائے گی کہ خیر کا وعدہ کرے اور پھر خلاف کرے۔

وَإِذَا أُوْتِئَ خَانَ مَعْنَى خِيَانَتِ كِ عَادَتِ هُوَ، اُور اُگر اِیْثَا خِيَانَتِ هُوْگِیْ ہُوْ تو اُسے علامتِ نفاقِ شمارِ نہ کریں گے۔

حدیث ۳۳۳ : حَدَّثَنَا قَبِيصَةُ ۱ اس حدیث میں فرمایا کہ جس میں چار خصلتیں ہوں وہ خالص منافق ہے اور اس میں

نفاق ہی نفاق ہے ۱ اور پورا پورا منافق ہے۔ یہاں پر شبہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسے شخص کے منافق ہونے کا حکم کیسے لگادیا گیا جبکہ وہ کلمہ پڑھتا ہے اور مومن ہے، تو کیا ان چیزوں کے پائے جانے سے وہ اسلام سے خارج ہو جائے گا اور اِنَّ الْمُنَافِقِينَ فِي الدَّرَكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۲ کا مصداق بن جائے گا؟ حالانکہ ایسا نہیں ہے اور دلائل قاطعہ اس پر قائم ہیں کہ جب تک تجوید نہ ہو اس وقت تک کفر نہ ہوگا اور چونکہ اس مومن میں یہاں تجوید نہیں ہے اس لئے اسے خارج از اسلام نہیں کہہ سکتے، پھر کیا توجیہ ہوگی اس حدیث کی؟ تو لوگوں نے اس کی مختلف توجیہات کی ہیں، بعض نے کہا کہ اس سے نفاق علی مراد ہے کہ دل میں اعتقاد تو صحیح ہے مگر عمل خلاف ہے اور نفاق اعتقادی وہ ہے کہ اعتقاد کے خلاف گواہی دے، یعنی دل سے اعتقاد تو نہیں ہے مگر ظاہر کرے کہ وہ معتقد ہے جسے قرآن میں فرمایا: اِذَا جَاءَكَ الْمُنَافِقُونَ قَالُوا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُولُ اللّٰهِ ۳ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُولُهُ ۴ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنَافِقِينَ لَكَاذِبُونَ ۵، یعنی جو لوگ دل میں کفر لئے ہوئے تھے اور نبی علیہ السلام کے پاس آکر ایمان ظاہر کرتے تھے ان کو اللہ نے جھوٹا قرار دیا۔ اور ایسے ہی اعتقادی منافقوں کے لئے قرآن میں فرمایا گیا ہے: اِنَّ الْمُنَافِقِينَ فِي الدَّرَكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ کہ جہنم کے نچلے طبقے میں ہوں گے۔

نافقہاء لغت عرب میں ضمت (گوہ) کے سورخ کو کہتے ہیں، وہ اپنے گھر میں دو سورخ رکھتی ہے، ایک ظاہری ہوتا ہے اور یہی کھلا رہتا ہے، دوسرا سورخ کسی اور جانب اس طرح بناتی ہے کہ نظر نہیں آتا اور دیکھنے میں زمین برابر معلوم ہوتی ہے مگر سورخ کے منہ پر مٹی کا بہت ہلکا سا پردہ ہوتا ہے جو معمولی ٹھوک سے کھل جاتا ہے، وہی چھپا ہوا سورخ اس وقت کام آتا ہے جب کوئی شکاری اسے پکڑنے آتا ہے اور ظاہری سورخ پر ٹھہرتا ہے اور یہ اس دوسرے خفیہ سورخ سے نکل جاتی ہے اور شکاری کے ہاتھ نہیں لگتی، اسی خفیہ سورخ کا نام نافقہاء ہے اور دوسرا کھلا ہوا سورخ جس سے آتی جاتی ہے اور سب کو نظر آتا ہے قاصعہاء ہے۔

یہی حال منافق کا بھی ہوتا ہے کہ وہ چور دروازے سے کام لیتا ہے اور کھلے طور پر اپنے کو مسلمان کہتا ہے، ہمارے یہاں اردو کے محاورہ میں اس کو دورنگی کہیں گے (یہ دورنگی یا نفاق کی زندگی میں بالکل نہ تھا، ابن کثیر نے صراحت کی ہے اِنَّ مَكْتَلَمَ لَمْ يَكُنْ هُنَالِكَ

نفاق" (کہیں نفاق نہ تھا) یہ بیماری مدینہ میں پیدا ہوئی، جب کچھ لوگوں کو دین برحق پسند نہ آیا، اور مخالفت کی طاقت اپنے میں نہ پائی تو وہ چور دروازے سے داخل ہوئے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایمان کا اظہار کرتے مگر دل میں کفر پر جمے رہتے، اس طرح انھوں نے اسلام اور اہل اسلام کو بہت نقصانات پہنچائے اور یہ ان کے خاص خصال تھے جن کا حدیث میں ذکر ہے۔

اب اگر یہ عادتیں کسی مجلس مومن میں پائی جائیں تو ان کی توجیہ قرطبی اور بیضاوی نے علی نفاق سے کی کہ جس میں منافق کی جتنی خصلتیں ہوں گی اتنا ہی وہ علما منافق ہوگا اور جس میں چاروں خصلتیں ہوں گی وہ پکا منافق علی ہوگا اور جس میں کم ہیں اتنا ہی وہ کم منافق علی ہوگا۔

بعض لوگوں نے دوسری توجیہ یہ کی کہ اسے منافق غافل اعتقادی کے شبیہ قرار دیا یعنی فعلہ فعل المنافقین و صورۃ المنافقین، انھوں نے اپنی اس توجیہ میں لفظ منافق میں تعریف نہیں کیا، صرف نسبت میں فرق کر دیا۔

تیسری توجیہ یہ ہے کہ یہ عام نہیں ہے بلکہ عہد نبوت میں جو منافق تھے ان کے بارے میں صحابہ سے فرما ہے ہیں کہ جس میں یہ چار باتیں دیکھو تو سمجھ لو کہ پکا منافق ہے اور جس میں کم ہوں تو اس میں نفاق کم ہے، پس یہ مخصوص اشخاص کے لئے ہے۔

گر ہم کہتے ہیں کہ بخاری کے مینے سے ظاہر ہوتا ہے کہ مراتب نفاق بتلا ہے ہیں کہ یہ بھی نفاق ہے اور اعلیٰ مرتبہ نفاق کا ہے اس لئے نفاق کی تین یا چار خصلتیں پائی جا رہی ہیں گر پھر بھی ایسا نفاق نہیں ہے کہ اس کی وجہ سے خودی انکار ہو جائے اور ان میں سے بھی نہیں جن کے بارے میں قرآن نے ان المنافقین فی الدارک الاسفل من النار کہا ہے جیسے امام بخاری "قتالہ کفر" میں کہتے ہیں، تو اس سے امام بخاری کے مسلک کے مطابق نفاق کے مراتب نکل آئے اور بخاری کی بات اسی وقت ثابت ہوگی جب مومن میں یہ خصلتیں پائی جائیں، اسلئے یہ توجیہ بے وزن ہے کہ عہد نبوی کے منافقین کے بارے میں یہ فرمان نبوی ہے۔

پہلی حدیث میں "واذا وعد اخلف" تھا اور یہاں "واذا عاہد خلد" ہے، کچھ زیادہ فرق نہیں ہے بس اتنا فرق ہے کہ معاہدہ طرفین سے ہوتا ہے اور وعدہ ایک طرف سے اور اس کے عوم میں معاہدہ بھی داخل ہے، نیز معاہدہ کا تقض حرام ہے بشرطیکہ یہ معاہدہ خلاف شرع نہ ہو اور وعدہ کا تقض مکروہ ہے، اس میں بھی اگر پہلے سے ایفاء کی نیت تھی اور پھر بدل دیا تو مکروہ تنزیہی ہے، اور اگر وعدہ کرتے وقت ہی پورا کرنے کی نیت نہ تھی تو مکروہ بخاری ہے۔

علماء نے لکھا ہے کہ یہ فرمان نبوی جوامع اکلم میں سے ہے، کیونکہ انسان میں تین چیزیں ہیں: قول، فعل، نیت، جب یہ تینوں درست ہو جائیں تو اب کیا باقی رہ گیا، اسی طرح عمل کے تین درجے ہیں، ایک دل کا فعل، دوسرا زبان کا، تیسرا جوارح کا، اذا حدث کذب" قول کے نادر پر وال ہے، "اذا واتمن خان" فعل کے نادر پر بنی ہے، "واذا وعد اخلف" میں

بَابُ قِيَامِ لَيْلَةِ الْقَدْرِ مِنَ الْإِيمَانِ

شب قدر میں عبادت بجالانا ایمان میں داخل ہے

۳۴۔ حَدَّثَنَا أَبُو الْيَمَانِ قَالَ أَخْبَرَنَا شُعَيْبٌ قَالَ حَدَّثَنَا أَبُو الزِّنَادِ عَنْ

ہم سے بیان کیا ابو الیمان نے کہا ہم کو خدی شعیب نے کہا ہم سے بیان کیا ابو الزناد نے ' انھوں نے اعرج
الاعرج عَنْ ابْنِ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ يَقُمْ لَيْلَةَ
' انھوں نے ابو ہریرہ سے کہا فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو شخص شب قدر میں عبادت کرے ایمان کے ساتھ ثواب کی

الْقَدْرِ إِيْمَانًا وَاحْتِسَابًا غُفِرَ لَهُ مَا قَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ

نیت کر کے اس کے اگلے گنہ بخش دئے جائیگے

نیت کا نفاذ ہے اور اخلاف وعدہ وہی مذہب ہے جس میں ایفاء وعدہ کی نیت نہ ہو اگر نیت تھی مگر مجبوزا پورا نہ کر سکا تو مذہب میں چنانچہ
امام غزالی نے احیاء العلوم میں تصریح کی ہے کہ اصل چیز وعدہ میں نیت ہے اگر نفاذ نیت ہے تو مذہب ہے — تو یہ نیت کا نفل ہے
اور جو ان یتیموں چیزوں میں سچا نہیں وہ منافق نہیں تو اور کیا ہوگا؟
وَإِذَا خَاصَمَ فَجْرًا، فجر سے مراد یہ ہے کہ گالی پراتا اُسے، گالی گولج مومن کی شان کے خلاف ہے، اور یہ منافق
کا کام ہے۔

قَوْلًا تَابِعَهُ شُعْبَةُ عَنْ الْأَعْمَشِ، یہ سفیان ثوری کا تاجع بیان کیا کہ اشمس سے شعبہ بھی راوی ہیں اس لئے
بیان کیا کہ پہلی سند تیسہ کی ہے اور تیسہ کو یحییٰ ابن مسین ضعیف کہتے ہیں اس لئے بخاری نے اس کا اظہار کر دیا کہ راوی دوسرا بھی ہے
مگر یہ تعلق ہے، کتاب المطام میں اس کو موصول بیان کیا گیا ہے۔

بَابُ قِيَامِ لَيْلَةِ الْقَدْرِ مِنَ الْإِيمَانِ

یعنی لیلۃ القدر کی عبادت ایمان میں سے ہے مگر از روئے ایمان و احتساب کے۔

ہر عمل طاعت میں دو شرطیں ہیں، اول ایمان کہ اس کے بغیر کوئی عمل کار آمد نہیں سب بیکار ہوگا، یہی وجہ ہے کہ کفار کے
عمل بیکار ہیں، قرآن پاک میں دو مقام پر ان کے اعمال کا بیکار ہونا بتلایا گیا ہے، ایک تو سورہ ابراہیم میں ارشاد فرمایا اَلَمْ يَكُنْ
الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادٍ اِسْتَدَّتْ بِهِ الرِّيحُ فِي يَوْمٍ عَاصِفٍ ط لَا يَقْدِرُونَ مِمَّا كُتِبُوا عَلٰى
شَيْءٍ ط ذَلِكَ هُوَ الضَّلَالُ الْبَعِيدُ (حال ان لوگوں کا جو منکر ہوئے اپنے رب سے ان کے اعمال ہیں جیسے دور اکھ جو زور کی

پلے اس پر ہوا آہمی کے دن کچھ ان کے ہاتھ میں نہ ہوگا اپنی کمائی میں سے، یہی ہے بہک کر دور جا بڑنا) اس آیت نے یہ امر واضح کر دیا کہ کفار کے اعمال چاہے وہ کتنے ہی بھلے معلوم ہوتے ہوں اور مخلوق ان سے کتنے ہی فائدے کیوں نہ اٹھا چکی ہو مگر یہ راکھ کے ڈھیر کی طرح قیامت میں اڑ جائیں گے اور وہ حسرت کرتے رہ جائیں گے، معلوم ہوا کہ بغیر ایمان کے اعمال کا کچھ اعتبار نہیں۔

دوسری جگہ سورہ نور میں فرمایا: **وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ بِقِيعَةٍ يَحْسَبُهُ الظَّمْآنُ مَاءً حَتَّىٰ إِذَا جَاءَهُ لَمْ يَجِدْكَ سَيِّئًا وَوَجَدَ اللَّهَ عِنْدَهُ فُوتَهٗ حِسَابَهُ ۖ وَاللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ** (اور جو لوگ منکر ہیں ان کے کام جیسے ریت جنگل میں، پیاسا جانے اس کو پانی، یہاں تک کہ جب پہونچا اس پر اس کو کچھ نہ پایا اور اللہ کو پایا اپنے پاس پھر اس کو پورا پہونچا دیا اس کا لکھا اور اللہ جلد لینے والا ہے حساب) جن کافروں نے سمجھا تھا کہ ہم بڑے بڑے کام کرتے ہیں، ہزاروں مخلوق کے کام آتے ہیں، کیا یہ سب رائیگاں جائے گا، انھیں جواب دیا کہ اللہ پر ایمان کے بغیر کوئی عمل قیمتی نہیں، دنیا میں دیکھو باغی کے کسی اچے عمل کی کوئی قیمت حکومت کی نگاہ میں نہیں ہے، تو پھر اللہ کے باغی کا کوئی عمدہ عمل بھی بے وزن ہے۔

توصیہ میں پہلی قید ایمان کی لگائی اور دوسری شرط احتساب کی، یعنی حسبہ اللہ کام کرے، معلوم ہوا کہ نیت کا صاف رکھنا ضروری ہے، فرض کرو ایک شخص تہجد پڑھتا ہے تو اس سے اس کا پہلا نشانہ تو یہ ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے درجات میں ترقی فرمائے گا اور یقین رکھتا ہے کہ میں چونکہ اس کے حکم کو تسلیم کرتا ہوں اور اس کو اپنا حاکم سمجھتا ہوں، اس کے نبی پر اور اس کے کلام پر ایمان رکھتا ہوں، لہذا میرے درجات میں ترقی ہوگی، اب ایک شخص کو یقین تو سب کچھ ہے مگر نیت یہ بھی ہے کہ لوگ دیکھیں گے تو کہیں گے بڑا عابد ہے، تو یہ ریاء ہے، احتساب نہیں، نیت خیر کی ہونی چاہئے، بالکل ذہول بھی نہ ہو اور نیت شر بھی نہ ہو، تو تنہا ایمان کافی نہیں احتساب بھی ہونا چاہئے۔

اسی طرح لیلۃ القدر میں عبادت سے پچھلے گناہ معاف ہوتے ہیں، سوال پیدا ہوتا ہے کہ کون سے گناہ معاف ہوتے ہو گئے سلف کہتے ہیں کہ صفات تو یقیناً معاف ہوں گے اور کیا رُغوض الی مشیۃ اللہ ہیں، معاف کرے یا نہ کرے، کچھ معاف کرے یا کل، یہ تو سلف کا قول ہے، میں ان شاء اللہ بیان کروں گا۔

یہاں صرف یہ کہنا ہے کہ قیام لیل بھی ایمان کا ایک شعبہ ہے، اسی کو فرمایا: **مَنْ يَهْمُ لَيْلَةَ الْقَدَرِ إِيْمَانًا وَاحْتِسَابًا**

بَابُ الْجِهَادِ مِنَ الْإِيمَانِ

جہاد ایمان میں داخل ہے۔

۳۵۔ حَدَّثَنَا حَرَمِيُّ بْنُ حَفْصٍ قَالَ حَدَّثَنَا عَبْدُ الْوَاحِدِ قَالَ حَدَّثَنَا

اس سے بیان کیا حرمی بن حفص نے، کہا ہم سے بیان کیا عبد الواحد نے، کہا ہم سے بیان کیا عمارہ نے، کہا ہم سے بیان کیا ابو زرعة ابن عمرو بن جریر نے، کہا میں نے سنا ابو ہریرہ سے، انھوں نے نبی

صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ أُنْتَدَبَ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ لِمَنْ خَرَجَ فِي سَبِيلِهِ

صلی اللہ علیہ وسلم سے، فرمایا: اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے جو شخص ہیری راہ میں (یعنی جہاد کے لئے) نکلے اس کو

لَا يَخْرُجُهُ إِلَّا إِيْمَانُ بِي أَوْ تَصَدَّقَ بِرُسُلِي أَنْ أَرْجِعَهُ بِمَالٍ مِنْ أَجْرٍ أَوْ غَنِيمَةٍ

(اس کے گھر سے) اسی بات نے نکالا ہو کہ مجھ پر ایمان رکھتا ہے اور میرے پیروں کو کچا جاتا ہے تو میں اس کے لئے یہ دیتا ہوں

أَوْ أَدْخِلُهُ الْجَنَّةَ وَلَا أَنْ أَشُقَّ عَلَى أُمَّتِي مَا قَعَدْتُ خَلْفَ سَرِيَّةٍ وَلَوْ دَتُّ

یا تو اس کو جہاد کا ثواب اور لوٹ کا مال دے کر (زندہ) متاخر (اس کے گھر کو) لوٹا دوں گا یا (اگر وہ شہید ہو گیا ہو) اس کو بہشت میں لے جاؤں گا یا

أَتَى أَقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ثُمَّ أَحْيَى ثُمَّ أَقْتَلُ ثُمَّ أَحْيَى ثُمَّ أَقْتَلُ

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر میری امت پر شاق دہو تو میں ہر لشکر کے ساتھ جو جہاد کو جاتا نکلتا۔ اور مجھے تو یہ آرزو ہے کہ اللہ کی راہ میں مارا جاؤں، پھر

جَلَا جَاؤُں، پھر مارا جاؤں پھر جَلَا جَاؤُں، پھر مارا جاؤں۔

عُفِّرَ لَهُ مَا قَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ، جو شخص بھی ایمان و احساب کے ساتھ لیلۃ القدر میں قیام کرے، تو اس کے پچھلے گناہ بخش دئے جائیں گے

آگے باب التطوع قیام رمضان میں بھی یہی حدیث لارہے ہیں مگر وہاں کچھ تغیر ہے، ایک تو "مَنْ قَامَ رَمَضَانَ" فرمایا، یعنی وہاں عام کر دیا، اس پر شبہہ ہوتا ہے کہ جو وعدہ قیام لیلۃ القدر پر تھا وہ سارے رمضان کے قیام پر ہو گیا، تو اب یہ ثواب

سارے رمضان کے قیام پر ہے یا لیلۃ القدر پر؟ تو اس کا بہتر جواب زرقانی نے دیا ہے کہ جو شخص تمام رمضان قیام نہ کر کے تو صرف

لیلۃ القدر کا قیام کا کافی ہے بشرطیکہ اسے مل جائے۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ لیلۃ القدر میں "مَنْ يَقُمْ" مفارغ کا صیغہ ہے اور رمضان میں "قَامَ" ماضی ہے اور اس کے بعد

"مَنْ صَامَ" بھی ماضی ہے، تو اس کے متعلق کرمانی جو شارح بخاری ہو، اور حافظ سے پہلے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ اس میں یہ

نکتہ ہے کہ جو شخص رمضان میں قیام کر رہا ہے تو رمضان کے تحقق و متعین ہونے کی وجہ سے یقینی طور پر وہ قیام کر چکا اس لئے اس کو باقی لائے مگر لیلة القدر میں تحقق یقینی نہیں اس لئے مضارع کا صیغہ لائے، واللہ اعلم بالصواب۔

بَابُ الْجِهَادِ مِنَ الْإِيمَانِ

قَوْلُهُ اِنْتَدَبَ اللَّهُ لِمَنْ خَرَجَ فِي سَبِيلِهِ لَا يَخْرُجُهُ إِلَّا إِيْمَانٌ بِي وَتَصَدِيقٌ بِرُسُلِي،
اِنْتَدَبَ بِمَعْنَى تَكْفَّلَ، دوسری روایت میں کفعل کا لفظ ہی ہے، انتداب کہتے ہیں سرعت کے ساتھ اجابت کو، یعنی اللہ نے اس شخص کا تکفل کر لیا جو جہاد کے لئے نکل چکا ہو، مگر شرط یہ ہے کہ نکلنے کی بنیاد اور غرض اللہ پر ایمان اور پیغمبر کی تصدیق اور بشارت پیغمبر پر اعتقاد رکھتے ہوئے ہو، نہ سلطنت کی طلب ہو، نہ مال و جاہ کی چاہت، محض خالصتہ لوجہ اللہ نکلا ہو۔

اَنْ اَرْجُوهُ بِمَا نَالِ، اللہ نے اس شخص کا تکفل کر لیا اور ذمہ داری لے لی کہ میں اس کو لوٹاؤں گا اس چیز کے ساتھ جو اس کو ملے گی، وہ کیا ہے؟ مِنْ اَجْرِ اَوْ غَنِمَةٍ! باہر ہر حال میں اور غنیمت کبھی کبھی اَوْ اَدْخَلَهُ الْجَنَّةَ یا میں اس کو داخل کروں گا جنت میں۔ تو اس کو دو باتوں میں سے ایک ضرور ملے گی، 'اجر و غنیمت یا جنت' لَا يَخْرُجُهُ إِلَّا اِيْمَانٌ بِي سے معلوم ہوا کہ جہاد کی روح ایمان باللہ اور تصدیق بالرسول ہے، تو جہاد بھی ایمان میں داخل ہو گیا و هو مقصود البخاری (اسی بخاری کا مقصود ہے) اور اس سے کسی کو انکار نہیں، 'فرق اتنا ہے کہ کچھ لوگ اس کو جزو ایمان کہتے ہیں اور کچھ لوگ شعبہ ایمان کہتے ہیں قَوْلُهُ وَلَوْلَا اِنْ اَشَقَّ عَلٰى اُمَّتِي مَا قَعَدْتُ خَلْفَ سَيِّدَةٍ، یعنی مجھے اپنی امت پر شفقت کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں ہر سر پر کے پیچھے جاتا، "سیدیۃ" اس چھوٹی جاغت کو کہتے ہیں جس میں زیادہ سے زیادہ چار سو آدمی ہوں، اس سے زیادہ کو ہمیش کہتے ہیں امت پر شفقت یوں ہوتی کہ بہت سے اہم امور جو مدینہ میں ہو رہے تھے وہ معطل ہو جاتے، یا یہ کہ جب خلفاء کا دور آئے تو وہ کہیں یہ نہ سمجھ لیں کہ خلیفہ کا نکلنا ضروری ہے، تو ایسی حالت میں بہت سے اہم کام معطل ہو جائیں گے، انھیں مصالح کے پیش نظر آپ نہیں نکلتے، اور نہ ہر سر پر کے ساتھ آپ ضرور نکلتے^(۱)۔

قَوْلُهُ لَوْ دِدْتُ اَنِ اَمْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ثَمَّ اَحْيَيْتُ ثَمَّ اَمْتَلْتُ ثَمَّ اَحْيَيْتُ ثَمَّ اَقْتُلْتُ، یعنی مجھے جہاد میں ایسی

(۱) ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہیری امت کے وہ کمزور لوگ جن کے پاس خرچ نہیں ہے میرے ساتھ چلنے کے متمنی ہوتے مگر ناداری سے نہ جاسکے اور میرے پاس

بھی انتظام نہ ہو سکتا تو ان کو سخت کڑھن ہوتی، تو ان کی رعایت بھی پیش نظر ہے (جواب)

باب ۲۷ تَطَوُّع قِيَامِ رَمَضَانَ مِنَ الْإِيمَانِ

رمضان میں راتوں کو نفل نماز پڑھنا ایمان میں داخل ہے

۳۶۔ حَدَّثَنَا إِسْمَاعِيلُ قَالَ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ

ہم سے بیان کیا اسماعیل نے، کہا مجھ سے بیان کیا مالک نے، انھوں نے ابن شہاب سے، انھوں نے حمید ابن عبد الرحمن سے، انھوں نے ابو ہریرہ سے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو کوئی رمضان میں مَنْ قَامَ رَمَضَانَ إِيْمَانًا وَاحْتِسَابًا غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ (راتوں کو) ایمان رکھ کر اور ثواب کے لئے عبادت کرے اس کے اگلے گناہ بخش دئے جائیں گے

لذت آتی ہے کہ ایک دو بار نہیں بلکہ جی چاہتا ہے کہ بار بار جان دیتا رہوں، یہاں تنہا ہے شہادت کی اور تنہا شہادت بھی شہادت ہے چنانچہ ابو داؤد میں ہے کہ بہت سے لوگ بستر پر جان دے دیتے ہیں اور وہ شہید ہوتے ہیں اور حضور کی حیات دوسروں کی شہادت سے لاکھوں درجے بڑھ کر ہے اور شہادت سے آپ کے کمال میں اضافہ ہوتا، یہاں محض شوق و جذبہ کا اظہار ہے، اور حقیقت میں یہ مرتبہ اس شخص کو حاصل ہوتا ہے جو محبت الہی میں مستغرق ہو۔

ترمذی کے قول سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فقرہ لوددت ان اقتل اخذ مبرج ہے یعنی ابو ہریرہ کا قول ہے، اور یہ کئی تنہا ہے لیکن بخاری نے یہاں تو کچھ نہیں کہا البتہ باب ماجاء فی التمتنی میں تصریح کی ہے کہ یہ قول خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے

باب ۲۸ تَطَوُّع قِيَامِ رَمَضَانَ

امام بخاری اس ترجمہ میں لفظ ”تطوع“ لاکر یہ بتانا چاہتے ہیں کہ جس طرح فرائض اعمال داخل ایمان ہیں، اسی طرح نوافل اعمال بھی داخل ایمان ہیں، رات کا قیام فرض نہیں ہے، نفل ہے، قیام لیالی رمضان میں تراویح بھی ہے اور دیگر نوافل بھی شامل ہو سکتے ہیں، تہجد، تلاوت قرآن، اذکار وغیرہ سب قیام رمضان میں شامل ہیں، تو معلوم ہوا کہ نوافل اعمال بھی داخل ایمان ہیں۔

حدیث ۳۷۔ قَوْلُهُ مَنْ قَامَ اخذ سے بظاہر مراد یہ ہے کہ لیل میں مستحب قیام کرے، اور بعض محققین نے لکھا ہے کہ قیام سے تراویح مراد ہے، کہ جس شخص نے تراویح کی مداومت کی تو گویا اس نے تمام رمضان قیام کیا، اس عمل کا خاصہ بیان فرمایا کہ اس سے گناہ بخش دئے جائیں گے، یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ ہر عمل کی ایک خاصیت ہوتی ہے جس طرح ہر دوا کی ایک خاصیت ہوتی ہے، مگر جس طرح دوا کی تاثیر میں شرط ہے کہ اس تاثیر کی باطل کرنے والی کوئی چیز نہ ہو ورنہ اثر ظاہر نہ ہوگا اسی طرح یہاں سمجھو کہ یہ مغفرت و نوب اس نیک

باب ۲۸ صَوْمُ رَمَضَانَ احْتِسَابًا مِنَ الْإِيمَانِ

رمضان کے روزے رکھنا ثواب کی نیت سے ایمان میں داخل ہے

۳۷۔ حَدَّثَنَا ابْنُ سَلَامٍ قَالَ أَخْبَرَنَا مُحَمَّدُ بْنُ فُضَيْلٍ قَالَ حَدَّثَنَا

ام سے بیان کیا ابن سلام نے، کہا ہم کو بخاری محمد بن فضیل نے، بیان کیا یحییٰ ابن سعید نے
 یَحْيَىٰ بْنُ سَعِيدٍ عَنْ أَبِي سَلَمَةَ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ
 انہوں نے ابوہریرہ سے، انہوں نے ابوہریرہ سے، کہا فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو شخص رمضان کے روزے
 وَسَلَّمَ مَنْ صَامَ رَمَضَانَ إِيْمَانًا وَاحْتِسَابًا غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ
 ایمان رکھ کر اللہ ثواب کی نیت سے رکھے اس کے اگلے گناہ بخش دئے جائیں گے۔

عمل کی غایت ہے بشرطیکہ کوئی ایسا مانع نہ پیدا ہو جائے جو اس کی اس غایت کو ظاہر نہ ہونے دے، اسی لئے جناب رسول اللہ صلی اللہ
 علیہ وسلم نے اس کا اہتمام فرمایا اور امت کو تعلیم دی کہ اپنے اس عمل کو اللہ کی نافرمانی سے بالکل صاف دپاک رکھو، کیونکہ نافرمانی سے
 اس بابرکت عمل کی تاثیر کام نہ کر سکیگی، اسی لئے فرمایا کہ جو آدمی گناہوں کو نہیں چھوڑتا اس کو جاگنے کے سوا اور کچھ حاصل نہ ہوگا، اسی طرح
 ایمان کے ساتھ احتساب کی قید یہ بقی ہے کہ صرف خدا کی خوشنودی پیش نظر رہے، اور اسی کا نام اخلاص ہے، جس قدر اس کے اخلاص
 میں بلند ہوگی اسی قدر اللہ تعالیٰ کی طرف سے انعامات کی بارش ہوگی۔

باب ۲۹ صوم رمضان الخ

حدیث ۳۸۔ مبارک ارشاد سے معلوم ہوا کہ رمضان میں روزہ رکھنا ان دو شرطوں کے ساتھ جن کا ذکر پہلے ”لیلة القدر“
 اور قیام رمضان میں آچکا ہے، مغفرت ذنوب کا ذریعہ ہے، رمضان کا پورا مہینہ خیر و برکت کا مہینہ ہے، رحمت الہی جوش میں ہوتی ہو
 جیسا کہ حدیث شریف میں ہے کہ رمضان کی پہلی رات سے اعلان شروع ہو جاتا ہے یا باغی الخیر اقبل و یاغی الشوائم
 ولله عتقاء من النار، اسے خیر کے طلبگار آگے بڑھ (اور رحمت سے بھرپور فائدہ حاصل کر لے) اور شر کے چاہنے والے رک جا،
 (یعنی شر بالکل چھوڑ دے تاکہ خسارہ سے بچ جائے) اور اللہ کے لئے بہت لوگ (بہرکت ماہ رمضان) دوزخ سے آزاد کئے ہوئے ہیں
 اس رحمت کی تکمیل کو یا اس چیز سے ہوتی ہے کہ کسر شیطان قید کر دئے جاتے ہیں تاکہ اب انہیں فساد پھیلانے اور اللہ کی رحمت سے
 روکنے کا موقع نہ مل سکے اور رحمت سے فائدہ اٹھانے والے پوری طرح فائدہ اٹھا سکیں، یہی وجہ ہے کہ اس اعلان سے اگر کوئی اب
 بھی فائدہ نہیں اٹھاتا اور اپنی مغفرت نہیں کراتا تو اس کو سخت وعیدیں بھی سنا دیں، تاکہ آدمی ڈر کر برائی چھوڑ دے، لیلة القدر کے منافع

باب ۲۹ الدِّینُ یُسْرُ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَحَبُّ الدِّینِ

اسلام کا دین آسان ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کو وہ دین بہت پسند ہے جو سہل،

إِلَى اللَّهِ الْحَنِيفِيَّةُ السَّمَحَةُ

سیدھا آسان ہو

بیان کر کے یہ بھی سنایا من حرم خیرھا فقد حرم، جو اس شب کی خیر سے محروم رہا وہ بالکل ہی محروم رہا، اسی طرح فرمایا رغم انف رجل دخل علیہ رمضان ثم افسح قبل ان یغفر لہ، خاک آلودہ ہو اس شخص کی ناک کہ جس پر رمضان آیا پھر وہ ختم ہو گیا اس سے پیشتر کہ اس شخص کی بخشش کی جائے، اور اس سے سخت وعید اس حدیث میں ہے جو کعب ابن عجرہ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ فرمایا کہ ممبر کے قریب ہو جاؤ، ہم لوگ قریب ہو گئے تو آپ ممبر پر چڑھے، جو اب پہلی سیڑھی پر قدم رکھا فرمایا امین، پھر جب دوسرے زینہ پر قدم رکھا تو فرمایا امین، اسی طرح تیسری سیڑھی پر بھی قدم رکھتے ہوئے آپ نے فرمایا امین، ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ آج یہ نیابت دیکھی گئی، فرمایا: ہاں! ہوا یہ کہ اس وقت جبریل امین میرے سامنے آئے تھے، جب پہلے درجہ پر میں نے قدم رکھا تو انھوں نے کہا: ہلاک ہو وہ شخص جس نے رمضان کا مبارک مہینہ پایا پھر بھی اس کی مغفرت نہ ہوئی، میں نے کہا امین، پھر جب میں دوسرے درجہ پر چڑھا تو جبریل نے کہا: ہلاک ہو وہ شخص جس کے سامنے یہ یاد کر ہو اور وہ درود نہ بھیجے، میں نے کہا امین، جب میں تیسرے درجہ پر پہنچا تو جبریل نے کہا: ہلاک ہو وہ شخص جس کے والدین یا ان میں سے کوئی ایک بڑھاپے کو پاوے اور وہ اس کو جنت میں داخل نہ کرائے، میں نے کہا امین۔

اللہ کے محبوب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان کی راتوں کے قیام اور دن کے روزے کو مغفرت کا ذریعہ قرار دیا، اور بخاری نے اپنے نقطہ نظر کے مطابق انہیں ایمان میں داخل بتایا۔

خاری نے یہاں تطویر قیام لیل کو صوم فرض رمضان سے بیان کیا، شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ قیام لیل ترتیب میں مقدم ہو کیونکہ شریعت میں رات پہلے ہوتی ہے اور دن بعد میں، تو رات کا قیام اور تراویح رات ہی سے شروع ہوگی اور روزہ دن میں ہوگا، اسلئے پہلے قیام کا باب لائے، واللہ اعلم بالصواب۔

باب ۳۰ الدِّینُ یُسْرُ

دین آسانی کا نام ہے، یعنی سارا دین سہل ہے، کوئی مشکل چیز نہیں، یا ایک جن امور میں مختلف شکلیں جواز کی نکلتی ہوں، وہ سب کی سب اگرچہ شرعاً جائز ہیں مگر ان میں سے بہتر وہ ہیں جن میں تسہیل و سہولت ہو۔

یہاں ایک کھٹک یہ پیدا ہوتی ہے کہ ایمان کے سلسلہ کے ابواب سے الدین یسر کا باب بے جوڑ معلوم ہوتا ہے، اس کو کہیں آنکھ لانا چاہئے تھا جب ابواب ایمان کا سلسلہ ختم ہو جاتا، اسی طرح الجہاد من الایمان کا جو باب لائے ہیں اس میں بھی بے ترتیبی سی معلوم ہوتی ہے، تو وہاں حافظ نے لکھا ہے کہ لیلۃ القدر کا قیام اور اس کی تلاش میں جدوجہد چونکہ بہت مشکل ہے اور یہ وہی شخص کر سکتا ہے جو مجاہدہ کرتا ہو اور وہ ایسا ہی ہے جیسے جہاد میں جانا اور لیلۃ القدر کا قیام اسی کو حاصل ہوتا ہے جو جدوجہد کرے تو وہاں دیر ربط پایا جاتا ہے، کیونکہ دونوں میں جدوجہد ہے اور دونوں میں الایمان ہیں۔ مگر یہاں تو کچھ بھی نہیں، ایک دن قرآن پر نظر پڑی اس وقت سمجھ میں آیا کہ بخاری کی نظر قرآن پر ہے، وہاں بھی پہلے رمضان کا ذکر ہے، بعد میں "یسر" کا، پڑھو: شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَىٰ وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۖ وَمَن كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ۚ (۱) بہینہ رمضان کا ہے جس میں نازل ہوا قرآن، ہدایت ہے واسطے لوگوں کے اور دلیلیں روشن، راہ پانے کی، اور حق کو باطل سے جدا کرنے کی، سو جو کوئی پائے تم میں اس مہینہ کو تو ضرور رکھے اس کے روزے اور جو کوئی ہو بیمار یا مسافر تو اس کو گنتی پوری کرنی چاہئے اور دونوں سے، اللہ چاہتا ہے تم پر آسانی اور نہیں چاہتا تم پر دشواری۔

امام بخاری نے جب صیام کا باب باندھا تو فوراً ادھر منتقل ہو گئے، چونکہ آیت میں یسر کا ذکر تھا اس لئے انھوں نے یسر ہی کا

باب باندھ دیا۔

اس پر بہت جی خوش ہوا اور جو ایک بے ترتیبی سی معلوم ہو کر باعث تکبر ہو رہی تھی وہ الحمد للہ بالکل دور ہو گئی۔

تَوَلَّىٰ أَحَبُّ الدِّينِ إِلَى اللَّهِ الْحَنِيفِيَّةُ السَّمْحَةُ، فرماتے ہیں: محبوب دین ملت حنیفیہ ہے، "حنیف" کے معنی ملت میں مائل کے ہیں اور قرآن و سنت میں "حنیف" اسے کہتے ہیں جو سب سے ٹوٹ کر اللہ کی طرف بھجک جائے اور صرف اللہ ہی کی طرف مائل ہو جائے، جیسے ابراہیم علیہ السلام تھے إِنَّ أَوَّلَ مَا هَدَيْتُمْ كَانَ أُمَّةً قَالَتْ تَلَايَنَهُ حَنِيفًا ۖ وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِينَ (۲) (۱) اصل میں تو ابراہیم تمھارا ہونے والا فرماں بردار اللہ کا سب سے ایک طرف ہو کر اور نہ تمھارا شرک والوں میں) یعنی کسی قسم کا شرک نہ تھا، بال برابر بھی مشرک نہیں تھا، اسی کی توصیف کرتے ہیں یہ

ازیکے گو وزہم کیسے باش . یک دل ویک قبلہ ویک ہوئے باش
 یہ شعر حضرت شیخ فرید الدین عطار رحمہ اللہ کے رسالہ منطق الطیر کا ہے، 'ان کا مرتبہ مولانا رومؒ سے بلند ہے، بقیہ اشعار
 یہ ہیں، بڑے کام کے ہیں :

آں خداوندے کہ ہستی ذات اوست	جملہ عالم مصحف آیات اوست
اوز جلد بیش و ہم پیش از ہم	جلد از خود دیدہ و خویش از ہم
جاں نہاں درجہم او درجاں نہاں	اے نہاں اندر نہاں اے جاں جاں
چوں نہاں بینی عیاں آنگہ شود	چوں عیاں بینی نہاں آنگہ شود
چوں بہم بینی چوں بے چون ست او	آں زماں از ہر دو بیرون ست او
ازیکے گو وزہم کیسے باش	یک مولیٰ ویک قبلہ ویک روئے باش

یہ آخری شعر اصلی ضیف کا ترجمہ ہے، 'دہی ہے جو حدیث میں ہے : مَنْ أَحَبَّ لِلّٰہِ وَأَبْغَضَ لِلّٰہِ فَقَدْ اسْتَكْمَلَ الْإِيْمَانَ، جس نے محبت کی تو اللہ کے لئے اور بغض کیا تو اللہ کے لئے، یعنی سب کچھ اللہ ہی کے لئے، تو اس نے ایمان کامل کر لیا۔

ابراہیم علیہ السلام کو ضیف کہا گیا اس لئے کہ سب سے پہلے پرستار توحید اور مظہر توحید ہی تھے، گھر کو چھوڑا، باپ کو چھوڑا، قوم کو چھوڑا اور وطن کو چھوڑا، صرف سیدنا لوط علیہ السلام کو جو بھیجے تھے، لیکر صل دئے، قرآن میں ہے : فَأَمِّنْ لَهُ لُوطًا وَقَالَ إِنِّي مُهَاجِرٌ إِلَىٰ رَبِّي ۖ ا پھر ہاں لیا اس کو لوط نے اور وہ بولا میں تو وطن چھوڑتا ہوں اپنے رب کی طرف) اس کے بعد حکم ہوا کہ ہاجر کو اپنے چھوٹے بچے کے ساتھ وادیٰ غریزی زرعی میں چھوڑ دو، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمائیل حکم کی، حدیث میں ہے حضرت ابراہیم نے جب حضرت بابر کو چھوڑا تو بولیں : یہاں ہیں نہاں میں جو چھوڑے جا رہے ہو یا اللہ کے حکم سے ہے یا اپنی رائے سے ؟ کہا اللہ کے حکم سے، تو کہنے لگیں : اب جاؤ کچھ پردہ انہیں، پھر ذبح کا مسلمانے آیا تو کیسے مضبوط نکلے، کتنی تمناؤں سے ان کو اللہ سے مانگا تھا مگر جب اللہ کا حکم ملا تو زرا بھی تامل نہ کیا، فوراً کر گذرے، جب غمزدہ نے آگ میں ڈالا تو فرشتے نے کہا ہم مدد کریں، کیسا جواب دیا سبحان اللہ ! فرمایا : اَمَّا اِلَيْكَ فَلَا تَمَّ سَ تَوَهَّرُ زَنْبِيں وَاَمَّا اِلَى اللّٰہِ فَحَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ، رہا اللہ سے، تو بیشک اس سے ضرور کیونکہ اللہ ہمارے لئے

۳۸۔ حَدَّثَنَا عَبْدُ السَّلَامِ بْنُ مُطَهَّرٍ قَالَ نَا عُمَرُ بْنُ عَلِيٍّ عَنْ مَعْنِ بْنِ مُحَمَّدٍ

ہم سے بیان کیا عبد السلام ابن مطہر نے کہا خردی ہم کو عمر ابن علی نے انھوں نے سن ابن محمد غفاری سے
الْغِفَارِيُّ عَنْ سَعِيدِ بْنِ أَبِي سَعِيدٍ الْمَقْبُرِيِّ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ
انھوں نے سعید ابن ابی سعید مقبری سے انھوں نے ابو ہریرہ سے انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے
وَسَلَّمَ قَالَ: إِنَّ الدِّينَ يَسُرُّ وَلَنْ يُشَادَّ الدِّينَ أَحَدٌ إِلَّا غَلَبَهُ فَسَدِّدُوا وَقَارِبُوا وَأَبْشِرُوا
بیشک (اسلام کا) دین آسان ہے اور دین میں جو کوئی سختی کرے گا تو دین اس پر غالب آئے گا اس لئے بیچ کی چال چلو

وَاسْتَعِينُوا بِالْغَدْوَةِ وَالرَّوْحَةِ وَشَيْءٍ مِنَ الدَّلْجَةِ

اور (افضل کام نہ کر سکو تو) اس کے قریب رہو اور ثواب کی امید رکھ کر اس سے خوش رہو اور صبح کی پہل تندی اور شام کی چل تندی اور آخر رات کی
کچھ چل تندی سے مدد لو

بالکل کافی ہے اور بہترین کارساز ہے۔ ہر طرح کا امتحان ہو گیا، اسی کو فرمایا ہے، إِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ أَسْلِمَ قَالَ أَسَلْتُ لِرَبِّ
الْعَالَمِينَ^(۱) جب ابراہیم سے کہا ان کے رب نے اسے ابراہیم! اپنے رب کے فرماں بردار بن جاؤ تو بولے میں تو رب العالمین کا فرشتہ
بن گیا۔ قرآن پاک میں لفظ ”حنیف“ صرف ابراہیم علیہ السلام کے لئے استعمال کیا گیا ہے، یعنی ان کا لقب ہو گیا کسی دوسری ذات
کو قرآن میں ”حنیف“ نہیں کہا گیا، ہاں ”صفار“ دوسرے مومنین کے لئے آیا ہے مگر ”حنیف“ کسی اور کے لئے نہیں آیا۔ اب نہ کہ
”حنیفہ“ اس لئے کہتے ہیں کہ وہ ان کی طرف منسوب ہے، فرماتے ہیں: احب الدين الى الله الحنيفية السمحة،
اللہ کو وہ دین بہت محبوب ہے جو سیدھا، سچا اور آسان ہو، مشبہ ہو گا کہ تمام ادیان اللہ کی طرف سے ہیں جو اب یہ ہے کہ محبوب تو سب
ہیں لیکن ”احب“ دین ابراہیمی ہے، ”سمحة“ سہل سہل باتیں جس میں سخت گیری نہیں، یہود کی طرح سختی نہیں، چنانچہ قرآن میں
نبی علیہ السلام کے اوصاف میں فرمایا گیا: الرسول النبي الاقنى الذي يجدونه مكتوبًا عندهم في التوراة والانجيل
يامرهم بالمعروف وينهاهم عن المنكر ويحل لهم الطيبات ويحرم عليهم الخبائث ويضع عنهم اصرهم
والاغلال التي كانت عليهم^(۲) وہ رسول وہی ای جسے اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا پاتے ہیں جو بھلایوں کا کم دیتے ہیں اور سزا
سے روکتے ہیں اور آثار دیتے ہیں ان کا بوجھ اور وہ بیڑیاں جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے یہی جن زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے سب توڑ دیں

یعنی سختیاں اٹھا دی گئیں اور آسانیاں کر دی گئیں۔

قرآن میں شاہد موجود ہے: **وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ** (اللہ نے تم پر دین میں کچھ تنگی نہیں کی اور غالباً **لَنْ يَشَادَ الدِّينَ أَحَدًا إِلَّا غَلَبَهُ** "اسی آیت سے اقتباس ہے، 'کوئی شخص دین سے زور آزمائی نہیں کرتا لیکن دین اس پر غالب آجاتا ہے' **مُشَلَّطَةً** : ایک دوسرے پر غالب آنے کے لئے دستخط کرنا، یعنی کوئی دین پر عادی ہونا چاہے تو ممکن ہے، اگر کوئی شخص چاہے کہ تمام عبادات اور تمام غزوات میں جمع کر لے تو نتیجہ ہوگا کہ چند دن ایسا کرے گا، پھر سب کو چھوڑ دے گا کیونکہ یہ بھج نہیں سکتا، اس پر دوام نہیں ہو سکتا پھر دین سے مغلوب ہو جاتا ہے اور یہ کنایہ ہے کہ آدمی تمام عزائم جمع کرنا چاہے تو نہیں کر سکتا تو آدمی کو چاہئے کہ اس قدر کرے جسے نباہ سکے، اور اگر دوام ہو سکے، یہی طریقہ اچھا ہے، اس میں ہمیشہ کام ہوتا رہتا ہے، نیز طبیعت میں نشاٹ بھی رہتا ہے۔

سَدَّ دَوًّا : یعنی میاں دروی اختیار کرو، **سَدَّاد**، بین بن راستہ اختیار کرنا، توسط درج پر بند کرنا، بفتح سین ہے، اور کسر سین **سَدَّاد** کے معنی ڈاٹ لگانا اور روکنا، ہیں، کما قال الشاعر:

أَصَاوَعُونِي وَأَتَيْتُ أَصَاوَعًا **لِيَوْمٍ كَرِهْتَهُ وَسَدَّادٌ تَغْرِ**

وَقَارِبُوا : قریب قریب لگے رہو، یعنی اکمل کا حصول تو مشکل ہے، اس ساتھ ساتھ لگے چلو۔
تَوَلَّوْا وَأَبْشَرُوا : یعنی بشارت حاصل کرو کہ تھوڑا کام کرنا اور دوام کے ساتھ کرنا بہتر ہے بہت کام کرنے سے مگر چند دن کرنے سے۔

امام غزالی نے لکھا ہے کہ ایک قطرہ جو مسلسل کسی پتھر پر گرتا رہے گا وہ بڑوں کے بعد پتھر میں سوراخ کر دے گا لیکن اگر اتنا ہی پانی ایک دم گرا دیا جائے تو کچھ بھی اثر نہ ہوگا۔

اسی طرح مداومت ذکر قلب کو چھید دیتی ہے، شاہ ولی اللہ کا قول **تَحْتَ اَنْدَالِ الْبَالِغَةِ** میں درج ہے کہ شریعت نے تقییل عبادت کا حکم تکثیر کے لئے دیا ہے یعنی جو تقییل کرے گا اور کرتا رہے گا تو وہ بہت ہو جائے گا اور جب یکدم بہت سا کر لیا تو عمر بھر پابندی تو نہ کر سکے گا چھوٹ جائے گا لہذا کم رہ جائے گا، جو دو کا مذاق نفع کم لیتا ہے وہ زیادہ بچ لیتا ہے اس لئے نفع بھی زیادہ کمالینا ہے اور جو زیادہ نفع لیتا ہے وہ کم بچتا ہے اور وہ قائم نہیں رہتا اس لئے نفع میں کمی ہو جاتی ہے، بس یہی معاملہ عبادات میں بھی ہے، اس کو اتنا پکڑو کہ

بَابُ الصَّلَاةِ مِنَ الْإِيمَانِ وَقَوْلُ اللَّهِ تَعَالَى (وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضِيعَ إِيمَانَكُمْ) يَعْنِي صَلَاتَكُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ

نہا ایمان میں داخل ہے اور حق تعالیٰ نے اسے بے فائدہ نہیں فرمایا اور ایسا نہیں جو تمہارا ایمان اکارتے ہو یعنی بتائے کہ ایمان تمہارے لئے نماز پڑھنا (بیت کی طرف سے) ضروری ہے

نہا ہو۔

قوله واستعينوا بالغدوة والروحة وشيء من الدلجة، یہ جملے اگر انسان مضبوطی سے پکڑے تو وہی بن سکتا ہے اس میں حضورؐ نے اپنی رحمت سے تعلیم و تربیت کا خلاصہ کر دیا ہے، فرماتے ہیں: صبح اور شام کا اور کچھ دلوچ کا کافی ہے، بس ان سے مدد حاصل کرو، غُدْوَةٌ شَرْوَعٌ دن میں چلنے کو کہتے ہیں، اور رَوْحَةٌ بعد زوال چلنے کو، دُلْجَةٌ رات کے آخری حصہ کو کہتے ہیں، تو یہ تین اوقات آدمی کے لئے کافی ہیں جبکہ وہ پابندی سے لگا رہے، ایسے لوگ جن کو ذوق عبادت ایسا ہو کہ کم کرنے سے دشت ہو، وہ بہت کم ہیں، جیسے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ جو تابعی ہیں ان کے بارے میں منقول ہے کہ چالیس برس تک عشاء کے وضو سے فجر کی نماز پڑھی، چالیس ہزار قرآن ختم کئے، غالباً تیس ہزار اس مقام پر ختم کئے ہوں گے جہاں شب میں عبادت کرتے تھے اور دس ہزار اس کے علاوہ دیگر مقامات پر، اور بہت سے حج کئے، انہیں عبادت کم کرنے سے دشت ہوتی تھی۔

دوبند میں ایک صاحب صائم الدہر تھے، سال کے وہ پانچ دن جن میں روزہ رکھنا حرام ہے، ان میں کہتے تھے جیسے تھیں نہ کھانے سے تکلیف ہوتی ہے ایسے ہی مجھے کھانے سے ہوتی ہے۔

نفیس ابن عیاض یا سفیان ثوری کا منقول ہے کہ اگر بادشاہ کو اس لذت کا علم ہو جائے جو ہیں عبادت میں حاصل ہے تو وہ اسے حاصل کرنے کے لئے ہم پر شکنے کر چڑھائی کر دیں۔

تو یہ خواص کام تہرہ ہے اور یہاں علم عوام کا ذکر ہو رہا ہے کہ وہ برداشت نہیں کر سکتے، حضرت مولانا گنگوہی فرماتے تھے کہ تیس برس کے تجربہ کے بعد معلوم ہوا کہ جو چیز اتنی مشکل معلوم ہوتی تھی وہ تو بہت آسانی سے حاصل ہو سکتی ہے، پھر یہ حدیث سنائی: "وَأَسْتَعِينُوا بِالْغُدْوَةِ وَالرَّوْحَةِ وَشَيْءٍ مِنَ الدَّلْجَةِ"، اور جو چاہے اس کا تجربہ کر لے، پھر دیکھو کیا کیفیت ہوتی ہے

بَابُ الصَّلَاةِ مِنَ الْإِيمَانِ

ترجمہ الصَّلَاةِ مِنَ الْإِيمَانِ، اور اس کے استشہاد میں آیت پیش کی: وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضِيعَ إِيمَانَكُمْ، یہاں ایمان بول کر

(۱۱) امام سیوطی نے اپنی کتاب "تبيين الصلوة في مناب اليمين" میں امام ابوحنیفہ کی اہمیت تسلیم کی ہے، اسی طرح ابن حجرؒ اور ابن حجر عسقلانیؒ بھی امام اعظمؒ کی اہمیت تسلیم کرتے ہیں، صاحب کرامتؒ میں حضرت ابن عمرؓ کے علاوہ اور بھی کئی صحابہؓ کی روایت ثابت ہے، البتہ سارے کا ثبوت نہیں، امام بیہقی نے بھی مناب امام اعظمؒ میں ایک سال لکھا ہے جس میں انہوں نے امام صاحب کی اہمیت تسلیم کی ہے، منہ

۳۹۔ حَدَّثَنَا عَمْرُو بْنُ خَالِدٍ قَالَ نَا زُهَيْرٌ قَالَ نَا ابُو اسْحَاقَ عَنِ الْبَرَاءِ أَنَّ

ہم سے عمرو ابن خالد نے بیان کیا، کہا ہم سے زہیر نے بیان کیا، کہا ہم سے ابو اسحاق نے ہمارے بیان کیا کہ آنحضرت

النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ أَوَّلَ مَا قَدِمَ الْمَدِينَةَ نَزَلَ عَلَى أَجْدَادِهِ أَوْ قَالَ

صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ میں تشریف لائے تو اپنے ننھیال یا مہیال میں اترے جو انصاری لوگوں میں تھے اور آپ سولہ یا سترہ بیٹے

أَخْوَالِهِ مِنَ الْأَنْصَارِ وَأَنَّهُ صَلَّى قَبْلَ بَيْتِ الْمَقْدِسِ سِتَّةَ عَشَرَ شَهْرًا أَوْ سَبْعَةَ عَشَرَ شَهْرًا

تک (مدینہ میں) بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے رہے

مراد لیا گیا ہے اور اس پر قرینہ یہ حدیث ہے مَاتَ عَلَى الْقِبْلَةِ قَبْلَ أَنْ تُحَوَّلَ اور یہی مدعا تھا اس لئے کہ نماز پر ایمان کا اطلاق

ہوتا ہے، یہاں ایک اشکال ہے وہ یہ کہ "عند البیت" سے بظاہر کعبہ مراد ہے، کیونکہ جب مطلق "البیت" باللام بولا جاتا ہے تو کعبہ

ہی مراد ہوتا ہے، اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ بیت سے بیت المقدس مراد ہو، بظاہر سوال "الی بیت المقدس" سے تھا،

کہ انھیں کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنا مسرور ہوا تھا اور وہ بیت المقدس ہی کی طرف نماز پڑھتے ہوئے دنیا سے رخصت ہو گئے تھے، اب اگر

بیت اللہ مراد لیا جائے تو مطلب نہیں بنتا، اور اگر بیت سے بیت المقدس مراد لیا جائے تو خلاف عرف ہے، مسند طیاسی میں "صلواتکم

الی بیت المقدس" کی تصریح ہے، اس روایت سے تائید ہوتی ہے کہ بیت المقدس مراد ہے، مگر حافظ نے [اس موقع پر] جو کچھ

لکھا ہے وہی میرے نزدیک بھی قوی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ صلوٰۃ سے مراد تو وہی صلوٰۃ الی بیت المقدس ہے لیکن البیت سے مراد کعبہ ہے

مطلب یہ کہ وہ نماز جو متوجہ الی بیت المقدس پڑھی گئی وہ کعبہ کے قریب پڑھی گئی، امام بخاری نے یہ اس وجہ سے کہا ہے کہ جب کعبہ کے قریب

بیت المقدس کی طرف رخ کر کے پڑھی ہوئی نماز باوجود قرب کعبہ کے ضائع نہیں ہوئی تو وہ نماز جو مدینہ میں کعبہ سے بہت دور بیت المقدس

کی طرف منہ کر کے پڑھی گئی ہے کیونکہ ضائع ہوگی، اس صورت میں البیت سے وہی مراد لی گئی جو معروف ہے اور عند البیت سے مراد یہ ہے

کہ اس کا وقوع بیت اللہ کے قریب ہوا جبکہ توجہ بیت المقدس کی طرف تھی تو لفظ عند معنی میں "الی" کے نہیں بلکہ نفس قرب مراد ہے۔

حدیث ۳۹۔ كَانَ أَوَّلَ مَا قَدِمَ الْمَدِينَةَ نَزَلَ عَلَى أَجْدَادِهِ أَوْ قَالَ أَخْوَالِهِ أَجْدَادُ

وہ اجداد مراد ہیں جو مال کی طرف سے ہیں یعنی نانا وغیرہ، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا عبد المطلب نے ایک نکاح مدینہ کے قبیلہ بنو النجار میں کیا

تھا اور یہ انصار کا ایک قبیلہ ہے، اس لئے یہ حضور کا نانا بہال ہوا۔

وَكَانَ يُعْجِبُهُ أَنْ تَكُونَ قِبَلَتُهُ قِبَلَ الْبَيْتِ وَإِنَّهُ صَلَّى أَوَّلَ صَلَوةٍ صَلَّاهَا

اور آپ پسند کرتے تھے کہ آپ کا قبلہ کعبہ کی طرف ہو جائے اور پہلی نماز جو آپ نے (کعبہ کی طرف) پڑھی وہ عصر کی نماز تھی اور

صَلَوةُ الْعَصْرِ وَصَلَّى مَعَهُ قَوْمٌ فَخَرَجَ رَجُلٌ مِمَّنْ صَلَّى مَعَهُ فَمَرَّ عَلَى أَهْلِ مَسْجِدٍ

آپ کے ساتھ اور لوگ بھی تھے ان میں سے ایک شخص جو آپ کے ساتھ نماز پڑھ چکا تھا ایک اور مسجد والوں کی طرف سے

وَهُمْ رَاكِعُونَ فَقَالَ أَشْهَدُ بِاللهِ لَقَدْ صَلَّيْتُ مَعَ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

گذا اور وہ رکو ع میں تھے (بیت المقدس کی طرف منہ کئے ہوئے) اس نے کہا میں اللہ کا نام لے کر گواہی دیتا ہوں کہ میں نے (ابھی)

قَبْلَ مَكَّةَ فَدَارُوا كَمَا هُمْ قِبَلَ الْبَيْتِ وَكَانَتِ الْيَهُودُ قَدْ أَعْجَبَهُمْ إِذْ كَانَ يُصَلِّي

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کعبہ کی طرف نماز پڑھی، پہنچتے ہی وہ لوگ نماز ہی میں کعبہ کی طرف بھر گئے اور جب آپ بیت المقدس کی طرف نماز پڑھا

قَبْلَ بَيْتِ الْمُقَدَّسِ وَأَهْلُ الْكِتَابِ فَلَمَّا وُلِيَ وَجْهَهُ قِبَلَ الْبَيْتِ أَنْكَرُوا ذَلِكَ

کرتے تھے تو یہودی اور دیگر اہل کتاب (نصاری) خوش تھے جب آپ نے اپنا منہ کعبہ کی طرف پھیر لیا تو انھوں نے برا مانا۔

قَوْلُهُ أَوَّلَ صَلَوةٍ صَلَّاهَا صَلَوةُ الْعَصْرِ اس میں کچھ اختلاف ہے اس روایت سے تو معلوم ہوتا ہے کہ جس میں

تحويل قبلہ ہوا تھا وہ نماز عصر تھی، مگر کتب سیر میں ابن سعد وغیرہ نے لکھا ہے کہ پہلی جو نماز کعبہ کی طرف ادا کی گئی وہ ظہر کی تھی، حافظ ابن حجر

نے دونوں میں تطبیق یوں دی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ظہر کے وقت مسجد نبوی میں نہ تھے بلکہ ایک دوسری مسجد بنو سلمہ میں تھے اب مسجد

ذوالقطنین کہتے ہیں نماز پڑھا ہے تھے اور دو رکعتیں پڑھ چکے تھے کہ مکہ آیا اور آپ نے تحويل فرمای تو ظہر کی دو رکعتیں بیت المقدس

کی جانب ہوئیں اور دو رکعتیں کعبہ کی طرف اس کے بعد مسجد نبوی میں سب سے پہلے جو نماز پڑھی گئی وہ عصر کی نماز تھی تو اب مطلب یہ

ہوگا کہ اول صلوة تار عصر ہے اور فی الجملہ اول ظہر بھی ہے کیونکہ بعض اجزاء کعبہ کی طرف بھی ہوئے لیکن روح المعانی میں سیوطی کے رسالے

سے نقل کیا گیا ہے کہ وہ اسے رد کرتے ہیں اور سیر کی روایت کو ترجیح دیتے ہیں اور وہ اس کے قائل نہیں ہیں کہ کچھ کعبہ کی طرف ہوئی اور

کچھ بیت المقدس کی طرف بلکہ کہتے ہیں کہ پوری نماز کعبہ کی طرف ہوئی اور تحويل کا حکم پہلے ہو چکا تھا اس کی تائید میں انھوں نے نسائی

کی وہ روایت پیش کی ہے جو ابوسید بن العلی سے مروی ہے کہ ایک روز ہم نے دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مہر پر تشریف فرما ہیں ہم

بھی سننے کو بیٹھ گئے تو آپ نے تحويل قبلہ کی آیت تلاوت فرمائی ابوسید کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے ساتھی سے کہا آؤ ہم سب سے پہلے دو رکعتیں

پڑھ لیں تاکہ ہم سابق ہوں تو انھوں نے دو رکعتیں پڑھیں اور سب سے پہلے پڑھیں حتیٰ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ابھی تک نہیں

پڑھی تھیں اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر کی نماز پڑھائی۔

اس روایت کو ہم نے نسائی میں تلاش کیا مگر ابواب میں تو نہیں ملی، لیکن ہے سنن کبریٰ یا کسی اور کتاب میں ہو
 تواب دو باتیں ثابت ہوئیں، اول یہ کہ تحویل مسجد نبوی میں ہوئی، دوسری یہ کہ پوری نماز ظہر کعبہ کی طرف ہوئی، یہ من وچہ سیر کی
 روایت کے خلاف ہے۔ کیونکہ سیر کی روایت میں ہے کہ ظہر کی دو رکعتیں کعبہ کی طرف ہوئیں، اور یہاں یہ ہے کہ پوری کعبہ کی طرف ہوئی، نیز وہاں
 ہے کہ وہ مسجد بنو سلمہ کی تھی اور یہاں یہ ہے کہ وہ مسجد نبوی تھی، ہاں اس میں دونوں متفق ہیں کہ وقت ظہر کا تھا، عصر کا نہ تھا، کتب سیر میں مسجد بنو سلمہ
 میں تحویل قبلہ کا ذکر ہے لیکن سنن ابوداؤد میں تصریح ہے کہ بعد تحویل صبح کی نماز کے وقت بنو سلمہ کی مسجد میں اطلاع ہوئی تھی، اس سے بھی بظاہر
 یہی معلوم ہوتا ہے کہ تحویل مسجد نبوی میں ہوئی، دوسرے یہ کہ پوری نماز ظہر کعبہ کی طرف ہوئی، اب رہا بخاری کا قول تو ان دونوں میں جس کو ترجیح
 ہو اس پر عمل ہوگا، ظاہری طور پر بخاری ہی کی روایت کو ترجیح حاصل ہوگی، تطبیق درست نہیں۔

قوله **فهرعلى اهل المسجد وهم راكعون** بعض مشیوں نے غلطی سے یہاں یہ لکھ دیا ہے کہ یہ مسجد بنو سلمہ کی ہے،
 حالانکہ درست نہیں، بلکہ یہ مسجد بنو عمارؓ ہے — مسجد بنی عمرو بن عوف و مسجد قبا اور مسجد بنو سلمہ میں تو روایات سے ثابت ہے کہ صبح کو اطلاع
 پہنچی تھی۔

نورالدین جہودی نے اپنی کتاب وفاء الوفاء میں لکھا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مدینہ میں بہت سی مساجد تھیں۔
 قوله **يُصلى قبل بيت المقدس** یہ معروف و مجہول دونوں طرح ہے، یہود خوش بھی تھے، نیز ظن بھی کرتے تھے
 کہ ہمارے قبلہ کی طرف نماز پڑھتے ہیں۔

واهل الكتاب، اہل کتاب سے بظاہر نصاریٰ مراد ہیں مگر اشکال یہ ہے کہ نصاریٰ کا قبلہ بیت اللحم ہے، جو
 مولد مسیح ہے، نہ کہ بیت المقدس، اور ان دونوں میں فاصلہ ہے، اگرچہ دونوں شام ہی میں ہیں، لہذا اب نصاریٰ کی موافقت کہاں رہی؟
 ایک جواب تو یہ ہے کہ دونوں کی سمت ایک ہی ہے اس لئے کسی ایک کی طرف رخ کرنے سے دونوں کی طرف ہو جاتا ہے، دوسرا یہ ہے کہ
 بیت المقدس کوئی علیہ اسلام کا مقرر کیا ہوا قبلہ ہے اور نصاریٰ بھی احکام تورات اور دین تورات کے بموجب ہیں لہذا فی الجملہ اشتراک اور
 قوت ہے اس لئے وہ بھی خوش ہوتے ہیں، اب بعض لوگوں نے کہا ہے کہ مراد یہودی ہی ہیں، تنقید صرف عنوان کا ہے اور اوصاف پر
 متلف ہے اور ایسا شائع ہے جیسا کہ **هوالاول والاخر** میں ہے، بعض نے کہا ہے کہ اہل کتاب کا عطف یصطیٰ کی ضمیر پر ہے
 یعنی چونکہ یہودی بھی بیت المقدس ہی کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے اس لئے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم بیت المقدس کی طرف رخ کر کے
 نماز پڑھتے تو یہود خوش ہوتے تھے، لہذا یہودی ہی ہیں مگر ضمیر راجع الی النبی ہے، پھر جب تحویل ہوئی تو انھوں نے انکار کیا کہ یہ اپنے

قَالَ زُهَيْرٌ حَدَّثَنَا أَبُو اسْحَاقَ عَنِ الْبَرَاءِ فِي حَدِيثِهِ هَذَا إِنَّهُ مَاتَ عَلَى الْقِبْلَةِ قَبْلَ
 زُبَيْرٍ نَعْنَاهُمْ سَعْدُ بْنُ ابْنِ أَبِي اسْحَاقَ نَعْنَاهُ ' انھوں نے براء سے اسی حدیث میں کہ قبلہ بدل جانے سے پہلے کچھ لوگ مر گئے تھے،
 اَنْ تَحُولَ رِجَالٌ وَقِيلُوا فَلَمْ يَنْدَرِ مَا قَوْلُ فِيهِمْ فَاَنْزَلَ اللَّهُ تَعَالَى وَمَا كَانَ اللَّهُ
 جَوْ دَاغًا قَبْلَ يَوْمِ قِبْلَتِ يَوْمِ نَزَلَ رَسْمُ لَوْ كُفِّدَ بُوْكَوْغُ تَعْنَاهُ ' ہم ان کے حق میں کیا کہیں (ان کو نماز کا ثواب دے یا نہیں) تب
 لِيُضَيِّعَ اِيْمَانَكُمْ

اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری: اللہ ایسا نہیں ہے جو تمہارا ایمان اکارت کر دے (یعنی تمہاری نماز)

نبی میں کہ کبھی ادھر اور کبھی ادھر نماز پڑھتے ہیں، اسی کو قرآن نے بیان کیا ہے کہ سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ یعنی یہ بے وقوف یوں کہیں گے کہ
 کیا اللہ میاں سے غلطی ہو گئی تھی کہ پہلے اُدھر پڑھتے کو کہا اور پھر ادھر؟ جواب دیا: قُلْ اللَّهُ الشَّيْءُ وَالْمَغْرِبُ ' آپ کہتے ہیں
 کہ مشرق و مغرب سب اللہ ہی کے تو ہیں، اس کے مصالح ہیں جیسا مناسب سمجھتا ہے حکم دیتا ہے، کسی کو اس میں دخل دینے کا کیا
 حق ہے — شروع میں اہل کتاب کے قبلہ کی طرف توجہ کرانے میں ممکن ہے محض تالیفِ تلوٰب مقصود ہو کہ نبی کسی نبی کے کسی شعاع
 کی اہانت نہیں کرتا، بلکہ اس کی تعظیم کرتا ہے، وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ اُمَّةً وَسَطًا (الایہ) اسی طرح ہم نے تم کو معتدل امت
 بنایا، تو ایک حکمت اس تحویل قبلہ میں یہ بھی ہے کہ نمایاں ہو جائے کہ کون حکم دیتا ہے اور کون سربانی کرتے ہوئے پھلے پیر لوٹ
 جاتا ہے، چنانچہ لکھا ہے کہ ضعیف الایمان لوگ اس واقعہ تحویل قبلہ کی وجہ سے مرتد ہو گئے، مگر راسخ العقیدہ لوگ نہیں ہٹے، ان کے لئے
 فرمایا گیا: مَا كَانَ اللَّهُ لِيُضَيِّعَ اِيْمَانَكُمْ، اللہ تمہارا ایمان ضائع نہیں کرے گا، بلکہ پورا پورا ثواب دے گا، اگریشان نزول ہوتا
 تو میں کہتا کہ ایمان سے ایمان ہی مراد ہے، یہی سیاق کے بھی موافق ہے کیونکہ امتحان مقصود ہے کہ جو لوگ ہٹے نہیں وہ سمجھ لیں
 اللہ کے ہاں ان کی قدر ہے اور اللہ ان کا ایمان ضائع نہ کرے گا: اِنَّ اللَّهَ بِالْاِنْسَانِ لَوَّوْفٌ رَّحِيْمٌ بے شک اللہ تعالیٰ
 لوگوں پر بڑی شفقت والا اور بڑی رحمت والا ہے۔

تو نظم قرآن بظاہر یہی بتاتا ہے اور اس پر صلوة الی بیت المقدس منطبق نہیں، لیکن چونکہ صحیح حدیث میں آگیا اسلئے
 اب کچھ نہیں کہتے مگر مندرجہ اب بھی اس میں ہے کہ جو لوگ ایک طرف نماز پڑھ کر دنیا سے رخصت ہو گئے، جب ان کی صلوة ضائع
 نہیں ہوگی تو جو مومنین ہیں ان کی تو بطریق اولیٰ ضائع نہ ہوگی۔

قال زُهَيْرٌ یہ تعلیق نہیں ہے بلکہ وہی حدیث ہے کہ جب تحویل ہو گئی تو خیال ہوا کہ جو مرچکے ہیں یہ معلوم ان کی نمازوں کا
 کیا مال ہے، لفظ و قتلوا میں زہیر منفرود ہے۔ ترمذی، ابو داؤد، ابی اسحق اور مسلم وغیرہ میں قتلوا کا لفظ نہیں ہے، صرف قتلوا

کالفاظ ہے اور اس لفظ سے اشکال پیدا ہوتا ہے کہ قبل تحویل قبل کوئی جنگ نہیں ہوئی، سب سے پہلے بدر کی جنگ ہوئی ہے جو رمضان میں ہے اور تحویل اس سے پہلے جب میں ہو چکی تھی، جنگ بدر میں کچھ صحابہ ضرور شہید ہوئے تھے لیکن تحویل سے قبل کوئی شہید نہیں ہوا حافظہ کہتے ہیں کہ جہاں تک ہم نے تاریخ و سیر کا مطالعہ کیا ہے ہمیں یہ معلوم ہوا کہ تحویل سے پہلے کوئی شہید ہوا ہو، ممکن ہے کچھ لوگ شہید ہوئے ہوں مگر ہم نے بہت تلاش کیا ہے ہمیں نہیں معلوم ہو سکا کہ وہ کون لوگ ہیں۔ اور زہیر کے علاوہ دوسرا کوئی نہیں لکھا، لہذا بظاہر یہ لفظ قتلوا صحیح نہیں۔

دوسرا اشکال ایک اور ہے اور اسے بھی کسی نے حل نہیں کیا، ہم نے اپنے اساتذہ کے سامنے یہ اشکال پیش کیا تو انھوں نے کچھ حل کیا، سوال یہ ہوتا ہے کہ نسخ تو بہت سے احکام میں ہوا ہے مگر صحابہ کو کہیں یہ خیال نہیں ہو کہ جو چیز منسوخ ہوئی اور کچھ لوگوں نے صرف اس پر عمل کیا، نسخ پر عمل نہیں کیا اور مر گئے تو اس کا کیا ہے گا؟ آخر یہاں کیا خصوصیت تھی کہ یہ سوال پیدا ہوا؟ اصل چیز تو لوہا و الہیہ کا اتباع ہے، جب پہلے حکم پر عمل کر لیا اور دوسرے کا وقت ہی نہیں پایا تو اب یہ سوال کیسا کہ کیا ہوگا؟ ہوا کیا جیسا انھیں ایک بات کا اور انھوں نے کیا نہیں کیا، دوسرا امر کا تو ناجہی نہیں تھا، آخر اس میں خاص بات کیا ہے؟ کیوں یہ سوال اٹھا؟؟ غصے کہیں اس کا جواب نہیں ملتا، نہ تفسیر میں، نہ حدیث میں، ہمارے استاد (حضرت شیخ الحدیث محمد بن عبد اللہ علیہ السلام) فرماتے ہیں کہ کل ذہیرہ حدیث میں ایسے دو موقعوں کا ذکر ہے ایک موقع تو یہی قول قبل کا ہے اور دوسرا آخر کی حرمت کے موقع پر یہی سوال پیدا ہوا، صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! ہنسی و غصہ اور میں اس حال میں شہید ہوئے کہ ان کے بیٹوں میں شراب موجود تھی، تو ان پر شراب بعد کو حرام ہوئی تھی پھر بھی سوال کیا گیا، اسی کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی، لَيْسَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جُنَاحٌ فِيمَا طَعِمُوا إِذَا مَا اتَّقَوْا (البقرہ: ۱۷۵) (جو لوگ ایمان لائے اور کام نیک کئے ان پر کوئی گناہ نہیں اس پر جو پہلے کھا چکے، جبکہ آئندہ کو ٹھہ گئے) تو جس طرح وہاں پر شراب کے بارے میں آیت کا ترمیم ہوا اسی طرح یہاں پر ماکان اللہ لیضیع ایمان لکھ کا نازل ہوا۔

ابن کثیر نے مسند امام احمد سے ایک روایت نقل کی ہے اس میں دونوں قصوں کو یکجا کر دیا ہے، ان کا یہ تتبع کرنا اس لئے نہیں ہے کہ دونوں واقعے ساتھ پیش آئے، بلکہ اس لئے جمع کیا ہے کہ یہی دو واقعے اس قسم کے ہیں۔

تو استاد فرماتے ہیں کہ یہ دونوں چیزیں ایسی ہیں کہ ان کا نسخ ترتیب اور انتقاد کے بعد ہوا ہے، ہر مسلمان قرآن سے اندازہ کر رہا تھا

کتاب صبح و شام میں اعراسے والا ہے چنانچہ عمر کے متعلق سب سے پہلے یہ آیت نازل ہوئی: يَسْئَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْمِرِ ۚ جِب
یہ آیت حضرت عرفانوق رضی اللہ عنہ نے سنی تو کہا: اَللّٰهُمَّ بَيْنْ لَنَا بَيَانَ شَافِيًا (اے اللہ ہمارے لئے شافی بیان نازل فرما دے)
اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَأَنْتُمْ سُكَارَىٰ (۱) (اے ایمان والو! نہ کی بات میں نماز
کے قریب نہ جاؤ) اس کے بعد بھی حضرت عرض اللہ عنہ نے پہلی ہی بات عرض کی اَللّٰهُمَّ بَيْنْ لَنَا بَيَانَ شَافِيًا فِي الْخَمْرِ (یا اللہ شراب
بارے میں فیصلہ کن بات فرما دے) اس سے معلوم ہوا کہ لوگوں کو انتظار تھا کہ حرمت ضرور ہوگی اور حرمت کا آخری حکم آنے ہی والا ہے تب میری
پر یہ آیت اتنی جس میں حرمت کا صاف حکم تھا: إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْمِرُ وَالْأَزْأَمُ رَجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوا
لَعَلَّكُمْ تَفْلَحُونَ ۚ إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُوقِعَ بَيْنَكُمْ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْمِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ
وَعَنِ الصَّلَاةِ فَكُلْ أَنْتُمْ فَهَلُوفُونَ (۲) (یہ شراب اور جوا اور بت اور پانے سب گندے کام ہیں شیطان کے، سوان سے بچتے رہو تاکہ
تم نجات پاؤ، شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ وہ تم میں دشمنی اور میر پڑیو شراب اور جوا کے اور روکے تم کو اللہ کی یاد سے اور نماز سے، سوا ب بھی
تم بازو گے؟) جب یہ آیت نازل ہوئی تب عرفانوق رضی اللہ عنہ بولے: اِسْتَهْنِ يَا رَبِّ (ہم باز آئے یا رب!) اب انتظار ختم ہو گیا۔
اسی طرح تھوہل قبلہ میں بھی ہوا، یہاں بھی قرآن تھے اس لئے ہر شخص ہمد وقت منتظر رہتا تھا کہ اب تھوہل قبلہ کا حکم آیا، طبری میں
مذکور ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں تمنّا تھی کہ ہمارا قبلہ کعبہ ہو جائے، یہی ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ تھا
اور آپ ابراہیم علیہ السلام سے اُتی تھے اس لئے دعا مانگتے تھے اور بار بار چہرہ آسمان کی طرف آمد حی کے انتظار میں اُٹھاتے تھے قرآن نے فرمایا
قَدْ كُنَّا تَرَىٰ تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاءِ فَلَوْلِئِكَ قَبْلَةً تَرَضَّاهَا قَوْلٌ وَجْهِكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ (دیشک ہم دیکھتے
ہیں بار بار اُٹھنا آپ کے چہرے کا آسمان کی طرف، سو اب تہہ پھیریں گے ہم آپ کو اس قبلہ کی طرف جس سے آپ راضی ہیں، اب آپ اپنا منہ مسجد
کی طرف پھیر لیں) اس کا پورا دائرہ مختصر یہ ہے پہلے کعبہ مسلمانوں کا قبلہ مقرر ہوا تھا اس کے بعد استقامت چند دنوں (سولہ یا سترواہ) کے لئے بیت المقدس
کو قبلہ بنادیا گیا، اور ظاہر ہے کہ استقامت اسی میں ہوتا ہے جو جس پر بھاری ہو، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَإِنْ كُنْتُمْ لَكَيْفَةً إِلَّا عَلَى الَّذِينَ يَنْ
هَدَى اللَّهُ (۵) (اور بیشک یہ بات بھاری ہوئی گمان پر جن کو راہ دکھائی اللہ نے تم عوام مسلمانوں پر تو یہ بات اس لئے گراں ہوئی کہ ان میں زیادہ تر
قریش تھے اور قریش کو کعبہ کی انصافیت پر اعتقاد تھا اس لئے جب اس کے خلاف حکم پر عمل کرنا پڑا تو اگرچہ عمل کیا مگر دل میں خیال رہا، اور خواص کو

اس لئے بار تھا کہ یہ حکم امتِ ابراہیمی کے خلاف تھا اور وہ امتِ ابراہیمی کے مامور تھے، اللہ نے فرمایا: **مَلَّةَ اَبْرٰهِيْمَ** (۱) اور انھیں انھوں میں جو ذوقِ سلیم رکھتے تھے اور بن کو مرا تہ میں امتیاز کرنے کی صلاحیت عطا ہوئی تھی وہ اسے ترقی معکوس سمجھ رہے تھے، مگر بغیر اللہ نے اسرار و حکم تک رسائی مرحمت فرمائی تھی اور جو حقیقت بیت المقدس اور حقیقت کعبہ کو اس فراموشی کے نور سے جو اللہ نے انھیں عطا فرمائی تھی جدا جدا سمجھتے تھے، ان کو اس کا علم تھا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء علیہم السلام کے جاسم ہیں اور آپ کی رسالت جملہ عالم اور تمام امتوں کو شامل ہے اس لئے حکمت الہی میں یہ ضروری ہے کہ استقبال بیت المقدس بھی کچھ دونوں کے لئے ضرور کرایا جائے، اس لئے انھیں کوئی گھبراہٹ نہیں ہوئی، جب امتحان ہو چکا اور حکمت الہی پوری ہو گئی تو حکم ہوا کہ اب کعبہ کی طرف منہ کیجئے، تو چونکہ پہلے سے انتظار تھا اور لوگ سمجھ رہے تھے کہ قبلہ بدل کر رہے گا اور نبی علیہ السلام کی تمنا بھی تھی جو پوری ہوئی اور حکمت خداوندی کا تقاضا بھی تھا اس لئے حکم ملنے ہی فوراً تبدیل ہوئی اور کسی نے یہ نہیں سوچا کہ ایک آدمی کے خبر دینے سے ہم کیسے رخ بدل لیں۔

واقعہ یوں پیش آیا کہ جب مسجد قبا اور مسجد نبویہ میں ایک شخص نے جا کر خبر دی کہ توبل کا حکم آگیا تو لوگوں نے اسی وقت بیت اللہ کی طرف رخ کر لیا، چونکہ وہ پہلے سے اس حکم کے منتظر تھے اس لئے انھیں کوئی تال نہ ہوا اور فوراً رخ بدل لیا۔ غیب وغیرہ میں اس پر بحث آئی ہے کہ قاطع کا نسخ خبر واحد سے کیسے ہوسکتا ہے؟ تو یہاں بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنا قطعی تھا پھر خبر واحد سے کیسے نسخ ہو گیا اور لوگوں نے کیوں رخ بدل دیا؟ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ خبر واحد جو محفوف بالقرائن ہو قطعی بن جاتی ہے اور نسخ بھی بن جاتی ہے اور یہاں ایسا ہی تھا کہ قرائن موجود تھے، قرائن کیا تھے؟ حضورؐ کی دنیا میں، ہر شخص کا انتظار وغیرہ، تو ان دونوں واقعات میں نسخ و ترقب و انتظار اور یقین کے بعد آیا، تو ایک طرح اللہ کی مرضی لوگوں پر ظاہر ہو چکی تھی اس لئے سوال کا پیدا ہونا مستبعد نہیں تھا بلکہ ضروری تھا کہ جب ایک شخص پہلے سے جانتا ہے کہ نسخ آنے والا ہے اور ابھی آیا نہیں کہ اس کی موت واقع ہو گئی اور کعبہ کی طرف نماز نہ پڑھ سکے، تو اب ان کے ایمانوں میں (ان کی نمازوں میں) کچھ کمی نہ ہوگی کیونکہ کعبہ جو افضل تھا اس کی طرف توجہ نہ کر سکے یہ مطلب نہیں کہ انکو اس میں تردد تھا کہ ان کی نماز مطلقاً ہوئی یا نہیں، نہ ایسا صحابہ سمجھ سکتے ہیں، چنانچہ یہاں **فَلَمْ يَذَرُوا مَا يَقُولُونَ** ہے، یعنی ہم نہ سمجھے کہ ان کے حق میں کیا کہیں۔ بہر حال ان کے دل میں جو شک تھی اس کا جواب دیا **مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضَيِّعَ اِيْمَانَكُمْ** (اللہ ان کا ایمان (نماز) ضائع نہیں کرے گا۔ اب یہ بھی معلوم ہو گیا کہ یہاں ایمان سے کیوں تعبیر کیا، اس لئے کہ لوگ اصل روح صلوة پر مطلع ہو جائیں کہ اصل منشا حکم الہی ہے اور وہ اس حکم پر

چلتے رہے، ان کے مرنے کے بعد جب اللہ نے دوسرا حکم دے دیا تو ان کا کیا تصور ہوا؟ ان کا ایمان کیوں ضائع ہوگا؟ ان کی نوکوی کوتاہی تھی نہیں؟ یہی تحریم خمر میں بھی فرمایا کہ جو لوگ ایمان لائے اور ایمان میں ترقی کرتے کرتے درجہ احسان تک پہنچ گئے تو ایسے لوگوں کے بارے میں کیا سوال کرتے ہو؟ ان میں کچھ فرق نہیں وہ وعسین ہیں واللہ یحب المحسنین (اور اللہ محسن سے محبت فرماتا ہے)

تو یہاں شبہ ہونا ہی چاہئے تھا کیونکہ افضل اور مفضول کا سوال ہے، کعبہ بالاتفاق بیت القدس سے افضل ہے اور افضل پر عمل ہونے کا تو شبہ ہوا کہ ممکن ہو ثواب کچھ کی ہوگی، اس کو اللہ نے فرمایا کہ کچھ کی نہیں آئی، ہم تو دلوں کا حال دیکھتے ہیں، ایسے معلوم ہے کہ ان کے دلوں میں کعبہ کی طرف نماز پڑھنے کا کس قدر جذبہ تھا اور کس قدر شوق رکھتے تھے مگر یہ ان کے اعتبار سے باہر تھا کہ موت کو روک لیں، موت نے عمل نہ کرنے دیا ورنہ ان کے جذبات ضرور ایسے تھے اور وہ دل سے متنی تھے کہ کعبہ کی طرف نماز پڑھیں۔

چنانچہ ایک صحابی براہِ راست معروضہ جو مدینہ میں تھے اپنے اجتہاد سے کعبہ کی طرف نماز پڑھتے تھے مگر حضورؐ نے منع فرمایا تو مجبوراً بیت القدس کی طرف نماز پڑھنے لگے مگر جب تحویلِ قبلہ سے ایک ماہ قبل ان کا انتقال ہونے لگا تو وصیت کی کہ مجھے کعبہ کی طرف دفن کرنا، اس سے معلوم ہوا کہ کچھ لوگ ایسے بھی تھے کہ ان کے دل میں جذبہ و شوق تھا اس لئے اللہ فرماتا ہے کہ ہم تو مجذوبہ کو دیکھتے ہیں، ان کے شوق کو دیکھتے ہیں، کیا ہم ان کے ایمان کو ضائع کر دیں گے؟

اس میں کلام ہے کہ نسخ قبلہ دوبار ہوا یا ایک بار، دونوں روایات ہیں، تفصیل یہ ہے کہ تیرہ سال نبی علیہ السلام مکہ میں رہے اور نماز پڑھتے ہی تھے، تو بعض علماء کہتے ہیں کہ پہلے آپ کعبہ کی طرف نماز پڑھتے تھے، بعد کو کہ ہی میں بیت القدس کی طرف نماز پڑھنے لگے، پھر مدینہ میں بیت اللہ کی طرف پڑھنے کا حکم ہوا، تو نسخ دو بار ہوا۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ شروع ہی سے بیت القدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے کہین کے قریب اس طرح کھڑے ہوتے کہ رخ بیت القدس کی طرف بھی ہو اور بیت اللہ کی طرف بھی، مقصود تو استقبال بیت القدس ہونا مگر آپ اپنی طبیعت سے صورت اختیار کرتے تھے تاکہ دونوں کا استقبال حاصل رہے، اس قول پر نسخ کا ایک بار اور وہ بھی مدینہ میں ہونا ثابت ہوا، روایات سے اسی کی تائید ہوتی ہے کہ قبلت بیت القدس ہی تھا اور کوئی روایت ایسی نہیں ہے جس میں یہ ہو کہ کسی زندگی میں بیت اللہ قبلہ رہا ہے، مگر حدیث امت جبریلؑ میں ایک لفظ عند باب البیت ہے (بیت اللہ کے دروازے کے قریب) اور اس جگہ کھڑے ہونے سے استقبال بیت القدس ممکن ہے، لہذا اس سے کعبہ ہی قبلہ معلوم ہوتا ہے

(۱) صحابہ میں یہ واقعہ دیگر ہے، یاد رکھو صحابہ کے حالات میں تین کتابیں مشہور ہیں، ان میں احابہ جو حافظ ابن حجر عسقلانی کی تصنیف ہے سب سے بہتر اور سب کو صاحبِ سنی، دوسری "المستعجب" لابن عبد البر اور اسدِ غابہ لابن الاثیر، انجری ہے۔

تخلیل قبلہ کا حکم دیا، اس صورت میں نسخ ایک بار ہوگا اور پہلے استقبال کعبہ آپ کے نظری رجحان کا اثر تھا وحی سے نہیں تھا اور جبریلؑ نے بھی اسی کو ترجیح دیتے ہوئے بیت اللہ کی طرف توجہ کی۔ یہ سیرا خیال ہے، واللہ اعلم صحیح ہے یا غلط۔

باب حسن اسلام المرء

اسلام تو سارا ہی بہتر ہے مگر مسلمان ہونے والے کئی طرح کے ہیں، ایک وہ ہے جو محض روٹی کے لئے مسلمان ہوا، ایک وہ ہے کہ ایمان تو دل سے لایا لیکن افعال سیدہ نہیں چھوڑے، تو یہ دونوں اچھے نہیں، ایک وہ ہے کہ کفر چھوڑ کر اسلام میں آیا اور عمل بھی بہتر کے، یہ اسلام حسن ہے۔

بخاری کی غرض یہ ہے کہ اسلام کے بھی مراتب ہیں اور اس حدیث سے مراتب ہی ثابت کرنا چاہتے ہیں، حدیث پاک میں بہت جڑی بشارت اور اللہ کی رحمت بے پایاں کا بیان ہے کہ جس آدمی نے اسلام قبول کر لیا اور اچھی طرح قبول کیا یعنی اس کے احکام پر عمل بھی کرنے لگا تو ایک فائدہ یہ ہوگا کہ اس کا سارا پھیل گیا ہوا معاف ہو جائیگا یعنی اسے حق تعالیٰ نے اپنی ہمتی اور اللہ کے حقوق ضائع کئے ہوں گے اللہ انھیں معاف فرما دے رہے متعلق العباد تو ان کا معاملہ دوسرا ہوگا، وہ صاحب حق کے معاف کرنے ہی سے معاف ہوں گے، پھر اب اس کا از سر نو نیا کھاتا باقی طور شروع ہوگا کہ جو نیکی کرے گا اس کے بدلے کم از کم دس ویسے ہی نیکیاں اس کے نام اعمال میں لکھی جائیں گی، سات سو تک اس میں اضافہ ہوتا چلا جائیگا اور جو برائی کرے گا وہ ایک ہی لکھی جائے گی۔ سات سو تک کا یہ اضافہ بھی ایک ضابطہ ہے، اضافہ اسی حد تک محدود نہیں ہے، وہ جتنا چاہا زیادہ کر سکتا ہے، قرآن میں ہے: **وَاللّٰهُ يُضَاعِفُ لِمَنْ يَّشَاءُ** (۱) اللہ جس کے لئے چاہے سات سو سے بھی زیادہ کر دے گا، پھر اگر کبھی ختم نہ ہوگا، قرآن ہی میں دوسری جگہ فرمایا: **إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَلَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ** (۲) جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے ان کے لئے اجر ہے جو کبھی منقطع نہ ہوگا (۳) رہیں سنیات تو ان میں اضافہ نہ ہوگا بلکہ ایک کے بدلے ایک ہی ہوگی اور اس میں سے بھی چاہے گا تو معاف فرما دے گا۔ **إِلَّا أَنْ يَتَّقُوا اللَّهَ** میں یہ بیان فرمایا گیا ہے۔

یہ حدیث امام مالک کی ہے، واقطبی نے اپنی کتاب "غرائب مالک" میں یہ حدیث درج فرمائی ہے، اس میں "خَسَنَ" "إِسْلَامَهُ" کے بعد ایک جملہ یہ بھی مذکور ہے کہ کافر کے اعمال نامہ میں اس کے اسلام سے پہلے کے اچھے اعمال بھی لکھ لئے جائیں گے، یعنی زمانہ قبل اسلام کی ساری برائیاں تو ختم ہو جائیں گی البتہ کفر کے زمانہ والی بھلائیاں اس نئے اعمال نامہ میں لکھی جائیں گی جو اس کے حق میں

۱۔ حَدَّثَنَا اسْمَعِيلُ بْنُ مَضُورٍ قَالَ حَدَّثَنَا عَبْدُ الرَّزَّاقِ قَالَ أَخْبَرَنَا مَعْمَرٌ

ہم سے بیان کیا اسحق ابن منصور نے کہا ہم سے بیان کیا عبد الرزاق نے کہا خبر دی ہم کو معمر نے
عَنْ هَمَامٍ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا أَحْسَنَ أَحَدُكُمْ
أَخُوهُ نَفْسَهُ فِي بَيْتِهِ أَوْ فِي مَسْجِدِهِ أَوْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَوْ فِي بَيْتِ يَتِيمٍ أَوْ فِي بَيْتِ مَسْكِينٍ أَوْ فِي بَيْتِ
إِسْلَامِهِ فَكُلُّ حَسَنَةٍ يَعْمَلُهَا تَكْتُبُ لَهُ بِعَشْرِ امْتَالِهَا إِلَى سَبْعِ مِائَةِ ضِعْفٍ وَكُلُّ
تَوَسُّعٍ يَفْعَلُهُ يَكْتُبُ لَهُ بِعَشْرِ امْتَالِهَا إِلَى سَبْعِ مِائَةِ ضِعْفٍ وَكُلُّ
سَيِّئَةٍ يَفْعَلُهَا تَكْتُبُ لَهُ بِمِثْلِهَا
دوسری ہی ایک کھجی جائے گی

مانع ہوں گی، امام بخاری نے یہ جملہ چھڑ دیا ہے حالانکہ داؤد طحاوی نے نو طرق سے یہ حدیث پیش کی ہے اور سب میں یہ اضافہ نقل کیا ہے، اگر
معلوم کیوں امام بخاری نے اسے حذف کر دیا اور حدیث میں اختصار کیا، اس کے بارے میں محدثین بالعموم یہ کہہ دیتے ہیں کہ اس اختصار کی
مصلحت معلوم نہیں ہوتی، بعضوں نے یہ لکھ دیا کہ شاید بخاری نے اس ٹکڑے کو مسلمات اہل سنت کے خلاف پایا ہوگا اس لئے اسے نہیں لائے
بخاری نے سچا ہوگا کہ یہ مسلمان ہے کہ کافر کے حسانات غیر مقبول ہیں اور یہاں اس کے خلاف ہے اس لئے چھڑ دیا مگر ملاحظہ فرمائیے کہ یہ ٹھیک
نہیں ہے کیونکہ حدیث کو قطع نہیں کیا جاسکتا، ہاں اس کی تردید کرو یا تاویل کرو مگر نقل تو کرنا ہی چاہئے اور یہ بھی تسلیم نہیں کیا جاسکتا کہ کافر کے حسانات
کے غیر مقبول ہونے کا مسئلہ مسئلہ ہے، نوی تو کہتے ہیں کہ یہ غلط ہے کہ کافر کے حسانات مانع نہیں، بلکہ یہ مسئلہ اجماع کے قریب ہے کہ کافر کے حسانات
مانع ہیں دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، آخرت میں گناہ و عذاب میں تخفیف ہوگی ورنہ پھر عدل کے خلاف لازم آئے گا، فرض کرو کفار میں ایک
سخت ظالم و جابر اور غاصب ہے اور دوسرا وہ جو دوسروں کے حقوق کا لحاظ رکھتا ہے، کسی پر جبر و ظلم نہیں کرتا، تو کیا دونوں برابر ہو جائیں گے
ہرگز نہیں، یہ بات عدل الہی کے خلاف ہے، لہذا حسانات آخرت میں ضرور مانع ہوں گی اور عذاب میں تخفیف ہوگی، چنانچہ ابوطالب کے
عذاب میں تخفیف کا ہونا حدیث پاک سے ثابت ہے، روایت ہے کہ سیدنا عباس رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ آپ کی
ذات گرامی سے ابوطالب کو کچھ نفع پہنچایا نہیں؟ وہ تو آپ کی بڑی حمایت کرتے اور آپ سے بے انتہا محبت کا تعلق رکھتے تھے، تو آپ نے
فرمایا: ہاں اگر میں نہ ہوتا تو وہ جہنم کے نیچے کے طبقہ میں ہوتے، میری وجہ سے ان کے عذاب میں اتنی تخفیف ہوگئی کہ انہیں آگ کی نوبت
دو جوتیاں پہنا دی گئی ہیں جو سب سے ہلکا عذاب ہے، یہ الگ بات ہے کہ وہاں کا ہلکا عذاب بھی بہت سخت ہے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
نے فرمایا کہ ابوطالب کا دماغ اس طرح کھول رہا ہوگا جس طرح انڈی جو لٹے پر کھنکھاتی ہے، یہاں غرض یہ ثابت کرنا ہے کہ کافر کے عذاب میں

تخفیف ہوگی اور تخفیف انھیں حسنت کی وجہ سے ہوگی جو انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت میں کئے تھے۔ ابوہب نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کی خوشی میں ایک باندی ثویہ کو آزاد کر دیا تھا تو اس دن اس کے عذاب میں تخفیف ہو جاتی ہے، یہی وہ آیت جس میں فرمایا گیا ہے (لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ الْعَذَابُ) "عذاب میں تخفیف نہ کی جائے گی" اس کے متعلق میں یہ کہتا ہوں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ بعد تخفیف بھی اس کو ایسا لگے گا کہ تخفیف نہیں ہوئی، جیسا کہ حدیث میں ہے کہ ابوطالب کو سب سے ہلکا عذاب ہوگا مگر وہ ہمیں گے کہ سب سے زیادہ سخت عذاب بھوکہ ہو رہا ہے، مسلم کی روایت میں ہے: مَا يَرَىٰ اَنْ اَحَدًا اَشَدَّ مِنْهُ عَذَابًا وَاَنَّهُ لَا هَوْنَهُمْ عَذَابًا لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ الْعَذَابُ کا ایک دوسرا مطلب یہ بھی بیان کیا گیا کہ شروع ہی میں جو عذاب تجوز ہوگا اسی میں تخفیف ہو چکی ہوگی، اب اس تخفیف شدہ عذاب میں مزید تخفیف نہ ہوگی — غرض کافر کے حسنت سے آخرت میں فائدہ ہونا ثابت ہے اسی کو امام نووی نے کہا ہے کہ یہ بات قریب بہ اجماع ہے کہ کافر کے حسنت نافع ہیں۔

یہ تو آخرت کی بات تھی، دنیا میں بھی کافر کے حسنت نافع ہیں، مال کا ہونا اولاد کا ہونا، آرام و آسائش کا میا ہونا، یہ سب اعمال نفع ہے، اب اس کے بعد اگر کافر ایمان لے آیا اور اس نے استقامت دکھائی تو اس کے حسنت اگر مقبول ہو جائیں تو کوئی مستبعد نہیں، اور اب اس کے خلاف ہی ہے، جب اللہ تعالیٰ بہت سے ان اعمال کو محسوب کر لیتا ہے جو ابھی کئے ہی نہیں، جیسا کہ آتا ہے کہ ایک شخص تہجد پڑھنے کے خیال سے سویا لیکن آنکھ نہ کھلی تو اسے تہجد کا ثواب ملے گا، اسی طرح ایک شخص جماعت کے ارادہ سے چلا مگر جماعت نہ ملی تو اسے بھی جماعت کا ثواب ملے گا، جب شریعت میں ایسے شواہد موجود ہیں تو پھر اس مومن نے بھی تو عات کفر میں عمل کیا تھا مگر شرط پوری نہ تھی، یعنی نیت، لہذا اب جب کہ مسلمان ہو گیا تو اگر اللہ تعالیٰ اس کے وہ اعمال محسوب کرے تو کیا استبعاد ہے بلکہ میں تو ترقی کر کے کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ سے بعید ہی نہیں بلکہ اسی کی توقع ہے — حدیث پاک میں ہے کہ قیامت میں ایک شخص پیش کیا جائے گا اور اللہ تعالیٰ صفار ذنوب کے بار میں اس سے سوال کرے گا تو وہ مجبوراً اقرار کرے گا مگر ڈر سے سہا جا رہا ہو گا کہ یہ تو صفار ذنوب ہیں، نہ مسلم کبار پر کیا گذرے گی، لیکن اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ میں نے تیرے سب گناہ معاف کر دیے اور انھیں حسنت سے بدل دیا، فَاُولَٰئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ مَسِيئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ (۳) حدیث میں آتا ہے کہ اس پر وہ شخص کہے گا اے اللہ ابھی میرے کچھ کبیرہ گناہ بھی باقی ہیں، تو اللہ تعالیٰ ہنسے گا۔ پس جب مسیئات کو حسنت سے تبدیل کر دیتے ہیں تو اس میں کیا استبعاد ہے کہ کافر کے حسنت کو اس کے مسلمان ہو جانے کے بعد محسوب کر لیں — تو یہاں میں یہی

بَابُ أَحَبِّ الدِّينِ إِلَى اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ آدَمُ

الذکوہ علی بہت پسند ہے جو بیش کیا جائے۔

۱۔ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ الْمُثَنَّى قَالَ حَدَّثَنَا يَحْيَى عَنْ هِشَامٍ قَالَ

بہم سے بیان کیا محمد ابن المثنیٰ نے کہا ہم سے بیان کیا یحییٰ نے انہوں نے ہشام سے، کہا نبی

أَخْبَرَنِي أَبِي عَنْ عَائِشَةَ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَخَلَ عَلَيْهَا وَعِنْدَهَا

نہدی میرے باپ (۶۶ء) نے انہوں نے عائشہ صدیقہ سے کہ آؤ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس تشریف لائے وہاں

امْرَأَةٌ قَالَتْ مَنْ هَذِهِ قَالَتْ فُلَانَةٌ تُذَكِّرُكُمْ صَلَاتِهَا قَالَ مَا عَلَيْكُمْ بِهَا

ایک عورت (بیٹی) تھی آپ نے پوچھا یہ کون ہے، حضرت عائشہ نے کہا فلاں عورت ہے اور اس کی نماز کا حال بیان

تُطِيقُونَ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يَمَلُّ اللَّهُ حَتَّى تَمْلُوكَ كَانَ أَحَبَّ الدِّينِ إِلَى اللَّهِ مَا دَامَ عَلَيْهِ

کرنے لگیں (کہ یہ رات بھر عبادت کرتی ہیں) آپ نے فرمایا بس بس! وہ کام کرو جو (ہیشہ) کر سکو، کیونکہ خدا کی قسم اللہ تو

صَاحِبُهُ

(ثواب دینے سے) نہیں تھکے گا، تم ہی تھک جاؤ گے، اور حضور کو وہ عمل بہت پسند تھا جس کا کرنے والا اس کو ہمیشہ کرے۔

کہتا ہوں کہ اسلام لانے سے اللہ تعالیٰ اس کے اقبل اسلام کے حسنات بھی شمار فرمائے گا مگر یہ معاملہ افضل کا ہے۔ اور وہ جو ایک مہ

میں ہے کہ بعد اسلام اگر اس نے اچھے کام کئے تو وہ اسلام اس کے لئے اہم نیلایا ہوگا، اور اگر [اسلام کے بعد بھی] وہ مشدات

سے باز آیا تو اُخْذْ بِأَوَّلِهِ وَآخِرِهِ، یعنی اول و آخر سب کی پکڑ ہوگی۔ اس کی مختلف تاویلیں کی گئی ہیں، مثلاً یہ کہ وہ منافق

ہوگا، مگر یہ درست نہیں، بلکہ امام احمد نے لکھا ہے کہ اگر اب بھی وہ باز آیا اور گناہوں پر مہربان تو اب اس سے باز پرس ہوگی۔ مگر

اس میں سچے تردد ہے، اس لئے میں تو وی کہتا ہوں جو امام ابو حنیفہؒ نے کہا ہے کہ اسلام سب کو ہم کر دے گا۔

اب رہا اُخْذْ بِأَوَّلِهِ وَآخِرِهِ تو اس کو ایک مثال کے ذریعہ سمجھاتا ہوں :

ایک طالب علم نے کوئی تصور کیا تو مہتمم صاحب اس سے کہا اب کی مر تیرہ صوفائے کئے دیتا ہوں مگر پھر مت کرنا، اگر اس نے

پھر وہی جرم کیا، مہتمم صاحب نے دوبارہ بھی اس کو سمجھایا اور کہا جاؤ ابھی پھر چھوٹے دیتا ہوں لیکن اگر اب بھی تم باز نہ آئے تو ضرور

سزا ملے گی، مگر اس کے باوجود وہ نہ مانا اور پھر جرم کیا، تو اب اسے سخت سزا ملے گی، اگرچہ یہ سزا ایک ہی جرم کی ہے مگر اس قدر سخت

ہے کہ سب جرموں کے برابر ہوگئی۔

تو یہاں بھی ایسا ہی معاملہ ہے، مگر اسلام نے سب کو ہم کر دیا تھا اور بعض اسلام لانے سے سب سے توبہ بھی ہو گئی تھی مگر اس کے بعد بھی اس نے پھر وہی بد معاشیاں اور شرارتیں شروع کر دیں، تو اب سزا بھی سخت ہو گئی کیونکہ تکرار جرم سختی کا باعث ہے، جرم ایک ہی ہو مگر مضافاً ہے، تو اخذِ بلولہ و اخروہ کا میرے نزدیک یہی مطلب ہے کہ اول و آخر پر جو سزا ہونی چاہئے تھی وہ سب آخر پر ہو جائے گی، کیونکہ اس نے معافی کی قدر نہیں کی لہذا سزا بھی سخت ہو گئی۔

بَابُ أَحَبِّ الدِّينِ إِلَى اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ

امام بخاری کا مقصد یہ ہے کہ یہاں عمل پر بلکہ دوامِ عمل پر دین کا اطلاق کیا گیا، معلوم ہوا کہ اعمال تو مطلوب ہیں ہی ان کا دوام بھی مطلوب ہے، پہلے باب میں کہا تھا کہ حسنِ اسلام مطلوب ہے اور یہاں بتلایا کہ وہ حسنِ اسلام دوامِ عمل ہے۔

حدیث ۴۱۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے ہاں تشریف لائے تو اس وقت میرے پاس ایک ستماء بیٹی تھیں، جن کا نام خولار بنت تویت تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا یہ کون ہیں؟ حضرت صدیقہؓ نے جواب دیا کہ خولار بنت تویت، صدیقہؓ نے ان کی نماز کا حضورؐ سے تذکرہ کیا کہ بہت نمازیں پڑھتی ہیں، جنسِ روایات میں ہے کہ فرمایا: یہ رات بھر نمازیں پڑھتی رہتی ہیں، ظاہر ہے کہ یہ نوافل ہو گئی، تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ رہے دو، اتنا زیادہ وجہ مت لادو کہ نہا نہ ہو سکے، اس اتنا کہ جس پر پابندی کر سکو جیسا کہ پچھلے باب میں مَدَدٌ وَأَوْقَارُ کے ضمن میں تقریر ہو چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ثواب دینے میں کوئی کمی نہیں ہے بلکہ تم خود ہی محکم کہ کچھ دنوں میں اسے یا تو ترک کر دو گے یا بے دلی سے کر دو گے اور دونوں باتیں بری ہیں۔

علیکم بہا تطیقون میں یہی تعلیم دی کہ اپنے لئے وہی کام اختیار کرو جس کی طاقت ہو یعنی جس پر دوام و پابندی ہو سکے، جوش میں بہت کرنا شروع کیا اور کچھ دنوں بعد جوش ٹھنڈا ہوا تو سب چھوٹ گیا، یہ اللہ کو پسند نہیں۔

اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وَاللَّهِ لَا يَمْلِكُ اللَّهُ حَقَّ تَمَلُّوا خدا کی قسم اللہ تو ثواب دینے سے نہیں تھکے گا، تم ہی تھک جاؤ گے۔ مَلَالٌ اس مکان اور تعب کو کہتے ہیں کہ جو مشقت کرنے کے بعد لاحق ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی شان اس سے بہت بلند ہے کہ تعب و مشقت اس کو ہو، مراد نفیِ ملال من اللہ ہے، یعنی اللہ تو ثواب برابر دیتا رہے گا جب تک تم عمل کرتے رہو گے، وہاں کمی نہیں، مگر تم سے اس کا نہا ہوشیار ہو گا۔

فتح الباری میں حسن ابن سفیان کے سند سے نقل کیا گیا ہے کہ عائشہ صدیقہؓ نے ان ستماء کی یہ تعریف کی کہ بہت نمازیں

بَابُ زِيَادَةِ الْإِيمَانِ وَنَقْصَانِهِ وَقَوْلِ اللَّهِ تَعَالَى: وَزِدْنَا لَهُمُ هُدًى

ایمان کے بڑھنے اور گھٹنے کے بیان میں اور اللہ تعالیٰ نے (سورہ کہف) میں فرمایا: اور ہم نے ان کو اور ہدایت دی اور سورہ مدثر میں: ایمان والوں کا ایمان اور بڑھے اور (سورہ المائدہ میں): آج ہم نے تمہارے لئے تمہارا دین پورا کیا اور (قاعدہ ہے کہ)

وَزِدَادُ الَّذِينَ آمَنُوا إِيمَانًا وَقَالَ: الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ فَإِذَا تَرَكَ شَيْئًا مِنَ الْكَمَالِ فَهُوَ نَاقِصٌ

پورے میں سے کوئی کچھ تھوڑ دے تو وہ ادھورا جاتا ہے۔

۴۲ - حَدَّثَنَا مُسْلِمُ بْنُ أَبِرَاهِيمَ قَالَ حَدَّثَنَا هِشَامٌ قَالَ حَدَّثَنَا

اس سے بیان کیا مسلم ابن ابراہیم نے کہا ہم سے بیان کیا ہشام نے کہا ہم سے بیان کیا متادہ نے انھوں نے

مَتَادَةُ عَنْ أَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يُخْرَجُ مِنَ النَّارِ مَنْ قَالَ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَفِي قَلْبِهِ وَزَنُ شَعِيرَةٍ مِنْ خَيْرٍ وَيُخْرَجُ مِنَ النَّارِ مَنْ قَالَ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَفِي قَلْبِهِ وَزَنُ بَرَّةٍ مِنْ خَيْرٍ وَيُخْرَجُ مِنَ النَّارِ

ہو تو وہ (ایک ذرہ ایک دن ضرور) دوزخ سے نکلے گا اور جس نے لا الہ الا اللہ کہا اور اس کے دل میں جو برابر بھلائی ہو

وَالنَّارِ مَنْ قَالَ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَفِي قَلْبِهِ وَزَنُ بَرَّةٍ مِنْ خَيْرٍ وَيُخْرَجُ مِنَ النَّارِ

وہ (ایک ذرہ ایک دن ضرور) دوزخ سے نکلے گا اور جس نے لا الہ الا اللہ کہا اور اس کے دل میں ذرہ (چھوٹی)

مَنْ قَالَ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَفِي قَلْبِهِ وَزَنُ ذَرَّةٍ مِنْ خَيْرٍ

برابر بھلائی ہو وہ (ایک ذرہ ایک دن ضرور) دوزخ سے نکلے گا

پڑھتی ہیں اس دقت کی تھی جب وہ سماء حضرت صدیق اکبرؓ کی مجلس سے جا چکی تھیں اس لئے منہ پر تعریف نہ ہوئی جس کی حضرات نے ممانعت فرمائی تھی یہ جہلاً بل اللہ حتی تملوا بطریق شاکست ہے بیہ جزاء سبب سبب مثلاً (۱)

بَابُ زِيَادَةِ الْإِيمَانِ وَنَقْصَانِهِ

یہ سلسلہ گزر چکا ہے فرق صرف اتنا ہے کہ یہاں زیادہ نقصان کا سلسلہ بالذات مذکور ہے اور وہاں تبعا ذکر تھا چنانچہ آیات

قَالَ أَبُو عَبْدِ اللَّهِ قَالَ لَبَّانٌ حَدَّثَنَا قَتَادَةُ حَدَّثَنَا أَنَسُ بْنُ النَّبِيِّ
 امام بخاری نے کہا، لبان نے اس حدیث کو روایت کیا، کہا ہم سے قتادہ نے بیان کیا، کہا ہم سے انس نے بیان کیا
 صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ "مِنْ إِيْمَانٍ مَكَانٌ خَيْرٌ"

انھوں نے حضورؐ سے اس میں من ایمان ہے بجائے خیر کے

۴۔ حَدَّثَنَا الْحَسَنُ بْنُ الصَّبَّاحِ سَمِعَ جَعْفَرَ بْنَ عَوْنٍ حَدَّثَنَا أَبُو الْعَمِيْسِ
 ہم سے بیان کیا حسن ابن صباح نے انھوں نے جعفر ابن عون سے سنا، کہا ہم سے بیان کیا ابو العمیس نے

بھی سب وہی ہیں، صرف ایک آیت الیوم اکملت لکم دینکم کے کمال کا لفظ بتلا رہا ہے کہ اس کے
 مراتب ہیں، قرآن کے لفظ اکملت پر امام بخاری کہنا چاہتے ہیں کہ یہ لفظ بتلاتا ہے کہ اب تک نقصان تھا، بخاری ناقص بولتے ہیں،
 مگر یہ کچھ مناسب نہیں معلوم ہوتا اس لئے یہ غیر کامل بولتے ہوں، گو ماں دونوں کا ایک ہی ہے، کیا یہ کہنا مناسب ہوگا کہ شہداء بدر و احد کا دین و
 ایمان ناقص تھا؟ ہرگز نہیں! ہاں یہ تعمیر مناسب ہوگی کہ ان کے ایمان میں اجمال تھا زیادہ تفصیل نہ تھی، امام ابو حنیفہؒ کے الفاظ یاد کرو :
 "أَصْعَابُ الْجُمْلَةِ ثُمَّ بِالْتَفْصِيلِ" تو ان کا ایمان ناقص نہ تھا بلکہ ضعف اور فتح کے بہت سے لوگوں سے وہ افضل ہیں، انھوں نے کچھ
 کمی نہیں کی تھی بلکہ ایمان سب پر لاپکے تھے، ہاں تمام تفصیلات پر عمل نہ کر سکے، تو اس سے نقصان لازم نہیں آتا۔ یہ بھی یاد رکھو کہ امام بخاری
 کمی بیشی نفس تصدیق میں بھی مانتے ہیں اور عمل کے اعتبار سے بھی وہ کمی بیشی کے قائل ہیں اور مومن بہ کے اعتبار سے بھی کمی بیشی مانتے ہیں، مومن بہ
 کے اعتبار سے کمی بیشی کا مفہوم یہ ہے کہ ایمانیات کی تعداد بڑھتی رہتی تھی، پہلے دو چار چیزوں پر ایمان لانا ضروری تھا اس لئے کہ اتنا ہی بتایا گیا تھا
 اس کے بعد ان کی تعداد بڑھی اور بڑھتی گئی تو مسلمانوں کا ایمان بھی بڑھتا گیا اور یہ سلسلہ جاری رہا یہاں تک کہ آیت "الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ
 دِينَكُمْ" جب نازل ہوئی تو اب مومن بہ سب کے سب آگئے اور سب پر ایمان ہو گیا، پہلے کم پر تھا اب زیادہ پر ہو گیا، لہذا امام غزالیؒ کا مقصد
 پورا ہو گیا۔ ہم اجمال و تفصیل کا فرق کہیں گے، ایمان تو سب پر ازل دن ہی تھا، تفصیل بعد میں آئی۔

حدیث ۴۳۔ قَالَ لَاتَّخَذَ نَاذِلُكَ الْيَوْمَ عَيْدًا، ایک یہودی نے امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ تمہیں
 اس آیت کی قدر نہیں، اگر ہمارے ہاں اترتی تو ہم اس دن کو عید منایا کرتے، بعض روایات میں تصریح ہے کہ یہ کہنے والے کعب احبار تھے جو حضرت عمر
 ہی کے زمانہ میں ایمان لائے ہیں، بعض روایات میں "أَنَّ نَاسًا مِنَ الْيَهُودِ" آیا ہے جس سے معلوم ہو کہ ان کے علاوہ اور بھی کچھ لوگ تھے
 حدیث کے لفظ "أَنَّ رَجُلًا مِنَ الْيَهُودِ" سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے، ورنہ مومن کے لئے یہ لفظ مناسب

اَخْبَرَنَا قَيْسُ بْنُ مُسْلِمٍ عَنْ طَارِقِ بْنِ شَهَابٍ عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ اَنْ رَجُلًا

کہا کہ ایک نبی نے فرمایا کہ میں نے اسے دیکھا ہے کہ ایک یہودی آدمی نے ان سے

مِنَ الْيَهُودِ قَالَ لَهُ يَا اَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ اَيَةُ فِي كِتَابِكُمْ تَقْرُؤْنَهَا وَلَوْ عَلَيْنَا مَعْتَرِ الْيَهُودِ

کہا، اے امیر المؤمنین! تمہاری کتاب (قرآن) میں ایک آیت ہے جس کو تم پڑھتے رہتے ہو، اگر وہ آیت ہم یہود لوگوں پر اتنی قوم اس

نَزَلَتْ لَاتَخَذُنَا ذٰلِكَ الْيَوْمَ عِيْدًا ۚ قَالَ اَتَىٰ اَيُّهُ ۚ قَالَ (الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنََكُمْ

دن کو (جس دن وہ آیت اتری) عید کا دن ٹھہرا لیتے، انھوں نے پوچھا، وہ کون سی آیت ہے؟ اس نے کہا، یہ آیت (آج جس نے تمہارے

وَاَتَمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا) قَالَ عُمَرُ قَدْ عَرَفْنَا

لے تمہارا دین پورا کیا اور اپنا احسان تم پر تمام کر دیا اور اسلام کا دین تمہارے لئے پسند کیا) حضرت عمر نے کہا ہم اس دن کو جانتے ہیں اور

ذٰلِكَ الْيَوْمَ وَالْمَكَانَ الَّذِي نَزَلَتْ فِيْهِ عَلٰى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

اس جگہ کو بھی جس میں یہ آیت اتر گئی تھی، وہ جگہ کا دن تھا جب آپ عرسات میں

وَهُوَ قَائِمٌ بِعَرَفَةَ يَوْمَ جُمُعَةٍ

کھڑے تھے

نہ تھا۔ خیر و تشدد خواہ کسی وقت کا ہو مگر اس میں شک نہیں کہ قابلِ خوب محبا، تمام قرآن میں سے اچھا انتخاب کیا، جب آیت الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ

نازل ہو گئی تو آپ کی راہ کیا، دین کی تکمیل ہوئی اور تمام نیت ہو گیا، اللہ نے یہ دین اسلام اس کے لئے پسند فرمایا اب ادر کیا چاہئے، سب کچھ

تو ہو گیا۔ اور قَدْ عَرَفْنَا، یہاں مختصر ہے، طبرانی وغیرہ میں یہ الفاظ بھی ہیں عَلٰى هَٰذَا بَفَضَلَ اللّٰهُ لَنَا عِيْدًا یعنی عرفان و قَدْ عَرَفْنَا

فرمایا ہیں خوب معلوم ہے، تم ایک عید کہتے ہو، الحمد للہ دو عیدیں جمع تھیں، نیز تم کہتے ہو کہ ہم اس دن کو عید بناتے اور یہاں اللہ تعالیٰ نے

خود عید بنادی تھی۔ عَزَّوَجَلَّ کے متعلق قریب قریب اتفاق ہے کہ سید الایم ہے، حدیث میں بھی تصریح ہے، اس میں بھی اختلاف ہے کہ

عشرہ ذی الحجۃ افضل ہے یا عشرہ رمضان، زاد المعاد میں علامہ ابن قیم نے خوب لکھا ہے کہ ایام تو عشرہ ذی الحجۃ کے افضل ہیں اور یابی

عشرہ رمضان کی، کیونکہ اس میں سیدۃ القدر ہے۔

کرماتی نے جواب دیا کہ یہ آیت عَزَّوَجَلَّ کے دن زوال کے بعد اتری تھی اور اگر کوئی بعد زوال طلوع ہلال کا یقین کرے تو اگرچہ

باب الزکوۃ من الإسلام وقوله تعالى: وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ

زکوۃ دینا اسلام میں داخل ہے، اور اللہ تعالیٰ نے (سورہ لم یکن میں) فرمایا: عبادکم ان کا فرض کو کسی حکم دیا گیا کہ

مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ حُنَفَاءَ وَيُقِيمُوا الصَّلَاةَ وَيُؤْتُوا الزَّكَاةَ وَذَلِكَ دِينُ الْقِيَمَةِ
خالص اللہ ہی کی بندگی کی نیت سے ایک طرف کے ہو کر اس کو پڑھیں، اور نماز کو ٹھیک کریں اور زکوۃ دیں، اور یہی پکا دین ہے

۴۴۔ حَدَّثَنَا إِسْمَاعِيلُ قَالَ حَدَّثَنِي مَالِكُ بْنُ أَنَسٍ عَنْ عَمِّهِ أَبِي سُهَيْلٍ

ہم سے اسماعیل نے بیان کیا کہ مجھ سے امام مالک ابن انس نے بیان کیا، انھوں نے اپنے چچا ابویس بن مالک

بْنِ مَالِكٍ عَنْ أَبِيهِ أَنَّهُ سَمِعَ طَلْحَةَ بْنَ عُبَيْدٍ اللَّهَ يَقُولُ جَاءَ رَجُلٌ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ

سے، انھوں نے اپنے چچا ابی مالک ابن ابی عامر سے، انھوں نے طلحہ ابن عبید اللہ سے، وہ کہتے تھے نجد والوں میں سے ایک شخص

صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ أَهْلِ نَجْدٍ ثَابِرُ الرَّأْسِ نَسَمِعُ دَوَى صَوْتِهِ وَلَا نَفْقَهُ مَا

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا، سر پریشان (یعنی اس کے بال بکھرے ہوئے تھے) ہم بھی نہیں اس کی آواز سن سکتے تھے اور اس کی

يَقُولُ حَتَّى دَنَا وَهُوَ يَسْأَلُ عَنِ الْإِسْلَامِ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَمْسُ

بات سمجھ میں نہیں آتی تھی یہاں تک کہ وہ نزدیک آ پہنچا، جب معلوم ہوا کہ وہ اسلام کو پوچھ رہا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

صَلَوَاتُ فِي الْيَوْمِ وَاللَّيْلَةِ فَقَالَ هَلْ عَلَى غَيْرِهَا قَالَ لَا إِلَّا أَنْ تَطَوَّعَ قَالَ رَسُولُ

اسلام، دن رات میں پانچ نمازیں پڑھنا ہے، اس نے کہا بس اس کے سوا تو اور کوئی نماز مجھ پر نہیں؟ فرمایا: نہیں! مگر تو نفل پڑھے

اللَّهُ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَصِيَامَ رَمَضَانَ قَالَ هَلْ عَلَى غَيْرِهِ؟ قَالَ لَا إِلَّا

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اور رمضان کے روزے رکھنا، اس نے کہا اور تو کوئی روزہ مجھ پر نہیں؟

! تو اور بات ہے) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اور رمضان کے روزے رکھنا، اس نے کہا اور تو کوئی روزہ مجھ پر نہیں؟

أَنْ تَطَوَّعَ

فرمایا: نہیں! مگر تو نفل رکھے

بنا: نہیں مگر دن عید ہی کا ہوگا، چونکہ یہ بعد زوال آری اسلئے مکہ میں عید ہی ہوگا، کرمانی نے ان لفظوں پر غور نہیں کیا جو طبرانی نے نقل

کے ہیں روزہ ایسا نہ کہتے، بہتر وہی ہے جو حافظ نے کہا کہ اہل عید یوم عذہ ہے اور اسی عید دسویں ذی الحجہ، اب دو عیدیں ہوں، ایک اسلئے

کریوم عذہ تھا، دوسرا اس لئے کہ یوم جمعہ تھا۔

باب الزکوۃ من الإسلام

دینِ تہم وہ ہے جس میں عبادت الہی اور اوقات و ایام زکوۃ ہو، یہی دینِ ستقیم ہے۔

قَالَ وَذَكَرَهُ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الزَّكَاةَ، قَالَ هَلْ عَلَى غَيْرِهَا
 علم نے کہا: اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے زکوٰۃ کا بیان کیا وہ کہنے لگا: بس اور تو کوئی صدقہ تو مجھ نہیں ہے؟ آپ نے
 قَالَ لَا إِلَّا أَنْ تَطَوَّعَ، قَالَ فَادَّبَ الرَّجُلُ وَهُوَ يَقُولُ: وَاللَّهِ لَا أَزِيدُ عَلَى هَذَا
 فرمایا: نہیں! مگر نفل صدقہ دو (تو اور بات ہے) راوی نے کہا کہ وہ شخص پیٹھ منڈ کر چلا یہ کہتا ہوا کہ خدا کی قسم میں اس سے
 وَلَا أَنْقُصُ، قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَفْلَحَ ابْنُ صَدَقَ.
 بڑھاؤں کا نہ گھٹاؤں کا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر یہ سچا ہے تو اپنی مراد کو پہنچے گا۔

الْآنَ تَطَوَّعَ" میں تطوع سے مراد میرے نزدیک صلوات نافذ مجرہ ہیں، عام شرح نے تطوع میں رواتب وغیرہ کو داخل کیا ہے اور لا ازیید
 ولا انقص "پر جو اشکال پیدا ہوتا ہے کہ جب تطوع میں سنن رواتب داخل ہیں تو پھر سائل کا حلف اٹھانے میں ابداً اس سے رکاوٹوں کا
 اور اس پر حضور کا "أَفْلَحَ ابْنُ صَدَقَ" فرمانا کیسے صحیح ہوگا؟ تو لوگوں نے اس اعتراض سے بچنے کے لئے تاویل کی ہیں، کسی نے کہا
 قسم اس پر رکھی اور لا ازیید ولا انقص "اس پر کہا ہے کہ مثلاً چار رکعت فرض کے بجائے تین یا پانچ رکعت نہ پڑھوں گا، کسی نے یہ
 مراد بیان کی کہ تبلیغ میں کوتاہی نہ کروں گا اور کسی زیادتی نہ کروں گا، کسی نے یہ کہا کہ کیفیات فرائض میں کمی زیادتی نہ کروں گا، مگر یہ سب
 تاویلات ریکہ ہیں کیونکہ بخاری میں آگے یہ روایت آئے گی کہ اس نے بجائے "لا ازیید ولا انقص" کے یہ کہا کہ "لا اتطوع
 شيئاً" تو اب وہ تاویلات کہاں گئیں، سب بیکار ہو گئیں، اس لئے میں کہتا ہوں کہ (محض نوافل ہیں) ان کے بارے میں اس نے کہا
 لا ازیید، اور قسم کھانا اس لئے نہیں کہ اس کو انکار اور بار ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھ سے نہ ہو سکے گا اور میں برداشت نہ کر
 سکوں گا کیونکہ میں کاروباری آدمی ہوں، مجھے اتنی فرصت نہ ملے گی — تو درحقیقت وتر، سنن رواتب، نوافل ہیں فرائض کے یہی
 حدیث اسماعیل ابن جعفر کی روایت سے آگے آئی ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں: فَاخْبَرَهُ بِشُرَائِعِ الْإِسْلَامِ اس کے بعد فرمایا لَا إِلَّا
 أَنْ تَطَوَّعَ، تو شرائع میں وتر و صدقۃ الفطر سب آگئے لہذا اذاعات پرا اعتراض ہے نہ شواہع پر۔

محمد ابن نصر مرذبی نے کتاب قیام اللیل میں نقل کیا ہے کہ ایک شخص نے امام ابوحنیفہ سے پوچھا فرض نماز میں کتنی ہیں؟ امام
 نے کہا: پانچ! سوال کیا وتر فرض ہے یا نہیں؟ فرمایا: فَرِيضَةٌ (ای بمعنی واجب) پھر کہا کتنی ہوئیں؟ فرمایا پانچ
 کہا شمار کرو: فجر، ظہر، عصر، مغرب، عشاء۔ پھر پوچھا: وتر کیا ہے؟ فرمایا: فرض! کئی بار اسی طرح سوال و جواب ہوا، تو کہنے
 لگا: اِنَّكَ لَا تَحْسِنُ الْحِسَابَ تمہیں حساب نہیں آتا — اس نے تو یہ کہا مگر ہم کہتے ہیں کہ اسی واقعہ سے امام ابوحنیفہ کا
 کمال تعلق معلوم ہوتا ہے کہ فرائض اصلی پانچ ہی ہیں اور وتر اگرچہ واجب ہے لیکن توابع فرائض سے ہے اور اس سے سائل کی نجات

باب ۳۵ اِتِّبَاعُ الْجَنَائِزِ مِنَ الْإِيمَانِ

جنازے کے ساتھ جانا ایمان میں داخل ہے۔

۴۵۔ حَدَّثَنَا أَحْمَدُ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَلِيٍّ الْمَنْجُونِيُّ قَالَ حَدَّثَنَا

ہم سے احمد ابن عبد اللہ ابن علی منجونی نے بیان کیا ، ہم سے بیان کیا روح نے کہا ہم سے

رَوَّحٌ قَالَ حَدَّثَنَا عَوْفٌ عَنِ الْحَسَنِ وَمُحَمَّدٍ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ

بیان کیا عوف نے انھوں نے حسن اور محمد سے ، انھوں نے ابو ہریرہ سے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ اتَّبَعَ جَنَازَةَ مُسْلِمٍ إِيْمَانًا وَاحْتِسَابًا وَكَانَ

جو کوئی ایمان رکھ کر اور ثواب کی نیت سے کسی مسلمان کے جنازے کے ساتھ جائے اور نماز اور دن سے فراغت تک

مَعَهُ حَتَّى يَصْلَةَ عَلَيْهَا وَيَفْرَغَ مِنْ دَفْنِهَا فَإِنَّهُ يَرْجِعُ مِنَ الْأَجْرِ بِقِيَرَاتَيْنِ كُلُّ

اس کے ساتھ رہے تو وہ دو قیراط ثواب لے کر لوٹے گا ، ہر قیراط آنا بڑا ہوگا جیسے احد کا پہاڑ ، اور جو شخص جنازہ

قِيَرَاتٍ مِثْلُ أَحَدٍ وَمَنْ صَلَّى عَلَيْهَا ثُمَّ رَجَعَ قَبْلَ أَنْ تُدْفَنَ فَإِنَّهُ يَرْجِعُ مِنَ الْأَجْرِ بِقِيَرَاتٍ

پر نماز پڑھ کر دن سے پہلے لوٹ جائے تو وہ ایک قیراط ثواب لے کر لوٹے گا ۔ روح کے ساتھ اس

تَابِعُهُ عُمَانُ الْمُؤَدِّنُ قَالَ حَدَّثَنَا عَوْفٌ عَنْ مُحَمَّدٍ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ

حدیث کا عثمان موزن نے بھی روایت کیا ، کہا ہم سے عوف نے بیان کیا ، انھوں نے محمد ابن سیرین سے

صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَحُكِّ

سنا ، انھوں نے ابو ہریرہ سے ، انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اگلی روایت کی طرح

معلوم ہوتی ہے ، ورنہ امام صاحب تو درحقیقت اسی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہے تھے ۔

قَوْلُهُ أَفْلَحَ إِنْ صَدَّقَ بعض دوسری روایات میں اور مسلم وغیرہ میں بھی أَفْلَحَ وَأَبِيَّةٌ آیا ہے ، اس پر یہ اعتراض وارد ہوتا

ہے کہ غیر اللہ کی قسم تو جائز نہیں ، تو جواب میں اس کی مختلف تاویلات کی گئی ہیں ، کسی نے کہا کہ یہ خصائص نبوی سے ہے ، سوال ہو کہ

خصائص سے ہے ؟ تو زرقانی نے لکھا ہے کہ حلف لغیر اللہ کی ممانعت اس لئے کی گئی ہے کہ تعظیم مفرطہ غیر اللہ کی نہ ہو اور حضور صلی اللہ علیہ

چونکہ تعظیم مفرطہ سے امون ہیں اس لئے آپ کے لئے جائز ہے (۱) مگر بہترین جواب خفی عالم حسن پلپی کا ہے ، وہ مطول کے حاشیہ میں

(۱) بعضوں نے کہا کہ یہاں مضامین محذوف ہے ، اصل میں ”ورث ابیہ“ تھا ۔ ۱۳ منہ

بَابُ خَوْفِ الْمُؤْمِنِ أَنْ يَحْبُطَ عَمَلُهُ وَهُوَ لَا يَشْعُرُ

مومن کو ڈرنا چاہیے کہ کہیں اس کے عمل میں غلطی نہ جائے اور اس کو خبر نہ ہو

وَقَالَ إِبْرَاهِيمُ التَّيْمِيُّ مَا عَرَضْتُ قَوْلِي عَلَى عَمَلِي إِلَّا خَشِيتُ أَنْ

اور ابراہیم تیمی نے کہا (جو دعا غلط تھی) میں نے اپنی گفتار اور کردار کو جب ملایا تو مجھ کو ڈر ہوا کہ کہیں میں

أَكُونُ مُكَذِّبًا

(شریعت کے) جھٹلانے والوں (کاسندوں) میں سے نہ ہوں ،

لکھتے ہیں کہ قسم دو ہیں ' ایک نفوی ' دوسری شرعی ' نفوی میں صیغہ قسم کا ہوتا ہے مگر مقصود ترمین کلام ہوتی ہے اور محض تردید اور خوبصورت بنانا ہوتا ہے جیسا کہ ذوق کا شعر ہے ۔

اتنا ہوں تری تیغ کا شہر مندہ احسان : سریرا ترے سر کی قسم اٹھ نہیں سکتا
شع نے آگ رکھی سر پر قسم کھانے کو : بخدا میں نے جلایا نہیں پردانے کو

تو درحقیقت یہاں ترمین ہے ' اور شرعی قسم وہ ہے جہاں تعظیم ہو اور وہ حلف ہے ۔
درختار کے خطبہ میں جہاں "وَلَعَمْرِي" آیا ہے وہیں شامی نے حسن چلی کی یہ عبارت نقل کی ہے

بَابُ اتِّبَاعِ الْجَنَائِزِ مِنَ الْإِيمَانِ

حدیث ۴۵ فرماتے ہیں کہ جو شخص صفت اللہ کے لئے پورے فلوں کے ساتھ اور اس کے وعدے پر یقین کر کے جنازہ

کے ساتھ جاتا ہے اور اس کے دفن تک ساتھ رہتا ہے تو وہ دو قیراط اجر لے کر لوٹتا ہے اور جو دفن میں شریک نہ ہو تو ایک قیراط اجر اسے ملے گا اور قیراط لکھتا ہے آخرت کا قیراط ملوے جو احد پہاڑ کی طرح ہے ' مقصود اتباع جنازہ کی ترفیع ہے ' ابن عساکر جب یہ حدیث پہنچی تو فرمایا لَقَدْ فُطِنَ مِنْ قِوَادِیْطِ کَثِیْرَةٍ یعنی بہت سے قیراط سے ہم محرم رہے ' یہاں حدیث میں ایمان کے ساتھ احتساب کی قید لگائی تاکہ شریک ہونے والا بھی طرح سوچ کر اللہ کی رضا اور اجر کی خاطر شرکت کرے اور سبھی طور پر جو لوگ شریک ہوتے ہیں یا اس خیال سے کہ ہم نہ جائیں گے تو یہ بھی ہمارے یہاں نہ آئیں گے ' وہ اپنی اصلاح کریں اور ارادہ کر کے اخلاص کے ساتھ شریک ہوں تاکہ عروہی اجر سے محفوظ رہیں ۔

حدیث میں اتبع جنازۃ مسلما ایماناً واحتساباً آیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ یہ بھی ایمان کا ایک شعبہ ہے ۔

لفظ اتباع سے یہ بھی نکالا گیا کہ جنازہ کے پیچھے چلنا مناسب ہے اور اتباع اسی وقت صادق آئے گا ' یہی امام ابوحنیفہؒ کا مسلک ہے — ثواب کے نزدیک جنازہ کے آگے چلنا چاہیے '۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ صلوٰۃ الجنازہ مسجد کے اندر ہو یا باہر؟ تو اس کے بارے میں ان شاء اللہ کتاب الجنازہ میں اس پر بحث کرونگا
تابعہ عثمان المؤمن، اس حدیث میں عثمان المؤمن، روح کا تابع ہے، انھوں نے بھی خوف سے روایت
کی ہے، اگر ان کی سندیں سن نہیں ہیں، بلکہ صرف ابن سیرین ہیں، حسن صرف ایک ہمد میں ہیں، اور ابن سیرین دونوں میں۔

باب خوف المؤمن

یعنی یمن کی شان یہ ہے کہ وہ ہر وقت ڈرتا رہے کہ کہیں اس کے عمل اکارت نہ کروئے جائیں اور خدا نخواستہ یہ جھٹلے اس
طرح ہو کہ اس کو پتہ ہی نہ چلے، کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی غفلت اور لاپرواہی میں کوئی جملہ بولتا ہے اور اسے بہت معمولی سمجھتا ہے مگر وہ استفہ
بڑا ہوتا ہے کہ اگر مسند پر ڈال دیا جائے تو اس پر بھی گراں ہو، یہ حدیث دراصل اس آیت سے مقتبس ہے: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا
أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوا لَهُ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ أَنْ تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تَشْعُرُونَ
اے ایمان والو اپنی آوازیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز پر بلند نہ کرو اور نہ ان کے سامنے اس طرح زور سے بولو جس طرح آپ میں ایک
دوسرے کے سامنے ہوتے ہو، ایسا نہ ہو کہ تمہارے سارے اعمال اکارت جائیں اور تم کو شعور بھی نہ ہو، اس میں تعظیم کا حکم دیا گیا تاکہ کوئی
مسلمان توقیر نبی میں کوتاہی نہ کرے، نبی کی مجلس کا ادب سکھایا جا رہا ہے کہ اسے اپنی مجلس جیسا نہ سمجھو کہ اس میں بنے جھجک گفتگوئیں کرو
یا آواز دی اور بے باکی سے بولو، یہاں اس کی بالکل گنجائش نہیں بلکہ اس بات کا خطرہ ہے کہ فرائض غفلت سے سارا نیا کرایا برباد نہ ہو جائے
اور تم کو پتہ بھی نہ چلے، بعض چیزیں بظاہر بہت معمولی معلوم ہوتی ہیں مگر حقیقت میں بڑی خطرناک ثابت ہوتی ہیں، دیکھو ڈانامیٹ
زور اما ہوتا ہے مگر پہاڑ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے، اس لئے تم کو آداب دربار نبوی کا بہت خیال رکھنا چاہئے۔

یہاں ایک مثال وارد کیا گیا ہے کہ کفر تو بیشک مجبوظ اعمال ہے مگر سید کا مجبوظ اعمال ہونا اہل السنۃ کا مسلک نہیں، حالانکہ یہاں
قرآن ناطق ہے کہ معصیت مجبوظ اعمال ہے، اس کے قلف جوابات دے گئے ہیں، میرے نزدیک ابن المنیرؒ اہل السنۃ کا مسلک نہیں، حالانکہ یہاں
انھوں نے حاشیہ کشاف میں جو کچھ لکھا ہے وہ سب سے بہترین جواب ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ امت اس پر متفق ہے کہ نبی کو عداۃ اذیاء پہونچا
صد کفر تک پہونچا نا ہے اور ایک حد تک اذیاء سانی بالاتفاق کفر ہے، رفع صوت اور اپنی آواز کو آپ کی آواز پر غالب کرنے کے بعض مراتب ایسے
ضرور ہیں جو صد کفر تک پہونچ جاتے ہیں کیونکہ اس سے نبی کو اذیاء پہونچتی ہے اور نبی کو اذیاء پہونچنا کفر ہے اور وہ بالاتفاق مجبوظ ہے، اسی لئے

قرآن میں فرمایا گیا، **وَأَنْتُمْ لَا تَشْعُرُونَ**، یعنی تم کو خبر بھی نہ ہو اور سارا کیا کرایا ستیا اس ہو جائے۔

اس تقریر کا خلاصہ یہ ہے کہ ایذا سبب ہے حبط اعمال کا، اس لئے رفع صوت اور قول باجمہ کو مطلقاً ممنوع قرار دیا کیونکہ بعض مرتبہ رفع صوت اور جہر بالقول سے بھی ایذا پہنچتی ہے اور ایذا پہنچانا کفر ہے اسلئے طلاقاً ممانعت فرمادی تاکہ خطرہ بھی نہ رہے، جیسے **إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ أَثَمٌ** (۱) کہ کبھی مطلق ظن (بدگمانی) سے روک دیا کہ تم کسی پر برائی کا ظن مت کرو۔

قرآن میں **وَقَالَ إِبْرَاهِيمُ النَّبِيُّ مَا عَرَضْتُ قَوْلِي عَلَى عَمَلِي الْآخِشِيَّتُ أَنْ أَكُونَ مُكَذِّبًا**، گو بعضوں نے مُكَذِّبًا ام فاعل پڑھا ہے لیکن اصح مکذِّبًا ام مفعول ہے، ابراہیم تیمی واعظ تھے اور واعظ کو مشکل ہوتی ہے کہ جب وہ دوسروں کو امر کرتا ہے اور خود کوتاہی کرتا ہے تو لوگ ظن کرتے ہیں، چنانچہ حافظ شیرازی نے کہلے سے

واعظان کیں جلوہ بزخواب و منبر می کنند چوں بخلوت می روند آن کار دیگر می کنند
مشکلی دادم ز دانشمند مجلس باز پرس تو بہ فرمایان چرا خود تو بہ کمتد می کنند

ابراہیم تیمی بڑے متقی و عابد تھے، یہ بات وہ تواضعاً کہہ رہے ہیں کہ جب میں اپنے قول و عمل کا موازنہ کرتا ہوں تو مجھے اس بات کا اندیشہ ہوتا ہے کہ کیا میں ایسا نہ ہو کہ میں جھٹلایا جاؤں کہ تیرا قول و عمل یکساں نہیں ہے، یہ اشارہ اس آیت کی طرف ہے :
تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ ۚ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللَّهِ أَنْ تَقُولُوا مَا لَا تَفْعَلُونَ (۲)

بخاری کا مقصد مرتبہ کی تردید ہے، جو کہتے ہیں کہ محض ایمان کافی ہے، عمل کی ضرورت نہیں، بخاری بتا رہے ہیں کہ دیکھو عمل کس قدر ضروری ہے، مرتبہ کا یہ بھی قول ہے کہ جس طرح کفر جنت میں نہ جائے گا اسی طرح ایمان دوزخ میں نہ جائے گا، یعنی جس طرح کفر کے ہوتے ہوئے کوئی حسد مقبول نہیں اسی طرح ایمان کے ہوتے ہوئے کوئی سیئہ بھی مضر نہیں اور صرف قول لا الہ الا اللہ جنت میں پہنچانے کے لئے کافی ہے۔

میں کہتا ہوں کہ یہ حماقت ہے، فرض کرو کہ ایک شخص سنگھیا کھالے تو اس کا اثر تمام رگ و پے میں فوراً ہوتا ہے، اسی طرح سانپ کاٹ لے تو تمام بدن سیاہ ہو جاتا ہے مگر ہر زہر کیاں نہیں، اگر بھڑکاٹ لے تو تمام بدن اس سے متاثر نہ ہوگا، اس کے برعکس اگر کوئی خیرہ گاؤں زبان غنیری کھالے تو تمام اعضاء کو تقویت ہوگی، تو کھڑی مثال بھی سنگھیا اور ستم الفار کی ہوگی، جہاں ذرا سا بھی آیا تو بالکل ایسا

وَقَالَ ابْنُ أَبِي مُلَيْكَةَ أَدْرَكْتُ ثَلَاثِينَ مِنْ أَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
اور ابن ابی ملیکہ نے کہا کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تیس صحابہ سے ملا

ہو گیا جیسے سانپ نے کاٹ لیا اور حیات جاتی رہی۔ اس کے برعکس ایمان کفر کے مقابلہ میں بمنزلہ حیات کے ہے اور حیات میں کمزوری و ضعف اور نقصان بھی ہوتا ہے، تو جب تک سانس چل رہا ہے کمزوری و ضعف کے باوجود حیات باقی ہے، تو جس طرح مرض و ضعف زندگی کے منافی نہیں، اسی طرح محصیت ایمان کے منافی نہیں، 'مرجیہ کا یہ جملہ کہ ایمان دوزخ میں نہ جائے گا اور کفر جنت میں بڑا موثر ہے' وہ کہتے ہیں کہ ایک شخص مثلاً زانی ہے تو دوزخ میں اس کا ایمان کیسے جائے گا؟ محدثین و مفسرین کے یہاں اس کا کوئی جواب نظر سے نہیں گذرا، ہاں ارباب حقائق نے لکھا ہے کہ جب ایسے مجرم کو دوزخ میں لے جائیں گے تو اس کے حسرت اور اس کا ایمان دروازہ جہنم پر اتار کر رکھ لیا جائے گا جیسے یہاں قیدیوں کے ساتھ برتاؤ ہوتا ہے اور یہ جو کہا کہ کوئی سیدہ جنت میں نہ جائے گا تو جنت میں جب مومند جگہ کا تو تمام گناہوں سے پاک و صاف ہو کر بالکل نکھر کر جائے گا جیسے سندھ سونے کو کندہ بناتا ہے۔ سچے گنہگار کے جب دوزخ سے سون کو نکالیں گے تو نہر حیات میں ڈالیں گے پھر وہاں فتنیون کہانتبت الحبۃ فی جانب السلیل — معلوم ہوا کہ جنت میں داخلہ کے وقت کوئی سیدہ باقی نہ رہے گا اور یہ سیئات سے پاک ہو کر جنت میں جائے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ قلب جو کہ ایمان کا محل ہے اور عذاب جسم پر ہو رہا ہے اس لئے قلب محفوظ رہے گا۔ باقی یہ جو قرآن میں فرمایا گیا ہے: نَارُ اللَّهِ الْمُوقَدَةُ الَّتِي تَطْلَعُ عَلَى الْإِنْسَانِ (ایک آگ ہے اللہ کی سلگوائی ہوئی جو جھانک لیتی ہے دلوں کو) یہ صرف کفار کے لئے ہے، تو میرے خیال میں عذاب مومنین کے لئے صرف جسم پر ہے نہ کہ قلب پر، اس لئے عمل ایمان عذاب سے محفوظ ہے۔

قال ابن ابی ملیکہ اخ ابن ابی ملیکہ فرماتے ہیں کہ صحابہ کا عام حال یہ تھا کہ ڈرتے تھے کہ کہیں نفاق علی، دورنگی اور غیبت کا الزام اللہ کی بارگاہ میں ان پر نہ آجائے، اس کا اثر یہ تھا کہ وہ بہت محتاط زندگی گزارتے تھے اور ہر وقت اخلاص کی راہ تلاش کیا کرتے، اور ہر کام میں خلوص نیت کا اس قدر اہتمام کرتے کہ خدا کی طرف سے ان کے غلط ہونے کی بار بار توثیق ہوتی۔

صلح مدینہ میں جس طرح امتثال امر نبوی کا ثبوت صحابہ نے پیش کیا اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا: لَقَدْ رَضِيَ اللَّهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ إِذْ يُبَايِعُونَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِي قُلُوبِهِمْ فَأَنْزَلَ السَّكِينَةَ عَلَيْهِمْ (یقیناً اللہ راضی ہوا ایمان والوں سے جبکہ اے محبوب وہ درخت کے نیچے آپ سے بیعت کر رہے تھے (اللہ کے نام پر جان دینے کی) تو اللہ نے ان کے دلوں کا حال جان لیا اور ان پر سکینہ نازل فرمایا) اس آیت میں فَعَلِمَ مَا فِي قُلُوبِهِمْ سے ان کے اخلاص پر مہر تصدیق ثبت ہوگئی

كُلُّهُمْ يَخَافُ النِّفَاقَ عَلَى نَفْسِهِ مَا مِنْهُمْ أَحَدٌ يَقُولُ إِنَّهُ عَلَى إِيْمَانٍ

ان میں ہر ایک کو اپنے اوپر نفاق کا ڈر لگا ہوا تھا، ان میں سے کوئی نہ کہتا تھا کہ میرا ایمان جبرئیل یا میکائیل کے

جبرئیل و میکائیل

ایمان کا ہے

اسی طرح غزوہ تبوک کے موقع پر کچھ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور فرمایا ہم اللہ کے نام پر جان کی قربانی دینے کے لئے آئے ہیں مگر ہمارے پاس سواری نہیں ہے آپ اس کا انتظام فرمادیں، آپ نے فرمایا: لا آجد ما احملکم علیہ، میں تو تمہاری سواری کا انتظام نہیں کر سکتا، تو قرآن ان کے زبان و دل کی تصدیق میں فرماتا ہے: وَاعْتَبِرْهُمْ قَيْضٌ مِنَ الدِّمِيعِ حَرْزًا اَلَا يَجِدُوْا مَا يَنْفِقُوْنَ (۱) یعنی وہ اس حال میں واپس ہوئے کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے، اس رنج و غم میں کہ ہمارے پاس خرچ کرنے کو نہیں وہ نہ ہم بھی جان دینے کو تیار تھے۔ اس طرح کے اور بھی بہت سے واقعات ان کے عکس پر شاہد عدل ہیں: یہ اسی لئے تو تھا کہ وہ ہر وقت ترساں و لرزاں رہتے تھے اور اپنا جائزہ لیتے رہتے تھے بلکہ ہر ایک دوسرے سے پوچھتا رہتا تھا کہ کہیں بات میرے اندر نفاق کی تو نہیں معلوم ہوتی، یہی ان کی فکر انہیں محفوظ رکھتی تھی فرضی اللہ عنہم اجمعین۔

قَوْلًا مَا مِنْهُمْ أَحَدٌ يَقُولُ اِنِّیْ کُوْنُوْا اِیْمَانِیْ کَیْمَانِ جَبْرِیْلَ وِیْمَاکِیْلَ مِیْسَاہِ اس میں اشارۃً امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے قول "ایمانی کا ایمان جبرئیل کی ترمیم ہے" امام بخاری کہنا یہ چاہتے ہیں کہ یہ ایک بہت بڑا دعویٰ ہے کہ آدمی اپنے ایمان کو جبرئیل کے ایمان کی طرح قرار دے جبکہ جبرئیل کا ایمان یقینی اور ان کا ایمان پر خاتمہ بھی یقینی ہے، کسی اور شخص کو سوائے ان لوگوں کے جن کو جنت کی بشارت دے دی گئی تھی جبرئیل کے خاتمہ میں یقین نہیں پیدا ہو سکتا، اسی بنا پر کوئی بھی ایسا دعویٰ نہیں کرتا تھا جیسا ابو حنیفہ نے کر دیا۔ یہ غلط ہے اعتراض کا۔ جواب سے پہلے یہ سمجھ لو کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے اس سلسلہ میں تین قول منقول ہیں:

اول ایمانی کا ایمان جبرئیل ولا اقول مثل ایمان جبرئیل۔ اور یہی سب سے زیادہ مشہور ہے۔
دوم اَکْرَہُ اِنْ یَقُوْلُ الرَّجُلُ اِیْمَانِیْ کَیْمَانِ جَبْرِیْلَ وَلٰکِنْ یَقُوْلُ اٰمَنْتُ بِمَا اٰمَنَ بِہِ جَبْرِیْلُ۔
اس کی تائید امام محمد کے اس قول سے بھی ہوتی ہے کہ "میں تو یہ کہتا ہوں کہ ایمانی کا ایمان جبرئیل اور نہ یہ کہتا ہوں کہ ایمانی

مثل ایمان جبریل بلکہ میں کہتا ہوں "امنت بما آمن بہ جبریل" (میں بھی اس پر ایمان لایا جس پر جبریل ایمان لائے) یعنی دونوں کا مؤمن بہ ایک ہے۔

سوم ایماننا مثل ایمان الملائکۃ۔

ان اقوال میں کوئی تعارض نہیں، بلکہ اس سے امام کا مقصود واضح ہو جاتا ہے۔ وہ صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مؤمن بہ ہمارا اور جبریل کا ایک ہے، یہ جملہ "امنت بما آمن بہ جبریل" بالکل واضح ہے کہ جس پر جبریل کا ایمان ہے اسی پر ہمارا بھی ایمان ہو، کیفیات ایمانی میں برابری کا بتانا مقصود نہیں ہے، "العالم واستعلم" میں امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے ایک مکالمہ منقول ہے، اس کو مسئلہ پر پوری روشنی پڑتی ہے، — ابو قتال نے امام صاحب سے کہا کہ اگر ناگوار خاطر ہو تو ایک بات پوچھوں "کیا ہمارے لئے یہ کہنا مناسب ہے کہ ہمارا ایمان ملائکہ و رسل جیسا ہے، حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ وہ ہم سے کہیں زیادہ مطہر و فرماں بردار ہیں" امام صاحب نے فرمایا: تم جانتے ہو کہ وہ ہم سے زیادہ فرماں بردار ہیں، اور میں پہلے بتا چکا ہوں کہ ایمان اور عمل دو الگ الگ چیزیں ہیں، ہمارا ایمان ملائکہ و رسل جیسا ایمان ہے، کیونکہ ہم وحدانیت رب اور اس کی قدرت اور اس کے پاس سے جو کچھ آیا ہے ان سب کی تصدیق کرتے ہیں، اور انہیں چیزوں کی انبیاء و رسل (اور ملائکہ) بھی تصدیق کرتے ہیں، لہذا معلوم ہو کہ ہمارا اور ان سب کا ایمان ایک جیسا ہے^(۱)

یہ بھی ممکن ہے کہ امام بخاری کے قول میں اس طرف اشارہ ہو کہ بغیر ان شاء اللہ کے "انا مؤمن" کہنا درست ہے یا نہیں؟ اس مسئلہ میں اشاعرہ کہتے ہیں کہ ان شاء اللہ کہنا چاہئے اور احناف کہتے ہیں کہ کچھ ضرورت نہیں، بعضوں نے اس کو نزاع لفظی تسلیم کر دیا ہے کہ حالت راہنہ پر نظر کرتے ہوئے ان لوگوں کے نزدیک ضرورت نہیں جو کہتے ہیں کہ نہ کہا جائے اور جو لوگ ان شاء اللہ کہنے کے قائل ہیں تو وہ منظر استقبال اور بہ لحاظ عاقبت و انجام کہتے ہیں کیونکہ اعتبار و اعتداد اسی ایمان کا ہے جس پر فائدہ ہو، اس لئے یہ کہنے کے میں انجام کے اعتبار سے ان شاء اللہ مؤمن ہوں۔

ابن تیمیہ نے کتاب الایمان میں لکھا ہے کہ مذہب سلف اس پر نہیں کہ ایمان کا موافقہ کے اعتبار سے استثناء کیا گیا جائے، یہ متاخرین کی تہقیق ہے، بلکہ سلف کا مسلک ترکیز نفس کے لحاظ سے تھا جیسے کوئی "اناولیٰ" کہے تو اس میں ایک طرح کا اتعاز پایا جاتا ہے، حالانکہ ہر مؤمن ولی ہے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اللہ ولی الذین آمنوا^(۲) اور اسی طرح دوسری جگہ

وَيَذْكُرْ عَنِ الْحَسَنِ مَا خَافَهُ الْإِمَامُ مِنْ وَلَا أَمِنَهُ إِلَّا مُنَافِقٌ وَمَا يُحَذِّرُ مِنَ الْهُوْلِ
اور حسن بھری سے منقول ہے کہ نفاق سے وہی ڈرتا ہے جو مومن ہوتا ہے اور اس سے ڈر وہی ہوتا ہے جو منافق ہے
عَلَى الثَّقَلَيْنِ وَالْعَصِيَّانِ مِنْ غَيْرِ قُوَّةٍ لِقَوْلِ اللَّهِ تَعَالَى: (وَلَمْ يَصِرُوا عَلَى مَا فَعَلُوا
اس باب میں آپس کی طرائق اور گناہ پر اڑے رہنے اور توبہ نہ کرنے سے بھی ڈرایا گیا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے (سورہ
وَهُمْ يَعْلَمُونَ)

آل عمران میں) فرمایا: اور وہ اپنے (برے) کام پر جان بوجھ کر نہیں اڑتے۔

۴۶ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عَرُورَةَ قَالَ حَدَّثَنَا شُعْبَةُ عَنْ زُبَيْدٍ قَالَ

ہم سے بیان کیا محمد ابن عروہ نے کہا ہم سے بیان کیا شعبہ نے انھوں نے زبید ابن حارث سے
سَأَلْتُ أَبَا وَائِلٍ عَنِ الْمَرْجَةِ فَقَالَ حَدَّثَنِي عَبْدُ اللَّهِ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ
کہا میں نے ابو داؤد سے مرجہ کے بارے میں پوچھا (کہ وہ کہتے ہیں کہ گناہ سے آدمی ناستی نہیں ہوتا) انھوں نے کہا مجھ سے
وَسَلَّمَ قَالَ سَبَابُ الْمُسْلِمِ فُسُوقٌ وَقَالَ كُفْرٌ

عبداللہ ابن مسعود نے بیان کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمان کو گالی دینے سے آدمی ناستی ہو جاتا ہے اور مسلمان کو کفر سے

فرمایا: وَاللَّهِ وَلِيَ الْمُؤْمِنِينَ" مگر اس کے باوجود انا دلی کہنا زیب نہیں دیتا، اسی طرح "اناموھن" کہنے سے بھی سلف اس لئے بچتے تھے
کہ اس میں بھی ایک قسم کا اذعار پایا جاتا ہے جو ان کی شان نہیں، اس لئے ان کے نزدیک حالت راہت میں بھی ان شاراۃ کہنا چاہئے۔
قَوْلًا مَا خَافَهُ الْإِمَامُ مِنْ وَلَا أَمِنَهُ" اسے نہیں ڈرتا مگر مومن، اور ڈر نہیں ہوتا مگر منافق، نودی وغیرہ میں بھی یہی ہے (۳)
مگر یہ صحیح نہیں، مضمون اپنی جگہ صحیح ہے مگر حسن بھری کا یہاں یہ مطلب نہیں بلکہ ان کا مقولہ اس پر ہے کہ ضمیر "خافہ" میں نفاق کی طرف
رابطہ ہے، یعنی نفاق سے وہی شخص خوف کھاتا ہے جو مومن ہو اور اس سے وہی بیباک اور ڈر ہوتا ہے جو منافق ہو، چونکہ دیگر روایات میں بھی
اسی کی صراحت ہے اس لئے یہاں ضمیر رابطہ الی النفاق ہی ہے اور بیشتر روایات اس بات پر شاہد ہیں کہ صحابہ کرامؓ نفاق سے بچد
ڈرا کرتے تھے، چنانچہ حضرت عمرؓ جیسے بشر باجمۃ شخص حضرت حذیفہؓ صاحب سر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھتے ہیں کہ کبھی حضورؐ
نے میرا نام تو منافقین میں نہیں لیا۔

امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ اگر عرش میں یہ آواز دی جائے کہ سوائے ایک کے اور کوئی جنت

(۱) آل عمران: ۶۸، (۲) یہاں ضمیر خافہ کی اللہ کی طرف رابطہ کی مطلب اگرچہ صحیح ہے مگر حسن بھری کا مطلب نہیں، (۳) شرح بخاری للکرامانی۔

میں نہ جائے گا، تو میں امید رکھوں گا کہ شاید میں ہی وہ شخص ہوں (جو جنت میں جائے گا) اور اگر یہ مداوی جائے کہ دوزخ میں سے ایک شخص کے اور کوئی نہ جائے گا تو میں خوف کروں گا کہ شاید میں ہی وہ شخص ہوں (جو دوزخ میں جائے گا) تو یہ ہے ایمان اور کمال رجا و خوف، اور جتنا ہی بڑا کوئی شخص ہو تا ہے اتنا ہی وہ اللہ سے ڈرتا ہے^(۱)۔

قوله مَا يُخْذِرُ مِنَ الْأَصْرَارِ، یہاں جس چیز سے ڈرایا گیا ہے وہ اصرار علی العاصی ہے، یہ تربتہ الباب کا دوسرا کلمہ اور اس کا عطف "خوف المؤمن" پر ہے، یعنی دوسری وہ چیز جس سے مؤمن کو ڈرنا چاہئے وہ گناہ پر اصرار ہے جو بہت خطرناک چیز ہے "من غیر توبۃ" تفسیر ہے اصرار کی، یعنی گناہ پر اڑنا یہ اسی وقت بولا جائے گا جب گنہگار گناہ کرتا ہے اور اس میں ایسی مذمت نہ پیدا ہو کہ وہ گناہ چھوڑ دے اور استغفار کرے، سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے "مَا أَصْرَمَ مِنْ اسْتَعْفَرَ" جس نے استغفار کر لیا وہ اصرار کرنے والا نہ رہا، اصرار کا مطلب یہ ہے کہ آدمی توبہ نہ کرے، اللہ کی طرف جھکے ہی نہیں اور گناہ سے باز ہی نہ آئے، اسلئے ایسے شخص کو سمجھایا کہ یہ بڑی خطرہ کی بات ہے اور اس کا نتیجہ بہت خراب نکلتا ہے، اس سے تلب مُظَلَم بن جاتا ہے اور پھر کبھی کبھی اس کی وجہ سے ایمان بھی جاتا رہتا ہے^(۲) اس لئے اس سے ڈرایا گیا۔

قوله سَأَلْتُ أَبَاوَأَمْلَ عَنِ الْمُرْجُئَةِ، میں نے ابو امل سے مر جئہ کے بارے میں پوچھا کہ ان کے معتقدات کیا ہیں؟ انھوں نے جواب میں یہ حدیث سنائی کہ مؤمن کو گالی دینا ناقص ہے اور اس سے قتال (لڑنا) کفر ہے، اس سے اعمال کی اہمیت معلوم ہوئی، اور برے اعمال کا مضر ہونا ثابت ہوا اور مر جئہ اسے مضر نہیں کہتے۔ [یہاں یہ بتادینا ضروری ہے کہ امت مسلمہ میں بہت سے گمراہ فرقے پیدا ہوئے ان میں روافض اور خوارج بہت مشہور اور خطرناک ہیں، انھیں گمراہ فرقوں میں ایک گمراہ مر جئہ کا ہے جن کی نسبت شہرستانی نے لکھا ہے کہ وہ کل مقتدا قلبی سے موخر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ایمان کے ساتھ کوئی مصیبت قطعاً مضر نہیں ہے، اگر وہ صاحب کبرہ کے معاذ کو قیامت پر چھوڑتا تھا اور دنیا میں اس کے صفت یا جہنمی ہونے کا حکم نہیں لگاتا تھا یا وہ ایمان کے ساتھ کسی مصیبت کو بالکل مضر نہیں مانتا تھا، اس لئے انھوں نے کہا ایمان نجات کے لئے کافی ہے، کوئی مصیبت ایمان کے ساتھ نقصان نہیں پہنچا سکتی، آدمی کی مغفرت کے لئے بالکل یہ کافی ہے کہ وہ شرک سے بچا رہے اور تو حید کے عقیدے پر رہے (دیکھو مل وغل [محمد ابن] عبد الکرم الشہرستانی الفصل الخامس من الباب الاول) ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۴، ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۰، ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱۳۶۷، ۱۳۶۸، ۱۳۶۹، ۱

۴۷۔ حَدَّثَنَا قُتَيْبَةُ بْنُ سَعِيدٍ حَدَّثَنَا إِسْمَاعِيلُ بْنُ جَعْفَرٍ

ہم سے بیان کیا قتیبہ ابن سعید نے کہا ہم سے بیان کیا اسماعیل ابن جعفر نے انھوں نے حمید سے

حُمَيْدٍ عَنْ أَنَسٍ قَالَ أَخْبَرَنِي عُبَادَةُ بْنُ الصَّامِتِ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ

انھوں نے انس سے کہا مجھ کو خبر دی عبادہ ابن صامت نے کہ آغخت ملے اللہ علیہ وسلم (اپنے حجرے سے)

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَرَجَ يُخْبِرُ بِلَيْلَةِ الْقَدْرِ قَتْلًا حَيَّ رَجُلَانِ مِنَ الْمُسْلِمِينَ فَقَالَ

نکلے (لوگوں کو) شبِ قدر بتانا چاہتے تھے (کہ وہ کون سی رات ہے) اتنے میں دو مسلمان لڑ پڑے ، آپ نے فرمایا:

یہاں تک کہہ دیا کہ دل میں اگر ایمان ہے تو زبان سے کفر تکبیر دینے سے اسے کچھ نقصان نہیں پہونچتا^(۱) — یہ تھے غصہ
نظریۂ مرجئہ کے۔

یہ جان لینے کے بعد بخاری کی تردید آسانی سے سمجھ میں آئے گی کہ بد علی سے نقصان ہوتا ہے ، اسی لئے وہ یہاں ابوداؤد

(جن کا نام شفیق ابن سلمہ تھا اور وہ کبار علمائے تابعین میں سے تھے) کی بات نقل کرتے ہیں جس سے مسلکِ مرجئہ کی تردید مقصود ہے [۳۱]

مرجئہ کو مرجئہ اس لئے کہتے ہیں کہ انھوں نے عمل کو پیچھے ڈال دیا اور ایمان سے اس کا کوئی لگاؤ باقی نہیں رکھا (ارجاء کے

معنی ہی مؤخر کرنے اور پیچھے ڈال دینے کے ہیں) ابنِ قتیبہ نے اور اسی طرح غوثِ عظیم نے غنیۃ الطالبین میں جو احناف کو مرجئہ میں شمار

کیا ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ احناف فرقہ ضالہ میں سے ہیں ، کیونکہ یہ واقعہ کے خلاف ہے اور ایسے معتدلیہ بزرگ کی شان نہیں

کہ وہ خلاف واقعہ بات کہیں ، اس سلسلہ کی صحیح بات وہ ہے جس کو [عہد بن] عبدالکریم شہرستانی نے مل وغل میں کہی ہے کہ

در اصل مرجئہ کہلانے والے دو قسم کے لوگ ہیں ، ایک عمل کے اعتبار سے جو کہتے ہیں کہ عمل جزو ایمان نہیں ، دوسرے عقائد کے اعتبار سے

جن کا کہنا یہ ہے کہ عمل ضروری نہیں بلکہ صرف ایمان نجات کے لئے کافی ہے — احناف کو جن لوگوں نے مرجئہ کہلایا ہے وہ پہلے گروہ میں

آتے ہیں اس لئے کہ احناف کے نزدیک عمل جزو ایمان نہیں ، نیز وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ترکِ عمل مضر ہے اور اس سے نقصان ہوتا ہے ،

احناف کہتے ہیں کہ صاحبِ ذنوب کبیرہ [مستحقِ عذاب ہے اور یوں اللہ معاف کر دے تو یہ اس کا کام ہے] تو جزو ایمان نہ ماننے کی بنا پر کچھ

لوگوں نے انھیں مرجئہ کہلایا۔ اور دوسرے مرجئہ وہ ہیں جو عقیدہ رکھتے ہیں کہ عمل ضروری نہیں اور کبار سے کوئی نقصان نہیں پہونچتا ، صرف

ایمان ہو تو بلا کسی سزا کے آدمی کی نجات یقینی ہے ، اسی بنا پر یہ مرجئہ فرقہ ضالہ میں شمار ہوتے ہیں اور انھیں کی تردید امام بخاری

إِنِّي خَرَجْتُ لِأَخْبِرْكُمْ بِبَلِيلَةِ الْقَدْرِ وَإِنَّهُ تَلَاخِي فَلَانٌ وَفَلَانٌ فَرَفَعَتْ وَعَسَى
 میں تو اس لئے باہر نکلا تھا کہ تم کو شبِ قدر بتاؤں اور نکلاں نکلاں آدمی لڑ پڑے تو وہ (میرے دل سے) اٹھالی گئی، اور
 أَنْ يَكُونَ خَيْرًا لَّكُمْ فَالْمَسْهُوفَ فِي السَّبْعِ وَالسَّبْعِ وَالْخَمْسِ
 شاید اسی میں تمہاری کچھ بہت سی ہو، اب تم اسے ستائیس، اسیسٹل اور پچیس رمضان کی راتوں میں تلاش کرو۔

کر رہے ہیں۔^(۱)

تنبیہ : ذہبی نے تصریح کی ہے کہ "غنیۃ الطالبین" حضرت غوث الاعظم کی تصنیف ہے مگر اس میں لوگوں نے دسائے
 شامل کر دیے ہیں، بیسے فتوحات کیہ شیخ الاکبر میں زیادہ سے بہت سے دسائے شامل کر دیے ہیں۔

قَوْلُ سَبَابِ الْمُسْلِمِ فَسَوْفَ وَقَالَ كَفَرُ مُسْلِمَانِ كُفَالًا دِيْنًا فَقَالَ كَفَرُ مُسْلِمَانِ كُفَالًا دِيْنًا فَقَالَ كَفَرُ مُسْلِمَانِ كُفَالًا دِيْنًا فَقَالَ كَفَرُ مُسْلِمَانِ كُفَالًا دِيْنًا
 اس سے مراد یہ ہے کہ دیکھو علیٰ صغیرات ہو رہی ہے، اور یہاں کفر سے مراد کفر دو کفر ہے، اس پر یہ انکشاف پیدا ہو رہا ہے
 کہ کفر دو کفر دونوں ہیں، قاتل بھی اور سبب بھی، یہاں فوٹی کے مقابلہ میں لفظ کفر لانا بتاتا ہے کہ کفر سے کفر ہی مراد ہے،
 اور بظاہر اس سے خوارج کی تائید نکلتی ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ فسق دونوں ہیں سبب بھی اور قاتل بھی، مگر چونکہ قاتل سبب سے اشد
 ہے اس لئے تعبیر میں غلط لفظ کا استعمال کیا گیا، اصل میں تو دونوں فسق تھے مگر یہ بتلانے کے لئے کہ دوسرا فسق اشد ہے، یوں تعبیر کر دی
 تاکہ معلوم ہو جائے کہ اس میں مراتب ہیں اور اس سے فرقہ ضالہ مرید کے عقیدے کی تردید بھی ہو جائے۔

حدیث ۴۷۰۔ قَوْلُ خَرَجَ يُخْبِرُ بِبَلِيلَةِ الْقَدْرِ أَخْرَجَهُ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كُفَالًا دِيْنًا فَقَالَ كَفَرُ مُسْلِمَانِ كُفَالًا دِيْنًا فَقَالَ كَفَرُ مُسْلِمَانِ كُفَالًا دِيْنًا فَقَالَ كَفَرُ مُسْلِمَانِ كُفَالًا دِيْنًا

(۱) حضرت اسحاق رحمہ کے بیان کو جامع تقریر کا حصہ ضبط نہیں کر سکے، شہرستان کے کلام کا حامل یہ ہے کہ غسان کوئی جو مرید کا زعم تھا اس کا ناسل ہے کہ ایمان
 صرف اللہ اور اس کے رسول کی معرفت اور اجل کے ساتھ ما انزل اللہ اور ما جاء به الراسول کے اقرار کا نام ہے، اس کے بعد شہرستانی کہتے ہیں یہ عجیب
 بات ہے کہ غسان اپنے مذہب کے موافق امام ابوحنیفہ کا قول بھی نقل کر لے، شاید وہ اس بارے میں بھڑا ہے پھر تم لکھا کہتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب مرید
 (مسیحی) کہلاتے تھے، یعنی مرید صلا میں ان کو کوئی شمار نہیں کرتا تھا، مرید کہتے کا شاید یہ سبب ہے کہ وہ کہتے تھے، ایمان صرف تصدیق بالقلب کا نام ہے اور وہ گھٹنا
 بڑھائیں، اس سے لوگوں نے لگان کر لیا کہ وہ عمل کو ایمان سے منور کرتے ہیں (جو طرح مرید صلا جو کرتے ہیں) حالانکہ یہ کہنا ممکن ہے کہ عمل میں اتنی محنت و مشقت
 کرنے کے ساتھ وہ ترک عمل کا فوی دیں۔ دوسرا جو مرید شہرستان کے ایک سبب یہ بھی ہے کہ وہ فرقہ قدیریہ اور معتزلہ (جن کا ظہور صدائوں میں ہو چکا تھا) کی سخت مخالفت کرتے
 تھے اور معتزلہ اس شخص کو کہتے تھے جو مسلک قدر میں کی مخالفت کرتا تھا، یہی حال و عیہ (خوارج) کا بھی تھا تو کچھ حدیثیں کہ یہاں سے معتزلہ کی دین ہوا (اللہ و اس کے رسول و اس کے اہل بیت)
 تحت عنوان الغسانیہ

باب سَوَالِ جَبْرِیْلِ النَّبِیِّ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم عَنْ الْاِیْمَانِ

حضرت جبریل کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھنا کہ ایمان کیا ہے، اسلام کیا ہے اور قیامت

وَالْاِسْلَامُ وَالْاِحْسَانُ وَعِلْمُ السَّاعَةِ

جاننے ہو (کب آئے گی) ۹

اور بظاہر اس رمضان میں جو لیلة القدر تھی اس کی تعین بتلائی گئی تھی، صحابہ کو اس کی خبر دینے کے لئے آپ نکلے تو دو آدمی لڑ رہے تھے، ایک کب ابن مالک تھے، دوسرے ابن ابی حذرو سلمیٰ، ان میں سے ایک کا قرض دوسرے پر تھا، حضور متکلف تھے، آپ نے ان میں صلح کرادی ایک سے کہا کہ نصف معاف کر دو، انھوں نے معاف کر دیا، دوسرے سے کہا: بقیہ ادا کر دو، جھگڑا تو ختم ہو گیا مگر اس دوران آپ کے ذہن مبارک سے وہ بات نکل گئی جس کو بتانے کے لئے آپ نکلے تھے، آپ نے فرمایا کہ اس جھگڑے کی وجہ سے لیلة القدر کا علم اٹھا لیا گیا، مقصود تنبیہ تھی کہ جھگڑا اور نزاع حرام کا باعث ہو گیا۔

قَوْلًا وَعَسَىٰ أَنْ تَكُونَ خَيْرَ الْكَلِمِ (شاید اسی میں تمھارے لئے بہتری ہو) نزاع اور جدال کی غصت کے سبب تعین بھلا دی گئی، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت کے سبب اس میں بھی خیر کا پہلو باقی رکھا، اس لئے آپ نے فرمایا کہ من وجہ یہی مانع اور باعث خیر و شعیوں کا یہ دعویٰ کہ لیلة القدر ہی اٹھائی گئی، غلط ہے، اس لئے کہ آپ نے اس کے بعد فرمایا: "الْمَسْوُهَا فِي السَّيِّئِ وَالسَّيِّئِ وَالْخَمْسِ" تلاش اور تجسس کا حکم کیوں دیا گیا؟ اگر لیلة القدر بالکل اٹھائی جاتی تو حضورؐ یہ کبھی نہ فرماتے کہ تائبیسوں، اتیسویں اور پچیسویں راتوں میں تلاش کرو، اس سے صاف واضح ہے کہ صرف تعین اٹھائی گئی اور اصل باقی رہی۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ معاصی سے ڈرنا چاہئے ورنہ اعمال کے جھٹ ہونے کا خطرہ ہے۔

باب سَوَالِ جَبْرِیْلِ اٰخِر

اس باب میں حدیث جبریل کا بیان ہے جس میں مذکور ہے کہ انھوں نے ایک جل کی صورت میں آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے چند سوالات کئے اور آپ نے ان سب کا جواب بھی دیا، البتہ قیامت کے متعلق آپ نے فرمایا کہ مجھے اس کی تعین معلوم نہیں، ہاں اس کی نشانیاں معلوم ہیں، جنہیں آپ نے بیان بھی فرمایا، آخر میں صحابہ کو مخاطب کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ یہ جبریل تھے، جو تمھیں دین سکھانے کے لئے آئے تھے۔

حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں صراحت کی ہے کہ حضورؐ کی آخری عمر کا واقعہ ہے، وہ ایک احتمال کا رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "وهو مردود بما رواه ابن منداه في كتاب الايمان باسناداه الذي على شروط مسلم من طريق سليمان التيمي"

وَبَيَّانِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَهُ ثُمَّ قَالَ جَاءَ جَبْرِئِلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ يُعَلِّمُكُمْ نَسْمَ
اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ان باتوں کو ان سے بیان کرنا، پھر یہ نہرنا کہ یہ جبریل علیہ السلام تھے جو تمہارا دین تم کو سکھائے
فَجَعَلَ ذَلِكَ كُلَّهُ دِينًا وَمَا بَيْنَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَوْ فِدَ عَبْدِ الْقَيْسِ
آئے تھے، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب باتوں کو دین فرمایا، اور اس باب میں اس کا بھی بیان ہے جو
مِنَ الْإِيمَانِ وَقَوْلُهُ تَعَالَى (وَمَنْ يَتَّبِعْ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ)
آپ نے عبد القیس (قبیلہ) کے پیغام پہنچانے والوں کو ایمان کے معنی بتائے اور اللہ تعالیٰ نے (سورہ آل عمران میں) نہر لیا:
اور جو کوئی اسلام کے سوا دوسرا کوئی دین چاہے تو ہرگز قبول نہ ہوگا اس کی طرف سے۔

فی حدیث عمر اولہ ان رجلا فی اخر عمر النبی صلی اللہ علیہ وسلم جاء الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم^(۱) اور یہ بھی لکھتے ہیں کہ ایک احتمال یہ ہے کہ حجۃ الوداع کے بعد کا یہ قصہ ہو "ویمحلت ان یكون بعد حجة الوداع
فانہا اخر سفراتہ ثم بعد قدومہ بقلیل دون ثلاثہ اشهر مات" یہ سفر حضور کا آخری سفر تھا اور حجۃ الوداع میں تکمیل دین
کا اعلان ہو چکا تھا "الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام
دیناً" اس سفر سے واپس پرتین ماہ بھی نہ گزرے تھے کہ آپ رفیق اعلیٰ سے جا ملے۔ آگے حافظ لکھتے ہیں کہ [وكانہ] انہا جاء (جبریل)
بعد انزال جميع الاحكام لتقریر امور الدین التي بلغها مقفدة، فی مجلس واحد لتتصبط، جبریل علیہ السلام
تمام احکام کے نزول کے بعد جبکہ دین مکمل ہو چکا تھا حاضر خدمت ہوئے، تاکہ جو احکام اور شریعت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو مختلف
اوقات میں پہنچائے تھے ان سب کو بخانا ایک ہی مجلس میں بیان کر دیں تاکہ وہ منقبض ہو جائیں اور یہ غلام ذہنوں میں محفوظ رہے اور امت
کو یاد رکھنا آسان ہو جائے۔ حدیثوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت جبریل امین کو کسی نے نہیں پہچانا بلکہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم
نے بھی نہیں پہچانا کہا سیتا۔

اس حدیث سے امام بخاری نے یہ بات افذکی کہ اسلام، ایمان، اور احسان یہ سب دین میں شامل ہیں اور یہ مجموعہ دین ہے
— ایک چیز یہ ہوئی — دوسری اس چیز کا ذکر جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وفد عبد القیس سے ایمان کے بارے میں بیان فرمائی تھی۔
جس کا یہاں صرف حوالہ ہے، آگے پوری حدیث "باب اداء الخمس من الايمان" میں آئے گی، تو جبریل کی حدیث سے معلوم

قَالَ مَا الْإِسْلَامُ؟ قَالَ الْإِسْلَامُ أَنْ تَعْبُدَ اللَّهَ وَلَا تُشْرِكَ بِهِ وَتَقِيَمَ الصَّلَاةَ وَ

اس نے پوچھا: اسلام کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: اسلام یہ ہے کہ اللہ کو پوجے، اس کے ساتھ شریک نہ کرے، نماز کو ٹھیک کرے اور

وَوَدَّيَ الزَّكَاةَ الْمَفْرُوضَةَ وَتَصُومَ رَمَضَانَ، قَالَ مَا الْإِحْسَانُ؟ قَالَ أَنْ

فرض زکوٰۃ ادا کرے اور رمضان کے بندے رکھے، اس نے پوچھا: احسان کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: احسان یہ ہے کہ اللہ کو

تَعْبُدُ اللَّهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ

ایسا (دل لگا کر) پوچھ جیسا کہ تو اس کو دیکھ رہا ہے

کیونکہ ایمان جملہ عقائد کا خلاصہ ہے اور اسلام احکام فقہیہ اور ارکان و اعمال کا اور احسان سلوک و تقویٰ اور تزکیہ نفس کا۔

اجاث فلسفہ و متکلمین نے بیان کئے ہیں مثلاً مسئلہ جزو لایق تجزی و غیرہ ان کا ذکر نہیں، البتہ متبعی عقائد میں وہ ایمان کی تفصیل

ہیں اور رب افعال و اعمال اسلام کی تفصیل ہیں اور سارا تصوف و ریاضیات اور اسرار و حکم وغیرہ جو کچھ بھی ہیں، وہ سب احسان کی تفصیل ہیں

اسی بنا پر یہ حدیث بہت ہی قابلِ اعتناء ہے — غالباً ہی وجہ ہے کہ امام مسلم نے اہل کتاب اسی حدیث جبریل سے شروع کی ہے (علامہ

پس نے کہا، قرآن کی ابتدا سورہ فاتحہ سے کی گئی جو اہم الکتاب ہے غالباً اسی کی پیروی میں امام نبوی نے اپنی دونوں کتابوں (شرح السنۃ

اور مصابیح کا افتتاح حدیث جبریل سے کیا، اس لئے کہ وہ امام السنہ ہے۔

کلام اس میں بہت طول سے اور کافی بسط عادتاً ہے، اگر میں اپنی سسط کے مطابق بیان کر دوں تو کم از کم مندرہ دن تک بیان

ہادی رے کا، مگر گناہش نہیں اس نے مخفی رکھ کر کہا ہوں۔

قولہ وارثاً یعنی تمہارا حق ہے کہ شخص یحسان نے۔ یہ اس کا یہ ہے کہ بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں ملے علمِ مہستہ

تھے، اس لئے اجنبی آدمی کو شناخت میں دقت ہوتی تھی اور اس کو لو جھنڈا پڑتا تھا کہ من محمد فیکم، تم سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کون ہے

بعد میں صحابہ نے ہی عرض کیا کہ حضور! احازت دس تو ہم ایک دکان (چھوڑو) بنا دیں اور آپ اسی رشتہ فزاہوں (سک) کو رکھیں، والا

بغیر جوئے کو پہچان لے، آپ نے اعزازتِ محنت فرمادی، جناح صحیفہ نے الگ حوتروہ بنادیا، اسی رتبہ تشرف فرما سونے لگے، اس وقت

یہی غانا اسی چوتھے رتشف فرماہوں گے اس لئے لفظ ہازا استعمال کیا جس کا معنی "نہاں" ہو گا تاکہ غیبی وضع ہو جائے۔

اور حضور کی نشست کا خاکہ زمین میں آجائے، یہیں سے سید کا لالہ اگر ازلِ علق کو نماںِ حلقہ (اور مخصوص) وقت پر مٹھا جائے تو کچھ مٹاؤ

نہیں۔ — فَاتَاكَ رَجُلًا یعنی آدمی کی صورت میں ایک صاحب آئے اور سال کا

مَا الْإِيمَانُ؟ ایمان کیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ ایمان اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ ہے۔

مردہ حضرت عرفانہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے ہے، اس میں یہ ہے کہ آنے والا آدمی اگر بیٹھ گیا واسنہ رکبتہ الی رکبتہ اور اپنے گھٹنے آپ کے گھٹنے سے ٹیک دے، یعنی اس قدر قرب ہو کہ اس کے گھٹنے اور آپ کے گھٹنے مل گئے، وضع کفہ علی الخذیہ ضریقہ کی کہ ہر راجع ہے؛ اس میں دو قول ہیں، اکثر کہتے ہیں کہ ضریقہ راجع کی طرف راجع ہے، یعنی آنے والے نے اپنے دونوں ہاتھ اپنی دونوں رانوں پر رکھ لئے، جس طرح باادب آدمی بڑوں کے سامنے بیٹھتا ہے، یہ بھی موجب بیٹھا۔ اگر ضریقہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف راجع کریں تو اس وقت ترجمہ ہوگا (اپنے دونوں ہاتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دونوں رانوں پر رکھ دے) یہ ہیئت گونہ ہے ادبی کی ہے اور جبریل سے مستبعد معلوم ہوتا ہے لہذا ادھر ضریقہ راجع نہ ہونی چاہئے، اگر یاد ہے کہ بعض روایات میں "خذی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" کی تصریح ہے، یعنی اپنے ہاتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دونوں رانوں پر رکھ دے۔ یہ حدیث بھی صحیح ہے، حافظ نے فتح الباری میں اس کو نقل کیا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ راجع کی طرف ضریقہ راجع کرنا بھی صحیح ہے، ائمہ روایت میں "خذی السبئی صلی اللہ علیہ وسلم" ہے وہ بھی صحیح ہے۔ صریح یہ ہوئی ہوگی کہ اولاً اپنے ہاتھ اپنی رانوں پر رکھوں گے، چنانچہ بعض روایات میں ہے: ایسے بیٹھے بیٹھے ہم نمازیں بیٹھے ہیں، پھر کچھ بے تکلف ہوتے گئے اور آگے بڑھتے گئے، یہاں تک کہ حضور کی رانوں پر ہاتھ رکھ دے۔ بعض روایات میں آیا ہے "قال ادنو یا محمد؟ قال ادن" پوچھا: میں اور قریب آجاؤں؟ آپ نے فرمایا قریب آجاؤ، اور یہی بار ہوا، اس سے یہ نظر بناتا ہے کہ پہلے تو اگر اس طرح موجب بیٹھے جیسے شاگرد، استاد کے سامنے بیٹھتا ہے، اس وقت ان کے ہاتھ خود اپنے رانوں پر تھو پھر آہستہ آہستہ آگے بڑھتے گئے اور بے تکلفی آتی گئی حتیٰ کہ بالکل قریب پہنچ گئے اور دونوں کے گھٹنے مل گئے اور اب انھوں نے اپنے ہاتھ اپنی رانوں سے اٹھا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رانوں پر رکھ دے۔ اس طرح جملہ روایات میں تطبیق بھی ہو جاتی ہے اور مجلس کا پورا نقشہ سامنے آ جاتا ہے، اور مقصود یہ تھا کہ کسی کو پتہ نہ چلے کہ یہ آنے والا کون ہے اس لئے تعزیر اور چھپانے کی پوری سی کی گئی تاکہ کوئی پہچان نہ سکے، یہی وجہ کہ کہیں یا محمد، کہہ کر مخاطب کیا اور کہیں یا رسول اللہ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاں بدو اور غیر تمدن لوگ یا مجرم، لکڑیٹھاگے تھے اور اہل تمدن لوگ یا رسول اللہ، لکڑیٹھاگے تھے، جبریل علیہ السلام اور وہاں افعالہ تھے، تکریم معلوم ہو سکے کہ کہاں کہتا ہے۔ اسی طرح بعض روایات میں ہے کہ آنے کے بعد التلاہ علیہا کہا جواہل تہذیب کا شعار ہے، اور بعض روایات میں ہے کہ تختی رقاب کرتے ہوئے آئے جواہل ہنہ کے طریقے کے خلاف تھا، ان سب باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے کو خفی رکھنا مقصود تھا۔

حضرت عمرؓ کہتے ہیں: شدید بياض الثوب شديد سواد الشعر لا يرى عليه أثر السفر لا يعنه منا حث

کپڑے بہت اچھے اور صاف تھے، بال نہایت سیاہ تھے، اس پر سفر کا کوئی اثر اور علامت نظر نہیں آتی تھی، اس سے معلوم ہوا کہ [مسافر اور باہر کا آدمی نہیں ہے ورنہ گرد و غبار اور کپڑے سے ناصاف ہوتے، بلکہ مقامی باشندہ ہے] لیکن ہم میں سے کوئی اس کو پہچانتا نہ تھا، یہ علامت تھی کہ باہر کا کوئی آدمی ہے۔

بعض روایات میں ہے: **کلان الطیب ریحا وانظف قوبا**، بہترین خوشبو لگائے تھا اور نہایت سترے کپڑے پہنے تھا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ بہت سلیقہ مند اور پجد مہذب ہے جو آداب مجلس سے پوری طرح باخبر ہے، یہ بھی تمیہ تھا۔ حدیث میں یہ بھی ہے کہ سوال کیا: **ما الايمان؟** جب حضورؐ نے جواب دیا تو کہا **صَدَقْتُ**، یعنی آپ نے سچ کہا، 'جیسے اردو محاورے میں "ٹھیک ہے" کہا جائے صحابہ کہتے ہیں **فَعَجِبْنَا لَهُ يَسْأَلُهُ وَيَصْدِّقُهُ**، پس تعجب ہوا کہ سوال بھی کرتے ہیں جو علامت نہ جانے کی ہے اور تصدیق بھی کرتے ہیں جو علامت ہے واقفیت کی۔ یہ بھی تمیہ ہے۔ غرض ہر مرد پر کوشش کی گئی ہے کہ کسی کو پتہ نہ چلے۔ ابن حبان میں ہے: **فَوَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِكَ مَا اشْتَبَهَ عَلَيَّ مَنْذُ اَنَا فِي قَبْلِ مَرَقِي هَذِهِ وَمَا عَرَفْتُهُ حَتَّى وُلِّيْتُ**، اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے جبریل جب سے آنے لگے کہیں کا آنا مجھ پر شبہ نہیں ہوا سوائے اس مرتبہ کے کہ میں انھیں پہچان نہ سکا، جب وہ چلے گئے تو معلوم ہوا: **وَفِي رَوَايَةِ ابْنِ فُروَةَ وَالَّذِي بَعَثَ مُحَمَّدًا بِالْحَقِّ مَا كُنْتُ بِالْعِلْمِ بِهِ مِنْ رَجُلٍ مِثْلِكَ وَانَّهُ لَجِبْرِيلُ** (۳) وفی حدیث ابی عامر ثمر و لی فلما لم نر طریقه قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم سبحان اللہ ہذا اجبریل جاء لیعلم لنا من دینہم والذی نفس محمد بیدہ ما جاء فی قطف الا واما عمر فہ الا ان تكون ہذا اطرا (۳) ان دونوں روایتوں سے معلوم ہوا کہ معاذ بالکل غفی رکھا گیا، یہاں تک کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو تیس سالہ جان پہچان کے باوجود پہچان نہ سکے، جب وہ چلے گئے تب معلوم ہوا کہ جبریل تھے، جو اس کو دین سکھانے آئے تھے۔ انھوں کا اس قدر اہتمام کیا گیا، لیکن ہے اس سے یہ بتانا منظور ہو سکے علم و معارف ختم کر دئے، دین کس کر دیا گیا مگر پھر بھی بندہ کا حال یہ ہے کہ اس کے پاس اپنی ذات سے کچھ نہیں ہے، سب کچھ عطائے خداوندی ہے وہ اگر چاہے تو محسوس و شہد کا علم بھی واپس لے لے، وہ اپنی قدرت دکھاتا ہے کہ اگر ہم چاہیں تو سب کچھ واپس لے لیں۔ نسا کی روایت میں ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام وحیہ کی شکل میں تھے، مگر حافظ نے تصریح کی ہے کہ نسا کی روایت کا یہ لفظ راوی کا، ہم ہے، ورنہ حضورؐ کیوں نہ پہچانتے، اور صحابہؓ لا یعرفونہ منا احد کیوں کہتے؟ یعنی ہم میں سے کوئی ان کو پہچانتا نہ تھا۔ اس سے سبق والا کج شہادت

کا علم جو بصر سے تعلق رکھتا ہے واپس لے لیا جاسکتا ہے، تو حقائق و معارف تو غیر محسوس چیزیں ہیں، ان کا علم بطریق اولیٰ سلب ہو سکتا ہے، چنانچہ قرآن میں فرمایا ہے: وَلَنْ شُكِّلَ الذَّهَبُ بِالَّذِي اَوْحَيْنَا إِلَيْكَ تِلْكَ لَاحِقُ الدَّيْلِ وَكَيْلًا ۝ اُنْكَرَ فَرَمَا: الْاَرْحَمَةُ مِنْ رَبِّكَ ۝ (۳۲) یعنی ہم ایسا کریں گے نہیں مگر کر سکتے ہیں، اس کا یہ ایک نمونہ دکھلادیا۔

حضرت مولانا محمد یعقوب رحمت اللہ علیہ (۳۱) فرماتے تھے اہم قسم کھاتے تھے کہ میرے پاس ایک شخص نبوی لایا اور کہا کہ دستخط کر دو، میں نے دستخط کرنے کا ارادہ کیا لیکن میں اپنا نام بھول گیا، بہتیرا سوچا مگر یاد نہیں آیا۔ حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ ایک بادیں اپنا مکان بھول گیا اور منٹوں سوچتا رہا اور غور کرتا رہا کہ کون سا مکان ہے اور کدھر جاؤں، اس پر مجھے یہ حدیث یاد آگئی۔ چونکہ آپ کو علم کامل دیا گیا ہے جیسا کہ ارشاد گرامی ہے عَلِمْتُ عَلَمُ الْاَوَّلِينَ وَالْاٰخِرِينَ مجھے اولین و آخرین کا علم دیا گیا ہے اس لئے ایک نمونہ اس کا بھی دکھلادیا گیا کہ ہم اس کے واپس لینے پر ہم وقت قادر ہیں، جس کا علم چاہیں دیکر واپس لے لیں، خواہ نبی ہو یا ولی۔ اور یہ تہدید ہے کہ علم الہی آپ کو نہیں تھا، تو اس سے تفصیل شان نبوی نہیں نکلتی۔

یہ بھی یاد رکھو کہ اگر نسا کی روایت کو وہم راوی نہ بھی مانا جائے اور یہ کہا جائے کہ جبریل دراصل وحی کبریٰ رضی اللہ عنہ کی شکل میں آئے تھے تو بھی مستبعد نہیں، کیونکہ ممکن ہے کہ پہلے سے وحی کبریٰ مجلس میں موجود ہوں تو اب کیسے سمجھنے کی جہر لیں جس، بہر حال اس صورت میں بھی "لا یعرفہ مٹا احد" صحیح ہے۔

قال الایمان ان تؤمن باللہ الخ یعنی اس کے موجود ہونے پر اور اس کے تمام کمالات و محاسن پر اور اس پر کدوہ متکا متوجہ ہے اور تمام نقائص سے متبرک ہے۔

یہاں پر جواب میں بھی ایمان کا لفظ فرمایا، تو بیوضوں نے کہا کہ سوال ایمان شرعی کا تھا اور "اَنْ تَوْمِنَ" میں ایمان نبوی مراد لے کر جواب دیا اِیْ اِنْ تَصَدَّقَ بِاللّٰہِ، جیسا کہ قرآن میں ہے: وَمَا اَنْتَ بِجَوْمِنٍ لَّنَا (۳۳) اِیْ بِمَصَدَّقٍ لَّنَا یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اس وقت کہا تھا جب وہ یوسف علیہ السلام کو کنوئیں میں ڈال کر رات میں روتے ہوئے اپنے باپ کے پاس آئے تھے اور کہا تھا کہ یوسف کو بھڑایا کھا گیا، اس کے بعد کہ آپ ہماری بات کی تصدیق دیکریں گے، یعنی نہ انیس گے اگرچہ ہم سچے ہیں۔ تو یہاں ایمان کے نبوی معنی تصدیق کے مراد ہیں۔ اسی طرح حضورؐ نے سائل کو جواب دیا کہ تم ایمان لاؤ، یعنی تصدیق کرو! اسخ۔

بعض نے کہا سوال نفس ایمان کا نہ تھا متعلقات ایمان کا تھا [یعنی ایمان کی تعریف نہیں پوچھ رہے تھے بلکہ اس کے متعلقات کو پوچھ رہے تھے کہ کن کن چیزوں پر ایمان لانا ضروری ہے] اس کا جواب دیا کہ [اللہ اور اس کے ملائکہ اور اس کی لقاء اور اس کے رسل وغیرہ پر ایمان لانا ضروری ہے] ملائکہ پر ایمان کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ کی ایسی مخلوق ہیں جو اس کے حکم پر کام کرتے ہیں اور سفراء البرہمن ہیں اور عباد مکرمون ہیں۔

قوله وبلغناہ یعنی اللہ سے ملنے پر ایمان رکھنا، بعض نے کہا کہ اس رویت باری مراد ہے یعنی یہ کہ رویت باری حق ہے، آگے یہ بات کہ رویت کس کو ہوگی؟ اس کا علم اللہ کو ہے۔

قوله ورسولہ رسولوں پر ایمان لانا یعنی وہ معصوم ہیں اپنی طرف سے کوئی بات نہیں کہتے جو حکم خداوندی ہوتا ہے اسی کو بیان کرتے ہیں اور یہ سمجھاتے ہیں کہ جو کچھ خدا کی طرف سے ہے وہ سب حق ہے اور ہر حال میں حق کہنا ہمارا کام ہے قرآن میں آخری نبی کے بارے میں فرمایا گیا: وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۚ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ ؕ یعنی وہ اپنی خواہش سے نہیں کہتے جو کچھ وہ کہتے ہیں وہ وحی الہی ہوتی ہے جو ان کے پاس پہنچتی ہے اسی کو وہ بیان کرتے ہیں خواہ وحی جلی ہو یا وحی خفی — ایک بزرگ نے اسی کیوں کہا ہے۔

گفتہ او گفتہ اللہ بود * گرچہ از مستقوم عبد اللہ بود

قوله وقومہن بالبعث . بعث : تہجد سے اٹھنا، یعنی اس کو بھی مانو کہ ایک وقت آئے گا جب یہ دنیا اپنی عمر پوری کرے گی اور اسے فنا کر دیا جائے گا، پھر دوبارہ ساری مخلوق پیدا کی جائے گی اور اللہ کے دربار میں حاضری ہوگی، پھر اس دنیا میں جو کچھ اچھا یا برا کیا ہے سب سامنے آئے گا اور پھر فیصلہ ہوگا، نیکیوں پر انعام اور بدیوں پر عتاب ہوگا۔

قوله قال ما الاسلام اخبرنا روايت من ان تعبد الله ہے اور بعض روایات میں ان تشهد ان لا اله الا الله ہے اور تعبد سے مراد بھی مکہ ہی پڑھنا ہے کیونکہ یہ "ما الاسلام" کا جواب ہے — میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ اسلام مثل بدن کے ہے اور ایمان مثل روح کے اور یہ موقع تھا کہ دونوں چیزوں کی پوری تفریق اور تعریف کی جائے اس لئے وہ فرق واضح کر دیا گیا ہاں بخود اطلاق ایک کا دوسرے پر ہو جاتا ہے۔

فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ ، قَالَ مَتَى السَّاعَةُ ؟
 اگر یہ نہ ہو سکے تو آنا تو خیال رکھو کہ وہ تجھ کو دیکھ رہا ہے ، اس نے کہا کیا تم کو آئے گی ؟

حافظ ابن عربی نے ایک لفظ کہا ہے ، وہ کہتے ہیں : اِذَا الْجَمْعَانِ تَقَرَّعَا وَادَّاعَرَّعَا جَمْعًا یعنی جب دونوں کی تشریح ایک ساتھ ہو تو دونوں الگ الگ معنی رکھتے ہیں ، اور جب دونوں علیحدہ علیحدہ بولے جاتے ہیں تو ایک کا اطلاق دوسرے پر ہوتا ہے یہاں چونکہ ایمان و اسلام ساتھ ساتھ مذکور ہیں اس لئے دونوں الگ الگ ہیں ، ایک کا تعلق قلب سے ہے اور وہ ایمان ہے ، دوسرے کا تعلق قاب و جوارح سے ہے اور وہ اسلام ہے ۔

یہاں بر بخاری کی روایت میں حج کا ذکر نہیں ہے حالانکہ یہ حدیث بعد فرض تہجد بلکہ بعد ادا ایلی حج کی ہے ، مگر مسلم میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت میں حج کا ذکر موجود ہے ، یہاں اختصار کر دیا گیا ، اس لئے کہ بعض میں تو عمر اور غسل جنابت کا ذکر بھی ہے ، اس سے تائید ہوتی ہے کہ یہاں اختصار ہے ، پوری حدیث دوسری جگہ موجود ہے ۔

قَوْلًا مَا لِحَسَنٍ اَخٍ اِيْمَانٍ وَاسْلَامٍ ابْتَدِئِي دَرْجَةً اَوَّلَ دَرْجَاتِ اِيْمَانٍ كَا هِيَ جِسْرُ رَغَاتٍ [کا مار] ہے ۔ پھر دوسرا درجہ اسلام کا ہے جس پر کمال نجات موقوف ہے ۔ ایمان غلوزار سے نجات دیتا ہے اور اسلام مطلقاً دخول ہی سے نجات دینے والا ہے ، تو غلوزار نجات اول درجہ اور دخول سے نجات دوسرا درجہ ، اس کے بعد رُفَعُ دَرَجَاتٍ کا آخری مرتبہ ہے ، اور یہ اسان سے حاصل ہوتا ہے ، پھر اس میں بھی مراتب ہیں ، ایک شبلی و جنید رحمہما اللہ کا مرتبہ ، ایک ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کا [مرتبہ] ایک انبیاء علیہم السلام کا [مرتبہ اور] ایک سید البشر افضل الرسل صلی اللہ علیہ وسلم کا [مرتبہ عالی] ۔

قَوْلًا اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَالَّذِیْ تَرَاهُ اَخٍ اس کی تفسیر میں علماء کا اختلاف ہے ۔ یہاں فرمایا " كَالَّذِیْ تَرَاهُ " کان تشبیہ لائے بالذات " نہیں لائے ۔ معلوم ہوا کہ اس دنیا میں کسی کے لئے رویت نہیں ، مسلم کی ایک حدیث میں فرمایا گیا : لَنْ تَرَوْا رَبَّكُمْ حَتّٰی تَمُوتُوْا " تم اپنے رب کو ہرگز نہ دیکھ سکو گے جب تک تم کو موت نہ آئے ، یعنی اس دنیا میں ان دنیوی آنکھوں سے تم رب کے دیکھنے کے قابل نہیں ہو ، یہ آنکھیں اس کا نقل نہیں کر سکتیں ، ہاں قلب پر جو کشف ہوتا ہے کبھی اس کو رویت کہہ دیتے ہیں (انہیں اگر استثناء ہے تو صف سراج میں حضور مصطفیٰ اللہ علیہ وسلم کی رویت کا ، بشرطیکہ رویت مسلم ہو ۔ " كَالَّذِیْ تَرَاهُ " کا مطلب یہ ہوا کہ عبادت میں قلب کا یہ حال ہو کہ گویا وہ مشاہدہ کر رہا ہے (مشاہدہ کا یہ مطلب نہیں کہ آنکھ سے دیکھ رہا ہو) یہ مقام مشاہدہ صوفیاء کے یہاں ہے ۔

فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ اَخٍ یعنی اگر وہ حال مشاہدہ کا نہ ہو سکے تو اس سے اتنا کہ دوسرا مرتبہ ہے کہ یہ ستھضر ہو کہ اللہ اللہ دیکھ رہا ہے یہ مقام مراقبہ کا ہے ، یہاں عقیدہ مراد نہیں ، وہ تو سب کو ہے ہی بلکہ یہاں استحضار مراد ہے کہ بندہ کا حال یہ ہو کہ وہ خدا کو اسنے پاسے جڑ چل

قَالَ مَا الْمَسْئُولُ بِأَعْلَمَ مِنَ السَّائِلِ وَسَأْخِذُكَ عَنْ أَشْرَاطِهَا إِذَا أَوَلَدَتْ

آپ نے فرمایا جس سے پوچھنا ہے وہ بھی پوچھنے والے سے زیادہ نہیں جانتا اور میں تجھ کو اس کی نشانیں بتلاؤں دینا ہوں، جب
الْأَمَةُ رَبَّتَهَا وَإِذَا تَطَاوَلَ الْإِبِلُ الْبَهْمُ فِي الْبُنْيَانِ فِي خَمْسٍ لَا يَعْلَمُهُنَّ إِلَّا
لَوْذِي اپنے بیان کو سمجھنے اور جب کالے اونٹ چرانے والے لمبی لمبی عارتیں ٹھونکیں (بڑے بن جائیں) قیامت کا علم یہی ان پہنچ
اللَّهُ ثُمَّ تَلَا النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (إِنَّ اللَّهَ عِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ اللَّهُ) ثُمَّ
باتوں میں ہے جن کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے (سورہ لقمان) کی یہ آیت پڑھی: بَلِكَ اللَّهُ هِيَ جَانَا
أَدْبَرَ فَقَالَ رُدُّوهُ فَلَمْ يَرَوْا شَيْئًا فَقَالَ هَذَا جَبْرِيلُ جَاءَ يُعَلِّمُ النَّاسَ دِينَهُمْ
ہے قیامت کب آئے گی! پھر وہ شخص بیٹھ موڑ کر چلا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کہو پھر میرے سامنے) لاؤ! (لوگ گئے)
قَالَ أَبُو عَبْدِ اللَّهِ جَعَلَ ذَلِكَ كَلَّةً مِنَ الْإِيمَانِ

تو وہاں کسی کو نہ دیکھا، آپ نے فرمایا: یہ جبریل علیہ السلام تھے، لوگوں کو ان کا دین سکھانے آئے تھے، امام بخاری نے کہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
نے ان سب باتوں کو (دین کہدیا) ایمان میں شریک کر دیا۔

کسی بادشاہ کے دربار میں بیٹھنے والے کی کیفیت ہوتی ہے — تو یہ دوسرے احسان کے ہوئے، ایک کا تعلق شہرود سے اور دوسرے کا عراق سے
ہے مگر میرے نزدیک یہ شرح مروج ہے، راجح وہ ہے جو امام نووی نے شرح مسلم میں بیان کی ہے اور نووی کا یہی مضمون شیخ سعدی
نے حاشیہ بخاری میں لکھا ہے، لیکن اس کی عبارت اور تعبیر لطیف ہے، نووی کی تعبیر اتنی لطیف نہیں ہے — پہلے ایک مثل سمجھ لو، ایک
شخص مثلاً دربارش ہی میں بیٹھا ہے اور سب لوگ اپنی اپنی جگہ بیٹھے ہیں تو اس وقت جو کیفیت ہوتی ہے اس کا اندازہ کسی درباری ہی کو ہو
سکتا ہے، ہر چیز پر نظر رہتی ہے کہ کہیں کوئی ایسی حرکت نہ ہو جائے جو خلاف نشا ہو اور میں دربار سے نکال دیا جاؤں (۱) و حقیقت جو دربار
میں رہتے ہیں ان کے لئے بڑی مشکل ہے، ایک چیز گتہ کی یہ ہے کہ ایک درباری بادشاہ کو دیکھتا ہے اور بادشاہ درباری کو دیکھتا ہے
تو آخر اس حال میں اور اس خوف میں کس چیز کو قفل ہے؟ اور خوف کی علت کیا ہے؟ بادشاہ کا درباری کو دیکھنا یا درباری کا بادشاہ کو
دیکھنا؟ مناظر حکم اور موثر کیا ہے؟ اس کا دیکھنا یا اس کا؟ اس کی مثال یوں ہے کہ کوئی تانبا دربار میں ہو تو کیا کچھ تعظیم ہی میں کمی

(۱) حضرت نے دربار حیدر آباد کے بعض واقعات بیان فرمائے تھے، اگرچہ تقریر پر نظر ثانی فرمائی تو انہیں تلمذ فرمادیا، اس لئے یہاں

بھی انہیں چھڑ دیا گیا۔ (جاء)

کر سکتا ہے؟ نہیں بلکہ اور زیادہ تعظیم ہوگی، معلوم ہوا کہ درباری کے دیکھنے کو دخل نہیں ہے بلکہ صاحب دربار کے دیکھنے کو دخل ہے اور تمام باتوں کی لحاظ کرنے میں اسی کے دیکھنے کو دخل ہے مذکور درباری کے دیکھنے کو، اسی بنا پر امام نوویؒ اور شیخ سننؒ کہتے ہیں کہ مرتبہ ایک ہی ہے دونوں، اور اسی حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ وہاں عہدیت ہیں اور کہو کہ اللہ کو دیکھ رہے ہو، اگر بالفرض تم دیکھتے ہو تو کیا کرتے، جیسے اس وقت کرتے اسی طرح اب بغیر دیکھے اور کہو "فَلَنْ لَّهٖ تَكُنْ تَرَاۗهُ فَانۡتَ تَرَاۗهُ" یعنی اگرچہ تو اسے نہیں دیکھتا لیکن وہ تو تجھ کو دیکھ رہا ہے اور حقیقتہً دخل اسی کے دیکھنے کو ہے لہذا اسی کی رعایت کرنی چاہئے، اب اس تقریر کی بنا پر "کانت تراه" میں مسئلہ رویت کی طرف توجہ کی حاجت نہیں، مطلب یہ جو کہہ رہے تو دیکھتے وقت کرتا اسی طرح اب بھی کہو کہ دخل تیرے دیکھنے کو نہیں۔

یہ بھی معجزہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شکل مسئلہ کو یوں حل فرمایا، تمام مراتب صوفیا اسی سے حاصل ہوتے ہیں، اسی کو نسبت یا داشت کہتے ہیں، سنت اور روایت یہی تعلق ہے اور جو صوفیانے کہا ہے وہ بظاہر حدیث کے خلاف ہے، بعضوں نے یہاں فحاشی بحث چھیڑی ہے، اگر یہ بحث دیکھنا چاہو تو ابن قیمؒ کی "مدارج السالکین" پڑھو، بعض نے اسے اور بھی معنی پہنا ہے یہاں اور کان نامہ بتلایا ہے، مگر یہ جہل ہے، چنانچہ حافظ نے اس کا بسوط رد کیا ہے، مرقاۃ بھی جہل ہی ہے۔

قوله **لَا تَمْتَنِي السَّاعَةَ** اس بار بایہ خیال ہوا کہ یہ تین سوالات ایمان، اسلام اور احسان تو باہم مربوط تھے، ایک کا ادنیٰ درجہ تھا دوسرے کا اوسط اور تیسرے کا اعلیٰ، مگر آئے کا سوال بظاہر غیر مربوط [معلوم ہوتا] ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ تمام دنیا عبادت کے لئے ہے، اور اس کا خری مرتبہ احسان ہے اور اعلیٰ درجہ کے محسن ختم ہو چکے، محسن کامل صلی اللہ علیہ وسلم بھی آپ کے تو اب دنیا کے بقا کی ضرورت کیا رہی؟ جب عبادت درجہ تمام تک پہنچ گئی اور ایجاد عالم کی غرض حاصل ہو چکی تو پھر اب کسی چیز کی ضرورت نہیں: **وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ** اور میں نے جن و انس نہیں پیدا کئے مگر اس لئے کہ میری عبادت کریں اور وجود نبوی سے عبادت کامل ہو چکی اور **[بعثت] اِذَا السَّاعَةُ كَلَّهَاتٍ** کی بھی یہی وجہ معلوم ہوتی ہے جس نے آپ خود فرما ہے میں کہ میرا آنا گویا قیامت کا آنا ہے اور اس میں بھی یہی اشارہ موجود ہے کہ غرض تخلیق پوری ہو گئی تو اب دنیا کی کیا ضرورت رہ گئی؟

حضرت ملانا محمد قاسم نانوتویؒ اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ نگین عبادت کے دو مرتبے ہیں، ایک کیفا دوسرے کما، کیفا تو بایں طہ حاصل ہو چکی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی پر اس کی تکمیل ہو گئی اور بعثت نبویؐ اسی تکمیل کے لئے تھی، اور کما اس وقت حاصل ہوگی

جب تمام دنیا میں اسلام پھیل جائے اور کوئی جگہ باقی نہ رہے، اور یہ اب تک حاصل نہیں ہوئی، میں کہ خود آپ نے ایک حدیث صحیح میں فرمایا:
 لَا يَبْقَى عَلَى ظَهْرِ الْأَرْضِ بَيْتٌ وَبَيْتٌ وَلَا مَذْبَحٌ وَلَا مَذْبَحٌ (نہ چکا، نہ پکا، نہ ڈیرہ، نہ نیمہ) (الادخلہ اللہ الاسلام بعزیز وذلیل اور یہ مسیح علیہ السلام کے زمانہ میں ہوگا اور اس کے آثار اب نظر آنے لگے ہیں، یہاں تک کہ نجد بھی بیشین گوی کرنے لگے ہیں کہ اُمّۃ تام دنیا کا مذہب اسلام ہوگا۔

غرض جب کنا و کیفاً دونوں طرح تکمیل ہو جائے گی تو پھر دنیا اٹھائی جائے گی، کیونکہ مقصود حاصل ہوگا، اور اٹھانا بھی اس ترتیب سے ہوگا جس ترتیب سے خلق ہوا تھا، سب سے پہلے کعبہ کو اٹھایا جائے گا کیونکہ وہی مہم سے پہلا گھر ہے "إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِمَكَّةَ مُبَارَكًا" حدیث پاک میں ہے: ایک بیشی غلام آئے گا "وَيَقْلَعُ جُحْرًا جُحْرًا" ایک ایک بھڑکال دے گا (اردو محلو) میں اینٹ سے اینٹ بجا دے گا (۲) وہ کعبہ جس کے متعلق فرمایا گیا کہ کوئی جاہل کعبہ پر حملہ کرنا چاہے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی گردن توڑ دے گا (میں کہ دانقہ انفیل میں ہو بھی چکا) (۳) اگر اب اسے ایک بیشی غلام توڑ دے گا، جیسے دہلی کالال قلعہ کے اگر اس وقت بڑے سے بڑا بادشاہ چاہے تو اس پر کسی طرح تسلط حاصل نہیں کر سکتا، لیکن جب سلطنت کا خیال اس کے توڑنے کا ہو جائے تو کئے کے مزدوروں سے توڑا دیا جائے گا، اس تقریر سے واضح ہو گیا کہ ساعۃ کا ذکر یہاں بالکل بر محل ہے، سوال کے جواب میں ما الممسؤل عنہا با علم من السائل، "جائے اس کے کہ مختصر لفظوں میں "لا اعلمہ" کہتے، آپ نے جواب میں اتنا طویل جملہ اختیار فرمایا، یہ بلاغت کا بہترین شاہکار ہے اس لئے کہ اس وقت اگرچہ جبریل سائل اور آپ مسؤل عنہ ہیں مگر بایہ ہمہ دنیا کے کسی مسؤل عنہ کو نہ تو اس کا علم ہے اور نہ کسی سائل کو، اس عنوان کے ذریعہ علم ساعۃ سے جمل کا اعطاف و استغراق ہو گیا۔

نوادرمیدی میں ایک روایت ہے، اس میں یہی سوال و جواب ہے مگر سائل مسؤل علیہ السلام ہیں اور عجیب جبریل، حضرت جبریل نے بھی یہی جواب حضرت مسیح علیہ السلام کو دیا تھا، مگر ہے من حیث لا یحتسب یہی جواب جبریل کو دلوایا گیا ہو کہ تم خود اپنا جواب یاد کرو تم نے بھی حضرت مسیح علیہ السلام سے ما الممسؤل عنہا با علم من السائل کہا تھا، وہی جواب تم میں تم کو دے رہا ہوں۔
 قَوْلًا وَمَا أَخْبَرْتُ عَنْ أَشْوَاطِهَا، أَشْوَاطُ مَعْنَى شَعْرَتُهَا، چھوٹی علاقہ میں، یہ نفع الاراء ہے، اور یسکین الرأ، شَعْرَتُهَا ہے اس کی مع شَعْرَتُهَا آتی ہے، بڑی علامات یا جہج یا جہج کا خروج، مسیح علیہ السلام کا نزول وغیرہ میں، چھوٹی علاقہ میں ہیں

اِذَا وُلِدَتِ الْاِمَّةُ رُبَّمَا، فتح ابداً میں اس کے چار معنی لکھے ہیں 'ب کو بیان کرنے کی حاجت نہیں'، ظاہر ہے کہ بچہ کی ماں مرتی ہوتی ہے اور بچہ مرتی ہوتا ہے، یہاں زمانہ کا انقلاب بتانا چاہتے ہیں کہ مرتی مرتی ہو جائے گا اور مرتی مرتی، عالی سافل بن جائے گا اور سافل عالی، تو پھر مرتی ہوگا، یہ کنایہ ہے انقلاب و انوکھا سواحوال سے، بعض روایات میں "رَبَّتْهَا" آیا ہے، اس سے مراد لڑکی ذی جائے بلکہ تاء کے معنی میں تادیل کر لی جائے یعنی ہمتہ، اسی کو کہا ہے ۷

اِذَا التَّحْتَ اِلْمَسَافِلُ بِالْاَعَالِیٰ ۝ لَقَدْ طَابَتْ مُنَادِمَةُ الْمُنَايَا

بعضوں نے کہا ہے کہ یہ کنایہ ہے کثرتِ محاربات سے، یعنی لڑائیاں کثرت سے ہوں گی تو گرفتار ہونے والی عورتیں فائزین کی لڑکیاں ہوں گی اور ان سے اولاد ہوگی تو امہات الاولاد کی کثرت ہوگی۔ (لڑکی، لڑکا جب باندی سے پیدا ہوگا تو ماں ام ولد کہلائیگی اور اب وہ آزاد ہو جائے گی، تو گویا یہ اولاد اس کی آزادی کا سبب بننے سے مرتی بن گئی) (۸)

بادشاہ حیرہ نعمان ابن منذر کی لڑکی جب حضرت سعد ابن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے سامنے لائی گئی تو اس نے حسرت سے دو شعر پڑھے جسے علامہ عینی نے شرح بخاری میں نقل کیا ہے، وہ کہتی ہے ۷

وَكَيْفَ نُسُوسُ النَّاسِ وَالْاَمْرُ اَمْرُنَا ۝ اِذَا نَحْنُ فِيهِمْ سَوْقَةٌ نَنْتَصِفُ

فَاَنْتَ لَدَيْنَا لَا يَدُودُ وَمَنْعِيْمُهَا ۝ تَقْلُبُ تَارَاتِ بِنَا وَتَصْرَفُ

تَنْتَصِفُ، وادری، سوقۃ، رعایا (یعنی ایک زمانہ تھا کہ ہم حکمران تھے آج بگڑ چکے ہیں، ہائے اس دنیا پاتا ہے، اس کی نعمتیں دائمی نہیں ہیں، اس میں ایسے ہی انقلابات اور تغیرات ہوتے رہتے ہیں) (۹) دراصل یہ اسی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ اعلیٰ اسفل بن جائیں گے اور اسفل اعلیٰ — دیکھو دنیا اسی طرف جا رہی ہے، چنانچہ سوویت حکومت قائم ہوگئی جو کمزوروں کی ہے (اور اب اس زمانہ میں (سنة ۱۳۵۷ء میں) تو کثرت سے پسندہ اقوام چار پاسی، ہنتر وغیرہ بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہیں) (۱۰)

تَلَدُ وَ اِذَا تَطَاوَلُ رِعَاةُ الْاِیْلِ الْبِہْمِ الْخ. بَہْمٌ جمع ہے اَبَہْمُ کی، جو جو نانا جانا ہو، دوسرے معنی میں سیاہ آدمی، یعنی وحشی، گنوا، بڑے بڑے قطعے بنائیں گے، اس میں بھی اشارہ ہے کہ ذلیل، عزیز، اور عزیز ذلیل بنائیں گے نا اہل، اہل بنائیں گے اور اہل مظل ہو جائیں گے، چنانچہ آگے حدیث آئے گی: اِذَا وُصِدَ الْاُمُورُ اِلٰی غَیْرِ اَہْلِهَا فَانْظُرِ السَّاعَةَ (جب معاملہ نا اہلوں کے سپرد کر دیا جائے تو قیامت کا انتظار کرو) (۱۱)

تذ فی خمس، یہ تعلق ہے ”ما المسؤل عنها“ کے، یعنی قیامت کا علم ان پانچ چیزوں میں سے ایک ہے جس کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا، پھر آپؐ نے آیت پڑھی: اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَہٗ عَلَمُ السَّاعَةِ ۚ لَا یَہْدِیہٗ اِلَیْہِا سِوَاہٖ (۱) لہذا ہم سے اس کا سوال نہیں ہو سکتا۔

امام رازی نے اس آیت میں دو سوال پیدا کئے ہیں، اول یہ کہ اس آیت کی رو سے یہ ہونا چاہئے کہ ان پانچوں میں سے کسی ایک کی جزئی بات کا علم نہ ہو، حالانکہ ہم سیکڑوں واقعات اس کے خلاف پاتے ہیں — اولیاء کی کرامت کثرت سے منقول ہیں — صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو رحم کی حالت معلوم ہو گئی تھی اور آپؐ نے انتقال سے پہلے اپنی حاملہ بیوی کے متعلق فرمادیا تھا کہ ان کے بچہ کی ہڈی ہوگی، اس لئے آپؐ وصیت فرمائی کہ اس محل کو بڑی مان کر ترکہ تقسیم کیا جائے — ایسے ہی سیکڑوں واقعات ہیں۔

میں نے اپنے اساتذ سے سنا کہ پنجاب میں ایک بزرگ عبداللہ شاہ ہیں، ان کی عام عادت تھی کہ محل سے متعلق تعویذ دینے وقت بتا دیتے کہ لڑکا ہے یا لڑکی اور ویسا ہی ہوتا۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ پانچ کی کیا تخصیص ہے اور اس میں انحصار کیوں ہے؟ اور بھی بہت سی اشیاء ہیں جن کی اور دل کو اطلاع تھیں، تو یہ انحصار کہاں صحیح ہوا؟ اس دوسرے سوال کا سہل جواب امام سیوطی نے ”لیاب النقول“ میں یہ دیا ہے کہ سوال یہاں انھیں پانچ کا تھا، اس لئے جیسا سوال تھا ویسا جواب دیا گیا — لیکن پہلے سوال کا جواب مشکل ہے، امام رازیؒ نے تقریریں کی ہیں مگر شافی جواب ہو سکا، اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اس مسئلہ کا اگشاف ہو جائے اور مسئلہ علم غیب کی تحقیقت واضح ہو جائے۔

اس سے پہلے ایک مقدمہ سمجھ لو کہ اگر ایک چیز کے کچھ فروع ہوں اور کچھ اصول، تو اعلیٰ علم اس وقت کہیں گے جب اس کے اصول کا علم ہو، فرض کرو ایک شخص سودو سوا مراض اور ان کے نسخے رٹ لے تو کیا اس کو طبیب کہہ سکیں گے؟ نہیں! وہ طبیب نہ ہوگا، بلکہ طبیب وہ سمجھا جائے گا جو اصول طب اور اس کے نسخے واقف ہو، چاہے مراض اور نسخے رٹے نہ ہوں، اسی طرح عالم وہی ہوگا جو اصول علم سے واقف ہو، فقہ وہ نہیں جسے جزئیات فقہ یاد ہوں، علم چاہے کہیں لیکن علماء اسے فقہ نہ کہیں گے، وہ اسی کو فقہ کہیں گے جو اصول اور ماخذ پر مطلع ہو، خواہ جزئیات کم یاد ہوں، امام اعظم کے زمانہ میں توشاید اتنی جزئیات بھی نہ رہی ہوں گی، اس زمانہ میں بھی مفتیین کو بہت سی جزئیات یاد ہوتی ہیں مگر ماخذ کا علم نہیں ہوتا، اسی پرشاذ غیرہ کو قیاس کرلو، خلاصہ کلام یہ ہے کہ حقیقی علم وہ ہے کہ اس کے اصول سے آگاہی ہو، لہذا کسی چیز کا

عالم اسی وقت کہلانے لگا جب اس کے اصول سے واقف ہو۔

اب سمجھو کہ غیب کے جزئیات بھی ہیں اور کلیات بھی، تو جس طرح جزئیات طب کے جاننے والے کو عالم طب اور طبیب نہیں کہیں گے، اسی طرح جزئیات غیبیہ پر مطلع کو عالم غیب نہیں کہہ سکتے، کلیات کے علم کا مطلب یہ ہے کہ مضابطہ بتلادیا جائے کہ مثلاً فلاں مضابطہ پہچان لیں کہ فلاں جگہ فلاں وقت اتنے اونچ بارش ہوگی اور پھر اتنی ہی بارش اسی وقت میں جس کا تعین کیا گیا ہے ہو بھی جائے اس میں تخلف نہ ہو، بس جو اس مضابطہ کا علم رکھتا ہے اسے عالم غیب کہا جائے گا اور جو یہ مضابطہ نہیں جانتا اسے عالم غیب بھی نہیں کہہ سکتے۔ اب ہم کہتے ہیں دنیا میں کسی کو عالم غیب نہیں کہہ سکتے کیونکہ کسی کو بھی کلیات کو نیہ کا علم نہیں ہو سکتا صرف ایک ہی ذات ہے اور وہ اللہ کی ہے جسے کوئی ذات کا علم محیط حاصل ہے، ہاں بعض امور کا انکشاف ہو جاتا ہے مگر اسے علم نہیں کہتے، کسی طرح اگر ہم کو معلوم بھی ہو جائے کہ اس کے پیٹ میں لڑکا ہے لیکن اگر کوئی پوچھ لے کہ لڑکا کیوں ہے؟ تو یقیناً ہمارے پاس اس کا جواب کچھ نہ ہوگا، البتہ تشریح میں ہم کلیات سے جواب دے سکیں گے، تو مضابطہ اور اصول غیب کا علم کسی نبی، کسی ولی کو نہیں ہو سکتا، یہ علم اللہ کی قدرت کے ساتھ مخصوص ہے، ایک کلیہ کا علم اگر ہو تو وہ مفتاح بنا ہے بہت سی جزئیات کے علم کا، خود اللہ نے فرمایا: **وَعِنْدَ مَفَاتِحِ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَا إِلَّا هُوَ** اس سے معلوم ہوا کہ تو اللہ وضوابط غیب کا اور کوئی ذات میں کلیات غیب کا علم، بجز خدا کے اور کسی کو نہیں، ہاں بعض جزئیات کا انکشاف ہو سکتا ہے جیسے اسی آیت **وَعِنْدَ مَفَاتِحِ الْغَيْبِ** الیہ میں، اسی طرح حدیث پاک میں بھی **مَفَاتِحُ** کا لفظ آیا ہے فرمایا: **"مَفَاتِحُ الْغَيْبِ خَمْسٌ"** ہاں تشریحات کے درمیان کلیات کا علم غیب انبیاء علیہم السلام کو ہے کیونکہ اگر یہ علم انھیں نہ دیا جائے تو ان کے کلام میں فرق آجائے، البتہ وہ اسی قدرت سے ملتا اللہ اپنی حکمت کے موافق عطا فرمادے، حافظ شیرازی نے کیا اچھا شعر کہا ہے

حدیث مطرب دے گو وراز دہر کستہ جو : کہ کس کشود و کشاید حکمت ایں مترا را
خلاصہ یہ کہ حوادث دہر پر کوئی مطلع نہیں ہو سکتا، اور جزئیات کے عالم کو عالم غیب نہیں کہہ سکتے، اسی کو فرمایا: **وَلَا يَحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِنْ عِلْمِهِ** (۲۶) یعنی احاطہ نہیں ہو سکتا، **وَمَعَ كَوْمِيتِهِ** اہل حقائق نے کہا ہے کہ کرمی منظر ہے علم کا، جس طرح عرش منظر ہے رحمت کا۔ دوسری جگہ فرمایا: **عَالَمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ**، وہ غیب و شہادت (پوشیدہ اور ظاہر) کا یکساں عالم ہے، یہ بحث تو علم غیب کی تھی۔ رہا کسی علم کا کسی پر تکلف ہو جانا تو یہ دوسری بات ہے اور یہ انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کرام دونوں کو ہوتا ہے

باب ۴۹۔ حَدَّثَنَا اِبْرَاهِيْمُ بْنُ حَمْرَةَ قَالَ حَدَّثَنَا اِبْرَاهِيْمُ

ہم سے ابراہیم ابن حمزہ نے بیان کیا، کہا ہم سے ابراہیم ابن سعد نے بیان کیا

البتہ ان دونوں کثوف میں فرق ہوتا ہے اور وہ فرق وہی ہے جس کو سورہ جن میں بیان فرمایا گیا: عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلَى غَيْبِهِ أَحَدًا إِلَّا مَنِ ارْتَضَىٰ مِنْ رَسُولٍ فَإِنَّهُ يَسْلُكُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ رَصَدًا ۚ یعنی وہ عالم غیب ہے اور غیب پر کسی کو عادی اور مسلط نہیں کرتا، ہاں انبیاء و رسل کو مقرریت میں اور توفیقات میں سے جسے چاہے مطلع کر دیتا ہے۔ اس حصہ سے مراد یہ ہے کہ اس طرح کسی کو غیب پر مسلط کر دے کہ بالکل بغیر میں ہو جائے اور کوئی چیز اس میں غلطی نہ ہو سکے، نہ نفس کو کچھ دخل ہو، نہ شیطان کو، نہ کسی تم کے شک و شبہ کو، غرض یہ کہ ہر شے سے محفوظ ہو، و مخصوص بالانبیاء کہیں ہے۔ ۴۹۔ فَاتَّخَذَ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ رَصَدًا ۚ اس لئے کہ اس کے آگے پیچھے ہرے دار ہوتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ نبی کو جو کشف ہوتا ہے یا وحی آتی ہے اس کے ساتھ پہلے دار ہوتے ہیں اس لئے اس میں غلطی کا احتمال نہیں ہوتا، بخلاف کشف دل کے کہ اس میں غلطی کا احتمال بھی ہے اور شبہ کی گنجائش بھی، اس لئے دونوں یکساں نہیں ہو سکتے۔ اب دونوں ہوئے۔ نبی کا علم قطعی، دلی کا نفی، ہاں اللہ کی ذمہ داری ہے اور یہاں نہیں اور یہ جزئیات علم ہیں، کلیات کا علم خاص بالادب ہے انہیں کو مفاتیح الغیب کہا گیا ہے، یہ علوم نہ نبی کو حاصل ہیں، نہ ولی کو، انہیں جو کچھ حاصل ہے خواہ کتنا کثیر ہو بجزئیات ہیں، اس لئے عالم الغیب نہیں کہہ سکتے۔ رہا اہل نجوم کو کچھ علم ہونا اور پیشین گوئیاں وغیرہ کرنا یا کسوف و خسوف کے متعلق کچھ بتانا تو یہ دراصل علم غیب نہیں ہے کیونکہ علم غیب وہ ہے جو عقل کے ذریعہ حاصل نہ ہو سکے، اور یہ اہل نجوم جو کچھ کہتے ہیں یہ حسابی چیزیں ہیں جنہیں ہر وہ شخص حاصل کر سکتا ہے جو اس فن کو عقل کے ذریعہ سیکھ لے، اور اس میں غلطی کا بھی ہمیشہ احتمال رہتا ہے، حساب صحیح ہو تو نتیجہ صحیح نکل آیا، حساب غلط ہو گیا تو نتیجہ غلط نکل آیا، کتنی پیشین گوئیاں غلط ہوتی رہتی ہیں مگر انبیاء علیہم السلام کے ہاں غلطی کا احتمال نہیں۔

باب ۳۸

یہ باب بغیر ترجمہ کے ہے اور اس قسم کا جواب آتا ہے وہ پہلے باب کے لئے مثل فصل اور تہ کے ہوتے ہیں، گذشتہ باب میں دین، اسلام، ایمان، احسان سب کا ایک دوسرے پر صادق آنا معلوم ہوا تو اب اس کی تکمیل کرتے ہیں کہ جب ایمان مجموعہ کا نام ہے [اور اس مجموعہ میں کئی شے ہوتی ہے] تو اس میں بھی کئی شے ہوگی، ہر قول کی حدیث میں لفظ یزید دن "دال علی اللہ تعالیٰ ہے، لہذا یہ تکلم ہے، میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ بخلاف تشبیہ الافان علیٰ کعبی ترجمہ ترک کر دیتے ہیں تاکہ امتحان و اقتدار جمع ہو جائے، لہذا جب ہمیں اجازت ملی کہ ہم ربط قائم کریں تو ہماری سمجھ میں یہ آتا ہے اور جس کو پہلے ثابت بھی کر چکے ہیں کہ ایمان، اسلام، کفر، فتنان، احسان وغیرہ میں مراتب ہیں اور اب یہاں کہنا چاہتے ہیں کہ یہ مراتب کا تفاوت دو طرح ہوتا ہے، کیفاً و کماً، کیفاً اس طرح کہ انفرادی و انجلاویں کی زیادتی ہوتی ہے، اور کماً اس طرح کہ تعداد میں کمی بیشی ہوتی ہے

بْنُ سَعْدٍ عَنْ صَالِحٍ عَنْ ابْنِ شَهَابٍ عَنْ عُبَيْدِ اللَّهِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ أَنَّ عَبْدَ اللَّهِ
 انہوں نے صالح ابن کیسان سے ، انہوں نے ابن شہاب سے ، انہوں نے عبید اللہ ابن عبد اللہ سے ، ان کو عبد اللہ ابن عباس
 بْنُ عَبَّاسٍ أَخْبَرَهُ قَالَ أَخْبَرَنِي أَبُو سَفْيَانَ ابْنُ حَرْبٍ أَنَّ هِرَقْلَ قَالَ سَأَلْتُكَ هَلْ
 نے خبر دی ، ان کو ابو سفیان بن حرب نے کہ ہرقل (شاہ روم) نے ان سے کہا میں نے تجھ سے پوچھا کہ اس ہنبر کے
 يَزِيدُ وَنَ أَمْ يَقْصُونَ فَرَعَمَتْ أَنَّهُمْ يَزِيدُونَ وَكَذَلِكَ الْإِيمَانُ حَتَّى يَتَمَّ وَسَلَّكَ
 آجہاد اور بڑھ رہے ہیں یا گھٹ رہے ہیں ؟ تو نے کہا بڑھ رہے ہیں اور ایمان کا بھی حال رہتا ہے یہاں تک کہ وہ پورا ہو ۔
 هَلْ يَرْتَدُّ أَحَدٌ سَخَطَةً لِدِينِهِ بَعْدَ أَنْ يَدْخُلَ فِيهِ فَرَعَمَتْ أَنْ لَا ، وَكَذَلِكَ الْإِيمَانُ
 (اپنے زور کو پہونچ جائے) اور میں نے تم سے پوچھا کہ کوئی اس کے دین میں آکر پھر اس کو برا سمجھ کر پھر جاتا ہے ؟ تو نے کہا
 حِينَ تَخْلُطُ بِشَاشَتِهِ الْقُلُوبَ لَا يَسْخَطُ أَحَدٌ
 نہیں ! اور ایمان کا بھی حال ہے ، جب اس کی خوشی دل میں سما جاتی ہے تو پھر کوئی اس کو برا نہیں سمجھتا ۔

یہاں حدیث ہرقل میں دونوں باتیں سچ ہیں ۔

حدیث ۴۹۔ پہلے اس نے سوال کیا کہ تعداد میں زیادہ ہو رہے ہیں یا کم ؟ جب جواب ملا کہ زیادہ ہو رہے ہیں تو قیصر نے
 کہا : كَذَلِكَ الْإِيمَانُ حَتَّى يَتَمَّ اس تمام سے کیا مراد ہے ؟ یہی تو ہے کہ مومنین کی کثرت ہوگی ، آگے دوسرا سوال ہے ۔ ہل يرتد احد
 جواب لا نہیں ! مگر کوئی نہیں ہوتا ، تو قیصر نے کہا : كَذَلِكَ الْإِيمَانُ آخر یعنی جب دل میں ، رگ و پے میں پیوست ہو جائے اور ریح بس
 جائے تو پھر قدم نہیں ہٹتا ، تو یہاں کیفیت ایمان اور روشنی و انجلا کا ذکر ہے اور وہاں تعداد میں زیادہ و نقصان تھا ۔ تو کی بیشی کبھی نفس کی کیفیت
 ایمان میں ہوتی ہے اور کبھی تعداد میں ۔

ایک دوسری چیز اور ہے کہ سوال میں سَخَطَةً لِدِينِهِ ہے اور اس کے جواب میں كَذَلِكَ الْإِيمَانُ ہے ، معلوم ہوا
 کہ دین و ایمان دونوں ایک ہی ہیں ، حدیث فضل گذر چکی ۔

باب فضل من استبرأ لدينه

ترجمہ کا مطلب یہ ہے کہ جو امتیاد کرے دین کے معاملہ میں ۔ استبرأ : بارت چاہنا ، تقویٰ یہی ہے کہ شبہ کی چیز سے بھی
 بچا جائے ، چونکہ [حدیث میں] استبرأ لدينه آگیا ہے [اور دین و ایمان ایک ہے] اس لئے بخاری نے [اس کے لئے بھی كَذَلِكَ الْإِيمَانُ
 میں ایک ترجمہ رکھ دیا] نیز یہ بھی مراد معلوم ہوتی ہے کہ مثل ایمان و اسلام کے مراتب کے درجے کے بھی مراتب ہیں ، تقویٰ کے معنی ہیں اللہ سے

باب ۳۹ فُضِّلَ مَنْ اسْتَبْرَأَ لِدِينِهِ

جو شخص اپنا دین قائم رکھنے کے لئے (گناہ سے) بچے اس کی فضیلت

۵۔ حَدَّثَنَا أَبُو عِيسَى حَدَّثَنَا زَكَرِيَّا عَنْ عَامِرٍ قَالَ سَمِعْتُ الثَّعْمَانَ ابْنَ

ہم سے ابو نعیم نے بیان کیا کہا ہم سے زکریا نے بیان کیا، انھوں نے عامر سے کہا میں نے ثعمان ابن بشیر سے

بَشِيرٍ يَقُولُ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: الْحَلَالُ بَيْنُ
منا، وہ کہتے تھے میں نے آنحضرتؐ سے سنا آپ فرماتے تھے: حلال کھلا ہوا ہے اور حرام کھلا ہوا ہے، اور ان دونوں کے

وَالْحَرَامُ بَيْنُ وَبَيْنَهُمَا مُشْتَبِهَاتٌ لَا يَعْلَمُهَا كَثِيرٌ مِنَ النَّاسِ .

بچ میں بعض چیزیں شبہ کی ہیں جن کو بہت لوگ نہیں جانتے (کہ حلال ہیں یا حرام)

ڈر کر کھ جانا، اس کا پہلا درجہ یہ ہے کہ آدمی شرک سے بچے، دوسرا یہ کہ کبار سے بچے، تیسرا یہ کہ صغار سے بچے، چوتھا درجہ یہ ہے کہ شبہات سے
بچے، یہ اعلیٰ درجہ ہے، اس سے مجھ اعلیٰ ایک اور درجہ ہے جو حاجت نرمی کی ایک حدیث میں بیان کیا گیا ہے، لَا يَبْلُغُ الْعَبْدُ
حقیقۃ التقویٰ حتی یدفع ما لا بأس بہ حدًا مِمَّا یُشَبِّهُهٗ بِاسٍ یعنی کوئی شخص اس وقت تک متقی نہیں ہو سکتا جب تک کہ بعض
مباح کو بھی ترک نہ کرے، اس ڈر سے کہ کہیں حرام میں نہ پڑ جائے اور یہ منفی الی احرام نہ ہو جائے۔ تو تقویٰ کے بھی مراتب نکل آئے،

قَوْلُ الْحَلَالِ بَيْنَ وَالْحَرَامِ بَيْنَ الْخَبَرِ حَرَامٌ وَمَحَالٌ وَاضِعٌ اور صاف ہیں، روٹی کھانا، پانی پینا وغیرہ محال ہیں بلاشبہ
اور غرض لم غزیر بلا شک حرام ہیں۔ ان دونوں کے درمیان مشتبہات ہیں۔ اس لفظ کے مختلف نسخے ہیں، ایک "مشتبہات" تفسیری باب

تفصیل سے، دوسرا "مشتبہات" اشتباہ باب افعال سے، سند داری کی ایک روایت میں "مشتبہات" تشریح باب تفاعل سے
آیا ہے، تینوں کے معنی اقرب اقرب ہیں۔ "مشتبہات": جو چیزیں مٹیں کر دی گئی ہوں قَالَ تَعَالَى: وَمَا مَلَكَهٖ وَمَا صَلَبُوهٗ
وَلَكِنْ شَبَّهَ لَهُمْ^(۱) (سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی نزالت میں یہودیوں کی گواہی کا جواب دیا گیا ہے کہ انھوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو
قتل کیا اور نہ سولی دی لیکن شبہ میں ڈال دیا گیا انکو^(۲)) اور اشتباہ شبہ ہونے کو کہتے ہیں، اور مشتباہ کے معنی ہیں دو چیزوں کا ہر شکل

ہونا، حاصل ایک ہی ہے، شبہ جب لگے گا جب امتیاز نہ ہو سکے اور دھوکہ لگ جائے۔ اس میں علماء نے کلام کیا ہے کہ شبہ میں پڑ جانا کس وجہ
سے ہوتا ہے اور اس کا مصداق کیا ہے، حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں چار پانچ قول نقل کئے ہیں، ان میں سے مثنیٰ بات زیادہ قابل قبول

میں اسی کو نقل کرتا ہوں، اصل یہ ہے کہ اشتباہ پیدا ہوتا ہے تو اس کا نشانہ کبھی قاضی اولہ ہوتا ہے، مثلاً ایک حدیث سے کوئی شے حلال اور دوسری سے وہی حرام معلوم ہوتی ہو تو اب کیا کہیں گے؟ حلال یا حرام؟ اس وقت مجتہد کا کام یہ ہے کہ نہ حلال کہیں نہ حرام، مگر ایسا کم ہوتا ہے اور تمام مجتہدین کو یہ صورت پیش نہیں آتی، اس لئے فرمایا (لَا يَحِلُّ لِكَثِيرٍ مِنَ النَّاسِ) جن کو بہت سے لوگ نہیں جانتے، یہ نہیں کہا کہ کوئی نہیں جانتا۔

اور کبھی اشتباہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب ایک مجتہد فیصلہ کر دیتا ہے کہ حلال ہے اور دوسرا کہتا ہے کہ حرام ہے اور ان میں سے کسی کو شبہ نہیں ہوتا، ایسی صورت میں ہم کیا کریں؟ ظاہر ہے کہ ایسے وقت میں ہمیں اختلاف سے بچنا چاہئے، بشرطیکہ اختلاف واقع ہو اور اس صورت میں ایسی چیز کو ہمیں ترک کر دینا چاہئے اسے اگر کر لیں تو اس کے کرنے سے وقوع فی الحرام ہوگا، لہذا اسے چھوڑ دینا چاہئے اور اگر حلال ہے تو اس کے نہ کرنے سے کوئی نقصان نہیں اس لئے اسے بھی چھوڑ دینا چاہئے ایک تیسری شکل بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ اختلاف نہ تو علماء میں ہے، نہ اولہ میں بلکہ تحقیق مناط میں اشتباہ ہو جائے یعنی یہ معلوم نہ ہو سکے کہ کس چیز کو کس حیثیت سے اس جزی میں داخل کریں جیسے دارالحرب اور دارالاسلام ہونے کے بارے میں اختلاف ہو، یا مثلاً یہ مسئلہ آیا کہ کسی نے کسی کی جب کاٹی اور مال لے گیا تو اسے سارق قرار دیں گے یا نہیں؟ یعنی کہ اس پر سرقہ کی تعریف صادق آئے گی یا نہیں؟ اسی کو تحقیق مناط کہتے ہیں^(۱)۔ کوئی تحقیق مناط میں اختلاف ہو جاتا ہے، معلوم ہوا کہ جب شے مشتبہ بن جاتی ہے۔

ایک اور چیز بھی ہے اور وہ یہ کہ شریعت نے اسے درمیان میں رکھا ہے، نہ حلال صریح کہا، نہ حرام صریح، اصطلاح فقہاء میں جسے مکروہ کہتے ہیں، تو اس مکروہ پر بھی شبہ کا اطلاق ہو سکتا ہے، کیونکہ یہ ذوالشبهة ہیں، من وجہ حلال، من وجہ حرام۔ اب میں سب کو جمع کر رہا ہوں، ان تین کے اعتبار سے تین لفظ مناسب ہیں۔ جب اولہ میں تعارض ہو تو مشتبہ کا لفظ درست ہے کیونکہ دلیل نے شبہ میں ڈال دیا۔ اور جب مجتہدین میں اختلاف ہو تو لفظ مشتبہات مناسب ہے کیونکہ اب ہم شبہ میں پڑ جاتے ہیں، اولہ شبہہ نہیں ڈالتے۔ اور تیسری چیز یعنی مکروہ میں مشتبہ کا لفظ مناسب کیونکہ یہ ذوالشبهة ہیں، نہ پورا حرام نہ پورا حلال۔

زین الدین ابن النیر کے شیوخ طریقت میں سے ایک بزرگ شیخ ابوالعاسم قبازی ہیں، یہ طریقت کے امام اور عارف تھے، ابن النیر نے ان کے مناقب میں ایک کتاب لکھی ہے، اس کتاب میں یہ حدیث بھی آئی ہے، تو اس کے متعلق ابن النیر نے اپنے شیخ کا مقولہ نقل کیا ہے کہ وہ کہتے تھے کہ ”وما بینہما مشتبہات“ سے مراد یہاں کہتا ہے کیونکہ وہ ذوالشبهة ہیں۔ گویا شریعت نے خود تین مرتبے رکھے ہیں اور پہلے

(۱) مفرد نفع المصنف میں ہے کہ اصولیین کے نزدیک تحقیق مناط یہ ہے کہ کسی وصف کے علت مکمل ہونے پر تو اتفاق ہو مگر کسی جزئی میں اس علت کا وجود غرضی ہو اور اجتہاد کرنا پڑے کہ وہ موجود ہے یا نہیں، اسی کو تحقیق مناط کہتے ہیں جیسے کہ ناش پسان کی تعریف صادق آتی ہے یا نہیں؟ (ترجمہ)

فَمِنْ أَتَى الْمُسْتَبْهَاتِ اسْتَبْرَأَ لِدِينِهِ وَعِرْضِهِ وَمَنْ وَقَعَ فِي الشُّبُهَاتِ كَرَّاجٌ
 پھر جو کسی شبہ کی چیزوں سے بچا اس نے اپنے دین اور عزت کو بچالیا اور جو کوئی ان شبہ کی چیزوں میں پڑ گیا اس کی مثال
 يَرْعَى حَوْلَ الْحَيِّ يُوشِكُ أَنْ يَوَاقِعَهُ الْآوَانُ لِكُلِّ مَلِكٍ حِمًى إِلَّا إِنْ حَمَى اللَّهُ
 اس پر وہ ہے کہ کسی ہے جو (شاہی) رنہ کے پاس (اپنے باندوں کو) چرائے وہ قریب ہے کہ رنہ کے اندھن سے جائے، سن لو ہر
 فِي أَرْضِهِ فَحَارَمُهُ الْآوَانُ فِي الْجَسَدِ مُضْغَةً إِذَا صَلَحَ الْجَسَدُ
 بادشاہ کا ایک رنہ ہوتا ہے، سن لو اللہ کا رنہ اس کی زمین میں حرام چیزیں ہیں، سن لو بدن میں ایک (گوشت کا) ٹوٹتا ہے،
 كُلُّهُ وَإِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ الْآوَانُ هِيَ الْقَلْبُ
 جب وہ درست ہوگا سارا بدن درست ہوگا اور جہاں وہ بگڑا سارا بدن بگڑ گیا، سن لو وہ ٹوٹتا (آوی کا) ٹپا ہے۔

دوسروں میں صرف دو حصے تھے، میسر ہمارے طائل کے اشتباہ سے پیدا ہو گیا تھا اتواب مشبہات سے بچنے کا مطلب یہ ہوا کہ جو کچھ سے بچا، تو
 استبرأ لِدِينِهِ وَعِرْضِهِ (اپنے دین اور عرض کے لئے استبرأ کیا) اس کی تائید صحیح ابن حبان کی حدیث سے ہوتی ہے جسے حافظ ابن حجر
 نے نقل کیا ہے اور کہہ ہے کہ سند مسلم کی ہے اگرچہ متن مسلم کا نہیں، اس کے الفاظ یہ ہیں: اجعلوا بینکم وبين الحرام مستورة من
 الحلال (۱) یعنی ایک ربدک حلال کی قائم کرو، مطلب یہ کہ اگر سارے طلال کا سوں کو کر لیا کرے تو بیچ میں سترہ نہیں رہتا، آگے فرماتے ہیں:
 من فعل ذلك فقد استبرأ لِدِينِهِ وَعِرْضِهِ اس سے معلوم ہوا کہ حلال چیزوں کو بھی چھوڑ دینا چاہئے، قباری فرماتے ہیں کہ
 بندہ اور حرام کے درمیان کمرہ ایک عقبہ (گھاٹی) ہے، جو طلال سے چل کر اس گھاٹی میں آئے گا تو حرام میں جا پڑے گا، پھر کہتے ہیں کہ
 مباح ایک عقبہ ہے بند سے اور کمرہ کے درمیان، یعنی اگر سارے طلال کو اختیار کرے گا تو اندیشہ ہے کہ کہیں کمرہ کی گھاٹی میں نہ پہنچ
 جائے، معلوم ہوا کہ حلال کی بھی ایک حد ہے اور کمرہ کی بھی ایک حد ہے۔ اب ابن حبان کی حدیث ”حلال کو سترہ بناؤ“ کا مطلب
 واضح ہو گیا۔

قولہ استبرأ لِدِينِهِ وَعِرْضِهِ اس نے اپنے دین اور آبرو کو بچالیا، دین کو بچایا تو یوں ہوا کہ حرام کا ترک نہ ہوا اور
 آبرو کی حفاظت یوں ہوئی کہ شبہ کام نہ کرنے کی وجہ سے لوگوں کے طعن اور ان کی انگشت نامی سے محفوظ رہا۔ فرض کیجئے کہ ایک شخص کسی
 عجمی عورت کے ساتھ ہو تو کو خیال فاسد نہ ہو مگر لوگ طعن کریں گے اور آبرو پر حرف لگے گا۔

رسمی اس جگہ کو کہتے ہیں جسے بادشاہ اپنے خاص حواشی کے لئے گھیر لیتے تھے، کوئی دوسرا شخص اس میں نہیں بڑا سکتا تھا۔
اہم شافی کے یہاں یہ مسئلہ ہے "اور خلفائے راشدین سے ثابت ہے کہ رقبہ میں پھاؤنی تھی اور حلی بنائی گئی تھی جن میں تیس ہزار گھوڑے
رہتے تھے۔ اور اب باڑہ بنا دیتے ہیں یا تار و نیزہ لگا دیتے ہیں، ظاہر ہے کہ جو کوئی باڑہ پر اپنے جانور چرائے گا تو بہت ممکن ہے کہ غفلت
میں جانور اندر گھس جائے تو یقیناً اس کی سناٹے لگی، اسی لئے فرمایا کہ قریب بھی مت جاؤ تاکہ محفوظ رہو۔ اسی طرح فرماتے ہیں کہ اللہ کے
عمرات کی بھی مہربندی ہے، اس کے قریب جو کوئی چرائے گا تو اندیشہ ہے کہ سحلی میں بڑ جائے گا اور وہ چیزیں مشتبہات ہیں، تو حرام
تھی ہیں اور قریب کی چیزیں مشتبہات ہیں۔ یہ نہایت بہترین تشبیہ ہے۔

قَوْلُ اتِّقِ الْجَسَدَ مُضْغَةً، یہ مزید فائدہ بتلاتے ہیں اور ایک ایسی حقیقت پر مطلع کرتے ہیں کہ اگر کوئی اس پر عمل ہو تو
مشتبہات سے بچ سکتا ہے۔ حقیقت تقویٰ بیان کرتے ہیں کہ جب تک اللہ کے در سے دل متاثر ہو اس وقت تک کچھ فائدہ نہیں ہوتا،
یہ مضغہ (قلب) اگر ٹھیک ہے تو سارا جسم ٹھیک ہے اور اگر وہ فاسد ہے تو جسم بھی فاسد۔ یہ تو روحانی حیثیت سے فرما رہے ہیں ایسے
لقبی حیثیت سے بھی حیات متوفیوں ہے حرکت قلب پر، حرکت قلب بند ہوتے ہی حیات ختم ہو جاتی ہے، یہاں مراد نبی علیہ السلام یہ ہے کہ
دل میں تقویٰ و خوف، خشیت الہی موجود ہے تو وہ مشتبہات سے بچ جائے گا ورنہ اگر دل ہی کی مشین خراب ہے تو پھر مشتبہات سے کیا بچ
سکتا ہے، اس لئے فرماتے ہیں کہ مشین درست کرو تو سب کام درست ہو جائے گا۔

فائدہ : علامہ ابن قیم نے کتاب الروح میں ایک مفید بحث کی ہے، اس کا ایک حصہ سننا ہوں، انھیں نے کہا ہے
کہ نفس اور روح ایک ہی چیز ہے مگر کچھ افعال کا فرق ہے، بعض افعال کے اعتبار سے روح اور بعض افعال کے لحاظ سے اسی کو نفس کہتے ہیں
کیونکہ اس میں نفاس ہوتے ہیں، یا سانس جو کہ منظر حیات ہے اس لئے نفس کہتے ہیں، یا یہ کہ حیات کے لحاظ سے روح ہے اور موت کے
اعتبار سے نفس کہتے ہیں۔

راقب تو وہ اس جسم منوہری کا نام نہیں ہے بلکہ وہ ایک لطیفہ ہے جو اس جسم کے اندر ہے جیسے کہ دماغ میں تمام حواس
ہوتے ہیں، علاوہ کہ جسم میں وہ نظر نہیں آتے، حکماء نے دماغ کے حصے کر کے بتلادیا کہ دماغ کے اس حصہ میں حس مشترک ہے، یہاں خیال
ہے، یہاں حافظہ ہے اور یہاں وہم، لیکن ظاہر میں محض جسم ہی ہے۔ اسی طرح قلب کا معاملہ ہے کہ وہ تمام جسم کا بادشاہ ہے، اسی کے

باب اَدَاءُ الْخُمْسِ مِنَ الْإِيمَانِ

لوگ کے مال میں سے پانچواں حصہ دینا ایمان میں داخل ہے۔

۵۔ حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ الْجَعْدِ قَالَ أَخْبَرَنَا شُعْبَةُ عَنْ أَبِي جَمْرَةَ تَالِ

ہم سے بیان کیا علی بن جعد نے کہا ہم کو خبری شعبہ نے انھوں نے ابو جمرہ سے کہا میں ابن عباس

كُنْتُ أَعْدُدُ مَعَ ابْنِ عَبَّاسٍ فَيَجْلِسُنِي عَلَى سِرِّيهِ فَقَالَ أَقِمْ عِنْدِي حَتَّى أَجْعَلَ

کے ساتھ بٹھا کرتا تھا وہ مجھ کو خاص اپنے تخت پر بٹھاتے ایک بار کہنے لگے تو میرے پاس رو جائیں اسے مال میں تراصد

لَكَ سَهْمًا مِنْ مَالِي فَأَقِمْتُ مَعَهُ شَهْرَيْنِ ثُمَّ قَالَ إِنَّ وَفْدَ عَبْدِ الْقَيْسِ لَمَّا

لگا دوں گا تو میں دو مہینہ تک ان کے پاس رہا پھر کہنے لگے عبد القیس کے بھیجے ہوئے لوگ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

أَوَّالِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مِنَ الْقَوْمِ أَوْ مِنَ الْوَفْدِ قَالُوا رَبِيعَةُ

کے پاس آئے تو آپ نے فرمایا یہ کون لوگ ہیں یا کون بھیجے ہوئے ہیں انھوں نے کہا ربیع کے لوگ ہیں

قَالَ مَرْحَبًا بِالْقَوْمِ أَوْ بِالْوَفْدِ غَيْرُ خَزَايَا وَلَا نَدَايَ فَقَالُوا يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنَّا

آپ نے فرمایا مرحباً ان لوگوں کو یا ان بھیجے ہوئے لوگوں کو نہ ذلیل ہوئے نہ شرمندہ وہ کہنے لگے یا رسول اللہ ہم

لَا نَسْتَطِيعُ أَنْ نَأْتِيَكَ إِلَّا فِي الشَّهْرِ الْحَرَامِ بَيْنَنَا وَبَيْنَكَ هَذَا الْحَيَّ مِنْ

آپ کے پاس نہیں آسکتے لیکن اب والے مہینہ میں کیونکہ ہمارے اور آپ کے درمیان کفار مضر کا

كُفَّارٍ مُضَرٍّ

قید ہے

علم سے سارے جسم کے سارے کام انجام پاتے ہیں، وہی عقل کا عمل بھی ہے۔

امام شافعیؒ کے نزدیک عقل ایک قوت اور ایک کا نام ہے، اس میں اختلاف ہے کہ اس کا عمل کیا ہے، امام شافعیؒ قلب کو عقل

قرار دیتے ہیں، میکہ میں نے بھی بیان کیا، قرآن کریم سے بھی اسی کی تائید نکلتی ہے، فرمایا گیا: اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرًا لِّمَنْ كَانَ لَهُ

قَلْبٌ اَوْ اَلْفَا السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيدٌ ۚ وَلَئِنْ دُرِّسْتُمْ بَعْدَ فَرَايَا : اَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْاَرْضِ فَتَكُوْنُ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَعْقِلُوْنَ بِهَا (۲) ، دونوں

فَمَرْزَا بِأَمْرِ فَصْلٍ تُخْبِرُهُ مِنْ وِرَاءِ نَاوَنْدُخُلٍ بِهِ الْجَنَّةَ وَسَأَلُوهُ عَنْ
 تَوَهُمٍ كَوَ خَاصَّةٍ بِأَمْرِ فَصْلٍ تُخْبِرُهُ مِنْ وِرَاءِ نَاوَنْدُخُلٍ بِهِ الْجَنَّةَ وَسَأَلُوهُ عَنْ
 الْأَشْرَبَةِ فَأَمَرَهُمْ بِأَرْبَعٍ وَنَهَاهُمْ عَنْ أَرْبَعٍ ، أَمَرَهُمْ بِالْإِيمَانِ بِاللَّهِ وَحَدِّهِ
 بہشت میں جائیں ، اور انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے باسنوں کو بھی پوچھا ، آپ نے چار باتوں کا ان کو حکم دیا اور چار
 باتوں سے منع کیا ، ان کو یہ حکم دیا کہ اکیلے (پتے) خدا پر ایمان لاؤ

آیتوں سے عقل کا محل قلب معلوم ہوتا ہے، حکما کہتے ہیں کہ قفل دماغ میں ہے نہ کہ قلب میں، ہاں اخلاق و شیک قلب سے متعلق ہیں، یہی
 امام صاحب سے منقول ہے، کہاں تک صحیح ہے واللہ اعلم۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اصل منہج قلب ہے لیکن چونکہ قلب دو دماغ کا قریبی اتصال ہے اس لئے پتہ نہیں چلتا، اس کی
 مثال بجلی کے بٹن کی سی ہے کہ بٹن دیا اور روشنی ہو گئی، ایسے ہی بٹن تو قلب ہے اور دماغ میں اس کی تیلیں ہیں، اس تقریر پر قرآن میں
 بھی تاویل کی ضرورت نہیں ہوتی اور حکما کا اختلاف بھی نہیں ہوتا، فن تشریح میں ثابت کیا ہے کہ ادراکات کا تعلق دماغ سے ہے تو شاہ صاحب
 فرماتے ہیں کہ جنبش قلب میں ہوتی ہے اور تصور دماغ میں بنتی ہے اور چونکہ قریبی اتصال ہے اس لئے پتہ نہیں چلتا جیسے بٹن کے دبانے
 اور روشنی کے ہونے میں کچھ فرق نہیں معلوم ہوتا، غرض اصل قلب ہی ثابت ہوا اور اسی کی صلاح پر تمام بدن کا صلاح اور اسی کے نگار پر
 تمام بدن کا نگار ہوتا ہے، اس لئے نون کا کام یہ ہے کہ وہ اس کی فکر پوری طرح کرے تو عوام سے بچ جائے گا اور تقویٰ بھی حاصل ہوگا۔

بَابُ اِدَاءِ الْخُمْسِ مِنَ الْاِيْمَانِ

حدیث ۵۱۔ ابو جرحہ تابعی ہیں، ان کا نام نصر بن عمران ہے جو قبیلہ ضبیعہ سے ہیں، ضبیعہ عبدالقیس کی ایک شاخ ہو
 اور اسی وجہ سے غالباً ابن عباس رضی اللہ عنہ نے ان کی قوم کے متعلق حدیث سنائی۔

قَوْلُهُ قَالَ كُنْتُ اَقْعُدُ مَعَ ابْنِ عَبَّاسٍ يُجَلِّسُنِي عَلٰی سِرِّيٍّ فَقَالَ اَقْعُدْنِي اَيُّ بَعْضِ يَوْمٍ فِي اَبَدٍ كَذَا ذَكَرَ
 تحت پر بٹھانے اور کچھ دینے کا وعدہ کرنے میں یہ مکت تھی کہ یہ ترجمان تھے افادہ فہمی زبان جانتے تھے، یہ بصرہ میں بہتے تھے اور بصرہ چونکہ ایران
 سے متصل ہے اس لئے یہ فارسی داں بھی تھے اور ابن عباس رضی اللہ عنہ کو فارسی نہیں آتی تھی اس لئے ان کو اپنے پاس بٹھاتے تھے مگر ترجمانی
 کر سکیں اور اسی خدمت کی ابن عباس انھیں اجرت دیتے تھے۔ اس سے یہ مسئلہ بھی نکلا کہ اجرت علی التعلیم جائز ہے، حالانکہ یہ غلط ہے
 حقیقت یہ تھی کہ ایک موقع پر ابن عباس ان سے کسی بات پر بہت خوش ہوئے تھے، اس وقت اس خوشی میں دینے کو کہا تھا —
 واقعہ یہ تھا کہ ابو جرحہ حج کو جا رہے تھے، انھوں نے تسبیح کا حرم باندھا، بعض لوگوں نے اعتراض کیا تو انھوں نے ابن عباس سے مسئلہ

پوچھا، 'ان کا مسلک خود تیس کا تھا اس لئے ان کو بھی بتایا اور وہ مطمئن ہو کر تیس کے احرام سے رندانہ ہو گئے، ایک دن انھوں نے خواب میں دیکھا کہ کوئی کہہ رہا ہے اسے ابو جبرہ، تیراج و عروہ مقبول ہو گیا، انھوں نے لوٹ کر یہ خواب ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بیان کیا تو ابن عباس رضی اللہ عنہ کو اس بہت خوشی ہوئی اور اپنے مسلک کی صحت کا یقین بڑھ گیا، اس خوشی میں انھوں نے دینے کا وعدہ کیا تھا — اس سے واضح ہو گیا کہ تعلیم کی اجرت نہ تھی — غرض یہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کے پاس ٹھہر گئے، ایک دن ایک بوڑھی عورت نے بنید کا مسئلہ پوچھا، ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اس کا جواب دیا تو ابو جبرہ کو یہ سوال و جواب سن کر خیال آیا کہ میں بھی جبرہ میں بنید بناتا ہوں اور گواہوں میں سکر نہیں ہوا مگر کسی مجلس میں دیر تک بیٹھنے سے ہلکی ہلکی باتوں کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے، انھوں نے اپنا یہ خیال ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ظاہر کیا، اس پر ابن عباس رضی اللہ عنہ نے وفد عبدالقیس کی یہ حدیث سنائی (یہ قبیلہ عبدالقیس بحرین میں آباد تھا اور دریمان میں قبیلہ مضر اور دوسرے قبیلے آباد تھے جن سے ان کی جنگ رہتی تھی عام اوقات میں حاضری کا موقع نہ تھا، صرف شہر حرم میں آ سکتے تھے، بحرین میں اسلام منقذ ابن حیان کی معزیت پہنچا، منقذ کھڑے کی تجارت کرتے تھے، مدینہ تک ان کا کاروبار پھیلا ہوا تھا) ایک مرتبہ کہیں بیٹھ ہوئے تھے کہ اسی دوران [نبی علیہ السلام ان کے پاس سے گذرے، منقذ ان کو دیکھ کر کھڑے ہو گئے، تو آپ نے ان کے اور ان کی قوم کے حالات دریافت فرمائے اور بحرین کے رؤساء کے حالات ان کے نام لے کر پوچھے، اس سے منقذ بہت متاثر ہوئے اور مسلمان ہو گئے، مگر اپنے وطن پہنچ کر اپنا اسلام ظاہر نہیں کیا، نماز خفیہ گھر میں پڑھ لیتے تھے، نبوی کو اس چیز سے شبہ ہوا، انھوں نے اپنے باپ منذر ابن نائذ لقب بہ اشج سے تذکرہ کیا کہ اب کی جب یہ مدینہ سے آئے ہیں ان اوقات میں ہاتھ منہ پیر دھوتے ہیں اور قبضہ رو ہو کر کبھی جھکتے ہیں کبھی سر زمین پر رکھتے ہیں، خسر نے رانا کو پوچھا کہ تم یہ کیا نئی بات کرتے ہو؟ تو انھوں نے سب اجزا کہہ سنایا اور یہ بھی کہہ دیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تمہارا حال بھی پوچھتے تھے، یس کر یہ بھی مسلمان ہو گئے، اب منقذ و منذر دونوں نے تبلیغ شروع کی اور سترہ میں بارہ اشخاص کا وفد حاضر خدمت ہوا اور سترہ میں چالیس آدمیوں کا یہ وفد آیا جس کو حضور نے مرجا کہا (۱۱)

قرآن قال مرحبا بالقوم ابدالوفد غالب گمان یہ ہے کہ شک کرنے والے شعبہ ہیں، لہذا قال المحافظ، یہ عبدالقیس ایک بڑے قبیلہ ربیعہ کی ایک شاخ ہے، دراصل ربیعہ، مضر، انمار، ایاد چار بجائی تھے، باپ نے میراث میں ایک ایک چیز جاردوں کو تقسیم کی تھی، ربیعہ کو خیل (گھوڑے) دئے تھے، اس لئے انھیں ربیعۃ الخیل کہتے ہیں، مضر کو سونا دیا تھا اس لئے

قَالَ اتَدْرُونَ مَا الْإِيمَانُ بِاللّٰهِ وَحَدَّاهُ ۚ قَالُوا اللّٰهُ وَرَسُولُهُ أَعْلَمُ قَالَ شَهَادَةُ
 آپ نے فرمایا تم جانتے ہو اکیلے (پچھلے پر ایمان لانا کیا ہے ؟ انہوں نے کہا) ہم کیا جانیں اللہ اور اس کا رسول خوب جانتا ہے آپ نے فرمایا
 اَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللَّهِ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ وَصِيَامَ مَرْمَضًا
 اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور محمد اس کے رسول ہیں۔ اللہ نماز ٹھیک کرنا اور زکوٰۃ دینا اور رمضان کے روزے کھانا

انہیں مضر محارم کہا جانے لگا۔ مضر ہی کی اولاد میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ انہار کو درہم اور زین لی تھی اور آباد کو ابلی گھوڑے اور بیل گائے
 ملے تھے، عبد القیس بنیہ کی شاخ تھی اور مرزہ سے مشرق میں آباد تھی۔

یعنی نے اس نعت کو بہت مفصل لکھا ہے، اس میں یہ بھی لکھا ہے کہ یہ لوگ مسلمان ہونے کے بعد زیارت کی غرض سے حاضر ہوئے
 تھے (اس وفد کے سردار وہی اشجق تھے جن کا ذکر حضور نے ان کے والد متقہ ابن حیان سے کیا تھا، حاضر مدینہ ہونے پر سب لوگ سواریوں سے کود کود کر
 شدت اشتیاق میں حضور کی خدمت میں پہنچ گئے، گریہ نہ گئے بلکہ آکر پیچھے سامان کو کچا اور محفوظ کیا، پھر فصل کیا، کپڑے بدلے اور ساتات اور
 وقار کے ساتھ دربار میں حاضر ہوئے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اس رویہ کو پسند فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ تم میں دو خصلتیں ایسی ہیں جو خدا
 کو بہت پیاری اور محبوب ہیں، ایک علم و بردباری یعنی فقہ سے مغلوب نہ ہونا اور دوسری اناہ یعنی کانوں میں بے مبری اور جلد بازی نہ کرنا، بلکہ
 ہر کام کو ساتات اور وقار کے ساتھ اطمینان سے انجام دینا)۔

قَوْلُهُ غَيْرُ خَزَايَا وَلَا نَدَامَى ۖ مَغْلُوبٌ بَكَرَأْسِهِ تَحْتَهُ كَرُوهَاوِي ۖ ذَلِكُمْ كَرَامٌ هُوَ ۚ

نَدَامَى، جمع نَدَامَانِ کی ہے، گرد وہاں مناسب اور برحق نہیں، کیونکہ نَدَامَانِ، شرابی کے مصائب یا مطلقاً مصائب
 کو کہتے ہیں، اگر نادم کی جمع کہیں تو اس کی جمع نَدَامَى نہیں آتی، اس لئے علماء نے یہ کہا ہے کہ نَدَامَى، جمع نادم ہی کی ہے گر
 علی سبیل الاتباع — خَزَايَا کے مقابل میں نَدَامَى کہہ دیا جیسے ”العشایا والغدایا“ کہا جاتا ہے، تو باوجودیکہ غَدَاة کی
 جمع غَدَاة آتی ہے لیکن عَشَايَا کے مقابل میں جمع کیلئے غَدَايَا کہہ دیا، ایسے ہی یہاں بھی

قَوْلُهُ إِلَّا فِي الشَّهْرِ الْحَرَامِ شَهْرٍ حَرَّمَ شَهْرٌ حَرَّمَ مُرَادُ لَيْ جَابِئِ يَا خَاصٌ رَجَبٌ ۚ كَيْونَكَ مَضْرُوعٌ رَجَبٌ كَا خَاصٌ احْتَرَامُ كَرْتِ
 تھے، اسی لئے احادیث میں رَجَبٌ مُضَرٌّ آتا ہے۔

بِأَصْرِ فَصْلٍ مِّنْ فَصْلٍ يَمْنَى فَاصِلٌ يَأْمَنُ مَفْصُولٌ دُونِ مَكْنٍ هِيَ ۚ

قَوْلُ: وَسَالُوهُ عَنِ الْاَشْيَاءِ 'خوف شراب کے بارے میں عام طور پر سوال کیا' آگے اس کا جواب بھی آتا ہے۔ آپ نے نہیں چاہا تو اس کا مکمل ذکر یا ذکر پانچ باتوں سے روکا۔

قَوْلُ: اَمْهَرَهُ بِالْاِيْمَانِ وَحَدَّثَهُ 'آپ نے انہیں مکمل دایمان باللہ وحدہ کا پھر پوچھا؛

اَنْدَرُونَ مَا الْاِيْمَانُ بِاللّٰهِ وَحَدَّثَهُ؟ جانتے بھی ہو کہ صرف کیلئے اللہ پر ایمان کا کیا مطلب ہے؟۔ انہوں نے عرض کیا:

اللہ ورسولہ اعلمہ اللہ اور اس کے رسول زیادہ اچھا جانتے ہیں (ہم کیا مانتے ہیں) تب آپؐ نے فرمایا
 شہادۃ ان لا الہ الا اللہ وان محمد رسول اللہ الخ بخاری نے تمام چیزوں کو تفصیل ایمان قرار دیا کہ سب ایمان
 باد کی تفسیر ہے، اب ترجمہ بخاری کو اداء الخمس من الایمان ثابت ہو گیا، حالانکہ یہ بالکل خلاف ظاہر ہے اور روایات میں صحت
 ہے کہ آپؐ نے شہادۃ ان لا الہ الا اللہ کہا و عقد واحدۃ اس عقد سے معلوم ہو گا کہ چار میں کی صرف ایک ہے،
 تین باقی رہیں، اور اگر آخر تک ایک ہی کی تفسیر ہے تو یہ اشیاء ثلاثہ کہاں ہیں۔ بیضاوی نے شرح مصابیح میں کہا ہے کہ روای
 نے بقیہ تین چیزیں بھول کر یا اعتقاد کے طور پر حذف کر دیں، ورنہ آپؐ نے سب بیان کی تھیں، مگر یہ بالکل خلاف قیاس ہے کہ تمام راوی
 بھول گئے ہوں۔

علاوہ بریں جب ملے اعمال ایمان یا فخر میں داخل ہو گئے جیسا کہ تمھارا مذہب ہمہ گیر ہے کہ تم کہتے ہو کہ تین اور ہیں۔ یہ تکلف بارہے صحیح بات ہے کہ سیر عیاروں میں بیان کی ہیں اور جو ہیں، شہادۃ، اقامۃ صلوة، ایثار، زکوٰۃ، صیام، رمضان۔ اب رہی بات و ان تعطیل کی، تو درحقیقت وہ زیادہ فائدہ نالہ ہے، کوئی چار روپے دیکر پانچواں روپہ بھی دے دے تو کیا وعدہ خلاف ہوگا، چونکہ یہ بات ان کے صبر حال قہی 'وہ ہر وقت جہاد کرتے تھے اور اس میں غنائم بھی آتے تھے اس لئے اس کا بھی ذکر کر دیا یا یوں کہا جائے کہ چار میں ادا لے خمس داخل ہے اور ابتداء میں شہادۃ کا ذکر کرنا ہے، 'وہ شمار میں نہیں ہے۔ جیسا کہ آں میں فرمایا: **وَأَعْلُوا أَلَمَّا عَنِتُّمْ مِنْ**

بَابُ مَا جَاءَ أَنَّ الْأَعْمَالَ بِالنِّيَّةِ وَالْحِسْبَةِ وَلِكُلِّ امْرَأٍ مَا وُؤِي

اس بات کا بیان کہ عمل بغیر نیت اور خلوص کے صحیح نہیں ہوتے ، اور ہر آدمی کو دیئے گئے کام کو نیت کر کے ، تو

فَدَخَلَ فِيهِ الْإِيمَانُ وَالْوُضُوءُ وَالصَّلَاةُ وَالزَّكَاةُ وَالْحَجُّ وَالصَّوْمُ وَالْأَحْكَامُ

عمل میں ایمان اور وضو اور نماز اور زکوٰۃ اور حج اور روزہ اور سارے معاملات (جیسے بیع و شراء ، نکاح و طلاق وغیرہ) آگئے

وَقَالَ تَعَالَى : (قُلْ كُلُّ يَعْمَلْ عَلَى شَاكِلَتِهِ) عَلَى نِيَّتِهِ نَفَقَةُ الرَّجُلِ عَلَى أَهْلِهِ

اور اللہ نے (مومنین اسرائیل میں) فرمایا : اے پیغمبر کہہ دیجئے ہر کوئی اپنے طریق یعنی اپنی نیت پر عمل کرتا ہے ، اور (اسی وجہ سے)

يَحْتَسِبُهَا صَدَقَةٌ وَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلَكِنْ جِهَادٌ وَنِيَّةٌ

آدمی اگر ثواب کے لئے خدا کا حکم سمجھ کر اپنے گھر والوں پر خرچ کرے تو صدقہ کا ثواب ملتا ہے (اور جب کہ فتح ہو گیا) تو آنحضرت صلی اللہ

علیہ وسلم نے فرمایا : (اب ہجرت نہیں رہی) لیکن جہاد اور نیت باقی ہے ۔

شَيْئٍ فَإِنَّ لِلَّهِ حُسْبَهُ^(۱) اے اللہ اس میں اللہ کا ذکر بڑا ہے ۔

اس موقع پر حج کا ذکر نہیں ہے ، ظاہر ہے کہ فرض ہو چکا تھا ، مگر ابو جبرہ کی حدیث میں ذکر نہیں ، ابو جبرہ کے علاوہ عکرمہ اور

سعید ابن المسیب نے بھی ابن عباسؓ سے روایت کی ہے ، وہاں حج کا ذکر بھی ہے ، یہ دونوں روایتیں فتح الباری میں ہیں ، اس کا بھی امکان

ہے کہ کسی خاص سبب سے چھوڑ دیا اور اس کا بھی امکان ہے کہ قصداً اختصار کر دیا ۔

قَوْلُهُ وَنَهَاهُمْ عَنْ اَرْبَعٍ . حَتَمَهُ : شَرَابُ الْكَاهِلِ ، سَبْوٌ . اَكْثَرُ بَزَرْجٍ كَا هُوَ تَحَا اس لئے اس کی تفسیر میں

الْجَرَّةُ الْخَضِرَاءُ کہیا ۔

دُبَاةٌ : قَوْمٌ . كَمَا كَا كُوْدَا كَالِ اس کے چھلکے کو خشک کر لیتے تھے اور اس میں شراب بناتے تھے ، چونکہ اس میں مسامت

نہیں ہوتے اس لئے جوش جلد آتا تھا ۔

تَقْدِيرٌ : كَهْرَجٍ كِي كُوْدَا كِيَا لَسَابِنَاتِهِ تھے ۔

مَرْقَتٌ يَا مَقِيرٌ : مَرْقَتٌ مَرْقَتٌ ہے اور مَقِيرٌ قَارِے ۔ اور قَارِ کو قیر بھی کہتے ہیں ، مگر اس کا ترجمہ رال

کرتے ہیں ، یہی دھت کا عصارہ ہے جو ایران میں ہوتا ہے اور لکھا ہے کہ اسی سے جہازوں اور کشتیوں میں پاشی کی جاتی ہے ۔

۵۲۔ حَدَّثَنَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ مَسْلَمَةَ قَالَ أَخْبَرَنَا مَالِكٌ عَنْ يَحْيَى بْنِ

ہم سے بیان کیا عبد اللہ بن مسلمہ نے کہا خبر دی ہم کو امام مالک نے ' انھوں نے یحییٰ ابن سعید سے ' انھوں

سَعِيدٌ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ أَبِرَاهِيمَ عَنْ عُلُقَمَةَ عَنْ ابْنِ وَقَاصٍ عَنْ عُمَرَ ابْنِ رَسُولِ اللَّهِ

محمد ابن ابراہیم سے ' انھوں نے علقمہ سے ' انھوں نے ابن وقاص سے ' انھوں نے حضرت عمر سے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّةِ وَلِكُلِّ امْرَأٍ مَا نَوَى فَمَنْ

نہ آیا : عمل نیت ہی سے صحیح ہوتے ہیں (نیت ہی سے ان میں ثواب ملتا ہے) اور ہر آدمی کو وہی ملے گا جو نیت کرے

كَانَتْ هِجْرَتُهُ إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ فَهِجْرَتُهُ إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَمَنْ كَانَ تَ هِجْرَتُهُ

پھر جو کوئی اپنا دین اللہ اور اس کے رسول کے لئے چھوڑے گا اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہوگی اور جو کوئی دین

لِدُنْيَا يُصِيبُهَا أَوْ امْرَأَةٍ يَتَزَوَّجُهَا فَهِجْرَتُهُ إِلَى مَا هَاجَرَ إِلَيْهِ

کمانے کے لئے یا کسی عورت کو بیاہنے کے لئے میں چھوڑے گا تو اس کی ہجرت انھی کاموں کے لئے ہوگی۔

علامہ انور شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ یہ غلط ہے بلکہ یہ زمین سے نکلتی ہے اور مٹی کے تیل کے نیچے سے نکالتے ہیں جیسے تار کو لے

اسی طرح کی کوئی چیز ہے، بہر حال اس سے رتن پر رون کر کے مٹے تاکہ غلیان جلد ہو۔

بَابُ مَا جَاءَتْ الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّةِ وَالْحِسْبَةِ

الحسبة یعنی احتساب و اخلاص کے ساتھ اللہ کے واسطے کسی کام کا کرنا۔

قَوْلُهُ فَذَخَلَ فِيهِ الْإِيمَانُ الْخَيْرُ يَخْدُمُ ابْنِ طَرَفٍ سَعِيدٌ رَحِمَهُ اللَّهُ كَوْنُ قُرْبَتِ رَسَائِلٍ سَعِيدٌ رَحِمَهُ اللَّهُ

نیز کوئی عمل ایمان سے خارج نہیں، لہذا نیت ہونی چاہئے، وضو میں نیت کی بحث گند مچی ہے کہ پانی بالطبع طاهر ہے اس میں نیت کی ضرورت

نہیں، جیسے غسل ثوب وغیرہ میں نیت کی ضرورت نہیں، حالانکہ وہ بھی عمل ہے تو عموم امتناع الاعمال میں وہ بھی داخل ہے۔ اس اعتراض کا

جواب مخالفین یہی دیتے ہیں کہ چونکہ وہ بالطبع مطہر ہے اس لئے نیت کی ضرورت نہیں، ہم کہتے ہیں اسی طرح یہاں وضو میں چونکہ پانی بالطبع

مطہر ہے اس لئے نیت کی ضرورت نہیں۔ رہا تیمم، تو چونکہ مٹی بالطبع طاهر و مطہر نہیں اس لئے نیت کی ضرورت ہے۔ الجواز الآخری میں ہے

کہ وضو عبادت جب بے گاہبہ نیت ہو، تو معلوم ہوا کہ مطہر تو بغیر نیت کے بن جائے گا لیکن عبادت نیت ہی سے بنے گا۔ الاشتباہ

۲ والنظر آخر میں اس پر مبسوط بحث کی گئی ہے کہ احسان کے ہاں کن کن نوات میں نیت فردی ہے اور کہاں کہاں نہیں۔

قَوْلُهُ قَالَ اللَّهُ تَعَالَى قُلْ كُلٌّ يَلْعَلُ عَلَى شَاكِلَتِهِ، عَلَى نَيْتِهِ، شَاكِلَتِهِ کی تفسیر حسن بصری سے منقول ہے، دیگر

۵۳۔ حَدَّثَنَا حَجَّاجُ بْنُ مِنْهَالٍ قَالَ حَدَّثَنَا شُعْبَةُ قَالَ أَخْبَرَنِي

ہم سے حجاج بن منہال نے بیان کیا، کہا ہم سے شعبہ نے بیان کیا، کہا مجھ کو عدی ابن ثابت نے خبر

عَدِيُّ بْنُ ثَابِتٍ قَالَ سَمِعْتُ عَبْدَ اللَّهِ بْنَ يَزِيدَ عَنْ أَبِي مَسْعُودٍ عَنِ النَّبِيِّ
دی، کہا میں نے عبد اللہ ابن یزید سے سنا، انھوں نے ابو مسعود سے، انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے، آپ نے
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ إِذَا انْفَقَ الرَّجُلُ عَلَى أَهْلِهِ يَحْتَسِبُهَا فِيهِ لَهُ صَدَقَةٌ
فرمایا: جب کوئی اپنے گھر والوں پر ثواب کی نیت سے (اللہ کا کم سمجھ کر) خرچ کرے تو صدقہ کا ثواب پائے گا۔

۵۴۔ حَدَّثَنَا الْحَكَمُ بْنُ نَافِعٍ قَالَ أَخْبَرَنَا شُعَيْبٌ عَنِ الزُّهْرِيِّ قَالَ

ہم سے ابوالیمان حکم ابن نافع نے بیان کیا کہا ہم کو شعیب نے خبری، انھوں نے زہری سے

حَدَّثَنِي عَامِرُ بْنُ سَعْدٍ عَنْ سَعْدِ بْنِ أَبِي وَقَّاصٍ أَنَّهُ أَخْبَرَهُ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ
کہا مجھ سے بیان کیا عامر ابن سعد نے، انھوں نے سعد ابن ابی وقاص سے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ إِنَّكَ لَنْ تَنْفِقَ نَفَقَةً تَبْتَغِي بِهَا وَجْهَ اللَّهِ إِلَّا أُجِرْتَ
تو جو کچھ خرچ کرے اور اس سے تیری نیت اللہ کی رضا مندی کی ہو تو تجھ کو اس کا ثواب ملے گا،

عَلَيْهَا حَتَّى مَا تَجْعَلَ فِي فَمِ امْرَأَتِكَ

یہاں تک کہ اس پر بھی جو تو اپنی جود کے منہ میں ڈالے :

علماء نے کہا ہے کہ "شاکلۃ" سے باطن امور مراد ہیں، یعنی جو اس کے دل میں دہی ظاہر ہوتا ہے۔ الاناء یتلشم بما فیہ۔

تَوْفَقُ نَفَقَةُ الرَّجُلِ عَلَى أَهْلِهِ يَحْتَسِبُهَا صَدَقَةٌ۔ یہ ایک حدیث کے الفاظ ہیں، یعنی اپنے اہل و عیال پر خرچ کرنا بھی

ایک قسم کا صدقہ ہے۔

وَلَكِنْ جِهَادٌ وَنِيَّةٌ یہ دوسری حدیث کا کڑا ہے، جب کو فتح ہو گیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لَا هَجُورَ
بَعْدَ الْفَتْحِ وَلَكِنْ جِهَادٌ وَنِيَّةٌ، یعنی اگر جہاد ہو تو یہ نیت رکھے کہ جب بھی خلیفہ بلائے گا تو حاضر و شریک ہوگا۔ امام بخاری کی غرض
یہ ہے کہ نیت کے مراتب ہیں، جس درجہ کی نیت ہوگی ویسا ہی ثواب ہوگا۔

حدیث ۵۳۔ فَهِيَ لَهُ صَدَقَةٌ، بلکہ اس سے بڑھ کر وہ حدیث ہے جس میں فرمایا گیا فی بضع أحدكم صدقة

سوال کیا گیا کہ اگر ایک شخص اپنی شہوت مٹاتا ہے اسے بھی اجر ملے گا؟ فرمایا ہاں، اگر حرام میں رکھتا تو اسے سزا ملتی، تو حلال میں اجر

بَابُ قَوْلِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الدِّينُ النَّصِيحَةُ لِلَّهِ وَرَسُولِهِ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا کہ دین کیا ہے ؟ سچے دل سے اللہ کی خدشاں برداری اور

وَلَا يَمْنَهُ الْمُسْلِمِينَ وَعَامَّتِهِمْ وَقَوْلُهُ تَعَالَى (إِذَا اضْلَحُّوا لِلَّهِ وَرَسُولِهِ)

اس کے پیغمبر اور مسلمان عاقلوں کی خیر خواہی اور اللہ تعالیٰ نے (سورتہ یوسف) فرمایا: جب اللہ اور اس کے رسول کی خیر خواہی میں ہیں

۵۵۔ حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ قَالَ حَدَّثَنَا يَحْيَى عَنْ إِسْمَاعِيلَ قَالَ حَدَّثَنِي

ہم سے مسدد نے بیان کیا کہ ہم سے یحییٰ ابن سعید تھان نے بیان کیا کہ انھوں نے اسمیل سے کہا کہ

قَيْسُ ابْنُ أَبِي حَازِمٍ عَنْ جَرِيرِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ الْبَجَلِيِّ قَالَ بَايَعْتُ رَسُولَ اللَّهِ

مجھ سے قیس ابن ابی حازم نے بیان کیا کہ انھوں نے جریر ابن عبد اللہ بجلئی سے سنا کہ انھوں نے کہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى إِقَامِ الصَّلَاةِ وَإِيتَاءِ الزَّكَاةِ وَالنَّصِيحَةِ لِكُلِّ مُسْلِمٍ

سے میں نے بیعت کی ان باتوں پر کہ نماز دینی کے ساتھ ادا کروں گا اور زکوٰۃ دیا کروں گا اور ہر مسلمان کا خیر خواہ رہوں گا۔

بھی لے گا۔

حدیث ۵۴۔ حضرت مسدد نے یہ اس وقت فرمایا جب وفات کا وقت قریب تھا جب وہ بیمار ہوئے تو حضور ان کی

عیادت کو تشریف لے گئے تھے اس وقت حضرت مسدد نے عرض کیا کہ میرا یہ حال ہے آپ کچھ نصیحت فرما دیجئے تاکہ میں وصیت کر جاؤں ان کا

گمان یہ تھا کہ شاید آخری وقت ہے اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کچھ فرمائیں تو وصیت کر جاؤں تاکہ آخرت میں میرے کام آئے اس

وقت آپ نے فرمایا ابھی تم مر دو گے نہیں ابھی بہت کم اڑ گئے اور بہت خرچ کرو گئے البتہ اگر نیت اچھی کر لو گے تو اس صدقہ کا ثواب لے گا۔

بَابُ قَوْلِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الدِّينُ النَّصِيحَةُ

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ دین نصیحت ہی ہے یہ ترجمہ اس لئے کیا گیا ہے قاعدہ یہ ہے کہ جب

بتدا اور خبر دونوں معرب باللام ہوں تو صحر کا افادہ ہوتا ہے اور یہاں دونوں معرب باللام ہیں اس لئے انحصار ہوگا اور مطلب یہ ہوگا کہ دین صرف

نصیحت ہی ہے کوئی اور چیز نہیں۔ مگر نصیحت کے بھی مراتب وارد ہوئے ہیں ایک اللہ کے لئے دوسرا اللہ کے رسول کے لئے تیسرا مسلمان

کے لئے چوتھا عات الناس کے لئے یہ چار مراتب یہاں بیان فرمائے گئے۔

نکتہ میں نصیحت کا لفظ دو طرح استعمال ہوتا ہے ایک غاص کرنے اور صاف کرنے کے معنی میں جیسے نَصَحْتُ

العسل میں نے شہد کو صاف اور غاص کر دیا دوسرے استعمال میں وہ سینے کے معنی میں آتا ہے جیسے نَصَحْتُ الثَّيَابَ میں نے

۵۶۔ حَدَّثَنَا أَبُو النَّعْمَانِ قَالَ حَدَّثَنَا أَبُو عَوَانَةَ عَنْ زِيَادِ بْنِ عِلَاقَةَ

ہم سے ابو النعمان نے بیان کیا ، کہا ہم سے ابو عوانہ نے بیان کیا ، انھوں نے زیاد ابن علقہ سے ، کہا

قَالَ سَمِعْتُ جَرِيرَ ابْنَ عَبْدِ اللَّهِ يَوْمَ مَاتَ الْمُغِيرَةُ بْنُ شُعْبَةَ قَامَ فَحَمِدَ

میں نے جریر ابن عبد اللہ سے سنا ، جس دن مغیرہ ابن شعبہ (کود کے مالک) مر گئے تو وہ خطبہ کے لئے کھڑے ہوئے

اللَّهُ وَاشْتَى عَلَيْهِ وَقَالَ عَلَيَّكُمْ بِاتِّقَاءِ اللَّهِ وَحُدَا لَا شَرِيكَ لَهُ وَالْوَتَارِ

اور اللہ کی تعریف کی اور خوبی بیان کی اور کہا تم کو اللہ کا ڈر رکھنا چاہئے اس کا کوئی ساجھی نہیں ، اور غل اور

وَالسَّكِينَةِ حَتَّى يَأْتِيَكُمْ أَمِيرٌ فَإِنَّمَا يَأْتِيَكُمْ الْآنَ ثُمَّ قَالَ اسْتَغْفِرُوا لِمِزْكُمُ

الطمینان سے رہنا چاہئے اس وقت تک کہ کوئی دوسرا مالک تمہارے اوپر آئے وہ اب آتا ہے ، پھر یہ کہا کہ اپنے

فَإِنَّهُ كَانَ يُحِبُّ الْعَفْوَ ثُمَّ قَالَ أَمَّا بَعْدُ فَإِنِّي أَنِيتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ

(مے ہوئے) مالک کے لئے مغفرت کی دعا مانگو ، کیونکہ وہ (میز) بھی معافی کو پسند کرتا تھا ، پھر کہا : اس کے بعد تم کو معلوم ہو کہ میں

وَسَلَّمَ قُلْتُ أَبَايُكَ عَلَى الْإِسْلَامِ فَشَرَطَ عَلَيَّ وَالنَّصِاحَ لِكُلِّ مُسْلِمٍ فَبَايَعْتُهُ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور میں نے عرض کیا میں آپ سے اسلام پر بیعت کرتا ہوں ، آپ نے اسلام کی شرط مجھ پر کر لی اور ہر ایک

عَلَى هَذَا وَرَبِّ هَذَا الْمَسْجِدِ إِنِّي لَنَا حِمْلٌ لَكُمْ ثُمَّ اسْتَغْفَرَ وَنَزَلَ

مسلمان کی غیر خواہی کی ، میں نے اس شرط پر آپ سے بیعت کر لی اس مسجد کے مالک کی قسم میں تمہارا خیر خواہ ہوں ، پھر استغفار کیا اور (ممبر سے) اترے

کپڑے سی دئے ، ان دونوں معافی کو سامنے رکھ کر سمجھ میں آتا ہے کہ نصیحت میں اول چیز تو صفائی اور غلوں ضروری ہے اور دوسری چیز یہ ہے کہ تفریق نہ ہو

بلکہ جمع کرنا اور ٹوٹے ہوئے کو جوڑنا ہو ، دونوں کا ماحصل خیر خواہی سے پیش آنا اور غلوں کا معاملہ کرنا ۔

حدیث کا ترجمہ اب یہ ہوا کہ دین نام ہے خیر خواہی کرنے اور غلوں سے پیش آنے کا ، آگئے تفعیل ہے کہ اللہ کے ساتھ غلوں ہو ، یعنی اللہ

کو ایک جاننا ، اسے تمام کمالات کے ساتھ متصف ماننا ، سارے رذائل و نقائص سے اس کو منزه سمجھنا ، مالک اللک ، مقدر اعلیٰ ماننا ، ان خوبیوں کے سامنے جھکنا اور اس کے احکام کو پوری خوش دلی سے بجالانا اور ساری زندگی عہدیت اور غلامی کی زندگی بنالینا ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غلوں یہ ہے کہ ان پر ایمان لانا ، ان کی تصدیق کرنا ، ان کے کہنے پر عمل کرنا ، جو طریق

زندگی وہ تجویز فرمادیں پوری دلچسپی سے بلا ادنیٰ تردد کے حق سمجھ کر قبول کر لینا اور علما ان کا پابند ہونا اور پابند رہنا

قَوْلًا وَلَا مَعْمَاةَ الْمُسْلِمِينَ ، اُنہ سے مراد یا تو خلفاء ہیں یا ائمہ ، ائمہ کی اطاعت معصومہ شریعت کے اندر رہ کر ، فتنوں کو دبانا ،

اصلاح کرنا اور ان کی غلطیوں پر نئی اور آہستگی کے ساتھ متنبہ کرنا وغیرہ ان کے ساتھ مخلص ہے۔ اور اگر سے مراد خلفاء اور ائمہ دین ہیں تو ان کے ساتھ مخلص یہ ہے کہ ان کی تعلیم کی اشاعت کرے، ان کی عزت و کرم کرے، ان کی تعلیمات سے فائدہ اٹھائے، لوگوں کو ان کی عزت کرنے پر راغب کرے، وغیرہ۔

قوله **وَلَعَلَّاهُمْ** ہر ایک کی خیر خواہی کرنا "يُحِبُّ لِأَخِيهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهِ" خلاصہ یہ ہوا کہ ہر طرح ان کی بھلائی اور خیر خواہی کرے۔ اس خیر خواہی کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ ان کو دین سکھائے اور دینی زندگی ان میں عام کرنے کی پوری کوشش کرے۔

اس حدیث کے متعلق [علماء نے] لکھا ہے کہ اگر کوئی دوسری حدیث نہ ہو تب بھی لوگوں کی ہدایت اور ان کی ساری زندگی کو ایسا ہی زندگی بنانے کے لئے یہ ایک حدیث کافی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے فائدہ اٹھانے کی توفیق مجھ کو بھی نصیب فرمائے اور امت کے سارے طبقات کو بھی۔ آمین

حدیث ۵۶۔ قوله **يَوْمَ مَاتَ الْمَغِيرَةُ ابْنُ شُعْبَةَ** اچھا، یہ حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نہایت زریک اور اعلیٰ درجہ کے مدبر صحابی تھے، سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے دور سے اہم خدمات پر مامور تھے۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان کو اپنے زمانہ میں کوڑا گودزن بنایا تھا، بہت ہی اعلیٰ درجہ سے خدمت انجام دی، جب ان کا انتقال ہونے لگا تو حضرت جریر ابن عبد اللہ بکلی گولہ کر نصیحت فرمائی۔ حضرت جریر ابن عبد اللہ رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پردہ فرمانے سے چھ ماہ قبل مسلمان ہوئے تھے، یہ بہت ہی خوبصورت تھے، یوسف ہذا الامۃ ان کا لقب تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انھیں دیکھتے تو تبسم فرماتے، مگر اسلام لانے کے بعد مزاج میں بہت تغیر ہو گیا تھا، بالائی فائزہ اتر گیا اور موٹا کھل استعمال فرمانے لگے جس میں جن کی جگہ کاٹا لگا ہوتا تھا۔

قوله **حَتَّى يَأْتِيَكُمَا امِيرَانَا يَمِيحُ كَمَا لَانَ** جب حضرت مغیرہ کا انتقال ہو گیا تو حضرت جریر نے نہر پر چڑھ کر وعظ بیان کیا، شاید انھیں خطرہ ہوا ہو کہ مفسدین کچھ شور مچائیں، اس لئے خیر خواہی امت کے لئے انھیں نصیحتیں فرمائیں۔ بعضوں نے اس سے یہ سمجھا ہے کہ حضرت جریر خود اپنی المیت کا اعلان کر رہے ہیں اور بعض لوگوں نے یہ لکھا ہے کہ حضرت مغیرہ نے ان کو اپنا قائم مقام بنادیا تھا، لیکن یہ دونوں باتیں صحیح نہیں ہیں، اس لئے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے زیاد کو امیر بنا کر کوفہ بھیج دیا تھا۔ اور اس لئے بھی کہ حضرت جریر خود سے امیر بن سکتے تھے اور نہ حضرت مغیرہ انھیں بنا سکتے تھے، ان کو اس کا حق نہیں تھا

البتہ یہاں اس کا احتمال ہے کہ حضرت مغرہ نے تدبیر سے کام لیتے ہوئے یہ فرمایا ہو کہ امت کو خیر خواہی سے سمجھاتے رہنا، اس وقت تک کہ کوئی امیر مقرر ہو کر آجائے، چنانچہ انھوں نے یہ کام بحسن و خوبی انجام دیا اور کوئی شورش پیدا نہیں ہونے پائی اور اس کا حاف اظہار کیا کہ چونکہ نبی علیہ السلام نے مجھ سے بیت لیتے وقت شرط لگادی تھی کہ ہر مسلمان کی خیر خواہی کرنا اس لئے میں امت کی خیر خواہی میں یہ نصاب گزر رہا ہوں۔

وقاس کے معنی سناٹ کے ہیں اور متکلیفۃ سے مراد چین و سکون اور امن ہے۔

قوله کان یحب العفو، اس جملہ سے یہ سمجھایا کہ جزا جس عمل سے ہوتی ہے۔

قوله والنصح لکل مسلم، سے یہ غرض بتادی کہ میری ذاتی کوئی غرض نہیں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت کے وقت والنصح لکل مسلم کی شرط لگائی تھی اس لئے جو اللہ یہ نصیحتیں کر رہا ہوں۔

ورب هذا المسجد، بعض روایات میں "رب المسجد الحرام" آیا ہے، اس لئے یہاں بھی وہی مراد ہے۔

(امام بخاری نے ترجمۃ الباب میں الدین النصیحة رکھا کیونکہ یہ حدیث ان کی شرط پر پوری نہ تھی اس لئے اسے ترجمہ میں لایا)

اور آیت قرآنی سے ان کی تاکید کر دی، اور دوسری حدیث جس میں النصح لکل مسلم کے الفاظ ہیں، ان کی شرط کے موافق تھی اسلئے اس کو متن میں رکھا۔^(۱۱)

الحمد للہ کتاب الایمان ختم ہوئی

کتاب العلم

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

بَابُ فَضْلِ الْعِلْمِ وَقَوْلِ اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ (يَرْفَعُ اللَّهُ الَّذِينَ

علم کی فضیلت اور اللہ تعالیٰ نے (سورہ مجادلہ میں) فرمایا : جو تم میں ایماندار ہیں اور جن کو علم ملا

أَمَنُوا مِنْكُمْ وَالَّذِينَ أَوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ ۖ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ) (

اللہ ان کے درجے بلند کرے گا، اور اللہ کو تمہارے کاموں کی خبر ہے

وَقَوْلِهِ (رَبِّ زِدْنِي عِلْمًا)

اور (سورہ طہ میں) فرمایا : پروردگار مجھے اور زیادہ علم دے

بَابُ فَضْلِ الْعِلْمِ

امام بخاری نے اپنی کتاب کی ابتداء "باب بدء الوحی" سے فرمائی اور اس میں وحی کی عظمت اور اس کی صداقت و حقانیت کو واضح فرمایا، کیونکہ تمام امور و احکام کا منبع اور سارے علوم و معارف کا سرچشمہ صرف وحی ہے، اس کے بعد ایمان کے ابواب لائے، کیونکہ ایمان ہی اصل اور بنیاد ہے، جب ایمان ہی درست نہیں تو اعمال کا کوئی وزن اور اس کی کوئی قدر اللہ کے یہاں نہیں۔ اور جب ایمان لاپس کا تو اب ایمان لانے کے بعد اللہ تعالیٰ کی مرضیات اور غیر مرضیات کو معلوم کرنے کی فکر ہوگی، اور نظر رہے کہ یہ علم ہی کے ذریعہ حاصل ہوگا، تو علم سے غرض یہ ہوگی کہ مرضیات الہی معلوم ہوں، لہذا کتاب العلم کے عنوان کے تحت اس علم کے فضائل اور اس کے حقوق و آداب بتلائے تاکہ من و جہر اس سے مناسبت ہو جائے، اسی بنا پر فضل علم کا باب پہلے لائے۔

اس باب میں پہلے دو آیتیں ذکر کیں جن سے علم کی فضیلت ثابت ہوتی ہے، پہلی آیت سورہ مجادلہ کی ہے، اس آیت میں

بَابُ مَنْ سُئِلَ عِلْمًا وَهُوَ مُشْتَغَلٌ فِي حَدِيثِهِ فَأَتَمَّ الْحَدِيثَ

جس شخص سے علم کی کوئی بات پوچھی جائے اور وہ دوسری بات کر رہا ہو پھر باقی بات پوری کر کے

ثُمَّ أَجَابَ السَّائِلَ

پوچھنے والے کا جواب دے

۵۷۔ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ سِنَانٍ قَالَ ثَنَا فُلَيْحٌ ح قَالَ وَحَدَّثَنِي

ہم سے بیان کیا محمد بن سنان نے کہا ہم سے بیان کیا فلیح نے اور دوسری سند - اور مجھے بیان کیا

إِبْرَاهِيمُ بْنُ النَّذْرِ قَالَ ثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ فُلَيْحٍ قَالَ ثَنَا أَبِي قَالَ حَدَّثَنِي هَلَالُ

ابراہیم بن منذر نے کہا ہم سے بیان کیا محمد بن فلیح نے کہا ہم سے بیان کیا میرے باپ فلیح نے کہا مجھ سے

بْنُ عَلِيٍّ عَنْ عَطَاءِ بْنِ يَسَارٍ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ بَيْنَمَا النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

بیان کیا ہلال بن علی نے انھوں نے عطاء بن یسار نے انھوں نے ابو ہریرہؓ سے کہا ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں

فِي مَجْلِسٍ يُحَدِّثُ الْقَوْمَ جَاءَهُ أَعْرَابِيٌّ فَقَالَ مَتَى السَّاعَةُ ؟

میں بیٹھ ہوئے ان سے باتیں کر رہے تھے اتنے میں ایک گھوڑا آپ کے پاس آیا اور پوچھنے لگا قیامت کب آئے گی؟

پہلے کچھ آداب مجلس بیان ہو رہے ہیں ارشاد فرمایا يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قِيلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوا فِي الْمَجَالِسِ فَافْسَحُوا يَفْسَحِ

اللَّهُ لَكُمْ وَإِذَا قِيلَ اسْتَوْذَعُوا فَاسْتَوْذَعُوا (۱) اس آیت میں دو چیزیں بتلائیں اول یہ کہ کھل کر بیٹھو یعنی اس طرح بیٹھو کہ دوسروں کے لئے

جگہ نکال آئے اور جب کہ کھل دو گے تو اللہ تم پر رزاقی اور کثرت دگی پیدا کرے گا (جزا میں مل سے ہے (۲) اور جب کہا جائے کہ کھڑے ہو جاؤ تو

کھڑے ہو جاؤ یہاں اگرچہ پیغمبر علیہ السلام کا ذکر ہے مگر لایہ ہے کہ صدر جب اٹھنے کا حکم دے تو اٹھ جاؤ اور دوسروں کے لئے جگہ چھوڑ دو اس کی

جزا کیا ہے ؟ یرفع اللہ الذین آمنوا منکم والذین آؤوا العلم درجات (۳) اللہ تم سے سے مومنین کے اور اہل علم کے درجات

بند کرے گا اس سے دو چیزیں ثابت ہوئیں ایک ایمان دوسرا علم معلوم ہوا کہ مومن کے درجات غیر مومن سے اور عالم کے

غیر عالم سے زیادہ ہیں اور غالباً دو چیزیں اس لئے بتلائی کہ یہ ادب و نجی شخص ملحوظ رکھ سکتا ہے جس کے دل میں ایمان ہو اور ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ

دنیا میں بھی اونچا فرمائے گا اور آخرت میں بھی۔ تو بخاری کا مقصود اثبات فضل علم ثابت ہو گیا اور گویا انھوں نے اس پر بھی متنبہ کر دیا کہ ایمان کے

فَمَضَى رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُحَدِّثُ فَقَالَ بَعْضُ الْقَوْمِ سَمِعَ مَا قَالَتْ

آپؐ اپنی بات میں مصروف رہے (اور گنوار کا جواب نہ دیا) بیٹھے لوگ (جو اس مجلس میں حاضر تھے) کہنے لگے آپؐ نے گنوار کی بات

فکرہ ما قال وقال بعضهم لم يسمع حتى إذا قضى حديثه قال أين أراء السائل

سنی گریہ مند کی ۔ اور بیٹھے کہنے لگے نہیں : آپؐ نے اس کی بات سنی ہی نہیں ۔ چپ آپؐ اپنی باتیں بدلتے رہتے

عَنِ السَّاعَةِ قَالَ هَا أَنَا يَا رَسُولَ اللَّهِ قَالَ فَإِذَا ضُيِّعَتِ الْأَمَانَةُ فَانْتَظِرِ

تو میں سمجھتا ہوں میں فرمایا : وہ قیامت کو پہنچنے والا کہاں گیا ؟ جس گنوار نے کہا میں حاضر ہوں یا رسول اللہؐ : آپؐ نے فرمایا :

السَّاعَةِ فَقَالَ كَيْفَ إِضَاعَتُهَا قَالَ إِذَا أُوسِدَ الْأَمْرُ إِلَى غَيْرِ أَهْلِهِ

تو اس (سے) جب امانت (ایمانداری دنیا سے) اٹھ جائے تو قیامت کا منظر وہ اس نے کہا ایماندار کی چونکہ اٹھ جائے گی ؟ آپؐ نے فرمایا

فَانتَظِرِ السَّاعَةَ

جب ہم تلافی کو دیا جائے تو قیامت کا منظر وہ ۔

بعد علم کا بیان کیوں لائے اس لئے کہ جس طرح آیت میں ایمان مقدم اور علم کو آخر ہے اسی طرح یہاں بھی کیا گیا ، نیز اس طرف بھی اشارہ ہے کہ علم کے بھی درجات ہیں اور واللہ بہما تعملون خبیرو سے اشارہ مقصود ہے کہ علم بے عمل بیکار ہے ، یا کہ اللہ خبردار ہے کہ کون کس درجہ کا علم رکھتا ہے اور کس مرتبہ کا شخص ہے ، اسی کے اعتبار سے ہم بھی رتبہ درجات کریں گے ۔

دوسری آیت اس بات پر مصلحتاً دلالت ہے کہ علم بڑھنے کی چیز ہے اور اللہ سے زیادہ کی طلب اسی وقت ہوگی جب اس میں کوئی نقص نہ ہو ، یہاں امام بخاری کوئی حدیث نہیں لائے ، شاید شرط کے مطابق کوئی حدیث انہیں نہیں ملی ہوگی ۔ لکھا ہے کہ امام نے تراجم پہلے لکھے تھے ، بعد کو تراجم کے مناسب حدیثیں درج کیں ، یہاں کوئی حدیث نہیں ملی اس لئے کوئی حدیث مذکور نہیں ہے ، اور میرے خیال میں اگر یہ بات قرین کے لئے ہے تو صحیح مسلم کی حدیث منطبق ہو سکتی ہے : مَنْ سَلَكَ طَرِيقًا يَلْتَمِسُ فِيهِ عِلْمًا سَهَّلَ اللَّهُ لَهُ طَرِيقًا إِلَى الْجَنَّةِ ۔

باب من مثل علما وهو مشتغل الخ

حدیث ۵۷ ۔ آپؐ گفتگو فرما رہے تھے کہ ایک اعرابی نے سوال کر دیا ، آپؐ نے التفات نہیں فرمایا ، بعض لوگوں نے کہا ہے کہ حضورؐ نے سوال سن لیا تھا مگر اس وقت سائل کا سوال کرنا پسند نہ آیا ، اس لئے جواب نہیں دیا اور بعض لوگوں نے سمجھا کہ حضورؐ نے سننا ہی نہیں — مگر یہ دونوں خیال صحیح نہیں بلکہ ایک دوسری ہی وجہ تھی ، وہ یہ کہ آپؐ گفتگو میں مصروف تھے ، جب بات ختم کر چکے تھے

بَابُ مَنْ رَفَعَ صَوْتَهُ بِالْعِلْمِ

جس نے علم کی بات پکار کر کہی ۔

۵۸۔ حَدَّثَنَا أَبُو النُّعْمَانِ قَالَ ثنا أَبُو عَوَانَةَ عَنْ أَبِي بَشْرٍ عَنْ يُونُسَ بْنِ

یونس سے بیان کیا ابو نعمان نے کہا ہم سے بیان کیا ابو عوانہ نے ، یونس نے ، ابو بصرے ، انھوں نے یونس

مَا هَكَ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ تَخَلَّفَ عَمَّا النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي سَفَرَةٍ

ابن امیر سے ، انھوں نے عبد اللہ بن عمرو سے ، کہا ایک سفر میں جو ہم نے کیا تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہم سے پیچھے

سَافِرُنَاهَا فَأَدْرَكْنَا وَقَدْ أَرَهَقْنَا الصَّلَاةُ وَغَنُّ نَمُوضًا فَجَعَلْنَا نَسْمُو عَلَى أَرْجُلِنَا

وہ گئے (وہ سفر کر رہے تھے) پھر آپ ہم سے اس وقت نے جب (عصر کی) نماز کا وقت آن پہنچا تھا ، ہم (جلدی جلدی) وضو کر

فَنَادَى بِأَعْلَى صَوْتِهِ وَيْلٌ لِلْأَعْقَابِ مِنَ النَّارِ مَرَّتَيْنِ أَوْ ثَلَاثًا .

رہے تھے ، پاؤں کو (خوب دھونے کے بل) یوں ہی سادھ رہے تھے ، آپ نے (یہ حال دیکھ کر) بلند آواز سے پکارا : دیکھو اڑیوں کی خرابی

دور رخ سے ہونے والی ہے ، دوبار یا تین بار یہ فرمایا ۔

فرمایا : ^(۱) اَيْنَ اُرَاهُ السَّائِلُ ؟ جواب میں عرض کیا میں ہوں تو آپ نے فرمایا : اِذَا ضُيِّعَتِ الْاِمَانَةُ فَاِنْتَظِرِ السَّاعَةَ

یعنی قیامت کی علامت یہ ہے کہ جب امانتیں ضائع کر دی جائیں ، مطلب یہ ہے کہ لوگ جن پر اعتماد کریں اور انھیں اپنی سمجھیں ، وہ امانت ثابت

نہ ہوں ، تو اس وقت قیامت کا انتظار کرو ، اس نے پھر سوال کر دیا کہ (امانت کی) اضافت کیونکر ہوگی ؟ یہ سوال اس ماحول کے مطابق تھا

اس لئے کہ اس وقت کسی کو اس کا وہم بھی نہیں گذرتا تھا کہ امانت ضائع کر دی جائے گی اور ایں خائن بن جائے گا ، اس لئے دوبارہ پوچھا ،

حضور یہ کیسے ہوگا ؟ آپ نے جواب میں فرمایا اس طرح سوال ہونے لگے گا کہ بولوگ ایں نہ ہوں گے ان کے ذمہ کام پیر دکر دے جائیں گے ،

اور جو ماہل ہوں گے وہ عہدہ دار بن جائیں گے ، تو مراد اضافت امانت سے یہ ہوئی نہ نا انھوں کے ہاتھ کام آپڑیں گے اور وہ اس کو امانت

کے ساتھ انجام نہ دے سکیں گے ، چنانچہ آج کل یہی ہو رہا ہے ، کوئی اہل کو نہیں دیکھتا بلکہ اغراض و سفارشات پر مدار و مدارہ گیا ہے ۔

یہ بھی سمجھ لو کہ "اہل" ہر شب کے اعتبار سے بخندہ بخندہ ہوتا ہے ، مثلاً محبت صرف وہ نہیں ہے جس کی تقریر عمدہ ہو ، بلکہ حدیث کا اہل وہ

شخص ہے جس میں دیانت اور علم دونوں ہوں ، درحقیقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم عالم اور مستعلم دونوں کو علم کا ادب بتلا رہے ہیں ۔ یہاں

باب قول المحدث حدثنا واخبرنا وانبانا وقال لنا الحميدي

حدث کا یوں کہنا ہم سے بیان کیا اور ہم کو خبر دی اور ہم کو بتلایا اور امام حمیدی نے ہم سے

كَانَ عِنْدَ ابْنِ عُيَيْنَةَ حَدَّثَنَا وَآخَرَنَا وَآنَبَنَا وَسَمِعْتُ وَاحِدًا.

کہا کہ سفیان ابن عیینہ کے نزدیک ہم سے بیان کیا اور ہم کو خبر دی اور ہم کو بتلایا اور میں نے سنا ان سب لفظوں کا ایک ہی مطلب تھا۔

اس سلسلہ کی دو باتیں بتلائیں، اول یہ کہ متعلم بیچ میں بات نہ کاٹے، جب عالم کی بات ختم ہو جائے تب سوال کرے۔ دوم یہ کہ اگر متعلم نے سوال کر ہی دیا تو اب جواب مفوض الی رای العالم ہے، اگر اپنی بات جاری رکھے اور اس کا جواب نہ دے تو یہ کہہ کی علامت نہ ہوگی، ہاں اگر مصلحت دینی ہو کہ فوراً جواب دینا مناسب ہے تو دینا چاہئے، چنانچہ ایسا ہوا بھی ہے کہ حضورؐ سے میں خطبہ میں سوال ہوا اور آپ نے اسی وقت جواب دیا، تو یہ مفوض الی رای العالم ہوگا کہ جیسا مناسب ہو دیا کرے، ایک صورت یہ بھی ہے کہ جواب بالکل نہ دے جب سائل جواب کا عمل نہ کر سکتا ہو، یا یہ کہ فقہ کا اندیشہ ہو، ایسے وقت میں مناسب یہ ہے کہ اسے تسلی دیدے کہ یہ تمہارے لئے مناسب نہیں، یہاں سائل غالباً قیامت کے وقت کا سوال کر رہا تھا مگر یہ اس کے مناسب نہ تھا اس لئے آپ نے اس کی علامت بیان فرمادی۔

باب من رفع صوته بالعلم

امام بخاری یہ ترجمہ اس لئے لائے کہ بظاہر رفع صوت شور مچانا ہے اور علم دین وراثت نبوی ہے لہذا یہ شور اس کے خلاف ہے اسی کا جواب دیتے ہیں کہ یہ رفع صوت اور شور و شغب اس میں داخل نہیں [جس کو قرآن میں ممنوع قرار دیا گیا ہے] کیونکہ حضورؐ نے بعض مواقع پر رفع صوت سے تبلیغ فرمائی ہے۔

حدیث ۵۸۔ قَوْلًا قَدْ اَرَهَقْنَا الصَّلَاةَ۔ نماز نے ہمیں پالیا تھا، یا ہم نے اسے پالیا تھا، مطلب یہ کہ

وقت نماز آگیا تھا۔

قَوْلًا نَسَحَ عَلٰی اَرْجُلِنَا۔ یعنی جلدی جلدی دھور ہے تھے گویا کہ مسح کر رہے تھے! اور گنا یہ ہے تعجل سے۔

قَوْلًا فَخَادِي بَا عَلٰی صَوْتِهِ۔ اس سے دعائیات ہو گیا کہ علم کی بات اگر پکار کر کہی جائے تو غلط ادب نہیں اور اس کی حاجت یا تو اس لئے ہوتی ہے کہ آواز پہنچتی نہیں، یا یہ کہ رنوخ فی القلب مقصود ہوتا ہے اس لئے زور سے بات کہی جاتی ہے تاکہ قلب میں راسخ ہو جائے، بہر حال یہ صورتیں جائز ہیں۔

قَوْلًا دِيلٌ لِّلْاَعْقَابِ مِنَ النَّارِ۔ دِيل اور دِيح دونوں ہم معنی ہیں، فرق صرف یہ ہے کہ اگر مستحق ہلاکت ہے تو لفظ دِيل بولتے ہیں اور اگر مستحق ہلاکت نہیں تو لفظ دِيح کا استعمال ہوتا ہے، ایک ضعیف حدیث میں ہے کہ دِيل

دورخ میں ایک وادی ہے۔

اس حدیث میں لفظ ”تمسح“ آیا ہے اس لئے روافض پیروں کے مسح کے قائل ہیں، وہ کہتے ہیں کہ اگر غنیمت پہنچے ہوئے ہو تو البتہ مسح جائز نہیں۔ روافض نے یہ عجیب اثبات کہہ دی کہ جہاں غسل ہے وہاں مسح کیلئے کہتے ہیں اور جہاں مسح ہے وہاں غسل کو کہتے ہیں۔

باب قول المحدث حدثنا و أخبرنا و أنبأنا الخ

علم کے متعلق چند ضروری باتیں بتلا رہے ہیں کہ محدث کا ”حدثنا“ ”أخبرنا“ ”أنبأنا“ ”سمعت“ اور ”عن“ کہنا ایک ہی معنی رکھتا ہے یا کچھ فرق ہے؟ لغت کے اعتبار سے اس میں چنداں فرق نہیں، تدرار محدثین کے نزدیک اس میں کوئی تنگی اور کوئی فرق نہیں تھا، اکثر وہ لوگ ایک کو دوسری جگہ استعمال کرتے تھے، متاخرین کے یہاں البتہ ضیق پیدا ہو گیا، کیونکہ انھوں نے اصطلاحیں قائم کر لیں — یہ دراصل اساتذہ سے عمل حدیث کے مختلف طریقے ہیں، ایک طریقہ تو یہ ہے جو اس وقت یہاں ہو رہا ہے، اگر کسی کو یوں حدیث حاصل ہو کہ تلمیذ نے پڑھ کر سنائی اور اساتذہ نے تقریر کر دی (یعنی نعم کہیا) تو اس کو قراءۃ علی شیخ کہیں گے۔ اور ایک یہ ہے کہ اساتذہ خود پڑھے اور تلامذہ سامع ہوں، تو اسے ”قراءۃ الشیخ“ کہتے ہیں، اب دونوں صورتوں میں روایت کرنے کے وقت کیا کہیں؟ ایک ہی لفظ کہیں یا علیحدہ علیحدہ؟ امام بخاری کہتے ہیں کہ ہر دو صورت میں ”حدثنا“ ”أخبرنا“ ”أنبأنا“ سب کہہ سکتے ہیں، اس میں کوئی فرق نہیں، یہی تدرار محدثین سے معنی کا ائمہ اربعہ سے بھی منقول ہے کہ سب متساوی ہیں۔

امام مسلم اس میں فرق کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ ”حدثنا“ شیخ کے پڑھنے پر کہیں گے، اور اگر تلمیذ نے پڑھا تو ”أخبرنا“ کہیں گے۔ امام مسلم ان دونوں فرقوں کی رعایت بہت کرتے ہیں، چنانچہ کبھی صرف اسی کی وجہ سے تحویل کر دیتے ہیں۔ متاخرین کہتے ہیں کہ ایسی صورت میں جب کہ شیخ نے پڑھا ہو نہ تلمیذ نے بلکہ صرف اجازت دی ہو کہ فلاں حدیث یا فلاں کتاب کی اجازت دیتا ہوں تو اس وقت ”أنبأنا“ کہیں گے — اور اگر ”مناولہ“ ہے، یعنی یہ کہ شیخ نے کتاب دے دی کہ اسے سننا دیا، سن کر سکوت کیا، تو ایسی صورت میں ”ناولنی“ کہا جائے گا مگر اس صورت میں مشافہہ شرط ہے، اگر مشافہہ نہیں ہے بلکہ اس نے کتاب بیچ دی تو اسے ”مکاتبہ“ کہیں گے — اسی طرح مصنف کی کوئی کتاب ہیں لگتی رہے ہیں ہی تھی نہ اجازت تھی نہ لکھی تھی، مگر پھر بھی ہم اسے روایت کرنے لگیں تو اسے ”وجادۃ“ کہیں گے — آگے پھر اختلاف ہے کہ اخبار اور تحدیث میں اتویٰ کون ہے یعنی شیخ کا سنانا اتویٰ ہے یا شیخ کا سننا اور تلمیذ کا پڑھنا؟ اس کے متعلق امام ابو ضیفہ اور امام مالک رحمہما اللہ کے دو قول ہیں، ایک یہ کہ

وَقَالَ ابْنُ مَسْعُودٍ حَدَّثَنَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ الصَّادِقُ

اور ابن مسعود نے کہا ہم سے بیان کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور آپ مجھے تھے اللہ جو آپ سے کہا گیا وہ بھی

الْمُضِدُّ وَقَالَ شَقِيقٌ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

”ج“ تھا اور شقیق نے عبد اللہ ابن مسعود سے نقل کیا میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات سنی اور

كَلِمَةً كَذَا وَقَالَ حَذِيفَةُ حَدَّثَنَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَدِيثَيْنِ

جذیفہ نے کہا ہم سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دو حدیثیں بیان کیں اور ابو العالیہ نے روایت کی

وَقَالَ أَبُو الْعَالِيَةِ عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيمَا يَرَوِي

ابن عباس سے انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ نے اپنے پروردگار سے اور انس نے

عَنْ رَبِّهِ وَقَالَ أَنَسٌ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَرَوِيهِ عَنْ رَبِّهِ ، وَ

آنحضرت نے اللہ علیہ وسلم سے روایت کی آپ نے اپنے پروردگار سے اور ابو ہریرہ نے آنحضرت

قَالَ أَبُو هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَرَوِيهِ عَنْ رَبِّهِمْ

صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ، کہا کہ آپ اس کو تمھارے مالک سے روایت کرتے ہیں جو

تَبَارَكَ وَتَعَالَى

برکت والا اور بلند ہے

دووں متادی ہیں ، دوسرا یہ سماع من الشیخ سے قرآنہ علی الشیخ افضل ہے ، کیونکہ جب شاگرد خود سنائے گا تو چونکہ وہ اپنے لئے کرتا ہے اس لئے

خوب احتیاط کرے گا اور اگر شیخ پڑھے گا تو اس قدر اعتناء نہ کرے گا ، بہتر فیصلہ وہ ہے جو حافظ [ابن حجر] نے فتح الباری میں اور دیگر تصنیفات

میں بھی تحریر فرمایا ہے کہ احوال مختلف ہیں ، کہیں حدیث آوی ہوگی ، کہیں اجتہاد ، جہاں پر جو مامون عن الغلط ہو وہاں وہی آوی ہوگا لہذا فیصلہ

یک طرفہ نہیں ہونا چاہئے — بخاری دونوں کو ایک کہتے ہیں ۔

تو قال ابن مسعود الخ ، امام بخاری اس کے نظائر پیش کر رہے ہیں کہ ایک کو دوسرے کی جگہ استعمال کرتے ہیں دیکھئے

کہیں ”حدثنا“ کہیں ”أخبرنا“ کہیں ”أبنا“ کہیں ”سمعت“ اور کہیں ”عن“ ہے ، لہذا سب برابر ہیں ۔

حدیث قدسی وہ ہے کہ پیغمبر علیہ السلام بصر کجا فرمائیں کہ یہ اللہ نے کہا اور وہ قرآن کے علاوہ ہو ، اگر تصریح نہ ہو تو وہ حدیث قدسی نہیں ہوگی

اگرچہ اللہ ہی کی طرف سے ہو فرمایا : ”إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيِي يُوحَى“ دہی تو سب ہی ہے مگر حدیث قدسی اسی وقت ہوگی جب خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم فرمائیں

۵۹۔ حَدَّثَنَا قُتَيْبَةُ بْنُ سَعِيدٍ قَالَ حَدَّثَنَا إِبْرَاهِيمُ بْنُ جَعْفَرٍ عَنْ

ہم سے قتیبہ بن سعید نے بیان کیا کہ ہم سے ابراہیم بن جعفر نے بیان کیا ، انھوں نے عبد اللہ بن

عبد اللہ بن دینار عن ابن عمر قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ان

دینار سے انھوں نے عبد اللہ بن عمر سے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ، درختوں میں ایک درخت ایسا ہے

مِنَ الشَّجَرِ شَجَرَةٌ لَا يَسْقُطُ وَرَقُهَا وَإِنَّمَا مِثْلُ الْمُسْلِمِ لِحَدِّ ثَوْبِي مَا هِيَ فَوْقَ النَّاسِ

جس کے پتے نہیں چھڑتے اور مسلمان کی مثال وہی درخت ہے ، تو مجھ سے بیان کرو وہ کون سا درخت ہے ؟

فِي شَجَرِ الْبَوَادِي ، قَالَ عَبْدُ اللَّهِ وَقَعَ فِي نَفْسِي أَنِّي النَّخْلَةُ فَاسْتَحْيَيْتُ ثُمَّ

پسنگر ٹوٹوں کا خیال جنگل کے درختوں کی طرف دھرا ۔ عبد اللہ نے کہا میرے دل میں خیال آیا کہ وہ کھجور کا درخت ہے

قَالُوا حَدِّثْنَا مَا هِيَ يَا رَسُولَ اللَّهِ ، قَالَ هِيَ النَّخْلَةُ ۔

مشرم سے کہہ دیا ، آخر صحابہ نے حضور سے پوچھا آپ ہی بیان فرمادیجئے یا رسول اللہ وہ کون سا درخت ہے ؟ آپ نے فرمایا وہ کھجور کا درخت ہے

کہ اللہ نے کہا ۔

حدیث ۵۹ : قَوْلًا فَحَدَّثُونِي أَنَّهُ بَعْضُ كَيْفِ تَرْجُمَةٍ مِّنَ لَفْظِ "حَدَّثُونِي" سَہ ہے ، آگے

ہے : ثُمَّ قَالَ وَاحِدًا ثَنَا "اور سے بھی حد ثنا" کہا گیا اور اُور سے بھی "حدَّثُونِي" فرمایا گیا ، اس سے معلوم ہوا کہ اگر

سنائے تو بھی حدیث ہے اور اسناد سنائے تب بھی حدیث ہے ، اس میں کچھ فرق نہیں ہے ، حافظ نے لفظ "حدَّثُونِي" کو ترجمہ

قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ لفظ مختلف طور پر آیا ہے ، کہیں "حدَّثُونِي" کہیں "اخبروني" اور کہیں "ابنوني" ۔ تو معلوم ہوا

کہ سب ایک ہیں ، واللہ اعلم ۔

ماہل حدیث یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امتحان لیا کہ ایک درخت ہے جس کے پتے نہیں چھڑتے اور وہ مثل مسلم کے ہے ،

تشبیہ کس چیز میں ہے ، اس کا یہاں ذکر نہیں ۔

قَوْلًا فَوْقَ النَّاسِ أَنَّهُ يَتَنَبَّهُ فِي جَنْجَلِ الْبَوَادِي فِي بَابِ كَوْنِ سَادَرِ نَخْلَةٍ ، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد

یہ ہے کہ

قَوْلًا فَاسْتَحْيَيْتُ ۔ میں شرابیا ، شرم کی وجہ وہ ہے جو ہاں سے اٹھ کر آنے کے بعد حضرت عمر سے انھوں نے خود

بتائی ہے کہ مجھے اس بات پر شرم آئی کہ یہاں مجلس میں اتنے بڑے بڑے لوگ موجود ہیں ، میں کس طرح ان پر سبقت کروں ، سیدنا عمرؓ

باب ۷ طرَحُ الْإِمَامِ الْمَسْئَلَةِ عَلَى أَصْحَابِهِ لِیَخْتَرِمَا عِنْدَهُمْ مِنَ الْعِلْمِ

استاذ اپنے شاگردوں کا علم آزمانے کے لئے کوئی سوال کرے ، اس کا بیان ۔

۶۔ حَدَّثَنَا خَالِدُ بْنُ مَخْلَدٍ قَالَ سَأَلْتُ سُلَيْمَانَ بْنَ بِلَالٍ قَالَ سَأَلْتُ

ہم سے بیان کیا خالد بن مخلد نے ، کہا ہم سے بیان کیا سلیمان ابن بلال نے ، کہا ہم سے

عَبْدُ اللَّهِ بْنُ دِينَارٍ عَنْ ابْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ إِنَّ مِنْ

بیان کیا عبداللہ ابن دینار نے انھوں نے عبداللہ ابن عمر سے ، انھوں نے نبی جلی اللہ علیہ وسلم سے ، آپ نے

الشَّجَرِ شَجَرَةً لَا يَسْقُطُ وَرَقُهَا وَإِنَّمَا مَثَلُ الْمُسْلِمِ حَدَّثَنِي مَا هِيَ ۚ

فرمایا درختوں میں ایک درخت ایسا ہے جس کے پتے نہیں جھڑتے اور مسلمان کی وہی مثال ہے ، مجھ سے بیان کہ وہ کون سا درخت ہے ؟

نے فرمایا اگر تو اس وقت کہہ دیتا تو میرے لئے ” عمر انعم “ سے زیادہ بہتر ہوتا ، کیونکہ جب آپ سنتے تو تقویٰ فرماتے اور برکت کی دعا فرماتے اس سے ہمارے اور ہمارے خاندان کے لئے خوشی کا عمدہ موقع ہوتا کیونکہ کسی اور کا ذہن ادھر نہیں منتقل ہوا — چنانچہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے فرمایا کہ وہ کھجور ہے ۔

علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ مسلم سے شایبہ کس طرح ہے ، بعضوں نے لکھا ہے کہ کھجور کا ادیکا معرکت جاتا ہے تو وہ خشک ہو جاتا ہے اور آدمی کا حال بھی یہی ہے کہ سرکرت جائے تو وہ ختم ہو جاتا ہے ، اسی بات میں حضور نے اس کو آدمی سے تشبیہ دی — بعضوں نے لکھا ہے کہ تاہر غل و قطع میں تشبیہ ہے کہ زرمادہ کا ہونا اور محبت ہونا اور میلان ہونا ، یہ مرد و عورت کا خالق ہے ، اور یہی ب باتیں کھجور میں بھی پائی جاتی ہیں — اور ایک ضعیف روایت کی نے پیش کی ہے کہ آدم علیہ السلام کے بنانے کے بعد کچھ مٹی پر ریح تھی اس سے کھجور کی تخلیق ہوئی ، اس لئے یہ انسان کی جو بھی جگہ ہے اور یہی وجہ شایبہ ہے : مگر حافظہ نے لکھا ہے کہ یہ روایت ساقط الا اعتبار ہے ۔

میں کہتا ہوں کہ اگر اس روایت کو تسلیم بھی کر لیا جائے تب بھی بات نہیں بنتی کیونکہ حضور نے مثل مسلم فرمایا ہے ، مثل آدمی نہیں فرمایا ، اور ان تمام صورتوں میں یہی لکھا ہے کہ شایبہ آدمی سے ہے ، تو اصل سوال حل نہیں ہوا کہ مثل مسلم کیوں کہا ، وجہ شہدہ بتلاؤ جو مسلم اور کھجور میں مشترک ہو ۔ میرے نزدیک صحیح یہ ہے کہ جس طرح کھجور کے ہر ہر جز سے انتفاع کیا جاتا ہے ، ایسے ہی مسلم کا مال ہے کہ ہر حال میں نفع پہونچتا ہے ، کوئی حال اس کا بیکار نہیں ، حتیٰ کہ اگر کٹاٹاگے تب بھی اسے ثواب ملتا ہے ، اپنے علم سے ، زبان سے ، ہاتھ پاؤں سے مرکب ، زندہ رہ کر ، غرض ہر طرح سے نفع پہونچتا ہے ، اگر کہا جائے کہ ایسے اور بھی درخت ہیں تو ہم کہیں گے ہوں گے ، ہمارا کیا نقصان ، ہم تو ہر شے صرف اس میں دیکھتے ہیں کہ جس چیز سے تشبیہ دی اس میں کیا کیا صورتیں ہیں اور انطباق کیسے ہے ؟ چونکہ عرب میں یہ چیز بالکل

قَالَ وَقَعَ النَّاسُ فِي شَجَرِ الْبَوَادِي، قَالَ عَبْدُ اللَّهِ وَقَعَ فِي نَفْسِي أَنَّهُ النَّخْلَةُ
 یہ سن کر جنگل کے ذہن میں پڑے (ان کا خیال ادھر گیا) عبد اللہ نے کہا میرے دل میں آیا کہ وہ کھجور کا
 فَاسْتَحْيَتْ، ثُمَّ قَالُوا حَدِّثْنَا يَا رَسُولَ اللَّهِ مَا هِيَ؟ قَالَ هِيَ النَّخْلَةُ
 درخت ہے لیکن (بزرگ لوگ بیٹھے تھے) مجھ کو شرم آئی، آخر صحابہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ آپ
 ہی فرمائیے! آپ نے فرمایا: کھجور کا درخت ہے۔

واضح تھی اس لئے اسی کو بیان کر دیا، تو تشبیہ برکت اور فیض میں ہے۔ بعض روایات میں ہے کہ جس طرح کھجور کا کوئی پتہ نہ گزرتا نہیں
 اسی طرح مسلم کی دعا مضائع نہیں ہوتی، یا تو اجر ملے گا یا دعا پوری ہوگی۔

باب طُرُجُ الْأَمَامِ الْمُسْلِمَةِ عَلَى أَحْبَابِهِ اخ

پہلے باب میں حدیث گند مچکی ہے، یہاں بخاری اس غرض سے یہ حدیث لائے ہیں کہ استاذ کبھی کبھی شاگردوں کے علم اور
 تیقظ اور توجہ کا امتحان لیتا رہے، تاکہ شاگرد ہمہ وقت متوجہ اور ہوشیار رہے۔ غامض نہ ہونے پائے کہ استاذ کے فیوض
 سے محروم رہ جائے۔

حدیث ۶۰: یہاں پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے سوال کیا اور ساتھ ہی امتنا پتہ بھی دیدیا کہ
 ذہن ادھر منتقل ہو سکے اگر کسی کا ذہن ادھر منتقل نہ ہوا، صرف عبد اللہ ابن عمرؓ کا ذہن ادھر گیا اگر وہ بڑوں کے سامنے بولنے کی جرات نہ کر سکے، ان کا
 ذہن کیوں منتقل ہو گیا، اس کی وجہ اس وقت یہ ہوگی کہ حضورؐ کے پاس اس وقت چہار لایا گیا تھا، چہار اس سفید گونے کو کہتے ہیں جو کھجور کے اندر سے
 نکلتا ہے اور کھایا جاتا ہے، اس وقت چہار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک میں تھا، اس لئے ان کا ذہن ادھر منتقل ہو گیا۔

دوسری بعض روایتوں میں یہ ہے کہ آپؐ نے اسی وقت یہ آیت تلاوت فرمائی: اَللّٰهُ تَوَكَّفَ صَرْبَ اللّٰهِ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً
 كَمَا تَجَرَّ طَيِّبَةً اَصْلُهُا نَائِبٌ وَفَرَّهَا فِي السَّمَاءِ ه تَوَتَّى اَكْهَأ كُلَّ حَيْنٍ، اس میں کلمہ طیبہ کی مثال دیکھ کر مسلم ہی ذکر پڑھتا ہے، تو اب
 "مَثَلُ الْمُسْلِمِ" کا مطلب یہ ہوا کہ مثل کلمۃ المسلمہ یا "مثل دین المسلمہ"۔ قرآن نے جس کی مثال بیان کی وہ کیا ہے؟ وہ غلبہ، تو اب
 ایک دوسری وجہ شبہ پیدا ہوئی کہ اس کی جڑ زمین میں اور شاخیں آسمان پر توتی اکلھا کل حین الایہ۔ ہر موسم میں پھل لاتا ہے یا کہ ہر وقت

باب ۸۱۰ الْقِرَاءَةُ وَالْعَرْضُ عَلَى الْمُحَدِّثِ وَرَأْيُ الْحَسَنِ وَالثَّوْرِيِّ

شاگردِ استاد کے سامنے پڑھے اور اس کو سنائے ، اس کا بیان ، اور امام حسن بصری اور

وَمَالِكُ الْقُرَاءَةُ جَائِزَةٌ وَاحْتِجَّ بَعْضُهُمْ فِي الْقِرَاءَةِ عَلَى الْعَالِمِ بِحَدِيثِ
سفیان ثوری اور مالک نے شاگرد کے پڑھنے کو جائز رکھا ہے ، اور بعضوں نے استاد کے سامنے پڑھنے کی دلیل ضمام بن ثعلبہ

ضَمَامُ بْنُ ثَعْلَبَةَ أَنَّهُ قَالَ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اللَّهُ أَمَرَكَ أَنْ

کی حدیث سے لی ہے ، اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا : کیا اللہ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ ہم لوگ نماز

نُصَلِّي الصَّلَاةَ قَالَ نَعَمْ ، فَهَذِهِ قِرَاءَةُ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ،

پڑھا کریں ؟ آپ نے فرمایا : ہاں ، تو یہ (گواہ) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پڑھنا ہی ٹھہرا ، ضمام نے (پھر

أَخْبَرَ ضَمَامُ قَوْمَهُ بِذَلِكَ فَأَجَارَوْهُ ، وَاحْتِجَّ مَالِكٌ بِالصَّحَابَةِ يُقْرَأُ عَلَى الْقَوْمِ

جا کر) اپنی قوم سے یہ بیان کیا تو انھوں نے اس کو جائز رکھا ، اور امام مالک نے دستاویز سے دلیل لی جو پڑھ کر لوگوں کو

يَقُولُونَ أَشْهَدُنَا فُلَانٌ وَيُقْرَأُ عَلَى الْقُرِيِّ فَيَقُولُ الْقَارِئُ أَقْرَأَنِي فُلَانٌ .

سنائی جاتی ہے ، وہ کہتے ہیں : ہم کو فلاں شخص نے اس دستاویز پر گواہ کیا ، اور پڑھنے والا پڑھ کر استاد کو سناتا ہے

پھر کہتا ہے : مجھ کو فلاں نے پڑھایا

خوب پھل لاتا ہے اور لوگ منتفع ہوتے ہیں ، تو مثال یہ ہوئی کہ مسلم کے دین سے ، علم سے ، کلمات سے ، لوگ دیسے ہی منتفع ہوتے ہیں ، جیسے

کہ نخل سے ، اب دوسرے نے کیا ہو گئے کہ اسی وقت جہار آیا اور اسی وقت آیت بھی تلاوت فرمائی اور اسی وقت آپ نے سوال بھی فرمایا ، ان

قرآن سے ابن عمر سمجھ گئے مگر شرم سے کہہ نہ سکے .

باب ۸۱۱ الْقِرَاءَةُ وَالْعَرْضُ عَلَى الْمُحَدِّثِ

اس کو مستقل طور پر اس لئے لائے کہ اس کا حجت ہو نا دلیل سے معلوم ہو جائے ، حسن بصری ، سفیان ثوری اور امام مالک کے

نزدیک قراۃ علی الشیخ جائز ہے ، امام مالک سے کوئی کہتا کہ آپ خود سنائیے تو خواہ ہوتے اور کہتے کہ قرآن اگر کوئی پڑھ کر سنائے تو تم

تصدیق کر دیتے ہو ، پھر حدیث میں کیوں تصدیق نہیں کرتے ، کبھی کبھی خود بھی سناتے تھے ، چنانچہ امام محمد کو پانچ سو احادیث سنائیں اور یہ ان کی

خصوصیات سے ہے ، اور کسی کے لئے امام مالک نے یہ گوارہ نہیں کیا .

قَوْلُ اللَّهِ أَمَرَكَ أَنْ نُصَلِّي الصَّلَاةَ ، قَالَ نَعَمْ . تَوْجِيهُ قِرَاءَةِ عَلَى الْعَالِمِ . وَاحْتِجَّ بَعْضُهُمْ فِي بَعْضِهِمْ

۶۱۔ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ سَلَامٍ قَالَ سَمِعْتُ مُحَمَّدَ بْنَ الْحَسَنِ الْوَاسِطِيَّ

ہم نے محمد ابن سلام بکندی نے بیان کیا ، کہا ہم سے محمد ابن حسن واسطی نے بیان کیا ، انھوں نے

عَنْ عَوْفٍ عَنِ الْحَسَنِ قَالَ لَا بَأْسَ بِالْقِرَاءَةِ عَلَى الْعَالِمِ وَحَدَّثَنَا عَبْدُ اللَّهِ

عوف سے ، انھوں نے امام حسن بصری سے ، انھوں نے کہا عالم کے سامنے پڑھنے میں کوئی نجات نہیں ، اور

بْنُ مُوسَى عَنْ سُفْيَانَ قَالَ إِذَا قَرَأَ عَلَى الْمُحَدِّثِ فَلَا بَأْسَ أَنْ يَقُولَ حَدَّثَنِي

ہم سے عبد اللہ ابن موسیٰ نے بیان کیا ، انھوں نے سفیان ثوری سے سنا ، وہ کہتے تھے ، جب کوئی شخص محدث کو

قَالَ وَسَمِعْتُ أَبَا عَاصِمٍ يَقُولُ عَنْ مَالِكٍ وَسُفْيَانَ الْقِرَاءَةُ عَلَى الْعَالِمِ وَقِرَاءَتُهُ

حدیث پڑھ کر سنا لے تو کچھ قات نہیں اگر یوں کہے کہ اس نے مجھ سے بیان کیا ۔ اور میں نے ابو عاصم سے سنا وہ امام مالک

سَوَاءٌ

اور سفیان ثوری کا قول بیان کرتے تھے کہ عالم کو پڑھ کر سنا اور عالم کا شاگردوں کے سامنے پڑھنا دونوں برابر ہیں ۔

۶۲۔ حَدَّثَنَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ يُوسُفَ قَالَ حَدَّثَنَا اللَّيْثُ عَنْ سَعِيدِ

ہم سے عبد اللہ ابن یوسف نے بیان کیا ، کہا ہم سے لیث سے بیان کیا ، انھوں نے

هُوَ الْمُقْبَرِيُّ عَنْ شَرِيكَ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ أَبِي نَمْرَانَ سَمِعَ أَنَسَ بْنَ مَالِكٍ يَقُولُ

سعید بصری سے ، انھوں نے شریک ابن عبد اللہ ابن ابی نمر سے ، انھوں نے انس ابن مالک سے سنا ایک بار ہم

بَيْنَمَا نَحْنُ جُلُوسٌ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْمَسْجِدِ دَخَلَ رَجُلٌ عَلَى حِمْلِ

مسجد میں آخفت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بیٹھتے تھے ، اتنے میں ایک شخص اونٹ پر سوار آیا اور اونٹ کو مسجد میں بٹھا کر بلند

فَاتَاخَهُ فِي الْمَسْجِدِ ثُمَّ عَقَلَهُ ثُمَّ قَالَ لَهُمْ أَيُّكُمْ مُحَمَّدٌ وَالنَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ

دیا ، پھر پوچھنے لگا (جائیو) کون ہے ؟ آخفت صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت لوگوں میں حکیم

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُتَكَيٍّ بَيْنَ ظَهْرَانِيهِمَا

لگا لگے بیٹھتے تھے ۔

مرا دوں ہیں ؟ بین السطور میں لکھا ہے کہ یہ حمیدی ہیں ، اور حمیدی نے اس کو نواد میں لکھا ہے ۔

حافظ نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ میں مقدمہ میں لکھ چکا تھا کہ حمیدی مراد ہیں مگر اب مجھے معلوم ہوا کہ ابوسعید صدام مراد ہیں ،

فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اللَّهُمَّ نَعَمْ، فَقَالَ الرَّجُلُ اأَمَنْتُ بِمَا جِئْتُ بِهِ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : ہاں میرے اللہ ! تب وہ شخص کہنے لگا جو حکم آپ (اللہ کے پاس سے) لائے ہیں میں

وَأَنَا رَسُولُ مَنْ وَرَائِي مِنْ قَوْمِي وَأَنَا ضَامٌّ بِنِ ثَعْلَبَةَ أَخُو بَنِي سَعْدِ بْنِ بَكْرٍ .

ان پر ایمان لایا اور میں اپنی قوم کے لوگوں کا جو یہاں نہیں آئے، بیجا ہوا ہوں : میرا نام ضمام ابن ثعلبہ ہے بنی سعد ابن بکر کے خاندان سے۔

رَوَاهُ مُوسَى وَعَلِيُّ بْنُ عَبْدِ الْحَمِيدِ عَنْ سُلَيْمَانَ عَنْ ثَابِتٍ عَنْ أَنَسٍ

اس حدیث کو (یث کی طرح) کوئی اور علی ابن عبد الحمید نے سلیمان سے روایت کیا، انھوں نے ثابت سے انھوں

عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هَذَا

نے انس سے، انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی مضمون

قَوْلُهُ وَفِرَّأَعْلَى الْقُرَى، مَقْرُوءٌ: قَوْلَانِ فِي تَقْلِيمِ دِينَ وَاللَّهِ. يَهَابُ نَهْيُ مَقْرُوءٍ كِي تَصَدِّقُ كِي بَعْدَ تَقَارِي كِي كَا: اقْرَأْ أَيْ فَلَنْ

(یعنی فلاں نے مجھے پڑھایا) اور اس پر اعتماد کیا جائے گا۔

سِوَاءُ، مَعْنَى دُونَ حُجَّتِ هِيَ.

حَدِيثُ ۶۲ :

قَوْلُهُ فَاِنَاخَتْهُ فِي الْمَسْجِدِ، بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اونٹ کو مسجد میں بٹھادیا تھا، اس سے امام مالک نے استدلال کیا کہ

اَكُوْلُ الْهَلْمِ كِي اِرْدَاثِ وَاِبْوَالِ طَاهِرِ هِيَ، وَهِيَ اِسْهَوْرَتِ عَالٍ كِي حَضُوْرُ كِيُوْنِ بَرَزَارِ رَكْعَتِ، يَنْ كِتَابُ اِهْوَالِ كِي حَضُوْرُ كَا مَعَالِ مَسْجِدِ كِي سَاحَةِ يَحَاكُ اَكْرُ

کوئی مسجد میں تھوک دیتا تو حضور حک فرماتے اور زعفران ملتے، جب تھوک کے باب میں یہ قول تھا اور اِردَاثِ وَاِبْوَالِ کو اگر پاک بھی فرض کر لو تو

اِسْ كِي حَضُوْرُ كِيُوْنِ پند فرما سکتے تھے، حقیقت یہ ہے کہ یہ استدلال صحیح نہیں، کیونکہ یہ یقینی نہیں کہ مسجد میں بٹھایا، چنانچہ دوسری روایات میں

تَمَرَّعَ هِيَ كِي مَسْجِدِ كِي قَرَبِ بَٹْطَلَا، پھر مسجد میں داخل ہوئے، اسی بنا پر وہاں یہ لفظ ہے تَحَدَّ خَل (پھر داخل ہوئے) لَفْظًا تَحَدَّ

بتلاتا ہے کہ پہلے باہر بٹھادیا پھر مسجد میں آئے۔

قَوْلُهُ بَيْنَ عَظْمَيْ نِيْهَمٍ، ظَهَرَ كَاتِبُهُ ظَهْرَانِ هِيَ، پھر ظہران کو مفرد کے حکم میں قرار دے کر دوبارہ تشبیہ کی علامت اس کے ساتھ

لگادی اور ایسا بطور مشبوع ہوتا ہے، اور یہ لفظ اس وقت ہوتے ہیں جب مجمع کثیر ہو اور ایک دوسرے کی طرف پیٹھ کئے بیٹھے ہوں۔

قَوْلُهُ هَذَا الرَّجُلُ الْاِمِيْضُ، مراد خالص بیاض نہیں، بلکہ "بیاض شوب بجمرة" مراد ہے، "بیسے گلاب" چونکہ اس میں

سفیدی غالب ہوتی ہے اس لئے بیاض سے تعبیر کر دیا۔

قوله يا ابن عبد المطلب . شاید یہ بھی اس کی طرف اشارہ ہو کہ عبد المطلب نے کہا تھا کہ یہ نبی ہوگا ، علاوہ ازیں خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حنین میں فرمایا تھا ۔

انا النبي لا كذب : انا ابن عبد المطلب

تو یہ بھی دراصل تعظیم کے لئے تھا۔

قولہ: قد اجبتك، فرماتے ہیں کہ جواب میں دے چکا، یعنی میں بالکل تیار ہوں، تو کیا کہ جواب دے چکا۔ جیسا سوال تھا دیا ہی جواب دیا، یہ کمال بلاغت ہے۔

قول: فمشدّد علیک، سختی سے مراد یہ ہے کہ وہ سوالات آپ کی شان کے خلاف ہوں گے، یہ کمال فطانت ہے کہ [پہلے معذرت خواہی اختیار کرتے ہوئے ناگہری کے خون سے] آگے کے لئے روک لگادی۔

وَجَعَلَ فِيهَا الْمَنَافِعَ اللَّهُ أَرْسَلَكَ ۖ قَالَ نَعَمْ ۚ قَالَ زَعَمَ رَسُولُكَ أَنَّ عَلَيْنَا

اھ ان میں فائدے کی چیزیں بنائیں، کیا اللہ نے آپ کو بھیجا ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں! پھر اس نے کہا: آپ کے ایلچی نے کہا ہم پر

خَمْسَ صَلَوَاتٍ وَزَكَاةٍ فِي أَمْوَالِنَا ۖ قَالَ صَدَقَ ۚ قَالَ بِالَّذِي أَرْسَلَكَ اللَّهُ

پانچ نمازیں ہیں اور اپنے مالوں کی زکوٰۃ دینا ہے؟ آپ نے فرمایا: اس نے سچ کہا۔ تب وہ کہنے لگا: تو تم اس کی جس نے

أَمَرَكَ بِهَذَا ۖ قَالَ نَعَمْ ۚ قَالَ وَزَعَمَ رَسُولُكَ أَنَّ عَلَيْنَا صَوْمَ شَهْرٍ فِي سَنَتِنَا

آپ کو بھیجا ہے کیا اللہ نے آپ کو اس کا حکم دیا ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں! پھر اس نے کہا: آپ کا ایلچی کہتا ہے کہ ہم پر سال بھر

قَالَ صَدَقَ ۚ قَالَ بِالَّذِي أَرْسَلَكَ اللَّهُ أَمَرَكَ بِهَذَا ۖ قَالَ نَعَمْ ۚ قَالَ وَزَعَمَ

میں ایک مہینہ کے روزے ہیں؟ آپ نے فرمایا: سچ کہتا ہے۔ تب وہ کہنے لگا: تم اس کی جس نے آپ کو بھیجا ہے کیا اللہ نے آپ کو حکم

رَسُولُكَ أَنَّ عَلَيْنَا حَجَّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا ۖ قَالَ صَدَقَ

دیا ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں۔ تب وہ کہنے لگا: آپ کے ایلچی نے یہ بھی کہا کہ ہم پر حج ہے یعنی اس پر جو وہاں تک پہنچنے کا راستہ پاس کے

ۚ آپ نے فرمایا: سچ کہا!

قَوْلُهُ فَلَا تَجِدُ عَلَىٰ فِي نَفْسِكَ ۚ یہ مانع ہے موجدۃ سے، جس کے معنی غفہ کے ہیں، وجدل یجدل کے معاصد

بہت ہیں اور ماضی مضارع ایک ہیں، کبھی وجود، بمعنی موجود ہونا، کبھی وجدان آتا ہے جبکہ گم شدہ یا کوئی مطلوب مل جائے، کبھی

وجد آتا ہے جبکہ محبت میں دلگیر ہو، کبھی موجدۃ آتا ہے غفہ ہونے کے معنی میں، تو جہاں جو معنی مناسب ہو وہی لئے جاتے

ہیں، یہاں مناسب یہ ہے کہ غضب اور غفہ کے معنی مراد لئے جائیں۔

قَوْلُهُ اَللّٰهُمَّ، یہ مزید تاکید کے لئے ہے۔

قَوْلُهُ اٰمَنْتَ (میں ایمان لاچکا) یہ ترجمہ اس لئے کیا کہ اکثر کے نزدیک یہ پہلے اسلام لاچکے تھے، پھر مزید یکتائی کیلئے

آئے تھے۔

قَوْلُهُ وَاِنَّا ضَامِنٌ لِّعَلْبَةِ اَخِي بَنِي سَعْدِ بْنِ بَكْرٍ: بخاری کہتے ہیں کہ یہ پہلے ایمان لاچکے تھے اور وفد میں شامل ہو کر

آئے تھے، بنو سعد کا یہ خاندان قبیلہ ہوازن کی ایک شاخ ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عیسیٰ سعید رضی اللہ عنہما کے ہاں قیام کے دوران

پرورش پائی تھی

قَوْلُهُ رَوَاهُ مُوسَى: یہ تعلقاً بیان کرتے ہیں کہ اس کی حدیث ثابت بنانی کے طریق سے بھی ہے، آگے پوری سند لاتے ہیں۔

قَالَ فَبِالَّذِي أَرْسَلْتُكَ اللَّهُ أَمَرَكَ بِهَذَا؟ قَالَ نَعَمْ، قَالَ فَوَالَّذِي

میں وہ کہنے لگا: تم اس کی جس نے آپ کو بھیجا ہے، کیا اللہ نے آپ کو اس کا حکم دیا ہے؟ آپ نے فرمایا ہاں، تب اس نے کہا: بَعَثَكَ بِالْحَقِّ لَا أَرِيدُ عَلَيْكَ شَيْئًا وَلَا أَنْقُصُ، فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ صَدَقَ لِيَدْخُلَنَّ الْجَنَّةَ۔

میں اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر یہ سچ بولتا ہے تو ضرور جنت میں جائے گا۔

بَابُ مَا يُذَكِّرُ فِي الْمَنَاقِلَةِ وَكِتَابُ أَهْلِ الْعِلْمِ بِالْعِلْمِ إِلَى

منازلہ کا بیان اور عالموں کی علم کی باتوں کو لکھ کر دوسرے شہروں میں بھیجنے کا بیان۔

الْبُلْدَانِ وَقَالَ أَنَسٌ نَسَخَ عُثْمَانُ الْمَصَاحِفَ فَبَعَثَ بِهَا إِلَى الْأَفْئَاتِ

انہی نے کہا: حضرت عثمان نے مصحف لکھوائے اور ملکوں میں بھیجوائے۔

حدیث ۶۳، قَوْلُهُ فَبَعَثَ بِهَا إِلَى الْأَفْئَاتِ: يَأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَسْأَلُوا عَنَ شَيْءٍ

مقصود دراصل یہ تھا کہ بے ضرورت سوال مت کرو، مگر چونکہ صحابہ میں خوف غالب تھا اس لئے ڈرتے تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی بات پوچھیں اور وہ درست نہ ہو تو مشکل پڑے اس لئے یہ چاہا کرتے تھے کہ کوئی باہر کا آدمی ایسا آجائے جو سمجھ دار بھی ہو اور بات بھی دھتک کی پوچھے تو ہم کو فائدہ پہنچ جائے۔

سیدنا عمارہ روئے عنی اللہ عز فرماتے ہیں کہ ہم نے کوئی دافع امانا مائل اور سمجھ دار نہیں دیکھا کہ اتنے مختصر طریقے سے تمام ضروری اور اہم باتیں دریافت کر لیں اور آپ نے بھی نہایت خندہ پیشانی سے اطمینان بخش جوابات مرحمت فرمائے، حدیث میں کئی جگہ "رُفِعَ" یا "تُرُفِعَ" آیا ہے۔ سیوہ نے بہت جگہ "رُفِعَ" کو "قال" کے قائم مقام کہا ہے، یہاں بھی "قال" کے معنی ہیں۔

قَوْلُهُ جَعَلَ فِيهَا الْمَنَافِعَ: پہاڑوں میں مختلف قسم کی منفعت بخش چیزیں پائی جاتی ہیں، مثلاً پھل، جڑی بوٹیاں اور جانوروں وغیرہ جڑی چیز یہ ہے کہ وہاں جو برف گر گئی ہے وہ پچھل کر دریاؤں کی شکل میں بہتی ہے جن کے ذریعہ تمام دنیا کی آبیاشی ہوتی ہے اور جن سے اہل دنیا سیراب ہوتے ہیں، تو پہاڑوں میں بہت سی نفع کی چیزیں ہیں۔

وَرَأَى عَبْدُ اللَّهِ ابْنَ عُمَرَ وَيَحْيَى بْنَ سَعِيدٍ وَمَالِكٌ ذَلِكَ جَائِزًا وَاحْتَجَّ بَعْضُ
 اور عبد اللہ بن عمر اور یحییٰ بن سعید انصاری اور مالک نے اس کو جائز رکھا ہے (یعنی بناؤں کو) اور حجاز کے بعض عالموں نے مناولہ کیلئے
 أَهْلَ الْحَجَّازِ فِي الْمُنَاوَلَةِ بِحَدِيثِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَيْثُ كَتَبَ
 آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث سے دلیل لی کہ آپ نے فوج کے ایک سردار کو ایک خط لکھا اور فرمایا کہ اس کو
 لِأَمِيرِ السَّرِّيَّةِ كِتَابًا وَقَالَ لَا تَقْرَأْهُ حَتَّى تَبْلُغَ مَكَانَ كَذَا أَوْ كَذَا، فَلَمَّا بَلَغَ ذَلِكَ
 (کھول کر) پڑھنا نہیں جب تک تو فلاں مقام تک نہ پہنچ لے، جب وہ اس مقام پر پہنچا تو لوگوں کو
 الْمَكَانَ قَرَأَهُ عَلَى النَّاسِ وَأَخْبَرَهُمْ بِأَمْرِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
 اس نے وہ خط پڑھ کر سنایا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ان کو بتلایا۔

باب ما يذكر في المناولة

مناولة : استاد کوئی لکھی ہوئی چیز شافہ دیدے اور کہے کہ میں اجازت دیتا ہوں تو اس کو بیان کر
 قولہ و کتاب اهل العلم : یہ مکاتبت ہے یعنی لکھ کر کہیں بھیج دینا۔

قولہ نسخ عثمان المصاحف : اس سے استدلال کیا کہ عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآن کریم کی نقلیں بھیجی تھیں اور لوگوں نے
 اسے قبول کر لیا تھا، یہ پانچ نقول تھیں اور بعضوں نے سات بھی بتائی ہیں۔

ورأى عبد الله بن عمر : بظاہر مشہور صحابی اور فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے مراد ہیں مگر بعضوں نے لکھا ہے کہ عبداللہ
 ابن عمر رضی اللہ عنہ مراد ہیں کیونکہ ان کا نام یحییٰ ابن سعید کے ساتھ لے رہے ہیں، مگر ظاہر یہی ہے کہ صحابی ہی مراد ہیں۔
 قولہ بعض اهل الحجاز : اس سے مراد حمید ہی ہیں، انھوں نے نوادریں اس سے استدلال کیا ہے۔

قولہ (امير السريّة) : یہ عبداللہ ابن جحش رضی اللہ عنہ ہیں، جو ام المومنین زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کے بھائی ہیں۔
 قولہ واخبرهم بامر النبي صلى الله عليه وسلم : سیر کی روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سیرۃ قریش کی
 خبریں لینے گیا تھا اور بدر کے واقعے سے پہلے گیا تھا، جب نوشتہ پڑھا گیا تو اس میں لکھا تھا کہ خبریں فراہم کرنا اگر کسی سے تعرض نہ کرنا، اور یہ بھی
 تھا کہ کسی کو مجبور نہ کرنا جو چاہے رہے، جو نہ چاہے نہ جائے۔ اس اعلان کے بعد دو آدمی قتل ہوئے، باقی سب آدمی ساتھ گئے۔ امام بخاری
 کا مقصد پورا ہو گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کتاب دی اور فرمایا کہ فلاں منزل پر جا کر پڑھنا۔ جو دو آدمی لوٹ آئے تھے ان کا لوٹ آنا
 اس لئے نہ تھا کہ جان کا خطرہ تھا، بلکہ اس لئے کہ انھوں نے ضرورت نہ سمجھی اور اجازت مل ہی گئی تھی، اس لئے کوئی قابل اعتراض بات بھی نہ تھی، اللہ اعلم

فَقِيلَ لَهُ أَنَّهُمْ لَا يَفْقَهُونَ كِتَابًا إِلَّا أَهْوَاؤًا فَاتَّخَذَ خَاتَمًا مِنْ فِضَّةٍ نَفْسُهُ

لوگوں نے آپ سے عرض کیا: وہ لوگ (عجم کے یا روم کے) وہی خط پڑھتے ہیں جس پر مہر لگی ہو، تو آپ نے چاندی کی ایک

مُحَمَّدُ رَسُولُ اللَّهِ كَأَنِّي أَنْظِرُ إِلَى بَيَاضِهِ فِي يَدِهِ فَقُلْتُ لِقَمَادَةٍ مَنْ قَالَ

انگوٹھی بنوائی، اس پر یہ کھدا تھا "محمد رسول اللہ" انسؓ نے کہا: گویا میں اس انگوٹھی کی سفیدی آپ کے ہاتھ میں دیکھ رہا ہوں

نَفْسُهُ مُحَمَّدُ رَسُولُ اللَّهِ؟ قَالَ أَنَسٌ!

شعبہ نے کہا: میں نے قنَادۃ سے پوچھا: اس پر محمد رسول اللہ کھدا تھا، یہ کس نے کہا؟ انھوں نے کہا انسؓ نے

بَابُ مَنْ قَعَدَ حَيْثُ يَنْتَهِي بِهِ الْمَجْلِسُ وَمَنْ رَأَى فَرْجَهُ

اس شخص کا بیان جو مجلس کے اخیر میں (جہاں جگہ ہو) بیٹھے اور جو حلفت میں

فِي الْخَلْقَةِ فَجَلَسَ فِيهَا

کھل جگہ پا کر اس میں بیٹھ جائے

۶۶ - حَدَّثَنَا إِسْمَاعِيلُ قَالَ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ إِسْحَاقَ بْنِ

ہم سے اسماعیل نے بیان کیا کہا مجھ سے امام مالک نے بیان کیا، انھوں نے اسحاقؒ

عَبْدُ اللَّهِ بْنِ أَبِي طَلْحَةَ أَنَّ أَبَا مَرْثَةَ مَوْلَى عَقِيلِ بْنِ أَبِي طَالِبٍ

ابن عبد اللہ ابن ابی طلحہ سے، ان کو ابو مرثہ عقیل ابن ابی طالب کے غلام نے خبر دی، انھوں نے

أَخْبَرَهُ عَنْ أَبِي وَاقِدٍ اللَّيْثِيِّ

ابو واقد لیثی سے سنا

اس کی حکومت کو پارہ پارہ کر دے، یہ دعاء قبول ہوئی اور خلیفہ دوم سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں اہل اسلام نے اس کی

دھجیاں بکھیر دیں، سلطنت بھی گئی اور خود اس کا حال بھی برا ہوا، اس کی بیوی پر جس کا نام شیریں تھا اس کا زکا عاشق ہو گیا اور اس پر

قبضہ کرنے کے لئے باپ کو ہلاک کر ڈالا، عورت (شیریں) کو جب اس کا علم ہوا تو اس نے زہر کھلایا اور مر گئی، بیٹے نے قوت کی کوئی دوا

کھائی تھی اس میں میت تھی اس کی وجہ سے وہ بھی مر گیا۔ ذوات و اشخاص پر تو یہ تباہی آئی اور ملک پر جو آفت آئی وہ سب کو معلوم ہو

کہ نام و نشان تک مٹ گیا۔ قصہ روم کا تو پھر بھی کچھ حصہ اور نام باقی رہ گیا، حضورؐ نے روم کے متعلق فرمایا ہے اِنْهَالِدْ وَانْتَ

الْقَرُونُ، یعنی وہ سیکنوں والے ہیں، آسانی سے قبضہ میں نہیں آتے، چونکہ اس نے تعظیم کی تھی اس لئے اس کی اتنی حالت باقی رہی

اَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَنَامُ هُوَ جَالِسٌ فِي الْمَسْجِدِ وَالتَّاسِعَةُ
 کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک بار مسجد میں بیٹھے تھے اور لوگ آپ کے ساتھ (بیٹھے) تھے ، انہیں میں سے کسی
 اِذَا قَبِلَ ثَلَاثَةٌ نَفَرٍ فَأَقْبَلَ اِثْنَانِ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَذَهَبَ
 (باہر سے) آئے ، دو تو ان میں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آگئے (آپ کا کلام سننے کو) اور
 وَاحِدٌ قَالَ فَوْقًا عَلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَأَمَّا أَحَدُهُمَا
 ایک چل دیا ، ابوہریرہ نے کہا : پھر وہ دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ کر ٹھہرے ، ان میں سے ایک نے
 فَرَأَى فُجَّةً فِي الْحَلَقَةِ فَجَلَسَ فِيهَا وَأَمَّا الْآخَرُ فَجَلَسَ خَلْفَهُمْ وَأَمَّا الثَّلَاثُ
 تو تھوڑی سی خالی جگہ حلقہ میں دیکھی وہاں بیٹھ گیا اور دوسرا لوگوں کے پیچھے بیٹھا اور تیسرا تو پیٹھ موڑ کر چل دیا ،
 فَأَذْبَرَدَ أَهْبَاءً ، فَلَمَّا فَرَّغَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ إِلَّا أَخْبِرَكُمْ عَنْ
 جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم (دعوت سے) فارغ ہوئے تو فرمایا : کیا میں تم کو تین آدمیوں کا حال نہ بتلاؤں ،
 النَّفَرِ الثَّلَاثَةِ أَمَّا أَحَدُهُمْ فَادْوَى إِلَى اللَّهِ فَأَوَاهُ اللَّهُ وَأَمَّا الْآخَرُ فَاسْتَحْيَى
 ایک نے تو ان میں سے اللہ کی پناہ لی ، اللہ نے اسے جگہ دے دی ، دوسرے نے (اللہ) گھنے میں
 فَاسْتَحْيَى اللَّهُ مِنْهُ وَأَمَّا الْآخَرُ فَاعْرَضَ فَأَعْرَضَ اللَّهُ عَنْهُ .
 لوگوں سے) شرم کی ، اللہ نے بھی اس سے شرم کی ، اور تیسرے نے منہ پھیر لیا ، اللہ نے بھی اس سے منہ پھیر لیا ۔

بخاری کا مقصود حاصل ہو گیا اور منادۃ و مکاتبتہ دونوں کا ثبوت ہو گیا ، عبد اللہ ابن عمر کو کتب دیا تو منادۃ ثابت
 ہوئی اور کسریٰ کے پاس کتب بھیجا تو اس سے مکاتبت ثابت ہوئی ۔

بَابُ مَنْ قَعَدَ حَيْثُ يَنْتَهِي بِهِ الْمَجْلِسُ

فُجَّةٌ اور فُجَّةٌ دونوں طرح سے ہے گر نصح فُجَّةٌ بالفتح ہے ، یعنی اگر فرج ہے تو اندر بیٹھنا غلط ہے نہیں ۔
 حَرْثٌ ۶۶ ، قَوْلًا فَوْقًا عَلَى رَسُولِ اللَّهِ ، یعنی علی مجلس رسول اللہ یا عند رسول اللہ
 قَوْلًا إِلَّا أَخْبِرَكُمْ ، یعنی ان تین کے ساتھ اللہ کا جو معاملہ ہوا تمہیں بتا دوں ۔

قَوْلًا فَادْوَى إِلَى اللَّهِ ، یعنی اس نے خیر کی طرف رغبت کی ، اس لئے اللہ نے بھی اس کو اپنی رحمت کی آغوش میں لے لیا ۔
 قَوْلًا فَاسْتَحْيَى ، یعنی جب اس نے شرم کی تو اللہ نے بھی اس سے شرم کی کہ اس کو محروم رکھے ۔

باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم رَبِّ مُبْلِغٍ أَوْعَى مِنْ سَامِعٍ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جس کو (یہ کلام) پہنچایا جائے وہ کس کو

زیادہ اور کھنے والا ہوتا ہے جس نے مجھ سے سنا۔

۶۷۔ حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ قَالَ حَدَّثَنَا بَشِيرٌ قَالَ حَدَّثَنَا ابْنُ عَوْنٍ عَنْ

ابن عیینہ سے، انھوں نے عبد الرحمن ابن ابی بکرہ سے، انھوں نے اپنے باپ ابو بکرہ سے، انھوں نے

ابن سیرین عن عبد الرحمن بن ابی بکرہ عن أمیه قال ذکر النبی

صلی اللہ علیہ وسلم قعد علی بعیرہ وأمسک إنسان بخطامہ أو بزمامہ

صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا، آپ اونٹ پر بیٹھے تھے (مٹی میں دوہیں ذی بکرہ کو) اور ایک آدمی اونٹ کی کھیل یا اس کی باگ

قال آی یوم هذا فسکنا حتی ظننا أنه سیسمیہ سوی اسمہ قال الیس

تھامے تھا، آپ نے (گوگوں سے) فرمایا: یہ کون سا دن ہے؟ ہم لوگ چپ ہو رہے، یہاں تک کہ ہم سمجھے کہ آپ اس دن کا کچھ

یوم النحر؟ قلنا بلی قال فای شهر هذا؟ فسکنا حتی ظننا أنه سیسمیہ بغير

ادنام رکھیں گے، پھر آپ نے فرمایا کیا یہ یوم النحر نہیں ہے؟ ہم نے کہا، کیوں نہیں! یوم النحر ہے، آپ نے فرمایا یہ کون سا مہینہ ہے؟

اسمہ قال الیس بذی الحجة؟ قلنا بلی قال فان دماءکم وأموالکم

ہم چپ رہے یہاں تک کہ ہم سمجھے آپ اس مہینہ کا جو نام ہے اس کے سوا کوئی اور نام رکھیں گے، آپ نے فرمایا کیا یہ ذی الحجہ کا مہینہ نہیں ہے؟

وأعراضکم بینکم حرأمرکم یومکم هذا فی شهرکم هذا فی بلدکم هذا

ہم نے عرض کیا، کیوں نہیں! یہ ذی الحجہ کا مہینہ ہے، آپ نے فرمایا تو تمہارے خون اور تمہارے مال اور تمہاری آبدیوں ایک دوسرے پر اس طرح سے حرام ہیں جیسے

تمہارے اس دن کی حرمت اس مہینہ میں، اس شہر میں۔

باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم رَبِّ مُبْلِغٍ أَوْعَى مِنْ سَامِعٍ

اس میں بتلاتے ہیں کہ اگر عالم سے کچھ سنے تو چاہئے کہ دوسروں کو پہنچا دے، کیونکہ کبھی وہ اس قدر محفوظ نہیں رکھتا جتنا کہ دوسرا

لُبِّلَغَ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ فَإِنَّ الشَّاهِدَ عَسَى أَنْ يُبْلَغَ مَنْ هُوَ أَوْعَى لَهُ مِنْهُ۔

جو یہاں حاضر ہے وہ اس کو خبر کر دے جو غائب ہے، کیونکہ جو حاضر ہے شاید وہ ایسے شخص کو خبر کر دے جو اس بات کو اس سے زیادہ یاد رکھے۔

بَابُ الْعِلْمِ قَبْلَ الْقَوْلِ وَالْعَمَلِ لِقَوْلِ اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ (فَاعْلَمْ أَنَّهُ

علم مقدم ہے قول اور عمل پر۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے (سورہ محمد میں) فرمایا: تو جان رکھ کہ اللہ کے سوا

لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ) فَبَدَأَ بِالْعِلْمِ وَأَنَّ الْعُلَمَاءَ هُمْ وَرَثَةُ الْأَنْبِيَاءِ وَرَثَةُ الْعِلْمِ

کوئی سچا معبود نہیں، اللہ نے علم کو پہلے بیان کیا، اور (حدیث میں ہے) کہ عالم لوگ وہی پیغمبروں کے وارث ہیں، پیغمبروں نے

مَنْ أَخَذَهُ أَخَذَ بِحِطِّهِ وَإِفْرَوْمَنْ سَلَكَ طَرِيقًا يَطْلُبُ بِهِ عِلْمًا سَهَّلَ اللَّهُ لَهُ

علم کا ترکہ چھوڑا، پھر جس نے علم حاصل کیا اس نے پورا حقد (اس ترکہ کا) لیا اور (حدیث میں ہے) جو کوئی علم حاصل کرنے کیلئے

طَرِيقًا إِلَى الْجَنَّةِ

راستہ چلے تو اللہ اس کے لئے بہت کا راستہ آسان کر دے گا۔

سننے والا محفوظ رکھ سکتا ہے، تو صحابہ کو حکم دے رہے ہیں کہ جو جس نے سنا ہے وہ دوسروں کو پہنچائے کیونکہ دوسرا کبھی زیادہ محفوظ رکھنے والا ہوتا ہے۔

قَوْلُهُ أَوْعَى: یہ وہی سے ہے جس کے معنی میں محفوظ رکھنا، اس کی دو صورتیں ہیں: ایک تو یہ کہ الفاظ محفوظ رکھے، اور

دوسری یہ کہ فہم میں اس سے احتفظ و اجود ہو، میرے خیال میں اسے عام ہی رکھنا چاہیے، دونوں میں سے خواہ کسی طرح سے ہو۔

حدیث سے: قَوْلُهُ بِحِطِّهِ وَأِفْرَوْمَنْ سَلَكَ طَرِيقًا يَطْلُبُ بِهِ عِلْمًا دُونَ طَرِيقٍ آخَرَ، حافظ ابن حجر کہتے ہیں دونوں ایک ہیں، مگر بعض

لوگوں نے کہا کہ بڑی سی خطام اور چھوٹی زمام ہے، یہاں بہر حال یکل مراد ہے، کیل اس لئے پڑے ہوئے تھے کہ اونٹ کے چلنے کی وجہ سے

بیان میں پریشانی نہ ہو، یہ زمام کے پکڑنے والے یہی ابو بکر تھے، وقیل بلال۔

قَوْلُهُ خَسَّكُنَا: بعض روایات میں ہے کہ اللہ و رسولہ علم کہا۔ اللہ اور اس کا رسول زیادہ واقف ہے، ان دونوں کو

میں تضاد نہیں ہے اس لئے کہ اللہ و رسولہ علم کہنا درحقیقت مادہ تفویض اور اصل جواب سے سکوت ہی ہے اس سے متحاجب کا ادب معلوم ہوتا ہے کہ

کس قدر زیاں رکھتے تھے، مالا کہ چہ بائیں ظاہر تھی، ہر شخص مبادت کر سکتا تھا مگر نہیں کیا۔

قَوْلُهُ كَحُرْمَةِ يَوْمِكُمْ هَذَا: انچو نکہ عرب کے نزدیک یہ دن اہمیت اور بلکہ محترم تھے اور ان کا احترام مرکز فی القلب تھا

اس لئے اس سے مشابہت دے کر بتلایا کہ ایسی ہی حرمت ان اشیاء کی بھی ہونی چاہئے۔

قَوْلًا فَإِنَّ الشَّاهِدَ عَمَلِيَّ أَنْ يَلْتَمِسَ مِنْ هُوَاغِي لَهُ مَنَّهُ : اس کا ترجمہ جس کا کہ بعض نے اعطا ، بعض نے انہم ترجمہ کیا ہے میں نے عام رکھا کہ حفاظت انہم حفظ دونوں سے ہوتی ہے ، الفاظ یاد کرنے تب بھی حفظ ہے اور مضامین و مطالب ذہن نشین کرنے تب بھی حفظ ہے

باب العلم قبل القول والعمل الخ

یہ بتلاتے ہیں کہ علم قول و عمل سے مقدم ہے اور تمام اعمال و اقوال مبنی ہیں علم پر ، اگر علم صحیح ہے تو سب درست اور اگر علم صحیح نہیں تو عمل بھی خراب ۔ امام غزالی نے اس کی مثال بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ایک شخص جا رہا ہے اور در سے ایک چلنے والے کو دیکھ کر سمجھا کہ یہ گھوڑا یا گدھا یا بیل ہے ، تو وہ بے خوف چلا جائے گا کیونکہ یہ اس کے علم کے موافق ہے ، اور اگر اسے شبہ سمجھا تو اسے پاؤں بھاگے گا ، اگر چہ اس کا علم غلط ہو مگر اپنے علم کے مطابق حرکات پیدا ہوں گے ، اصل یہ ہے کہ علم سے رغبت یا رہبت پیدا ہوتی ہے ، اور جب حرکت پیدا ہوتی ہے تو اعمال و احوال کا مدور شروع ہو جاتا ہے ، یا یوں کہو کہ کسی جگہ ملواری کھا کر تو اس کی طرف سے رغبت ہوگی ، پھر اس طرف ہاتھ بڑھے گا ، پھر کھائے گا تو اس وقت تمام حرکات موافق علم کے ہوں گی ، اور اگر معلوم ہو جائے کہ اس میں زہر ملا ہوا ہے تو ہرگز ہاتھ نہ بڑھے گا ، تو معلوم ہوا کہ اصل چیز علم صحیح ہے اور اسی پر تمام حرکات کا دار و مدار ہے اور اعمال کی صحت اور اسکا سقم ہو وقت ہے علم کے صحیح یا سقیم ہونے پر ۔

امام بخاری آیت لائے اور اس جملہ کو لاکر بتلادیا کہ تمام آیت تلاوت کر کے مطلب نکالو ، پوری آیت یہ ہے : **فَاعْلَمُ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَاسْتَغْفِرْ لِدُنْيَاكَ وَالْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ** (۱) خوب جان رکھو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور بخشش چاہو اپنے گناہوں کی اور ایمان والے مردوں اور عورتوں کی ۔ تو استغفار خواہ قلب سے ہو یا زبان سے ، اسی وقت ہوگا جب علم صحیح ہو ، جب علم صحیح نہیں تو عمل بھی درست نہیں اسے یاد رکھو کہ میں کہہ رہا ہوں کہ اگر علم صحیح ، دوقی ہے تو عمل بھی صحیح ، دوقی ہے ، اگر علم صحیح نہیں تو عمل بھی باطل ہوگا اور اگر علم قوی نہیں تو عمل میں ضعف ہوگا ۔

اب جو یہ فرما رہے ہیں : **إِنَّ الْعُلَمَاءَ هُمْ وَرَثَةُ الْأَنْبِيَاءِ** ، علماء ہی انبیاء کے وارث ہیں ، یہ کیوں کہہ رہے ہیں ؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ نبوت صفات علیہ اور کمالات علیہ سے ہے نہ کہ علیہ سے کیونکہ نبی کہتے ہیں خبر دینے والے کو ، تو پیغمبری علم حاصل کرنا ہے پھر خبر دیتا ہے ، تو نبوت من حیث ہو نبوت صفت علیہ ہے اور جب علم ہے تو اس کے مطابق عمل بھی ہوگا ، لہذا بلاشبہ علماء ہی ورثہ انبیاء ہو سکتے ہیں ، **الْعُلَمَاءُ وَرَثَةُ الْأَنْبِيَاءِ** " حدیث ہے اور جو مشہور ہے " علماء ائمہ کا کنیاء بنی اسرائیل " موان لفظوں کے ساتھ ثابت نہیں ، البتہ ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں : **أَبَتْ**

وَقَالَ (وَقَالُوا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ أَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِي أَصْحَابِ السَّعِيرِ) وَقَالَ هَلْ

يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ

النبياء لم يورثو دينارا ولا درهما بل ورثوا العلم، فقينا انما، نے دواہم و دنیا کے وارث نہیں بنایا بلکہ علم کا وارث بنایا ہے،

طرح جس علم کا علم اور وارث بنایا ہے وہ ایسا علم ہے جو صحیح بھی ہو اور فوری بھی، جس سے علم خود بہ خود ناسی و مبادر ہو اور اگر کوئی تمام کتابیں رٹ

لے کر عمل نہیں ہے تو شریعت کی زبان میں وہ علم اس پر وبال ہے، اسی کو فرمایا **والقرآن مجتہد لک** اور علیک، تو علم ہے جس سے نصیحت

اور تقویٰ پیدا ہو اور جب خلیت ہوگی تو عمل بھی اس کے مطابق ضرور ہوگا اپنا نیچے آگے فرماتے ہیں :

مَنْ سَلَكَ طَرِيقًا يَلْتَمِسُ بِهِ عِلْمًا، يَسْلَمْ كَمَا يَسْلُمُ الْمُسْلِمُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ مَعْرُوفٍ مُنْقِرٍ.

بعض روایات ابن عبد البر نے اپنی کتاب "جامع بيان العلم" میں درج کی ہیں اور تلامذہ کے حوالہ سے علم دین کا طالب ہو اور

سیس دور حالت توده شهید بکا شعلک نیست صحیح بودا در علم صحیح بودی که هر کس از کافران که تات که از این دنیا که

یہاں پر عرب کے دورہ اہمیت رکھتا ہے، جو کہ ہم نے اس کے ذریعے ہی دنیا کی تاریخ اور کائنات کی سیما ہی کو جاننے کی سہولت حاصل کی ہے۔

وَلَا تُنَاسُوا عِبَادَةَ اللَّهِ وَأُولِي الْقُرْبَىٰ مِنْكُمْ وَلَا يَذَرُ الْوَلَدَ

ی اُترتے ہیں اللہ سے، یعنی وہ جن کے دل میں منفش ہو چکا ہے اور اللہ تعالیٰ کی خشیت اور خوف اس پر غالب ہے وہ علماء ہی ہیں 'علم

اول میں سب سے بڑھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، تو خشیت اور تقویٰ کے مراتب بھی انہیں رخصت ہیں، جس کا کتاب نے غور فرمایا: ان

اخشاكم وفي بعض الروايات انا اتقاكم

قَالَ اللَّهُ تَبَٰرَكَ تَعَالَىٰ إِنَّهُ لَا يَلْفُظُ لِكَلِمَةٍ إِلَّا وَهُوَ عَٰلِمُ الْغُيُوبِ

ول

ی سمجھ سکتے ہیں۔

تَوَلَّاهُ الْاَوَّلُ اَسْمَعَ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِي اَصْحَابِ السَّعَةِ اُنْهَوْنَ نَعْلَمُ كَمَا كُنَّا نَمُرُّ بِهَا سَمِعْتُمْ تَوَلَّاهُ الْاَوَّلُ اَسْمَعَ

یہاں تک کہ اس کی سب سے زیادہ اعلیٰ سطح پر پہنچ جائے۔

میں ہوں گے۔ یہی دو صورتیں ہیں لیکن وہ خود بخود ہو یا پھر ان کو نہیں سمجھا دو دوسروں کی سے اور سن کر مسخ راہ اختیار کرے، انہوں نے ان

وہوں بالوں میں سے کسی کو اختیار نہیں کیا اس لئے تباہی سہنے آئی اور خود وہ اس کے معترف بھی ہوئے کہ تصورِ وارہم ہی ہیں قرآن نے

وَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ يُرِدِ اللَّهُ بِهِ خَيْرًا يُفْقَهُهُ فِي الدِّينِ
اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : اللہ جس کی بھلائی چاہتا ہے اس کو دین کی سمجھ دیتا ہے ، اور نہ مایا : علم
وَأِنَّمَا الْعِلْمُ بِالتَّعَلُّمِ
سیکھنے ہی سے آتا ہے ۔

ارشاد فرمایا ، " فاعترفوا بذنوبهم فسحقاً لأصحاب السعير " انھوں نے اپنے گناہ کا اقرار کر لیا تو اب اس تباہی اور لعنت کے
مستی ہو گئے جو علی اور انکار رسول پر مرتب ہوا کرتی ہے ، بخاری علیہ الرحمۃ نے اس آیت سے یہ نکالا کہ مار نجات سماع اور سمجھ پر ہے ۔
قوله هل يستوى الذين يعلمون والذين لا يعلمون ، کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے برابر ہیں ؟ سادہ
طرفین سے نہیں ، یعنی فضیلت میں بھی سادہ نہیں اور ذمہ داری میں بھی سادہ نہیں ، جاننے والے کی ذمہ داری بھی بڑی ہے اور
مانوذبھی سختی سے ہوگا ، حدیث شریف میں ہے کہ رب سے پہلے علماری سے باز پرس ہوگی ۔

ابن عبدالبر نے اپنی کتاب " جامع بیان العلم " میں ابن دیر کے چند شعر نقل کئے ہیں ، تم بھی سنو اس نے کہا :
أَهْلًا وَسَهْلًا بِالَّذِينَ أَحْبَبَهُمْ وَأَوْدَهُمُ فِي اللَّهِ ذِي الْأَلَاءِ
ان لوگوں کے لئے خوش آمد ہے جن سے میں محبت رکھتا ہوں انھیں میں اللہ کے لئے محبوب رکھتا ہوں جو صاحب انعام واکرام ہے
أَهْلًا لِقَوْمٍ صَالِحِينَ ذَوِي الشُّقَا
ان صاحب تقویٰ اور صالح لوگوں کے لئے خوش آمدید
يَسْعَوْنَ فِي طَلَبِ الْحَدِيثِ بِعَفَا
وہ لوگ عفت و وقار اور سبکدوشی کے ساتھ
لَهُمُ الْمَهَابَةُ وَالْجَلَالَةُ وَالنُّهَى
وہ لوگ اہمیت و جلال اور صاحب عقل ہیں
وَمِدَادُ مَا تَجَرَّوْا بِهِ أَفْلَامُهُمْ
اور ان کے قلم میں جو سیاہی جاری ہے
يَا طَائِبِي عِلْمُ النَّبِيِّ مُحَمَّدٍ
اے نبی ای محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے علم کے طلبکارو !
مَا أَنْتُمْ وَمِثْلُكُمْ بِسِوَا
تم اور تمھارے سوا دوسری قومیں برابر نہیں

وَقَالَ ابُودَرٍّ لَوْ وَضَعْتُمُ الصَّمَامَةَ عَلَى هَذِهِ وَأَشَارَ إِلَى أَفْكَاهُ ثُمَّ ظَنَنْتُ أَنِّي
 اور ابوذر نے کہا اگر تم تلوار یہاں رکھ دو اور اشارہ کیا انھوں نے اپنی گردن کی طرف، اُس وقت بھی میں سمجھوں کہ (میری گردن مارنے
 اُنْفِذْ كَلِمَةً سَمِعْتُهَا مِنَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَبْلَ أَنْ يُجِزُوا عَلَيَّ لَأَقْدِمُهَا
 سے پہلے) میں ایک ہی وہ بات سنا سکتا ہوں جو آنحضرت سے میں نے سنی ہے تو بہت میں اس کو سنا دوں اور آنحضرت
 وَقَوْلِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِيُبَلِّغَ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ،
 صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حاضر کو چاہئے کہ غائب کو (سید کلام) پہنچا دے۔

اس میں شبہ نہیں کہ کوئی شخص اگر پڑھ کر فن حدیث میں لگا ہوا ہے بشکل اس کا عمل شرط کے موافق بھی ہو تو وہ غازی
 اور مجاہد سے پڑھ کر ہے وَفَقْنَا اللَّهَ وَآيَاكُم۔

تَوَلَّيْتُمْ فِي الدِّينِ، یعنی اللہ تعالیٰ اسے دین کی سمجھ عطا فرما دیتا ہے جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ دین کے احکام کو اور
 آفات نفوس کو سمجھنے لگتا ہے، میرے خیال میں تفقہ فی الدین کا نام مکتبہ ہے کیونکہ قرآن پاک میں فرمایا: وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ
 فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا یہاں آیت میں مکتبہ کو خیر کہا گیا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اللہ خیر عظیم دینا چاہتا ہے، تو
 تفقہ فی الدین عطا فرماتا ہے، دونوں کے لانے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مکتبہ تفقہ فی الدین کا نام ہے جسے یہ دولت نصیب ہو جائے وہ بڑا ہی
 خوش نصیب ہے۔

قَوْلُ انَّمَا الْعِلْمُ بِالْعَلَمِ، یہ بھی حدیث ہے، یعنی علم سمجھنے سے آتا ہے اور اس کی خاطر جال کا ہوا اور شفقت اور درہ
 کی ٹھوکریں کھانی پڑتی ہیں تب آتا ہے، غرور، شیخی، کبر، شرم سے حاصل نہیں ہوتا، اسی طرح آرام طلبی اور لاپرواہی سے نہیں آتا،
 قَوْلُ قَالَ ابُودَرٍّ اِنْ اِسْ كَاتَصِيَهْ ہے کہ سیدنا ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ اور سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے درمیان وَالَّذِينَ
 يَكْتُمُونَ الذَّهَبَ وَالْفِصَّةَ کی تفسیر اختلاف پیدا ہو کر جھگڑے کی صورت اختیار کر گئی، سیدنا ابوذر کا فتویٰ تھا کہ مال جمع کرنا بالکل جائز
 نہیں اس لئے بیت المال میں بھی کچھ رکھا جائے، اس باب میں امراء سے جھگڑتے تھے اور کہتے تھے کہ مال ہرگز جمع کرنا چاہئے اور اسی
 آیت سے استدلال کرتے تھے، امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور دیگر تمام اکابر صحابہ آیت کا مصداق یہ نہیں سمجھتے تھے، اور نہ بیت المال میں جمع کرنا شرعاً
 غلط سمجھتے تھے، وہ کہتے تھے کہ بیت المال تو

۲۲ (۱) نفل الہدیٰ میں اس کو مؤلف کا کلام قرار دیا گیا ہے، مالک حافظ ابن حجر نے لکھا ہے "فَلَا يَخْتَلِفُ بِقَوْلٍ مِنْ جَعْلِهِ مِنْ

كَلَامِ الْبُخَارِيِّ" نفع الہدیٰ میں ۱۱۸ ج ۱ (عرب)

وَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ كُنُوْا رَبَّانِيْنَ حُلَمَاءَ عُلَمَاءَ فَقَهَاءَ ، وَيُقَالُ الرَّبَّانِيُّ

اور ابن عباس نے کہا تم ربانی بن جاؤ، یعنی حکیم بردبار، عالم، سمجھدار، بعضوں نے کہا ربانی وہ ہے جو لوگوں کو بڑی باتیں

الَّذِي يُرَبِّي النَّاسَ بِصَغَارِ الْعِلْمِ قَبْلَ كِبَارِهِ ،

لکھانے سے پہلے چھوٹی چھوٹی باتیں ان کو سکھا کر تربیت کرے۔

اسی لئے ہے کہ وہاں مال جمع کیا جائے اور جب جب اس کی ضرورت پیش آئے، مصالحت امت پر خرچ کیا جائے، جب یہ معاملہ پیدا ہوتا ہے، عثمان غنی رضی اللہ عنہ ہلکے ہو چکا تو انھوں نے مناسب سمجھا کہ مطلقاً نہیں بلکہ خاص اسی سلسلہ میں ابوذر رضی اللہ عنہ کو فتویٰ دینے سے روک دیا جائے اس لئے کہ اس فتوے سے امت میں انتشار پیدا ہونے کا شدید خطر تھا، چنانچہ سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے اس خاص سلسلہ میں انھیں فتویٰ دینے سے روک دیا تھا۔

پھر جب حضرت ابوذرؓ حج کو تشریف لے گئے تو تمام مئی میں لوگوں نے ان سے مسائل پوچھنا شروع کئے، یہ ان کے جوابات دے رہے تھے تو کسی نے کہہ دیا کہ آپ کو تو فتویٰ دینے سے روکا گیا ہے اور آپ فتویٰ دے رہے ہیں، چونکہ اس کا اعتراض غلط تھا اس لئے حضرت ابوذرؓ نے بگڑ کر جواب دیا کہ اگر میری گردن پر شمشیر بڑاں بھی رکھ دی جائے اور مجھے موقع ملے تو میں قبل اس کے کہ تلوار میری گردن پر پہنچے میں حدیث نبویؐ ضرور سنادوں گا، میں پہلے بتا چکا ہوں کہ ایک خاص سلسلہ میں جو ان کی اجتہاد ہی رائے تھی انھیں منع کیا گیا تھا اور یہ معاملہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کا تھا اس لئے انھیں بتانے کا حق تھا اور کسی کو روکنے کا حق نہیں تھا، اس لئے حضرت ابوذرؓ کا جواب بھی صحیح تھا۔

دشمنان عثمانؓ نے اس واقعہ کو بہت زیادہ اچھالا اور ابوذرؓ کو مقابل کرنا چاہا لیکن وہ بہر حال صحابی تھے اور اطاعت امیر کو واجب سمجھتے تھے، اس لئے اس سلسلہ میں اطاعت امیر کا حق ادا کیا اور حدیث بتانے میں حدیث کا حق ادا کیا۔

تو لا کونوا ربانیتین حُلَمَاءَ فَقَهَاءَ عُلَمَاءَ ، ربانی اصل میں رب کی طرف منسوب ہے، الف اور نون مزید مبالغہ کے لئے زیادہ کر دیتے ہیں، یعنی اللہ والے بن جاؤ، اور یہ اس وقت ہو گا جب کہ یہ چیزیں جمع ہوں، حکمت، علم، نقد، علم، جاننا، تفقہ، اگہرائی کو سمجھنا، یعنی علم بھی ہو اور تفقہ بھی ہو، حکمت کے معنی ہیں ہر چیز کو اس کے موضع اور محل میں رکھنا، بے موقع کلمہ بچنا اور اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی قوتوں کا صحیح استعمال کرنا، مثلاً اللہ نے قوتِ سماعت مرحمت فرمائی، اسے اگر غلطی لگائے سننے میں صرف کے تو بے موقع صرف کرنا ہو گا، کسی کو بہترین تباہ عطا فرمائی وہ اس سے کھانا پکانے لگے اور کلڑیاں جو کھانا پکانے کے لئے تھیں، انھیں سوٹ کیس میں جن کر رکھے، تو ظاہر ہے کہ ایسے آدمی کو سب جہنم میں بھیج دیں گے، اس لئے کہ ان چیزوں کا استعمال اس نے بے موقع کیا،

غرض حکمت ایک ذریعہ ہے جس کے ذریعہ سے ہر چیز کو اپنے موقع پر رکھنے کا شعور حاصل ہوتا ہے اور بے موقع استعمال سے بچنا آسان ہو جاتا ہے۔ حکمت کی یہ تعریف سب سے بہتر ہے، ماسے معانی اس میں آ جاتے ہیں۔

بعض مفسرین (ابن کثیر وغیرہ) نے حکمت سے سنت مراد لی ہے، وہ بھی درست ہے، سنت کا کام ہی ہے تبیین کرنا اور ہر چیز کا موقع بنانا، مثلاً جب یہ آیت نازل ہوئی **فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ** تو آپ نے فرمایا: **اجْعَلُوها فی زکوٰۃکم**، اور جب یہ آیت آئی **سَبِّحْ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلٰی** تو آپ نے فرمایا: **اجْعَلُوها فی سجدۃکم** سو ہر آیت کا صل، اس کا موضوع بنانا، سب حکمت ہے، مگر حکمت اسی میں منحصر نہیں ہے بلکہ اور بھی حکمت ہے، حکمت کا مادہ ح ک ہ ہے، انت میں اس کے معنی اصلاح کی غرض سے روکنے کے ہیں، اہل عرب بولتے ہیں: **حکمت الدابة** میں نے جانور کو نگام لگائی، نگام ہی کے ذریعہ گھوڑے کو روکتے اور قابو میں رکھتے ہیں، یہی معنی روکنے کے یہاں بھی ہیں، حکمت گویا عقل کی نگام ہے، عقل کو روکتی ہے تاکہ وہ بے قابو ہو کر کام نہ کرے، اللہ تعالیٰ کو حکیم اسی لئے کہتے ہیں کہ اس کا کوئی کام بے عقل اور غلات وضع اور غلات مصلحت نہیں ہوتا۔

خلاصہ یہ کہ عبد اللہ ابن عباس نے بتلایا کہ ربانی جو جس کے لئے تین صفتیں درکار ہیں: حکمت، علم، فقہ، جو ان کا حال ہو گا وہ ربانی ہو گا۔

قوله **دَيُّعَالُ الرَّبَّانِي الَّذِي يُرْتَبِ النَّاسُ** انج میرے نزدیک یہ بھی پہلی ہی تفسیر میں داخل ہے، انھوں نے رب کو نبوی معنی میں لیا، یعنی مرتب (جو تربیت کرے) اور تربیت کہتے ہیں کسی چیز کو اپنی استعداد کے مطابق بتدریج اس کی ممکنات کو پہنچانا، جس کے وہ لائق ہے، جیسے بچہ کی تربیت اس کے مرتبہ اور عمر کے لحاظ سے، اسی طرح عالم ربانی وہ ہے جو لوگوں کی تربیت کرے اس طرح کہ پہلے چھوٹے علوم بتائے پھر بڑے، اس کا آل بھی یہی ہے کہ موقع پر رکھے، حکیم یہ دیکھتا ہے کہ کہاں تک اسے فائدہ پہنچ سکتا ہے، نہ کہ اپنے علوم کے اعتبار سے اوق تقریر کرے، تو پہلے عادت ڈالتے ہیں، جیسے بچوں کو پہلے قواعد بندوبست پڑھاتے ہیں پھر بتدریج ترتیب کرتے ہیں، اسی طرح پہلے فروغ دیتے ہیں، پھر اسرار و دقائق میرے خیال میں یہ تفسیر ملے گی، تفسیر کے تحت میں آگئی، ابن عباس کی تفسیر بہت جامع ہے۔

باب ۳۲ مَا كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتَخَوَّلُهُمُ بِالْمَوْعِظَةِ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کو موقع اور وقت دیکھ کر سمجھاتے اور علم کی باتیں بتلاتے، اسلئے کہ

وَالْعِلْمُ كَيْ لَا يَفْرُوا.

ان کو نفرت نہ ہو جائے۔

۶۸۔ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ يُونُسَ قَالَ أَنَا سُفْيَانُ عَنْ الْأَعْمَشِ

ہم سے بیان کیا محمد ابن یونس نے، کہا ہم کو سفیان نے خبر دی، انھوں نے

عَنْ أَبِي وَائِلٍ عَنْ ابْنِ مَسْعُودٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

اُمش سے، انھوں نے ابو وائل سے، انھوں نے ابن مسعود سے، کہا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دونوں میں

يَتَخَوَّلُنَا بِالْمَوْعِظَةِ فِي الْأَيَّامِ كَرَاهَةَ السَّامَةِ عَلَيْنَا.

نصیحت کرنے کے لئے وقت اور موقع کی رعایت فرماتے، آپ اس کو برا سمجھتے کہ ہم اکتا جائیں۔

۶۹۔ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ بَشَّارٍ قَالَ شَايَعُنِي بْنُ سَعِيدٍ قَالَ

ہم سے محمد ابن بشار نے بیان کیا، کہا ہم سے شایعہ بن سعید نے بیان کیا، کہا ہم سے

شَايَعَةُ قَالَ حَدَّثَنِي أَبُو التَّيَّاحِ عَنْ أَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

شعبہ نے بیان کیا، کہا مجھ سے ابو التیاح نے بیان کیا، کہا انھوں نے انس سے، انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

قَالَ يَسْتَوُوا وَلَا تَغْبِرُوا وَبَشُرُوا وَلَا تُفَرُّوا.

آپ نے فرمایا (لوگوں پر) آسانی کرو، سختی نہ کرو اور خوشی کی بات سناؤ، نفرت نہ دلاؤ۔

(۵۳) باب مَا كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُهُمُ بِالْمَوْعِظَةِ آخِرَ

تخلؤل کے معنی دیکھ بھال کرنا اور نگہبانی کرنا اصلاح کے لئے مطلب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جن اوقات

میں دیکھتے کہ نصیحت کا وقت مناسب ہے اس وقت بیان فرماتے، یعنی نشاط اور شوق کے وقت بیان فرماتے۔

حدیث ۶۸ : سَامَةٌ : اکتا جانا، بول بولنا۔ بڑے سے بڑا عالم بھی اگر روزانہ وعظ کہے تو لوگ اکتا کر

بددل ہو جائیں گے۔

حدیث ۶۹ : وَلَا يَسْتَوُوا، یعنی اس طرح سمجھاؤ کہ دین کو مشکل نہ سمجھیں بلکہ تدریج انھیں دین کی طرف بلاؤ،

تاکہ وہ اس طرف رغبت کریں اور ان میں دین سیکھنے کا شوق پیدا ہو اور پھر علی زندگی میں سدھار آئے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ مہانت کرے یا خوف کی وجہ سے باطل انشاء بیان کرنے لگے، اگر کسی کو دیکھو کہ رسوم و عبادات میں منہمک ہے تو اسے آہستہ آہستہ سمجھاؤ تاکہ وہ یہ سمجھ سکے کہ مجھ سے یہ کیسے ہو سکتا ہے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو سمجھایا تھا کہ پہلے اہل میں کو کلمہ شہادت کی تبلیغ کرنا، اگر اسے مان لیں تو نماز کا حکم کرنا، اسے بھی مان لیں تو زکوٰۃ کو کہنا، یہ اسی حکمت کی بنا پر تھا۔

بزرگوں نے ہمیشہ اس کا خیال رکھا ہے، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہم کا ایک مرید تھا، وہ کسی دیہات کا رہنے والا تھا، حضرت کی خدمت میں آیا اور بے تکلفی سے کہا کہ حضرت تم مجھ کو مرید کرو، حضرت نے پوچھا: تم مرید ہو گے؟ وہ دیہاتی نے کہا: ہاں! حضرت نے بیعت کا جو قاعدہ ہے اس کے مطابق چوری سے تو بکرائی اور زنا وغیرہ سے منع کیا، تو آخر میں اس نے کہا: بس یہی میں نے نہ تو کبھی چوری کی، نہ زنا کیا، اس کا تو ذکر کر دیا مگر اپیم (ایون) کا کچھ ذکر نہیں کیا جو میں کھاتا ہوں، حضرت نے حکمت سے کام لیا، دریافت فرمایا: کتنی کھاتا ہے؟ اس نے ایون نکال کر ایک خوراک ہاتھ میں رکھ دی، آپ نے کچھ مقدار کم کر کے دے دی، کہ اتنی کھالیا کر، وہ چلا گیا اور خوش ہو گیا کہ اجازت مل گئی۔ دیکھنے والا سمجھ گیا کہ حضرت نے ایون کھانے کی اجازت دے دی حالانکہ وہ شرمناک حرام ہے، مگر وہ حکیم تھے، اس نے حکمت سے کام لیا، اس وقت تو وہ چلا گیا اور دو چار دن ایون کھاتا بھی رہا، مگر چند ہی دنوں کے بعد اس میں داعیہ پیدا ہوا کہ اگر یہ اچھی چیز تھی تو حضرت جی نے مقدار کیوں کم کی اور اگر بری چیز تھی تو تھوڑی بھی بری اور زیادہ بھی بری، معلوم ہوتا ہے کہ حضرت جی نے میری رعایت سے اجازت دے دی ہے، یہ سوچ کر اس نے عہد کیا کہ اب میں بالکل ہی نہ کھاؤں گا، مگر چونکہ وہ قوں کی عادت تھی اس لئے اس کے چھوڑنے سے دست آنے شروع ہو گئے، ڈاکٹروں نے کہا کہ اس کا علاج بس ایون ہی ہے، اس نے کہا مرنے منظور ہے مگر ایون کھانا منظور نہیں، خدا کی شان! پھر بغیر ایون کھانے چھا ہو گیا، کئی برسوں کے بعد جب حضرت کی خدمت میں آیا تو زور سے کہا: حضرت جی! السلام علیکم، اور مصافحے کے ساتھ دو روپے پیش کئے، حضرت نے صرف اس کی دھکنی کی خاطر لے کر روپے رکھ لئے، وہی بات بولا: تم نے پوچھا نہیں یہ روپے کیسے ہیں؟ حضرت نے فرمایا: بتلاؤ کیسے ہیں؟ کہنے لگا: اپیم کے ہیں، میں نے اپیم (ایون) چھوڑ دی اور یہ روپے اسی کے بچا کر رکھے ہیں۔ دیکھئے حکمت اسی طرح ہوتی ہے اور حکیم اسی کو کہتے ہیں، جو استدعا دیکھے پھر جیسی سہارا ہو ویسی ہی دوا تجویز کرے۔

حدیث شریف میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب عورتوں سے بیعت لی تو آپ نے یہ بھی فرمایا کہ نوہ ذکرنا، ایک عورت (ام عطیہ) نے اسی مجلس میں کہا: لا یسعی فکراکین، اس کی وجہ بھی اس نے بتائی کہ ہم پر قرضہ پائی ہے اس لئے ہم اسے ضرور آدیں گے

باب ۵۴ مَن جَعَلَ لِأَهْلِ الْعِلْمِ أَيَّامًا مَّعْلُومَةً .

جو شخص علم سیکھنے والوں کے لئے کچھ دن مقرر کر دے .

v. حَدَّثَنَا عُمَانُ بْنُ أَبِي شَيْبَةَ قَالَ حَدَّثَنَا جَرِيرٌ عَنْ مَنْصُورٍ

ہم سے عثمان بن ابی شیبہ نے بیان کیا، کہا ہم سے جریر نے بیان کیا، انہوں نے منصور سے

عَنْ أَبِي وَائِلٍ قَالَ كَانَ عَبْدُ اللَّهِ يُذَكِّرُ النَّاسَ فِي كُلِّ حَمِيسٍ فَقَالَ لَهُ رَجُلٌ

انہوں نے ابو وائل سے کہا: عبد اللہ ابن مسعود ہر جمعہات کو لوگوں کو وعظ سناتے تھے، ایک شخص نے ان سے کہا

يَا أَبَا عَبْدِ الرَّحْمَنِ لَوْ دِدْتُ أَنَّكَ ذَكَرْتَنَا كُلَّ يَوْمٍ قَالَ أَمَا إِنَّهُ يَمْنَعُنِي مِنْ

اے ابو عبد الرحمن میری آرزو یہ ہے کہ آپ ہر روز ہم کو وعظ سنائیں، انہوں نے کہا (کچھ مشکل نہیں) مگر میں اس کو

ذَلِكَ أَنِّي أَكْرَهُ أَنْ أَمْلِكُمْ وَإِنِّي أَتَخَوَّلُكُمْ بِالْمَوْعِظَةِ كَمَا كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

ایسا نہیں کرتا کہ تم کو آگاہ دینا چاہتا ہوں، اور میں (تمہاری خوشی کا) موقع اور وقت دیکھ کر تم کو نصیحت کرتا ہوں جیسے

يَتَخَوَّلُهَا خِفَافَةً السَّامَةِ عَلَيْنَا

آحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمارا وقت اور موقع دیکھ کر ہم کو نصیحت فرماتے تھے، آپ کو بھی پورے دن کا یہ کام تھا کہ ہم کو آگاہ

فرماتے تھے۔

صحیح مسلم میں ہے: عَنْ أُمِّ عَطِيَّةٍ قَالَتْ لَتَأْتِرَلَتْ هَذِهِ الْآيَةُ: يَا بَعْثَكَ عَلَى أَنْ لَا يُفَرِّقَنَّ بِاللَّهِ شَيْئًا...

وَلَا يَعْصِيَنَّكَ فِي مَعْرُوفٍ (۱) قَالَتْ كَانَ مِنْهُ الْيَاسَاحَةُ، قَالَتْ قُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ إِلَّا أَلْ فَلَانُ فَإِنَّهُمْ

كَأَفْوَا السَّعْدِ وَفِي الْجَاهِلِيَّةِ فَلَا بُدَّ لِي أَنْ أُسْعِدَهُمْ، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: إِلَّا

أَلْ فَلَانِ (۲) اس سے معلوم ہوا کہ آپ نے محسوس فرمایا کہ اس وقت انہیں کچھ ڈھیل دینا ہی تقاضائے حکمت ہے، اس لئے آپ نے ڈھیل

دے دی، یہ کام ہے حکیم کا۔

باب ۵۴ مَن جَعَلَ لِأَهْلِ الْعِلْمِ

اس سے پہلے باب میں فتوئل کا ذکر آچکا ہے اور فتوئل انتظام کرنا چاہتا ہے، اس لئے اس باب میں دوسرا ترجمہ لکھا کہ اگر

معلم معاہدت کی بنا پر کسی جگہ کچھ تئیں اوقات و ایام مناسب رکھے تو وہ کر دے، اسے بدعت نہ کہیں گے، ہاں اگر کسی تئیں کو دین کا کام اور خواب کی بابت

بھلے تو یہ بدعت ہے جیسے تیجہ وغیرہ کو سبب ثواب سمجھتے ہیں، بدعت وہ ہے کہ کسی ایسی چیز کو جس کا وجود نہ تو سنت میں ہو، نہ صحابہ میں اور نہ ائمہ دین کے زمانے میں، مگر اس کو ثواب کا سبب سمجھ کر کیا جائے، رسوم شادی وغیرہ کو کوئی دین بھل کر یا ان میں ثواب تصور کر کے نہیں کرتا، اسی طرح علی کے امور اور اس کی رسوم ہیں، ہاں اگر کوئی انھیں ثواب کا کام سمجھ کر کرنے لگے تو بدعت کہا جائے گا، یہی فرق ہے بدعات و رسوم میں، اسے یاد رکھو کہ جس کی اصل موجود نہ ہو، نہ شارع کے ہاں، نہ صحابہ و ائمہ مجتہدین کے ہاں اور اسے ثواب اور دین سمجھ کر کیا جائے تو بدعت ہے، ورنہ وہ بدعت نہیں، چاہے اس کا نام رسم رکھو یا کچھ اور۔ اتنا اور سمجھ لو کہ دین کا موقوف علیہ دین ہے، اگرچہ حضورؐ سے ثابت نہ ہو، اس کو ایک مثال سے سمجھو کہ کسی حکیم نے تمھیں نسخے میں لکھا کہ خیرہ کا دُزاں جو اہر والا فلاں دوا خانہ سے لے کر کھایا کرو، تم دوا خانہ پہنچو، دوا خانہ والے نے کہا: خیرہ نہیں ہے، اب اگر تم خود اس کے نسخہ کے مطابق مارے اجزاء، فراہم کر کے خیرہ تیار کر لو تو کیا حکیم کے حکم کے خلاف ہے؟ ہرگز نہیں؛ کیونکہ جب حصول صحت اس کے بغیر ممکن نہیں تو اسے کرنا ہی پڑے گا، ہاں اگر اجزاء بدل دئے یا کیت میں فرق کر دیا تو بیشک خلاف حکم ہوگا، اسی طرح اس کو سمجھو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيضَةٌ عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ“ علم کا طلب کرنا ہر مسلمان پر (مرد ہو یا عورت) فرض ہے، تو سب لوگ کیسے طلب کریں؟ کیا یہ بغیر کتب اور بغیر مدارس کے ممکن ہے؟ ہرگز نہیں؛ تو یہ کتب اور یہ مدارس دین کے موقوف علیہ ہوتے اس لئے یہ بدعت نہ ہوں گے، گو حضورؐ سے ان کا ثبوت نہ ہو۔ صحابہ کے قویٰ بہت عمدہ تھے، صحبت نبویؐ سے ان کے قلوب منور تھے اس لئے انھیں ضرورت نہ تھی، مگر اب امور بدوین کے (کتب و مدارس کے) حامل نہیں ہو سکتا اس لئے یہ بھی مامور ہیں، اہل ہے، ہاں اگر اس کے اجزاء لکھائیں یا کیفیات یا کمیات یا تعدادیں تصریح کریں تو یہ بدعت ہوگا، کیونکہ اس کا وجود شریعت میں نہیں ہے، نہ شریعت کا کوئی حکم اس پر موقوف ہے، اور اسی کو بدعت کہتے ہیں، بشرطیکہ اس کو دین سمجھ کر اختیار کریں۔ ہم نے بدعت کی تعریف میں جو شرطیں بیان کی ہیں وہ اس حدیث سے ماخوذ ہیں: ”مَنْ أَحْدَثَ فِي أَمْرِنَا هَذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ كَذِبٌ“ — دین میں احداث اسی وقت ہوگا جب اسے بدعت سمجھو۔ اس حدیث سے معلوم ہو کہ اگر غیر دین کو دین سمجھنا بدعت ہے اور جب کوئی بدعت کسی جماعت کا شائبہ نہ ہو تو پھر اسے نیک نیتی کے ساتھ بھی نہ کرنا چاہئے۔

امام بخاری کا مقصد تو صرف اتنا تھا کہ تعلیم کے لئے تعین خلاف دین نہیں ہے اور نہ یہ بدعت ہے۔

وہ پورا ہو گیا۔

باب من یرد اللہ بہ خیراً یفقیہہ فی الدین

اللہ جس کے ساتھ بھلائی کرنا چاہتا ہے اس کو دین کی سمجھ دیتا ہے۔

۷۱۔ حَدَّثَنَا سَعِيدُ بْنُ عَفِيرٍ قَالَ ثنا ابْنُ وَهْبٍ عَنْ يُونُسَ عَنْ

ابن شہاب قال قال حمید بن عبد الرحمن سمعت معاوية خطيباً يقول سمعت النبي صلى الله عليه وسلم يقول من یرد الله به خيراً يغفر له فإنا أنا قاسمٌ والله يعطي ولئن نزل هذه الأمة عطا فرأتها، اور میں تو ہائے والا ہوں دینے والا اللہ ہے، اور یہ (اسلام کی) جماعت ہمیشہ اللہ کے حکم پر قائم رہے گی، دشمنوں نے اس کو کوئی نقصان نہ پہنچے گا یہاں تک کہ اللہ کا حکم (قیامت) آجائے۔

باب من یرد اللہ بہ خیراً یفقیہہ فی الدین

سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے میر پر یہ حدیث سنا لی جس سے علم کی فضیلت اور تفقہ فی الدین کی عظمت معلوم ہوتی ہے نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ جس کو تفقہ فی الدین حاصل ہو جائے وہ بڑا ہی خوش نصیب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے خیر عظیم کا فیصلہ فرمادیا، یہ فضل عطا خداوندی ہے جو انتہائی قابل قدر اور لائق تحسین ہے۔

قوله إنا أنا قاسمٌ والله يعطي، معطی عرف میں الٰہک کو کہتے ہیں اور قاسم ہائے والے کو، مراد یہ ہے کہ اصل الٰہک تو اللہ ہے، میں تو صرف تقسیم کرنے والا ہوں، یعنی انتہائے خداوندی میرے ذریعہ سے بندوں کو ملتی ہیں۔ عرف اسلئے کہا کہ اگر صورت کے اعتبار سے کہا جائے تو حضور دونوں میں، معطی بھی اور قاسم بھی اور اگر حقیقت کے اعتبار سے دیکھا جائے تو معطی اور قاسم دونوں اللہ ہی ہے، اس لئے اب فرق کیسے درست ہوگا، لہذا یہ عرف ہی پر مبنی ہوگا اور مطلب یہ ہوگا کہ غلوں کو جو کچھ بھی ملے گی اور اس میں تفقہ فی الدین بھی داخل ہے۔ وہ اللہ ہی کا عطیہ ہے، البتہ اس کی تقسیم میری معرفت ہوتی ہے، ہر قسم کی نعمتیں اور ہر قسم کے اعلیٰ مراتب و مناصب اور ولایت و صدیقیت، حتیٰ کہ نبوت و رسالت سب آپ ہی کے واسطے سے غلوں کو ملتی ہے، براہ راست کسی کو کچھ

علم کے لئے عقل کی ضرورت

۷۲۔ حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ قَالَ ثَنَا سُفْيَانُ قَالَ قَالَ لِي ابْنُ أَبِي نَحْمٍ

ہم سے علی ابن عبد اللہ (مدینی) نے بیان کیا، کہا ہم سے سفیان نے بیان کیا، انھوں نے کہا مجھ سے ابن ابی نعیم
عَنْ جَاهِدٍ قَالَ سَمِعْتُ بَنَ عُمَرَ إِلَى الْمَدِينَةِ فَلَمَّ أَسْمَعُهُ يُحَدِّثُ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ
کہا ہے انھوں نے مجھ سے، انھوں نے کہا میں عبد اللہ ابن عمر کے ساتھ رہا مدینے تک، میں نے ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْإِحْدَيْثَا وَاحِدًا قَالَ كُنَّا عِنْدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
حدیث بیان کرتے نہیں مگر صرف ایک حدیث، انھوں نے کہا: ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے تھے کہ

نہیں ملتا، اور فیض قیامت تک جاوی رہے گا اس لئے اس کے لینے والے بھی لاعلم قیامت تک رہیں گے، اسی کا بیان **لَنْ تُوَالَّ هَذِهِ الْأُمَّةُ** میں ہے، مراد امت کا ایک طائفہ ہے، جیسا کہ دوسری جگہ تصریح ہے، اس میں اختلاف ہوا ہے کہ وہ کون سی جماعت ہے جس کے بارے میں مفسرین فرما رہے ہیں، ہر فن والا اپنی طرف کھینچتا ہے، مجاہدین اپنے لئے، محدثین اپنے لئے، مفسرین و فقہاء اپنے لئے، غرض ہر فن والے نے اس کا مصداق اپنے کو بنایا ہے، امام بخاری محدثین کو بتاتے ہیں، امام احمد بن حنبل اہل السنۃ والجماعہ کو کہتے ہیں، اگر کسی یہ ہے کہ الفاظ حدیث زیادہ ترجیح دینا چاہتا ہے تو کہتا ہے، کیونکہ دوسری حدیث میں یقاتلون علی اُحیتی ہے (حق کی خاطر قتال کرتے رہیں گے) اور کسی سلامت گر کا ان پر کوئی اثر نہ ہوگا البتہ اگر قتال سے عام مراد لیا جائے تو بیشک علماء بھی اس میں آجائیں گے اور خدا کا شکر ہے کہ ہر زمانہ میں کوئی نہ کوئی جماعت کسی نہ کسی جگہ ضرور رہی ہے، جو اس کی مصداق ہوتی ہے، امام احمد نے جو اہل السنۃ کو اس کا مصداق قرار دیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ قتال کرنے والے اہل السنۃ ہی ہونگے۔
تَوَالَّ حَتَّى يَأْتِيَ أَمْرُ اللَّهِ : بعض روایتوں میں **حَتَّى تَقُومَ السَّاعَةُ** "یا ہے، اس سے مراد قرب قیامت ہے۔
اس وقت ایک ہوا میں کی طرف سے چلے گی اور جملہ مومنین کی روح قبض کر لے گی، پھر اس وقت کوئی مومن نہ رہے گا، اور اس کے بعد قیامت آجائے گی۔

(٥٦) باب الفهم في العلم

قَوْلُ (الْحَدِيثِ) وَاحِدًا، اس سے معلوم ہوا کہ اکثر روایت کرتے تھے، روایت کرنے میں محتاط تھے، بہت سے صحابہ احتیاط کرتے تھے اور احادیث کم بیان کرتے تھے، لیکن حدیث کی کتابوں میں ابن عمر رضی اللہ عنہ سے جو بہت سی روایتیں موجود ہیں، ممکن ہے وہ اس بنا پر ہوں کہ وہ از خود کو کم بیان کرتے رہے ہوں، مگر جب لوگ پوچھتے تو بیان فرماتے ہوں۔ اور ظاہر ہے کہ وہ صحابی رسول تھے، اور

فَاتَىٰ جُبَّارٍ فَقَالَ إِنَّ مِنَ الشَّجَرِ شَجَرَةً مِثْلَهَا كَمِثْلِ الْمُسْلِمِ فَأَرَدْتُ أَنْ أَقُولَ
 اتنے میں کوئی کھجور کا گاہک نہ لایا، آپ نے فرمایا: درختوں میں ایک درخت ایسا ہے کہ وہ مسلمان کی مثال ہے، میرے دل میں آیا کہ میں
 هِيَ الْخَلَّةُ فَإِذَا أَنَا أَصْغَرُ الْقَوْمِ فَسَكْتُ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هِيَ الْخَلَّةُ
 وہ کھجور کا درخت ہے، پھر میں نے دیکھا کہ سب لوگوں میں میں ہی کس تھا، بزرگوں کو دیکھ کر میں (شرم سے) چپ رہا، آخر آپ نے خود ہی فرمادیا کہ
 وہ کھجور کا درخت ہے

بَابُ الْإِعْتِبَاطِ فِي الْعِلْمِ وَالْحِكْمَةِ وَقَالَ عُمَرُ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ

علم اور دانائی کی باتوں میں رشک کرنا، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تم بزرگ بننے سے پہلے
 تَقَهَّرُوا قَبْلَ أَنْ تَسُودُوا قَالَ أَبُو عَبْدِ اللَّهِ وَبَعْدَ أَنْ تَسُودُوا وَقَدْ تَعَلَّمُ
 دین کا علم حاصل کر لو، امام بخاری نے فرمایا کہ بزرگ بننے کے بعد بھی حاصل کرو اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے
 أَصْحَابُ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعْدَ كِبَرِهِمْ
 صحابہ نے بڑھاپے میں علم حاصل کیا ہے

اتباع سنت کا انہیں بڑا اہتمام تھا، حتیٰ کہ جب سفر کرتے تو اس کا پورا خیال رکھتے تھے کہ جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر کیا تھا، بالکل
 اسی طرح یہ بھی کریں، اس لحاظ سے بہت سے حضرات ان سے مختلف باتیں پوچھتے ہوں گے، تاکہ ان کے ذریعہ حکم نبوی معلوم ہو جائے اور یہ بھی
 چھپاتے تھے، جب ضرورت سمجھتے بیان فرماتے، اس طرح اچھا خاصہ مجموعہ ہو گیا۔

حدیث ۷۲: حدیث گزشتہ کی ہے، یہاں بخاری اس کو مکرر اس لئے لائے ہیں کہ بتائیں علم میں غم درکار ہے، دیکھو
 ابن عمرؓ نے غم سے کام لیا، کیونکہ اولاً تو سفر میں خواہ مخواہ کی گفتگو نہیں کی، ثانیاً بڑوں کا اس قدر ادب کیا کہ ایک بات ذہن میں آئی مگر چونکہ
 دوسرے بڑے لوگ بھی بیٹھے تھے، اس لئے ان کے مقابلہ میں اپنا ظلم ظاہر نہیں کیا، خود ہی فرمایا کہ مجھے شرم آئی کہ یہ معزز حضرات تشریف فرما ہیں
 میں چھٹا ہو کر بولنے لگوں، یہ مناسب نہیں۔ بڑا عمدہ سبق دیا۔

(۵۷) بَابُ الْإِعْتِبَاطِ فِي الْعِلْمِ وَالْحِكْمَةِ

إِعْتِبَاطٌ : دین کرنا، رشک کرنا، ایک حد ہے اس میں تمنا ہوتی ہے کہ محمود سے نیعت زائل ہو جائے، اور عِدْبَةُ : اپنے لئے خیر کی طلب ہوتی ہے، دوسرے کے زوالِ نعمت کی تمنا نہیں ہوتی، اسی بنا پر محمودِ اشیا میں غبطہ جائز ہے، اسی کو قرآن کریم میں فرمایا:

۷۲۔ حَدَّثَنَا الْحُمَيْدِيُّ قَالَ حَدَّثَنَا سُفْيَانُ قَالَ حَدَّثَنَا إِسْمَاعِيلُ

ہم سے حمیدی نے بیان کیا، کہا ہم سے سفیان نے بیان کیا، کہا ہم سے بیان کیا اسماعیل ابن ابی خالد نے

بُنْ أَبِي خَالِدٍ عَلَى غَيْرِ مَا حَدَّثَنَا الزَّهْرِيُّ قَالَ سَمِعْتُ قَيْسَ بْنَ أَبِي حَازِمٍ زہری نے جو ہم سے بیان کیا اس سے الگ طور پر کہا میں نے قیس ابن ابی حازم سے سنا، کہا میں نے عبداللہ بن مسعود سے

قَالَ سَمِعْتُ عَبْدَ اللَّهِ بْنَ مَسْعُودٍ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سنا، کہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دو (آدمیوں کی) غصتلوں پر کوئی رشک کرے تو ہونکتا ہے، ایک تو

لَا حَسَدَ فِيَّ أَشْتَيْنَ رَجُلًا أَتَاهُ اللَّهُ مَالًا فَسَلَّطَهُ عَلَى هَلَكَةٍ فِي الْحَوِّ اس پر جس کو اللہ نے دولت دی، وہ اس کو نیک کاموں میں سرچ کرتا ہے، دوسرے اس پر جس کو اللہ نے وَرَجُلًا أَتَاهُ اللَّهُ الْحِكْمَةَ فَهُوَ يَقْضِي بِهَا وَيَعْلَمُهَا قرآن و حدیث کا علم دیا وہ اس کے موافق فیصلہ کرتا ہے اور لوگوں کو سکھاتا ہے۔

وَفِي ذَلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُونَ اور اس چیز کے حاصل کرنے میں بازی لے جانے کے خواہشمند بازی لے جانے کی کوشش کریں یہاں تنافس سے غبطہ ہی مراد ہے۔

وَلَا تَقْفُمْ مَا قَبْلَ أَنْ تُسَوِّدُوا ، تَسَوَّدُوا میٹھ بھول کا ہے، یعنی سیادت کے لئے پہلے تیاری کرو اور اس کے لئے دین کی سمجھ حاصل کرو، تاکہ سیادت کے اہل بن سکو، ورنہ اگر بلا سمجھ اور علم کے سردار بن گئے تو لوگوں کو اور خراب ہی کر دے اور ان کے اخلاق کی دہشت نہ ہو سکے گی اس کے برعکس جو شخص پہلے سے تیار ہوگا اور اپنے میں اس کی اہمیت پیدا کرے گا تو وہ سردار بن کر امت کیلئے خیر کا باعث ہوگا، اس کے اچھے اخلاق اور علم و حکمت سے امت کو فائدہ پہونچے گا، یہ تا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے اس قول میں یہ حکمت بھی ہے کہ سردار بننے سے پہلے سیکھنا آسان ہے اور اس وقت سیکھنے اور علم حاصل کرنے میں حیا ماننے نہ ہوگی، ورنہ جب بڑا ہو جائے گا تو پھر کسی کے سامنے دانوٹے نمذتہ کرنے میں حیا مانے ہوگی اور تحصیل علم سے محروم رہ جائے گا۔

۱۱۔ ام بخاری نے آگے کا جملہ وَبَعْدَ أَنْ تُسَوِّدُوا بڑھا کر اس کی مزید تکمیل فرمادی کہ سیادت کے بعد بھی دین کی سمجھ حاصل کرو، یعنی یہ نہ سمجھنا کہ اب ضرورت نہیں رہی، ضرورت اب بھی ہے، گو صحیح وقت قبل سیادت ہی ہے لیکن استغنا کسی وقت نہیں

قَالَ ثَنَا ابْنِي عَنْ صَاحِبِ يَعْنِي ابْنَ كَيْسَانَ عَنْ ابْنِ شَهَابٍ حَدَّثَهُ أَنَّ عُبَيْدَ اللَّهِ
بَنَ عَبْدِ اللَّهِ أَخْبَرَهُ عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّهُ تَمَارَى هُوَ وَالْحُرُّ بْنُ قَيْسٍ ابْنُ حِصْنٍ
الْفَزَارِيُّ فِي صَاحِبِ مُوسَى، قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ هُوَ خَضِرٌ فَرِمَهُمَا أَبُو بَنْ كَعْبٍ
كَسَّكَ الْخَضِرَ فَاسْمُهُ خَضِرٌ، وَابْنُ أَبِي كَعْبٍ ابْنُ أَبِي كَعْبٍ ابْنُ أَبِي كَعْبٍ

اس میں یہ الفاظ زیادہ ہیں "یا لیتنی اوتیت مثل ما اوتی فلان" اسے کاش مجھ کو بھی دیسا ہی دیا جاتا جیسا کہ فلان کو دیا گیا ، فَعَمِلَتْ مِثْلَ مَا عَمِلَ فَلَانٌ "تو میں بھی ویسا ہی عمل کرتا جیسا کہ فلان نے عمل کیا ، یہاں پر بصرات یہ بات واضح ہوگی کہ غبطہ مراد ہے۔

(۵۸) باب ما ذکر فی ذهاب موسی فی البحر الی الخضرؑ

مقصود بخاری یہاں کیا ہے؟ ترجمہ میں ایک جزوی چیز ہے کہ موسیٰ علیہ السلام طلب علم میں گئے اور حضرت خضر سے ملاقات کی، لیکن ملاقات کی غرض کیا ہے، اسی کو اللہ نے اس قصہ میں فرمایا، هَلْ أَتَاكَ عَلَىٰ أَنْ تَعْلَمَ عَنِّي مِمَّا عَشَرْتُ رُشْدًا! کیا میں آپ کے ساتھ رہا کرتا ہوں کہ جو علم مفید آپ کو سکھایا گیا ہے اس میں سے آپ مجھے بھی سکھادیں (معلوم ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے طلب علم کے لئے دریا کا سفر کیا، تو امام بخاری کہتے ہیں کہ علم طلب کرنا چاہئے، اگرچہ دریا کا سفر بھی کرنا پڑے، دیکھو حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے شخص حضرت خضرؑ کے پاس علم کی طلب میں گئے بُوَيُثِقُ موسیٰ علیہ السلام سے انقض نہ تھے، یہاں اشْكَالٌ یہ ہے کہ بِظَاهِرِنِی الْبَحْرُ کے لفظ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے پہلے دریا کا سفر کیا پھر بعد میں حضرت خضر سے ملاقات ہوئی، حالانکہ واقعہ یوں نہیں ہے، بلکہ پہلے خشکی کا سفر ہوا اس کے بعد حضرت خضر سے ملاقات ہوئی اور پھر حضرت خضر کی میت میں دریا کا سفر ہوا، اس لئے اس میں غلط تبدیلی کی گئی، بعض نے کہا کہ مِصْرَافٌ مُحَذِّفٌ ہے اور عبارت یوں ہے: فِی سَاحِلِ الْبَحْرِ یعنی دریا کے کنارے کنارے۔ بعض نے کہا کہ الْحِی معنی میں جمع کے و بِیْنِی مع الْخَضِرِ تو وہ سفر مفرد ہو گا جو بعد تھا، خضر کے میت خضر ہوا، کسی نے کہا الْحِی مَقْصِدُ الْخَضِرِ مراد ہے، یعنی سفر کرنا اس مقصد کی طرف جہاں خضر جا رہے تھے، بہر حال تاول کرنی پڑے گی، خواہ کوئی سی تاول ہو، ورنہ بظاہر واقعہ کے خلاف ہے۔

قولہ تماری ہو و الحزن قیسؑ حضرت ابن عباسؓ اور حرا بن قیسؓ کے درمیان اس بات پر جھگڑا ہوا کہ فوجاً عبد

فَجَعَلَ اللَّهُ لَهُ الْحُوتَ آيَةً وَقِيلَ لَهُ إِذَا فَقَدْتَ الْحُوتَ فَارْجِعْ فَإِنَّكَ سَتَلْقَاهُ

اللہ نے ایک مچھلی ان کے لئے نشانی مقرر کر دی اور فرمایا : جب یہ مچھلی کھو جائے تو لوٹ چل تو اس سے مل جائے گا۔ غرض حضرت
نُوحٌ شَبَّعُ اثْرَ الْحُوتِ فِي الْبَحْرِ فَقَالَ لِمُوسَى فَتَاهُ أَرَأَيْتَ إِذَا أَوَيْنَا إِلَى الصَّخْرَةِ
مُوسَى سمندر کے کنارے کنارے اس مچھلی کے نشان پر روانہ ہوئے۔ ان کے خادم (یوشع) نے ان سے کہا جب ہم مخفر کے
فَإِنِّي نَسِيتُ الْحُوتَ وَمَا أَنْسِيهِ إِلَّا الشَّيْطَانُ أَنْ أَذْكُرَهُ قَالَ ذَلِكَ مَا كُنَّا
پاس ٹھہرے تھے تو میں مچھلی کا قصہ بیان کرنا بھول گیا۔ اور شیطان ہی نے مجھ کو بھلا دیا کہ میں آپ سے اس کا ذکر کرتا،
يَبْجُ فَارْتَدَّا عَلَى آثَارِهَا قَصَصًا ۖ وَفَجَدَا أَخْضَرًا فَكَانَ مِنْ شَأْنِهِمْ مَا قَصَّ
حضرت موسیٰ نے کہا : ہم تو اسی جگہ کی تلاش میں تھے، پھر دونوں کھوج لیتے لیتے اپنے پیروں کے نشان پر لوٹے

اللَّهُ تَعَالَى فِي كِتَابِهِ

وہاں خضر سے ملاقات ہوئی، پھر وہی قصہ گزرا جو اللہ نے اپنی کتاب میں بیان کیا۔

عرض کیا : آپ مجھے اس کا راستہ بتائیے تاکہ میں اس سے علم حاصل کروں۔ موسیٰ علیہ السلام کو کوئی دعویٰ تو نہیں تھا، صرف بیان واقعہ کے طرز
یہ جواب دے دیا تھا کہ وہ پسند نہیں آیا، کیونکہ صورت دعویٰ ہی کی تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی درخواست پر پتہ تو بتلادیا مگر ہم
اس سے تنبیہ مقصود تھی کہ تمہیں آنا بھی علم نہیں، البتہ اتنا نشان بتلادیا کہ مچھلی بھون کر زنبیل میں رکھ لو، جہاں یہ مچھلی گم ہو جائے بس وہیں وہ
بندہ ملے گا، موسیٰ علیہ السلام نے اپنے ایک خادم یوشع بن زون کو بھی جو اس وقت تو خادم تھے مگر بعد میں بنی ہو گئے، اپنے ساتھ لیا اور مچھلی
بھون کر زنبیل میں رکھ لی اور چل دئے، مگر کس عزم سے چلے، اس کو قرآن نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے : لَا أَبْرَحُ حَتَّىٰ أَبْلُغَ
مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ أَوْ أَمْضِيَ حُقُبًا (۱) میں برابر چلتا رہوں گا تا آنکہ دو دریاؤں کے سنگم پر پہنچ جاؤں، یا یوں ہی ساہا سال تک
چلتا رہوں، یعنی چاہے کتنا ہی طویل زمانہ گزر جائے مگر پہنچوں گا ضرور۔

ام بخاری کہتے ہیں کہ یہی طالب علم کی شان ہونی چاہئے، مفسرین لکھتے ہیں اور حدیث کے بعض الفاظ بھی اس پر دال ہیں
وہاں ایک پتھر پڑا تھا جس کے نیچے آب حیات کا چشمہ تھا، اسے حدیث میں عین الحیاة کہا گیا ہے، مگر یہ حدیث مرفوع نہیں ہے بلکہ درج
ہے، اسی پتھر پر موسیٰ علیہ السلام سر رکھ کر سو رہے، حضرت یوشع بن زون بیٹھ ہوئے۔ کچھ کچھ پانی زنبیل میں پہنچ گیا اور مچھلی

زندہ ہو کر دریا میں جا پڑی اور جہر جہر وہ گندری ایک طاقتور سرنگ سانبائی چلی گئی، حضرت موسیٰ علیہ السلام جب میدان ہوئے تو چل دئے اور یوشع علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بھٹی کے زندہ ہو کر دریا میں چلے جانے کا حال بتانا بھول گئے، بعض چیزیں قدرت کی طرف سے عبرت اور تنبیہ کے لئے ہوتی ہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت یوشع علیہ السلام سے کہا تھا کہ دیکھ چمپلی کی حفاظت کرنا، ان کے منہ سے نکل گیا تھا کہ یہ کون سی بڑی بات ہے، اللہ نے اسے تنبیہ فرمائی کہ بات بھاری تو نہ تھی مگر تم اسے از خود پورا نہ کر سکتے۔

موسیٰ علیہ السلام کو اب تک بھوک نہ لگی تھی، اب بھوک کا احساس پیدا ہوا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کو انھیں لٹانا مقصود تھا، اس کے کھانے کی خواہش پیدا کر دی گئی، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یوشع سے فرمایا: لاؤ بھائی کچھ کھائیں، تب انھیں یاد آیا اور اس وقت کہا: فانی نسیتُ الحَوْتَ وَمَا أَنَسَانِي إِلَّا الشَّيْطَانُ أَنْ أَذْكُرَكَ^(۱) (اے میں تو چمپلی کا قصہ آپ سے بتانا بھول ہی گیا، اور شیطان ہی نے مجھے بھلا دیا کہ میں آپ سے ذکر کرتا) — غرض موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: لوٹ چلو۔ وہیں مقصود ہے، چنانچہ لوٹے، اور جب اس مقام پر پہنچے تو دیکھا کہ مرفد الیٹا ہوا ہے بعض کتابوں میں ہے کہ پانی میں چادر اڑھے ہوئے بیٹھے تھے، موسیٰ علیہ السلام نے سلام کیا، انھوں نے سلام کے جواب کے بعد کہا: کون؟، کہا: موسیٰ ابن عمران، پھر وہ فوج گذار وہ مفصل آگے آئے گا، یہاں اتنی بات یاد رکھو کہ حضرت خضر علیہ السلام کے متعلق کہ وہ نبی تھے یا رسول؟ تو میرا رجحان یہ ہے کہ وہ نبی تھے، نبوت فی مابین النبی و بین اللہ ہوتی ہے اور رسالت میں تبلیغ ہوتی ہے، لہذا وہ پہلی شریعت کے حامل ہوں گے اور اسی کی طرف لوگوں کو بلایا ہوگا، وہ جزئیات کو نیکہ کے عالم تھے اور موسیٰ علیہ السلام کلیات تشریع کے، اسی بنا پر حضرت موسیٰ علیہ السلام صبر نہ کر سکے اور جلد ہی مفارقت ہو گئی — جس طرح مجتہد عام کو خاص اور مطلق کو مقید کر دیتے ہیں، اسی طرح انبیاء علیہم السلام بھی خدا کے اختیار دینے سے عام کو خاص اور مطلق کو مقید کر لیتے ہیں، حضرت خضر نے بچہ کو قتل کر دیا تو یہ ضابطہ نہیں تھا، مگر ان پر یہ جزئی کشف کر دی گئی کہ یہ بچہ آگے چل کر خدا دھپلائے گا اور ماں باپ کے ایمان کے لئے فطو ہوئے گا، اس لئے اسے قتل کر دینا ہی مناسب ہے، اس لئے حضرت خضر نے عام ضابطہ سے اسے خاص کر لیا، اس استثناء کا انھیں حق تھا، کیونکہ یہ عام ضابطہ کے پابند نہیں تھے، جس طرح رسول کو استثناء و تفسیق کا حق ہے۔ اسی طرح غیر رسول کو بھی اگر کچھ جزئیات کا اختیار دے دیا جائے تو کچھ بیحد نہیں، اسی بنا پر وہ اپنے کشف کے مطابق غلاف ضابطہ کر سکتے ہیں، مگر یہ استثناء نبی کے لئے ہے نہ کہ دلی کے لئے، بعض جہاں کہہ دیتے ہیں کہ نبی بھی دلی کا محتاج ہے، یہ بالکل غلط اور سراسر جہل ہے۔

باب ۵۹ قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم اللہم علمہ الكتاب

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا (ابن عباس کے لئے) یہ دعا کرنا، یا اللہ اس کو قرآن کا علم دے !

۷۵۔ حَدَّثَنَا أَبُو مَعْمَرٍ قَالَ ثنا عَبْدُ الْوَارِثِ قَالَ ثنا خَالِدٌ عَنْ عِكْرَمَةَ

ہم سے ابو معمر نے بیان کیا، کہا ہم سے عبد الوارث نے بیان کیا، کہا ہم سے خالد نے بیان کیا، انھوں نے مکرر

عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ خُصِمَنِي رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَفَالَ

انھوں نے ابن عباس سے، کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو (اپنے سینے سے) چٹایا اور دعا فرمائی : یا اللہ اس کو

اللَّهُمَّ عَلِّمَهُ الْكِتَابَ

سزا آن سکھا دے !

باب متى يصح سماع الصغیر

یہ دعا کس عمر کا حدیث میں سکتا ہے ؟

۷۶۔ حَدَّثَنَا السُّبُعِيُّ قَالَ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ

ہم سے اسماعیل نے بیان کیا، کہا مجھ سے امام مالک نے بیان کیا، انھوں نے ابن شہاب سے، انھوں نے

بْنِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُثْبَةَ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَبَّاسٍ قَالَ أَقْبَلْتُ رَاكِبًا عَلَى

عبد اللہ ابن عبد اللہ ابن عتبہ سے، انھوں نے عبد اللہ ابن عباس سے کہ میں ایک مادیان گدھی پر سوار ہو کر آیا اور ان دونوں

حِمَارِ آتَانِي وَأَنَا يَوْمَئِذٍ قَدْ نَاهَزْتُ الْإِحْتِلَامَ وَرَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

میں ہوائی کے قریب تھا (لیکن جوان نہیں ہوا تھا) اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم منیٰ میں سوار ہو رہے تھے،

(۵۹) باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم اللہم علمہ الكتاب

معلوم ہوا کہ علم کی دعا مانگنی چاہئے، یہ مبارک چیز ہے، بعض روایت میں حکمت کا لفظ آیا ہے اور بعض میں کتاب کا اور

بعض میں فقہہ فی الدین وعلہ التاویل ہے، یعنی اسے اللہ اسے دین کی سمجھ اور علم تفسیر عطا فرما، چنانچہ آج میں قدر تفسیر میں

وہ اس کی (تفسیر ابن عباس کی) محتاج ہیں اور سب سے بڑھ کر انھیں کی تفسیر ہے، اللہ نے انھیں اس درجہ تفقہ عطا فرمایا کہ فقہ شافعی کا تمام

۵۵ مدار انھیں پر ہے۔

احادیث میں دعا فرمانے کا قصہ بھی آیا ہے کہ آپ ایک بار غار کے لئے تشریف لے گئے تو ابن عباس نے آپ کے استسقاء کے لئے پانی

يَعْلَمُ مَنِّي إِلَى غَيْرِجَدٍّ أَرَفَرَّتْ بَيْنَ يَدَيَّ بَعْضَ الصَّفِّ وَأَرْسَلْتُ الْآثَانَ
آپ کے سامنے آؤں تھی، میں تھوڑی جھٹ کے آگے سے گزر گیا اور ادیان کو چھوڑ دیا، وہ چرتی رہی اور میں صف میں شریک

تَرَقَّعُ وَدَخَلْتُ فِي الصَّفِّ فَلَمْ يُنْكَرْ ذَلِكَ عَلَيَّ

ہو گیا، مجھ پر کسی نے اعتراض نہیں کیا۔

۷۷۔ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ يُوسُفَ قَالَ حَدَّثَنَا أَبُو مُسْهَرٍ قَالَ حَدَّثَنِي

ہم سے محمد ابن یوسف نے بیان کیا، کہا ہم سے ابو مسہر نے بیان کیا، کہا مجھ سے محمد ابن حرب

مُحَمَّدُ بْنُ حَرْبٍ قَالَ حَدَّثَنِي الزُّبَيْدِيُّ عَنِ الزُّهْرِيِّ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ الرَّبِيعِ
بیان کیا، کہا مجھ سے زبیدی نے بیان کیا، انھوں نے زہری سے، انھوں نے محمد ابن الربیع سے

قَالَ عَقَلْتُ مِنَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَجَعَلَتْهُ لِي وَجْهِي وَأَنَا ابْنُ
انھوں نے کہا مجھ کو (اب تک) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ کلی یاد ہے جو آپ نے ایک ڈول سے لے کر

خَمْسَ سِنِينَ مِنْ دَلْوٍ

میرے منہ پر ماری تھی، اس وقت میں پانچ برس کا تھا

رکھ دیا، آپ نے پوچھا: کس نے پانی رکھا ہے؟ ان کی خالد ام المؤمنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ ابن عباس نے، اس وقت
آپ نے انھیں سینے سے لگایا اور دعا فرمائی — واقو کہ چہ نفس ہے گریہ دعا دو سزوں کے لئے بھی جائز ہے۔

(۶۰) بَابُ مَتَى يَصْمَعُ صَواعُ الصَّغِيرِ

جہاں پر اصول حدیث میں ادا، وتخل کے شرط ہیں، وہاں یہ بھی ہے کہ کس عمر میں ادا وتخل ہو سکتا ہے۔ ادا کسی کو
دینا۔ — محل: خود اٹھانا۔

حدیث: ۶۱۔ قَوْلُهُ نَاهَرَتُ، یعنی میں قریب پہنچا تھا — یہ تقریبی کا ہے، جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم
بلسترہ کے نماز پڑھ رہے تھے۔ ابن عباس کہتے ہیں کہ میں سامنے سے گذرا۔

فَلَمْ يُنْكَرْ ذَلِكَ عَلَيَّ، یعنی نمازیوں میں سے کسی نے مجھ پر اعتراض نہیں کیا۔ اس سے ابن عباس کا مقصود ان لوگوں
کی تردید ہے جو اس بات کے قائل ہیں کہ کلب و حمار اور مَرَأَةٌ کَامِرَةٌ قاطع سلوۃ ہے، حدیث میں آیا ہے کہ لَا يَقْطَعُ أَحَدٌ
الصَّلَاةَ إِلَّا الْمَرَأَةُ وَالْكَلْبُ وَالْحِمَارُ۔ اسی کا جواب دے رہے ہیں کہ اگر ممنوع ہو مگر حضور منع فرماتے۔

روایت کا مدلول تو صرف اس قدر ہے کہ جدار نہ تھی، مطلقاً سترہ کی نفی اس سے نہیں ہوتی — تو بعض نے کہا، مطلقاً سترہ نہ تھا، امام شافعیؒ سے یہی منقول ہے، اور حافظ نے مندرجہ سے نقل کیا ہے: لیس شیئ لیسترہ، کوئی چیز سترہ کی نہ تھی، دوسری چیز یہ پیش کی کہ ابن عباسؓ رد کر رہے ہیں قائلین قطع کا، وہ تو اسی وقت قاطع کہتے ہیں جب سترہ نہ ہو اور اگر سترہ ہو تو بالاجماع قطع نہیں، لہذا اگر سترہ تھا تو پھر رد کیے ہوتا، ابن عباسؓ کی غرض تو اسی وقت حاصل ہو گی جب مطلقاً سترہ کی نفی کی جائے — یہاں ابن اثیر نے ایک لطیفہ لکھا ہے کہ ابن عباسؓ نے لطیف پیرایہ میں قائلین قطع صلوٰۃ کی تردید کی اور یہ بتلایا ہے کہ حمار، آٹان، قحی، توجب، انٹی حمار قاطع نہیں تو انٹی رجل کیسے قاطع ہو گی۔

حدیث: ۷۷، قولہ: وانا ابن خمس سنین؛ یہ مجھ کو ابن الریح صغار صحابہ میں ہیں، خود کہتے ہیں، مجھے اب تک وہ واقعا یاد ہے، جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ پر کھچی کی تھی، اس وقت میری عمر پانچ برس تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عمل (کھچی کرنا) مانوس کرنے کے لئے فرمایا، اس کو ملاعت کہتے ہیں^(۱) اس سے والدین بھی خوش ہوتے ہیں اور بچہ کو بھی اُنس ہوتا ہے۔

معلوم ہوا کہ پانچ سال کی عمر کی روایت مقبول ہوتی ہے۔ اصول فقہ و اصول حدیث میں اس باب میں اختلاف ہے کہ کس عمر کی روایت مقبول قرار پائے گی — بعضوں نے پانچ سال کہا ہے اور بعضوں نے سات سال کیونکہ اسی عمر میں نماز کا حکم دیا گیا ہے، جس سے معلوم ہوا کہ یہ عمر معتد بہ ہے، بعضوں نے چار سال کافی سمجھا ہے، کیونکہ بعض روایات میں شک کے ساتھ چار یا پانچ سال مذکور ہے، لہذا چار بھی کافی ہیں، مگر یاد رہے کہ بہتر بات وہ ہے جو ابن ہمام نے تحریر الاصول میں لکھی ہے اور جس کو حافظ نے بھی تسلیم کیا ہے کہ یہ تفادات و اتفاقات کی نوعیت اور نچے کی قوتوں اور طبائع کے اعتبار سے ہوتا ہے انہر بچہ کی ہر بات مرود ہے اور نہ ہر بچے کی ہر بات مستبول، بعض صغیر بچے بہت ذہین ہوتے ہیں۔ مثلاً مولانا جانی کہتے ہیں کہ میں دو سال کا تھا کہ میرے والد نے تفہم زانی کے شاگرد حیدرہ کے سامنے مجھے ڈال دیا تھا۔ لہذا اس سلسلہ میں کوئی قاعدہ اور ضابطہ نہیں متعین کیا جاسکتا اور نہ کوئی تحدید ہی کی جاسکتی ہے، بس صرف بچے کی قوتوں اور واقعات کی نوعیت کا اعتبار ہوگا، مثلاً کوئی بچہ کہے کہ مجھے یاد ہے کہ جب میں پانچ برس کا تھا اس وقت یہ مکان بنا تھا تو اسے قبول کر لینے میں کچھ حرج نہیں، لیکن اگر یہ کہے کہ میں پانچ برس کا تھا اس وقت

بَابُ الْخُرُوجِ فِي طَلَبِ الْعِلْمِ وَرَحَلَ جَابِرُ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ مَسِيرَةَ

علم حاصل کرنے کے لئے سفر کرنا اور جابر ابن عبد اللہ نے ایک حدیث عبد اللہ بن مسعود سے

شہرِ اِلٰی عَبْدِ اللَّهِ بْنِ اُنَيْسٍ فِي حَدِيثٍ وَاحِدٍ۔

سننے کے لئے ایک مہینہ کا سفر کیا۔

۷۸۔ حَدَّثَنَا أَبُو الْقَاسِمِ خَالِدُ بْنُ خُلَيْ قَاضِي حُصَّ قَالَ ثَنَا مُحَمَّدُ

بن حَرْبٍ قَالَ الْأَوْزَاعِيُّ أَخْبَرَنَا الزُّهْرِيُّ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَسَا

عُبَيْدَةَ بْنِ مَسْعُودٍ عَنْ بَنِي عَبَّاسٍ أَنَّهُ تَمَارَى هُوَ وَالْحُجْرُ بْنُ قَيْسٍ بْنُ حِصْنِ الْفَزَارِيِّ

انھوں نے ابن عباس سے کہ انھوں نے اور حوا بن قیس ابن حصن فزاری نے موسیٰ کے رشتہ میں

فِي صَاحِبِ مُوسَى فَرَبَّيْهِمَا ابْنُ بَنِي عَبَّاسٍ فَقَالَ ابْنُ

تَمَارَيْتُ أَنَا وَصَاحِبِي هَذَا ابْنُ صَاحِبِ مُوسَى الَّذِي سَأَلَ السَّبِيلَ إِلَى الْقَبْرِ

میرے اس دوست میں جھگڑا ہوا کہ موسیٰ کا وہ رشتہ کون تھا جس سے موسیٰ نے مناجات کیا تھا ؟ کیا تم نے

هَلْ سَمِعْتَ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَذْكُرُ شَأْنَهُ ؟ فَقَالَ ابْنُ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس باب میں کچھ سنا ہے ؟ آپ اس کا حال بیان کرتے تھے ؟ ابی نے

سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَذْكُرُ شَأْنَهُ يَقُولُ بَيْنَمَا مُوسَى فِي مَلَأَ

کہا : ہاں ! میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ قصہ بیان کرتے ہوئے سنا ہے ، آپ فرماتے تھے ایک بار موسیٰ

میں نے فلاں عالم کی تقریر سنی تھی ، جو مجھے بالکل محفوظ ہے ، تو بے شک اس کے قبول کرنے میں تردد ہوگا ، معلوم ہو کہ واقعات کی نوعیت بھی قبول و عدم قبول میں فرق ہوتا ہے ۔

(۷۱) بَابُ الْخُرُوجِ فِي طَلَبِ الْعِلْمِ

سابقہ باب میں یہ حدیث آپ کی ہے ، مگر اس میں مراد یہ تھی کہ دریا کا سفر خطرناک ہے ، لیکن علم کے لئے خطرناک سفر بھی کرنا چاہیے

مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ إِذْ جَاءَهُ رَجُلٌ فَقَالَ هَلْ تَعْلَمُ أَحَدًا أَعْلَمَ مِنْكَ ؟ قَالَ مُوسَى
 بنی اسرائیل کے لوگوں میں بیٹھ ہوئے تھے، اتنے میں ایک شخص ان کے پاس آیا اور کہنے لگا، تم کسی ایسے شخص کو
 لَا، فَأَوْحَى اللَّهُ إِلَى مُوسَى بَنِي عَبْدِ نَاخَصِرٍ، فَسَأَلَ السَّبِيلَ إِلَى لُقْيِهِ فَجَعَلَ اللَّهُ
 جانتے ہو جو تم سے زیادہ علم رکھتا ہو؟ موسیٰ نے کہا: نہیں! پھر اللہ نے ان کو وحی بھیجی کہ تم سے زیادہ علم ہمارے
 لَهُ الْخُوتُ آيَةٌ وَقِيلَ لَهُ إِذَا افْقَدْتَ الْخُوتَ فَارْجِعْ فَإِنَّكَ سَتَلْقَاهُ، فَكَانَ
 ایک بندے کو ہے، جس کا نام خضر ہے، موسیٰ نے اس سے ملنے کا رستہ پایا، اللہ نے پھلی کون کے لئے نشانی بنادی اور ان سے
 مُوسَى يَسْبِعُ أَوْ أَوَّلَ الْخُوتِ فِي الْبَحْرِ فَقَالَ قَتَى مُوسَى لِمُوسَى أَرَأَيْتَ إِذَا أَوَيْنَا
 کہہ دیا گیا کہ جب پھلی کھو جائے تو لوٹ آ، تو اس بندے کو ملے گا، موسیٰ اتنی پھلی کے نشان پر سمندر کے کنارے کن سے جا رہے تھے
 إِلَى الصَّخْرَةِ فَإِنِّي نَسِيتُ الْخُوتَ وَمَا أَسْمِيَهُ إِلَّا الشَّيْطَانُ أَرَأَيْتَ أَذْكُرُهُ
 موسیٰ کے خادم پوچھنے ان سے کہا: تم نے دیکھا جب ہم مغرہ کے پاس ٹھہرے تو پھلی کا تھکا ہوا میں بھول گیا اور شیطان ہی نے مجھ کو بھلا دیا،
 میں (تم سے) اس کا ذکر نہ کر سکا۔

اس لئے وہاں "فی البحر" کی تید لگادی تھی اور یہاں مطلقاً طلب علم کا ذکر ہے کہ گھبریں رہ کر علم نہیں تا بلکہ باہر نکلتا پڑتا ہے اس لئے "بالعلم"
 کی تید لگائی، چنانچہ جابر بن عبد اللہ نے جو مشہور صحابی ہیں ایک حدیث سننے کے لئے جو انھیں بالواسطہ پہنچ چکی تھی، اس حدیث کے راوی عبد اللہ
 ابن اُمیس صحابی کے پاس ایک اہل سفر کیا تاکہ سند عالی ہو جائے، حضرت جابر نے جب ان کے مکان پر پہنچ کر دروازہ دی تو عبد اللہ نے پوچھا
 کون؟ جواب دیا: جابر! پھر پوچھا: کیا آپ جابر ابن عبد اللہ ہیں؟ حضرت جابر نے فرمایا: ہاں! میں کہ عبد اللہ ابن اُمیس دوڑ کر پہنچے
 اور پوچھا: کیسے آئے؟ جواب دیا: ایک حدیث سننے کے لئے جو آپ نے براہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے اور مجھے بواسطہ
 پہنچتی ہے، اس لئے میں نے چاہا کہ براہ راست آپ سے سنوں، تب انھوں نے وہ حدیث سنائی، امام بخاری نے اسے یہاں نہیں بیان کیا بلکہ
 کتاب التوحید میں اس حدیث کا ایک ٹکڑا لائے ہیں اور وہ یہ ہے: فَيَنَادِيهِمْ بِصَوْتٍ يَسْمَعُهُ مِنْ بَعْدِ

(۱۱) مولانا وحید الزماں صاحب نے ترجمہ بخاری کے حاشیہ میں لایا، ذکر فرمایا ہے: اس حدیث کا ذکر خود امام بخاری نے کتاب التوحید میں کیا اور امام احمد اور
 ابویعلیٰ اور مؤلف نے ادب مفرد میں اس کو موصلاً نکالا، کہ اللہ قیامت کے دن لوگوں کو ننگے پن حشر کرے گا، پھر آواز سے ان کو پکارے گا، اور امام
 ذہبی نے کہا: اللہ کے کلام میں آواز ہونا کئی حدیثوں سے ثابت ہے، اور میں نے ان سب کو علیحدہ ایک رسالہ میں جمع کیا ہے، انہی (جامع تقریر)

قَالَ مُوسَىٰ ذَٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ فَأَرَدْنَا أَنْ عَلَيَّا أَنْهَارُهُمَا فَفَصَّصَا فَوَجَدَا أَخْضَرَ فَاذْكَا مِنْ
مُوسَىٰ نَبَا : ہمارا تو یہی مقصد تھا جس کی تلاش میں تھے ، آخر دونوں کھوج لگے تو ہوئے اپنے تہموں کے نشان دیکھتے ہوئے لوٹے ، پھر دونوں نے
شَاءَ بَيْنَهُمَا مَا قَصَّ اللَّهُ فِي كِتَابِهِ

خضر کو پایا اور وہی حال ہوا جو اللہ نے اپنی کتاب میں بیان فرمایا

لکھا سمیعہ من قریب انا الملك انا الدیان ، پوری حدیث دیگر کتب میں مذکور ہے ۔

معلوم ہوا کہ متقدمین نے کس قدر عین اور شقیں برداشت کی ہیں اور یہ تو حدیث نبوی ہے ، اسے جس قدر بھی محنت اور کوشش سے حاصل
کیا جائے بہتر ہے ، ورنہ لوگوں نے تو اور سننوں کے حصول میں بھی بڑی بڑی شقیں برداشت کی ہیں ، میر سید شریف جرجانی نے شرح مطالع پڑھی تو
شوق ہوا کہ اسے اس کے مصنف سے پڑھنا چاہئے ، بس چل دئے اور اس کے مصنف علامہ قطب الدین رازی کی خدمت میں حاضر ہوئے ، وہ اس وقت
اس قدر ضعیف ہو چکے تھے کہ بھول کو اٹھا کر دیکھا اور پوچھا : تم کون ہو ؟ انھوں نے عرض کیا : میں میر سید شریف جرجانی ہوں ، میں شرح مطالع اگرچہ
پڑھ چکا ہوں مگر صرف اس تمنایں کہ آپ سے اس کو پڑھوں ، آیا ہوں ، جواب دیا کہ میں بالکل ضعیف ہو چکا ہوں ، تم جوان ہو ، مجھے تمہاری تسکین
دہو سکے گی ، ہاں میرا ایک شاگرد روم میں ہے ، اس کا نام مبارک شاہ ہے ، تم اس کے پاس چلے جاؤ ، اس کا پڑھانا گویا میرا ہی پڑھانا ہے ، یہ وہاں پہنچے
اور سارا قصہ بیان کیا ، مبارک شاہ علامہ قطب الدین کے غلام تھے ، علامہ نے ان کی عمدہ پرورش کی تھی اور اچھی طرح پڑھایا تھا ، حتیٰ کہ وہ ہر فن میں فیض
و ماہر ہو گئے تھے اور خوب درس دیتے تھے ، لوگ اکثر انہیں مبارک شاہ منطقی کے نام سے پکارتے تھے ، جب میر سید شریف سے پوری بات سن لی تو فرمایا
کہ ہمارے ہاں داخلہ کی ایک شرط ہے ، اور وہ یہ کہ میں ایک اشرفیو میرا ایک سبق کے لئے لیتا ہوں ، میرا صاحب روزانہ ایک اشرفی کہاں سے لاتے ،
کہتے ہیں کہ میں نے بہت کچھ سوچنے کے بعد ان سے عرض کیا کہ روزانہ کی شرط تو نہیں ہے ، جب میرے پاس ایک اشرفی ہو جائے گا کہ اسے ، ایک سبق پڑھ
لیا کروں گا ، فرمایا : منظور ہے ، میرا صاحب میں جی طلب تھی ، فیصلہ کیا کہ جھولی ڈال کر بھیک مانگوں گا ، جب ایک اشرفی ہو جائے گا کہ اسے ، ایک سبق پڑھ
لیا کروں گا ، میرا صاحب نے تو فیصلہ کیا کہ اگر اللہ تعالیٰ کو کچھ اور ہی منظور تھا ، اس نے ابھی میرا صاحب کو بھیک مانگنے کی نوبت نہیں آئی تھی کہ ایک رئیس کو اس کا
علم ہو گیا کہ ایک سید ہے اور وہ اس طرح پڑھنا چاہتا ہے ، چنانچہ اس نے انھیں بلایا اور کہا کہ میں تم کو ایک اشرفی و میر دیا کروں گا ، تم سبق پڑھنا
شروع کرو ، میرا صاحب کی مانگی مراد پوری ہوئی اور پڑھنا شروع کر دیا ، ایک ہفتہ گذر رہا تھا کہ اس دن ملا کر کہا : میاں میں اشرفی کی کچھ پرواہ نہیں
ہمارا دعا تو تمہیں جانچنا اور تمہاری طلب کا امتحان لینا تھا ، وہ ہو چکا ، اب تم پڑھو اور اپنی اشرفیاں اپنے پاس رکھو ، مگر اگلی صف میں بیٹھنے کی اجازت نہیں

بَابُ فُضِّلَ مَنْ عِلْمٌ وَعِلْمٌ

عالم کی اور علم کھانے والے کا تفضیل

۷۹۔ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ الْعَلَاءِ قَالَ حَدَّثَنَا حَمَادُ بْنُ أَسَامَةَ عَنْ بَرِيدِ

بن عبد اللہ عن ابی بردہ عن ابی موسیٰ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال قتل ما
بعثنی اللہ بہ من الہدی والعم کے مثل الغیث الكثير اصاب ارضا فكان
منها نقیۃ قبلت الماء فانتبت کلا والعشب الكثير وكانت منها اجاد
مسدہ تھی جس نے پانی چوس لیا اور اس نے سبزی اور گھاس خوب اگائی ، اور بعضی سخت تھی (پھرنی) اس نے
امسکت الماء ففزع اللہ بہا الناس فشریوا وسقوا وزرعوا واصاب منها
طائفة اخری انما ہی قیعان لا تمسک ماء ولا تنبت کلا فذلک
یہ سینہ پر سا جو صاف چٹیل تھی ، نہ تو پانی کو اس نے تھما اور نہ اس نے گھاس اگائی (اور پانی اس پر سے بہہ کر نکل گیا) یہی

نہ بولنے کی ، بس سماعت کرو ، یہ اس پر بھی راضی ہو گئے اور سماعت کرنے لگے اور پیچھے ہی بیٹھتے تھے ، لیکن آخر یہ شریف تھے ، تقاضائی کو
شکست دی تھی ، درمیان درس میں جوش اٹھاتا تھا ، ٹھوگ و شبہات لگتے تھے ، گروہوں کی اجازت نہ تھی ، اس لئے خاموش رہنا پڑتا تھا ، البتہ
جب اپنے جرحہ میں جاتے تو دیوار کو مخاطب کرتے اور کہتے ، صاحب کتاب نے یوں کہا اور استاد نے یوں کہا اور میں یوں کہتا ہوں ، ایک مرتبہ
استاذ طلبہ کا حال معلوم کرنے کے لئے نشست میں لکھے ، جب ان کے جرحے کے پاس پہنچے تو یہ تقریر کر رہے تھے ، استاد آواز سن کر کھڑے ہو گئے
اور جب انھوں نے کہا ، اقول کذا تو پوری توجہ اور غور سے سنا ، بات بہت عمدہ تھی ، پسند آئی اور بہت خوش ہوئے ، صبح کو دریافت کیا کہ
فلان جرحہ میں کون رہتا ہے ؟ بتلایا گیا کہ یہ شریف رہتے ہیں ، بلایا اور فرمایا ، تم ملکی صفت میں بیٹھا کرو اور خوب جی کھول کر پوچھو ، پھر ان کا
جو مرتبہ ہوا وہ سب کو معلوم ہے ۔

میں کہتا ہوں ایک مولوی کی کتاب شرح مطالعہ کے لئے اتنی مشقتیں برداشت کیں ، پھر اگر حدیث ہوی کے لئے اس سے بہت زیادہ

مَثَلُ مَنْ فَقِهَ فِي دِينِ اللَّهِ وَفَقِهَ بِمَا بَعَثَنِي اللَّهُ بِهِ فَعِلِمَ وَعِلْمَهُ، وَمَثَلُ مَنْ

اس شخص کی مثال ہے جس نے خدا کے دین میں سمجھ پیدا کی اور اللہ نے جو سمجھ کو دے کر بھیجا ہے اس سے اس کو فائدہ ہوا، تو اس نے

لَمْ يَرْفَعْ بِذَلِكَ رَأْسًا وَلَمْ يَقْبَلْ هُدَى اللَّهِ الَّذِي أُرْسِلْتُ بِهِ۔

خود ستیگا اور دوسروں کو سکھایا، اور اس شخص کی جس نے اس پر سری نہیں اٹھایا اور اللہ کی ہدایت جو میں دے کر بھیجا گیا، نہ مانی۔

قَالَ أَبُو عَبْدِ اللَّهِ: قَالَ إِسْحَاقُ عَنْ أَبِي أُسَامَةَ وَكَانَ مِنْهَا طَائِفَةٌ قِيلَتْ

امام بخاری نے کہا: اسحاق نے ابو اسامہ سے اس حدیث کو روایت کیا، اس میں یوں ہے: بعضی زمین نے

الْمَاءُ، قَاعٌ يَعْلُوهُ الْمَاءُ، وَالصَّفْصَفُ: الْمُسْتَوِيُّ مِنَ الْأَرْضِ

پانی پی لیا (اس حدیث میں قلعان جگہ ہے قاع کی) یعنی وہ زمین جس پر پانی چڑھ جائے (ٹھہرے نہیں) اور (قرآن میں جو قاعاً صَفْصَفًا

تو) صَفْصَفُ کہتے ہیں ہموار زمین کو۔

شفقت برداشت کی جائے تو کیا بید ہے۔

(۹۲) بَابُ فَضْلِ مَنْ عَلِمَ وَعِلْمَهُ

من سبب تر بر سے یہ ہے کہ فرماتے ہیں کہ جس نے خود سکھا یا سکھایا اس کا فضل بہت بڑا ہے۔

حدیث ۷۹: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مثال دے کر فرمایا کہ کچھ زمین صاف ستھری ہوتی ہے، وہاں پانی گرتا ہے تو زمین میں

سبزہ اگتا ہے، اس سے آدمی اور جانور مستفید و منتفع ہوتے ہیں، تو یہ زمین خود بھی زندہ ہوئی اور اس نے دوسروں کی زندگی کا سامان بھی کیا،

زمین کی حیات اور زندگی یہی ہے کہ اس میں سبزہ اگے، قال تعالیٰ: وَبِغْيَى الْأَرْضِ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ

دوسری زمین وہ ہوتی ہے جو پانی کو روک لیتی ہے، وہ سبزہ نہیں اگتی لہذا زمین تو زندہ نہ ہوئی لیکن [اس کا پانی] دوسروں کی

زندگی کا سبب بن گیا۔

تیسری وہ زمین ہے جس میں نہ پانی رکتا ہے نہ پیداوار ہوتی ہے، تو یہ نہ خود زندہ ہوئی اور نہ دوسروں کی زندگی کا سبب بنی

کتنی عجیب مثال بیان فرمائی ہے، یہ صریحاً ہی کی شان ہے۔

یہ سے نزدیک شبہ اور شبہ کے درمیان اس طرح انطباق دیا جاسکتا ہے کہ ایک شخص عالم بھی ہے اور عامل اور علم بھی

بَابُ رَفْعِ الْعِلْمِ وَظُهُورِ الْجَهْلِ وَقَالَ رَبِّعَةُ لَا يَنْبَغِي لِأَحَدٍ

(دنیا سے) علم اٹھ جانے اور جہالت پھیلنے کا بیان اور ربیعہ نے کہا جس کو (دین کا) تقویرا سا بھی مسلم ہو وہ

عِنْدَهُ شَيْءٌ مِنَ الْعِلْمِ أَنْ يُضَيِّعَ نَفْسَهُ.

اپنے تئیں بے کار نہ کر دے۔

توزین کا پہلا قسم کمال ہے کہ خود سکھا اور عمل کر کے نفع اٹھایا اور دوسروں کو بھی سکھا کر نفع پہنچایا۔ اور دوسری زمین کی مثال اس شخص پر منطبق ہوتی ہے جو عالم تو ہے لیکن عمل کی توفیق نہیں، یعنی دوسروں کو فائدہ پہنچاتا ہے لیکن عمل نہ کر کے خود اس نفع سے محروم ہے، یہ اور بات ہے کہ کوئی اس سے پڑے اور اس کے لئے دعا کرے، اس طرح اس سے کچھ فائدہ حاصل ہو جائے، مقصد یہ ہے کہ اپنی ذات سے اپنے لئے کچھ نفع نہ ہو۔ تیسرا شخص وہ ہے کہ اس میں نہ قابلیت حفظ علم کی ہے اور نہ خوش متبع ہونے کی صلاحیت، تو ایسا علم وہاں ہے، یہ زمین کی تیسری قسم کی مثال ہوئی، انطباق کی شکل میرے نزدیک بہتر ہے، دوسرے حضرات نے اندر بھی تقریر کی ہے۔

نَفِیْقَةٍ کے معنی ہیں صاف، بعض روایتوں میں طَبِیْقَةٍ ہے، معنی تھری، کَلَّا: گھاس جو خشک ہو یا سبز، عَشْبٌ: تر گھاس، سبز، ثواب ترجمہ ہوا: اگلی گھاس اور سبزہ۔ اَجَادِبٌ: سخت زمینیں، جَدَبٌ: سخت زمین، بعض روایات میں اَفَادَاتٌ ہے، اَفَادَاتٌ اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں پانی بھر جائے، قِيعَانٌ جمع ہے قَاعٌ کی، چیل میدان، جہاں نہ پانی ٹھہرے، نہ گھاس اُسگے، فِذَالِکَ یعنی اس مجموعہ کی مثال ہے۔

قَوْلًا لَمْ يَرْفَعْ بِذَلِكَ رَأْسًا: سر نہیں اٹھایا، توجہ نہیں کی، یہاں دو ہی کا ذکر آیا، گر عَلِمَ وَعَلَّمَ یت دو صورتیں ہیں لہذا تعمیل کر کے تیسری قسم کمال کی جائے گی۔

قَوْلًا قَلِيلًا، تصحیفِ راوی ہے اور اگر اسی کو رکھیں تو معنی بھی تکلف سے بنیں گے، بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی بھی روکنے کے ہیں، مگر حافظ نے کہا ہے کہ تصحیف ہے۔

بخاری کی عادت ہے کہ مشکل الفاظ کو بھی حل کر دیتے ہیں اور قرآن میں جو اس کے مناسب لفظ آتا ہے اس کی بھی تفسیر کر دیتے ہیں، چنانچہ قَاع کی تفسیر کی تو ساتھ ساتھ صَفِصَف کی تفسیر بھی کر دی، حالانکہ یہاں یہ لفظ نہ تھا، مگر قرآن میں قَاعًا صَفِصَفًا آیا ہے اس لئے یہاں اس کی بھی تفسیر کر دی۔

بَابُ رَفْعِ الْعِلْمِ وَظُهُورِ الْجَهْلِ (۶۳)

اس باب میں رفع علم کا بیان ہے، مطلب یہ ہے کہ تیں رفع علم حاصل کر لو۔ دوسرے یہ بتلایا کہ رفع علم عبارت قیامت ہے۔

۸۔ حَدَّثَنَا عُمَرَانُ بْنُ مَيْسَرَةَ قَالَ حَدَّثَنَا عَبْدُ الْوَارِثِ عَنْ أَبِي التَّيَّاحِ

بہ عمران ابن میسرہ نے بیان کیا، کہا ہم سے عبد الوارث نے بیان کیا، انھوں نے ابو التیاح سے،

عَنْ أَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ مِنْ أَشْرَاطِ السَّاعَةِ أَنْ
انہوں نے انس سے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت کی نشانیوں میں یہ بھی ہے کہ (دین کا) علم
يُرْفَعُ الْعِلْمُ وَيَشْبَتِ الْجَهْلُ وَتَشْرَبَ الْحَمْرُ وَيُظْهِرَ الزِّنَا

اُٹھ جائے گا اور جہالت جم جائے گی اور شراب (کثرت سے) پی جائے گی اور زنا علانیہ ہوگا۔

تو اس کا موجود ہونا قیام عالم کا سبب و موجب برکت اور بقا، دنیا کی علامت ہے اور جب علم اُٹھ جائے اور جہالت کا غلبہ ہو جائے تو سمجھ و قیامت کی ایک
علامت ظاہر ہوگی، معلوم ہوا کہ جس چیز نہیں۔

قَوْلًا وَقَالَ رَبِّعِيَّةُ رَجُلٌ رَوَى الرَّاوِي عَرَادَ فِيهِ لَفْظٌ وَجَوَّاسْتَمَلُ نَحْسٍ هُوَ تَحْتَ بَلَدٍ جَنِّ رَفِيقُهُ أَوْ رِثَانُ اسْتِنْبَاطِ غَالِبٍ
ہوئی تھی اور مشغل صیغہ "الغلوب" ہوتا تھا اسے صاحب الرائے کہتے تھے، چنانچہ ربیعہ کا لقب اسی بنا پر رکھا گیا تھا، تو درحقیقت یہ چیز بری نہیں
کیونکہ بیشہ سے دوفرستے پئے آرہے ہیں، ایک وہ جن پر فقہ غالب تھی اور دوسرا وہ جن پر روایت غالب تھی، صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین میں بھی
دو گروہ تھے، ایک پر تفقہ غالب تھا، دوسرے پر روایت۔ اس تشریح سے معلوم ہوا کہ جو لوگ اصحاب الراوی کو تارک سنت کے معنی میں کہتے ہیں
وہ درست نہیں۔

قَوْلًا لَا يَنْبَغِي لِأَحَدٍ عِنْدَكَ شَيْءٌ مِنَ الْعِلْمِ أَنْ يُصْنَعَ نَفْسُهُ : جس کو دین کا تھوڑا سا بھی علم ہو وہ اپنے آپ کو بیکار نہ کرے
اس جملہ کے دو معنی لائے گئے ہیں، بعض کہتے ہیں اس کے معنی یہ ہیں کہ جس کو علم کا کچھ حصہ بھی ملا ہے چاہے کہ وہ گوشہ نشین نہ بیٹھے بلکہ
بیکار نہ کرے، اصاعت نہ کرے، بلکہ اداعت کرے، دراصل علم ہے ہی اس لئے کہ اس کی اشاعت ہو اور اسے پھیلا دیا جائے۔

بعضوں نے کہا کہ علم کو دنیا کا نام لے کر ذریعہ بنانا اور در بدر ذلیل و خوار پھر نایہ علم کا ضائع کرنا ہے، اس لئے اس سے روکا گیا تاکہ
علم کا وقار باقی رہے۔

میرنی سمجھیں یہ آتا ہے کہ نااہلوں کے ساتھ پڑھنے پڑھانے میں مشغول رہنا بھی علم کا ضائع کرنا ہے۔

حدیث ۸۰ : قَوْلًا أَنْ يَرْفَعُ الْعِلْمُ سَنَنَ نَأَى كَيْفَ نَحْنُ يَفْشُو الْعِلْمُ، اس میں لوگوں کو تردد ہو اسے

۸۱۔ حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ قَالَ حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ سَعِيدٍ عَنْ شُعْبَةَ عَنْ قَتَادَةَ

ہم سے مسدد نے بیان کیا کہ ہم سے یحییٰ بن سعید نے بیان کیا۔ انھوں نے شعبہ سے۔ انھوں نے قتادہ سے،

عَنْ أَنَسٍ قَالَ لَأَحَدٍ ثَنَكُمُ حَدِيثًا لَا يَحْدِثُكُمْ أَحَدٌ بَعْدِي، سَمِعْتُ رَسُولَ

اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ مِنْ أَشْرَاطِ السَّاعَةِ أَنْ يَقِلَّ الْعِلْمُ وَيَظْهَرَ

منا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ دین کا علم گھٹ جائے گا اور جہالت پھیل جائے گی اور زنا علانیہ ہونا
الْجَهْلُ وَيَظْهَرَ الزِّنَا وَتَكْثُرُ النِّسَاءُ وَيَقِلُّ الرَّجَالُ حَتَّى يُكُونَ لِخَمْسِينَ امْرَأَةً
اور عورتوں کی کثرت، مردوں کی قلت، عورتوں کی پچاس اور مردوں کی ایک چلانی ہو جائے گی

الْقِيمُ الْوَاحِدُ

ایک مرد ہوگا

گرامر (حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ) فرماتے تھے کہ یہ دونوں بھی علامات ہیں قیامت کی، چنانچہ دیکھو آج کل علم کس قدر پھیل رہا ہے بہترین
بہترین کتابیں پچاس پچاس جلدوں میں چھپ چھپ کر آ رہی ہیں اور رنغ علم بھی ہے کہ صحیح معنی میں جو عالم ہیں وہ اٹھ رہے ہیں اور
کم ہوتے جا رہے ہیں۔

ابن اجماعی بعض روایات میں ہے کہ قرآن کے حروف اٹھائے جائیں گے، مگر یہ بالکل آخر میں ہوگا، جس وقت زمین و آسمان
کو توڑنا مقصود ہوگا تو پہلے قرآن کے حروف اٹھائے جائیں گے۔

قَوْلًا وَيَظْهَرُ الزِّنَا، چنانچہ [آج اس کا ظہور] بھی ہو رہا ہے اور حدیث میں جو يَتَهَيَّأُونَ كِتْمَانَ رُجِ الْخَمْرِ آیا ہے
یورپ آج بالکل اسی کا مصداق بن رہا ہے۔

حدیث ۸۱: قَوْلًا وَيَقِلُّ الْعِلْمُ، یہاں یقل ہے، اس سے پہلے والی حدیث میں يُزْفَعُ تھا، مطلب یکہ آہستہ
آہستہ کم ہوتا جائے گا اور پھر بالکل رنغ ہو جائے گا۔

قَوْلًا وَتَكْثُرُ النِّسَاءُ، یعنی عورتوں کی کثرت ہوگی، یہاں حافظ کو اشکال ہوا کہ یہ کیسے ہوگا کہ گر جنگ عظیم کے بعد جو مردم شماری ہوئی
تو سب نے تسلیم کر لیا کہ مردوں کی قلت اور عورتوں کی کثرت ہو رہی ہے اور اب تو یہ مشاہدہ میں آ چکا ہے کہ اکثر گھروں میں لڑکیاں زیادہ ہیں اور
مرد کم ہیں، معلوم ہوا کہ سپہ اور اہل لڑکیوں کی زیادہ ہوگی اور مرد کم پیدا ہوں گے، پھر لڑائی وغیرہ میں منافع بھی مرد ہی

باب فضل العلم

علم کی فضیلت

۸۲۔ حَدَّثَنَا سَعِيدُ بْنُ عَفِيرٍ قَالَ حَدَّثَنِي اللَّيْثُ قَالَ حَدَّثَنِي عُقَيْلٌ

ہم سے سعید ابن عفیر نے بیان کیا، کہا مجھ سے لیث نے بیان کیا، کہا مجھ سے عقیل نے بیان کیا، انھوں نے

عَنْ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ حمزة بن عبد الله بن عمر أن بن عمر قال سمعت رسول الله

ابن شہاب سے، انھوں نے حمزہ ابن عبد اللہ ابن عمر سے کہہ کر کہ عبد اللہ ابن عمر نے کہا میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

صلى الله عليه وسلم يقول بينا أنا نائم أتيت بقدح لبن فشربت حتى أني لآري

سنا، آپ فرماتے تھے ایک بار میں سو رہا تھا، میرے سامنے دودھ کا پیالہ لایا گیا، میں نے پی لیا (اتنا جھک کر پیا کہ)

الرأي يخرج في الظفاري ثم أعطيت فضلي عمر بن الخطاب قالوا فما أولت

میرے تاخونوں پر تازگی (طراوت) دکھائی دینے لگی، پھر میں نے اپنا بچا ہوا (جو تھا دودھ) عمر کو دے دیا۔ لوگوں نے

يَا رَسُولَ اللَّهِ قَالَ الْعِلْمُ

عرض کیا یا رسول اللہ اس کی تیسیر کیا ہے ؟ فرمایا : علم

زیادہ ہوں گے (۱)

قوله القیّم : نگہبان ، خبر لینے والا ، یعنی مرد استے کم ہو جائیں گے کہ ایک ایک مرد (صالح) چپاس چپاس عورتوں کی خبر گیری

کرے گا اور ان کے مصالح پورے کرے گا۔ یہ مطلب نہیں کہ ایک ایک مرد کی چپاس چپاس یوں ہوں گی، بلکہ نگراں مراد ہے کہ بہت بہت سی

عورتوں کی خبر گیری کرنے والا ایک ایک مرد ہوگا۔ واللہ اعلم۔

بعضوں نے کہا کہ ممکن ہے اشارہ اس طرف ہو کہ عیاشی پھیل جائے گی اور لوگ چپاس چپاس عورتوں سے بیگمت کے طور پر

تعلق رکھیں گے، چار کی قید باقی رہے گی، مگر اس میں ایک اشکال یہ ہے کہ بعض روایات میں قیّم کے ساتھ صالح کی قید لگی ہوئی ہے (۲)۔

(۶۳) باب فضل العلم

پہلے یہ باب لاکھیں ہیں، بظاہر یہ مکر معلوم ہوتی ہے، مگر امام بخاری کی نظر بہت دقیق ہے، حافظہ کہتے ہیں کہ اس سے امام بخاری کے

(۱) شاید اسی بنا پر شریعت نے ایک مرد کو چار تک عورتوں کے رکھنے کی اجازت دی تاکہ عورتوں کی کھپت ہوتی رہے، واللہ اعلم بالصواب (جانب)

(۲) اس سے ظاہر ہوتا ہے بیگمت رکھنا اور نہیں ہے، اس لئے کہ کوئی صاحب مرد و عورت چار سے زیادہ نہیں رکھ سکتا، تو پھر دوسری ہی کوئی توجیہ کرنی پڑیگی (جانب)

باب الفُتْيَا وَهُوَ وَقَفٌ عَلَى ظَهْرِ الدَّابَّةِ أَوْ غَيْرِهَا

جانور وغیرہ پر سوار ہو کر دین کا مسئلہ بتانا۔

۸۲۔ حَدَّثَنَا إِسْمَاعِيلُ قَالَ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ عِصَى

ہم سے اسمعیل نے بیان کیا، کہا مجھ سے امام مالک نے بیان کیا، انھوں نے ابن شہاب سے انھوں نے ابن طلحہ بن عبید اللہ عن عبد اللہ بن عمرو بن العاص أن رسول الله صلى الله عليه وسلم وقف في حجة الوداع بمنى في شهر رمضان من سنة الفيل

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقَفَ فِي حَجَّةِ الْوَدَاعِ بِمَنْىَ لِلنَّاسِ يَسْأَلُونَهُ

منی میں ٹھہرے، اس لئے کہ لوگ آپ سے (دین کے مسئلے) پوچھیں۔

شفوف نظر کرتے چلتا ہے، چنانچہ حدیث سے مراد ظاہر ہو جائے گی، وہاں نفیض علماء مراد تھی اور یہاں نفیض یعنی زائد چیز کے ہیں جیسا کہ فضل طہوی المراتب میں مراد ہے، مطلب یہ ہے کہ جب خود عالم سیراب ہو جائے تو دوسروں کو بھی نفیض پہنچائے اور بچا ہوا دوسروں کو بھی دو، اس بقیب ہونے میں بھی فضل ہے۔

حدیث ۸۲، قَدَحٌ : لکڑی کا پیالہ۔ رِيتِي : تازگی، طراوت، تری !

تَوَلَّاهُ : اَعْطَيْتُ مُفَضِّلِي، فیض آگیا، یعنی حضرت عمر کو بچا ہوا دیا، معلوم ہوتا ہے کوئی خاص علم جو ضمیمہ ہے علوم نبوت کا، وہ دیا گیا، اسی لئے فرمایا کہ اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو عمر ہوتے، معلوم ہوا کہ نبوت کے ملکات اور اس کی استعداد ان میں ہے اور مُحَمَّدٌ شَرُّ تَوَلَّاهُ، اَعْطَيْتُ مُفَضِّلِي، وہ ہے کہ اللہ اس سے باتیں کرے، یہ مرتبہ اہام سے اوپر اور نبوت کے نیچے ہے، فضل علم دینا کتنا ہے دوسروں کو سیراب کرنے سے۔ شائد تراویح کے باب میں اس فضل علم کا ظہور ہوا جو آنحضرت سے ان کو ملتا تھا کہ حضورؐ نے تراویح کی ادا کی اور جماعت بھی کی مگر اس کا بہت اہتمام نہیں تھا، حضرت عمرؓ نے اس کی تکمیل بھی کی اور اہتمام بھی کیا۔

(۶۵) بَابُ الْفُتْيَا وَهُوَ وَقَفٌ عَلَى ظَهْرِ الدَّابَّةِ أَوْ غَيْرِهَا

اس باب کا مقصد اور غرض یہ ہے کہ ایک شخص جانور پر سوار ہے اس وقت کوئی اس سے مسئلہ پوچھے تو جواب دے یا نہ دے یعنی اس سے کہیں علم کی بے توقیری تو نہیں ہوتی، تو کہتے ہیں کہ بضرورت جواب دے سکتا ہے اور یہ ثابت بھی ہے، بعض ائمہ کا معمول یہ تھا کہ سوارانہ کھڑے ہوئے حدیث بیان نہیں کرتے تھے، چنانچہ امام مالک خاص شان اور وقار سے بیٹھ کر حدیث سناتے تھے، بلکہ روزانہ غسل کرتے، صاف کپڑے پہنتے اور خوشبو لگاتے پھر وقار سے بیٹھ کر حدیث بیان کرتے۔

اس وقت طالبعلی کے زمانہ کا ایک واقعہ یاد آگیا، امام مالک رحمہ اللہ کے حالات پر میرے ایک نہ دی دوست کا مضمون رسالہ المدینۃ میں شائع ہوا تھا، اس میں انھوں نے لکھا تھا کہ قاضی امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے ساتھ ہارون رشید مدینہ منورہ گئے تو امام مالکؒ کی خدمت میں بھی حاضری دی، ہارون رشید امام کا بہت احترام کرتا تھا اور اس کے دل میں امام کی بہت عزت تھی، قاضی ابو یوسف اس کے ہاں قاضی القضاۃ تھے^(۱) امام مالک سے قاضی ابو یوسف نے ایک سوال کیا، امام صاحب نے سکوت فرمایا، دوبارہ سوال کیا، پھر امام صاحب خاموش رہے، ہارون رشید کو یہ بات گراں گذری، وہ سمجھ کہ امام مالک نے ابو یوسف کو کچھ سمجھا نہیں، اس لئے انھوں نے کہا کہ امام صاحب آپ جانتے ہیں، قاضی ابو یوسف ہیں، اس کے بعد انھوں نے اپنے مضمون میں [امام مالک کا جواب] نقل کیا کہ امام مالک نے کہا: اِذَا جِئْنَا لِلْبُخَاةِ فَاسْتَفِينَا اور اس کا ترجمہ یہ کیا کہ 'جب ہم ہوا پرستوں کے لئے بیٹھیں اس وقت ہم سے دریافت کرنا، اور آگے اس کی تشریح یہ کی کہ امام نے ابو یوسف پر تن کی کہ یہ ہوا پرست ہیں، کیونکہ انھوں نے عہدہ قضا قبول کر لیا تھا۔

اتفاق سے اسی زمانہ میں مذہب جانا ہوا اور وہاں ان صاحب سے بھی ملاقات ہوئی جن کا مضمون تھا، دوران گفتگو میں انھوں نے مجھ سے فرمایا کہ دیوبند میں تاریخ بینی کا سلسلہ کم ہے^(۲) طالب علی کا دور تھا اس لئے اسی زبان میں میں نے بھی جواب دیا کہ 'تاریخ بینی بیشک کم ہے مگر تاریخ دانی زیادہ ہے، انھوں نے فرمایا کہ بینی اور دانی میں کیا فرق ہے؟ میں نے کہا: ہم دیکھتے کم ہیں اور سمجھتے زیادہ ہیں، پوچھا: کوئی اس پر شاہد؟ میں نے کہا: یہی مضمون جو آپ نے امام مالک کے حالات میں لکھا ہے، کیا یہ امام مالک کی شان علی کے مناسب ہے کہ وہ امام ابو یوسف جیسے بلند پایہ شخص کو ہوا پرست کہیں؟ اس سے صرف امام ابو یوسف ہی کی نہیں بلکہ امام مالک کی بھی تنقید ہوتی ہے کہ انھوں نے اتنے بڑے شخص کو ہوا پرست کہا، کہنے لگے: الفاظ موجود ہیں، میں نے کہا: الفاظ تو ہیں مگر جو معنی بیان کئے گئے وہ صحیح نہیں بلکہ اس کے معنی طلبہ کے ہیں، جیسے قرآن میں فرمایا: ذٰلِكَ هَاكِيَ الْفَيْعِ^(۳) باغی کو باغی اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ طالب ہوتا ہے، واقعہ یہ کہ امام مالک کی عام عادت تھی کہ جب تک بچے نہ ہوتا سنا تے تھے، اس لئے امام نے یہ کہا کہ جس وقت طالبین کا بچ ہوگا اور ہم اسی کام کے لئے بیٹھیں گے تب اس کا جواب دیں گے، اور اس میں نہ امام صاحب کی تنقید تھی نہ ابو یوسف کی، مگر جب باغی کا ترجمہ ہوا پرست کیا جائے گا تو معنی بدل جائیں گے اور دونوں اماموں کی تنقید لازم آئے گی، تو یہ فرق ہے 'بینی' اور 'دانی' میں، طالب علی کا یہ واقعہ میں نے سنا دیا، اس سے خدا بخواتم کسی کی تنقید مقصود نہیں ہے

(۱) سب سے پہلے قاضی القضاۃ امام ابو یوسف ہی ہیں، نہ (۲) مذہب کے خاص مضامین میں زمانہ اور تاریخ نمایاں

مقام رکھتے ہیں، نہ (۳) کہتے

فَجَاءَ رَجُلٌ فَقَالَ أَمَا أَسْعُرُ فَحَلَقْتُ قَبْلَ أَنْ أَذْمُجَ قَالَ أَذْمُجُ وَلَا حَرَجَ ،

پھر ایک شخص آپ کے پاس آیا اور کہنے لگا مجھ کو خیال نہیں رہا میں نے قربانی سے پہلے سر منڈا لیا ، آپ نے فرمایا : اب قربانی

فَجَاءَ آخَرُ فَقَالَ لَمَّا أَسْعُرُ فَنَحَرْتُ قَبْلَ أَنْ أَرُمِيَ ، قَالَ أَرُمِ وَلَا حَرَجَ . فَتَالَ

کرنے ، کوئی مضائقہ نہیں ، پھر ایک اور شخص آیا اور کہنے لگا مجھ کو خیال نہیں رہا میں نے لنگریاں مارنے سے پہلے قربانی کر لی

فَمَا سَأَلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ شَيْءٍ قَدَّمَ وَلَا أَخَّرَ إِلَّا قَالَ أَفْعَلُ وَلَا حَرَجَ

آپ نے فرمایا : اب لنگریاں مار لے کچھ مضائقہ نہیں ، عبد اللہ ابن عمر نے کہا تو (اس دن) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے

جو پوچھا گیا ، کوئی بات کسی نے آگے کر لی یا پیچھے کر دی تو آپ نے یہی فرمایا : اب کرے کچھ مضائقہ نہیں

بَابُ مَنْ أَجَابَ الْفَتَا بِإِشَارَةِ الْيَدِ وَالرَّأْسِ

جس نے ہاتھ یا سر کے اشارے سے جواب دیا

۸۴۔ حَدَّثَنَا مُوسَى بْنُ إِسْمَاعِيلَ قَالَ حَدَّثَنَا وَهَيْبٌ قَالَ ثنا يَأُوبُ

ہم سے بیان کیا موسیٰ ابن اسماعیل نے ، کہا ہم سے بیان کیا وہیب نے ، کہا ہم سے بیان کیا

عَنْ عِكْرَمَةَ عَنْ بَنِ عَبَّاسٍ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سُئِلَ فِي حَجَّتِهِ فَقَالَ

یابوب نے ، انھوں نے عکرمہ سے ، انھوں نے ابن عباس سے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حج میں پوچھا گیا ، ایک شخص نے کہا ،

ذَبَحْتُ قَبْلَ أَنْ أَرُمِيَ ، قَالَ فَأَوْمَأَ بِيَدِهِ قَالَ وَلَا حَرَجَ . وَقَالَ حَلَقْتُ

میں نے لنگریاں مارنے سے پہلے ذبح کیا ، آپ نے ہاتھ سے اشارہ کیا ، کچھ حرج نہیں ، اور ایک شخص نے کہا : میں نے قربانی کر لی ہے

حدیث : ۸۳۔ یہاں مختلف سائل ہیں جنھوں نے ترتیب بدل جانے پر سوال کیا اور آپ نے سب سے یہی فرمایا : أَفْعَلُ

وَلَا حَرَجَ ، اب کرے کچھ حرج نہیں غرضی اور حلق کا مسئلہ یہ ہے کہ اول رمی ہے پھر نحر ، اس کے بعد حلق ، مگر یہاں ترتیب بدل گئی تھی ، تو چونکہ ثبوت

تھی اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جاؤ کچھ گناہ نہیں ، اب اس طرح کہ لو یعنی مقدم و موخر جو کچھ ہو گیا ، جوگا ، مگر کرو ، ترک نہ ہو ، یہاں

لَا حَرَجَ کا مطلب یہ ہے کہ گناہ نہیں ، اگرچہ ان چیزوں میں ترتیب واجب ہے مگر انھیں معذور قرار دیا گیا اس لئے گناہ کی نفی کی گئی ، رہا یہ کہ دم لازم

آئے گا یا نہیں ؟ تو یہ دوسرا مسئلہ ہے ، اس کا یہاں ذکر نہیں ، کتاب کچھ میں مستقلاً مسئلہ آئے گا وہیں اس کے متعلق کچھ کہوں گا ان شاء اللہ تعالیٰ .

بَابُ مَنْ أَجَابَ الْفَتَا بِإِشَارَةِ الْيَدِ وَالرَّأْسِ

یعنی کسی مسئلہ کا جواب سر یا ہاتھ کے اشارے سے دے سکتا ہے یا نہیں ، مقصود یہ ہے کہ اس سے بظاہر لاپرواہی معلوم ہوتی ہے اسلئے

قَبْلَ أَنْ أَذْبَحَ فَأَوْمَأَ بِيَدِهِ وَلَا حَرْجَ

مرثدا یا، آپ نے ہاتھ سے اشارہ فرمایا، کچھ حرج نہیں

۸۵۔ حَدَّثَنَا الْكَلْبِيُّ بْنُ إِبْرَاهِيمَ قَالَ اَنَا حَنْظَلَةُ عَنْ سَالِمٍ قَالَ سَمِعْتُ

ہم سے کئی ابن ابی ہریرہ نے بیان کیا، کہا ہم کو حنظلہ نے خبر دی، انھوں نے سالیہ سے، کہا میں نے
ابا ہریرہ سے سنا، انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے، آپ نے فرمایا (دین کا علم) اٹھ جائے گا اور جہالت پھیل جائیگی
وَيَكْثُرُ الْهَرْجُ، قِيلَ يَا رَسُولَ اللَّهِ وَمَا الْهَرْجُ؟ فَقَالَ هَكَذَا بِيَدِهِ فَحَرَفَهَا
اور (طرح طرح کے) فساد پھیلیں گے اور ہرج بہت ہوگا، عرض کیا: یا رسول اللہ ہرج کیا ہے؟ آپ نے ہاتھ کو ترچھا

كَأَنَّهُ يُرِيدُ الْقَتْلَ

ہا کر فرمایا، جیسے قتل آپ نے مراد لیا۔

۸۶۔ حَدَّثَنَا مُوسَى بْنُ إِسْمَاعِيلَ قَالَ ثَنَا وَهَيْبٌ قَالَ ثَنَا هِشَامٌ عَنْ

ہم سے موسیٰ بن اسماعیل نے بیان کیا، کہا ہم سے وہیب سے، بیان کیا، کہا ہم سے ہشام نے
فاطمة عن أسماء قالت أتيت عائشة وهي تصلي فقلت ما شأن الناس؟ فأشار
بیان کیا، انھوں نے فاطمہ سے، انھوں نے اسماء سے، انھوں نے کہا میں حضرت عائشہ کے پاس آئی، وہ نماز پڑھ رہی تھیں
إلى السماء فإذا الناس قيام فقلت ببئحان الله قلت آية فأشارت برأسها
میں نے کہا: لوگوں کو کیا ہوا (وہ پریشان کیوں ہیں؟) انھوں نے آسمان کی طرف اشارہ کیا، دیکھا تو نگ کھڑے ہیں حضرت
أَي نَوْمٍ فَقُمْتُ حَتَّى عَلَانِي الْغُشَى فَجَعَلْتُ أَصْبُ عَلَى رَأْسِي الْمَاءَ فَحَمِدَ اللَّهُ
عائشہ نے کہا: سبحان اللہ! میں نے کہا: کیا کوئی (عذاب یا قیامت کی) نشانی ہے؟ انھوں نے سر ہلا کر کہا: ہاں! تب میں بھی (نماز میں)
النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَشْنَى عَلَيْهِ

کھڑی ہو گئی، یہاں تک کہ بھوکو غش آنے لگا، میں اپنے سر پر پانی ڈالنے لگی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی تعریف کی اور غوثی بیان کی

امام بخاری یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ایسا کرنا بضرورت جائز ہے۔

حدیث: ۸۴، یہاں لفظ ایماء آیا ہے، بخاری نے اس سے استدلال کیا ہے۔

ثُمَّ قَالَ مَا مِنْ شَيْءٍ لَمْ أَكُنْ أُرِيْتَهُ إِلَّا رَأَيْتُهُ فِي مَقَامِي هَذَا حَتَّى الْجَنَّةَ وَالنَّارَ
 پھر فرمایا، جو چیزیں ایسی تھیں جو مجھ کو دکھائی نہیں جاسکتی تھیں ان سب کو میں نے (آج) اس جگہ سے دیکھ لیا۔ یہاں تک کہ بہشت
 فَأَوْحَىٰ إِلَيَّ أَنْكُمْ تُفْتَنُونَ فِي قُبُورِكُمْ مِثْلَ أَوْ قَرِيبَ لَا أَدْرِي أَيَّ ذَلِكَ قَالَتْ أَسْمَاءُ
 اور دوزخ کو بھی، پھر مجھ پر وحی بھی گئی کہ تم لوگ اپنی قبروں میں اس طرح یا اس کے قریب آزمائے جاؤ گے (ظاہر کو یا دین
 مِنْ فِتْنَةِ الْمَسِيحِ الدَّجَالِ يُقَالُ مَا عَلِمْتَ بِهَذَا الرَّجُلِ فَأَمَّا الْمُؤْمِنُ أَوِ الْمُؤْمِنَةُ
 کہ اسما نے کون سا کھد کہا) جیسے مسیح و دجال سے آزمائے جاؤ گے (تم سے) کہا جائے گا: اس شخص کے باب میں کیا اعتقاد رکھتے تھے؟
 لَا أَدْرِي أَيُّهُمَا قَالَتْ أَسْمَاءُ يَقُولُ هُوَ مُحَمَّدٌ هُوَ رَسُولُ اللَّهِ جَاءَنَا بِالْبَيِّنَاتِ
 (یعنی آنحضرت کے باب میں) ایمان دار یا یقین رکھنے والا (معلوم نہیں اسما نے کون سا لفظ کہا) کہے گا وہ محمد ہیں، اللہ کے بھیجے ہوئے
 وَالْهُدَىٰ فَاجْتَنَاهُ وَاتَّبِعْهُ هُوَ مُحَمَّدٌ ثَلَاثًا
 ہمارے پاس کھلی نشانیاں اور ہدایت لے کر آئے، ہم نے ان کا کہنا مان لیا اور ان کی راہ پر چلے، وہ محمد ہیں، تین بار ایسا ہی کہئے گا۔

حدیث: ۸۵۔ الْهَرَجُ یعنی تل کرنا۔

حدیث: ۸۶۔ قَوْلَا آيَتُ عَاشِثَةُ، یہ کون کا واقعہ ہے، ازواج مطہرات اپنے حجروں سے غصہ و کینہ کی آیت
 کر رہی تھیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے کہا کہ تم لوگوں کو اللہ کی آیت یاد دلاؤ۔

قَوْلَا فَأَشَارَ بِيَدِهِ، یعنی حضرت صدیق اکبرؓ نے اسما کے سوال کے جواب میں آسمان کی طرف اشارہ کیا۔

قَوْلَا أَصْبَحْتُ عَلَىٰ رَأْسِي، یعنی منہ پر ہی میں نے چل کر لیا۔

قَوْلَا لَمْ أَكُنْ أُرِيْتَهُ، یعنی اس مقام سے وہ مارے گئے جو دنیا و آخرت میں پیش آنے والے تھے سب ظاہر کر دے گئے،
 بعض روایات میں ہے کہ قبل کی روایات میں متشکل کر دے گئے، گویا عالم مثال کو سامنے کر دیا گیا، بلاشبہ جیسے آج کل سینما کے پردہ پر تصاویر متشکل نظر
 آتی ہیں، تشبیہ مقصود نہیں، سمجھانے کے لئے محض مثال ہے، حضورؐ نے سب کچھ حتیٰ کہ جنت و دوزخ کو بھی دیکھ لیا، یہاں یہ سوال کرنا جنت
 و دوزخ کہاں ہیں؟ درست نہیں، کیونکہ یہ وجود کی دوسری نوع ہے، ایک عالم کے اعتبار سے این دہمتی کا سوال ہو سکتا ہے، مثلاً کوئی
 پوچھے کہ یہ دیوار کس طرف ہے؟ تو کہا جا سکتا ہے کہ شمال یا جنوب میں ہے، کیونکہ اس کا تعلق ہمارے عالم سے ہے اور اس کا وجود خارجی ہے
 لیکن اس وجود کی نوعیت علیحدہ ہے، وہاں کے متعلق کیسے این دہمتی کا سوال ہو سکتا ہے؟

علامہ ابن تیمیہؒ نے لکھا ہے کہ دارِ مین ہیں: دارِ دنیا، دارِ برزخ، دارِ آخرت اور ہر ایک کے قوانین و قوانین اور حالات

فَقَالَ نَصَاحًا قَدْ عَلِمْنَا إِنْ كُنْتَ لَمُوقِنًا بِهِ وَأَمَّا الْمُنَافِقُ أَوِ الْمُرْتَابُ لَا أَدْرِي
پھر اس سے کہا جائے گا تو مزے سے سو جا، ہم تو پہلے ہی جان چکے تھے کہ تو ان پر یقین رکھتا ہے، اور منافق یا شک کرنے والا
اَيْ ذَلِكَ قَالَتْ اَسْمَاءُ فَيَقُولُ لَا أَدْرِي سَمِعْتُ النَّاسَ يَقُولُونَ شَيْئًا فَقُلْتُمْ

(نہیں معلوم اسامی نے کون سا لفظ کہا ان دونوں میں سے) یوں کہے گا: میں کچھ نہیں جانتا (میں نے تو دنیا میں کچھ غور ہی نہیں کیا)
لوگوں کو جو کہتے سنا وہی میں بھی کہنے لگا۔

جہاں، ایک عالم میں دوسرے عالم کا سوال ہی بچا ہے، مثلاً ہم عالم حیوانات میں جا کر کہیں کہ انسان کا عالم ایسا ایسا ہے اور وہاں یہ ہے
تو کیا کوئی حیوان سمجھ سکتا ہے؟ ہرگز نہیں؛ تو جو قانون وہاں ہے یہاں نہیں، معلوم ہوا کہ ہر درجہ کے قوانین و قوانین ملحدہ ہیں، دور کی حالتیں
دیکھو یورپ کے بڑے بڑے محققین روح کے متعلق کہتے ہیں کہ روح کے قوانین اب تک جس قدر ہم پر مشکلف ہوئے وہ ان سے بہت کم ہیں
جو ہیں، ابھی نامعلوم ہیں، کوئی شخص خواب دیکھے تو تم اس سے پوچھو کہ جو ممکن تم نے خواب میں دیکھا ہے وہ کس طرف ہے اور کس شہر میں ہے،
تو کیا وہ بتا سکتا ہے؟ ہرگز نہیں؛ اسی طرح یہاں رہ کر کوئی نہیں بتا سکتا کہ جنت، دوزخ کہاں ہیں، حالانکہ وہ واقعہ اس وقت بھی موجود ہیں
ایسا نہیں ہے کہ پہلے یہ عالم ہے، پھر عالم مثال آئے گا، پھر عالم آخرت، بلکہ سب اسی وقت موجود ہیں، مگر ہماری نظریں دیکھ نہیں سکتیں، جب
حجاب اٹھ جائے گا سب مشکلف ہو جائے گا، جیسا کہ نبی علیہ السلام کے لئے حجاب اٹھ گیا، تو سب نظر آ گیا، جنت بھی اور دوزخ بھی۔

قَوْلُهُ بِهَذَا الرَّحْلِ، اشارہ کیسے ہوگا؟ تو یہ بھی ممکن ہے کہ اشارہ الیہ سامنے ہوں، اس طرح کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی جگہ پر
رہیں اور پردہ اٹھا دیا جائے اور وہ دیکھ لے۔ اور ہو سکتا ہے کہ عالم مثال میں یہ صورت ہو، مگر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم
کے کچھ صفات بیان کے جائیں گے کہ ایسے ایسے شخص جو تمہارے پاس ایسی ایسی چیزیں لائے تھے ان کے متعلق تمہارا کیا قول ہے؟

قَوْلُهُ نَصَاحًا، اچھی طرح آرام کر، ہم نے نھر کا ترجمہ "سو جا" نہیں کیا، اس وجہ سے کہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ
مردوں کو بھی کسی کی کام میں لگا دیتے ہیں، بعض ملاوت کرتے ہیں، بعض نمازیں پڑھتے ہیں، مکلف نہ ہونے کا یہ مطلب ہے کہ اب ان پر
ضروری نہیں رہا، مگر وہ یہ از خود بطور اتنا ذکر کرتے ہیں، حاجی صاحب فرماتے تھے کہ اللہ ایک بار جنت میں پہنچا دے تو ہم کہیں گے کہ ہم
اب کسی اور چیز کی ضرورت نہیں، بس ایک مصلے بھر جگہ دے دی جائے، ہمیشہ نماز پڑھتے رہیں، تو یہ اس لئے نہیں کہ وہ مکلف ہیں، بلکہ
اس لئے کہ انھیں لذت ہی میں ملتی ہے اور وہ اس میں خوش ہوتے ہیں، وہاں علم کی ترقی کتاب سے نہ ہوگی۔

یہاں کا فرمایا ہرگز ذکر نہیں ہے۔ مگر بعض روایات میں تصریح ہے اشرح عقیدہ سفارینی صلیبی میں سلف کے اقوال نقل کئے ہیں ہیں
کھدے کہ کافر سے بھی سوال ہوگا، یہ کتاب کتب ابن تیمیہ و ابن قیم کا خلاصہ ہے۔

بَابُ تَحْرِیضِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَفَدَ عَبْدِ الْقَيْسِ عَلَى أَنْ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عبد القیس کے لوگوں کو اس بات کی ترغیب دینا کہ ایمان اور علم کی باتیں یاد رکھیں، اور جو لوگ ان کے پیچھے (اپنے ملک میں) ہیں، ان کو نذر کر دیں، اور مالک ابن حویرث نے کہا ہم سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے

النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ارْجِعُوا إِلَى أَهْلِكُمْ فَعَمِلُواهُمْ

فرمایا ہے: اپنے گھر والوں کے پاس لوٹ جاؤ، ان کو دین کی باتیں سکھاؤ

۸۷۔ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ بَشَّارٍ قَالَ حَدَّثَنَا غُنْدَرٌ قَالَ حَدَّثَنَا شُعْبَةُ عَنْ

ہم سے محمد ابن بشار نے بیان کیا، کہا ہم سے غندر (محمد ابن جعفر) نے بیان کیا، کہا ہم سے شعبہ نے،

أَبِي جَهْرَةَ قَالَ كُنْتُ أُرْجَمُ بَيْنَ ابْنِ عَبَّاسٍ وَبَيْنَ النَّاسِ فَقَالَ إِنَّ وَفَدَ عَبْدِ الْقَيْسِ

بیان کیا، انھوں نے ابو جہرہ سے، کہا میں عبد اللہ ابن عباس اور (بصرہ کے) لوگوں کے بیچ میں مترجم تھا، عبد اللہ

أَوْ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ مِنَ الْوَفْدِ أَوْ مِنَ الْقَوْمِ؟ قَالُوا رُبْعَةٌ قَالَ

ابن عباس نے کہا عبد القیس کے پیچھے ہونے والے لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے، آپ نے فرمایا: یہ تیس کے پیچھے ہونے

مَرَحَبًا بِالْقَوْمِ أَوْ بِالْوَفْدِ غَيْرَ خَرَايَا وَلَا زِدَا حُمًى قَالُوا إِنَّا نَأْتِيكَ مِنْ شَقَّةٍ بَعِيدَةٍ

لوگ ہیں؟ یا کن لوگ ہیں؟ انھوں نے کہا ہم رعبہ والے ہیں، آپ نے فرمایا: مرجان لوگوں کو یا ان پیچھے ہونے والے لوگوں کو، نہ

وَبَيْنَا وَبَيْنَكَ هَذَا الْحَيُّ مِنْ كَفَارٍ مُضَرٍّ وَلَا نَسْتَطِيعُ أَنْ نَأْتِيكَ إِلَّا فِي شَهْرٍ حَرَامٍ

ذیل ہونے: مضرمدہ ہونے، وہ کہنے لگے: ہم آپ کے پاس دور کا سفر کر کے آئے ہیں اور ہمارے آپ کے بیچ میں مضر کے کافروں کا یہ

فَرْنَا بِأَمْرِ مُخْذَرٍ بِهِ مَنْ وَرَأَيْنَا نَدْخُلُ بِهِ الْجَنَّةَ

قبیلہ اڑے اور ہم سوا ادب کے نبی کے اور دونوں میں آپ کے پاس نہیں آسکتے، اس لئے ہم کو ایک ایسی (عمدہ) بات بتا دیجئے جس کی خبر ہم

اپنے پیچھے والوں کو کر دیں اور اس کی وجہ سے ہم بہشت میں جائیں

۶۷۱) بَابُ تَحْرِیضِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

دین کی اور علم کی باتوں کو محفوظ رکھنے کو بتلاتے ہیں کہ یہ محبوب چیز ہے، نیز سکھ کر اپنے ہم وطنوں کو سکھانا بھی چاہئے اور تبلیغ بھی کرنا چاہئے اور

بہی بات آپ نے مالک ابن حویرث سے فرمائی تھی [حاصل یہ ہے کہ] علم کو خفی نہ رکھنا چاہئے، بلکہ اسے پھیلانا چاہئے۔

فَأَمَرَهُمْ بِأَرْبَعٍ وَنَهَاهُمْ عَنْ أَرْبَعٍ. أَمَرَهُمْ بِالْإِيمَانِ بِاللَّهِ وَحَدَهُ. قَالَ هَلْ

آپ نے ان کو چار باتوں کا حکم کیا اور چار باتوں سے منع کیا، ان کو حکم کیا خدا سے واحد (یکلختا) پر ایمان لانے کا، فرمایا: تم ہاتھ بڑھ کر

تَذَرُونَ مَا الْإِيمَانُ بِاللَّهِ وَحَدَهُ قَالُوا اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَعْلَمُ، قَالَ شَهَادَةُ أَنْ

نہایت واحد پر ایمان لانا کس کو کہتے ہیں، انھوں نے کہا اللہ اور اس کا رسول خوب جانتا ہے، آپ نے فرمایا: یوں گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی

لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللَّهِ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ وَصَوَّمَ رَمَضًا

سچا سجدہ نہیں ہے اور محمد اس کے پیغمبر ہوئے ہیں، اور نماز کو درستی سے ادا کرنا اور زکوٰۃ دینا اور رمضان کے روزے رکھنا اور لوٹ

وَتَعطَى الْخُمْسَ مِنَ الْمَغْنَمِ وَنَهَاهُمْ عَنِ الدِّبَاءِ وَالْحَنْتَمِ وَالْمَرْقَةِ قَالَ شُعْبَةُ

کے دل سے پانچواں حصہ داخل کرنا، اور ان کو منع کیا کدو کے تو بے اور سبز لکھی برتن اور روغنی برتن سے، شعبہ نے کہا

وَرُبَّمَا قَالَ النَّقِيرُ وَرُبَّمَا قَالَ الْمُقِيرُ قَالَ أَحْفَظُوهُ وَأَخْبِرُوهُ مَنْ وَرَائَكُمْ

ابو جمرہ نے بھی تو کہا، اور کہ یہ ہے ہونے لکڑی کے برتن سے اور کبھی کہا مرقت کے بدلے مقیر، آپ نے فرمایا اس کو یاد کرو اور اپنی بیچ والوں کی خبر

قَوْلًا شَفَقَهُ، جس کا طے کرنا شاق ہو، شفقت سے ملے ہو، یہی سافت بعیدہ ہے، اخبار وہ من ورائکم میں ترجمہ ہے باب کا

یعنی دوسروں کو جان کے پیچھے وطن میں رہ گئے ہیں انھیں خبر کریں۔

قَوْلًا رَبَّمَا قَالَ النَّقِيرُ، یعنی راوی نے کبھی بھی اس کو چوتھی چیز بتایا ہے، یوں کہہا کہ ش کیا چار چیزوں سے (۱) الدِّبَاءُ؛

کدو کا تو بنا (۲) الحَنْتَمُ؛ سبز لکھی برتن (۳) المَرْقَةُ؛ روغنی برتن (۴) النَّقِيرُ؛ لکڑی کے برتن یا کدو کا بنا ہوا برتن، اور کبھی بجائے مرقت کے

مقیر کہا، یعنی روغنی بنا ہوا برتن۔

یہ بات یاد رکھو کہ ابن عباس نے سوال کے جواب میں یہ حدیث سنائی، اس منبع سے سمجھ میں یہ آتا ہے کہ وہ اسے منسوخ نہ سمجھتے تھے

کیونکہ بعد میں (یعنی حضور کی وفات کے بعد) بیان کر رہے ہیں اور نفوی دے رہے ہیں، مگر صحیح مسلم کے آخرین تصریح ہے کہ کنت نہیں کہم عن

الانتباز وَلَا تَقُولُوا مَسْكِرًا اسے نسخ مراد موجود ہے جس سے معلوم ہوا کہ علت وحدت میں ظروف کو دخل نہیں ہے۔

علمائے اس میں کلام کیا ہے کہ نبی تو منسوخ ہے مگر نبی کا منشا کیا تھا؟ تو بعض نے یہ منشا بتلایا کہ یہ برتن مذکور نہیں شراب کے لئے کیونکہ

عموماً انھیں ظروف میں شراب بناتے تھے اب جب شراب حرام کر دی گئی اور ظروف سامنے موجود ہوں گے تو اس کی یاد تازہ ہو جائے گی، اس لئے

ان برتنوں کا استعمال بھی ممنوع قرار دے دیا، پھر جب دلوں میں شراب کی نفرت بیٹھ گئی اور انس بھی ہمارا ہوتا تو ان ظروف کے استعمال کی اجازت

مل گئی جو اصل حکم تھا، یہ تقریر اس نسخ کے مناسب ہے اور بعضوں نے کہا کہ اس کا منشا یہ ہے کہ ان برتنوں میں میز جو بنائی جاتی ہے تو بہت جلد اشتداد

بَابُ الرَّحَلَةِ فِي الْمَسْئَلَةِ النَّازِلَةِ

کوئی مسئلہ جو پیش آیا ہو اس کے لئے سفر کرنا۔

۸۸۔ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ مُقَاتِلٍ أَبُو الْحَسَنِ قَالَ أَخْبَرَنَا عَبْدُ اللَّهِ قَالَ

ام سے محمد ابن مقاتل ابو الحسن نے بیان کیا، کہا ہم کو عبد اللہ ابن مبارک نے خبر دی، کہا ہم کو عمر
 انا عمر بن سعید بن ابی حسین قال حدثني عبد الله ابن ابی ملىكة عن عتبة
 بن سعید نے خبر دی، کہا مجھ سے عبد اللہ ابن ابی ملىك نے بیان کیا، انھوں نے عقبہ ابن حارث سے سنا، انھوں نے
 بن الحارث انه تزوج ابنة لابی اهاب بن عزير فأتته امراة فقالت اني
 ابو اهاب ابن عزير کی بیٹی (غنیہ) سے نکاح کیا، پھر ایک عورت آئی (اس کا نام نہیں معلوم) کہنے لگی کہ میں نے تو عقبہ
 قد ارضعت عتبة والى تزوج بها قال لها عتبة ما علم انك قد ارضعتني
 اور اس کی دھن (غنیہ) کو دودھ پلایا ہے، عقبہ نے کہا کہ میں تو نہیں سمجھتا کہ تو نے مجھ کو دودھ پلایا ہے، نہ تو نے مجھ سے
 ولا اخبرتني فركب الى رسول الله صلى الله عليه وسلم فسأله فقال رسول الله
 کبھی بیان کیا، پھر عقبہ سفر کر کے (اپنے ملک سے) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف مدینہ کو چلے اور آپ سے پوچھا، آپ نے فرمایا
 صلى الله عليه وسلم كيف وقد قيل

تو اس عورت سے کیونکر (محبت کرے گا) جب ایسی بات کہی گئی (کہ وہ تیری بہن ہے)

پیدا ہو جاتا ہے اور وہ اٹھنے لگتی ہے، اس لئے احتیاط کرنے کو کہا کہ مباد کوئی اس میں میز بنائے اور اس میں اشتداد پیدا ہو جائے
 جس کا اسے شعور نہ ہو اور استعمال کرنے کو بے شعور ہی مسکر کا استعمال ہو جائے گا، اس وجہ سے ان ظروف کا استعمال کرنا ہی منع
 فرمایا، اگر اس میں اشکال ہے کہ یہ منشا تو آخر تک موجود ہے، پھر نسخ کیوں ہوا، برخلاف پہلی تقریر کے کہ وہ منشا نسخ کے مناسب ہے۔
 قیوں کہا جاسکتا ہے کہ چونکہ ان میں منکر جلد آتا ہے اور ابتداء میں مسکر پینے کی عادت تھی اس لئے ادھر سے احتیاط
 کم ہوگی اور ادھر منکر جلد آئے گا، اس لئے منع فرمایا (پھر جب عادت چھوٹ گئی تو اجازت دے دی) کہ اب وہ خود ہی احتیاط
 بہت لیں گے، اس تقریر سے اشکال تو دور ہو گیا (مگر بہر حال پہلی تقریر منشا نسخ کے زیادہ مناسب ہے۔ احوال چونکہ حدیث مسلم
 میں نسخ کا ذکر صراحتاً موجود ہے، لہذا کہیں گے کہ یہ حدیث ابن عباس کو نہیں پہونچی۔

(۹۸) باب النجاء: پہلا باب طلب علم کے لئے سفر کرنے کا تھا اور دوسرا دریا میں سفر کا تھا اور یہ ایک تیسری چیز ہے کہ

فَكَارَهَا عُقْبَةً وَلَكَّتْ زَوْجًا غَيْرَهُ

نہر عقبہ نے اس کو چھوڑ دیا، اس نے دوسرے سے نکاح کر لیا۔

ایک تو مطلق علم کے لئے سرفہ اور ایک کسی خاص جزیہ کے لئے سفر کرنا، جسے استغفار کہتے ہیں، تو یہ بھی طلب علم ہے، لیکن جزیٰ اور پہلے کئی طلب علم کو ذکر کیا۔
حدیث : ۸۸۔ تولا عقبہ بن الحارث، یہ کہتے ہیں کہ میں نے عقیقہ سے نکاح کیا اور بعد نکاح مجھ سے ایک عورت نکلا کہ میں نے عقبہ کو بھی دودھ پلایا ہے اور تمھاری منکوحہ غنیہ کو بھی، یعنی تم دونوں رضائی بھائی بہن ہو، تمھارا نکاح کیسے درست ہوگا؟ عقبہ نے کہا میں تو اس کا کوئی علم نہیں تھا کہ تو نے ہم دونوں کو دودھ پلایا ہے، نہ ہی تو نے قبل نکاح ہم کو کوئی اطلاع دی۔

یہ جواب تو انھوں نے دے دیا مگر اپنے اطمینان کی غرض سے دربار نبویؐ میں حاضری دی، اور معلوم کیا کہ کیا اس حالت میں ایک عورت کا قول معتبر ہو سکتا ہے؟ یا نہیں!

تولا کَیْفَ وَقَدْ قِيلَ، یعنی آپ نے یہ سن کر کہ دودھ پلانے والی عورت خود کہتی ہے کہ اس نے ان دونوں کو دودھ پلایا ہے، فرمایا کہ پھر کچھ دوں انھیں روکتے ہو؟ جب کہ کہہ دیا گیا جو کچھ کہہ دیا گیا، یعنی [رضاعت کی بات کبھی جاہلی]
تولا فَكَارَهَا، یعنی عقبہ نے اس عورت کو چھوڑ دیا [علمی اختیار کر لی] اب ہدائی کی کیا صورت پیش آئی؟ خود طلاق دیدی؟ یا رسول اللہ اسلام نے تفریق کرا دی؟ دونوں احتمال ہیں۔ تفریق کا مفضل حال آگے آگے آئے گا، یہاں تو آتا رہتا ہے کہ طلاق سے بھی مفارقت ہو جائی کہ اور حاکم کی تفریق سے بھی۔

مسئلہ کا مختصر بیان یہ ہے کہ اگر مرد تنہا شہادت دے کہ میں نے اس لڑکے اور لڑکی کو مدت رضاعت میں دودھ پلایا ہے تو تنہا مرضعہ کی یہ شہادت امام احمد ابن حنبل کے نزدیک کافی ہے، مزید شہادت کی حاجت نہیں، اور جہور کہتے ہیں کہ کافی نہیں، بلکہ نصاب شہادت کا پایا جان ضروری ہے، دو مرد ہیں، یا ایک مرد دو عورتیں۔ قَالَ اللَّهُ تَعَالَى: فَاسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ مِنْ رِجَالِكُمْ، فَإِنْ لَمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَامْرَأَتَانِ۔ خفیکہ اور بعض دیگر ائمہ کا یہی مسلک ہے۔ یہ حدیث بظاہر امام احمد کے لئے مفید ہے اور حجت ہے، یعنی یہ کہ صرف مرضعہ کی شہادت کافی ہے، اس کے جواب میں ابن تیمیہ نے لکھا ہے کہ یہ حدیث محمول ہے تو رے اور تنزہ پر، یعنی شریعت کو حجت کو ثابت نہیں کرتی، لیکن چونکہ شبہہ پڑ گیا ہے، جو ثبوت کے لئے اگرچہ کافی نہیں ہے، مگر پڑھ چکے ہو: الْحَلَالُ بَيْنَ وَالْحَرَامِ بَيْنَ وَبَيْنَهُمَا مُشْتَبِهَاتٌ، اس لئے حضورؐ نے فرمایا: كَيْفَ وَقَدْ قِيلَ، اس کے علاوہ یہ بات بھی ہے کہ اب شاید آپس میں اصفائی بھی رہے، اس لئے تو رے آپ نے حکم دیا، اور تفریق

بَابُ التَّنَاوُبِ فِي الْعِلْمِ

علم حاصل کرنے کے لئے باری مقرر کرنا

۸۹۔ حَدَّثَنَا أَبُو الْيَمَانِ قَالَ أَخْبَرَنَا شُعَيْبٌ عَنِ الزُّهْرِيِّ قَالَ وَقَالَ

ہم سے ابو الیمان نے بیان کیا۔ کہا ہم کو شعیب نے زہری، انھوں نے زہری سے۔ دوسری سند :

ابْنُ وَهْبٍ أَنَا يُوسُفُ بْنُ ابْنِ شَهَابٍ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ أَبِي ثَوْرٍ عَنْ

امام بخاری نے کہا۔ ابن وہب نے کہا : ہم کو یوسف نے خبر دی، انھوں نے ابن شہاب سے، انھوں نے عبید اللہ بن عبد اللہ

عَبْدُ اللَّهِ بْنُ عَبَّاسٍ عَنْ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ كُنْتُ أَنَا وَجَارِيٌّ مِنَ الْأَنْصَارِ

ابن ابی ثور سے، انھوں نے عبد اللہ بن عباس سے، انھوں نے حضرت عمر سے، انھوں نے کہا : میں اور میرا ایک انصاری

فِي بَنِي أُمَيَّةَ بْنِ زَيْدٍ وَهِيَ مِنْ عَوَالِي الْمَدِينَةِ وَكُنَّا تَنَابُؤُ الْكَوْثُورِ عَلَى رَسُولِ اللَّهِ

خبر دی دونوں بنی امیہ بن زید کے گاؤں میں جو مدینہ کے (یورپ کی طرف) بلند گاؤں میں سے تھا کرتے تھے، اور

صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَنْزِلُ يَوْمًا وَأَنْزَلَ يَوْمًا

ہم اور وہ دونوں باری باری آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس (مدینہ میں) اتر کرتے، ایک روز وہ اترتا اور ایک روز میں اترتا

ہوئی، یہ شیخ ابن ہمام نے جواب دیا۔ بخاری بھی آگے چل کر کتاب البیوع میں اسی طرط اشارہ کر رہے ہیں۔ لیکن خیر الدین رحمی استاد صاحب دفتار سے حاشیہ البحر الرائق میں منقول ہے کہ ہمارا (احاف کا) جو مسلک ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ قضاء حرمت ثابت نہیں ہوتی، دیانتہ ہو جاتی ہے قضاء اور دیانتہ کے مراتب کا تعین بہت مشکل ہے، اقوال فقہاء اس باب میں مضطرب ہیں، جو لوگ اب تک یہ سمجھ جاتے ہیں کہ فی المیزان وہیں اللہ تو حرمت ہو گئی، لیکن لوگوں کے تعلقات اور معاملات کے اعتبار سے حرمت کا حکم نہیں، یہ ٹھیک نہیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ جب تک معاملہ فکر عدالت میں نہیں آیا، اس وقت تک دیانتہ ہے، خواہ تمام دنیا میں شہرت ہو جائے، اس صورت میں اگر ایک عورت یہ کہے، تو مفتی یہی فتویٰ دے گا کہ تم دونوں علیحدہ ہو جاؤ، لیکن قاضی اس کا پابند نہیں، تو مفتی فتویٰ دے گا وہ فتویٰ دیانتہ ہوگا، اگر قاضی کے پاس سوال ہوگا کہ دو گواہ لاؤ، اب اگر (گواہ نہ لاسکے اور) قاضی نے فیصلہ کر دیا کہ جاؤ ماسقہ رہو تو اسے شریعت میں سفاح نہ کہیں گے، پس اب دیانتہ کا مطلب یہ ہوگا کہ ایسے وقت میں ترک کر دینا بہتر ہے۔ یہ تعبیر ابن ہمام کے قول سے اچھی ہے، اگرچہ مال دونوں کا ایک ہے، تو جب مفتی کا قول لازم نہیں ہے، نہ وہ تفریق کرا سکتا ہے تو وہ محض توڑنا ہوگا، بخلاف قول قاضی کے کہ وہ تفریق کرا سکتا ہے، اب غور طلب بات یہ ہے کہ حضور نے جو کثف و قد قیل فرمایا، تو یہ بحیثیت قاضی کے فرمایا تھا اور یہ حکم قضا تھا یا مشورہ اور فتویٰ کے اعتبار سے تھا؟ ۹۔

فَإِذَا نَزَلَتْ جَنَّتُهُ بِخَيْرِ ذَلِكَ الْيَوْمِ مِنَ الْوَحْيِ وَغَيْرِهِ وَإِذَا نَزَلَ فَعَلَ مِثْلَ ذَلِكَ

جس دن میں اترتا تو اس دن کی ساری خبریں، وحی وغیرہ جو آپ پر اترتی اس کو بتلا دیتا اور جس دن وہ اترتا تو وہ بھی ایسا ہی کرتا،

فَنَزَلَ صَاحِبِي الْأَنْصَارِ يَوْمَ نُوَيْبَةَ فَضْرَبَ بِأَبِي صَرْبٍ شَدِيدًا فَقَالَ أَلَمْ تَهْوَبْ؟

ایک دن ایسا ہوا کہ میرا ساتھی انصاری اپنی باری کے دن اترتا تھا، اس نے (دہان سے آن کر) میرا دروازہ زور سے کھڑکایا، اور

فَفَرَعْتُ وَخَرَجْتُ إِلَيْهِ فَقَالَ حَدَّثَ أَمْرٌ عَظِيمٌ، فَدَخَلْتُ عَلَى حَفْصَةَ فَإِذَا هِيَ

کہنے لگا: عمر ہیں؟ میں گھبرا کر باہر نکل آیا، وہ کہنے لگا: (آج تو) بڑا نچ ہوا (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیوی کو

تَبَنَّى، فَقُلْتُ أَطْلَفَ كُنَّ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ؟ قَالَتْ لَا أَدْرِي

طلاق دے دیا) یسن کریں (اپنی بیٹی) حفصہ کے پاس گیا اور وہ رو رہی تھی، میں نے کہا: کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تم لوگوں کو

طلاق دے دی؟ اس نے کہا میں نہیں جانتی

دونوں ہی احتمال ہیں، تو اب دونوں فریق کے لئے گنجائش رہی، کسی ایک کے ساتھ مخصوص نہ رہا، کیونکہ آپ کے دونوں منصب تھے، اگر کہیں نہیں ہے کہ آپ نے عورت کو طلب فرمایا ہو، اگر قصار فرماتے تو عورت کو بلانا اور شہادت لینا ضروری تھا، اور وہ ہوا انہیں، تو یہ اس بات کا مزعج ہے کہ منصب افتاء کے اعتبار سے قویٰ دیا تھا۔

(۹۹) بَابُ التَّأْوِبِ فِي الْعِلْمِ

حدیث ۸۹ : ابن شہاب وہی زہری ہیں، یہ حدیث بہت طویل ہے، آگے مفصل آئے گی، اس میں جس عظیم

ذکر ہے وہ ایلا کا واقعہ ہے، امام بخاری نے باب کا عنوان یہ رکھا ہے کہ علم کو نوبت بہ نوبت حاصل کرنا یعنی دو طالب علم (طلب علم میں) اس طرح شریک ہو جائیں (اور سمجھوتہ کریں) کہ ایک دن ایک جا کر استاد سے سن لیا کرے اور دوسرے دن دوسرا سن لیا کرے، تو علوم ہوا کہ اگر کسی ضرورت سے تناوب کر لیا جائے تو اس میں کچھ حرج نہیں ہے، یہ صورت بھی ہو سکتی ہے اور یہ حدیث اس کی دلیل ہے۔

قولہ بنی اہیۃ بن زید۔ یہ ایک قبیلہ ہے عوالی مدینہ میں، مدینہ کے شرقی جانب کو عوالی اور جو مغرب کی جانب نشیب میں ہے، اسے سوافل کہتے ہیں، کبھی عوالی کے مقابل کو سوافل کہہ دیا جاتا ہے، عوالی گاؤں ہے [ذرا فاصلہ پر] روزانہ وہاں سے آنے میں حرج تھا اور کسب ضروریات میں [روز روز آنا جانا ضل انداز ہوتا تھا] اس لئے غر فرماتے ہیں کہ ہم نے اپنے پڑوسی سے یہ طے کر لیا کہ ایک دن تم جاؤ ایک دن ہم، اس سے مسئلہ بھی نکل آیا کہ خبر واحد قابل احتجاج ہے، خصوصاً جب خبر واحد فرد ہوا اور غریب بھی اگر خبر واحد تحت نہ ہوئی تو ایسا سمجھوتہ کیوں ہوتا اور کیوں یہ قبول کرتے۔ اور اگر قبول نہ کرتے تو فائدہ کیا تھا، لہذا معلوم ہوا کہ ہر عادل کی

ثُمَّ دَخَلْتُ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقُلْتُ وَأَنَا قَائِمٌ أَطْلَقَ

پھر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا۔ میں کھڑے ہی کھڑے (پہلے ہی) عرض کیا: کیا آپ نے اپنی بیویوں کو طلاق دے دیا؟

نِسَاءَكَ؟ قَالَ لَا أَفْقَلْتُ اللَّهُ أَكْبَرُ

آپ نے فرمایا: نہیں تو میں نے کہا: اللہ اکبر!

روایت اگرچہ وہ فرد ہو اور غریب ہو، قابل احتجاج ہے۔

قَوْلًا فَقَالَ أَتَمَّهُوْ: پوچھا وہ یہاں ہیں یا نہیں؟

قَوْلًا فَدَخَلْتُ أَخْرَجُهُ خَصْرًا، درجہ مطول روایت میں ہے کہ عرضی اللہ نے کہا: اجاء الغسانی: کیا غسانی

آگئے، چونکہ اس وقت شہرت ہو رہی تھی کہ غسانی (جو انصار مدینہ کے ہم چداور عیسائی تھے) مدینہ پر چڑھائی کرنے والے ہیں، پہلے عرض کا ذہن فوراً ادھر گیا کہ شاید انھوں نے حکم کر دیا ہو۔ انصاری نے جواب میں کہا نہیں! اس سے بھی بڑھ کر حادثہ پیش آیا یعنی حضور نے ازواج کو طلاق دے دی، معلوم ہوا کہ طلاق ازواج حملہ غسانی سے بھی بڑھ کر ہے، ان صحابی کوبات کی پوری تحقیق نہ تھی حضور ایک مشرہ (بالا خانہ) میں تشریف فرما تھے، منافقین نے طلاق کی بات مشہور کر دی تھی، کہیں سے انھوں نے بھی سن لیا اور یہی اثر نقل کر دیا۔

حضرت عمر سب سے پہلے حضرت حفصہ کے ہاں پہنچے، کیونکہ یہ بیٹی تھیں اور ان کی فکر حضرت عمر کو اس لئے تھی کہ (اگر یہ بات سچ ہوئی تو) یہ بڑی خردی تھی، چنانچہ انھوں نے فرمایا: قد خابت حفصہ [حضرت عمر بن حب حفصہ کے پاس] پہنچے تو ان کو روتے ہوئے دیکھ کر (حضرت عمر پہلے تو) گھبرائے، مگر جب انھوں نے (اداری) کہا تو کچھ پریشانی میں کمی ہوئی۔

یہ بھی آیا ہے کہ حضرت عمر نے حضرت حفصہ سے فرمایا: تمہیں دھوکہ نہ ہو کہ حضور جس طرح عائشہ کو محبوب رکھتے ہیں، تم کو بھی رکھیں گے، آخر تم کس بات پر جھگڑتی ہو؟ کیا نفقہ پر؟ خبردار! اب جس چیز کی ضرورت ہو مجھ سے کہنا، حضور سے ہرگز نہ کہنا۔ پھر یہاں سے حضور اقدس کی خدمت میں پہنچے اور تین بار اذن طلب کیا، تب حاضری کی اجازت ملی، اوپر گئے تو کمرہ کی حالت دیکھی کہ سامان کچھ بچا نہیں، بہت منافع ہوئے، اس لئے بھی کہ سامان کچھ نہ تھا اور اس لئے بھی کہ آپ کو ازواج کی طرف سے خصوصاً حفصہ کی طرف سے دکھ پہنچا۔

سب سے پہلا سوال کیا: أَطَلَقْتَ نِسَاءَكَ؟ کیا حضور نے اپنی ازواج کو طلاق دے دی؟ آپ نے فرمایا: نہیں! کہا: اللہ اکبر، (یہ اللہ اکبر کہنا یا تو) فرح و سرور سے تھا یا تعجب کی راہ سے۔ عمر کہتے ہیں کہ اس کے بعد میں نے عرض کیا کہ آپ میرا قصہ سنیں تو تعجب کریں گے، ہم جب تک کہ میں تھے تو عورتوں پر غالب تھے (اور عورتیں دبی ہوئی تھیں) اور یہاں آکر انصار مدینہ کی عورتوں کو دیکھ کر ہمارے عورتوں کا بھی

بَابُ الْغَضَبِ فِي الْمَوْعِظَةِ وَالتَّعْلِيمِ إِذَا رَأَى مَا يَكْرَهُ

دعوت کہنے یا پڑھانے میں کوئی بری بات دیکھے تو غصہ کرنا

۹۔ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ كَثِيرٍ قَالَ أَخْبَرَنِي سُفْيَانُ عَنْ أَبِي خَالِدٍ عَنْ

ہم سے محمد ابن کثیر نے بیان کیا، کہا خبر دی ہم کو سفیان ثوری نے، انھوں نے اسماعیل بن ابی خالد سے

قَيْسِ بْنِ أَبِي حَازِمٍ عَنْ أَبِي مَسْعُودٍ الْأَنْصَارِيِّ قَالَ قَالَ رَجُلٌ يَا رَسُولَ اللَّهِ

انھوں نے قیس بن ابی حازم سے، انھوں نے ابومسعود انصاری سے، انھوں نے کہا ایک شخص (حزم ابن کعب) نے عرض کیا

لَا أَكَادُ أَدْرِكُ الصَّلَاةَ مِمَّا يَطْوُونَ بِهَا فُلَانٌ

یا رسول اللہ مجھے تو (جماعت سے) نماز پڑھنا مشکل ہو گیا ہے، فلاں صاحب (معاذ ابن جبل) نماز (بہت) لمبی پڑھتے ہیں

رنگ بدل گیا، ایک دن میں نے اپنی بیوی کو کسی بات پر جھڑکا تو اس نے کہا کہ تم مجھے کیوں جھڑکتے ہو، کیا تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے
بڑھ کر ہو، ازواج مطہرات تو حضور سے حقوق طلب کرتی ہیں اور تم جھڑکتے ہو [حضرت عمرؓ کہتے ہیں۔ اس کے بعد میں نے] عرض کیا کہ حضرت
میں حصہ کے پاس گیا اور حصہ سے یہ یہ کہا۔ حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ اس کے حضور کے چہرے پر فروغ و مسرت کے آثار پائے گئے، پھر میں نے
کہا کہ دعا کیجئے کہ اللہ آپ کی امت پر توسیع کرے، یہ ادب کے خلاف تھا کہ کہنے کے اپنے لئے دعا کیجئے، یہ بکثرت کفار مزے اُڑا رہے ہیں
اور اہل اسلام تنگی میں ہیں، یہ جلد آپ کو پسند نہ آیا، آپ اٹھ کر بیٹھ گئے اور فرمایا: اِنِّیْ شَاكْتُ اَنْتَ یَا اَبْنَی النَّخْبَابِ هُوَ لَآءُ قَوْمٍ عَجَلَتْ
لَهُمْ طَبِیْعٌ تَهْمُ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَالاخِرَةِ لَهْمُ فِي الْاٰخِرَةِ۔ اس کے بعد آیات تغیر نازل ہوئیں، یا ایہا النبی قل لا زواج با
اجراً عظیماً۔ آپ نے آیتوں پر عمل کیا اور ازواج کو اختیار دیا، تاہم ازواج نے بالاتفاق کہا کہ ہم کو دار آخرت مقصود ہے۔ مقصد
حدیث کو لانے سے تناوب ثابت کرنا ہے جو ابتدا حدیث میں مذکور ہے۔

(۱۰) بَابُ الْغَضَبِ فِي الْمَوْعِظَةِ

اس ترجمہ سے یہ افادہ مقصود ہے کہ اگر اساذ غصہ ہو جائے تو کچھ مضائقہ نہیں، چونکہ بظاہر غصہ کرنے اور خفگی سے حظ نفس معلوم
ہوتا ہے اس لئے بتاتے ہیں کہ حضور جو حظ نفس سے خالی تھے وہ غصہ ہوتے تھے، اور یہ اس وقت ہوتا تھا جب کوئی شاگرد اپنی فطرت سلیمہ اور
طبیعت سے کام نہ لیتا تھا اور اٹلے پلٹے سوال کرتا تو ایسے موقع پر بخفا ہوتے، یہاں بھی حضرت معاذ ابن جبل کو اپنی فطرت سلیمہ کو کام لیکر

(۱۱) حضرت معاذ کا نام ظاہر کی بنا پر لیا گیا ہے۔ ۱۲ مرتب۔

فَارَأَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي مَوْعِظَةٍ أَشَدَّ غَضَبًا مِنْ يَوْمِئِذٍ فَقَالَ
 اِيَّهَا النَّاسُ اِنَّكُمْ مُنْفَرُونَ فَمَنْ صَلَّى بِالنَّاسِ فَلْيُخَفِّفْ فَإِنَّ فِيهِمُ الْمَرِيضَ
 نفرت دلانے کے، دیکھو جو کوئی نماز پڑھائے وہ بھی نماز پڑھے، کیونکہ ان میں کوئی بیمار ہوتا ہے، کوئی ناتواں اور
 الضَّعِيفَ وَذَا الْحَاجَةِ

کوئی کام والا

نماز کو زیادہ طویل کرنا چاہئے تھا مگر انھوں نے توجہ نہیں کی اس لئے محبوب آقا نے غصہ فرمایا، اب اگر کسی اور استاد کو بھی اسی طرح
 کی بات پر غصہ آجائے تو کوئی قابل گرفت بات نہیں۔

قَوْلُهُ لَا اِكَادُ اَدْرِكَ الصَّلَاةَ، یعنی قریب نہیں ہے کہ میں شریک ہو سکوں کیونکہ میں کام کاجی آدمی ہوں، کام کرتے
 کرتے تھک جاتا ہوں اور اتنی طویل قرات برداشت نہیں ہوتی۔

قَوْلُهُ فَلَانَ عَلَّاهُ غَمَانِي نے فرمایا کہ فلاں سے معاذ ابن جبل مراد نہیں ہیں بلکہ ابی ابن کعب ہیں، لِهَذَا قَالَ الْمَحَافِظُ
 قَوْلًا فِي مَوْعِظَةٍ أَشَدَّ غَضَبًا اِنَّ اس سے ترجمہ ثابت ہو گیا۔

قَوْلُهُ اِنَّكُمْ مُنْفَرُونَ یعنی من الدین، کیونکہ نماز بھی دین سے ہے اور تم نے اس سے نفرت دلائی تو یہ دین سے
 نفرت دلانا ہوا، اور یہ بات مومن کی شان کے خلاف ہے۔

قَوْلُهُ فَلْيُخَفِّفْ، تخفیف سے مراد یہ ہے کہ جن جن نمازوں میں جو سور مسنون ہیں ان میں سے جو چھوٹی ہوں ان کو
 پڑھے اور اچاناً طویل بھی پڑھ لے، تو طویل منہی غنیمتیں داخل نہیں ہے، عادت نبوی یہ تھی کہ نماز فجر میں تطویل فرماتے اور اکثر
 طوال مفصل پڑھتے اور اوسط و قصار دیگر نمازوں میں پڑھتے تھے، شیخ جنجنوں نے حضور سے شکایت کی بظاہر حاجت دالے معلوم
 ہوئے ہیں، اور حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے قصے میں تو مسائل یقیناً حاجت والا تھا اور یہاں یقینی طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ سائل
 ذوالحاجہ تھا۔

(۱) یہاں بظاہر حضرت معاذ ابن جبل مراد ہیں، جیسکہ ترجمہ مولانا وحید الزماں سے ظاہر ہوتا ہے۔ ۱۲ ج ۱۔

(۲) حاجت تقریر نے حزم ابن کعب لکھا ہے، جو خود ان کا سہو ہے۔ فتح الباری ص ۱۳۶ ج ۲ ملاحظہ کیجئے ۱۳ مرتب۔

حَتَّىٰ أَحْمَرَتْ وَجْنَتَاہُ، أَوْ قَالَ أَحْمَرَ وَجْہَہُ فَقَالَ مَا لَکَ وَلَهَا مَعَهَا سِقَاءُهَا

آپ کے دونوں گال سرخ ہو گئے، یا آپ کا منہ سرخ ہو گیا، آپ نے فرمایا: تجھے اونٹ سے کیا واسطہ، وہ تو اپنی شک اور اپنا
وجزاء ہمارا ترڈ الماء وَتَرَعَى الشَّجَرَ فذَرَهَا حَتَّىٰ يَلْقَاهَا رِبُّہَا قَالَ فَضَالَةٌ
موزہ ساتھ رکھا ہے، وہ خود پانی پر جا کر پانی پی لیتا ہے اور درخت کے پتے چر لیتا ہے، اس کو چھڑ رہے دے جب تک اس کا

الْغَنَمُ؟ قَالَ لَکَ أَوْ لِأَخِیْکَ أَوْ لِذِئْبٍ

بلک آنے، اس نے کہا: گئی ہوئی بکری؟ آپ نے فرمایا: وہ تو میرا حصہ ہے یا تیرے بھائی (اس کے) مالک (حصہ) یا بھینٹے کا۔

۹۲۔ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ الْعَلَاءِ قَالَ حَدَّثَنَا أَبُو أُسَامَةَ عَنْ بُرَيْدٍ عَنْ

ام سے محمد ابن عمار نے بیان کیا، کہا ہم سے ابوسامہ نے بیان کیا، انھوں نے برید سے، انھوں نے

أَبِی بُرْدَةَ عَنْ أَبِي مُوسَى قَالَ سَمِعْتُ النَّبِیَّ صَلَّى اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنْ أَشِیَاءَ کَرِهَہَا

ابو بردہ سے، انھوں نے ابوموسیٰ اشعری سے، کہا کہ لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی باتیں سنی ہیں کہ آپ کو برا معلوم ہوا

احتمال قوی ہے اور اس وقت یہ صورت ذہنی، اس لئے سرکار کو غصہ آیا، منشا حضور کا یہ تھا کہ اونٹ کے لئے کسی چیز کا خون نہیں، کھانے پینے میں
وہ اس کا قحط نہیں کوئی پہونچائے تو کھاپی سکے ورنہ نہیں، بلکہ وہ خود ہی کھاپی سکتا ہے۔

وَحَدَّثَنَا عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ سَمِعْتُ النَّبِیَّ صَلَّى اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنْ أَشِیَاءَ کَرِهَہَا

تو ابی فضالۃ الغنم، یعنی اگر بکری جنگل میں مل جائے اور مالک کا پتہ نہ ہو تو اس کو کچر کر گھر لاسکتا ہے؟ یا اونٹ کی

طرح اس کا بھی حکم ہے؟ یہ سوال چونکہ ڈھنگ کا تھا اس لئے آپ نے مسئلہ سمجھایا اور اس پر غصہ نہیں فرمایا بلکہ اس کا حکم بتلایا کیونکہ بکری میں
احتمال بے ضیاع کا اور وہ کھانے پینے میں چر دہا ہے کی قحط ہے۔

لَاخِیْکَ، صاحب مال یا کوئی مسلم۔

لِلذِّئْبِ، اشارہ کیا کہ ضیاع کا احتمال ہے، اس لئے اس کی حفاظت کر لینا چاہئے۔

بخاری کا ترجمہ ثابت ہو گیا کہ موعظت میں غصہ بھی ہو سکتا ہے۔

حدیث ۹۲۔ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ الْعَلَاءِ قَالَ حَدَّثَنَا أَبُو أُسَامَةَ عَنْ بُرَيْدٍ عَنْ

قرآن میں منع کیا گیا ہے کہ خواہ مخواہ سوال نہ کرو، مگر بعض لوگ تعنت اور استہزاء سے سوال کرتے تھے، وہ بھی اس میں داخل ہے، اور
بعض محض لالابی پن سے، اس لئے ناگواری کا اظہار فرمایا گیا۔

فَلَمَّا أَكْثَرَ عَلَيْهِ غَضَبَ ثُمَّ قَالَ لِلنَّاسِ سَامُونِي عَمَّا شَعْنُمْ فَقَالَ رَجُلٌ مِّنْ أَبِي؟ قَالَ
 ؟ بہت پوچھا یہ بھی کی تو آپ کو غصہ آگیا ، آپ نے فرمایا : (اچھا یوں ہی سی) اب جو چاہو پوچھتے جاؤ ! ایک شخص (عبداللہ بن حذافہ)
 أَبُوکَ حُذَافَةُ فَقَامَ أَخْرَفُ فَقَالَ مِّنْ أَبِي يَا رَسُولَ اللَّهِ؟ قَالَ أَبُوکَ سَامِلٌ
 نے پوچھا کہ میرا آپ کون ہے ؟ فرمایا : تیرا آپ خزانہ ہے ، پھر دوسرا کھڑا ہوا (سعد بن سالم) کہنے لگا : یا رسول اللہ ! میرا آپ
 مَوْلَى شَيْبَةَ فَلَمَّا رَأَى عُمَرَ مَاتِي وَجْهَهُ قَالَ يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنَّا نَتُوبُ إِلَيْ
 کون ہے ؟ آپ نے فرمایا : تیرا آپ سالم ہے شیبہ کا غلام ، جب حضرت عمر نے آپ کے چہرہ مبارک کے غصہ کو دیکھا تو کہنے لگے
 اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ

ہم یا رسول اللہ اللہ عزوجل کی بارگاہ میں توبہ کرتے ہیں

بَابُ مَنْ بَرَّكَ عَلَى رُكْبَتَيْهِ عِنْدَ الْإِمَامِ أَوْ الْمُحَدِّثِ

امام یا محدث کے سامنے دو زانو (ادب سے) بیٹھنا ۔

۹۳۔ حَدَّثَنَا أَبُو الْيَمَانِ قَالَ أَنَا شُعَيْبٌ عَنِ الزُّهْرِيِّ قَالَ أَخْبَرَنِي

ہم سے ابو الیمان نے بیان کیا ، کہا ہم کو شعیب نے خبر دی ، انھوں نے زہری سے ، کہا مجھ کو انس
 أَنَسُ بْنُ مَالِكٍ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَرَجَ فَقَامَ عَبْدُ اللَّهِ بْنُ حُذَافَةَ
 ابن مالک نے خبر دی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم باہر برآمد ہوئے تو عبداللہ ابن حذافہ کھڑے ہوئے ۔

قَوْلُهُ سَلَوْنِي عَمَّا شَعْنُمْ ، جو چاہو پوچھو ! یہ غصے سے فرمایا ، کبھی انشراح یا خوشی سے یہ سددت پیش آتی تھی ، وہاں ناگواری
 نہ ہوتی تھی ۔

قَوْلُهُ فَقَالَ رَجُلٌ مِّنْ أَبِي؟ یہ ماسُ عبداللہ ابن حذافہ ہیں ۔

قَوْلُهُ أَبُوکَ حُذَافَةُ ، یعنی جس طرت منسوب تھے ، اس کی صحت کی صراحت فرمادی ۔

قَوْلُهُ فَقَامَ أَخْرَفُ ، دوسرے نے یہی سوال کیا ، روایت میں ہے کہ جب یہ دوسرا مائل گھر گیا تو اس نے کہا کہ تو مجھے رسوا
 کرنے کے لئے لے گیا تھا ، کیونکہ جاہلیت کے زمانہ میں خود ذنا کثرت سے تھا تو کہیں حضور کسی اور کا نام بتا دیتے تو کیا ہوتا ؟ میری رسوائی ہوتی یا
 نہیں ؟ جواب دیا کہ اگر حضور کسی اور کو بتلاتے تو میں تو اسی کو باپ کہتا ، خواہ کچھ ہوتا ۔ یہ سوال تعنت سے نہ تھا بلکہ تانہی کی بنا پر تھا اسکو
 عمر مجھ گئے اور عرض کیا : یا رسول اللہ ! ہم توبہ کرتے ہیں ۔

فَقَالَ مَنْ ابْنِي؟ قَالَ أَبُوكَ حَذَافَةُ ثُمَّ أَكْثَرَانُ يَقُولُ سَلُونِي فَبَرَكَ عُمَرُ عَلَى

اور پوچھنے لگے: میرا باپ کون ہے؟ آپ نے فرمایا: تیرا باپ حذا ہے، پھر بار بار فرمانے لگے: پوچھو! پوچھو! آخر حضرت عمرؓ
رُكِبَتْ لَهُ فَقَالَ رَضِينَا بِاللَّهِ رَبًّا وَبِالْإِسْلَامِ دِينًا وَبِمُحَمَّدٍ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
(یہ حال دیکھ کر) دوزانو بیٹھے اور کہنے لگے: ہم اللہ کے رب ہونے سے اور اسلام کے دین ہونے سے اور حضرت محمدؐ

نَبِيًّا، ثَلَاثًا، فَسَكَتَ

کے نبی ہونے سے خوش ہیں۔ تین بار یہ کہہ کر اس وقت آپ چپ ہو رہے

بَابُ ۷۲ مَنْ أَعَادَ الْحَدِيثَ ثَلَاثًا لِيَفْهَمَهُ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ

ایک بات کو خوب سمجھانے کو تین تین بار کہنا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے (ایک حدیث میں) فرمایا

وَسَلَّمَ الْآدَوُ قَوْلُ الزُّورِ، فَمَا زَالَ يَكْرِرُهَا، وَقَالَ ابْنُ عُمَرَ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ

سن لو اور جھوٹ بولنا اور کئی بار اس کو فرماتے رہے، اور ابن عمرؓ نے روایت کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین بار

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هَلْ بَلَغْتَ ثَلَاثًا

فرمایا: کیا میں نے تم کو (اللہ کا پیغام) پہنچا دیا؟

۹۴۔ حَدَّثَنَا عَبْدُ اللَّهِ قَالَ حَدَّثَنَا عَبْدُ الصَّمَدِ قَالَ سَأَلْنَا عَبْدَ اللَّهِ بْنَ

ہم سے عبدہ نے بیان کیا، کہا ہم سے عبد الصمدؓ نے بیان کیا، کہہ ہم سے عبد اللہ ابن

(۷۱) بَابُ مَنْ بَرَكَ عَلَى رُكْبَتَيْهِ رَحْ

یعنی ادب بتلاتے ہیں کہ شاگرد کی شان سے ہے کہ دوزانو بیٹھے۔

حدیث ۹۳، قَوْلُ رَضِينَا بِاللَّهِ رَبًّا رَحْ، بعض روایات میں ہے: وَبِالْقُرْآنِ أَمَامًا، ہم قرآن کو امام

بنانے سے خوش ہیں۔

(۷۲) بَابُ مَنْ أَعَادَ الْحَدِيثَ ثَلَاثًا رَحْ

نبی علیہ السلام کی عادت مبارکہ تھی کہ جب کوئی بات سمجھانی ہوتی اور آپ کا یقین ہو کہ ایک بار بات کہنے سے قلب میں راسخ نہیں

ہوئی تو آپ تین بار اس کا اعادہ فرماتے تاکہ خوب سمجھ میں آجائے، یہ تکرار ہمیشہ نہ ہوتی بلکہ بعض روایت ہوتی۔

قَوْلُ الْآدَوُ قَوْلُ الزُّورِ، سمجھ لو اور جھوٹ بولنا۔ جھوٹ کی مذمت میں اس کی اہمیت ظاہر کرنے کے لئے بار بار دہرایا۔ بعض

[illegible]

روایات میں ہے کہ آپ نے اتنی بار دہرایا کہ ہم کہنے لگے لیتہ سکتے۔ تو کبھی کبھی اہمیت ظاہر کرنے کے لئے اس قدر تکرار ہوتا تھا کہ مخاطب (تمنا کرنے لگتا کہ کاش آپ اتنی شفقت نہ اٹھاتے اور خاموش ہو جاتے)۔

حدیث ۹۴، قَوْلًا فَسَلَّمَ عَلَيْهِمْ ثَلَاثًا، یہ دوسرا مسئلہ ہے، فقہار نے لکھا ہے کہ ایک بار سلام کافی ہے، حضورؐ تین بار سلام دہاں کرتے جہاں کبھی کسی کے مکان پر تشریف لے جاتے اور سلام استیذان فرماتے جس کے الفاظ یہ ہوتے: السَّلَامُ عَلَيْكُمْ اَدْخُلُوا (اسلام علیکم کیا میں اندر جاؤں) اور داخل ہونے کے بعد پھر سلام کرتے، یہ سلام تجتہ ہوتا اور میرا سلام واپسی پر رخصت ہونے کا ہوتا، اسے سلام تودیع کہتے ہیں۔ اکثر نے یہی معنی تین سلام کے لئے دیں اور کسی نے یہ بھی کہا ہے کہ صرف استیذان کے لئے [تین بار سلام کرتے] یعنی اگر ایک بار میں جواب نہ ملتا تو دوبارہ سر بارہ سلام کرتے۔

باب ۳ تعلیم الرجل اُمّته واهله

اپنی لونڈی اور گھر والوں کو (دین کا علم) سکھانا۔

۹۶۔ حَدَّثَنَا مُحَمَّدٌ هُوَ ابْنُ سَلَامٍ قَالَ اَنَا الْمُحَارِبِيُّ نَاصِلِحُ بْنُ

ہم سے محمد ابن سلام نے بیان کیا، کہا ہم سے عبدالرحمان محارب نے کہا، ہم سے صالح بن حیان نے

حَيَّانَ قَالَ قَالَ عَامِرُ الشَّعْبِيِّ حَدَّثَنِي أَبُو بَرْدَةَ عَنْ أَبِيهِ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ

کہا، عامر شعبی نے کہا، مجھ سے ابو بردہ نے بیان کیا، انھوں نے اپنے باپ ابو موسیٰ اشعری سے، کہا آنحضرت

صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثَلَاثَةَ لَهْمٍ أَجْرَانِ رَجُلٌ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ أَمِنَ بِنَبِيِّهِ وَأَمِنَ

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تین آدمیوں کو دہرا ثواب ملے گا، ایک تو اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) میں سے وہ شخص

مُحَمَّدٌ وَالْعَبْدُ الْمَسْلُوكُ إِذَا آدَى حَقَّ اللَّهِ وَحَقَّ مَوَالِيهِ وَرَجُلٌ كَانَتْ عِنْدَهُ

جو اپنے پیغمبر پر ایمان لایا اور پھر محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لایا، دوسرے وہ غلام جو اللہ کا حق ادا کرے اور اپنے مالکوں کا بھی

أَمَةٌ يَطَاهَا فَأَدْبَاهَا فَحَسَنَ تَأْدِيهَا وَعَلِمَهَا فَحَسَنَ تَعْلِيمِهَا ثُمَّ اعْتَقَهَا فزَوْجَهَا

تیسرے وہ شخص جس کے پاس ایک لونڈی ہو وہ اس سے صحبت کرتا ہو پھر اس کو ایسی طرح ادب سکھائے اور اچھی طرح

فَلَهُ أَجْرَانِ ثُمَّ قَالَ عَامِرُ أَطَيْنَا كَمَا بَغَيْرِ شَيْءٍ قَدْ كَانَ يُرْكَبُ فِيهَا دُونُهَا إِلَى الْمَدِينَةِ

تعلیم کرے اور آزاد کرے اس سے نکاح کر لے تو اس کو دہرا ثواب ملے گا، عامر شعبی نے صالح سے کہا ہم نے یہ حدیث تم کو

مفت نادی، ایک زمانہ وہ تھا کہ لوگ اس سے کم حدیث کے لئے مدینہ تک سوار ہو کر جاتے

اس کے بعد بھی اگر اذن نہ ملتا تو واپس آجاتے، جب کہ ابو موسیٰ اشعری کا دائمہ حضرت عمرؓ کے ساتھ پیش آیا، میرے خیال میں یہ بھی مراد ہو سکتی ہے کہ اذن دخول [کے بعد] زیادہ سے زیادہ تین بار سلام ہو، شاہ صاحب فرماتے تھے کہ اگر تم علم کی حاجت کیرہ ہو تو اس میں تین بار، اول ابتداء میں، دوم وسط میں، سوم آخر میں سلام کرنا مناسب ہے۔

حدیث ۹۵، اس سے پہلے باب میں حدیث کو رفع صوت ثابت کرنے کے لئے لائے تھے اور یہاں باعتبار تکرار کے [یعنی اگلے باب میں رفع صوت کا جواز اور اس باب میں تکرار و اعادہ کا جواز ثابت کرنے کے لئے لائے ہیں]؛

(۳) بَابُ تَعْلِيمِ الرَّجُلِ أُمَّتَهُ وَاهْلَهُ

حدیث ۹۶۔ اس حدیث کا پہلا جزو اجماع ہے۔ شیعہ اپنی ہیں۔

(۱) جامع تقریر نے اذن دخول کے لئے لکھا ہوگا مگر صحیح نہیں معلوم ہوتا اس لئے کہ اذن دخول کے لئے تین بار کا ذکر تو سب کے کھلے ہیں ۱۲۔ (مرتب)

قَوْلًا ثَلَاثَةً لَهُمْ أَجْرَانِ [تین آدمیوں کو دو ہر اثواب ملے گا] ایک ان میں سے کتابی ہے، جو اپنے نبی پر ایمان لانے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لایا، قرآن کریم میں اس کا ذکر دو جگہ ہے :

(۱) سورہ قصص رکوع ۶ پارہ ۲۰ میں فرمایا : الَّذِينَ آمَنُوا هُمْ أَكْبَرُ مِنْ قَبْلِهِ هُمْ بِهِ يُؤْمِنُونَ . وَإِذْ أَنشَأَ عَلَيْهِمُ الْقُلُوبَ قَالُوا الْمَنَاجِبُ إِنَّهُ أَنْحَرُ مِنْ رَبِّنَا إِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهِ مُسْلِمِينَ . أُولَئِكَ يُؤْتَوْنَ أَجْرَهُمْ مَرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوا [یعنی] جن کو دی ہے ہم نے کتاب اس سے پہلے وہ اس پر یقین کرتے ہیں اور جب ان پر تلاوت کی جاتی ہے تو کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لائے، یہی ہر ٹھیک ہمارے رب کا بھیجا ہوا، ہم ہیں اس سے پہلے کے کلم بردار، وہ لوگ پائیں گے اپنا ثواب دہرا اس بات پر کہ وہ قائم رہے۔

(۲) سورہ صدہ، رکوع ۳، پارہ ۲۶ میں ارشاد باری ہے : وَرَهْبَانِيَّةٍ ابْتَغَتْ عَنْهَا مَالِكُنَّهَا عَلَيْهِمُ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَضْعِ اللَّهِ فَمَارِعُوهَا حَتَّى رَاعَيْنَاهَا فَإِنَّمَا الَّذِينَ آمَنُوا مِنْهُمْ أَجْرُهُمْ وَكَثُرٌ مِنْهُمْ فَاسْقُونَهُ . يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَآمِنُوا بِرَسُولِهِ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَحْمَتِهِ [یعنی] اور ایک ترک کرنا دنیا کا جو انھوں نے قیامت نکالی تھی، ہم نے نہیں لکھا تھا یہ ان پر لکھا گیا ہے کہ ان کی چاہے کو اللہ کی رضامندی، پھر دنیا بچا جیسا چاہے تھا نبی، پھر دنیا ہم نے ان میں جو ایسا انداز تھے ان کا بدلہ اور بہت ان میں انفران ہیں، اسے ایمان والا ڈرتے رہو اللہ سے اور یقین لاؤ اس کے رسول پر، دے گا تم کو دو حصے اپنی رحمت سے۔

دوسرا وہ عبد الملک ہے جو اپنے مولیٰ کا قیام ادا کرنے کے ساتھ اللہ کا بھی قیام ادا کرے، اس کو بھی دو ہرا جرے ملے گا۔ تیسرا وہ آدمی ہے جس نے اپنی باندی کو تمیز واد بنایا اور اسے علم بھی سکھایا، پھر آزاد کر کے خودی نکاح بھی کر لیا، اس کو بھی دو ہرا جرے ملے گا۔ پہلے دونوں میں دو دو چیزیں تھیں اور تیسرے میں کئی چیزیں ہیں : تعلیم، تادیب، اعتناق، تزوج۔ تو اسی قیام ایک سلسلہ ہے اور اعتناق کا مابعد ایک سلسلہ ہے اور وہ صرف تزوج ہے، یعنی اولاد پہلے سلسلہ کی ہر طرح تکمیل کی، اس کے بعد اس سے نکاح کر کے تمام حقوق زوجیت ادا کئے اور اس طرح دوسرے سلسلہ کی تکمیل کی وَ لَكُنْ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِمُ بِالْمَعْرُوفِ .

شعبی نے اَعْمَلْنَا لَهَا میں کس کو فنی طلب بنایا ہے ؟ روایت میں یہاں اختلاف ہے، مسلم میں ہے کہ ایک شخص خراسان کا آیا تھا اور اس نے سوال کیا تھا کہ اگر کوئی اپنی لونڈی کو آزاد کر کے نکاح کر لے تو اس کو لوگ کالوا کب بدانتہا کہتے ہیں [یعنی ایسا آدمی جو اپنے قربانی کے جاور پر سواری کرے۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ] ایک کام قربت کا کیا کہ تعلیم و تادیب کے بعد آزاد کر دیا لیکن اس کو پھر اپنے ہی

کام میں لے آیا کہ خود ہی نکاح کر لیا، تو جس طرح رکوب علی البذنة (قربانی کے اذیت پر سواری) بلا عذر برا کام ہے، ایسا ہی یہ نکاح ہر شے سے جواب میں کہا کہ ہرگز برا کام نہیں ہے، بلکہ اس میں دوہرا اجر ہے، اس کے بعد شعی کہتے ہیں، اَعْطَيْنَا كَهَا اخًا یعنی مفت میں گھر بیٹھے (م کو یہ حدیث کی دولت) دیدی ورنہ اس سے پہلے لوگ اس سے کم کے لئے مدینہ تک کا سفر کرتے تھے، مطلب یہ ہے کہ اس کی قدر کرنا اور یاد رکھنا۔ اس سے معلوم ہوا کہ کوئی عالی مضمون یا دقیق علمی کتبہ بنایا جائے اور اس پر کچھ احسان بھی جتلا دیا جائے تو یہ کبر نہیں ہے اور یہ جائز ہے بشرطیکہ نیت صالح ہو۔ اتنا اور سمجھتے چلو کہ یہ دو اجر کس بات کے ہیں؟ کیا یہ دونوں میں سے ہر ایک کا ایک اجر ہے یا ہر عمل پر دوہرا اجر ملے گا؟ مثلاً ایک غلام جو مولیٰ کی خدمت کرتا ہے تو اس پر ایک اجر اور اللہ کے حقوق کی رعایت کرتا ہے تو اس پر دوسرا اجر، یعنی اس طرح دو اجر ہیں یا یہ کہ جتنے کام کرے گا اب دوہرا ملے گا: مولیٰ کی خدمت کا بھی دوہرا اور اللہ کے حقوق کی رعایت کا بھی دوہرا؟ ہر برکت ان حسنات و ایمان کے۔ اسی طرح کئی کئی کے حق سمجھو!۔ تو دونوں قول ہیں، مگر اکثر یہ کہتے ہیں کہ چونکہ دو جزو ہر ایک میں ہیں اس لئے ہر جزو پر ایک اجر ملے گا [لیکن اس پر] اشکال ہوا کہ پھر اس میں کتنا ہی وغیرہ کی خصوصیت رہی، جو آدمی نیکی کے دو کام کرے گا اس کو دو اجر ملیں گے [مثلاً] حج کرنے والا نہ پڑھے گا تو اس کو دوہرا اجر ملے گا، ایک نماز کا، دوسرا حج کا، تو پھر حدیث پاک میں ثلثۃ ہی کیوں فرمایا؟ آخر انھیں تین کی کیا تخصیص ہوئی؟۔ شارحین نے کہا وجہ تخصیص یہ [ہے کہ تقاضائے حال ہی ہوگا] اور وہ فعل تین کے ذکر کا جو پاکو لفظ اللہ داعیہ ہوگا، اس کا حاصل یہ ہوا کہ تین ہی میں انحصار نہیں ہے، اور یہی صحیح ہے۔

قرآن میں ازواج مطہرات کے سلسلہ میں فرمایا: وَمَنْ يَفْعَلْ جَنَاحًا لِلَّهِ وَرَسُولِهِ دَفَعْنَا كِتَابًا أَجْرَهَا مَرْتَيْنًا۔ تم میں جو نبی بھی اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کریں گی اور نیک عمل کریں گی ہم ان کو ان کا اجر دو، عطا فرمائیں گے۔

اور بھی اس کی نظائر ہیں، حافظ ابن حجر مقلانی صاحب فتح الباری نے میں سے زیادہ نظائر پیش کئے ہیں

اب وہ چیز سمجھو جس میں شراعت پریشان ہوئے ہیں اور اپنی اپنی سمجھ کے مطابق [اشکال کا] حل نکالنا ہے، اشکال یہ ہے کہ اہل کتاب سے کیا مراد ہے؟ آیا اہل کتاب سے یہود اور نصاریٰ دونوں مراد ہیں اور کتاب سے تورات و انجیل دونوں؟ یا اہل کتاب سے کوئی ایک [یہودی یا نصرانی] اور کتاب سے بھی کوئی ایک [توریت یا انجیل] مراد ہے؟ بعضوں نے کہا، دونوں مراد نہیں ہو سکتے، وجہ اس کی یہ ہے کہ یہود نے عیسیٰ علیہ السلام کا انکار کیا اور ان کو دجال کہا، معاذ اللہ، کتب سابقہ میں مسیح و دجال سے قید لایا ہے اور مسیح عیسیٰ کی خوشخبری دینی ہے

ان یہود نے اس کے بالکل برعکس کر دیا کہ عیسیٰ علیہ السلام کو مسیح و قبال قرار دیا اور دجال کو مسیح بشریہ، اور جب دجال نکلے گا تو وہ اس کے ساتھ ہوگا ایسی صورت میں انکار عیسیٰ علیہ السلام کی وجہ سے شرعاً ان کا ایمان معتبر نہیں بلکہ وہ عند اللہ حبط ہو چکا، پس جب وہ ایمان معتبر نہ رہا تو ایک ہی ایمان باقی رہا اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا ہے، اور یہاں دو چیزیں ہوتی ضروری تھیں۔ اس لئے یہود مراد نہیں ہو سکتے اسی بنا پر جنہوں نے عاجزاً کر کہہ دیا کہ ان کتاب میں صرف نصاریٰ مراد ہیں اور کتب سے مراد صرف انجیل ہے۔ ایسا کہنے سے وہ شبہ تو جاتا رہا لیکن اب اس سے ٹھہر کر ایک اشکال سامنے آگیا اور وہ یہ کہ اس حدیث کا ماخذ قرآن کریم کی آیت **أُولَٰئِكَ يَوْمَئِذٍ أَجْرُهُمْ مَّا يَكُونُ لَهُمْ** ہے، اور ان آیات کے بارے میں تمام اکابر مفسرین نے مثلاً طبری، طبرانی اور ابن کثیر جو خود محدث بھی ہیں، روایات کو پرکھ کر کہا کہ عبد اللہ ابن سلام اور ان کے رفقاء کے حق میں نازل ہوئیں جو یہودی اور احبار میں سے تھے۔

اب اگر تم حدیث کو نصاریٰ کے ساتھ خاص بھی کر لو آیت میں کیا کر دو گے؟ وہاں تو اولاً یہودی مراد ہیں، نصاریٰ اگر مراد ہوں تو ثانیاً مراد ہوں گے، یہ سوال حافظ وغیرہ نے اٹھایا ہے اور اس کا جواب بھی دیا ہے مگر ٹھیک ٹھیک نہیں سمجھا کیونکہ حافظ کا کلام کچھ مضبوط اور متفق نہیں ہے اس لئے اس سے تشفی نہیں ہوئی، علاوہ بریں نصاریٰ کو مراد لینے پر ایک اشکال اور بھی وارد ہوتا ہے وہ یہ کہ ہم مان لیتے ہیں کہ نصاریٰ مراد ہیں مگر ہم پوچھتے ہیں کہ جو نصاریٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تھے ان میں سے کیا چند لوگ بھی ایسے تھے جو (اسلام سے پہلے) صحیح نصاریت پر قائم رہے ہوں؟ جمہور نصاریٰ تو انیت مسیح کے عقیدے پر تھے اور یہ کفر صریح ہے تو کیا انیت مسیح کے معتقد کو مومن باسح کہہ سکتے ہیں؟ اگر نہیں کہہ سکتے تو پھر نصاریٰ کا بھی دو نبیوں پر ایمان کہاں متحقق ہوا، ایک ہی ایمان تو رہا، پھر دو اہل کس بات پر نہیں گئے؟ (اس صورت میں) جس طرح یہود منکر عیسیٰ ہو کر حدیث کے تحت نہیں آئے، اسی طرح نصاریٰ انیت مسیح کے عقیدے کی وجہ سے حدیث کے تحت نہیں آتے، کلا کھلا سموعا، ان کو دو اجر ملنا تو درکنار ان کو تو معذب ہونا چاہئے، انوس اس پر کسی نے توجہ نہیں کی، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ یہود کے زمانے سے نصاریٰ کا نہ ماننا کچھ کم نہیں۔

یہ سب اشکال کی تقریر، اب میں پہلے حافظ کا کلام جو کچھ سمجھ سکے ہوں اسے نقل کرتا ہوں، بعد کو وہ تقریر کروں گا جو اس سلسلہ کی بہتر تقریر ہوگی۔ [لیکن پہلے چند باتیں بھلو]

پہلی چیز یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام سب کے سب با مشاعر ابراہیم علیہ السلام (دنی و دایہ نوح علیہ السلام بھی) اپنی اپنی

قوم کی طرف مبعوث ہوئے، ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں لوگ کہتے ہیں کہ ان کی بعثت عام تھی، یہ مخصوص تو کہیں نہیں، لیکن عملدار کہتے ہیں، واللہ اعلم — (ایسی ہی ایک) روایت نوح علیہ السلام کے بارے میں بھی ہے واللہ اعلم — باقی انبیاء علیہم السلام کی دعوت عام نہ تھی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت عام تھی تمام اہل عالم کے لئے — ایک بات تو یہ ہوئی۔

دوسری بات یہ یاد رکھنے کی ہے کہ جس قوم میں جو نبی آیا ہو اس قوم کے ذمہ اس نبی پر ایمان لانا واجب ہے اور اس کی شریعت میں داخل ہونا ضروری ہے، لیکن اور دوسری قومیں جن کی طرف بعثت نہیں ہوئی اگر انھیں دعوت پہنچ جائے تو بعد جو دعوت نبی کی تصدیق کرنا اور اس کی شریعت کو قبول کرنا لازم ہے یا نہیں؟ اس میں بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن وہ کلام بہت منتشر ہے۔ شاہ صاحب نے اس کو بہت اچھی طرح منضبط کیا ہے اور فرمایا ہے کہ تقی الدین نے لکھا ہے کہ توحید کی دعوت عام ہے اور رب کو اس کا قبول کرنا لازم ہے اور جو قبول نہ کرے گا وہ بالک ہوگا، لیکن دعوت شریعت کا قبول کرنا لازم نہیں، اگر کوئی کسی دوسری شریعت سمادی کے تحت ہو تو اس پر لازم نہیں کہ اس دعوت شریعت کو قبول کرے، خلاصہ یہ کہ مبعوث علیہم کو توبہ باتیں تسلیم کرنی ہوں گی اور مدعوین کو صرف نبی کی تصدیق کرنا اور توحید کا ماننا لازم ہوگا، دخول فی ذہبہ الشریعہ لازم نہ ہوگا بشرطیکہ کوئی شریعت حقہ رکھتے ہوں، اور اگر کوئی شریعت نہ رکھتے ہوں تو اس شریعت کا ماننا بھی توحید کے ساتھ لازم ہوگا۔ یہیں سے یہ بات بھی واضح ہو جائے گی کہ عیسیٰ علیہ السلام صرف نبی، اسرائیل کی طرف مبعوث ہوئے تھے جیسا کہ قرآن نے فرمایا: **وَرَسُولًا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَٰئِيلَ** — دوسری جگہ فرمایا: **يَا بَنِي إِسْرَٰئِيلَ إِنِّي رَاسُوكُم مِّنْ اللَّهِ** — پس بن بنی اسرائیل پر تو لازم تھا کہ کل احکام اور تمام شریعت کو جو عیسیٰ علیہ السلام لائے تھے قبول کریں، مگر دیگر ممالک یا قوم مثلاً ہندوستان یا یورپ والوں کو دعوت نہیں پہنچنی تو کوئی سوال ہی نہیں اور اگر دعوت پہنچنی تو توحید کا قبول کرنا لازم، لیکن شریعت کا قبول کرنا لازم نہیں، جیسے ہم ہیں کہ تصدیق کرتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام کی گمان کی شریعت کا اسرائیل نہیں کرتے معلوم ایسا ہوتا ہے کہ مسیح علیہ السلام نے اطراف عالم میں اپنے حواریوں کو بھیجا تھا، چین، اٹلی، قسطنطنیہ بھی اپنے حواری بھیجتے تھے اور انگریزوں نے تحقیق کی ہے کہ مدراس میں بھی دعواری عیسیٰ علیہ السلام کے پہنچے تھے۔

ایک حدیث میں ہے کہ معصوم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ملوک کو خطوط لکھے تو یہ بھی تحریر فرمایا تھا کہ میں انھیں اسی طرح بھیجتا ہوں جس طرح مسیح علیہ السلام نے اپنے حواری بھیجتے تھے، تو بنی اسرائیل پر مسیح علیہ السلام کی تمام جزئی دیکھی کا تسلیم کرنا لازم تھا اور مدعوین پر صرف

توحید کا اقرار اور پیغمبر کا اقرار ضروری تھا بشرطیکہ [پہلے کسی] شریعت حق پر ہوں، ورنہ ان پر بھی بنی اسرائیل کی ہی طرح سب کا قبول کرنا لازم ہوگا۔

شاہ صاحب نے اسی طرح [مسلک و متفقہ] مرتب کیا ہے اگرچہ بعض اور علمائے اہل سنت نے اسے تسلیم نہیں کیا ہے۔

اب آگے چلیے! اصل قصہ حضرت عبداللہ ابن سلام وغیرہ کا ہے، یہ عبداللہ ابن سلام سیدنا یوسف علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں، ان کے اجداد کسی زمانہ میں شام میں رہتے تھے، جب بخت نصر نے حکماً اور بہتوں کو پکڑ کر لے گیا تو ان کے اجداد شام سے بھاگ کر مدینہ طیبہ پہنچے اور انھیں یہاں رہتے صدیاں گزریں تو اب یثیل بنی اسرائیل کے نہ رہے، تھے تو وہ نسل اسرائیل ہی سے مکرور زمانہ اور بعد وطن کے باعث وہ ان سے کٹ گئے تھے اور وہ ان لوگوں کے شل ہو گئے تھے جن کی طرف عیسیٰ علیہ السلام مبعوث نہیں ہوئے تھے یہ بالکل اجنبی سے ہو گئے تھے، لہذا مبعوث علیہم میں داخل نہ رہے، اب ہم کہتے ہیں کہ مکہ ہے عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے سواری مدینہ طیبہ بھیجے ہوں اور انھوں نے تصدیق کی ہو، کیونکہ وہ فاروق و فاروق میں کھائے کہ مدینہ منورہ میں ایک چھریا گیا تھا جس میں کھاتھا، اَنَّا رَسُوْلُ رَسُوْلِ اللّٰهِ عِیْسٰی۔ طبری نے بھی اسے لیا ہے مگر اس میں ہے: اَنَّا رَسُوْلُ اللّٰهِ، ایک رسول حذف ہو گیا ہے، اور وہ فاروق و فاروق پورا کرنا قادیانی اسی کو لے اڑا کہ دیکھو اس سے معلوم ہو کہ مسیح مرچے، تو انا ثابت ہے مگر دخول فی المدینہ ثابت نہیں، اور جب وقت پہنچ چکی تو بہت محنت سے انھوں نے تصدیق بھی کی ہو، مگر چونکہ وہ شریعت حق موسویہ پر قائم تھے اس لئے ان پر قبول شریعت موسویہ لازم نہیں رہی، کیونکہ وہ اب شل اجنبی کے ہو گئے، اب صرف تصدیق مسیح و اقرار توحید ان کے ذمہ ہے، اس لئے وہ رہے تو یہودی ہی، مگر تصدیق کی عیسیٰ علیہ السلام کی، تو اب ان کا ایمان موسیٰ علیہ السلام پر معتبر و معتبرہ و مقبول ہے، بشرطیکہ شریعت نہ کی ہو، ان کے احوال سے معلوم ہوتا ہے کہ مسیح علیہ السلام کی ضرورت تصدیق کی ہوگی کیونکہ انھوں نے صرف حضور کے چہرہ کو دیکھ کر کہا تھا: هٰذَا الرَّجُلُ الَّذِي يَدْعُو كُذَّابٍ، یہ چہرہ جھوٹے کا چہرہ ہرگز نہیں۔ تو ایسے شخص کے حق میں ہمارا احسن ظن یہی ہے کہ ضرورت تصدیق کی ہوگی اور کہیں انکار ثابت نہیں۔ ایک روایت آئی ہے لیکن وہ ثابت نہیں۔

حاصل یہ کہ آریہ کا مصداق عبداللہ ابن سلام ہیں کیونکہ ان کا ایمان موسیٰ علیہ السلام پر معتبر ہے، مگر پھر بھی یہ اشکال باقی ہے اس لئے کہ اگرچہ ایک ابن سلام مومن تھے مگر عام یہود تو اس میں نہیں آسکتے۔ اسی طرح نصاریٰ اہل دین پر قائم نہیں رہے تھے، سب نے تحریف پر چلنا شروع کر دیا تھا۔ ایسے ہی یہود حرق دین پر چلتے تھے، کہتے تھے: اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَرَحْمٰنٌ اَعْيٰیۡۡ (اللہ فقیر ہے

اور ہم غنی ہیں) نیز کہا: **يَا اَللّٰهُ مَغْفِرًا لِّكَ** (اللہ کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں) پھر ایسے کتابوں کو دہرا کر جس چیز کا لے گا؟
 طبعی نے کہا: ان کا ایمان اگرچہ نافع اور معتبر نہیں لیکن حضور پر ایمان کی برکت سے اللہ نے انھیں یہ اجر دے دیا، جیسے ستم کے وہ
 پیچھے کام جو حالت کفر میں کئے تھے وہ محبوب ہو جاتے ہیں، اسی طرح یہ اسلام کو نافع تھا مگر برکت نبی اتی صلی اللہ علیہ وسلم وہ بھی معتبر ہو گیا اور
 راز اس کا یہ ہے کہ جو حضور پر ایمان لاتا ہے وہ موسیٰ و ہارون علیہما السلام پر بھی صحیح ایمان لاتا ہے، اس لئے اب اس کے ایمان سابق کی بھی
 تصحیح ہو گئی۔

نکمر سچی بات یہ ہے کہ ان سب تقریروں میں تکلفات بہت ہیں اور ہمیں اس سے تشفی نہیں ہوتی۔ اب میں وہ تقریر کرتا ہوں
 جس کا وعدہ کیا تھا: — میرے نزدیک نہ ضرورت تخصیص کی ہے اور نہ کسی کو نکلانے کی، نہ یہ ثابت کرنے کی ضرورت ہے کہ ان کا ایمان
 معتبر تھا، بلکہ اس کو یوں ہی ظاہر کر رکھو، مگر اشکال کا حل سننے سے پہلے ایک مقدمہ سمجھ لو، وہ یہ کہ کسی مامور کے ساتھ قوی موانع و دعوائے
 لگے ہوئے ہوں جو اس کی ادائیگی کی راہ میں حائل ہوں اور ایک صاحب ہمت آدمی ان موانع کی پروا کے بغیر اپنے عزم پر جا رہا ہے، اور
 مامور کو پوری طرح بچالائے تو ظاہر ہے کہ ایسا آدمی بہت زیادہ ستائش کا مستحق ہے [اور اس مامور پر عمل کرنا نہایت اہم بات ہے]
 اور اگر معاملہ اجر کا آجائے تو یقیناً [ایسا آدمی] اجر عظیم کا مستحق ہوگا، مثلاً ایک فارغ آدمی نماز پڑھتا ہے تو وہ حق واجب اس طرح ادا کرتا ہے
 کہ اسے ادائیگی کے مواقع حاصل ہیں، ایسی صورت میں یہ بڑا کمال نہیں ہے، لیکن اس کے مقابل میں ایک وہ ہے کہ تمام دنیا کی فکر اس کو
 لاحق ہیں اور وہ خون پسینہ ایک کر کے روزی کاتا ہے اور جب نماز کا وقت آتا ہے تو یہ تمام موانع کے ہوتے ہوئے حکم بجالانے کو مستعد ہوتا ہے
 اور نماز کی پوری پابندی کرتا ہے، تو یہ بلاشبہ اس پہلے فارغ آدمی کے مقابلہ میں زیادہ تعریف کا مستحق ہے، اب اگر ان دونوں کے اجر میں
 ناک حقیقی فرق کرے اور اس دوسرے کو زیادہ [اجر] مرحمت فرمائے تو کسی طرح خلاف عقل نہیں، بلکہ عین متفقائے عقل ہے۔

یاشا ایک امیر و خوش حال کا روزہ ہے اور [ایک] غریب یعنی گناہ کا کہ امیر کے لئے کوئی رکاوٹ نہیں، اس لئے کہ وہ
 خوش حال ہے مطمئن ہے، شقت نہیں کرنی پڑتی، برضات اس یعنی گناہ کے، کہ اس کے لئے بہت سے موانع ہیں، پس اگر وہ ان موانع پر
 غالب آتا ہے اور پوری عفت کے ساتھ مظاہرہ عیدت کر کے روزہ رکھتا ہے تو بیشک یہ زیادہ اجر کا مستحق ہوگا، نظیر اس کی وہ حدیث ہے
 جس میں اس تلاوت قرآن کرنے والے کا ذکر ہے جو تھلا تا ہے [یا جو رک رک کر پڑھتا ہے] اور پڑھنے میں [اس کو] بہت شقت ہوتی ہے

مگر وہ ہے کہ لگا ہوا ہے، خوب محنت سے بنا کر پڑھنے کی کوشش کرتا ہے (یقراً و یتقاع) تو اس کے لئے دہراجر ہے، فرمایا: فلذا احزان ایک ظاہر میں کو اس کے عمل میں اور صاف صاف بلا تعب و مشقت پڑھنے والے کے عمل میں کوئی فرق محسوس نہ ہوتا ہو مگر حقیقت یہ ہے کہ اس معذور متلمانے والے اور مشقت کے ساتھ پڑھنے میں اور اس صاف زبان والے کے پڑھنے میں فرق ہے، سب مانتے ہیں کہ چونکہ اسے شقت زیادہ ہوتی ہے اور یہ محنت کر کے اس پر غالب آتا ہے تو اس کو یقیناً دہراجر ملنا ہی چاہئے، کوئی بھی عقل والا یہ نہیں کہہ سکتا کہ دونوں برابر ہیں اس مقدس کے بعد کھجور کہ حدیث میں تین چیزیں بتلائی ہیں۔ اول الْعَبْدُ الْمَمْلُوكُ اِذَا اَدَّى اَحَقَّ اللّٰهِ وَحَقَّ

مَوْلَانِیْہ۔ ایک غلام کو ایک طرف یہ فکر لاحق ہے کہ اپنے آقا کا کم بجالائے اور دوسری طرف یہ بھی فکر ہے کہ اپنے امی مالک کا کم بجالائے اور وہ ان دونوں کو نباہتا ہے اور مشقت برداشت کرتا ہے، ظاہر ہے اس میں تب زیادہ ہے اور اس کی محنت و مشقت اس آزاد شخص سے کہیں زیادہ ہے جو ہر طرح راحت میں ہے، اس کو صرف ایک ہی حق ادا کرنا ہے اور وہ اللہ کا حق ہے، مگر عبد ملک کو ڈبل حق ادا کرنا اس لئے وہ زیادہ اجر کا مستحق ہے، یہاں دو چیزیں ہیں، ایک حق مولیٰ اور ایک حق اللہ، تو یہاں مانع موجود ہے، مگر اس نے ہمت کی اور دونوں کے حقوق ادا کئے تو اسے دو گنا ملنا ہی چاہئے، اب یہ بات صاف ہو گئی کہ جو حق موانع اور مفرحتوں کے باوجود ادا کیا جائے اور مانع کا مقابلہ کیا جائے، بس اس میں دہراجر ہے، لہذا اس لفظ کو خالص کر داور نہ بالکل عام کر دو، بلکہ یوں کہو کہ جہاں موانع ہوں پھر بھی وہ اسے ادا کرے اور کوئی نہ ہونے دے وہاں دہراجر ہے۔

دوسرا جزو حدیث کا یہ ہے: وَرَجُلٌ کَانَ تَعَبًا اَمَةً اَخًا بَانِی زِر دمت ہے، مجبور ہے مگر اس نے

[اس کے ساتھ] احسان کیا اور تعلیم و تربیت سے اس کو آراستہ کیا، ہند بنایا اور پھر بجائے اس کے کہ مقید رکھتا آزاد کر دیا، آزاد ہو کر تاجر وہ اجر حاصل کرنے کے لئے کرتا ہے۔ آزاد کرنے کے بعد یہ چیز عار کھی جاتی تھی کہ آزاد کر کے خودی نکاح کرے، کیونکہ بظاہر پھر قید میں لا رہا ہے اور اس میں حظ نفس بھی ہے، یہ کام تو کیا تھا ثواب و عبادت کے لئے، پھر حظ نفس حاصل کر رہا ہے، اسی خیال کی بنا پر خزانہ نے [شبی سے وہ بات کہی تھی] اور عبد اللہ ابن مسعود سے باسناد صحیح ثابت ہے کہ انھوں نے اس کو کالواکب بدنہ کہا ہے، نیز انس ابن مالک اور کئی صحابہ سے بھی یہ منقول ہے اور وہ لوگ اسے برا سمجھتے تھے، شاید انھیں یہ حدیث نہیں پہنچی تھی، وہ لوگ کہتے تھے کہ حدیث میں ہے الْعَائِدُ فِیْ هَيْئَتِهِ کَالْعَائِدِ فِیْ قَبْرِہِ (بہر کر کے لوٹانے والا ایسا ہے جیسے کوئی قبر کے لئے کہے چلے) تو یہ ان کی نگاہ میں معیوب نفس تھا کہ آزاد کر کے کوئی نکاح کر لے، یہ ایک بڑا مانع تھا کہ سواٹی میں بری نظرت دیکھا جائے گا، مگر اس نے کچھ پرواہ نہیں کی، برادری اور قوم کی لعنت زنی سے بے نیاز ہو کر اس پر مزید احسان کیا کہ موانع کے باوجود اس سے نکاح کر لیا، ایک پہلا احسان تو یہ کیا کہ

پڑھایا لکھایا، پھر آزاد کیا، اور دوسرا احسان کیا کہ شرف زوجیت بخشا، تو یہ احسان بالائے احسان ہے، یہ بات نہیں ہے کہ اس کو مقید کر دیا وہ تو اب برابر کی ہو گئی: وَلَكِنْ يَسْئَلُ الَّذِي عَلَيْهِنَ بِالْمَعْرُوفِ (اور عورتوں کا بھی حق ہے (مردوں پر) جیسا کہ مردوں کا ان پر حق ہے دستور کے موافق) تو اب دو گن اجر یوں ملے گا کہ ایسا کرنے میں لوگ اس کو برا کہیں گے، یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی کسی بدعت کو چھوڑے اور اہل بدعت اس پر طاعت کریں مگر وہ اتنی طاعت کی پردہاہ کئے بغیر اس بدعت کو چھوڑے ہی رکھے اور لَا يَجْزِيَنَّ فَرْقَةٌ لَّكُمْ وَلَا يَحْزَنُ مَصْذِقٌ بِنِجَانٍ، تو کیا وہ مزید ثواب کا مستحق نہ ہوگا۔

یہ مقدمہ ذہن میں رکھ کر اب اصل مسئلہ سنئے: میں کہتا ہوں کہ جو موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لایا وہ اسے حق سمجھتا ہے اور حق سمجھ کر ایمان لایا، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو آپ نے بھی موسیٰ اور ان کی شریعت کی تصدیق کی، قرآن نے کہا: إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ الْتُورَةَ فِيهَا هُدًى وَنُورٌ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّونَ الَّذِينَ أَسْلَمُوا لِلَّذِينَ هَادُوا وَالرَّاسُخُونَ فِي الْأَخْبَارِ رَبِّسَ اسْتَخْفِظُوا مِنْ كِتَابِ اللَّهِ وَكَافُوا عَلَيْهِمْ شَهِدَاءُ ۖ فَلَا تَخْشَوْنَ النَّاسَ وَاخْشَوْنِي وَلَا تَتَّبِعُوا أَهْوَاءَ بَنِي إِسْرَءِيلَ وَمَنْ لَمْ يَحْكَمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ (۳) ہم نے توراہ اماری جس میں ہدایت اور روشنی ہے، اس پر حکم کرتے تھے غیر جو حکم پر دار تھے اللہ کے اور حکم کرتے تھے درویش اور عالم، اس واسطے کہ وہ نگہبان ٹھہرائے گئے تھے اللہ کی کتاب پر اور وہ اس کی خبر گیری پر مقرر تھے، سو تم نہ ڈرو لوگوں سے اور مجھ سے ڈرو اور تم خرید و میری آیتوں پر مول ٹھوڑا، اور جو کوئی حکم نہ کرے اس کے موافق جو کہ اللہ نے امارا سودی لوگ کافر ہیں)

جب توراہ کی جو موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی ہر طرح تصدیق و تائید ہو گئی تو جو اس پر ایمان لایا اس کی تصدیق و تائید بھی قرآن سے ہو گئی، پھر اس کے لئے یہ ماننا کتنا مشکل ہے کہ جب تک نبی آخر الزمان پر ایمان نہ لائے گا اس وقت تک اس کی نجات نہ ہوگی، بلکہ وہ مُلحد فی النار ہوگا، اس سے یہ کہا جائے تو ان الفاظ کو کس کس پر کتنا شاق گزرے گا اور سوچے گا کہ اس کی شریعت اور اس کا بنی نجات دلائے کے لئے کافی نہیں ہے؟ انسانی فطرت کا تقاضا یہی ہے کہ وہ اسے اپنی اور اپنے نبی کی اہانت سمجھے گا کہ اس کا بنی اور اس کی شریعت نجات دلانے کے لئے کافی نہ ہو، اس لئے جو موسیٰ علیہ السلام یا عیسیٰ علیہ السلام کو مانتا ہے مع قطع النظر عن صحیحہ اور خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام اور تورات و انجیل کی تصدیق فرما رہے ہیں، تو اب اس پر کیا گزرے گی جب اس سے کہا جائے کہ یہ سب کچھ سہی

مگر تجھ بات نہ لے گی جب تک کہ تو ان بنی آخر الزماں پر ایمان نہ لائے، یہ بات یقیناً اس پر بہت شاق گذرے گی، مگر اس نے ہمت سے کام لیکر طبیعت کے تقاضے کے خلاف حضور کو مان لیا اور ان پر ایمان لایا، اس لئے کہ وہ بشارت سن چکا تھا، پھر اس نے کسی کی ملامت کی پروا نہیں کی اور بچے دل سے حضور پر ایمان لایا تو اسے دہراجر ملے گا دو کاموں پر نہیں صرف ایک ہی کام پر دہراجر ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر یہود و نصاریٰ کے یہاں تحریف نہ ہوئی ہو [اور غیر محض شریعت پر ہی ان کا ایمان ہو] تب بھی ان کا ایمان کافی نہیں، تاؤتیکہ حضور پر ایمان نہ ہو، تو چونکہ ایک امر مطلوب کے ساتھ ایک ماننے والی قوی موجود ہے جو روک رہا ہے اور ہمارا ہے اور وہ شخص سب پر غالب آکر امر مطلوب کی ادائیگری کرتا ہے تو ضرور دوسرے اجر کا مستحق ہے۔

اور یہ فطری چیز ہے کہ آدمی اپنے بنی اور یہ کہ سب سے اعلیٰ دار فہم تھا ہے، چنانچہ میں اپنی دلی بات کہتا ہوں کہ میں نے شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے میت کی تواب کوئی کتنا ہی بڑا کیوں نہ آجائے ہرگز اس کی طرف توجہ نہیں ہو سکتی خصوصاً جب کہ وہ شیخ الہند کی بہت سی تعریفیں بھی کر دے، تو ایسے ہی یہاں یہ فطری بات تھی [کہ کوئی دینی پُر ایمان لانے کے بعد دوسرے بنی پر ایمان لانا شاق ہوا] مگر اس مومن نے مستقل مزاجی اختیار کر لی اور وسوسہ کی پروا نہ کی، تو اسے دہراجر ہے۔

قرآن پاک کے الفاظ ہیں: **يُؤْتُونَ أَجْرَهُمْ مَّتَّكِئِينَ تَحَاصِرُونَ**، یعنی جھے رہے، نفس کو روکے رکھا، بوم وطن کی پروا نہ کی، وسوسہ شیطانیہ پر غالب رہے اس لئے دواجر ہیں۔

تو اب یہ کہنا درست نہیں کہ ایک اجر اپنے بنی پر ایمان لانے کا اور دوسرا ایمان بالبنی الای کا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ایمان بالبنی الای ہی پر دواجر ہیں کہ باوجود موانع کے موانع پر غالب آکر حضور پر ایمان لے آیا، اس میں کسی کی تفسیص نہیں، نہ یہود کی، نہ نصاریٰ کی، نہ قوداؤ کی نہ نیکل کی۔

اب یہاں پر تھوڑا سا کلام شیخ اکبر کا جوایت سے متعلق ہے پیش کرتا ہوں ۷

تبع زہر گوشت یا نستم ۵ نہر خرمن خوش یا نستم

شیخ اکبر کہتے ہیں کہ جو کسی پیغمبر پر ایمان لایا ہے اس پر لازم ہے کہ حضور پر بھی ایمان اچھا لائے کیونکہ موسیٰ علیہ السلام نے بھی بشارت دی ہے اور موسیٰ علیہ السلام اور تمام انبیاء نے بھی، تو اچھا حضور پر ایمان لازم ہے، خوشی موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لایا وہ اس بات پر بھی ایمان لائے گا کہ **مُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِيهِمْ مِنْ بَعْدِي أُمَمٌ أَكْثَرُ ط** (میں اپنے بعد ایک رسول کی بشارت دیں والا ہوں

جن کا نام احمد ہے، صلی اللہ علیہ وسلم) تو جو کسی ایک نبی پر ایمان رکھتا ہے اس کے دو ایمان ہیں، ایک تفصیلی جو اس کا اپنے پیغمبر پر ہے، اور ایک اجالی وہ جو منطوی ہے تفصیلی میں، قرآن میں ہے: **وَإِذَا أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَا آتَيْتُكُمْ مِنْ كِتَابٍ وَحِكْمَةٍ ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مُصَدِّقٌ لِمَا مَعَكُمْ لَقُوا مَنْ يَنْهَاهُ وَنَسَوْنَهُ** ط قَالَ **أَقْرَرْتُمْ وَأَخَذْتُمْ عَلَىٰ ذَٰلِكُمْ أَصْرِي** ط قَالُوا **أَقْرَرْنَا** (۱) اور یاد کرو جب ہم نے نبیوں سے عہد کیا کہ جب میں تم کو کتاب و حکمت دوں پھر تمہارے پاس رسول امی آئے جو تمہارے پاس والی کتاب کی تصدیق کر رہا ہو تو تم اس پر ضرور ضرور ایمان لانا اور ضرور ضرور ان کی مدد کرنا، کیا تم نے اقرار کر لیا اور تم نے میرا عہد قبول کر لیا انہوں نے کہا ہم نے اقرار کر لیا

آگے و عید ہے، **فَمَنْ تَوَلَّىٰ بَعْدَ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ** (۲) (جو کوئی بھی اس کے بعد روگردانی کرے گا تو وہی فاسق ہوگا) — تو جس کے حق میں سارے نبیوں سے اور امتوں سے اقرار کیا گیا ہے اس اقرار پر تو سب کا ایمان ضرور ہی ہوگا، لہذا اجمالاً نبی امی پر ایمان ضروری ہوا، اب جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو آپ نے سارے انبیاء علیہم السلام کی تصدیق کی: **أَمَّا الرَّسُولُ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مِنْ رَبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ كُلٌّ آمَنَ بِاللَّهِ وَمَلَيْكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ**، **لَا نَفْرَقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْ رُسُلِهِ** رسول اس پر ایمان لائے جو ان پر ان کے رب کی طرف سے نازل کیا گیا اور ایمان والے بھی ایمان لائے، کب سب ایمان لائے اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر، ہم رسولوں میں سے کسی ایک کی بھی تفریق نہیں کرتے تو حضور پر جو ایمان لایا وہ تفصیلی ایمان ہوا اور اس کے ضمن میں اجمالاً تمام انبیاء علیہم السلام پر بھی ایمان لانا ہوا اسلئے کہ وہ سب انبیاء مجتہد تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مصدق — اس کے بعد رسول کے شیخ اکبر کہتے ہیں کہ یہ کتابی جو حضور پر ایمان لایا اس کا ہر ایک ایمان دو ایمانوں پر مشتمل ہے، پہلے اپنی طرف پر ایمان لایا تو تفصیلاً اپنے نبی پر اور اجمالاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا ہوا اور جب حضور پر ایمان لایا تو یہ تفصیلاً حضور پر ہوا اور اجمالاً تمام انبیاء پر، اب پڑھو: **أَلَّذِينَ آمَنُوا مِنَّا هُمُ الْكُتُبُ مِنْ قَبْلِهِ هُمْ بِهِ يُؤْمِنُونَ** ط **وَإِذْ أَيْتَنَّا عَلَيْهِمُ آلُوا آمَنَ بِهِ** (۳) یعنی وہ کہتے ہیں کہ ہم تو پہلے ہی سے مطیع ہیں، تو ان کا ایمان دو ایمانوں پر مشتمل ہے، اس لئے فرمایا: **أُولَٰئِكَ يُؤْتُونَ أَجْرَهُمْ مَرَّتَيْنِ** (۴) اب یہ کچھ بھی معلوم ہو گیا کہ مَرَّتَيْنِ کیوں کہا؟ اَجْرَيْنِ کیوں دیا؟ اس لئے کہ ان کا ایمان دو بار تھا، حدیث میں چونکہ الفاظ میں کچھ فرق ہے اس لئے یہ توجیہ حدیث پر چسپاں نہیں۔

باب ۷۷ عِظَةُ الْإِمَامِ النِّسَاءِ وَتَعْلِيمُهَا

امام کا عورتوں کو نصیحت کرنا، ان کو (دین) کی باتیں سکھانا۔

۹۷۔ حَدَّثَنَا سُلَيْمَانُ بْنُ حَرْبٍ قَالَ ثنا شُعْبَةُ عَنْ أَيُّوبَ قَالَ سَمِعْتُ

ہم سے سلیمان ابن حرب نے بیان کیا، کہا ہم سے شعبہ نے بیان کیا، انھوں نے ایوب سے،

عَطَاءُ بْنُ أَبِي رِبَاعٍ قَالَ سَمِعْتُ ابْنَ عَبَّاسٍ قَالَ أَشْهَدُ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

کہا میں نے عطار ابن ابی رباع سے سنا، کہا میں نے ابن عباس سے سنا، انھوں نے کہا میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر

أَوْ قَالَ عَطَاءُ أَشْهَدُ عَلَى ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَرَجَ وَمَعَهُ

گواہی دیتا ہوں، یا عطار نے کہا میں ابن عباس پر گواہی دیتا ہوں (راوی کو شک ہے) کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

بِلَالٍ فَظَنَّ أَنَّهُ لَمْ يَسْمَعْ النِّسَاءَ فَوَعَّظَهَا وَأَمَرَهَا بِالصَّدَقَةِ فَجَعَلَتِ الْمَرْأَةُ تُلْقِي

(مردود کی صفت سے) ٹھکے اور آپ کے ساتھ بلال تھے، آپ کا خیال ہوا کہ عورتوں تک میری آواز نہیں پہنچی، پھر

الْقُرْطُ وَالْحَاتِمَ وَبِلَالٌ يَأْخُذُ فِي طَرَفِ ثَوْبِهِ وَقَالَ إِسْمَاعِيلُ عَنْ أَيُّوبَ عَنْ

آپ نے عورتوں کو نصیحت کی اور ان کو خیزت کرنے کا حکم دیا، کوئی عورت اپنی جالی پھینکنے لگی، کوئی انگوٹھی، اور

عَطَاءٍ قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ أَشْهَدُ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

بلال نے اپنے کپڑے کے کونے میں (یہ خیزات) لینا شروع کی، اس حدیث کو اسماعیل بن عتبہ نے ایوب سے

روایت کیا، انھوں نے عطار سے کہ ابن عباس نے یوں کہا کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر گواہی دیتا ہوں،

(اس میں شک نہیں ہے)

باب ۷۸ عِظَةُ الْإِمَامِ النِّسَاءِ وَتَعْلِيمُهَا

ترجمہ رکھا کہ امام عورتوں کو تعلیم دے تو منوع نہیں، یعنی خاص طور پر عورتوں کے لئے مجلس و غلط منعقد کی جائے، تو

یہ بھی ثابت ہے اور ہونا چاہئے۔

حدیث: ۹۸، تَوَلَّاهُ أَشْهَدُ إِذَا أَشْهَدَ فِي شَكٍّ هَكَذَا عَطَاءُ قَالَ أَشْهَدُ عَلَى ابْنِ

عباس یا ابن عباس نے کہا اشہد علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم، بعض روایات میں ہے کہ دونوں نے کہا اور

اشہد کا لفظ دونوں جگہ موجود ہے۔

باب ۷۵ الحِصَّ عَلَى الْحَدِيثِ

حدیث کے لئے حرص کرنا

۹۸۔ حَدَّثَنَا عَبْدُ الْعَزِيزُ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ قَالَ حَدَّثَنِي سُلَيْمَانُ عَنْ

ہم سے عبد العزیز ابن عبد اللہ نے بیان کیا، کہا مجھ سے سلیمان نے بیان کیا، انھوں نے عمرو ابن ابی عمرو
عمر و بن ابی عمرو و عن سعید بن ابی سعید المقبری عن ابی ہریرۃ اَنَّهُ قَالَ
انھوں نے سعید ابن ابی سعید مقبری سے، انھوں نے ابو ہریرہ سے، انھوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! قیامت کے دن
قِيلَ يَا رَسُولَ اللَّهِ مَنْ أَسْعَدُ النَّاسِ بِشَفَاعَتِكَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ
آپ کی شفاعت کا سب سے زیادہ مستحق کون ہوگا (کس کی نسبت میں یہ نعت ہوگی؟) آپ نے فرمایا: ابو ہریرہ! میں جانتا تھا
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَقَدْ ظَنَنْتُ يَا أَبَا هُرَيْرَةَ أَنْ لَا يَسْأَلَنِي عَنْ هَذَا الْحَدِيثِ أَحَدٌ
کچھ سے پہلے کوئی یہ بات مجھ سے نہیں پوچھے گا، کیونکہ میں دیکھتا ہوں تجھے حدیث سننے کی کسی حرص ہے (اب سن لے)
أَوَّلَ مِنْكَ لِمَا رَأَيْتُ مِنْ حِرْصِكَ عَلَى الْحَدِيثِ أَسْعَدُ النَّاسِ بِشَفَاعَتِي يَوْمَ الْقِيَامَةِ
سب سے زیادہ میری شفاعت کا نصیب ہونا اس شخص کے لئے ہوگا جس نے اپنے دل سے یا اپنے جی کے ظلم کے ساتھ

مَنْ قَالَ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ خَالِصًا مِنْ قَلْبِهِ أَوْ نَفْسِهِ

لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ كَبُرَ هُوَ

قَوْلًا خَرَجَ مَعَهُ بَلَالٌ فَلَمَّا لَمْ يَبْعَثِ النِّسَاءَ فَوَعظَهُنَّ وَأَمَرَهُنَّ بِالصَّدَقَةِ، خَرَجَ كَمَا مَطْلَبُ يَهُدَى كَر

عید کی نماز پڑھ کر نکلے اور جو کچھ عورتیں پیچھے تھیں اس لئے انھوں نے نہیں سنا، اس لئے آپ ان کے پاس گئے اور وعظ و نصیحت کی، صدقہ کا حکم
اس لئے دیا کہ کفرانِ عشیرہ وغیرہ بہت کرتی ہیں کہنی احادیث، اس لئے عذاب سے بچانے کے لئے یہ حکم دیا، کیونکہ الصدقات تطفئ غضب
المرتب (صدقہ رب کے غضب کو ٹھنڈا کرتا ہے) وَعظهن من وعظ اور اھوھن سے تعلیم احکام مراد ہے، قُرْطُ بَالِي يَابَنُكِلَ
دیگرہ جو کان کی ٹوپیوں پہنی جائیں۔

باب الحِصَّ عَلَى الْحَدِيثِ (۷۵)

حدیث : ۹۸۔ قَوْلًا مِنْ أَسْعَدِ النَّاسِ لَيْتَ { آپ کی شفاعت کا سب سے زیادہ اہل کون ہے؟ }

(۱) یہاں جات تقریر صحیح طور پر حضرت اساذ کے الفاظ کا مفہوم ادا نہیں کر سکے۔

بَابُ كَيْفَ يَقْبُضُ الْعِلْمُ وَكَتَبَ عُمَرُ بْنُ عَبْدِ الْعَزِيزِ إِلَى ابْنِ بَكْرِ بْنِ حَزْمٍ أَنْظِرْ

علم کیونکر اٹھ جائے گا؟ اور عمر ابن عبد العزیز (خلیفہ) نے ابوبکر ابن حزم (مدینہ کے قاضی) کو

مَا كَانَ مِنْ حَدِيثِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَأَكْتُبُهُ فَإِنِّي خِفْتُ دُرُوسَ
الْعِلْمِ وَذَهَابَ الْعُلَمَاءَ وَلَا تَقْبَلُ الْأَحَادِيثَ النَّبَوِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلِيَفْشُوا الْعِلْمَ
نہ جائے اور عالم چل بیس اور یہ خیال رکھو وہی حدیث اٹھانا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہو (نہ اور کسی کا قول)
وَلِيَجْسُوا حَتَّى يَعْلَمَ مَنْ لَا يَعْلَمُ فَإِنَّ الْعِلْمَ لَا يَهْلِكُ حَتَّى يَكُونَ سِرًّا
یا غل (اور عالموں کو علم پھیلانا چاہیے، تعلیم کے لئے بیٹھنا چاہئے، کہ جن کو علم نہیں وہ علم حاصل کرے، اس لئے کہ علم جہاں
پوشیدہ رہا، بس مٹ گیا۔

قَوْلًا مِنْ قَالَ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ. مراد یہ ہے کہ جو موصوفہ خاص ہے اور شرک سے بالکل خالی ہے وہ اسعد ہے، بعض روایات

میں ہے کہ اسعد الناس بشفاعتی وہ ہیں جو مرکب کبار ہیں، جیسا کہ فرمایا شفاعتی لا اهل الکتاب ثم من امتی، میری شفاعت
میری امت کے مرکب کبیرہ لوگوں کے لئے ہوگی، یہاں عمل کا ذکر نہیں ہے، تو یوں کہا جائے گا کہ فرق مراتب ملحوظ ہوگا، جس کے اندر جتنی
چیزیں ہوں گی اسی کے اعتبار سے آپ شفاعت فرمائیں گے [شفاعتیں کئی ایک ہیں] ایک شفاعت بول عشرے [نجات کے لئے]،
ایک قبل دخول نار کے، اور ایک بعد دخول کے ہوگی۔ مسلم شریف میں ہے کہ بعض ایسے ہوں گے جن کے پاس عمل نہ ہوگا، اور اللہ تعالیٰ
صرف اپنے قدرت سے انھیں دوزخ سے نکالیں گے اور اس میں تصریح ہے کہ وہ قائلین لا الہ الا اللہ ہوں گے، ظاہر سے ایسا
معلوم ہوتا ہے کہ وہ بغیر شفاعت نبوی کے نجات پائیں گے، مگر یاد رہے کہ وہ بھی نکالے جائیں گے شفاعت نبوی ہی سے، کیونکہ تصریح ہے کہ
حضور عرض کریں گے کہ اب اللہ کوئی نہیں رہا سوائے ان لوگوں کے جو لا الہ الا اللہ کے قائل ہیں، اس پر اللہ فرمائے گا کہ اب انھیں میں نکالوں گا
بہر حال وہ نکالے جائیں گے شفاعت نبوی ہی سے، اگرچہ ان کو اللہ تعالیٰ اپنے یہ قدرت سے نکالے گا۔

بَابُ كَيْفَ يَقْبُضُ الْعِلْمُ (۷۶)

[امام بخاری علم اٹھانے جانے کی کیفیت بتانا چاہتے ہیں کہ] علم کیسے اٹھایا جائے گا؟ ایک صورت تو یہ ہے کہ سینوں سے

علم نکال لیا جائے اور دوسری صورت یہ ہے کہ کتابوں سے حدوث مٹا دئے جائیں، تو یہ دونوں صورتیں نہ ہوں گی، بلکہ اس کی تیسری صورت
ہوگی اور وہ یہ کہ علماء اٹھائے جائیں گے۔

۹۹۔ حَدَّثَنَا الْعَلَاءُ بْنُ عَبْدِ الْجَبَّارِ حَدَّثَنَا عَبْدُ الْعَزِيزُ بْنُ مُسْلِمٍ عَنْ

ہم سے علاء بن عبد الجبار نے بیان کیا، کہا ہم سے عبد العزیز بن مسلم نے بیان کیا، انھوں نے

عَبْدُ اللَّهِ بْنُ دِينَارٍ بِذَلِكَ يَعْنِي حَدِيثَ عُمَرَ بْنِ عَبْدِ الْعَزِيزِ إِلَى قَوْلِهِ ذَهَابَ الْعُلَمَاءُ
عبد اللہ بن دینار سے، انھوں نے عمر بن عبد العزیز کا یہ قول بیان کیا یہاں تک "اور عالم چل بسے۔"

۱۰۰۔ حَدَّثَنَا إِسْمَاعِيلُ بْنُ أَبِي أُوَيْسٍ قَالَ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ هِشَامِ

ہم سے اسماعیل بن اویس نے بیان کیا، کہا مجھ سے امام مالک نے بیان کیا، انھوں نے ہشام بن عروہ سے

بْنُ عُرْوَةَ عَنْ أَبِيهِ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو بْنِ الْعَاصِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ
انھوں نے اپنے باپ سے، انھوں نے عبد اللہ بن عمر دین العاص سے، کہا میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا

صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ إِنَّ اللَّهَ لَا يَقْبِضُ الْعِلْمَ انْتِزَاعًا يَنْتَزِعُهُ مِنَ
آپ فرماتے تھے، اللہ (دین کا) علم بندوں سے چھین کر نہیں اٹھاے گا بلکہ علموں کو اٹھا کر علم کو

الْعِبَادِ وَلَكِنْ يَقْبِضُ الْعِلْمَ بَقْبِضِ الْعُلَمَاءِ

اٹھا لے گا

ابوبکر ابن حجر ابن عزاہن حرم والی مدینہ تھے اور چونکہ مدینہ گھوارہ تھا علوم نبویہ کا، اس لئے انھیں لکھا کہ حضورؐ کی جس قدر احادیث

میں ان سب کو لکھو الو۔ یہ ۹۹ء کا واقعہ ہے۔

قَوْلُهُ فَانْقَضَتْ دُرُوسُ الْعِلْمِ، یعنی میں اندیشہ کرتا ہوں کہ علم مندس نہ ہو جائے اور علماء نہ باقیں، تو آگے کو
سلسلہ چلن مشکل ہو جائے گا، چنانچہ اس اولیت کا شرف عمر ابن عبد العزیز کو ملا، بعض روایات میں ہے کہ علاوہ ابوبکر کے اور حکام کو بھی
لکھا، چنانچہ بصرہ، کوفہ، شام، خراسان، رے میں جو اہل علم تھے سب نے حدیثیں جمع کیں، ابن جریر نے کہیں حماد ابن سلمہ نے بصویں، امام
مالک نے مدینہ میں حدیثیں مدون کیں، مگر سب سے پہلے قوم کو جو کتاب ملی وہ زہری کی کتاب تھی (پورا واقعہ تدوین حدیث کی عیشیں گزر چکا)
کتابت سے روکنے کے [جو بعض اقوال منقول ہیں] اس کی حقیقت اتنی ہے کہ جو حفظ کر سکتے تھے [ان کو اجازت نہ تھی اسلئے کہ]
انھیں کتابت کی ضرورت نہ تھی۔

اور بعضوں نے کہا کہ جن کی کتابت پر [عدم مہارت یا کم حد ضبط نہ کر سکے کی بنا پر] اعتماد نہ تھا، ان کو نسخہ فرمایا، اور جن پر
اعتماد تھا جیسے عبد اللہ ابن عمر دین العاص، ان کو اجازت تھی، بہر حال کتابت حدیث ثابت ہے، امت کا اس پر عمل رہا ہے، بلکہ بعض

حَسَّ إِذَا الْمَيْتَقَ عَالِمًا اتَّخَذَ النَّاسُ رُؤُسًا جُتَمًا لَا فُسْرَ لَوْ
 جب کوئی عالم باقی نہیں رہے گا تو لوگ جاہلوں کو سردار (پیشوا) بنائیں گے، ان سے منہ پوچھیں گے، وہ بے علم
 فَاقْتُوا بِغَيْرِ عِلْمٍ فَضَلُّوا وَأَضَلُّوا
 نوبی دیں گے، آپ بھی گمراہ ہوں گے اور (دوسروں کو بھی) گمراہ کریں گے۔

قَالَ الْهَرِيرِيُّ نَاعِبًا قَالَ ثَنَا قَتِيبَةُ قَالَ حَدَّثَنَا جَرِيرٌ عَنْ هِشَامٍ مَخُوكًا
 ہریری نے کہا: ہم سے عباس نے بیان کیا، کہا ہم سے قتیبہ نے کہا ہم سے جریر نے انھوں نے ہشام سے اننداس کے
بَابٌ هَلْ يُجْعَلُ لِلنِّسَاءِ يَوْمًا عَلَى حِدَةٍ؟
 کیا امام عورتوں کی تسلیم کے لئے کوئی عید دن مقرر کر سکتا ہے؟

۱۱۔ حَدَّثَنَا آدَمُ قَالَ ثَنَا شُعْبَةُ قَالَ حَدَّثَنِي ابْنُ الْأَصْبَهَانِيِّ قَالَ

ہم سے آدم نے بیان کیا، کہا ہم سے شعبہ نے بیان کیا، کہا ہم سے مہر الدارحان ابن عبد اللہ اصبہانی نے
 سَمِعْتُ أَبَا صَالِحٍ ذَكَرَ أَنَّهُ يُحَدِّثُ عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ
 کہا میں نے ابو صالح ذکر کیا کہ وہ ابو سعید خدری سے روایت کرتے تھے، عورتوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا
 صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ غَلَبْنَا عَلَيْنَا الرِّجَالُ فَأَجْعَلْ لَنَا يَوْمًا مِنْ نَفْسِكَ فَوَعَدَهُنَّ يَوْمًا
 مرد آپ کے پاس آتے ہیں، ہم پر غلبہ ہوئے تو آپ اپنی طرف سے (خاص) ہمارے لئے ایک دن مقرر کر دیجئے، آپ نے ان سے ایک دن

بلکہ واجب ہے۔

ایک روایت ابن وہب کی ہے کہ انھوں نے اپنی یادداشت لکھ کر رکھی تھی اور لوگوں کو دکھلایا بھی تھا، اور تدریب الراوی میں ہے
 کہ انس ابن مالک نے بھی اپنی کتاب لکھ کر دکھلائی۔

وَلَا لَا تَقْبَلُ الْأَحْدِيثَ النَّبِيِّ، یعنی کسی کی رائے نہ ہو بلکہ جو بودہ حدیث ہی ہو۔

وَلَا حَتَّى يَكُونَ مَسْرُوعًا، یعنی جب علم کو راز بنائیں گے اور چھپا کر رکھ لیں گے، تو یہ تفسیع علم ہے (اس سے) یہ نہ سمجھنا (چاہئے)
 کہ کوئی چیز چھپائی بھی نہ جائے، ہر چیز کا انکار منوع نہیں بلکہ یہ دیکھنا چاہئے کہ کبھی کبھی کس قسم کا ہے، اس کے ہم کے مطابق کلام کیا جائے۔

(۱۱) شاید یہاں جا سے کچھ ہو چکا ہے ۱۲۔

لَقِيْنَهُ فِيْهِ فَوْعَظُهُنَّ وَامْرَهُنَّ فَكَانَ فِيمَا قَال لَهُنَّ مَا مِنْكُنَّ اِمْرَاَةٌ تَقْدِرُ مِثْلَ ثَلَاثَةِ

لئے کا وعدہ فرمایا، اس دن کو نصیحت کی اور شرم کے احکام بتائے، ان باتوں میں جو آپ نے فرمائیں یہ بھی تھی کہ جو عورت

مِنْ وَلَدِهَا اِلَّا كَانَ لَهَا حَاجَابًا مِّنَ النَّارِ فَقَالَتْ اِمْرَاَةٌ وَاشْنِيْنُ فَقَالَ وَاشْنِيْنُ،

اپنے تین بچے آگے بھیجے تو وہ آخرت میں اس کے دوزخ سے آڑ بن جائیں گے، ایک عورت نے عرض کیا اگر دو بھیجے؟ آپ نے فرمایا: اور دو بھی!

۱۰۲۔ حَدَّثَنِي مُحَمَّدُ بْنُ بَشَّارٍ قَالَ تَنَاخَدُّرُ قَالَ تَنَا شَعْبَةَ عَنْ عَبْدِ الرَّحْمَنِ

مجھ سے محمد ابن بشار نے بیان کیا، کہا ہم سے غدر نے بیان کیا، کہا ہم سے شعبہ نے بیان کیا، انھوں نے

بْنِ الْاَصْبَهَانِيِّ عَنْ ذُكْوَانَ عَنْ اَبِي سَعِيْدٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِهَذَا

عبدالرحمان ابن اسہبانی سے، انھوں نے ذکوان سے، انھوں نے ابوسعید سے، انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی

وَعَنْ عَبْدِ الرَّحْمَنِ ابْنِ الْاَصْبَهَانِيِّ قَالَ سَمِعْتُ اَبَا حَازِمٍ عَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ

حدیث اور شعبہ نے اس کو روایت کیا عبدالرحمان ابن اسہبانی سے، انھوں نے کہا میں نے سنا ابو حازم سے، انھوں نے

ثَلَاثَةٌ لَمْ يَدْخُوا الْحِجْنَ

ابو ہریرہ سے اس روایت میں یوں ہے، آپ نے فرمایا: "تین بچے جو جوان نہ ہوئے ہوں۔"

قَوْلًا قَالَ الْفَرُّوقِيُّ، فَرَّ بَرِي اِمَامٌ بَخَّارِي كَيْ شَاكَرُوْهُ، اِنْ كِي عَادَتْ هِي كَبَجَب [بَابُ كَيْ سَاب] كُوْثِي حَدِيْث

علامہ بخاری کے کسی اور سے طے ہے تو اسے بھی نقل کر دیتے ہیں۔

(۱۰۱)، بَابُ هَلْ يَجْعَلُ لِلنِّسَاءِ يَوْمًا عَلٰى حِدَّةٍ

حدیث: ۱۰۱، قَالَتْ اِمْرَاَةٌ وَاشْنِيْنُ؟ يَعْطِفُ ثَلَاثِيْنِ؟ یعنی سال کی مذکور شدہ پر ایک غیر مذکور کو عطف کر کے

اس لئے بولے کہ عطف بھی اس کو مذکور پر عطف کر دے، بعض روایتوں میں صرف ایک کا ذکر آیا ہے اور بعض میں اس کے ساتھ لَمْ يَنْبَغِ الْحِجْنَ

کی تید بھی لگی ہوئی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ نابالغ مرے تو یہی حجاب من انار ہوگا۔ باقی رہا یہ شبہ کہ جو ان کا صدر مزیدہ ہوتا ہے، تو یہ یاد

رہے کہ وہاں اس کا کفارہ بھی ہے اور امید کی جاتی ہے، مگر یہاں مسئلہ شفاعت کا ہے کہ بچوں سے والدین کو خاص قسم کا تعلق ہوتا ہے

ان سے امیدیں وابستہ ہوتی ہیں اور اب تک ان سے عقوق بھی سرزد نہیں ہوا ہے، حدیث میں ہے کہ بچے جب دکھیں گے کہ ہمارے والدین

(۱۰۱) جواب واضح نہیں ہوا، شاید یہ مطلب ہے کہ وہ شدیدہ صدر مصیبت زدہ کے گناہوں کا کفارہ بنے گا اور اسے موجب مغفرت بننے کی بہت کچھ امید ہے، مگر یہاں شفاعت کا

ذکر ہے اور اس کی صلاحیت معلوم کچھوں میں ہی زیادہ سے ۱۲ (مرتب)

بَابٌ مِّنْ سَمْعِ شَيْئًا فَلَمْ يَفْهَمْهُ فَرَاَجَعَهُ حَتَّى يَعْرِفَهُ

کوئی شخص ایک بات سے اور نہ سمجھے تو دوبارہ پوچھے سمجھنے کے لئے۔

۱۰۳۔ حَدَّثَنَا سَعِيدُ بْنُ ابْنِ مَرْيَمَ قَالَ اَنَا نَافِعُ بْنُ عُمَرَ قَالَ حَدَّثَنِي

ہم سے سعید ابن ابی مریم نے بیان کیا، کہا ہم کو نافع نے خبر دی، کہا مجھ سے ابن ابی لمیہ نے بیان کیا، انہوں نے

ابْنِ ابْنِ مُلَيْكَةَ أَنَّ عَائِشَةَ زَوْجَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَتْ لَا تَسْمَعُ شَيْئًا
حضرت عائشہؓ نے، ان کی عادت تھی جس بات کو سنتیں اور نہ سمجھتیں تو خوب سمجھنے تک اس کو دوبارہ پوچھتیں اور (ایسا ہوا کہ ایک بار)

لَا تَعْرِفُهُ إِلَّا رَاجَعَتْ فِيهِ حَتَّى تَعْرِفَهُ وَأَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ:
آنحضرت مصلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، (قیامت کے دن) جس شخص سے حساب لیا جائے گا وہ عذاب میں

مِنْ حُومِيبَ عَذَابٍ قَالَتْ عَائِشَةُ فَقُلْتُ أَوَلَيْسَ يَقُولُ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ فُسُوفَ
پڑے گا، تو حضرت عائشہؓ نے کہا: اللہ تعالیٰ تو (سورہ انشت میں) فرماتا ہے: اُس کا حساب آسانی سے

يُحَاسِبُ حِسَابًا يَسِيرًا،

لیا جائے گا۔

دوزخ میں جا رہے ہیں تو وہ پل جائیں گے کہ ہم ہرگز نہ جانے دیں گے، اللہ تعالیٰ فرمائے گا: اچھا اسے جھگڑا لو نیچے! انہیں جنت میں لے جا۔
تو وہ ان کو لے کر جنت میں جائے گا

۴۸) بَابٌ مِّنْ سَمْعِ شَيْئًا اخ

یعنی ایک شخص جو بات نہ سمجھتا ہوا سے پوچھ لے، اس ازراہ سنت سوال نہ ہو ورنہ محروم رہے گا، بات یہ ہے کہ علم حاصل کرنے کیلئے
بھی ہر جا جائے، وقت کی رعایت، استاد کی حالت، سب کا لحاظ رکھنا چاہئے، حضرت شیخ الحدیث اپنا قصہ سناتے تھے کہ ایک بار بدایہ النیرین میں ایک
سند تیار ہو مجھ سے مل نہ ہوا اور شفا نہ ہوئی، اتفاقاً گنگوہہ جانا ہوا (دیوبند سے گنگوہہ ہائیں کوں ہے) تو حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے اس کو
پوچھا، حضرت نے اس کی تقریر فرمادی، میں نے سنا تو غصے سے کہ سمجھ میں تقریر نہ آئی، اس لئے پھر پوچھا، آپ نے پھر تقریر فرمادی، اس کے
بعد پھر پوچھا تو کچھ آثار خشکی کے نظر آئے، میں نے کہا: بس ٹھیک ہے حضرت! اور اٹھ کر چلا آیا اور راستہ بھر سوچتا آیا، ندی پر (راستہ میں ندی
پڑتی ہے) بہو پج کر دفعہ سمجھ میں آگئی۔ تو علم میں تادب کی ضرورت ہے۔

حدیث: ۱۰۴۔ حدیث میں یہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا یہ حال تھا کہ جب کوئی بات حضورؐ فرماتے

قَالَتْ فَقَالَ إِنَّمَا ذَلِكَ الْعَرَضُ وَلَكِنْ مَنْ نُوقِشَ الْحَسَابَ يَهْلِكُ.

آپ نے فرمایا: (یہ حساب نہیں ہے) اس سے مراد تو اعمال کا بتلانا دینا ہے، لیکن جس سے کچھ تان کر حساب لیا جائے گا وہ تباہ ہوگا۔

بَابٌ ۷۹ لِيُبْلَغَ الْعُلَمَاءُ الشَّاهِدَ الْغَائِبَ، قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

جو شخص مانے موجود ہو وہ علم کی بات اس کو پہنچا دے جو غائب ہو، اس کو ابن عباس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا۔

۱۰۴۔ حَدَّثَنَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ يُوسُفَ قَالَ حَدَّثَنَا اللَّيْثُ قَالَ حَدَّثَنِي سَعِيدٌ هُوَ

ام سے عبد اللہ ابن یوسف ترمذی نے بیان کیا، کہا ام سے لیث ابن سعد نے بیان کیا، کہا مجھ سے سعید ترمذی نے بیان کیا

ابْنُ أَبِي سَعِيدٍ عَنْ أَبِي ثَرْيَاحٍ أَنَّهُ قَالَ لِعَمْرٍو بْنِ سَعِيدٍ وَهُوَ يَبْعُثُ الْبُعُوثَ إِلَى مَكَّةَ
انہوں نے ابو ثریح سے (جو صحابی تھے) انہوں نے عمرو ابن سعید سے کہا (جو یزید کی طرف سے مدینہ کا حکم تھا) وہ کہہ رہے ہیں بھیج رہا تھا،

أَذْنًا لِيَأْتِيَهَا الْأَمِيرُ أَحَدُكَ قَوْلًا قَامَ بِهِ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْغَدَ مِنْ
اسے امیر! تجھ کو اجازت دے میں تجھ کو ایک حدیث سناؤں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دوسرے روز ارشاد فرمائی، میرے کانوں

يَوْمَ الْفَتْحِ سَمِعْتُهُ أَذْنًا يَوْمَ عَاةٍ قَلْبِي وَأَبْصَرْتُهُ عَيْنًا يَوْمَ كَلَّمَهُ بِهِ حَمْدُ

نے اس کو سنا اور دل نے اسے یاد رکھا اور میری دونوں آنکھوں نے ان کو دیکھا جب آپ نے یہ حدیث سنائی آپ نے اللہ کی تعریف کی

اللَّهُ وَأَشْنَى عَلَيْهِ ثُمَّ قَالَ إِنَّ مَكَّةَ حَرَمَهَا اللَّهُ وَلَمْ يُحَرِّمْهَا النَّاسُ فَلَا يَحِلُّ لِمَرءٍ يُؤْمِنُ
اور خوبی بیان کی، پھر فرمایا کہ مکہ کو اللہ نے حرام کیا ہے، لوگوں نے حرام نہیں کیا (اس کا ادب یہ حکم اپنی ہے) تو جو کوئی اللہ اور کچھ دن

بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ أَنْ يَسْفِكَ بِهَا دَمًا وَلَا يَعْصِدَ بِهَا شَجَرَةً

(قیامت پر ایمان رکھتا ہو، اس کو وہاں خون بہانا درست نہیں اور نہ وہاں کوئی درخت کاٹے۔

اور اچھی طرح ان کی سمجھ میں نہ آتا تو فوراً سوال کرتیں، چنانچہ جب آپ نے فرمایا: مَنْ حُسِبَ عُذَابٌ لِمَنْ حُسِبَ عَذَابٌ یعنی جس سے حساب کیا گیا اسے عذاب دیا گیا، تو فوراً سوال کیا گیا کہ قرآن میں ہے فسوف يحاسب حساباً يسيرا، یعنی عنقریب حساب آسان لیا جائے گا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا جواب دیا: ذَلِكَ الْعَرَضُ، یعنی حدیث میں جس حساب کا ذکر ہے وہ اور ہے اور آیت میں اور۔ آیت میں جس حساب کا ذکر ہے وہ درحقیقت عرض ہے۔

ایک حساب تو یہ ہے کہ اسے پیش کر دیا جائے، اس وقت کھود کر دیا اور کاوش نہیں ہوتی، اور ایک مطالبہ اور منا قرعہ ہے کہ کیوں یہ کیسا ہے؟ تو یہ حساب سخت ہے، یعنی جس کی کھود کر دیا گئی اور جانچ کا گئی تو وہ ہلاک ہونے والا ہے۔

فَإِمَّا أَحَدًا تَرَخَّصَ لِقِتَالِ رَسُولِ اللَّهِ فِيهَا فَقُولُوا إِنَّ اللَّهَ قَدْ أَذِنَ لِرَسُولِهِ وَلَمْ يَأْذَنْ لَكُمْ
 (اگر میرے بعد) کوئی ایسا کرنے کا یہ دلیل لے کہ اللہ کے رسول وہاں رہے ؟ تو تم یہ کہو کہ اللہ نے تو (فتح مکہ کے دن) اپنے رسول کو (خاص)
 وَإِنَّمَا أَذِنَ لِي فِيهَا سَاعَةً مِنْ نَهَارٍ ثُمَّ عَادَتْ حُرْمَتُهَا الْيَوْمَ كَحُرْمَتِهَا بِالْأَمْسِ وَلِيَبْلُغَ الشَّاهِدُ
 اجازت دی تھی، تم کو اجازت نہیں دی اور مجھ کو بھی صرف ایک گھنٹی دن کے لئے اجازت دی تھی، پھر اس کی حرمت آج دہری ہی ہوگئی جیسے
 الْغَائِبِ، فَقِيلَ لِأَبِي شَرِيحٍ مَا قَالَ عَمْرُو قَالَ أَنَا أَعْلَمُ مِنْكَ يَا أَبَا شَرِيحٍ لَا تُعْذِرُ عَاصِيًا
 کس تھی، اور جو شخص یہاں حاضر ہو وہ اس کی خبر اس کو کر دے جو غائب ہے، لوگوں نے ابوشریح سے پوچھا: عذر دے اس کا کیا جواب دیا؟ ابوشریح
 وَلَا قَارًا بِدِمِهِ وَلَا فَارًا بِخُوبَةٍ.

نے کہا: عذر دے یہ جواب دیا کہ میں تجھ سے زیادہ علم رکھتا ہوں، کو گنگنا کر کہنا نہیں دیتا اور نہ اس کو جو خون یا چمادی کر کے بھاگے۔

(۷۹) بَابُ لِيَبْلُغَ الْعِلْمُ

حدیث ۱۰۴۰۔ ابوشریح صحابی ہیں اور عمر و ابن سعیدؓ، یزید کے عہد حکومت میں مدینہ کا والی تھا، قصہ یہ ہوا تھا کہ امیر معاویہؓ
 نے جب یزید کو خلیفہ بنایا تو حضرت حسین اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے نیت سے انکار کر دیا، حضرت حسین کا حال تو معلوم و مشہور ہی ہے،
 ابن زبیر مدینہ سے مکہ کو ہجرت کر گئے کہ وہ حرم ہے، وہاں امن میں رہیں گے، چنانچہ انھیں عائذہ اللہ کہتے تھے، یزید نے ان کے اقتدار کو باطل
 کرنے کے لئے پڑھائی کی تیاری کی اور [عمر و ابن سعید کو مل بھیجا کہ] ابن الزبیر سے جنگ کے لئے [شکر روائہ کرد] اس موقع پر [ابوشریح نے
 ایک کلمہ بتایا کہنا چاہا اور فرمایا: ائذِنَ لِي اِيْهَا اَلْمِيْرُ، اے امیر مجھے کچھ کہنے کی اجازت دیجئے، یہ نہایت ادب اور تہذیب کا خطاب تھا۔
 قَوْلًا مَمْنُوْنًا اِذْنًا يٰ اَبِي شَرِيْحٍ جِيْهِ مَحْرَمٍ يَنْ لِيْ مَعُوْظٌ رَكْعَاةً.

قَوْلًا حَرَمَهَا اللّٰهُ وَلَمْ يَحْرَمْهَا النَّاسُ، یعنی اللہ نے اس کو حرم بنایا ہے، بندوں کا بنایا ہوا نہیں ہے، جیسا کہ آج کل
 یورپ میں بناتے ہیں، شہر سوئٹزرلینڈ کہہ کر کسی کو سزا نہیں دی جاسکتی۔

قَوْلًا وَإِنَّمَا أَذِنَ لِي فِيهَا سَاعَةً، بعض روایات میں ہے کہ طلوع آفتاب سے عصر تک یہ ساعت تھی، تو اس سے قلیل مدد اور
 قَوْلًا أَمْسٍ یعنی فتح کو کا اس (فتح کو سے پہلے کا دن)۔

قَوْلًا وَلِيَبْلُغَ الشَّاهِدُ الْغَائِبِ، تو ابوشریح نے حق ادا کر دیا، یہی تہذیب کا خطاب کا۔

(۱) یہ (عمر و ابن سعید) بھی ہیں لیکن ان کے افعال اچھے نہیں تھے ۱۲ (۲) خط کشیدہ عبارت کا مفہوم واضح نہیں ہے، ۱۳ مرتب۔

۱۰۵۔ حَدَّثَنَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ عَبْدِ الْوَهَّابِ قَالَ ثَنَا حَمَّادُ عَنْ أَيُّوبَ عَنْ مُحَمَّدٍ

ہم سے عبد اللہ ابن عبد الوہاب نے بیان کیا، کہا ہم سے حماد نے بیان کیا، انھوں نے محمد ابن سیرین سے، انھوں نے

عَنْ أَبِي بَكْرَةَ ذَكَرَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ فَإِنْ دِمَاءُكُمْ وَأَمْوَالُكُمْ۔ قَالَ مُحَمَّدٌ

ابوبکر سے، انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا کہ آپ نے فرمایا، تمہارے خون اور تمہارے مال۔ اور ابن سیرین نے کہا میں سمجھا ہوں

وَاحْسِبُهُ قَالَ۔ وَأَعْرَاضُكُمْ عَلَيْكُمْ حَرَامٌ كَحُرْمَةِ هَذَا فِي شَهْرِكُمْ هَذَا،

یہی کہا۔ اور تمہاری عزتیں (آبروئیں) ایک دوسرے پر حرام ہیں، جیسی اس دن (یوم النحر) کی حرمت ہے اس مہینہ میں، سن رکھو،

الْأَيْ لِيُبْلِغَ الشَّاهِدُ مِنْكُمْ الْغَائِبَ، وَكَانَ مُحَمَّدٌ يَقُولُ صَدَقَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ

جو شخص حاضر ہے وہ غائب کو پہنچا دے، ابن سیرین نے کہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمایا سچ ہوا (جو لوگ اس وقت حاضر تھے

وَسَلَّمَ، كَانَ الْإِهْلَ بَلَّغَتْ مَرَّتَيْنِ،

انھوں نے جو غائب تھے ان کو یہ حدیث پہنچا دی) اور آنحضرت نے فرمایا اس رکھو میں نے یہ حکم تم کو پہنچا دیا، دوبار فرمایا۔

قَوْلًا أَنَا أَعْلَمُ یعنی میں زیادہ جانتا ہوں، حالانکہ وہ جھوٹا ہے، وہ کیا جانتا، یہ صحابی، وہ تابعی، یہ تو صرف ماننے کی وجہ سے

کہا، صحابی نے بالکل صحیح سمجھا تھا، اس نے ان کی بات کا ٹٹھی چا ہی۔

قَوْلًا لَا تَقْبِلُوا حَاجِيًّا یعنی عاصی، باغی، جانی، سارق وغیرہ کو حرم پناہ نہیں دیتا، بلکہ وہیں حرم میں سزا دی جائے گی،

میں کہتا ہوں کہ اس سے قطع نظر کیجئے کہ مسک کیا ہے، اس سے یہی پوچھا جائے کہ باغی و عاصی کون ہے؟ کیا ابن زبیر؟ ہرگز نہیں! ابن زبیر عاصی

نہیں بلکہ تم عاصی ہو کہ باوجود فسق و فجور کے تم نے لوگوں کی گردنوں میں اپنی حکومت کا قلابہ ڈالا، باقی رہا مسک تو شوانخ کے ہاں وہیں حرم میں

سزا دی جائے گی، اور جزیہ کہتے ہیں وہاں قتل نہ کریں گے، ہاں اسے اس طرح تلک کریں گے کہ وہ حرم چھوڑ دے، اور جب حرم سے باہر آئے

تو سزا دی جائے، ہاں ادون انفس میں اسبستہ حرم میں ہی مدود جاری ہوں گی، اور اگر کسی نے حرم میں کسی کو قتل کیا تو اس سے وہیں قصاص

لیں گے، بشرطیکہ حد بغاوت تک پہنچ گیا ہو۔ اور اگر نکال کئے ہوں تو نکال کر قتل کریں گے، اور اتفاق کی بات ہے کہ ابوشریح کی حدیث ہمارے

(خفیعہ کے) موافق ہے اور عمر و ابن سعید کا مسلک شوانخ کا ہے۔

حدیث ۱۰۵، قَوْلُهُ عَنْ مُحَمَّدٍ عَنْ أَبِي بَكْرَةَ، یہ بظاہر صحیح نہیں بلکہ عن محمد عن ابن ابی بکرۃ (۱) ہے۔

(۱) فتح الباری کے حاشیہ پر عن محمد عن ابن ابی بکرۃ عن ابی بکرۃ ہے "ابن حجر نے کہا کہ کتب شیعہ کی روایت کی طرح ہے اور باقی راویوں کے نہیں عن ابن

ابی بکرۃ رہ گیا ہے، جس کی وجہ سے سند منقطع ہو گئی ہے" ۱۲ مرتب۔

بَابُ اِثْمٍ مِنْ كَذَبٍ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔

جو شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ باندھے وہ کیسا گنہگار ہے۔

۶۔ حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ الْجَعْدِ قَالَ اَنَا شُعْبَةُ قَالَ اَخْبَرَنِي مَنْصُورٌ قَالَ سَمِعْتُ

ام سے علی ابن جعد نے بیان کیا، کہا، ام کو شعبہ نے خبر دی، کہا، مجھ کو منصور بن معتمر نے خبر دی، کہا، میں نے ربیع بن حراش سے سنا، وہ کہتے تھے: میں نے حضرت علیؑ سے سنا، کہتے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (دیکھو) مجھ پر جھوٹ

فَاِنَّهُ مِنْ كَذَبٍ عَلَى فُلَيْحِ النَّارِ

باندھنا کیونکہ جو شخص مجھ پر جھوٹ باندھے گا وہ دوزخ میں جائے گا۔

تو کانِ ذلک ای وقع ذلک، یعنی آپؐ نے تبلیغ کا حکم دیا تھا، لوگوں نے ویسا ہی کیا کہ اسی طرح پہنچا دیا

۸۰) بَابُ اِثْمٍ مِنْ كَذَبٍ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

حضور پر جھوٹ بولنا اور بہت لگانا یا کسی قول یا فعل کی نسبت حضورؐ کی طرف کرنا جو حضورؐ نے نہیں فرمایا یا نہیں کیا، اشد کبائر سے حتیٰ کہ ابو محمد جوئی امام احرار کے والد اور ابن المیز و غیر ہمارے یہاں تک کہہ دیا کہ وہ کافر ہو جائے گا، مگر جہور کہتے ہیں کہ وہ کافر نہیں ہوگا البتہ اشد کبیر کا مرتکب ہوگا، بعض صوفیہ نے بہت تہاہل کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ اگر تریف و تریب کے لئے حدیث وضع کر لے تو اس بارے میں وعید نہیں ہے بلکہ یہ جائز ہے، مگر یہ بات بالکل غلط اور مہمل ہے، کذب علی اپنی ہر حال منوع ہے، وہ کہتے ہیں کہ یہ کذب علی اپنی نہیں ہے بلکہ لٹنی ہے، حالانکہ وہ بھی علی اپنی ہے کیونکہ جھوٹ منسوب کیا جی کی طرف، البتہ صوفیائے محققین اور جہور نے بالاتفاق اس کو منوع قرار دیا ہے (اور تریف و تریب کے لئے بھی حدیث وضع کرنے کو حرام کہا ہے)

مفسرین اکثر ضعیف حدیثیں لے لیتے ہیں، اور بعض تو اسراہیلیات اور موضوعات کو بھی لے لیتے ہیں، لیکن احتیاط لازم ہے موضوعات کی تو مطلقاً گنجائش ہی نہیں، اسراہیلیات میں بھی تحقیق کرنا چاہئے اور مضامین کی فضائل اعمال میں تو گنجائش ہے مگر اور درجہ نہیں۔

نقل احادیث کے باب میں کس کا اعتبار کیا جائے گا اور کس کی نقل قبول ہوگی؟ تو اول درجہ میں اصحاب احادیث یعنی محدثین ہیں دوسرے درجہ میں ائمہ اہل فقہ اور تیسرے درجہ میں قدامت اہل سنت جی کو غریب احادیث سے لگاؤ رہا ہے جیسے امام ابو عبیدہ مگر اسے بھی بے کھٹکے بیان نہیں کر سکتے، جیسا کہ محدثین کی تخریج (تحقیق) کو بے کھٹکے بیان کر سکتے ہیں، لاطعی قاری بھی تہاہل کر جاتے ہیں اس لئے یہاں بھی احتیاط کرنی ہوگی۔

۱۰۷۔ حَدَّثَنَا أَبُو الْوَلِيدِ قَالَ تَنَا شُعْبَةُ عَنْ جَامِعِ بْنِ شَدَّادٍ عَنْ عَامِرِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ

ہم سے ابو الولید نے بیان کیا، کہا ہم سے شعبہ نے بیان کیا، انھوں نے جامع ابن شداد سے، انھوں نے عامر

ابن الزبیر عن أبيه قُلْتُ لِلزُّبَيْرِ إِنِّي لَا أَسْمَعُكَ تُحَدِّثُ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
ابن عبد اللہ ابن زبیر سے، انھوں نے اپنے باپ عبد اللہ ابن زبیر سے، انھوں نے (اپنے باپ) حضرت زبیر سے کہا: میں تم کو آنحضرت
کما یحدث فلان وفلان قال أما إني لم أفرقه ولكن سمعته يقول من كذب على
صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں فلاں فلاں شخصوں کی طرح بیان کرتے نہیں سنتا، انھوں نے کہا: میں آنحضرت سے جدا نہیں رہا کہ آپ کی حدیثیں

فَلْيَتَّبِعُوا مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ

میں نے نہ سنی ہوں، لیکن میں نے سنا آپ فرماتے تھے: جو کوئی مجھ پر جھوٹ باندھے وہ اپنا ٹھکانہ دوزخ میں بنالے

۱۰۸۔ حَدَّثَنَا أَبُو مَعْمَرٍ قَالَ تَنَا عَبْدُ الْوَارِثِ عَنْ عَبْدِ الْعَزِيزِ قَالَ أَسْرَ

ہم سے ابو معمر نے بیان کیا، کہا ہم سے عبد الوارث نے بیان کیا، انھوں نے عبد العزیز سے، انھوں نے کہا:

إِنَّهُ لِيَمْنَعُنِي أَنْ أَحَدًا يَكْذِبُ عَلَيَّ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ تَعَمَّدَ
اِس نے کہا جو تم میں بہت سی حدیثیں بیان کرنا اس کی وجہ بھی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو کوئی جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ
عَلَى كَذِبًا فَلْيَتَّبِعُوا مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ۔

باندھے وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے

حدیث ۱۰۷۔ تَوَلَّى فُلَانٌ وَفُلَانٌ، ابْنِ مَاجِهِ فِيكَ رَوَايَتٌ هِيَ جَسَاسَةٌ مَعْلُومَةٌ هِيَ كَافِرَةٌ مَعْلُومَةٌ مَعْلُومَةٌ مَعْلُومَةٌ

ہیں، دوسرے فلاں کا حال معلوم نہیں۔

تَوَلَّى أَمَّا إِنْ لَمْ أَفَارِقْهُ، یعنی میں محبت نبوی میں برابر رہا ہوں۔ اور بعض روایات میں ہے کہ پہلے اپنے تعلقات خاندانی بیان
کئے، پھر کہا کہ حضور کی محبت میں میں بھی رہا ہوں لیکن چونکہ میں حضور سے من کذب علیّ انحرس چکا ہوں اسلئے میں احتیاط برتا ہوں، اگر میں انہ
مردوں کا احتیاط برتنا مشکل ہوگا۔ انہ میں رطب و یابس سب آجاتی ہیں اور بلا ارادہ غلط چیزیں منہ سے نکل جاتی ہیں اور ان کے نزدیک خطا بھی
غلط چیز نکلتا منہ سے ہوگا، غرض یہ کہیں احتیاط نہ ہو سکے اور میں غلطی سے بیان کر دوں۔

حدیث ۱۰۸۔ قَالَ النَّبِيُّ، اس رضی اللہ عنہ کثرین حدیث میں سے ہیں اور کہتے ہیں کہ میں کثیر حدیثیں بیان نہیں کرتا، تو اس کا
جواب بعض نے یہ دیا کہ اس سے زیادہ ذخیرہ ان کے پاس رہا ہوگا، مگر صحیح جواب یہ ہے (ان شاء اللہ) کہ وہ اپنی طرف سے بیان ذکر کرتے تھے مگر عمری یا بی

۱۰۹۔ حَدَّثَنَا الْهَكْمِيُّ بْنُ إِبْرَاهِيمَ قَالَ حَدَّثَنَا يَزِيدُ بْنُ أَبِي عُبَيْدٍ عَنْ سَلَمَةَ هُوَ ابْنُ

ام سے کہی ابن ابراہیم نے بیان کیا، کہا ہم سے یزید ابن ابوعبید نے، انھوں نے سلمہ ابن اکوع سے، انھوں نے

الْأَكُوْعُ قَالَ سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ مَنْ ثَقُلَ عَلَى مَا لَمْ أَقُلْ فَلَيْتَبَوَّأُ
کہا میں نے سنا نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے، فرماتے تھے: جو کوئی مجھ پر وہ بات لگائے جو میں نے نہیں کہی، وہ اپنا ٹھکانا

مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ

دوزخ میں بنالے۔

۱۱۰۔ حَدَّثَنَا مُوسَى قَالَ ثَنَا أَبُو عَوَانَةَ عَنْ أَبِي حَصِينٍ عَنْ أَبِي صَالِحٍ عَنْ

ام سے موسیٰ ابن اسماعیل نے بیان کیا، کہا ہم سے ابو عوانہ نے بیان کیا، انھوں نے ابو حصین سے، انھوں نے

أَبِي هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ تَسْمَوُا بِأَسْمَائِي وَلَا تَكْتَبُوا بِكُنْيَتِي وَمَنْ

ابو صالح سے، انھوں نے ابو ہریرہ سے، انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے، آپ نے فرمایا: میرے نام پر نام رکھو (محمد اور محمد

رَأْنِي فِي الْمَنَامِ فَقَدْ رَأْنِي فَإِنَّ الشَّيْطَانَ لَا يَمُثِّلُ فِي صُورَتِي وَمَنْ كَذَبَ عَلَى مَتَعَدَّةٍ

نام رکھو) اور میری کنیت (ابوالقاسم) نہ رکھو اور یہ سمجھو کہ جس نے خواب میں مجھ کو دیکھا اس نے بلاشبہ مجھ ہی کو دیکھا، کیونکہ شیطان

فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ

میری صورت نہیں بن سکتا اور جو جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ باندھے وہ اپنا ٹھکانہ دوزخ میں بنائے

اور لوگ کثرت سے سوال کرتے تھے، مجبوراً ان کو جواب دینا پڑتا تھا، اکثر صحابہ دینا سے جاچکے تھے، صحت و دایک باقی رہ گئے تھے، اس وجہ سے ان کی میان کردہ حدیثوں کا ذخیرہ بہت ہو گیا

قَوْلُ سَلَمَةَ هُوَ ابْنُ الْأَكُوْعِ، یہ ہوا ابن الاکوع بخاری کی تفسیر ہے۔

حدیث ۱۱۰۔ قَوْلُ لَا تَكْتَبُوا بِكُنْيَتِي، یہ اس لئے فرمایا کہ ایک مقام پر آپ تشریف لے جا رہے تھے، کسی نے کہا: یا ابا القاسم

اے ابوالقاسم! آپ نے مراد دیکھا، اس نے کہا: لَمَّا عَنَّكَ، یعنی میں آپ کو نہیں بلاتا، اس پر آپ نے فرمایا: لَا تَكْتَبُوا بِكُنْيَتِي، میری کنیت

نہ رکھو، اس میں اشتباہ ہوتا ہے، نام کی اجازت اس لئے دی کہ لوگ کثرت یا کنیت سے پکارتے تھے یا یا رسول اللہ کہتے تھے، اس میں اشتباہ

کم تھی بالکل نہ تھی۔ چونکہ یہ علت اب معدوم ہو گئی اس لئے اب علم رکھتے ہیں کہ جائز ہے، اور بعض نے کہا کہ اگرچہ جائز ہے مگر بہتر یہ ہے کہ کنیت نہ لکھے

قَوْلُ وَمَنْ رَأْنِي فِي الْمَنَامِ فَقَدْ رَأْنِي، اور جس نے مجھ کو خواب میں دیکھا اس نے مجھ ہی کو دیکھا، کوئی دوسری چیز نہیں کہی

اس کی بشت کتاب الرّوایا میں حافظ نے بہت طویل لکھی ہے۔ اس کا خلاصہ بیان کرتا ہوں تاکہ دھوکا نہ لگے، پہلی چیز یہ ہے کہ یہاں الفاظ مختلف آئے ہیں، بعض میں فقد رانی آیا ہے، بعض میں فسیرائی اور بعض میں فکامۃ قد رانی، گو اگر اس نے مجھ کو دکھا، بعض میں ہے کاذر قد رانی فی القیظۃ، بعض میں ہے قد رانی فی القیظۃ ہے، اس نے سخی میں علما کا اختلاف ہوا ہے کہ کیا مراد ہے؟ بعض نے کہا: جس نے غصو کو خواب میں دیکھا تو وہ حضور کو ضرور دیکھے گا، کہاں دیکھے گا؟ تو بعضوں نے کہا قیامت میں، اس پر شبہ ہوا کہ پھر تھکھیں کیا رہی، قیامت میں تو سب دیکھیں گے، ہون کیا، کافر بھی؟ تو جواب دیتے ہیں کہ روئے مضموم مراد ہے، یعنی خاص اتفاقات، الطاف و عنایات کے ساتھ، بعض نے کہا کہ اس کا مطلب ہے کہ جس نے مجھے خواب میں [اس وقت دیکھا جب یہ بقید حیات ہوں] تو وہ مجھ کو ضرور دیکھے گا، یعنی اسے صحبت نبوی حاصل ہوگی اور باخیر خدمت ہوگا اور اگر انتقال کے بعد دیکھا تو کفن ہے یزاد ہو کہ میرے مزار کی زیارت کرے گا کیونکہ اس کو بھی زیارۃ النبی کہتے ہیں، اور یہ اس وقت ہے جب روایت میں فسیرائی آیا ہو، مگر اکثر روایات میں فقد رانی ہے، تو اس صورت میں مطلب یہ ہے کہ جس نے مجھ کو خواب میں دیکھا اس نے ٹھیک ٹھیک مجھ کی کو دکھا، یعنی یہ ایسا یقینی دیکھنا ہے جیسا کہ بیداری میں بھی دیکھنا، چنانچہ بعض روایات میں ہے: من رانی فقد رانی الحق یعنی ٹھیک ٹھیک دیکھا، بعض وحدۃ الوجود والے فقد رانی الحق کا یہ معنی لیتے ہیں کہ اندر کو دکھ لیا، لیکن اگر وحدۃ الوجود ہی پر رکھا جائے تو پھر حضور کی کو دکھا کر تھکھیں، سب کا دیکھنا اندر کا دیکھنا ہے۔ یہاں ایک بڑا اہم سوال یہ ہے کہ آیا خواب میں زیارت کرنا اگر ایسا ہی ہے جیسا کہ حیات میں دیکھنا، تو جس زنی و حالات میں دیکھے اور جو حضور کی زبان سے سنے اس سے کیا احکام ثابت ہوں گے، لوگ اس سے گمراہ ہوں گے، چنانچہ مرزا غلام احمد قادیانی نے بہت سے خواب چھاپے ہیں، تو حدیث کے نہ سمجھنے سے غیب نکلے ہوئے، کہ کفر و ایمان کا سوال پیدا ہو گیا، بعض صوفیہ کو خواب پر اس قدر وثوق ہوتا ہے کہ حدیث اور شریعت کی پرواہ ہی نہیں کرتے، اس لئے ضرورت ہے کہ اصل مسئلہ منع کر دیا جائے، تاکہ مطلب بھی واضح ہو جائے اور گمراہی بھی نہ پھیلے پائے، یاد رکھو ایک چیز بہارِ شفق علیہ ہے اور ایک چیز مختلف فیہ، اختلاف اس میں ہے کہ حضور کو دیکھنا ہر حالت میں دیکھنے کو عام ہے یا کسی حالت کے ساتھ خاص ہے؟ کسی خاص لباس میں دیکھنا اور خاص اپنی صورت میں دیکھنا جو آپ کی حقّی اس پر دیکھنا معتبر ہے یا عام ہے، خواہ علیہ بارکہ کے موافق ہو یا مخالفت؟ تو من رانی کس وقت سمجھا جائے گا، بعض کہتے ہیں کہ اگر کسی یا ایکس یا ل کا سفید ہونا حدیث سے معلوم ہوا ہے اور اس نے ایک کم یا ایک زیادہ دیکھا تو پھر اس نے حضور کو نہیں دیکھا، روایت وہی معتبر ہے جو حدیث کے موافق ہو، جو شائک میں صحابہ نے بیان کیا ہے پھر تفصیل ہے کہ اگر پیری کی حالت میں دیکھا تو پیری کا حدیث معتبر ہے اور اگر جوانی کی حالت میں دیکھا تو جوانی کا حدیث، اور بچپن میں بچپن کا حدیث معتبر ہوگا

قاضی عیاض وغیرہ کے کلام سے یہی مفہوم ہوتا ہے، اور ہمارے اکابر میں سے شاہ عبدالعزیز صاحب اور شاہ رفیع الدین صاحب میں اختلاف رہا ہے۔ شاہ رفیع الدین کا یہی مسلک تھا کہ ٹھیک اپنی زنی پر ہونا چاہئے، شاہ عبدالعزیز فرماتے تھے کہ عام ہے کسی بھی حالت میں ہو، حضور ہی ہوں۔ ابن حجر نے رازی، مالکی شارح مسلم کا قول نقل کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ اگر اصلی علیہ میں دیکھا، تب تو کلام نہیں کہ آپ ہی کو دیکھا، غیر کو نہیں، لیکن اگر دوسری زنی و بیعت اور علیہ میں دیکھا تو اس وقت رویت شخص ذات کی تو رویت حقیقیہ ہے، واقعی آپ کی ذات کو دیکھا اور تغیر اوصاف یہ رویت متخیلہ ہے۔ اصلی نہیں، مثلاً فرض کیجئے کوئی عیب دیکھا اور تین ہے کہ حضور کو دیکھنا ہوں تو ذات تو آپ ہی کی ہوگی مگر اوصاف کا تغیر قوت متخیلہ کا غلبہ ہے اور متخیلہ کا دخل کچھ مافی نہیں فقہ رافضی کے، اس کو معبرین نے بھی لکھا ہے کہ اگر کوئی برائی یا بھلائی آپ کے ساتھ دیکھی اور وہ چیز آپ کی زندگی میں آپ کے ساتھ نہ تھی تو حضور کی مثال اس وقت آئینہ کی سی ہے، یعنی خود اس دیکھنے والے میں جو قصور ہے وہ نظر آ رہا ہے، وہ دیکھ تو رہا ہے پیچیدہ، مگر نظر آ رہا ہے اپنا حال، کبھی ایسا ہوتا ہے کہ لباس وغیرہ غلات شریعت ہی ہوتا ہے اس وقت تغیر میں اختلاف، ہوتا ہے، چنانچہ مولانا عبدالغنی صاحب نے خواب میں دیکھا کہ میں غازی آباد اسٹیشن پر ہوں اور حضور کو دیکھا کہ تشریف لارہے ہیں، اور کوئی پتوں پہنچے ہوئے ہیں، یہ گھبراؤ کیونکہ معبرین نے لکھا ہے کہ رائی کے نقصان پر دال ہے، گھبرا کر مولانا رشید احمد گنگوہی کو لکھا — حضرت مولانا کو تبصر کر خاص ملکہ تھا، جواب میں لکھا کہ ایک اور چیز کی طرف اشارہ ہے، یہ دکھایا گیا ہے کہ آج کل دین پر نصاریٰ کا غلبہ ہے، دین حضور کی ذات ہے اور لباس نصاریٰ کا ہے، تو تمہارا اس میں تصور نہیں بلکہ نصاریٰ کے غلبہ کی خاص چیز دکھائی گئی ہے، تو یہ صفات کی رویت متخیلہ ہے اس کے علاوہ ایک اور چیز قابل غماض ہے، وہ یہ کہ جو باتیں بصراحت مدینہ میں مذکور ہیں وہ تو بے مال سلم ہیں، لیکن جو باتیں مدینہ سے خارج ہیں ان میں ہم کلام کر سکتے ہیں، لہذا جو کہتا ہے کہ حضور نے یہ فرمایا ہے، اس کے پاس کیا دیں ہے کہ حضور نے فرمایا ہے؟ حضور نے فرمایا ہے کہ شیطان میری ہمدرد پر مشتمل نہیں ہو سکتا، لیکن یہ نہیں فرمایا ہے کہ آواز بھی پیدا نہیں کر سکتا، اور انکار بھی نہیں کر سکتا، یہ کیوں جائز نہیں ہے کہ اس وقت ہمیں کرے اور کہے اپنی آواز سے اور سننے والا سمجھے کہ حضور فرما رہے ہیں، لہذا سماع کا اعتبار نہیں ہو سکتا۔ یہاں تک ایک جزد ہوا جو انکار تھا، دوسرا جزد جو اتفاقی ہے اب اسے سنو۔

باتفاقاً، افریقین یہ مسئلہ کہ حضور نے جو خواب میں فرمایا اور اس نے سنا تو یہ سماع حجت نہیں جب تک کتاب و سنت کے موافق نہ ہو، چنانچہ شیخ علی متقی صاحب کنز العمال (جو بہت بڑے دلی بھی ہیں) جب یہ مدینہ میں تھے تو ایک شخص نے آکر خواب بیان کیا کہ حضور نے مجھ سے فرمایا ہے: اشوب الخمر، شراب پی سب نے کہا ہماری سمجھ میں نہیں آتا، شیخ نے فرمایا: یہ ٹھک دیکھا ہوگا، لیکن آپ نے لاشرب الخمر، شراب مت پی، فرمایا ہوگا اور تو نے اشوب الخمر (شراب پی) نہ پایا تھا ہوگا، پھر اس سے پوچھا: تو شراب تو نہیں پیتا؟ کہا: پیتا ہوں، کہا: تو پھر حضور نے کیوں توبہ فرمائی؟

اس کی کیا ضرورت تھی۔

اس کی بہترین تفسیر فتح المغیث میں بخادی نے دی ہے، جہاں ردۃ کے شرائط بیان کئے ہیں کہ راوی کب معتبر ہوگا [اور اس کی روایت کب معتبر ہوگی] کہتے ہیں کہ راوی اگر مغفل ہے، یا شیخ کے کلام کے ساتھ اعتقاد نہیں کرتا تو اس کی روایت معتبر نہیں، جب مغفل کی روایت پر سبب عدم ہالاً کے معتبر نہیں تو غافل نام کی روایت پر کس طرح اعتبار کیا جاسکتا ہے جب بیداری میں مغفل کا اعتبار نہیں، تو جو غفلت میں ڈوبا ہوا ہے اس کا سماع کیے معتبر ہو سکتا ہے؟ لہذا اگر ایک لاکھ آدمیوں نے بھی مرزا غلام احمد تادیانی کے متعلق خواب میں دیکھا ہو اور وہ سچے بھی ہوں تو خواب کی جو گفتگو وہ نقل کرتے ہوں وہ ہرگز قابل اعتبار نہیں، ہاں روایت ذات معتبر ہے، اور بے ہوشے اوصاف اور بدلی ہوئی حیثیت کا اعتبار نہیں اور اسی لئے کلام پر وثوق نہیں ہو سکتا، اس لئے کہ جب صفات میں تغیر ہو سکتا ہے تو کلام میں اور سماع میں بطریق اولیٰ ہو سکتا ہے۔ اور جو خاص کرتے ہیں ان کے مسابک کے لحاظ سے تو کچھ کلام ہی نہیں، بہر حال دونوں قول پر یہ قول مردود ہے۔

اس کے ساتھ یہی یاد رکھو کہ جو لوگ کہتے ہیں کہ اصلی صورت میں روایت ہونا چاہئے، ظاہر حدیث اطمینان کی تائید میں ہے؛ فانت الشیطان (لا یقتل) یعنی نیشل نہیں بن سکتا، لیکن دوسروں کی صورت میں تو آ سکتا ہے، تو میں مراد حدیث کی تفسیر نہیں کر رہا ہوں، بلکہ کہتا ہوں کہ ظاہر حدیث حضرت شاہ رفیع الدین کا مؤید ہے۔

اور امام المعین محمد ابن سیرینؒ اسے بساند صحیح منقول ہے کہ جب کوئی کہتا ہے کہ میں نے حضورؐ کو دیکھا ہے تو فرماتے صفہ لی یعنی بیان کر دو کس طرح دیکھا ہے، اگر مطابق پاتے تو تائید فرماتے، ورنہ تسلیم نہ کرتے، اس سے بھی تائید ہوتی ہے خصوصاً کرنے والوں کی۔ اس کے بعد اس میں بھی اختلاف ہے کہ راوی (دیکھنے والا) بالثال دیکھتا ہے یا نہیں کہ یہ کبھی بجمہدہ الکسیم روایت ہوتی ہے؟ ہر سر نزدیک اس میں کوئی اشکال نہیں کہ بجمہدہ الشریف دیکھے، اس طرح کہ حجاب اٹھ جائیں، لیکن خواب میں یہ دیکھنے والا صحابی نہ ہوگا، کیونکہ صحابی بننے کے لئے یہ شرط ہے کہ حالت حیات نبوی میں روایت ہوئی ہو۔

امام غزالی اور امام سیوطی نے لکھا ہے کہ مثال میں ہوتا ہے (یعنی مثال کی روایت ہوتی ہے) اور چونکہ مثال کاشف ہے، اس لئے یہی کہا جائے گا کہ حضورؐ ہی کو دیکھا، مولانا فضل حق فیروز آبادی نے خواب میں حضورؐ کو دیکھا کہ گھر میں تشریف لائے گئے شاہی لباس میں، شاہ [ولی اللہ] صاحب کے خاندان میں خواب کہلا بھیجا اور تفسیر چاہی، تو یہ جواب ملا کہ فوراً مکان خالی کر دو، قاصد جواب لے کر یہہو چلا تو انھوں نے گھر خالی کر دیا

بَابُ كِتَابَةِ الْعِلْمِ

علم کی باتیں سمجھنا

۱۱۱۔ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ سَلَامٍ قَالَ أَنَا وَكَيْعٌ عَنْ سُفْيَانَ عَنْ مُطَرِّفٍ عَنْ

ہم سے محمد بن سلام بکندی نے بیان کیا، کہا ہم کو وکیع ابن جراح نے بکندی، انھوں نے سفیان ثوری سے سنا، انھوں نے

الشَّعْبِيِّ عَنْ أَبِي جُحَيْفَةَ قَالَ قُلْتُ لِعَلِيِّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ هَلْ عِنْدَكُمْ كِتَابٌ، قَالَ لَا إِلَّا مَطَرٌ سَ، انھوں نے شعبی سے، انھوں نے ابو حنیفہ سے، کہا میں نے حضرت علیؑ سے پوچھا، کیا تمہارے پاس کوئی کتاب ہے؟ انھوں نے کہا:

كِتَابُ اللَّهِ أَوْ فُهِمًا عَطِيَهُ رَجُلٌ مُسْلِمٌ أَوْ مَانِي هَذِهِ الصَّحِيفَةُ، قَالَ قُلْتُ وَمَا فِي كُوفِي نَہیں، مگر اللہ کی کتاب (قرآن شریف) یا محمد جو مسلمان کو دی جاتی ہے (اللہ کی طرف سے ملتی ہے) یا جو اس ورق میں لکھا ہوا ہے، ابو حنیفہ نے کہا:

هَذِهِ الصَّحِيفَةُ؟ قَالَ الْعَقْلُ وَكَفَاكَ الْأَسِيرُ وَلَا يُقْتَلُ مُسْلِمٌ بِكَافِرٍ

میں نے پوچھا اس ورق میں کیا لکھا ہوا ہے، حضرت علیؑ نے کہا: دین کا میان اور قیدیوں کے چھڑنے کا اور یہ علم کو کافر کے ہتھکنڈے میں لکھ کر دیا۔

مکان خالی کرنا تھا کہ سارا گھراؤ دُت کر گیا، اس تعبیر پر سب تھمر ہوئے، لوگوں نے پوچھا کہ خواب کو اس تعبیر سے کیا نا سبست تھی؟ جواب میں فرمایا کہ قرآن میں ہے، إِنَّ الْمُلُوكَ إِذَا دَخَلُوا قَرْيَةً أَكْسَدُوهَا ۖ (۱) بادشاہ جب کسی بستی میں (غزوۂ) داخل ہوتے ہیں تو اسے خراب کر دیتے ہیں، یہ شاہی لباس میں آنا اس طرف اشارہ تھا، اس سے میں نے سمجھ لیا۔

معلوم ہوا کہ ہیئت بدل کر آنے میں بھی کوئی خاص نکتہ ہوتی ہے، اس لئے خواب میں مختلف تعبیریں ہوتی ہیں۔

ابن ابی جرہ ایک بہت بڑے عارف و اندر نزرگ ہیں، انھوں نے بخاری کا حاشیہ لکھا ہے ”بہجۃ النطوس“ اس کا نام ہے، حافظ اکثر ان کا کلام نقل کرتے ہیں، وہ اور دوسرے لوگ کہتے ہیں کہ جب نام میں دیکھنے والا حضورؐ ہی کو دیکھتا ہے تو نقطہ میں جو جات کشف دیکھتے ہیں، اس کے بارے میں بھی کہیں گے کہ حضورؐ ہی کو دیکھا، ایسے معاملات میں ابن تیمیہ کا قول معتبر نہیں بلکہ صوفیہ محققین کا قول معتبر ہے لکن فقہ رجال روح المعانی میں علامہ آلوسیؒ نے اس پر بہت عمدہ بحث کی ہے کہ رویت نقطہ میں بھی ہو سکتی ہے۔

بَابُ كِتَابَةِ الْعِلْمِ (۸۱)

حدیث ۱۱۱، حضرت علیؑ کی نسبت بہت شروعات سے شیعوں نے شہور کر رکھا تھا کہ حضورؐ کوئی خاص نوشتہ ان کو دے گئے ہیں اس لئے

۱۱۲۔ حَدَّثَنَا أَبُو نَعِيمٍ الْفَضْلُ بْنُ دُكَيْنٍ قَالَ سَمِعْتُ أَنَا شَيْبَانَ عَنْ يَحْيَى عَنْ أَبِي سَلَمَةَ

ہم سے ابو نعیم فضل بن دکین نے بیان کیا، کہا، ہم سے شیبان نے بیان کیا، انھوں نے یحییٰ ابن ابی کثیر سے، انھوں نے

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ خُرَاعَةَ قَتَلُوا أَحْبَلًا مِنْ بَنِي لَيْثٍ عَامَ فَتْحِ مَكَّةَ بِقَتْلِ مَنْهَرَقَتِ لَوْهٍ،

ابو ہریرہ سے، انھوں نے ابو ہریرہ سے کہ خُرَاعَةُ نے (جو ایک قبیلہ ہے) بنی لیت (قبیلہ) کے ایک شخص کو اس سال مار ڈالا جس سال

فَاخْبَرِ بِذَلِكَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَرَكِبَ رَاحِلَتَهُ فَخَطَبَ فَقَالَ إِنَّ اللَّهَ

کو فتح ہوا، اپنے ایک غول کے بدلے جو بنی لیت نے ان کا کیا تھا، اس کی خبر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دی گئی، آپ اپنی اونٹنی پر

حَبَسَ عَنْ مَكَّةَ الْقَتْلَ أَوْ الْفَيْلَ، قَالَ مُحَمَّدٌ وَاجْعَلُوهُ عَلَى الشَّلِكِ كَذَاقَالِ أَبُو نَعِيمٍ

سوار ہوئے اور خطبہ پڑھا، پھر فرمایا: اللہ تعالیٰ نے کہ سے قتل یا فیل (ہاتھوں) کو رک دیا، امام بخاری نے کہا، اس لفظ کو

الْقَتْلَ أَوْ الْفَيْلَ وَغَيْرُهُ يَقُولُ الْفَيْلَ

شک ہی کے ساتھ رکھو، ابو نعیم نے یوں ہی کہا قتل یا فیل، امام ابو نعیم کے سوا اور لوگوں نے فیل کہا ہے (شک نہیں کی)۔

ان سے سوالات ہوئے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کا جواب دیا کہ کتاب تو کوئی نہیں سوائے کتاب اللہ کے، ہاں! اللہ نے ایک نہم

ہم کو دی ہے اس سے ہم مسائل نکال لیتے ہیں، ہاں ایک مختصر سوانح ہے جو تنویر کی میان میں رکھا ہوا ہے، پوچھا گیا کہ

اس میں کیا لکھا ہے؟ فرمایا: العقل، یعنی دیت کے مسائل، اور بعض روایات میں ہے: فضائل الصدقات و

نکات الاسیر، تیری کوتاہی سے چھڑاؤ۔

معلوم ہوا کہ روانہ نے جو مشہور کر رکھا تھا وہ صحیح نہیں تھا (۱)

قولا ولا يقتل مسلما بکافر، اس میں علما کا اختلاف ہے کہ کافر کے بدلے مسلم قتل کیا جائے گا یا نہیں،

ائمہ ثلاثہ، امام شافعی، امام مالک، امام احمد ابن حنبل کہتے ہیں کہ اگر ذمی کو یا معاہدہ مسلمان کو قتل کر دیا تو قصاص میں

قتل نہیں کیا جائے گا، اور امام ابو حنیفہ کہتے ہیں کہ قتل کیا جائے گا، ترمذی کی حدیث ہے: اللهم ما لنا وعليهم

ما جلینا۔ یعنی معاہدے سے ان کی تمام چیزیں محفوظ ہو گئی ہیں اور جب ہم قصاص میں قتل نہ کریں گے تو ذی معاہدہ

(۱) واہ چونکہ یہ تفسیر کے قائل ہیں، کہہ دیں گے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے تفسیر کر لیا اور انکار کر دیا، ورنہ

حقیقت وہی ہے جو ہم نے کہی، ۱۲ (جامع تقریر)

وَسَلِّطْ عَلَيْهِمْ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالْمُؤْمِنُونَ الْأَوَّابُونَ لِحَلِّ أَحَدٍ قَبْلِي
اور اللہ کے رسول اور مسلمان ان پر غالب آگئے (یعنی کہ کافروں پر اس رکھو! کہ مجھ سے پہلے کسی کے لئے حلال نہیں ہوا، نہ میرے بعد کسی کے لئے حلال
وَلَا لِحَلِّ أَحَدٍ بَعْدِي الْأَوَّابُونَ لِحَلِّ سَاعَةٍ مِّنْ نَّهَارٍ الْأَوَّابُونَ سَاعَتِي هَذَا حَرَامٌ
ہوگا، سن رکھو! میرے لئے بھی وہ ایک گھڑی دن کی حلال ہوگا، پس رکھو! کہ اس وقت حرام ہے، وہاں کے کانٹے نہ کاٹنے جائیں، اور
لَا يَخْتَلِي شَوْكُهَا وَلَا يَعْصِدُ شَجَرُهَا وَلَا تَنْقُطُ سَاقُهَا إِلَّا لِمُسْتَدٍّ، فَمَنْ قَتَلَ فَهُوَ بِخَيْرِ
وہاں کے درخت نہ قطع کئے جائیں، اور وہاں کی پڑی ہوئی چیز نہ اٹھائی جائے، مگر جو پہنچنا چاہے (وہ اٹھا سکتا ہے) پس جس کا کوئی عزیز
النَّظَرِ بِنِ اِمَاَنٍ يُعْقَلُ وَاِمَاَنٍ يُقَادُّ اَهْلُ الْقَتْلِ، بِنَجَاءِ رَجُلٍ مِّنْ اَهْلِ اِيْمَانٍ
ارہ جائے اس کو دو میں سے ایک کا اختیار ہے، یا قودیت لے اور یا تعاص (قاتل مقتول کے وارثوں کے حوالہ کیا جائے) اتنے میں کین واولوں میں سے

دم کی حفاظت نہ کر سکیں گے، ذی کافروں وال دیا ہی محفوظ ہے جیسے سلم، صغیر نے کہا کہ کافر سے یہاں کافر جی ملا جو آئے ان شاللہ پوری تحقیق آئے گی
حدیث ۱۱۳: صلح حدیبیہ میں جو معاہدہ ہوا تھا اس میں خزاع کا قیدیہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا صلیف ہو گیا تھا اور بنو ثکاف کے حدیب بن گئے تھے اور
یہ معاہدہ ہو گیا تھا کہ کوئی کسی پر حملہ نہیں کرے گا مگر بنو ثکاف نے غدیر کیا اور خزاع کے ایک شخص کا قتل کر دیا، خزاع نے ایک وفد حضور کی خدمت میں بھیجا، روایت
میں آیا ہے کہ حضور اس وقت دھنور رہے تھے اور ابھی یہ وفد پہنچا نہیں تھا کہ حضور نے فرمایا: مرد کی جائے گی اسے بنی خزاع! عائشہ صدیقہؓ نے عرض کیا: آپ
کس سے کہہ رہے ہیں؟ آپ نے فرمایا: بنو ثکاف نے بدبھدی کی ہے اس کی شکایت لے کر ایک وفد رہا ہے (گویا کہ درمیان کے پر دے ہٹا دے گئے تھے)
اور آپ دیکھ رہے تھے، فتح مکہ کا یہی سبب ہوا تھا، بعد فتح مکہ اس کا اعلان عام ہو گیا۔

اس کے بعد بنو خزاع نے موقع پا کر بنی ثکاف کے ایک شخص کو ان مقام میں قتل کر دیا، اس وقت آپ نے فرمایا: (إِنَّ اللَّهَ حَبَسَ عَنْ هَذِهِ الْقَتْلِ
أَوَّلَ النَّبِيِّ، یعنی قتل کو روک دیا، اصحاب نہیں کو روک دیا، یعنی کوئی حرم میں قتل کا ارتکاب نہیں کر سکتا۔

قَوْلُهُ وَسَلِّطْ عَلَيْهِمْ، یعنی اصحاب نبیل کامیاب نہ ہو سکے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کامیاب ہو گئے۔
قَوْلُهُ وَلَا يَعْصِدُ شَجَرُهَا، اس میں تفصیل ہے کہ وہ جنس نبات سے (یعنی آدمیوں کی لگائی ہوئی کھیتی یا بویا ہو پودا یا پھول) نہ ہو، بلکہ خورد
ہو اور گھاس کھدی ہوئی نہ ہو اور آخر مستثنیٰ ہے۔

قَوْلُهُ وَلَا تَنْقُطُ سَاقُهَا إِلَّا لِمُسْتَدٍّ، اور حرم کی گری پڑی چیز نہ اٹھائی جائے، سو اسے اس کے جس کو پہنچنا چاہے، چونکہ تلاش میں غنیمت کا
منظر ہے اس لئے خصوصیت کے ساتھ اس کا ذکر کر دیا، حج کے زمانہ میں لوگ درود کے ہوتے ہیں کوئی کیسے احتیاط کر سکتا ہے اور کیسے تعزیت ہو سکتی ہے
اس لئے اسی کا لگن تھا کہ آدمی سمجھ کر کہاں تلاش کرتے پھریں، لاؤ استعمال کر لیں، اس لئے سفر فرمایا۔

قَوْلُهُ مَنْ قَتَلَ اِمْرًا يَنْهَى عَنْ قَتْلِ اِمْرَةٍ يَقَادُّ، قودے ہے، جس کے معنی تھاں کے ہیں، بعض روایت میں ہے اِمْرًا يَنْهَى عَنْ قَتْلِ

فَقَالَ اَكْتُبْ لِي يَا رَسُولَ اللَّهِ فَقَالَ اَلْاَبُو الْاَبِي فَلَانِ فَقَالَ رَجُلٌ مِّنْ قُرَيْشٍ اِلَّا اِلْدُخْرِيَا

ایک شخص (ابوشہ) آیا، اس نے عرض کیا: یا رسول اللہ! (آپ نے جو باتیں بیان فرمائیں وہ) مجھ کو لکھ دیجئے، آپ نے فرمایا لوگوں سے اچھا اس کو لکھ دو، قریش کے

رَسُولَ اللَّهِ فَإِنَّا لَجَعَلُهُ فِي بُيُوتِنَا وَقُبُورِنَا فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلَّا اِلْدُخْرِيَا اِلَّا اِلْدُخْرِيَا

ایک شخص (حضرت عباس) نے عرض کیا: یا رسول اللہ! ادھر کاٹنے کی اجازت دیجئے، ہم اس کو گھر میں اور قبر میں لگائے ہیں، آپ نے فرمایا: اچھا ادھر اچھا، ادھر (وہ کانٹے کو)

۱۱۳۔ حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ قَالَ ثَنَا سَفْيَانُ قَالَ ثَنَا عَمْرُو قَالَ أَخْبَرَنِي وَهْبُ بْنُ

ہم سے علی بن عبد اللہ نے بیان کیا، کہا ہم سے سفیان نے بیان کیا، کہا ہم سے عمرو نے بیان کیا، کہا مجھ کو وہب بن نہب نے خبر دی، انھوں نے اپنے بھائی

مَنْبِهِ عَنْ أَخِيهِ قَالَ سَمِعْتُ أَبَا هُرَيْرَةَ يَقُولُ مَا مِنْ أَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

(ہم میں نہ) سے کہا میں نے ابو ہریرہ سے سنا فرماتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں مجھ سے زیادہ حدیث کا روایت کرنے والا کوئی نہیں، البتہ

أَحَدُ أَكْثَرِ حَدِيثًا عَنْهُ مِنِّي إِلَّا مَا كَانَ مِنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو فَإِنَّهُ كَانَ يَكْتُبُ وَلَا اَكْتُبُ

عبد اللہ بن عمرو نے بہت سی حدیثیں روایت کیں ہیں، کیونکہ وہ لکھتے تھے اور میں نہیں لکھتا، وہب بن نہب کے ساتھ اس حدیث کو معمر نے بھی ہمارے روایت کیا

تَابَعَهُ مَعْمَرٌ عَنْ هَمَّامٍ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ

انھوں نے ابو ہریرہ سے

۱۱۴۔ حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ سُلَيْمَانَ قَالَ حَدَّثَنِي بْنُ وَهْبٍ قَالَ أَخْبَرَنِي يُونُسُ عَنْ ابْنِ

ہم سے یحییٰ بن سلیمان نے بیان کیا، کہا مجھ سے وہب نے بیان کیا، کہا یونس کو یونس نے خبر دی، انھوں نے ابن شہاب سے، انھوں نے عبید اللہ

شَهَابٍ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ عَنْ بَنِي عَمَّاسٍ قَالَ لَمَّا اشْتَدَّ بِالنَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَجَعُ

بن عبد اللہ سے، انھوں نے ابن عباس سے، کہا جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیمار ہوئے، تو آپ نے امی بیماری کی سختی میں

وَأَمَّا ابْنُ بَقْلَدٍ (بائل کیا جائے یا قصاص لیا جائے، تو اب یہ پہلے کے برعکس ہو گیا۔

مراویہ ہے کہ دو دونوں میں وہ مختار ہے، چاہے دیتے چاہے قصاص۔ اس کے بعد اس معاملہ میں آپ نے اپنے پاس سے دیت (خون بہا) دی

مخاوی نے اسے بہت تفصیل سے لکھا ہے کہ زنی بھی اگر قتل کیا جائے تو بھی قصاص یا دیت اے کی لیکن اس استدلال میں کلام ہے، ثابت کرنا

کہ خزانہ سلم تھا اور لیشی تھا، شکل ہے۔

تو لہ اکتسبوا الابن فلان، یہاں سے کتبت کا جواز بھی نکل آیا، اور یہی ترجمہ تھا۔

تو لہ الا الذخر یہ ایک گھاس ہے جو بہت کام آتی تھی چھپتوں کو اس سے پاٹ دیتے تھے جیسے یہاں پھوس اور مکڑے وغیرہ

چھت پاٹ دیتے ہیں، اور قبور کے فصل کو بھرتے تھے۔

قَالَ اَتُوْنِي بِكِتَابٍ اَكْتُبُ لَكُمْ كِتَابًا اَنْضَلُوْا بَعْدَهُ قَالَ عُمَرَانِ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
 فرمایا: لکھئے گا۔ میں تمہارے لئے ایک کتاب لکھوا دوں، جس کے بعد تم گمراہ نہ ہو، حضرت عمرؓ نے کہا: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر بیاری کی سختی ہے اور ہمارے پاس

غلبۃ الوجع وَعِنْدَنَا كِتَابُ اللهِ حَسْبُنَا فَاخْتَلَفُوا وَكَثُرَ اللَّغْطُ قَالَ قَوْمُوْا عَنِّي وَلَا يَسْبِغِي
 اللہ کی کتاب موجود ہے، وہ جو کہیں کرتی ہے، لوگوں نے اختلاف شروع کر دیا، آپ نے فرمایا: چلو، اٹھو، میرے پاس لڑنے جھگڑنے کا کام، ابن عباسؓ نے
 عِنْدِي التَّارُغُ فَوَجَّحَ بَنُ عَمَّاسٍ يَقُوْلُ اِنَّ الرِّزْيَةَ كُلَّ الرِّزْيَةِ مَا حَالَ بَيْنَ رَسُوْلٍ
 جب یہ حدیث روایت کی، تو یوں کہتے ہوئے نکلے: ہائے مصیبت داسے مصیبت جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کتاب نہ لکھوائے دی۔

الله صلى الله عليه وسلم وَبَيْنَ كِتَابِهِ

حدیث ۱۱۳: تابعہ معمر بنی وہب بن زبید کا کتاب معمر ہے، وہاں اخیر کہا تھا اور یہاں نام لے لیا۔

حدیث ۱۱۴: قولہ اَتُوْنِي بِكِتَابٍ یہ وفات شریف سے چار روز قبل یوم خمیس (جمعہ) کا قصہ ہے، آپ کو اس وقت بہت تکلیف تھی اور اسی حالت
 میں آپ نے فرمایا: تم کا غم گزندہ دوات لاؤ، میں تمہیں لکھوا دوں تاکہ تم بہک سکو، حضرت عمرؓ نے فرمایا: کہ اس وقت حضور پر روح (درد) غالب ہے، اس لئے میں چاہے کہ
 اس وقت تکلیف نہ دیں میرا کہ شین ات ذوات عرض میں شاگرد سے کہے کہ کتاب لاؤ میں پڑھا تاہوں اور شاگرد عرض کرے کہ اس وقت ہمیں دیکھو۔

قَوْلًا عِنْدَنَا كِتَابُ اللهِ حَسْبُنَا، خود قرآن کہتا ہے: مَا ظَنُّنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ، اور جالی احکام کتاب اللہ میں موجود ہیں اور تفصیل احادیث میں
 قَوْلًا فَاخْتَلَفُوا، یہ اختلاف ایسا ہی ہے جیسا کہ (الصلحین لحد العصر الاثنی عشر فیہ) (تم میں سے کوئی بھی عسکر نماز پڑھے لیکن بنی قرظین میں)
 کی مراء جھگڑے میں ہوا تھا، اس موقع پر مجاہدین دو گروہ ہو گئے تھے اسی طرح یہاں بھی دو خیال کے لوگ ہو گئے، ایک خیال کے لوگوں نے کہا لاؤ، دوسرے خیال کے
 لوگوں نے کہا اس وقت تکلیف نہ دو۔ ————— فتح الباری میں سنا احمد سے نقل ہے کہ حضرت علیؓ کو حکم دیا تھا، اور مناسب بھی یہی معلوم ہوتا ہے کیونکہ یہ بہت
 نبوی سے تھے، شیعوں نے خوب پروپیگنڈا کیا اور حضرت عمرؓ کو ہف ملاحت بنایا اور انوس ہے کہ کچھ اہل سنت بھی ان کے ہتے چڑھ گئے، ان لوگوں نے ناہمی سے یہ کہنا
 کہ حضرت عمرؓ نے روک دیا، حالانکہ ہرگز جمع نہیں، اس لئے کہ حکم کو حضرت علیؓ کو دیا تھا، نہ کہیں گے کہ؟ اور اگر حضرت علیؓ اس وقت بھی مغلوب تھے تو کس بنا پر
 ان کو اس لئے کہتے جو جب حضورؐ کے مقابل میں ٹھکرا سناں نہ سکے اگر نہ راہ کی روایت نہ بھی ہوتی تو بھی اہل بیت کو تمیل کرنی ہی چاہئے تھی، اس تقدیر پر یہ سب
 خطا وار ظہر ہے، پھر یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ اگر وہ کوئی دین کی ضروری چیز ہوتی تو خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم برگزیدہ رکئے، بلکہ عمر بنی اللہ عنہ کو دانت
 دیتے اور کاغذ ننگو اگر ضرور لکھوا دیتے، مگر آپ نے ایسا نہیں کیا، معلوم ہوا کہ حضورؐ کی نگاہ میں حضرت عمرؓ کی رائے پسندیدہ تھی اس لئے آپ نے اسے قبول فرمایا، اگر
 لکھی جاتی تو ممکن تھا کچھ ہولت دجالی گمراہ کی تنی اہمیت خود حضورؐ کی نگاہ میں تھی۔ نیز اگر ضروری بھی تھی تو تنہا حضرت عمرؓ کی یوں ذمہ دار قرار دے تھا
 مارے صحابہ مع فاضلان نبوت کے سب ہی قصود دار قرار پائیں گے، اس لئے ہم اندر دئے انصاف و دیانت کسی کو قصود و اہمیتیں سمجھتے، صرف رائے کا اختلاف
 ہوا، حضورؐ نے عمر بنی اللہ عنہ کی رائے قبول فرمائی اور بات ختم ہو گئی، اہل بیت نے بھی اسے اہم نہیں سمجھا وہ نہ کئی دن آپ حیات رہے، حضرت علیؓ بھی نہ

بَابُ الْعِلْمِ وَالْعِظَةِ بِاللَّيْلِ (رات کے وقت تسلیم اور وعظ)

۱۱۵۔ حَدَّثَنَا صَدَقَةُ قَالَ أَخْبَرَنَا ابْنُ عُيَيْنَةَ عَنْ مَعْمَرٍ عَنِ الزُّهْرِيِّ عَنْ هُنْدٍ عَنْ أُمِّ سَلَمَةَ

ہم سے سعد بن نفل نے بیان کیا کہ ایک کنبیاء بن عیینہ نے زہریؒ سے انھوں نے زہریؒ سے انھوں نے سند بنت ۵ سے انھوں نے

ح وَعَمْرِو وَيُحْيَى بْنِ سَعِيدٍ عَنِ الزُّهْرِيِّ عَنْ أُمِّ سَلَمَةَ عَنْ أُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ اسْتَقِظَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ

ہم سے۔ دم بن سند اور سفیان بن عیینہ سے اس کو زہریؒ نے بیان کیا کہ ایک کنبیاء بن عیینہ نے زہریؒ سے انھوں نے سند بنت ۵ سے انھوں نے

وَسَلَّمَ ذَاتَ لَيْلَةٍ فَقَالَ سُبْحَانَ اللَّهِ مَاذَا أُنْزِلَ اللَّيْلَةَ مِنَ الْفَقْرِ وَمَاذَا فَتَحَ مِنَ الْخَزَائِنِ يَقُولُ

اور اسے۔ ما۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رات (بند سے) جاتے تو فرمایا: سبحان اللہ! آج رات کو (آسمان سے دنیا میں) کیا کھلتے (آسمان سے) (غدا) اور کیا (رحمت کے)

صَوَابِ الْحُجْرَةِ كَأَسِيَةٍ فِي الدُّنْيَا عَارِيَةٍ فِي الْآخِرَةِ.

خزانے کھلے (اے لوگو! ان حُجْرَتِ اَللَّوْلِیِّوں میں) کس بات کے لئے جگاؤ؟ بہت کاموں میں دنیا میں اپنے لئے رہتے ہیں، آخرت میں نئی ہوں گی۔

اور اسے ٹھہرے کی رات حضرت عباسؓ یا ابن عباسؓ نے دوسرے وقت کیوں نہ مذہب کیا؟ نماز و قیام و رات تھوڑے ہی حاضر رہتے تھے اور یہ حضرت امیرِ مومنینؓ تھے

معلوم ہوا کہ ان کی نگاہ میں مسجد کی بہت تھی۔ بعد میں انھوں نے حضرت عمرؓ کی طرف اشارہ کیا کہ ہم نے اپنے لئے ایک جگہ حیرت انگیز کیا کہ آپ حضرت علیؓ کی خلافت کے لئے کھڑا

چاہتے تھے، حالانکہ کچھ لوگ اس کے بھی مخالف ہیں کہ حضرت ابو بکرؓ کی مخالفت کے لئے کھڑے تھے اور اسی تیس سے کام لیا جائے کہ خلافت کے متعلق کھڑے تھے؛ لیکن علیؓ کی وجہ سے کس

قدیم ہوا جو حدیث یہ ہے کہ آپؐ عائشہ صدیقہؓ نے انھیں سے فرمایا کہ ہاں! اپنے بھائی اور ابو بکرؓ کو یاد کرو کہ وہ دو ابو بکرؓ کے ہوا کہ آپؐ کے لئے اللہ انکار کرتا ہے (یعنی کسی اور کی

خلافت تسلیم نہیں کرتا) اسی طرح ایمان دار لوگ بھی لاؤ، خلافت یہ نہ لکھیں کہ ان کے لئے دلائل تھے کہ وہ اپنے تئیں قرین سے تو ہم بھی کہیں گے کہ ابو بکرؓ کے لئے تھے۔

تو لا خورج ابن عباسؓ اس طرح سے ہم تو اسے کہہ رہے ہیں کہ اس وقت تو جو تھے قرینہ درست نہیں بلکہ اقدار کے بعد وفات نبویؐ جس مکان میں حدیث بیان کر رہے تھے،

وہاں یہ کہتے ہوئے نکلے کہ بہت بڑا معاملہ ہے جو حال ہو رہا اور کہنے لگا: یا۔

بَابُ الْعِلْمِ وَالْعِظَةِ بِاللَّيْلِ

یعنی رات کے وقت علم اور وعظ کی باتیں بتلانا، چکر گوشہ کے بعد صبح کی مانند ہے اس لئے ممکن ہے کہیں اس سے دھوکہ نہ ہو (کہ علم کی بات بھی نہیں کی جاسکتی)

اگر کہتا ہے کہ (علم کی بات کرنا بدعت بھی) درست ہے۔

حدیث ۱۱۵: قَوْلَا مَاذَا أُنْزِلَ اللَّيْلَةَ مِنْ الْفَقْرِ وَمَاذَا فَتَحَ مِنَ الْخَزَائِنِ يَقُولُ

قَوْلَا مَاذَا فَتَحَ مِنَ الْخَزَائِنِ يَقُولُ صَوَابِ الْحُجْرَةِ كَأَسِيَةٍ فِي الدُّنْيَا عَارِيَةٍ فِي الْآخِرَةِ. اُنْزِلَ فَرَمَا: اِقْطَعُوا صَوَابِ

الحُجْرَةِ زَجْرَةً وَابْنِ كَلْبَةَ دُو، تاکہ جو روح الی اللہ اور توبہ و تضرع کر لیں، یہ رات اجابت کا ہے۔

قَوْلَا فَرُبَّ كَأَسِيَةٍ فِي الدُّنْيَا عَارِيَةٍ فِي الْآخِرَةِ. یہ طور و عطا ہے کہ یہاں سب کچھ اور

بَابُ السَّمْرِ بِالْعِلْمِ

(باب) رات کو علم کی باتیں کرنا

۱۱۶- حَدَّثَنَا سَعِيدُ بْنُ عَفِيرٍ قَالَ حَدَّثَنِي اللَّيْثُ قَالَ حَدَّثَنِي

ہم سے سعید بن عفیر نے بیان کیا، کہا مجھ سے لیث نے بیان کیا۔ کہا مجھ سے عبد الرحمن
عَبْدُ الرَّحْمَنِ بْنُ خَالِدِ بْنِ مُسَافِرٍ عَنْ ابْنِ شَهَابٍ عَنْ سَالِمِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ
بن خالد بن مسافر نے انھوں نے ابن شہاب سے انھوں نے سالم بن عبد اللہ اور ابوبکر
بَكْرِ بْنِ سُلَيْمَانَ بْنِ أَبِي حَتْمَةَ أَنَّ عَبْدَ اللَّهِ بْنَ عُمَرَ قَالَ صَلَّى لَنَا النَّبِيُّ
ابن سلیمان ابن ابی حتمہ سے انھوں نے کہا عبد اللہ بن عمر نے بیان کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْعِشَاءَ فِي الْخُرَجِيَّاتِ فَلَمَّا سَلَّمَ قَامَ فَقَالَ أَرَأَيْتُمْ
نے اپنی آہستہ عمر میں ہم کو عشاء کی نماز پڑھائی، جب سلام پھیرا تو کھڑے ہوئے اور فرمایا
لَيْلَتَكُمْ هَذِهِ فَإِنَّ رَأْسَ مِائَةِ سَنَةٍ مِّنْهَا لَا يَبْقَى مِمَّنْ هُوَ عَلَى ظَهْرِ الْأَرْضِ
کیا تم نے اس رات کو دیکھا (اسے یاد رکھنا) اب سے سو برس کے بعد جسے لوگ اس وقت زمین پر ہیں

أَحَدٌ

ان میں سے کوئی نہیں رہے گا۔

اگلے بے سوسالان معلوم ہوگا رات کو حفظ ہو سکتا ہے اور یہی ترجمہ تھا۔

بَابُ السَّمْرِ بِالْعِلْمِ (۸۳)

حدیث ۱۱۶ قولہ :- فَإِنَّ رَأْسَ مِائَةِ سَنَةٍ مِّنْهَا لَا يَبْقَى مِمَّنْ هُوَ عَلَى ظَهْرِ الْأَرْضِ

یعنی آج کی رات سے سو سال تک اور اسکے اندر اندر سب لوگ جو اس وقت موجود ہیں فنا ہو جائیں گے۔ اور بعض روایات
میں ہے کہ یہ واقعہ وفات سے ایک ماہ قبل کا ہے، لہذا اسلئے ہم سب کو ختم ہو جانا چاہیے اس کا صحیح مطلب یہ ہے
کہ اس رات میں جو لوگ موجود ہیں ان میں سے کوئی نہ ہوگا، چنانچہ یہ پیشین گوئی پوری ہوئی، اسے ساعت و سحری کہتے ہیں،
یعنی ایک قرن کی قیامت اور ساعت صغریٰ من مات فقد قیامت قیامت (جو مر گیا اس کی قیامت آگئی) اور ساعت کبریٰ،
کل عالم کا فنا ہو جانا،

۱۱۔ حَدَّثَنَا آدَمُ قَالَ ثَنَا شُعْبَةُ قَالَ ثَنَا الْحَكَمُ قَالَ سَمِعْتُ سَعِيدَ

ہم سے آدم نے بیان کیا کہا ہم سے شعبہ نے بیان کیا کہا ہم سے حکم نے بیان کیا کہا میں نے سعید بن جبیر سے سنا انھوں نے ابن عباس سے کہا میں ایک رات کو اپنی خالہ میمونہ بنت حارث کے پاس سویا زوج النبی صلی اللہ علیہ وسلم وكان النبی صلی اللہ علیہ وسلم جوبی بی تھیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی، اور اس رات کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی انھیں عندہا فی لیلتها فصلی النبی صلی اللہ علیہ وسلم العشاء ثم جاء الی کے پاس تھے (انہی باری تھی) آپ نے عشاء کی نماز پڑھی پھر (مسجد) گھر آئے اور چار رکعتیں منزله فصلی اربع رکعات ثم نام ثم قام ثم قال نام الغلیم او کلمۃ پڑھیں پھر سو رہے پھر بیدار ہو کر اٹھے، اور فرمایا: بچہ کیا سو گیا، یا کچھ ایسا ہی فرمایا پھر (نماز کیلئے)

اس سوال کے بعد کسی کے زندہ باقی نہ رہنے پر سوال پیدا ہوا کہ خضر بھی زندہ ہیں یا نہیں۔ بہت سے عالم صوفیہ زندہ مانتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ ہم ان سے ملاقاتیں کرتے ہیں، تو اب ہم کس کس کو جھٹلائیں اسلئے اس حدیث سے انھیں سستی کرتے ہیں، کہ ممکن ہے کہ وہ اس وقت زمین پر نہ ہوں اور حضور نے علی ظہر الارض فرمایا ہے، تو خضر اس سے نکل گئے یا حدیث کا یہ مطلب ہے کہ جو روئے زمین پر نظر آتے ہیں حضور نے انکے بارے میں فرمایا ہے باقی جو مغیب ہیں انکا یہاں ذکر نہیں ہے، اور خضر مغیب ہیں، لہذا انکا بیان نہیں ہے۔ خضر کا مستجاب الدعوات ہونا نصوص سے ثابت نہیں ہوتا۔

امام بخاری انھیں زندہ نہیں مانتے جیسا کہ آگے آئے گا اور جمہور صوفیہ کا قول یہ ہے کہ وہ زندہ ہیں۔ حافظ نے قرطبی سے نقل کیا ہے کہ اس پر اتفاق ہے کہ وہ رسول نہیں ہیں مگر دوسرے مقام پر تین چار قول نقل کر دئے ہیں۔ نبی۔ رسول۔ ولی۔ ملک،

حدیث ۱۱۔ قولہ: فصلی اللہ علیہ وسلم العشاء، بعض نے کہا کہ یہ بعد عشاء کی سنتیں ہیں، وتر سے پہلے کی

رکعات نہیں ہیں، اسکی مفصل بحث باب الوتر میں آئیگی،

قولہ: فجعلنی عن یمینہ بخاری نے اس حدیث سے تین مسئلے نکالے کہ اصل موقف یمن ہے،

تَشْبَهُهَا ثُمَّ قَامَ فَقُمْتُ عَنْ يَسَارِهِ فَجَعَلَنِي عَنْ يَمِينِهِ فَصَلَّى خَمْسَ
 كَهْرُطَةٍ هُوَ فِي يَمِينِ بَيْتِهِ (اور) آپ کی بائیں طرف کھڑا ہوا۔ آپ نے مجھ کو اپنی دائیں طرف کر لیا اور پانچ رکعتیں
 رَكَعَاتٍ ثُمَّ صَلَّى رَكْعَتَيْنِ ثُمَّ نَامَ حَتَّى سَمِعْتُ غَطِيطَهُ أَوْ خَطِيطَهُ ثُمَّ
 پڑھیں۔ پھر دو رکعتیں (غیر کی سنتیں) پڑھیں پھر آپ سو گئے یہاں تک کہ میں نے آپ کے خراٹے کی آواز
 خَرَجَ إِلَى الصَّلَاةِ
 سنی پھر (صبح کی نماز کے لئے) برآمد ہوئے

مگر جائز تینوں ہیں۔ یمن۔ یسار۔ خلف،

قوله فصلی خمس رکعات یہ روایت مختصر ہے، مطول میں ثابت ہے کہ تیرہ رکعات پڑھیں، غطیط۔
 خراٹے، خطیط۔ کم درجہ کے خراٹے۔ یہاں بظاہر حدیث کو ترجمۃ الباب سے کچھ مناسبت نہیں، بعض نے کہا (کوفی وغیرہ
 نے) کہ نام الغایۃ سمر ہے [اور اسی سے سمرنی العلم کے جواز پر استدلال ہے] حالانکہ اسے سمر نہیں کہا جاتا، سمر اصل لغت
 میں چاند کی چاندنی کو کہتے ہیں [پھر چاندنی رات میں انسان کوئی کو سمر کہنے لگے] سمر میں کلام معتد بہ ہونا چاہیے، اور وہ قبل نوم
 ہوتا ہے، اور یہاں بعد نوم ہے، اسلئے مناسبت ظاہر نہیں۔ مگر بخاری وراصل امتحان کیا کرتے ہیں کہ طالب علم کہاں تک
 متبع کرتا ہے۔ انھوں نے تو مگر ردال دیئے ہیں۔ ابن حجر نے کہا ہماری سمجھ میں حدیث کو باجیہ مناسبت ہے کہ بخاری ہی حدیث
 کتاب التفسیر میں بھی لائے ہیں، وہاں پر ہے فتحدت مع اھلہ ساعة (اپنی بیوی مقررہ سے کچھ دیر بات کی) ثم نام
 (پھر سو گئے) اب ترجمہ نکل آیا، تو گویا بخاری اشارہ کر رہے ہیں کہ اسے تلاش کرو، کہیں نہ کہیں ضرور ملے گا۔ یہ ابن حجر
 ہی کا کام ہے کہ متبع کر کے نکال لیا۔ ورنہ بعضوں نے تو کہہ دیا کہ کوئی مناسبت نہیں، اور اس سے سمرنی العلم اس طرح نکلے گا
 کہ فتحدت مع الاھل امر مباح ہے پس جب امر مباح میں سمر جائز ہوا، تو سمرنی العلم بطریق اولیٰ درست ہوگا، اس طرح
 حدیث سے ترجمۃ الباب کا ثبوت ہو گیا

بَابُ حِفْظِ الْعِلْمِ

باب علم کو یاد رکھنا

۱۱۸۔ حَدَّثَنَا عَبْدُ الْعَزِيزُ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ قَالَ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ

ابن شہاب سے بیان کیا عبد العزیز بن عبد اللہ نے کہا مجھ سے امام مالک نے بیان کیا انہوں نے

ابن شہاب عن الأعرج عن أبي هريرة قال إن الناس يقولون

اكثر أبو هريرة ولو لا إتيان في كتاب الله ما حدثت حديثاً ثم يتلو

بیان کیس اور بات یہ ہے کہ اگر اللہ کی کتاب میں یہ دو آیتیں نہ ہوتیں تو میں کوئی حدیث بیان نہ کرتا، پھر (سورہ بقرہ کی)

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَىٰ إِلَىٰ قَوْلِهِ الرَّحِيمِ

یہ آیت پڑھتے جو لوگ چھپاتے ہیں ان کھلی ہوئی نشانیوں اور ہدایت کی باتوں کو جو ہم نے اتاریں (غیر تکبینی

إِنَّ إِخْوَانَنَا مِنَ الْمُهَاجِرِينَ كَانَ يَشْغَلُهُمُ الصَّفْقُ بِالْأَسْوَاقِ وَإِنَّ

انا التواب الرحیم تک) ہمارے بھائی مہاجرین تو بازاروں میں خرید و فروخت میں پھنسے رہتے اور ہمارے انصاری بھائی

إِخْوَانَنَا مِنَ الْأَنْصَارِ كَانَ يَشْغَلُهُمُ الْعَمَلُ فِي أَمْوَالِهِمْ وَإِنَّ أَبَاهُ هِرَيْرَةَ

اپنی کھیتی باڑی کے کام میں لگے رہتے، اور ابو ہریرہ (نہ کوئی پیشہ کرتا تھا نہ سوداگری) وہ اپنا پیٹ بھرنے کے لئے غنیمت

كَانَ يَلْزَمُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِشَبَعِ بَطْنِهِ وَيَحْضُرُ

مکے اللہ علیہ وسلم کے پاس جمارہتا اور ایسے موقعوں پر حاضر رہتا جہاں یہ لوگ حاضر نہ رہتے، اور وہ باتیں

مَا لَا يَحْضُرُونَ وَيَحْفَظُ مَا لَا يَحْفَظُونَ،

یاد رکھتا جو وہ لوگ یاد نہ رکھتے،

بَابُ حِفْظِ الْعِلْمِ (۸۴)

(حدیث ۱۱۸) قولہ :- إِنَّ النَّاسَ الْغُلَامَ مَعْلُومٌ ہوتا ہے کہ [حقیقت سے ناواقف لوگ] ابو ہریرہ

پر شروع ہی سے اعتراض کرتے آئے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ کل تین سال تو وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے

۱۱۹۔ حَدَّثَنَا أَبُو مُصْعَبٍ أَحْمَدُ بْنُ أَبِي بَكْرٍ قَالَ ثنا مُحَمَّدُ بْنُ

ہم سے ابو مصعب احمد بن ابی بکر نے بیان کیا کہ ہم سے محمد بن ابراہیم ابن دینار
ابراہیم بن دینار عن ابن ابی ذئب عن سَعِيدِ الْمُقْبَرِيِّ عَنْ
نے بیان کیا انھوں نے محمد بن ابی ذئب سے انھوں نے سعید مقبری سے انھوں نے ابو ہریرہ سے
ابن ہُرَيْرَةَ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنِّي أَسْمَعُ مِنْكَ حَدِيثًا كَثِيرًا
کہا میں نے عرض کیا یا رسول اللہ میں آپ سے بہت باتیں سنتا ہوں انکو بھول جاتا ہوں
أَنْسَاهُ قَالَ ابْسُطْ رِدْءَكَ فَبَسَطْتُهُ فَعَرَفَ بِيَدَيْهِ ثُمَّ قَالَ ضُمَّ
آپ نے فرمایا اپنی چادر بچھا، میں نے بچھائی آپ نے اپنے دونوں ہاتھ سے ایک پلے کر
فَضَمُّهُ فَمَا لَسَيْتُ شَيْئًا بَعْدُ۔

اس میں ڈال دیا پھر فرمایا اسکو لپیٹ لے (یا اپنے سینے سے لگالے) میں نے پیٹ لیا (یا اپنے سینے سے لگالیا) اسکے بعد میں کوئی چیز بھولا

۱۲۰۔ حَدَّثَنَا ابْرَاهِيمُ بْنُ السُّنْدِ رِ قَالَ حَدَّثَنَا ابْنُ أَبِي فَدْيِكٍ

ہم سے ابراہیم بن منذر نے بیان کیا، کہا ہم سے ابن ابی فدیك نے یہی حدیث بیان کی اس
بِهَذَا أَوْ قَالَ فَعَرَفَ بِيَدَيْهِ فِيهِ۔
روایت میں یہ ہے کہ آپ نے ہاتھ سے چلو لیکر اسیں ڈال دیا۔

اور اتنی زیادہ حدیثیں نقل کرتے ہیں، اس کا جواب خود ابو ہریرہؓ یہ دیتے ہیں کہ کتمان علم حرام ہے اور مجھ پر احادیث کا بیان
کرنا واجب ہے، کَمَا قَالَ اللَّهُ تَعَالَى: إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُمُونَ مَا آتَيْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَى الْآيَةِ،
یہ آیت اسی لئے پڑھی کہ کتمان درست نہیں۔ پھر خود ہی [کثرت روایت] کی وجہ بھی بتادی کہ ہمارے بھائی مہاجرین و انصار
اپنے اپنے مشاغل میں مصروف رہتے تھے، ان کو حضور کے پاس حاضری کا وقت کم ملتا تھا، اور میرا حال یہ تھا کہ میں ہر وقت
حضور ہی کے ساتھ چمٹا رہتا تھا، میرے پاس کوئی دوسرا کوئی مشغلہ یا دھند ہا تھا ہی نہیں، اس لئے میں پوری فراغت سے
ہر بات سنتا تھا۔

(حدیث ۱۱۹) اسکے علاوہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک دوسری خصوصی عنایت بھی مجھ کی تھی
کہ آپ نے اپنے دست مبارک سے میری چادر میں کچھ ڈال دیا تھا، ہاتھ بظاہر خالی تھا مگر اس میں علم کے خزانے تھے،

۱۲۱- حَدَّثَنَا سَعِيدٌ قَالَ حَدَّثَنِي أَخِي عَنْ ابْنِ أَبِي ذئْبٍ

ہم سے اسماعیل بن ابی اویس نے بیان کیا کہ مجھ سے میرے بھائی (عبد الحمید نے) بیان کیا انھوں نے ابن
عَنْ سَعِيدِ الْمُقْبِرِيِّ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ حَفِظْتُ مِنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ
ابن ذئب سے انھوں نے سعید مقبری سے انھوں نے ابو ہریرہ سے کہا میں نے (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے) علم کے
عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَعَائِيْن فَمَا أَحَدُهُمَا فَبَشَّتُهُ وَأَمَّا الْآخَرُ فَلَوْ بَشَّتُهُ
دو پھیلے سیکے، یعنی دو طرح کے علم حاصل کئے ایک کو میں نے (لوگوں میں) پھیلا دیا اور دوسرے کو اگر میں پھیلا دوں
قَطَعَ هَذَا الْبَلْعُومُ

تو میرا بلعوم کاٹ ڈالا جائے،

قَالَ أَبُو عَبْدِ اللَّهِ الْبَلْعُومُ حَجَرِي الطَّعَامِ،
امام بخاری نے کہا بلعوم (نر خرا) وہ ہے جس سے کھانا اترتا ہے،

بَابُ الْأَنْصَابِ لِلْعُلَمَاءِ -
(باب) عالموں کی بات سننے کیلئے خاموش رہنا،

۱۲۲- حَدَّثَنَا حُجَّاجٌ قَالَ ثَنَا شُعْبَةُ قَالَ أَخْبَرَنِي عَلِيُّ بْنُ مُدْرِكٍ

ہم سے حجاج نے بیان کیا کہ ہم سے شعبہ نے بیان کیا کہ خبر دی مجھے کو علی بن مدرک نے انھوں نے

اس کا فائدہ یہ ہوا کہ اسکے بعد سے حضور کی کوئی بات بھولنا نہ تھا، اسلئے میرے پاس ذخیرہ حدیث بہت تھا، اور چھپانا منع تھا
اسلئے میں نے سب ہی کچھ امت کو پہونچا دیا۔

(حدیث ۱۲۱) قولہ :- حَفِظْتُ مِنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَعَائِيْن یعنی
اتنا علم کہ اگر اسکو کسی ظرف میں بھرا جائے تو بڑے بڑے دو برتن بھر جائیں دو برتن بایں طور کہ ایک ظاہر سے تعلق رکھتا تھا
اور دوسرا اسرار دین سے۔

قولہ :- قَطَعَ هَذَا الْبَلْعُومُ صوفیہ اس سے وحدۃ الوجود وغیرہ مراد لیتے ہیں مگر یہ صحیح نہیں، کیونکہ روایات میں تصریح
ہے کہ یہ اسرار منافقین اور فتنہ وغیرہ تھے جو حضور نے انھیں بتائے تھے، چونکہ انکا تعلق تبلیغ سے نہ تھا اسلئے انھیں بیان نہیں کیا۔
یہ نمونہ شین کی تصریح ہے،
بَابُ الْأَنْصَابِ لِلْعُلَمَاءِ
یعنی جب علماء کچھ بیان کریں تو لوگوں کو [چپ ہو جانا چاہیئے اور خاموشی سے سننا چاہیئے]

عَنْ أَبِي ذُرْعَةَ عَنْ جَرِيرَانَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَهُ

ابوزرعه سے انھوں نے جریر سے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں ان سے فرمایا لوگوں کو خاموش کر
فِي حَجَّةِ الْوُدَاعِ اسْتَنْصَتِ النَّاسَ فَقَالَ لَا تَرْجِعُوا بَعْدِي كُفَّارًا
(جب جریر نے خاموش کر دیا) تو آپ نے فرمایا (لوگو) میرے بعد ایک دوسرے کی گز نہیں مار کر

يَضْرِبُ بَعْضُكُمْ رِقَابَ بَعْضٍ

کافر نہ بن جائے،

بَابُ مَا يَسْتَحِبُّ لِلْعَالِمِ إِذَا سُئِلَ أَيْ النَّاسِ أَعْلَمُ فَيَكِلُ لِعِلْمِ اللَّهِ تَعَالَى

باب - جب عالم سے یہ پوچھا جائے کہ سب لوگوں میں بڑا عالم کون ہے تو اسکو یوں کہنا چاہیے کہ

اللہ کو معلوم ہے۔

۱۲۳- حَدَّثَنَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ مُحَمَّدٍ الْمُسَنِّدِيُّ قَالَ سَأَلْتُهُ

ہم سے عبد اللہ بن محمد مسندی نے بیان کیا کہ ہم سے سفیان نے بیان کیا کہ ہم سے
تَالَتْهُمَا عَمْرُو قَالَ أَخْبَرَنِي سَعِيدُ بْنُ جُبَيْرٍ قَالَ قُلْتُ لِابْنِ عَبَّاسٍ
عمرو بن دینار نے بیان کیا کہ مجھ کو سعید بن جبیر نے خبر دی کہ ہمیں نے ابن عباس سے کہا کہ نوف بجال کہتا ہے کہ

(حدیث ۱۲۲) قولہ :- قَالَ لَهُ فِي حَجَّةِ الْوُدَاعِ اسْتَنْصَتِ النَّاسَ آپ نے جریر بن عبد اللہ سے

حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا۔ لوگوں کو چپ کرادو اور جب وہ چپ ہو کر آپ کی طرف متوجہ ہو گئے تو فرمایا لَا تَرْجِعُوا الْيَدِیْنِیْ خَلْفَ الْوُجْهِ بہت
طویل ہے مگر بخاری کئی بابوں میں اس کا کوئی کوئی جزو لائے ہیں، کہیں یکجا پورا نہیں لائے، اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مسلمان
کا قتل فعل کفار اور خصلت کفار ہے۔

بعض روایات میں لفظ ضَلَّال آیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ قتل مسلم سے وہ خارج از اسلام نہیں ہوتا اسی بنا پر قتالہ کفر
کہ تاویل کرتے ہیں۔ (۹۷) بَابُ مَا يَسْتَحِبُّ لِلْعَالِمِ

قولہ :- إِذَا سُئِلَ ۖ یعنی اگرچہ سب بڑا عالم ہو، جب اس سے سوال کیا کہ ای الناس اعلم [سب بڑا عالم کون ہے،
یہ سب زیادہ علم کس کو ہے] تو اسکا کہنا چاہیے اللہ اعلم کیونکہ اسکو تمام دنیا کا کیا علم، اس طرح علماء کو تو وضع کی تعلیم دی کہ کوئی اپنے علم پر غویں نہ

(حدیث ۱۲۳) قولہ :- الْمُسَنِّدِيُّ چونکہ ان کی عادت تھی کہ احادیث مسندہ کو تلاش کرتے تھے اس لئے

اَنْ تَوْفَا الْبِكَالِي يَزْعُمَانَنَّ مُوسَى لَيْسَ مُوسَى بَنِي إِسْرَائِيلَ
 وہ موسیٰ (جو خضر کے ساتھ گئے تھے) بنی اسرائیل کے موسیٰ نہیں ہیں بلکہ دو سے موسیٰ (بن میثا) ہیں
 اِنَّمَا هُوَ مُوسَى اخْرَفَقَالَ كَذَبَ عَدُوُّ اللَّهِ حَدَّثَنَا ابْنُ بَنِي كَعْبٍ
 انھوں نے کہا جھوٹا ہے اللہ کا دشمن ہم سے ابی بن کعب نے بیان انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے
 عَنْ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ قَامَ مُوسَى النَّبِيُّ خَطِيبًا فِي
 سُنَا آتٍ نَفَرًا مُوسَى بَنِي إِسْرَائِيلَ فِي خُطْبَةٍ يَرْفَعُ كُفْرًا لَوْ كُفْرًا لَوْ كُفْرًا لَوْ كُفْرًا
 بَنِي إِسْرَائِيلَ فُسِّلَ أَيْ النَّاسِ أَعْلَمُ فَقَالَ أَنَا أَعْلَمُ فَعَتَبَ اللَّهُ
 سب لوگوں میں بڑا عالم کون ہے موسیٰ نے کہا میں بڑا عالم ہوں، اللہ نے ان پر عتاب فرمایا
 عَزَّ وَجَلَّ عَلَيْهِ إِذْ لَمْ يَرِدَّ الْعِلْمُ إِلَيْهِ فَأَوْحَى اللَّهُ إِلَيْهِ أَنْ عَبْدًا آمِنٌ
 کیوں کہ انھوں نے یوں نہیں کہا، اللہ کو معلوم ہے پھر اللہ نے انھیں وحی بھیجی کہ میرا ایک بندہ
 عِبَادِي بِجَمْعِ الْبَحْرَيْنِ هُوَ أَعْلَمُ مِنْكَ قَالَ يَا رَبِّ وَكَيْفَ بِهِ، فَقِيلَ لَهُ
 ہے وہاں جہاں دو دریا (فارس اور روم کے سمندر) ملتے ہیں۔ وہ تجھ سے زیادہ علم رکھتا ہے۔ موسیٰ نے عرض کیا

انھیں ہندی کہنے لگے۔ سفیان سے یہاں ثوری مراد ہیں۔ ابن عیینہ نہیں، [نفع الباری میں ہے کہ ابن عیینہ مراد ہیں]۔

قوله :- نَوْفَا الْبِكَالِي یہ دمشق کے رہنے والے تابعی بہت بڑے عالم تھے، پہلے یہودی تھے، کعب اجار کے طبقے کے ہیں
 سعید بھی تابعی ہیں اور ابن عباس کے تلمیذ ہیں، بحث پر چھڑ گئی تھی کہ حضرت خضر کے واقعہ بن موسیٰ کا ذکر ہے وہ کون ہیں؟ موسیٰ بن غزن
 علیہ السلام، یا موسیٰ بن میثا؟

قوله :- کَذَبَ عَدُوُّ اللَّهِ نَوْفٌ مُسْلِمٌ دَعَا تَعْلَمُ تَعْلَمُ، لوگوں نے انھیں بڑے طبقے سے شمار کیا ہے۔ پھر عدو اللہ
 کیوں کہا؟ تو بعض نے کہا کہ ممکن ہے ابن عباس کو ان کے ایمان میں شبہ رہا ہو، مگر یہ درست نہیں بلکہ یہ ایسا ہی ہے جیسے عداوت میں کسی
 سخت غلطی پر زبر کیلئے بڑا جھوٹے کو سخت کلمہ کہہ دیتا ہے۔ ایسا ہی ابن عباس نے کہہ دیا۔

قوله :- فَعَتَبَ یعنی کچھ عتاب ہوا۔ انبیاء علیہم السلام سے مواخذہ لفظی بھی ہو جاتا ہے، اللہ کو یہ عنوان پسند نہ آیا
 اسلئے عتاب فرمایا گیا، جیسا کہ داؤد علیہ السلام کے لئے بھی قرآن میں آیا ہے۔

قوله :- جَمْعِ الْبَحْرَيْنِ۔ اس میں بہت سے اقوال ہیں۔ شاہ صاحب (علامہ انور شاہ) سے مذکورہ ہوا تو فرمایا

أَحْمِلْ حُوتًا فِي مِثْثَلٍ فَإِذَا أَفْقَدْتَهُ فَهُوَ ثَمَرٌ فَإِنْ طَلَقَ وَانْطَلَقَ

پروردگار میں اس تک کیسے پہنچوں، حکم ہوا کہ ایک مچھلی زمیں میں رکھ لے جہاں وہ مچھل گم ہو جائے وہیں وہ
مَعَهُ بِفَتْاهُ يُوشَعَ بْنِ نُونٍ وَحَمَلَا حُوتًا فِي مِثْثَلٍ حَتَّى كَانَا عِنْدَ الصَّخْرَةِ

ملے گا، پھر موسیٰ علیہ السلام چلے اور ان کے ساتھ انکے خادم یوشع بن نون بھی تھے، اور دونوں نے ایک مچھلی زمیں میں

وَضَعَا رُؤْسَهُمَا فَمَا فَا نَسَلُ الْحُوتِ مِنَ الْمِثْثَلِ فَاتَّخَذَ سَبِيلَهُ فِي الْبَحْرِ

رکھ لی جب دونوں صخرہ کے پاس پہنچے تو اپنے سر (زمین پر) رکھ کر سو گئے۔ مچھلی زمیں سے نکل بھاگی اور دریا میں آئے

سَرَبًا وَكَانَ لِمُوسَى وَفَتْاهُ عَجَبًا فَإِنْ طَلَقَا بَقِيَّةَ لَيْلَتِهِمَا وَيَوْمَهُمَا فَلَمَّا

راستہ لیا، اور موسیٰ اور ان کے خادم کو تعجب ہوا، خیر وہ دونوں ایک رات دن میں جتنا باقی رہا تھا اس میں چلتے رہے

أَصْبَحَ قَالَ مُوسَى لِفَتْاهُ إِنِّي أَخْذُ أَعْمَالًا قَدْ لَقِينَا مِنْ سَفَرِنَا هَذَا انْصَبًا

جب صبح ہوئی تو موسیٰ نے اپنے خادم سے کہا ہمارا ناشتہ لاؤ ہم تو اس سفر سے تھک گئے، اور موسیٰ کو تھکان نے چھوڑا

وَلَمْ يَجِدْ مُوسَى مَسَامِنَ النَّصَبِ حَتَّى جَاوَزَ الْمَكَانَ الَّذِي أُمِرَ بِهِ

بھی نہیں مگر جب اس جگہ سے آگے بڑھ گئے جہاں تک ان کو جانے کا حکم ہوا تھا اس وقت ان کے خادم نے کہا تم نے

فَقَالَ لَهُ فَتَاهُ أَذْأَيْتَ إِذْ أَوَيْنَا إِلَى الصَّخْرَةِ فَإِنِّي نَسِيتُ الْحُوتَ قَالَ مُوسَى

نہیں دیکھا جب ہم صخرہ کے پاس پہنچے تھے تو (مچھلی نکل بھاگی) میں اس کا ذکر کرنا بھول گیا موسیٰ نے کہا تم تو ہی کی

ذَلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ فَإِذَا تَدَنَّ أَعْلَى أَثَارِهِمَا قَصَصًا فَلَمَّا انْتَهَيَا إِلَى الصَّخْرَةِ

تلاش میں تھے آخر وہ دونوں کھوج میں لگاتے ہوئے اپنے پاؤں کے نشاںوں پر لوٹے جب اس صخرہ کے پاس پہنچے

کہ خلیج فارس جو کراچی سے بصرہ تک چلی گئی ہے اور آگے بھی گئی ہے تو جہاں خلیج فارس میں نہر فرات گرتی ہے وہ مجمع البحرین ہے،

قوله .. هُوَ أَعْلَى مَنَظَرٍ، اسی من وجر، کیونکہ ان کو جو زیارت تکوینیہ کا علم تھا اور موسیٰ کو کلیات تشریبیہ کا، اور ظاہر ہے کہ

کلیات تشریبیہ کا علم افضل ہے، لہذا افضل تو یقیناً موسیٰ ہی تھے، مگر چونکہ ان کے منہ سے ایک ایسا لفظ نکل گیا تھا جس سے دعویٰ

مترشح ہوتا تھا، اسلئے زجراً یہ فرمایا گیا، بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ اور یوشع دونوں حضرات سو گئے تھے، لیکن بعض

روایات میں ہے کہ حضرت موسیٰ دیکھ رہے تھے، لہذا ماننا پڑے گا کہ اس وقت وہ جاگ رہے تھے، اگرچہ پہلے سو رہے ہوں۔ مَثَلًا لِرَبِّكَ

قوله وَكَانَ لِمُوسَى وَفَتْاهُ عَجَبًا، راوی نے اس کو مقدم کر دیا ہے ورنہ یہ مؤخر ہے، ————— مسجدی۔۔۔ ۱۲ مغلی،

اِذَا رَجُلٌ مُّسَبِّحٌ بِثَوْبٍ اَوْ قَالَ تَسْبِيحِي بِثَوْبِهِ فَسَلَّمَ مُوسَى فَقَالَ الْخَضِرُ
 دیکھا تو ایک شخص (سوربا) ہے کپڑا پیٹے ہوئے یا کپڑا پیٹے ہے، موسیٰ نے (اس کو سلام کیا، خضر جاگ اٹھے) انھوں
 وَ اِنِّیْ بِاَرْضِكَ السَّلَامُ فَقَالَ اَنَا مُوسٰی، فَقَالَ مُوسٰی بَنٰی اِسْرَآئِیْلُ؟
 نے) کہا تیرے ملک میں سلام کہاں سے آیا؟ موسیٰ نے کہا میں موسیٰ ہوں، خضر نے کہا بنی اسرائیل کے موسیٰ؟
 قَالَ نَعَمْ قَالَ هَلْ اَتَّبَعْتَ عَلٰی اَنْ تَعْلَمَنِیْ مِمَّا عَلِمْتَ رُسُلًا اَقَالَ اِنَّكَ
 انھوں نے کہا ہاں، (پھر) کہا کیا میں تمہارے ساتھ رہ سکتا ہوں اس شرط پر کہ تم کو جو علم کی باتیں سکھائی گئی ہیں
 لَنْ تَسْتَطِیْعَ مَعِیْ صَبْرًا اَیَا مُوسٰی اِنِّیْ عَلٰی عِلْمٍ مِّنْ عِلْمِ اللّٰهِ عَلَمِنِیْ
 وہ مجھ کو سکھلاؤ، خضر نے کہا تم سے میرے ساتھ صبر نہ ہو سکے گا، موسیٰ بات یہ ہے کہ اللہ نے ایک (قسم کا) علم مجھ کو
 لَا تَعْلَمُهُ اَنْتَ، وَاَنْتَ عَلٰی عِلْمِ عَلَمِكَ اللّٰهُ لَا اَعْلَمُهُ، قَالَ سَجَدْنِیْ
 دیا ہے جو تم کو نہیں ہے، اور تم کو ایک (قسم کا) علم دیا ہے جو مجھ کو نہیں ہے، موسیٰ نے کہا اگر خدا چاہے تو ہر درجہ کو صبر کرنے والا
 اِنْ شَاءَ اللّٰهُ صَابِرًا وَّلَا اَعْصِیْ لَكَ اَمْرًا فَاَنْطَلَقَا مِشْیَانِ عَلٰی
 پاؤں گے اور میں کسی کام میں تمہاری نافرمانی نہیں کرنے کا، آخر دونوں سمندر کے کنارے کنارے روانہ ہوئے ان کے پاس
 سَاحِلَ الْبَحْرِ لَیْسَ لَہُمَا سَفِیْنَةٌ فَمَرَّتْ بِہُمَا سَفِیْنَةٌ فَكَلَّمُوہُمْ
 کشتی نہ تھی (کہ سمندر پار جائیں) اتنے میں ایک کشتی ادھر سے گذری، انھوں نے کشتی والوں سے کہا ہلو ہلو سوار کرو،
 اَنْ یَّحْمِلُوہُمْ اَفْعُرُ الْخَضِرُ فَحْمِلُوہُمْ بِغَیْرِ نَوَلٍ فِجَاءٌ عَصْفُورٍ
 خضر کو انھوں نے پہچان لیا اور موسیٰ اور خضر کو بے کرایہ سوار کر لیا، اتنے میں ایک چڑیا آئی اور کشتی کے کنارے بیٹھ کر

قوله وَاِنِّیْ بِاَرْضِكَ السَّلَامُ، یہ کفار کا ملک ہوگا، یا مسلام کے علاوہ کوئی اور آدابِ تہتہ کے ہوں گے، اس سے معلوم ہوا کہ
 خضر کو اس کا علم نہ تھا، باوجودیکہ جزئیاتِ تکوینیہ کے عالم تھے، تو معلوم ہوا کہ علم کی کامیابی نہیں،
 قوله اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِیْعَ اِلَیْ، حضرت خضر یا تو اس سے سمجھے کہ نباہ مشکل ہے، یا اس وجہ سے کہ یہ عالم میں شریعت کے
 اور انہیں کلیات کا علم ہے، میں جزئی علم کے مطابق عمل کروں گا، اور وہ کلیات کے مطابق، لہذا وہ اعتراض کریں اور معاملہ نبھانے لگے گا۔
 قوله اِنْ شَاءَ اللّٰهُ صَابِرًا وَّلَا اَعْصِیْ لَكَ اَمْرًا، موسیٰ علیہ السلام نبی تھے، ان کو شاید یہ خیال بھی نہ تھا کہ خضر جیسا شخص ایسے منکرات کا
 مرتکب ہوگا، اسلئے وعدہ کر لیا، مگر جب منکرات دیکھے تو شانِ نبوت کے تقاضے سے اعتراض کیا،
 قوله فَحْمِلُوہُمْ اَفْعُرُ، معلوم ہوتا ہے کہ کوشش کی معیت میں تک رہی، بعد کو مفارقت ہوگئی کیونکہ آگے کہیں ان کا ذکر نہیں آتا،

فَوَقَّعَ عَلَى حَرْفِ السَّفِينَةِ فَنَقَرَنَقْرَةً أَوْ نَقَرَتَيْنِ فِي الْبَحْرِ فَقَالَ

اس نے ایک یا دو چیزیں سمندر میں ماریں، خضر نے کہا موسیٰ! میرے اور تمہارے علم دونوں نے اللہ کے علم میں سے اتنا

الْخَضِرُ يَا مُوسَى مَا نَقَصَ عَلَيَّ وَعِلْمُكَ مِنْ عِلْمِ اللَّهِ تَعَالَى إِلَّا كَقَفْرَةٍ

یا ہے جیسے اس چڑیا کی چونچ نے سمندر میں سے اس کے بعد خضر کشتی کے تختوں میں سے ایک تختہ کی طرف چلے اور اس کو اٹھ ڈالا،

هَذِهِ الْعَصْفُورُ فِي الْبَحْرِ فَعَمِدَ الْخَضِرُ إِلَى لُوحٍ مِنَ الْأَوَاحِ السَّفِينَةِ

حضرت موسیٰ کہنے لگے ان لوگوں نے تو ہم کو بے گریہ سوار کیا اور تم نے یہ کام کیا کہ ان کی کشتی میں چھید کر دیا،

فَنَزَعَهُ فَقَالَ مُوسَى قَوْمٌ حَمَلُونَا بِغَيْرِ لَوْلٍ عَمَدَتْ إِلَى سَفِينَتِهِمْ

کشتی والوں کو ڈبانا چاہا، خضر نے کہا میں نہیں کہہ چکا تھا کہ تم سے میرے ساتھ صبر نہیں ہونے کا،

فَحَرَقَتْهَا لِتَغْرُقَ أَهْلَهَا قَالَ الْمَاقِلُ إِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا

موسیٰ نے کہا بھول چوک پر میری گرفت نہ کرو اور میرے کام کو مشکل میں نہ پھنساؤ،

قَالَ لَا تَوَاخِذْنِي بِمَا نَسِيتُ وَلَا تُرْهِقْنِي مِنْ أَمْرِي عُسْرًا

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ پہلا اعتراض تو موسیٰ کے سبھو لے ہی سے تھا

اس وقت تختہ نکالا۔

قوله :- ما نقص الله به مطلب نہیں کہ اللہ کے علم میں سے اتنا کم ہو گیا، یہ تو دنیا کے اہل میں بھی نہیں ہوتا، بلکہ مطلب یہ ہے کہ

جیسے اس تری کی کوئی حقیقت نہیں سمندر کے پانی کے مقابلے میں، اسی طرح انسانی علم کی کوئی حقیقت نہیں اللہ کے علم کے مقابلے میں، یہ بھی محض مثال ہے، ورنہ علم الہی غیر متناہی ہے، اور یہاں دونوں متناہی ہیں، اس میں صرف من وجہ مناسبت ہے

ورنہ غیر متناہی کو متناہی سے کوئی نسبت نہیں، مگر اس سے بہتر کوئی مثال نہ تھی، اس لئے اسے بیان کیا گیا۔

قوله فعَمِدَ الْخَضِرُ إِلَى لُوحٍ مِنَ الْأَوَاحِ السَّفِينَةِ فَنَزَعَهُ، مفسرین لکھتے ہیں، کہ جب ساحل کے قریب کشتی پہنچی

قَالَ فَكَانَتْ الْأُولَىٰ مِنْ مُّوسَىٰ نَسِيَانًا فَأَنْطَلَقَا فَاذْأَعْلَامٌ يَلْعَبُ
 خیر پھر دونوں چلے۔ ایک لڑکا لڑکوں میں کھیل رہا تھا، خضر نے کیا کیا کہ اوپر سے اس کا
 مَعَ الْعِلْمَانِ فَاخَذَ الْخَضِرُ بِرَأْسِهِ مِنْ أَعْلَاهُ فَاقْتَلَعَ رَأْسَهُ بِيَدِهِ
 سر تھما اور اپنے ہاتھ سے اس کا سر اوکھڑ کیا، موسیٰ نے کہا،
 فَقَالَ مُّوسَىٰ أَقْتَلْتَ نَفْسًا ذَكِيَّةً بِغَيْرِ نَفْسٍ قَالَ أَلَمْ أَقْتُلْ لَكَ
 تو نے ایک معصوم جان کا ناحق خون کیا، خضر نے کہا میں نے تم سے نہیں
 إِنَّكَ لَكُن تَسْتَطِيعُ مَعِيَ صَبْرًا، قَالَ ابْنُ عَيْنَةَ وَهَذَا الْوَكْدُ
 کہا تھا کہ تم سے میرے ساتھ صبر نہیں ہونے کا، ابن عینہ نے کہا یہ پہلے کلام سے زیادہ سخت ہے،
 فَأَنْطَلَقَا حَتَّىٰ إِذَا اتَيَا أَهْلَ قَرْيَةٍ اسْتَطْعَمَا أَهْلُهَا فَنَابَوْا
 خیر پھر دونوں چلے، چلتے چلتے ایک گاؤں والوں کے پاس پہنچے اُن سے کھانا مانگا، انھوں نے کھانا کھلانے سے انکار کیا،

قوله فَاذْأَعْلَامٌ، غلام کا اطلاق جو نابالغ پر بھی ہوتا ہے، موسیٰ علیہ السلام نے معراج میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو
 غلام کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، تو اب اس کا اطلاق نابالغ میں منحصر نہیں ہے، اب یہ امر کہ یہ غلام نابالغ تھا یا نابالغ، تو قرآن حدیث
 میں کچھ تصریح نہیں، ہاں آثار و اقوال میں کہ وہ نابالغ تھا،
 قوله ذَكِيَّةٌ، یعنی بے جرم، اور پھر اگر قتل بھی کر دے تو اس پر قصاص نہیں، اور یہاں تو اس نے کوئی قصور بھی نہیں کیا
 تھا، اسی کو موسیٰ علیہ السلام نے کہا تھا، بِغَيْرِ نَفْسٍ۔

قوله أَلَمْ أَقْتُلْ لَكَ، یہاں لَكَ بڑھاکر تاکید کر دی۔
 قوله جَدَّارِ يَدِيدٍ، یعنی پرانے زمانے کی عظیم الشان دیوار اس قدر جھک گئی تھی کہ گرنے کے قریب ہو گئی تھی۔
 قوله قَالَ الْخَضِرُ، یہاں قَالَ بمعنی اِشَارَہ ہے، یعنی حضرت خضر نے ہاتھ کے اشارے سے اسے سیدھا کر دیا،
 موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا عجیب بات ہے، جس نے احسان کیا اور بلا کر ایہ کے بٹھایا، اسکی تو کشتی توڑ دی اور نقصان پہنچایا،
 اور جنہوں نے انتہائی بے مروتی سے کھانا تک کھلانے سے انکار کر دیا، ان کے ساتھ احسان و کرم کا یہ معاملہ!

اسْتَطْعَمَا أَهْلُهَا میں مفسرین کچھ اشکال پیش آیا ہے کہ لفظ اَہْلُ کو مکرر کیوں لایا گیا، اسْتَطْعَمَا ہم
 کہنا چاہیے تھا، زرخشری وغیرہ بہت کچھ لکھا ہے اور نکتے بیان کئے ہیں، مگر میں کہتا ہوں کہ اس پر غور کرو کہ کلام کی غرض کیا ہے۔

اَنْ يُضَيِّفُوهُمَا فَوَجَدَا فِيهَا جَدَا اَرِیْرِدْ اَنْ یَنْقُضَ قَالَ الْخَضِرُ
 پھر دونوں نے دیکھا اس گاؤں میں ایک دیوار ہے جو گرانا چاہتی ہے حضرت خضر نے اپنے ہاتھ سے اشارہ کیا
 بیدار فاقامہ فقال له موسى لو شئت لا اتخذت عليك اجرا
 اور دیوار کو سیسہ ہا کر دیا، حضرت موسیٰ نے کہا تم چاہتے تو اس کی مزدوری (اس گاؤں والوں سے) لے سکتے تھے،
 قال هذا فراخ بيني وبينك، قال النبي صلى الله عليه وسلم
 حضرت خضر نے کہا بس مجھ میں تم میں جدائی کی گھڑی آپہنچی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ موسیٰ پر رحم کرے
 یرحمہ اللہ موسیٰ کو دد فالو صبر حتی یقض علینا من امرہما
 تم تو یہ چاہتے تھے کاش موسیٰ صبر کرتے تو ان کے اور حالات بھی ہم سے بیان کئے جاتے
 قال محمد بن یوسف ثنایہ علی بن خشرم قال سفیان بن عیینہ بطولہ
 محمد بن یوسف نے کہا ہم سے اس حدیث کو علی بن خشرم نے بیان کیا کہا ہم کو سفیان بن عیینہ نے خبر دی، یعنی لمی حدیث

میں کہتا ہوں کہ مقصود بد اخلاقی اور بخل کی مذمت کرنا ہے [اسکے بعد سنو کہ] ایک تو کسی بستی سے محض گذرنا ہے، اور ایک
 بستی والوں کے پاس جانا ہے، اگر کوئی بطور مرد [کسی بستی سے] گذر جائے، تو کہیں گے کہ فلاں شخص قریہ میں آیا، یا قریہ
 سے گذرا، یہ نہ کہیں کہ قریہ والوں کے پاس گیا، کیونکہ یہ مرد و عبور ہے، اتیان بالہ نہیں ہے، اہل عرف کے نزدیک،
 دوسری چیز یہ ہے کہ اگر مسافر اہل قریہ کے پاس گیا تو بستی میں دوسم کے لوگ ہوتے ہیں، ایک وہ جو وہاں
 کے اہل اور باشندے ہیں، دوسرے وہ جو ہیں تو بستی ہی میں، مگر خود مسافرت کی حالت میں ہیں اہل نہیں، جیسے
 ہم یہاں ڈابھیل میں رہتے ہیں، اگر کوئی ہمارے پاس آئے اور ہم کہیں کہ ہم خود مسافر ہیں، تو ہمارا عذر مقبول ہوگا،
 لیکن اس بستی کے اصل باشندے یہ جواب دیں تو ان کا عذر قبول نہ ہوگا،

اب سمجھو کہ قرآن انھیں دو باتوں کو بتاتا ہے کہ موسیٰ اور خضر علیہما السلام اہل قریہ کے پاس گئے تھے، قریہ
 سے صرف مرد و عبور نہ تھا بلکہ بالقصد اتیان الی اہل القریہ تھا، ایک بات تو یہ ہوتی، دوسری بات یہ ہے کہ اہل قریہ میں
 سے بھی انکے پاس گئے، جو خود مستقل وہاں کے باشندے تھے، مسافرت کی حالت میں نہ تھے، ان سے کھانا طلب
 کیا تھا، اور انھوں نے کیا، ثواب پوری تقبیح و مذمت، اور سورۃ اخلاقی کا بیان ہو گیا، حاصل یہ کہ پہلے اہل سے عام، اور دوسرے
 اہل سے خاص وہاں کے باشندے مراد ہیں، جن سے سوال کیا، مگر انھوں نے انکار کیا، تو ان کی کمال بے مروتی ظاہر ہوئی
 اس بنا پر موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ ایسے بد اخلاقوں کے ساتھ یہ سلوک؟

بَابُ مَنْ سَأَلَ وَهُوَ قَائِمٌ عَالِمًا جَالِسًا

(باب) ایک عالم سے جو بیٹھا ہو کھڑے کھڑے سوال کرے۔

۱۲۴- حَدَّثَنَا عُثْمَانُ قَالَ ثنا جَرِيرٌ عَنْ مَنْصُورٍ عَنْ أَبِي وَائِلٍ

ہم سے عثمان بن ابی شیبہ نے بیان کیا کہا ہم سے جریر نے بیان کیا انھوں نے منصور سے انھوں نے ابو وائل
عَنْ أَبِي مُوسَى قَالَ جَاءَ رَجُلٌ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
سے انھوں نے ابو موسیٰ سے کہا ایک شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور پوچھنے لگا یا رسول اللہ
فَقَالَ يَا رَسُولَ اللَّهِ مَا الْقِتَالُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَإِنْ أَحَدًا يُقَاتِلُ
کون سا لڑنا ہے؟ کیوں کہ ہم میں بے کوئی غم کیوجہ سے لڑنا ہے اور کوئی (شخص یا قوم یا ملک)

عُضْبًا وَيُقَاتِلُ حِمِيَّةً، فَرَفَعَ إِلَيْهِ رَأْسَهُ قَالَ وَمَا رَفَعَ إِلَيْهِ رَأْسَهُ
جیت (غیرت) کی وجہ سے، آپ نے اس کی طرف سر اٹھایا اسلئے کہ (آپ بیٹھ تھے) اور وہ کھڑا تھا آپ نے فرمایا
إِلَّا أَنَّهُ قَائِمًا فَقَالَ مَنْ قَاتِلٌ لِيَكُونَ كَلِمَةً اللَّهُ هِيَ الْعُلِيَّا فَمَوْفِي سَبِيلِ اللَّهِ
جو کوئی اسلئے لڑے کہ اللہ کا بول بالا ہو تو وہ لڑنا اللہ کی راہ میں ہے۔

بَابُ السُّؤَالِ وَالْفَتَا عِنْدَ رَحِي الْجَمَارِ

(باب) کنکریاں مارتے وقت مسئلہ پوچھنا اور جواب دینا

۱۲۵- حَدَّثَنَا أَبُو نُعَيْمٍ قَالَ ثنا عَبْدُ الْعَزِيزِ بْنُ أَبِي سَلَمَةَ

ہم سے ابو نعیم نے بیان کیا کہا ہم سے عبد العزیز بن ابی سلمہ نے انھوں نے

قوله يَرْحَمُ اللَّهُ موسى لوددنا الخ، یعنی اگر موسیٰ علیہ السلام کچھ صبر کرتے تو اور بہت سے عجائبات معلوم ہوتے، —
حضرت خضر کے متعلق معلوم ہو چکا ہے کہ وہ نبی ہیں، اور اللہ نے انھیں تخصیص و تقیید کا اختیار دیا تھا، اس لئے اگر اس
مصلحت نے کہ اسکے ماں باپ فادے سے بچ جائیں۔ لڑکے کو قتل کر دیا، تو کسی اعتراض کی گنجائش نہیں، کلیات تشریعیہ
میں خلاف کرنے کا حق نہیں ہے، ہاں جزئیات تکوینیہ میں کسی کشف سے کیا جاسکتا ہے۔ قرآن پاک کی اس آیت وَمَا أَهْلَكُ
عَنْ أُمِّرُئِي میں امر ہے، جو نبی کو ہوتا ہے ولی کو نہیں، اس لئے کسی ولی کے لئے جزئیات تکوینیہ میں یہ اختیار ثابت کرنا ہرگز درست
نہیں، کما فعلہ الجمال۔

عَنِ الزُّهْرِيِّ عَنْ عِيسَى بْنِ طَلْحَةَ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ

رَأَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عِنْدَ الْجُمُعَةِ وَهُوَ يُسْأَلُ
 أَنْخَضَتْ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كُوجِرَهُ عَقِبَهُ كَيْسٌ دَيْكُهَا أَبٌ سَلَمَةُ لُؤْجُورُ رَجُلٍ
 فَقَالَ رَجُلٌ يَا رَسُولَ اللَّهِ خَرْتُ قَبْلَ أَنْ أُرْمَى فَقَالَ ارْهَمْ وَلَا حَرْجَ
 ابْنِ شَيْخٍ نَعْنُ عَرَضَ كَيْسٌ يَا رَسُولَ اللَّهِ! مِثْلُ نَعْنُ كُنْكَرِيَا بَارِنُ سَلَمَةُ (بُحُولُ سَلَمَةُ) قَرْبَانِي كَرْدِي، أَتَيْتُ فَرِيَا
 قَالَ آخِرُ يَا رَسُولَ اللَّهِ حَلَقْتُ قَبْلَ أَنْ أُخْرَقَ قَالَ أُخْرَقُوا حَرْجَ
 ابْنِ كُنْكَرِيَا كُجِرَ حَرْجَ نَعْنُ، دُوسُ كُنْكَرِيَا رَسُولَ اللَّهِ مِثْلُ نَعْنُ قَرْبَانِي كَرْدِي سَلَمَةُ (بُحُولُ سَلَمَةُ)
 فَمَا سُئِلَ عَنْ شَيْءٍ قَدَّمَ وَلَا آخَرَ إِلَّا قَالَ أَفْعَلْ وَلَا حَرْجَ
 أَتَيْتُ فَرِيَا ابْنِ قَرْبَانِي كَرْدِي كُجِرَ حَرْجَ نَعْنُ، دُوسُ كُنْكَرِيَا رَسُولَ اللَّهِ مِثْلُ نَعْنُ قَرْبَانِي كَرْدِي سَلَمَةُ (بُحُولُ سَلَمَةُ)

(۸۷) بَابُ مَنْ سَأَلَ وَهُوَ قَائِمٌ

بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہ اعاجم کی طرح کا فعل ہے، اور یہ ممنوع ہے، تو اس کا جواب دیتے ہیں کہ یہ بضرورت جائز ہے، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ اس سے علم کی بے قدری نہیں ہوتی

(۸۸) بَابُ السُّؤَالِ وَالْفِتْيَانِ عِنْدَ رَجُلٍ جَمَارِ

رمی جمار طاعت و عبادت ہے، تو ایسے وقت میں سوال کرنا درست ہے یا نہیں، تو کہتے ہیں کہ جائز ہے، بشرطیکہ طاعت استغراق کی نہ ہو، جیسے کہ صلوٰۃ، کہ یہاں ناجائز ہے،

قوله :- قَالَ رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عِنْدَ الْجُمُعَةِ

چونکہ قریب کھڑے تھے، اس لئے استدلال کر دیا، اگرچہ خاص رمی جمار نہیں فرما رہے تھے،

بَابُ ۸۹ قَوْلِ اللَّهِ تَعَالَى وَمَا أُوتِيتُمْ مِنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا

باب، اللہ کا (سورہ نبی اسرائیل میں فرمانا) اور تم کو تھوڑا ہی سا علم دیا گیا،

۱۲۶- حَدَّثَنَا قَيْسُ بْنُ حَفْصٍ قَالَ سَمِعْتُ عَبْدَ الْوَاحِدِ قَالَ

ہم سے قیس بن حفص نے بیان کیا کہ ہم سے عبد الواحد نے بیان کیا کہ ہم سے عیش
ثَنَا الْأَعْمَشُ سُلَيْمَانُ بْنُ مِهْرَانَ عَنْ إِبْرَاهِيمَ عَنْ عَلْقَمَةَ عَنْ
عَبْدِ اللَّهِ قَالَ بَيْنَا أَنَا وَمُثَنَّى مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي مَغْرِبِ
عَبْدِ اللَّهِ بْنِ مَسْعُودٍ كَمَا بَارِئِينَ أَخْفَضَ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَسَاحَةِ مَدِينَةٍ كَعُظْمَاءِ (يَا كَهْتِي)
الْمَدِينَةِ وَهُوَ يَتَوَكَّأُ عَلَى عَسِيبٍ مَعَهُ فَمَرَّ بِنَفَرٍ مِنَ الْيَهُودِ
میں چل رہا تھا آپ کھجور کی چھڑی پر جو آپ کے پاس تھی ٹیکا لگاتے جاتے تھے، راہ میں چند یہودیوں پرست
فَقَالَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ سَلُّوهُ عَنِ الرُّوحِ، فَقَالَ بَعْضُهُمْ لَا تَسْأَلُوهُ
آپ گذر رہے، انھوں نے آپس میں کہا ان سے روح کو پوچھو، اُن میں بعضوں نے کہا مت پوچھو ایسا نہ ہو وہ ایسی بات
لَا يَجِيءُ فِيهِ شَيْءٌ تَكْرَهُونَهُ فَقَالَ بَعْضُهُمْ لِنَسْأَلُكَ، فَقَامَ رَجُلٌ
کہیں جو تم کو بُری معلوم ہو بعضوں نے کہا ہم تو ضرور پوچھیں گے، آخر ان میں ایک شخص کھڑا ہوا اور کہنے لگا ابوالقاسم

(۸۹) بَابُ قَوْلِ اللَّهِ تَعَالَى وَمَا أُوتِيتُمْ مِنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا

حدیث ۱۲۶، بعض روایات میں ہے کہ حضور بیت المدراس میں تشریف لے گئے، اور وہاں یہ سوال جواب
ہوئے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ خرب:۔ ویرانہ۔ عسیب چھڑی۔

قل الروح الخ اس بات میں اختلاف ہے کہ اس آیت میں کیا اس مسئلہ میں غور کرنے سے بالکل روک دیا گیا ہے،
یا کسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، صوفیہ کہتے ہیں کہ اشارہ کیا گیا ہے، اور علماء کہتے ہیں کہ روک دیا گیا ہے کہ تم
اسے سمجھ نہیں سکتے، اور اس کی حقیقت معلوم کرنے کی ضرورت نہیں، لہذا اس بحث میں پڑنا درست نہیں، میں نے اپنے
رسالہ الروح فی القلن میں بتلایا ہے، کہ آیات میں اشارات موجود ہیں، اسی رسالہ میں میں نے یہ بھی بتلایا ہے کہ
امرو خلق میں کیا فرق ہے، ناظر ہذا۔

مِنْهُمْ فَقَالَ يَا أَبَا الْقَاسِمِ مَا الرُّوحُ؟ فَسَكَتَ فَقُلْتُ إِنَّهُ يُوحَىٰ إِلَيْهِ فَقُسْتُ
روح کیا چیز ہے؟ یہ سن کر آپ چپ ہو رہے، میں سمجھ گیا کہ آپ پر وحی آ رہی ہے اور کھڑا ہو گیا، جب وحی کی طاقت
فَلَمَّا انْجَلَىٰ عَنْهُ فَقَالَ: وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ، قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي وَمَا
جاتی رہی تو آپ نے (سورہ بنی اسرائیل کی یہ آیت) پڑھی، یعنی اے پیغمبر تجھ سے روح کو پوچھتے ہیں، کہہ دے روح میرے
أَوْتُوا مِنَ الْعِلْمِ الْأَقِيلَا۔
مالک کا حکم ہے، اور ان لوگوں کو تھوڑا ہی علم ملا ہے۔

قَالَ الْأَعْمَشُ هِيَ كَذَلِكَ قَرَأْتُنَا: ”وَمَا أَوْتُوا“
اعمش نے کہا ہم نے اس آیت کو یونہی پڑھا ہے۔ ”وَمَا أَوْتُوا“

بَابُ مَنْ تَرَكَ بَعْضَ الْأَخْتِيَارِ خَافَةَ أَنْ يَقْصُرَ فَهُمْ بَعْضُ النَّاسِ
باب، بعض اچھی بات اس ڈر سے چھوڑ دینا کہیں نا سمجھ لوگ اس کو نہ سمجھیں اور اس کے نہ کرنے سے بڑھ کر کسی
فَيَقْعُوا فِي أَشَدِّ مِنْهُ
گناہ میں نہ پڑ جائیں۔

۱۲۴۔ حَدَّثَنَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ مُوسَىٰ عَنْ إِسْرَائِيلَ عَنْ أَبِي إِسْحَاقَ عَنْ
ہم سے عبید اللہ بن موسیٰ نے بیان کیا انھوں نے اسرائیل سے انھوں نے ابواسحاق سے انھوں نے اسود سے

(۹۰) بَابُ مَنْ تَرَكَ بَعْضَ الْأَخْتِيَارِ

بظاہر اس باب کا تعلق کتاب العلم سے ہے، مگر حقیقتاً اگر تعلق ہے، ترجمہ تو یہ ہے کہ کوئی کام جو مختار پسندیدہ ہو
اس ڈر سے اس کو نہ کرے کہ بعض نا فہم سمجھنے سے قاصر رہیں گے اور پھر اس سے بڑے فتنے میں مبتلا ہو جائیں گے۔
حدیث ۱۲۴، اس کے لئے یہ حدیث آئے کہ حضور فرماتے ہیں کہ اگر قریش نے نئے مسلم نہ ہوتے تو میں کہہ کر ابراہیم
کی بنا کے مطابق بناتا، قریش نے بنا کہیں میں چند کوتاہیاں کی تھیں، اول یہ کہ حلیم کو خارج کر دیا تھا، دوسرے یہ کہ دروازہ
ایک کر دیا تھا، تیسرے یہ کہ کرسی بہت اونچی کر دی تھی، اور حضور ﷺ چاہتے تھے کہ حلیم کو داخل کر دیا جائے، اور دروازے دو
ہوں، ایک دخول کا دوسرا خروج کا، اور کرسی نیچی کر دی جائے، مگر آپ نے ایسا کیا نہیں، کیونکہ خون تھا کہ کہیں لوگ
عظیم غلطی میں مبتلا نہ ہو جائیں۔

الْأَسْوَدُ قَالَ قَالَ لِي ابْنُ الزُّبَيْرِ كَانَتْ عَائِشَةُ تُسْرِ إِلَيْكَ كَثِيرًا فَمَا أَحَدٌ
 کہ عبد اللہ بن زبیر نے مجھ سے کہا حضرت عائشہؓ چپکے چپکے تم سے بہت باتیں کیا کرتی تھیں تو کعبہ کے باب میں بھی انھوں نے
 فِي الْكَعْبَةِ قُلْتُ قَالَتْ لِي قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا عَائِشَةُ
 مجھ سے کہا تھا میں نے کہا انھوں نے یہ کہا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا عائشہ اگر تیری قوم
 لَوْلَا أَنَّ قَوْمَكَ حَدِيثُ عَهْدِهِمْ قَالَ ابْنُ الزُّبَيْرِ يَكْفُرُ لَنَقَضْتِ
 (قریش کے لوگ) نو مسلم نہ ہوتے۔ ابن زبیر نے کہا یعنی کفر کا زمانہ ابھی گذرا نہ ہوتا۔ تو میں کعبہ کو توڑ کر اس
 الْكَعْبَةِ فَجَعَلْتُ لَهَا بَابَيْنِ بَابًا تَدْخُلُ النَّاسُ وَبَابًا يَخْرُجُونَ مِنْهُ
 میں دو دروازے لگاتا ایک دروازہ میں سے لوگ اندر جاتے اور ایک دروازہ میں سے باہر نکلتے، پھر
 فَقَعَلَهُ ابْنُ الزُّبَيْرِ
 ابن زبیر نے (اپنی حکومت کے زمانہ میں) ایسا ہی کیا

۱۔ کو کتاب العلم یہ مناسبت ہو کہ بخاری تنبیہ کر رہے ہیں کہ عالم کو حکیم بھی ہونا چاہیے اور اصلاح کے وقت لوگوں کے حالات پر نظر
 رکھنا چاہیے کہ کہیں چھوٹی بات کی اصلاح سے کسی بڑی برائی میں نہ پڑ جائیں۔
 قولہ الاسود :- یہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے شاگرد ہیں، اور ابن زبیر صحابی ہیں، تو صحابی تابعی کا سوال کر رہے ہیں،
 قولہ فما حدثتک الخ یہاں حدیث مختصر ہے، بعض روایات میں ہے کہ ابن زبیر نے کہا کہ مجھے بھی حدیث سنائی ہے۔
 اور تمھیں بھی، مگر مجھے پوری محفوظ نہیں لہذا تم سناؤ اور جہاں تم بھولو گے میں نقشہ دوں گا، پھر ایسا ہی ہوا،
 قولہ حدیث عہدہم، یہاں حدیث عہدہم بالا ضافہ ہے، مگر زیادہ شروح میں حدیث بالتأیید ہے،
 یہاں تک اسود نے سنایا پھر یاد نہ رہا تو ابن زبیر نے کہا بالكفر،

قولہ ففعله ابن الزبیر یعنی ابن زبیر نے عمل کر کے دکھلا دیا، مگر عبد الملک بن مروان نے اسے قائم نہ
 رہنے دیا، حجاج اس کا نائب تھا، اور یہی امیر لشکر بھی تھا، اس نے جب مکہ مکرمہ پر چڑھائی کی، اور حضرت
 عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو اس وقت امیر مکہ تھے، شہید کر دیا۔ اس کے بعد حجاج نے عبد الملک کو حضرت
 ابن زبیر کی شہادت کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا کہ کعبہ کی اس وقت یہ صورت ہے، اسے باقی رہنے دیا جا
 یا توڑ کر پہلے جیسا بنا دیا جاتے۔ عبد الملک نے اس کے جواب میں لکھا کہ ہمیں ابن زبیرؓ کی عمارت کی ضرورت نہیں ہے لہذا

باب ۹۱: مَنْ خَصَّ بِالْعِلْمِ قَوْمًا دُونَ قَوْمٍ كَرَاهَةً أَنْ لَا يَفْهَمُوا وَقَالَ

باب: بعضے علم کی باتیں کچھ لوگوں کو بتانا کچھ لوگوں کو اس خیال سے کہ انکی سمجھ میں نہ آئے گی نہ بتانا۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا (لوگوں سے) دین کی وہی باتیں کو جو وہ سمجھیں۔ کیا تم چاہتے ہو کہ انشاء اللہ اس کا رسول بھٹلایا جائے

۱۲۸۔ حَدَّثَنَا بِه عُمَيْدُ اللَّهِ بْنُ مُوسَى عَنْ مَعْرُوفٍ عَنْ أَبِي

ہم سے اس قول کو عبید اللہ بن موسیٰ نے بیان کیا انھوں نے معروف سے انھوں نے ابو الطفیل سے انھوں نے

الْطُّفَيْلِ عَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے۔

۱۲۹۔ حَدَّثَنَا اسْحَقُ بْنُ إِبْرَاهِيمَ قَالَ أَنَا مَعَاذُ بْنُ هِشَامٍ

ہم سے اسحق بن ابراہیم نے بیان کیا کہ ہم کو معاذ بن ہشام نے خبر دی کہ مجھ سے میرے باپ نے

قَالَ حَدَّثَنِي أَبِي عَنْ قَتَادَةَ قَالَ ثَنَا أَنَسُ بْنُ مَالِكٍ أَنَّ النَّبِيَّ

بیان کیا انھوں نے قتادہ سے کہا۔ ہم سے انس بن مالک نے بیان کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے

صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَمَعَاذُ رَدِّ يَفْهُ عَلَى الرَّحْلِ قَالَ يَا مَعَاذُ

معاذ سے فرمایا جب معاذ نے آپ کی خواص میں سواری پر بیٹھتے تھے۔ اے معاذ!

اسے توڑ دو۔ چنانچہ عمارت جو منشا ربوبی کے عین مطابق تھی، توڑ کر اسے سابق حالت پر لے آیا گیا۔ پھر ہارون رشید نے اپنے زمانے میں اس کو تبدیل کرنا چاہا مگر امام مالک رحمہ اللہ نے اسے روک دیا۔

(۹۱) باب مَنْ خَصَّ بِالْعِلْمِ قَوْمًا دُونَ قَوْمٍ

یعنی استاد کچھ علوم و حقائق بعض طلبہ کے سامنے بیان کرے اور بعض سے پوشیدہ رکھے، اس خیال سے کہ یہ سمجھیں گے تو یہ عین حکمت کا مقتضی ہے کیونکہ اگر عوام کے سامنے ذات و صفات کے مسائل بیان کئے جائیں تو ظاہر ہیکہ وہ کیا سمجھیں گے۔ قولہ اَتَجِبُونَ اَنْ يَكْذِبَ۔ یعنی جب ان کی عقل میں نہ آئے گا تو وہ اسے غلط سمجھیں گے اور اس غلط فہمی کا سبب تم بنو گے لہذا احتیاط کرنا چاہئے۔

امام احمد رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ جن احادیث سے خروج علی السلطان کا جذبہ یا جراثیم علی العاصی

بْنِ جَبَلٍ قَالَ لَبَّيْكَ يَا رَسُولَ اللَّهِ وَسَعْدَيْكَ قَالَ يَا مَعْزُودُ

انہوں نے عرض کیا حاضر ہوں یا رسول اللہ حاضر۔ آپ نے فرمایا مَعْزُودُ !

قَالَ لَبَّيْكَ يَا رَسُولَ اللَّهِ وَسَعْدَيْكَ قَالَ يَا مَعْزُودُ قَالَ لَبَّيْكَ

انہوں نے عرض کیا حاضر ہوں یا رسول اللہ حاضر، آپ نے فرمایا مَعْزُودُ ! انہوں نے عرض کیا

يَا رَسُولَ اللَّهِ وَسَعْدَيْكَ ثَلَاثًا قَالَ مَا مِنْ أَحَدٍ يَشْهَدُ أَنْ

حاضر ہوں یا رسول اللہ حاضر - تین بار - (آپ نے معاذ کو بکارا پھر) فرمایا جو کوئی سچے دل سے یہ گواہی دے

لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللَّهِ صِدْقًا مِنْ قَلْبِهِ

کہ اللہ کے سوا کوئی سچا معبود نہیں اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کے بھیجے ہوئے ہیں۔ تو اللہ اسکو

الْأَحْرَمَ اللَّهُ عَلَى النَّاسِ قَالَ يَا رَسُولَ اللَّهِ أَفَلَا أَخْبِرُ بِهِ

دوزخ بدحرام کر دے گا۔ معاذ نے عرض کیا یا رسول اللہ! کیا میں لوگوں کو اس کی خبر کر دوں

النَّاسَ فَيَسْتَبْشِرُونَ قَالَ إِذَا تَكَلَّمُوا وَأَخْبَرْتُ بِهِمْ عِنْدَ

وہ خوش ہو جائیں گے۔ آپ نے فرمایا ایسا کرے گا تو انکو جہنم ہو جائیگا۔ اور معاذ نے سرتے وقت گھنگار

مَوْتِهِ تَأْتِيهِمْ

ہونے کے ڈر سے یہ لوگوں کو بیان کر دیا۔

پیدا ہوا ان کو عوام کے سامنے نہ بیان کرنا چاہئے۔ اور امام مالک نے کہا اسی احادیث جو صفات کے مسائل پر مشتمل ہوں انکا ذکر عوام کے سامنے نہ کرو۔ جیسے إِنَّ اللَّهَ خَلَقَ آدَمَ عَلَى صُورَتِهِ وغیرہ۔ اس کے علاوہ حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث گزرجکی ہے جس میں انہوں نے بعض علوم کے متعلق فرمایا کہ فَلَوْ بَشَّرْتَهُمْ لَقَطَعْنَا هَذَا الْبَلْعُومَ۔ اسی طرح حسن بصریؒ بھی ایسی چیزیں بیان کرنا پسند نہ کرتے تھے جتنا پھر حضرت انس بن مالکؓ نے عربیوں کی حدیث مثلاً حجاج کے سامنے بیان کی تو انھیں (حسن بصریؒ کو) برا لگایا کیونکہ وہ خود سفاک تھا اور اس سے اس کی جرأت برہمتی۔

حافظؒ نے لکھا ہے کہ اس کا ضابطہ یہ ہے کہ جس حدیث کا ظاہر کسی بدعت کی تقویت کرنا ہو یا معصیت پر جرأت دلانا ہو اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد وہ نہ ہو تو ایسی حدیث کو ایسے لوگوں میں جو سمجھتا ہو یا نہ سمجھ سکتا ہو نہ بیان کرنا چاہئے۔ تو اب سمجھو کہ اگر عوام کے سامنے اس قسم کی چیزیں بیان کریں گے تو وہ غلطی میں مبتلا ہو جائیں گے

۱۳۔ حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ قَالَ حَدَّثَنَا مَعْتَمِرٌ قَالَ سَمِعْتُ

ہم سے مسدد نے بیان کیا کہ ہم سے معتمر نے بیان کیا کہ میں نے اپنے باپ سے
ابنی قال سمعت انساً قال ذكر لي أن النبي صلى الله عليه
سنا کہ میں نے انس سے سنا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ رحمہ سے فرمایا
وَسَلَّمَ قَالَ لِمَعَاذٍ مَنْ لَقِيَ اللَّهَ لَا يَشْرِكُ بِهِ شَيْئًا دَخَلَ
جو شخص اللہ سے ملے وہ (دنیا میں) شرک نہ کرتا ہو تو وہ بہشت میں
الْجَنَّةِ قَالَ إِلَّا ابْتِشْرِبَ النَّاسُ قَالَ لَا إِيَّانِي أَخَافُ أَنْ يَشْكُلُوا
جائے گا۔ معاذ نے عرض کیا کیا میں لوگوں کو یہ خوشخبری نہ دوں؟ کہنے فرمایا میں میں ڈرتا ہوں کہیں وہ بھروسہ نہ کر بیٹھیں۔

لہذا احتیاط کرنا چاہیے اور نہ بیان کرنا چاہیے۔ وعظ، تلقین، تذکرہ، درس، عام مجالس سب میں لحاظ رکھنا چاہئے کہ کہیں لوگوں کو
دھوکہ نہ ہو اور وہ غلطی میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ مثلاً متشابہات کا ذکر جیسے حدیث میں ہے کہ دوزخ جب گرم ہوگی تو اللہ
اپنا قدم رکھے گا۔ عوام کے سامنے اسے بیان کیا جائے تو وہ اسے کیا سمجھ پائیں گے اس لئے اس سے پرہیز کرنا چاہئے۔

حدیث ۱۲۸۔ قوله عن معمر وف، یعنی ابن خزیمہ، یہ ثلاثیات بخاری سے ہے۔ ثلاثی وہ ہے جس میں
تیسرا راوی صحابی ہو یہاں [تیسرے راوی] ابو الطفیل صحابی ہیں جو حضرت علیؓ سے روایت کر رہے ہیں۔

حدیث ۱۲۹۔ قوله لبیک یا رسول الله وسعدیک ثلثاً تین بار اہتمام شان کیلئے فرمایا۔
قوله ما من أحد يشهد اس کی بہترین تاویل ہے جو حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ سے
شیخ الہندؒ نے نقل کی ہے۔ کہ جیسے طب کے اندر دو قسم کی کتابیں ہیں ایک وہ جنہیں مفردات کے خواص و تاثیرات، حرارت و برودت
رطوبت و پیوست کا ذکر ہے، دوسری وہ جن میں ہر کتب نسخوں کے مزاج بتلائے جاتے ہیں جنہیں قرابا دین کہتے ہیں۔ مثلاً ایک
نسخہ میں بیس دوائیں ہیں تو کسرو انکسار کے بعد ان میں دواؤں کا جو مجموعی مزاج بتلائے اس کا بیان ہوتا ہے۔ بعینہ
اسی طرح عمل کی دو صورتیں ہیں ایک مفردات و دوسری مرکبات۔ انبیاء علیہم السلام مفردات کا حال بیان کرتے ہیں اور مرکبات
کا حال قیامت میں لکھئے گا۔ مثلاً فرمایا من قال لا اله الا الله تو اس میں کلمہ کی تاثیر بیان فرمائی کہ اس کا قائل جنت میں
جائے گا دوزخ میں نہ جائے گا اور فرمایا لا یدخل الجنة قتات یا فرمایا من ادعى غیب ابیہ و انتحی الی غیب
موالیہ فعلیہ لعنة الله والملئكة والناس اجمعین تو ان کی تاثیرات یہی ہیں کہ جنت میں نہ جائے یا لعنت

بَابُ الْحَيَاءِ فِي الْعِلْمِ وَقَالَ مُجَاهِدٌ لَا يَتَعَلَّمُ الْعِلْمَ مُسْتَحْيٍ وَلَا مُتَكَبِّرٌ

باب: علم میں شرم کیسا ہے۔ اور مجاہد نے کہا جو شخص شرم کرے یا مغرور ہو اس کو علم نہیں آئے گا۔
وَقَالَتْ عَائِشَةُ نَعَمْ النِّسَاءُ نِسَاءُ الْأَنْصَارِ لَمْ يَمْنَعْنَهُنَّ الْحَيَاءُ
اور حضرت عائشہ نے کہا، انصار کی عورتیں بھی کیسا ابھی عورتیں ہیں ان کو شرم نے دین کی سمجھ حاصل کرنے
أَنْ يَتَفَقَّهْنَ فِي الدِّينِ۔
سے نہیں روکا۔

۱۳۱۔ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ سَلَامٍ قَالَ أَخْبَرَنَا أَبُو مُعَاوِيَةَ

ہم سے محمد بن سلام بکندی نے بیان کیا، کہا ہم کو ابو معاویہ نے خبر دی
قَالَ حَدَّثَنَا هِشَامٌ عَنْ أَبِيهِ عَنْ زَيْنَبِ بِنْتِ أُمِّ سَلَمَةَ عَنْ
کہا ہم سے ہشام بن عروہ نے بیان کیا انھوں نے اپنے باپ عروہ سے انھوں نے زینب سے جو بیٹی تھیں ام المومنین حضرت ام سلمہ کی انھوں نے
أُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ جَاءَتْ أُمُّ سَلِيمٍ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ
ام سلمہ سے۔ انھوں نے کہا، ام سلیم (اس کی ماں) آئیں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ۳۳
وَسَلَّمَ فَقَالَتْ يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحْيِي مِنَ الْخِثِّ
اور پوچھنے لگیں یا رسول اللہ! اللہ حق بات سے شرم نہیں کرتا۔

مستحق ہو اور کلمہ کی تاثیر یہ ہے کہ جنت میں جاتے۔ اب ایک شخص کے اندر یہ سب باتیں ہیں تو اب کسرو انکسار سے کیا مزاج
پیدا ہوا یہ آخرت میں کھلے گا۔ اگرچہ کہیں کہیں بتلا بھی دیا ہے لیکن عام طور پر مفردات کی خصوصیات بتلاتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ دونوں
درست ہیں۔ مرکب کی تاثیر کا حال آخرت میں معلوم ہو گا اور وہ یہ کہ جو غالب رہے گا وہ کھینچ لے جائیگا۔ مثلاً شفاعت
سے کلمہ اسے جنت میں کھینچ لے جائیگا۔ یا آگ میں میل کچیل جلا دیا جائے گا پھر کلمہ کندن کر کے جنت میں کھینچ لائے گا۔
تو اب یہ تاویل نہیں بلکہ مدلول یہ ہے استاد (حضرت شیخ المنذم سے منقول ہے۔ مگر اس کو ابن ربیع نے بھی محمل لکھا ہے۔

[ایک مثال سے اس کو یوں سمجھو، کہ بانی بارو بالطنع ہے اگر اس کو آگ پر رکھ کر اس قدر گرم کر لیا جائے کہ
وہ آگ کا کام کرنے لگے تو اسے حار کہیں گے لیکن اب بھی برودت طبعی جو جذر طبیعت میں رکھی ہے وہ موجود ہے
مگر مستور ہو گئی ہے۔ جیسا کہ متنبی نے کہا ہے

فَهَلْ عَلَى الْمَرْأَةِ مِنْ غَسْلِ إِذَا احْتَلَمَتْ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ
 عَلَيْهَا وَسَلَّمَ إِذَا رَأَتْ الْمَاءَ فَغَطَّتْ أَمْسَلَةً تَعْنِي وَجْهَهَا
 البتہ وہ (جاگ کر) پانی دیکھے۔ یہ سن کر ام سلمہؓ نے اپنا منہ (شرم سے) ڈھانک لیا
 وَقَالَتْ يَا رَسُولَ اللَّهِ أَوْ تَحْتَلِمُ الْمَرْأَةُ؟ قَالَ نَعَمْ تَرَبَّتْ
 اور عرض کیا، یا رسول اللہ! کیا عورت کو بھی احتلام ہوتا ہے؟ آپ نے فرمایا ہاں تیرے اچھ کو
 يَمِينُكَ فِيمَ يَشْبَهُهَا وَلَدُهَا۔
 مٹی لگے، پھر بچہ کی صورت ان سے کیوں بنتی ہے۔

۱۳۲۔ حَدَّثَنَا سَمْعِيلُ قَالَ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ
 بْنِ دِينَارٍ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُمَرَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ
 وَسَلَّمَ قَالَ إِنَّ مِنَ الشَّجَرِ شَجَرَةً لَا يَسْقُطُ وَرَقُهَا وَهِيَ مَثَلُ
 درختوں میں ایک درخت ایسا ہے جس کے پتے نہیں بھڑکتے۔ مسلمان کی دہی مثال ہے
 الْمُسْلِمِ حَدَّثَنِي مَا هِيَ؟ فَوَقَعَ النَّاسُ فِي شَجَرِ الْبَادِيَةِ
 مجھ سے کہو وہ کون سا درخت ہے؟ سنکر لوگوں کا خیال جنگل کے درختوں کی طرف دوڑا
 وَوَقَعَ فِي نَفْسِي أَنَّهَا النَّخْلَةُ، قَالَ عَبْدُ اللَّهِ، فَاسْتَحْيَيْتُ
 اور میرے دل میں آیا کہ وہ کھجور کا درخت ہے۔ عبد اللہؓ نے کہا لیکن مجھ کو شرم آتی (میں نے)
 قَالُوا يَا رَسُولَ اللَّهِ أَخْبِرْنَا بِهَا، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ
 آخر لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ ہی بتائیے وہ کونسا درخت ہے۔ آپ نے حضرت عمرؓ سے بیان کیا جو میرے
 وَسَلَّمَ هِيَ النَّخْلَةُ، قَالَ عَبْدُ اللَّهِ، فَحَدَّثْتُ أَبِي بِمَا وَقَعَ فِي
 فرمایا وہ کھجور کا درخت ہے۔ عبد اللہؓ نے کہا پھر میں نے اپنے باپ (حضرت عمرؓ) سے بیان کیا جو میرے
 نَفْسِي فَقَالَ لَا تَكُونِ قُلْتُمَا الْحَبَّ إِلَى مَنْ أَنْ يَكُونَ لِي كَذَا وَكَذَا،
 دل میں آیا تھا۔ انھوں نے کہا اگر تو (اس وقت) کہہ دیتا تو مجھ کو اتنا مال ملنے سے بھی زیادہ خوشی ہوتی۔

باب ۳۱ مِّنْ اسْتَحْيَا فَاَمَرَ غَيْرَهُ بِالسُّؤَالِ

باب جو کوئی شہرم سے آپ نہ پوچھے دوسرے شخص سے پوچھنے کو کہے۔

۱۳۳۔ حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ قَالَ حَدَّثَنَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ دَاوُدَ

ہم سے مسدد نے بیان کیا کہ ہم سے عبد اللہ بن داؤد نے بیان کیا

عَنِ الْأَعْمَشِ عَنْ مُنْذِرِ الثَّوْرِيِّ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ

انہوں نے اعمش سے انہوں نے منذر ثوری سے انہوں نے محمد بن حنفیہ سے

الْحَنْفِيَّةِ عَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ كُنْتُ رَجُلًا

انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے انہوں نے کہا میری مذی بہت نکلا کرتی

مَذَاءً فَأَمَرْتُ الْمُقَدَّادَ أَنْ يَسْأَلَ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ

تھی۔ میں نے مقداد سے کہا تم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا مسئلہ پوچھ

وَسَلَّمْ فَسَأَلَهُ فَقَالَ فِيهِ الْوُضُوءُ۔

انہوں نے پوچھا آپ نے فرمایا مذی سے وضو کرنا چاہئے۔

عَدَلَ الْعَوَازِلَ حَوْلَ قَلْبِي النَّائِبَ وَهُوَ الْحَبَّةُ مِنْهُ فِي سُودَاتِهِ

طامت کریموں کی طامت میرے پریشان دل کے گریبے اور محبوب کی محبت سویدائے قلب کے اندر ہے

ایسا ہی یہاں ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ یہی گرم پانی آگ پر ڈال دیا جائے تو آگ کو بجھا دیگا۔ اگر اس کے اندر برودت نہ تھی تو کیوں انطفاء ہوا۔ معلوم ہوا کہ برودت اسکی ذاتی ہے جو گرم ہونے کی حالت میں بھی موجود تھی۔ اسی طرح مومن کیلئے کلمہ ایک ذاتی چیز ہے جو قلب میں مستور ہے اور عوارض نے گھیر لیا ہے۔ جب عوارض مند فہ ہو گئے شفاعت سے یا کلمہ سے یا مغفرت سے یا دروزخ میں جلتے سے، کسی طرح بھی عوارض دور ہوئے تو ذاتی چیز کا ظہور ہو گیا بخلاف کافر کے کہ اس میں سنجاست ہے اور وہ ذات میں ہے کسی صابون سے کٹنے والی نہیں اور معاصی اور پرکی سنجاست میں کلمہ اندر مستور ہے، عوارض کے اندر قلعے سے وہ لوٹ آئے گا اور جنت میں لے جانے گا۔

(۹۲) باب الْحَيَاءِ فِي الْعِلْمِ

قولہ، مستکبر، یعنی متکبر کو بھی علم نہیں آتا کیونکہ کبر اظہارِ امتیاز سے الگ ہے اور علم امتیاز سے آتا ہے۔ جب تک

باب ۹۲ ذکر العلم والفتیاء فی المسجد

باب ۹۲ مسجد میں علم کی باتیں کرنا اور فتویٰ دینا
۱۳۲- حَدَّثَنَا قُتَيْبَةُ بْنُ سَعِيدٍ قَالَ حَدَّثَنَا اللَّيْثُ بْنُ سَعْدٍ

ہم سے قتیبہ بن سعید نے بیان کیا، کہا ہم سے لیث بن سعد نے بیان کیا
قَالَ حَدَّثَنَا نَافِعٌ مَوْلَى عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ
عُمَرَ أَنَّ رَجُلًا قَامَ فِي الْمَسْجِدِ فَقَالَ يَا رَسُولَ اللَّهِ مَنْ أَيْنَ تَأْمُرُنَا
أَنْ نَهْلَ؟ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَهْلُ أَهْلُ الْمَدِينَةِ
(رج کا، احرام کماں سے باندھیں؟ آپ نے فرمایا، مدینہ والے ذوالحلیفہ سے احرام باندھیں
مَنْ ذِي الْحُلَيْفَةِ وَيَهْلُ أَهْلُ الشَّامِ مِنَ الْجَحْفَةِ وَيَهْلُ أَهْلُ مَجْدٍ
اور شام والے جحفہ سے احرام باندھیں اور نجد والے قرن سے۔)

احتیاج ظاہر نہ کیا جائے گا اس وقت تک علم نہیں آئے گا۔

حدیث ۱۳۲- قَوْلُهُ لَا تَكُونُ قَلْتَهَا أَحِبَّ إِلَى مَنْ أَنْ يَكُونَ لِي كَذَا وَكَذَا يَعْنِي
ایسی حیانتہ کر فی چاہتے کہ اس کی وجہ سے مزید رفع درجات سے محرومی ہو جائے۔ اس جیسا عرق مراد ہے۔

(۹۳) باب من استجی فی امر غیرہ بالسؤال

یہ پہلے ترجمہ کی تلافی ہے کہ کبھی کبھی جیسا مانع ہوتی ہے اور یہ جائز بھی ہے بشرطیکہ مطلب فوت نہ ہو۔

حدیث ۱۳۳- اس کے لئے یہ حدیث لائے کہ حضرت علی رضی عنہ حضرت مقداد سے معلوم کرایا تھا۔

(۹۴) باب ذکر العلم والفتیاء فی المسجد

جو تک حدیث میں آیا ہے کہ مساجد ذکر اللہ کے لئے ہیں اور وہاں شور و شغب ناجائز ہے اور علم میں
بھی کبھی کبھی شور و شغب ہوتا ہے تو کہتے ہیں کہ یہ جائز ہے بشرطیکہ علم دین ہو۔ فلسفہ وغیرہ کی
تعلیم نہیں۔ صرف دستخط و تاویل داخل کر لیں گے۔

مَنْ قَرَنَ وَقَالَ بَنُ عُمَرَ وَيَزْعُمُونَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ

صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ وَيُهْلُ أَهْلُ الْيَمَنِ مِنْ

يَلْمُهُ، وَكَانَ بَنُ عُمَرَ يَقُولُ لَمْ أَفْقَهُ هَذَا مِنْ

رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صاف نہیں سنی۔

بَابُ مَنْ أَجَابَ السَّائِلَ بِأَكْثَرِ سَأَلِهِ

باب پوچھنے والے نے جتنا پوچھا اس سے زیادہ جواب دینا

۱۳۵- حَدَّثَنَا آدَمُ قَالَ حَدَّثَنَا ابْنُ أَبِي ذَيْبٍ عَنْ

نَافِعٍ عَنْ بَنِي عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

ح وَعَنِ الزَّهْرِيِّ وَعَنْ سَالِمٍ عَنْ ابْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

أَنَّ رَجُلًا سَأَلَهُ مَا يَلْبَسُ الْمُحْرِمُ فَقَالَ لَا يَلْبَسُ

الْقَمِيصَ وَلَا الْعِمَامَةَ وَلَا السَّرَاوِيلَ وَلَا الْبُرْنُسَ

وَلَا تَوْبَامَاسَهُ الْوَرَسُ أَوِ الزَّعْفَرَانُ فَإِنْ لَمْ يَجِدِ النَّعْلَيْنِ

نہ وہ کپڑا جس میں ورس یا زعفران لگی ہو ، پھر اگر (پہننے کو) جوتیاں (چل)

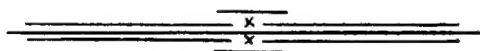
فَلْيَلْبَسِ الْخُفَّيْنِ وَلْيَقْطَعْهُمَا حَتَّى يَكُونَا تَحْتَ الْكَعْبَيْنِ -
 نہ ٹپیں تو موزے ٹخنوں کے نیچے تک کاٹ کر پہن لے۔

(۱۵۱) بَابُ مَنْ أَجَابَ السَّائِلَ بِأَكْثَرِ مَا سَأَلَهُ

یعنی سائل کے سوال سے زیادہ بیان کرے۔ پہلے باب میں گذرا تھا کہ بعض اشیاء کو روک لے اور یہاں اس کے برعکس باب لائے، تو بتانا یہ مقصود ہے کہ یہ صورت بھی جائز ہے۔ حالات کا تقاضا ہو تو نہ بیان کرے اور مصلحت ہو تو زیادہ بھی بتلا دے۔

حدیث ۱۳۵ - قوله ما لبس المحرم ؟ سوال صرف پہننے کا تھا، کہ محرم کیا کیا پہنے، جواب دیا کہ یہ یہ نہ پہنو، قمیص، عامہ، سرادیل، برنس وغیرہ۔ باقی پہن سکتے ہو۔ اگر پہننے کا ذکر فرماتے تو احصاء نہ فرماتے کچھ اشیاء ہی بیان فرماتے تو تنگی رہتی اس لئے ان اشیاء کا ذکر فرما دیا جو ممنوع قمیص بقیہ جائز ہو گئیں یہ عین حکمت ہے۔

قوله الکعبین، یہاں وسط قدم کی ہڈی مراد ہے اور امام محمدؒ سے جو مروی ہے کہ کعبین سے بیچ کی ہڈی مراد ہے وہ صرف اسی مقام پر ہے۔ وضو میں کعبین سے یہ بیچ کی ہڈی مراد نہیں بلکہ ٹخنے مراد ہیں۔



کتاب العلم تمام شد

والحمد لله الذی بنعمته تمّ الصّالحات

AF.1317